قاہرہ کا قہر

تاریخ کے اوراق سے ایک غلام زادے کی سرگزشت

حصہ اوّل

مُعظّم جاوید بُخاری

تاریخ کے اوراق سے ایک غلام زادے کی سرگزشت، جس نے تاج سلطانی
پہن کر مسلمانوں پر وہ عظیم احسان کیے جنہیں فراموش کرنا ناممکن ہے!

قاہرہ کا قہر

معظم جاوید بخاری

(پہلا حصہ)

مکتبہ داستان / حکایت پبلشرز پٹیالہ گراؤنڈ میکلوڈ روڈ لاہور

رابطہ کے لیے:

ماہنامہ حکایت 26 پٹیالہ گراؤنڈ لاہور

آپ اپنا آرڈر یا کوئی شکایت بذریعہ ای میل بھیج سکتے ہیں

ای میل: e-mail:maktabaedastan@yahoo.com
e-mail:monthlyhikayat@yahoo.com

ٹائٹل: نیکس ایچ

کمپوزنگ: شاہد امان

قیمت: =/220 روپے

ناشر: حکایت پبلشرز۔ 26۔ پٹیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ لاہور۔

اسٹاکسٹ: مکتبہ داستان 26۔ پٹیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ لاہور۔

فون: 7321898-7356541

تعارف

ساتویں صدی ہجری کے عین وسط میں جب عباسی خلافت کا انحطاط انتہا کو پہنچ چکا تھا، قاہرہ کی فاطمی خلافت دم توڑ چکی تھی، سلجوقی، زنگی اور ایوبی حکمران اپنی طاقت کو باہمی چپقلش میں ختم کر چکے تھے، خوارزمی سلطنت منگولوں کے عتاب کا شکار ہو چکی تھی۔ منگول حریص نگاہوں سے بغداد کی جانب دیکھ رہے تھے۔ مسلمان امراء سازشوں سے ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچ رہے تھے، علماء سر بازار دوسرے مسالک پر کیچڑ اچھال رہے تھے۔ ایسے میں مصر کی سرزمین نے ایک عجب نظارہ دیکھا۔ دشت قپچاق، قزوین اور کوہ قاف کے سفید فام باشندے جو کہ چنگیز خان کے ظلم وستم کا شکار ہو کر غلام بنالئے گئے اور اہل مصر کے پاس پہنچ گئے تو وہ طوفان کی طرح اُٹھ کھڑے ہوئے اور مصر کے تخت وتاج کے مالک بن گئے۔ پونے تین سو سال تک انہوں نے ایسی خوبی سے حکومت کی کہ مغربی ومشرقی مورخین متعجب رہ گئے۔ ممالیک مصر کا دورِ حکومت تاریخ اسلامیہ کا ایک شاندار باب ہے۔ الملک الظاہر رکن الدین بیبرس انہی غریب الدیار غلاموں کی جماعت کا ایک فرد تھا جو اپنی غیر معمولی صلاحیتوں اور بخت آوری کی بدولت مصر کے تاج وتخت اور خزائن کا مالک بن گیا۔ کہنے کو تو وہ ممالیک کے سلسلے کا چوتھا حکمران تھا مگر حقیقت یہی ہے کہ وہ پہلا مملوک فرمانروا تھا جس نے مملوک سلطنت کی بنیادیں استوار کیں اور اس کو ایک ایسی طاقت بنا ڈالا جس کا نام سن کر دشمنان اسلام کے جسم لرز اُٹھتے تھے۔ وہ ایک ایسے نازک اور پر آشوب دور میں جریدہ عالم پر نمودار ہوا جب مسلمان تقریباً ڈیڑھ صدی سے صلیبی طالع آزماؤں کی ستم رانیوں کا ہدف بنے ہوئے تھے اور رہی سہی کسر فتنہ تاتار نے پوری کر دی تھی۔ وحشی تاتاریوں کی بربریت نے جہاں خلافت کے احترام کو پامال کیا وہیں ان کی غارت گری سے مسلمانوں پر ایسی دہشت مسلط کر دی کہ وہ خود کو بے بس اور بے یار ومددگار محسوس کرنے لگے۔ ایک معمولی تاتاری سپاہی پورے

گاؤں کو روند ڈالتا مگر کوئی اس کے سامنے پر مارنے کی ہمت نہ کر پاتا۔ ہلاکو خان نے شام و عراق کو کھنڈرات بنا ڈالا تھا۔ ایسے میں مسلمان مصر کی جانب جان بچا کر ہجرت کرنے لگے۔ تاتاریوں کے ساتھ صلیبیوں کے اتحاد نے ایک بڑے عرصے تک مسلمانوں پر قیامت برپا کئے رکھی۔ ایسے میں جب مسلمان اللہ کے حضور گڑگڑا کر کسی نجات دھندہ کی دعائیں مانگ رہے تھے بیبرس سامنے آیا اور تاتاریوں کے سامنے چٹان بن کر کھڑا ہو گیا۔ ہلاکو خان اس کی بہادری اور شجاعت کے قصے سن کر دنگ رہ گیا۔ صلیبی اس کی ہیبت کے سامنے جم کر کھڑے نہ رہ سکے۔ سلطان بیبرس کی یہ درخشاں عسکری کامیابیاں ہی تھیں جنہوں نے متعصب مغربی مورخین سے بھی کسی نہ کسی صورت میں اس کی عظمت کا اعتراف کرایا۔ یوں تو اس کی عساکر میں متعدد قابل سپہ سالار موجود تھے مگر بیبرس کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ دشمنان اسلام کے مقابلے میں خود سالاری کا فریضہ ادا کرے۔ عباسی خلفاء کے بعد یہ بڑا اہم حکمران تھا جس نے شوق شہادت میں میدان جنگ میں بار بار اترنا گوارا کیا۔ اس کی ولولہ انگیز قیادت نے فوجیوں میں بھی بے پناہ عزم و ہمت اور ناقابل تسخیر جذبہ جہاد پیدا کر دیا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ شوق جہاد کے معاملہ میں بیبرس، الپ ارسلان، عمادالدین زنگی، نورالدین زنگی، صلاح الدین ایوبی اور سلطان محمد فاتح جیسے مجاہد فرمانرواؤں کی صف کا آدمی تھا تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ بیبرس نے جہاں فرانس کے شاہ لوئیس نہم کو گرفتار کر کے رہائی دلوائی وہیں اس نے احیاء خلافت کا دوبارہ اجراء کر کے مسلمانوں میں ایک مرکز اور یگانگی پیدا کر دی تھی۔ سلطان بیبرس جیسی ہمہ گیر شخصیت کے بارے میں یہ تاریخی کہانی حکایت کے صفحات کی زینت بن چکی ہے۔

معظم جاوید بخاری

انتساب!

محترم عنایت اللہ کے نام!
جن کو پڑھ کر میں نے لکھنا سیکھا۔

گھوڑوں اور اونٹوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا قافلہ نہایت سست روی سے دمشق کے صدر دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ یہ کوئی عام سا قافلہ نہیں تھا بلکہ سرزمین کوہ قاف کی اس خونخوار تاتاری اور منگول قوم کا تھا جنہوں نے کئی برس قبل سلطنت خوارزم کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی تھیں۔ مسلمانوں کے سروں کے مینار بنا ڈالے تھے۔ آندھی طوفان کی طرح یہ قوم آن ہی آن میں یوں چھا گئی کہ بڑے بڑے بہادر ان کے سامنے جھکتے اور پھر ٹوٹتے چلے گئے۔ یوں تو منگولوں کے قافلے عرصہ دراز سے سلطنت مسلمہ میں تجارت کے سلسلے میں آیا کرتے تھے اور ریچھ اور بھیڑیے کی گرم کھالوں کی بڑی مقدار تہذیب یافتہ قوم کو میسر آتی تھی۔ منگول تاجروں کو عموماً جن اشیاء کی اشد ضرورت پڑتی تھی ان میں خصوصاً خورد و نوش کی اشیاء اور کپڑے وغیرہ شامل تھے۔ ممکن تھا کہ یہ لوگ تجارت کے بہانے تہذیب و تمدن سے آگاہی حاصل کر لیتے مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مسلمانان اسلام دن بدن احکام شرعیہ سے غافل ہو کر بدمتوں کا شکار ہو رہے تھے۔ ان کی اصلاح میں بڑی بڑی برگزیدہ ہستیاں ناکام ہو چکی تھیں۔ قدرت نے انہیں سزا دینے کی ٹھان لی اور یہ سزا بڑی عبرت انگیز اور خوفناک تھی۔ منگول جو کہ بے خبری کے عالم میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ انہیں تموچن جیسا رہنما میسر آ گیا جو کہ چنگیز خان کے لقب سے سلطنت خوارزم پر عتاب بن کر ٹوٹ پڑا۔ مسلمان گاجر مولی کی طرح کٹتے چلے گئے۔ ان کی سرزمین منگولوں کے گھوڑوں تلے روندی گئی۔ شہروں کے شہر خاک اور ملبے کا ڈھیر بن گئے۔ جیتے جاگتے لوگ کھوپڑیوں کے میناروں میں بدل گئے۔ یہ سلسلہ ابھی اختتام پذیر نہیں ہوا تھا۔ منگولوں اور تاتاریوں کے لشکر مسلمانوں کے علاقوں کو مسلسل پامال کئے جا رہے تھے۔ ایسے میں ان کے قافلوں کی آمد سے تمام شہروں میں خوف و ہراس پھیل جاتا۔ منگولوں کی دھاک اتنی تھی کہ وہ جو مطالبہ کیا کرتے ان کی تعمیل کرنا لازمی سمجھا جاتا۔ عباسی خلیفہ بغداد کسی حد تک اس اثر کو زائل کرنے میں کامیاب ضرور تھا۔ اس کا وجود ہی مسلمانوں کے لئے آخری سہارا تھا۔

بغداد میں کثیر التعداد افواج کی موجودگی سے کسی حد تک اطمینان ضرور تھا۔ ایسا ہی ایک قافلہ 630ھ میں دمشق میں داخل ہوا۔ کوتوال شہر کو پہلے ہی خبر مل چکی تھی۔ اس نے تاتاری قافلے کا شہر کے صدر دروازے پر استقبال کیا۔ یہ اس کی ذمہ داری تھی کہ وہ اس قافلے کو قیام کے دوران کسی دہشت گردی کا شکار نہ ہونے دے۔ سرزمین خوارزم سے بچ کر آنے والے لوگ کئی شہروں میں پناہ گزین تھے۔ ان کی طرف سے یہ خطرہ ہر وقت لاحق رہتا تھا کہ وہ کسی تاتاری تاجر کو اپنے انتقام کا نشانہ نہ بنا ڈالیں جو کچھ ماضی میں بیت چکا تھا اس کا دوہرانا آنے والی نسلوں کی تباہی کا باعث بن سکتا تھا لہٰذا احتیاط روا رکھنا ہی بھلائی کے حق میں تھا۔ وہ قافلہ دمشق کے شمالی حصے کی جانب بڑھ گیا۔ کوتوال شہر اپنے ہرکاروں کے ہمراہ اس کے عقب میں رہا۔ جب اس قافلے نے بیت الاحضرا کی حصے میں پڑاؤ ڈالا تو کوتوال شہر نے ان سے اپنا تعارف کرایا اور اپنی طرف سے مکمل تحفظ کی یقین دہانی کرائی۔ اس قافلے کا امیر بلاقہ خان نامی تاتاری تھا۔ یہ اپنے قافلے میں واحد شخص تھا جسے عربی زبان سے آگاہی تھی۔ اس

نے کوتوال شہر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے قیام کے بارے میں تفصیل بتائی۔ تھوڑی ہی دیر میں کوتوال شہر چند ضروری اقدام اُٹھا کر وہاں سے رخصت ہوگیا۔

قافلے کے لوگ وہاں اپنے خیمے گاڑنے لگے۔ بیت الاحضر ایک چھوٹا سا میدان تھا جہاں کسی کو مستقل آباد ہونے یا مکان تعمیر کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ جگہ سرکاری طور پر ایسے تاجروں کے لئے وقف تھی جنہیں دمشق میں عارضی طور پر ٹھہرنا ہوتا تھا۔ اس میدان کے بائیں کنارے پر ایک کنواں تھا جہاں پانی ہر وقت میسر رہتا۔ بلاقہ خان نے اپنے ساتھیوں کو کچھ ہدایات دیں اور اپنے خیمے میں ایک بڑے ایرانی قالین پر بیٹھ گیا۔ یہ قالین اسی کے لئے لگایا گیا تھا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ بلاقہ خان آج آرام کرنا چاہتا تھا۔ اس کے پاس عمدہ کھالوں کا بڑا ذخیرہ تھا جو اسے دمشق میں فروخت کرنا تھا۔ دمشق کے لوگ بیت الاحضر کے قریب سے گذرتے تو حیرت و خوف سے ان پر ایک نگاہ ڈالے بنا نہ رہ پاتے۔ بلاقہ خان دل ہی دل میں ان کے چہروں پر چھائے ہوئے خوف کو دیکھ کر محظوظ ہوتا رہا۔ شام ڈھل گئی اور رات کی تاریکی بڑھنے لگی۔ ایسے میں ایک مقامی شخص اپنا چہرہ لپیٹے ہوئے وہاں آیا۔ اس کی آمد اور انداز بڑا مشکوک تھا۔ قافلے کے محافظوں نے اس کا رستہ روکنا چاہا تو اس نے بلاقہ خان کا نام لیا اور اپنا نام بتایا۔ جس پر انہیں قدرے اطمینان ہوگیا۔ نو وارد دمشق کی بردہ منڈی کا نامی تاجر ابو داؤد تھا۔ وہ ایک محافظ کی معاونت میں بلاقہ خان کے خیمے تک پہنچ گیا۔ اس نے خیمے کا پردہ ہٹایا اور اندر داخل ہوگیا۔ بلاقہ خان اس کی صورت دیکھ کر محض مسکرا دیا۔ اس نے محافظ کو اشارہ کیا تو وہ باہر نکل گیا۔ بلاقہ خان نے ابو داؤد کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تو ابو داؤد نے ایک گاؤ تکیے سے ٹیک لگالی۔ دونوں ایک دوسرے کی جانب کئی لمحے خاموشی سے دیکھتے رہے۔ بلاقہ خان نے پہلو میں پڑی صراحی میں سے دو جام بھرے اور ایک اس کی جانب بڑھا دیا۔ ابو داؤد نے وہ جام یوں لیا جیسے کوئی خاص نعمت ہو۔

''ابو داؤد!'' بلاقہ خان ایک گھونٹ لیتا ہوا بولا۔ ''مجھے تمہارا ہی انتظار تھا، تمہاری راہ تکتے تکتے سارا دن بیت گیا میں تو یہ سمجھا تھا کہ شاید تم یہ علاقہ ہی چھوڑ کر چلے گئے ہو''۔

''پہلے اگر کام کی بات ہو جائے تو......''

''ٹھیک ہے تم پہلے تجارت کے خواہش مند ہو تو مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے''۔ بلاقہ بولا۔

''تمہارے پاس کتنے دانے ہیں؟''

''دانے تو تھوڑے ہی ہیں مگر......''

''مگر کیا؟'' ابو داؤد کے ماتھے پر بل پڑ گیا۔

''نہایت قیمتی ہیں......'' بلاقہ خان معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ جس پر ابو داؤد کا چہرہ کھل اُٹھا۔

''کیا لو گے؟''

''میں ان کی فروخت میں خود دلچسپی رکھتا ہوں میرا خیال ہے کہ کسی دوسرے کو زیادہ فائدہ دینے کے بجائے مجھے خود سارا نفع سمیٹنا چاہئے''۔ بلاقہ خان نے جام کی چسکی لگائی اور سر دھننے لگا۔

''تمہاری یہ بات مجھے بھلی نہیں لگی''۔

''یہ کاروبار ہے ابو داؤد! فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے تم میرے تنہا ہی خریدار ہوا کرتے تھے مگر اب خریدار کئی لوگ ہوں گے۔ جو منافع تم حاصل کرتے تھے۔ میں اب وہ سب خود رکھنا چاہتا ہوں''۔ بلاقہ خان کے لہجے میں بے اعتنائی سی پھیلنے لگی۔

''ٹھیک ہے تم جو چاہو کر سکتے ہو، تمہارا مال ہے...... میں اب چلتا ہوں''۔ ابو داؤد کا چہرہ ناکامی سے

پژمردہ ہو رہا تھا۔ اس نے جام ایک جانب رکھا اور کھڑا ہو کر لباس صحیح کرنے لگا۔ وہ پردے کی جانب بڑھ گیا۔ اچانک وہ دوبارہ مڑا جیسے کچھ یاد آیا ہو۔ بلاقہ خان اس کی جانب لاپروائی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے اچانک مڑنے پر فوراً سنبھل گیا۔

''ایک بات تمہیں بتانا ضروری سمجھوں گا''۔

بلاقہ خان اس کی جانب استفسارانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ ابو داؤد کے چہرے پر کچھ ہی دیر قبل چھانے والی پژمردگی یکدم غائب ہو چکی تھی بلکہ اس کی جگہ کراہت آمیز مسکان لے چکی تھی۔

''یہاں تم آزادانہ ایک بھی دانہ نہیں بیچ پاؤ گے کیونکہ ہر جگہ کے کچھ قوانین و اصول ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہاں پر نو وارد تاجر مال براہ راست گاہک کو نہیں بیچ سکتا۔ وہ پابند ہے کہ مال صرف مقامی تاجر کو دے کر چلا جائے۔ تمہارا تو مال ہی دوسری نوعیت کا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ تم اس میں سے ایک بھی دانہ کسی کو بیچ نہیں پاؤ گے۔ یہاں کے لوگ تم سے ضمانت بھی طلب کریں گے کہ خریدا ہوا دانہ انہیں دھوکا دے کر فرار تو نہیں ہو جائے گا۔ یہ ضمانت صرف مقامی تاجر کی ہی ہوتی ہے۔ باہر سے کبھی کبھار آنے والے تاجروں کی نہیں''۔

ابو داؤد کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہو چکی تھی جبکہ بلاقہ خان اس کی بات پر قدرے پریشان ہو گیا۔ اس کی بات کسی حد تک درست بھی تھی اس کی ضمانت معتبر نہیں تھی۔

''ہونہہ! تو پھر تم کیا چاہتے ہو؟''

بلاقہ خان نے استفسار کیا۔

''میں نے کیا چاہنا ہے تم اپنی بات کرو۔ مال مجھے بیچنا ہے یا نہیں''۔

''ٹھیک ہے آؤ ادھر بیٹھو''۔

ابو داؤد مسکراتا ہوا واپس گاؤ تکیے پر دراز ہوگیا۔ بلاقہ خان نے دو جام مزید بھرے اور ایک اس کی جانب بڑھا دیا۔

''دیکھو! یہ مال عام لوگوں کے لئے نہیں ہے بلکہ خاص قسم کے لوگوں کی ضرورت ہے۔ تم سمجھ رہے ہو نا......'' بلاقہ خان نے کہا۔

''ہاں! کتنے دانے ہیں''۔

''چالیس''۔

''کیا لو گے؟''

''جو قیمت لگے گی اس کا دو تہائی حصہ''۔

''نہیں......نہیں! یہ بہت زیادہ قیمت ہے''۔

''مال دیکھو گے تو تمہیں خود ہی اہمیت کا احساس ہو جائے گا کہ یہ قیمت کچھ بھی نہیں''۔

''نہیں بلاقہ خان! میں ایسا سودا نہیں کر سکتا۔ مال چاہے جیسا مرضی ہو۔ تم فی دانہ کے لحاظ سے قیمت لگاؤ۔ یہ بات بھی دھیان میں رکھو کہ اگر کوئی دانہ فرار ہوگیا تو اس کی قیمت تم نہیں، میں نے ہی لوٹانی ہے''۔

''میرا خیال ہے کہ مال دیکھنے کے بعد ہی بات آگے بڑھائی جائے تو زیادہ بہتر ہوگا''۔ بلاقہ خان نے باہر کسی کو آواز لگائی۔ کچھ ہی لمحوں میں ایک تنومند شخص خیمے میں داخل ہوا جو کہ صورت سے ہی تند مزاج معلوم ہوتا تھا۔ بلاقہ خان نے اسے تاتاری زبان میں کچھ کہا تو وہ سر ہلا کر باہر نکل گیا۔ ابو داؤد اس دوران خاموشی سے بیٹھا رہا۔ بلاقہ خان نے فرصت کے دوران دو جام اور بنائے اور ایک اس کی جانب بڑھا دیا۔ ابو داؤد جب بھی جام

اپنی جانب بڑھتے دیکھتا تو اس کی نگاہوں میں حرص کی چمک عیاں ہو جاتی تھی۔ بلاقہ خان اس کی بھوک کو تاڑ چکا تھا۔ اس نے اس بار صراحی کچھ ایسے انداز میں رکھ دی کہ وہ جب چاہتا جام بھر لیتا۔ کچھ ہی لمحوں میں باہر سے دبی تنومند شخص خیمے میں دوبارہ داخل ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ اس بار وہ تنہا نہیں تھا بلکہ اس کے ہمراہ ایک دس سالہ خوبصورت لڑکا بھی تھا۔ سرخ و سپید رنگت اور نزاکت نے اسے مزید پرکشش بنا ڈالا تھا۔ ابوداؤد کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ جام کو بھول کر اسے تکتا ہی رہ گیا۔

''واللہ! یہ تو غلمان جنت کی مانند دکھائی دیتا ہے''۔ ابوداؤد بے اختیاری سے بڑبڑا اُٹھا۔

''میں نے کہا نہیں تھا کہ مال بے حد قیمتی ہے۔ یہ خاص دانے صرف میرے ہی پاس ہیں اور یہ صرف صاحب ذوق لوگوں کے لئے ہی ہو سکتے ہیں''۔ بلاقہ خان نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی۔ ''ابوداؤد! یہ خاص دانے میں دشت قپچاق اور الف لیلوی کوہ قاف کی وادی سے لے کر آیا ہوں۔ ویسے تو تم سے پہلے بردہ منڈی کا تاجر عبدالرحیم ثمرقندی بھی آیا تھا.....'' بلاقہ خان جان بوجھ کر خاموش ہو گیا۔

ابوداؤد جو کہ ابھی تک اسی لڑکے کو تکے جا رہا تھا عبدالرحیم کا نام سن کر یکدم چونک اُٹھا۔

''اسے کیا تمیز تجارت کی.....'' ابوداؤد جل بھن سا گیا۔ ''بلاقہ خان تجارت کرنا ہے تو مجھ جیسے شخص سے کرو، میری منڈی میں ساکھ اعلیٰ ہے اور یاد رکھو کہ کوئی دوسرا تاجر یہاں میری رفتار سے زیادہ آج تک مال نہیں بیچ پایا''۔

''ابوداؤد!'' بلاقہ خان مسکرا کر بولا۔ ''مال کے بکنے کی بات چھوڑو، یہ دانے اتنے لاجواب ہیں کہ یہ خود اپنے خریدار ڈھونڈ لیں گے، ان کے لئے کسی کی اعلیٰ ساکھ کی کوئی ضرورت نہیں''۔

''تم نے کتنے دانے بتائے تھے؟''

''چالیس دانے''۔

''دیکھو بلاقہ خان!'' ابوداؤد اب پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''تم مال کی قیمت بولو، حصوں کے چکر میں نہ پڑو۔ حصوں کے چکر میں شاید تم گھاٹے میں رہ جاؤ''

''کاروبار کرنا ہے تو گھاٹے اور نفع کا کیا سوال؟''

''تم اگر چاہو تو میں پانچ دینار سرخ فی دانہ دے سکتا ہوں۔ حالانکہ میں نے ابھی پورا مال نہیں دیکھا ہے.....'' ابوداؤد نے قیمت لگا دی۔

''ابوداؤد!'' بلاقہ خان منہ بنا کر بولا۔ ''مال کے مطابق قیمت بولو۔ پانچ دینار تو ان کے جوتے کی قیمت نہیں۔ بہر حال قیمت تو وہی رہے گی یعنی آخری بولی کا دو تہائی حصہ۔ اگر کوئی اس قیمت پر تیار نہیں تو میں مال کسی دوسرے شہر میں لے جانا زیادہ پسند کروں گا''۔

''اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں''۔

''نہیں''۔

''میں آخری بات کہوں؟''

''ہاں! شوق سے کہو''۔

''اگر تم اسی طرح مصر ہو تو آخری بولی کا دو تہائی نہیں ایک تہائی لے لو''۔

''نہیں! قیمت کم نہیں ہو سکتی''۔

''ٹھیک ہے تو پھر میں چلتا ہوں''۔

''سوچ لو..... پھر شکوہ نہ کرنا میں کسی اور سے سودا کر لوں گا''۔ بلاقہ خان اس کی جانب غور سے دیکھ رہا تھا۔ ابوداؤد نے ایک لمحے کے لئے کچھ سوچا اور پھر نفی میں گردن ہلا دی۔ بلاقہ خان اس کی بات سن کر گہری سوچ میں پڑ گیا۔ ابوداؤد دمشق کے اعلیٰ تاجروں میں سے نمایاں حیثیت کا مالک تھا۔ اگر وہ پیچھے ہٹ جاتا تو شاید ہی کوئی اور تاجر اس کے مال کو خریدنے کی حامی بھرتا۔ دوسرا جو قیمت بلاقہ خان کے ذہن میں تھی اس پر کوئی بھی تیار نہیں ہوتا۔

''ابوداؤد! میں بھی آخری بات بولوں''۔ بلاقہ خان نے کچھ سوچ کر کہا۔ ابوداؤد نے سر اثبات میں ہلایا تو وہ اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا بولا۔ ''نہ تمہاری بات اور نہ ہی میری بات..... وسط میں سودا کر لیتے ہیں..... آدھا آدھا''۔

اس کی بات سن کر ابوداؤد کان کھجانے لگا۔ نہ جانے کیوں وہ یہ سودا اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ قدرے توقف کے بعد اس نے مسکرا کر حامی بھر لی۔ بلاقہ خان کے چہرے پر بھی بشاشت پھیل گئی۔ اسی خوشی میں جام پر جام چلنے لگے۔ بلاقہ خان جہاں کھالوں کا تاجر تھا، وہیں وہ غلاموں اور لونڈیوں کی تجارت بھی کرتا تھا۔ یہ خیال اسے کچھ ہی عرصے پہلے آیا تھا جب خاقان اعظم کی جانب سے اس کے حصے میں کوہ قاف اور دشت قپچاق سے وافر مقدار میں غلام ملے تھے۔ ان علاقوں میں کچھ ہی سال قبل اسلام کی روشنی پہنچی تھی۔ ابھی ایمان دلوں میں پوری طرح روشن بھی نہیں ہو پایا تھا کہ منگولوں نے اسلام دشمنی میں ان علاقوں کو بھی پامال کر ڈالا۔ یہاں کے معصوم شہریوں کو صرف اس بات کے جرم میں موت و ہلاکت کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ مسلمانوں کے گروہ میں کیوں شامل ہوئے۔ نوجوانوں اور بوڑھوں کو ہلاک کر کے ان کے گھروں کو نذر آتش کر دیا گیا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا گیا۔ پھر مزید ستم یہ ہوا کہ ماؤں سے ان کے بچوں کو جدا کر کے مختلف شہروں میں بھیج دیا گیا جہاں منگول تاتاری لوگوں نے انہیں خوراک پر بوجھ سمجھتے ہوئے مسلمانوں کے آگے بیچ ڈالا۔ بلاقہ خان بھی ایک ایسی ہی کھیپ لے کر دمشق آیا تھا۔



دمشق کی بردہ منڈی دوسرے دن کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ ابوداؤد کے خاص ہرکاروں نے پورے شہر میں ڈھنڈورا پیٹ ڈالا تھا کہ جنت کے غلمان کی نیلامی لگائی جا رہی ہے۔ دمشق کے متمول افراد جنت کے غلمان دیکھنے کے اشتیاق میں یہاں جمع تھے۔ بلاقہ خان ایک اونچے چبوترے پر ایک جانب بیٹھا ہوا تھا۔ چبوترے کے اطراف میں وہ سب معصوم بچے سفید چادروں میں لپٹے کھڑے تھے جن کی نیلامی ہونے والی تھی۔ ابوداؤد نے اس سلسلے میں ایک خاص اہتمام کیا تھا کہ لڑکوں کے چہروں پر سفید نقاب چڑھا دیئے تھے۔ ابوداؤد نے نیلامی کے آغاز سے پہلے ان حسین و جمیل لڑکوں کی تعریفوں میں ایسے قلابے ملائے کہ دمشق کے در و دیوار تک محظوظ ہو گئے۔ نیلامی کا آغاز کیا گیا اور پہلے ایک لڑکے کو سامنے لایا گیا۔ جب اس کا نقاب کھلا تو حاضرین محفل پر گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ یہ دیکھ کر ابوداؤد بڑے فخر سے سر دھننے لگا۔ محفل میں سے کسی نے سو درہم کی آواز لگائی۔ پھر یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک ایک کر کے لڑکے سامنے آتے رہے اور حاضرین محفل میں سے بولیاں لگتی رہیں۔ جب کوئی بولی رُک جاتی تو اسے اس معصوم کا مالک بنا دیا جاتا۔ یہ سلسلہ تمام دن چلتا رہا۔ سینکڑوں کی بولی ہزاروں میں جا کر اختتام پذیر ہو جاتی۔ سہ پہر کے قریب جب دو لڑکے باقی رہ گئے تھے تو ابوداؤد نے تھکن سی محسوس کی۔ وہ بلاقہ خان کے برابر نشست پر جا بیٹھا۔ اس نے اپنے دیوہیکل غلام کو اشارہ کیا تو وہ لڑکے کو دھکیلتا ہوا سامنے لے آیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا نقاب اُٹھا دیا گیا۔ وہ لڑکا پہلے بکنے والے لڑکوں سے قدرے مختلف دکھائی دے

رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کرنجی اور بال سرخ تھے۔ یہ خوبی تو پہلے لڑکوں میں بھی موجود تھی مگر اس میں جو خاص چیز تھی وہ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی معصومیت اور دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ مجمع نے جب اس کا حسن دیکھا تو عش عش کر اُٹھے پھر اس کی بولی لگنا شروع ہوگئی۔ دوسری طرف بلاقہ خان نے خفیف سے اشارے سے ابوداؤد کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ ابوداؤد چونک کر اس کی جانب متوجہ ہوا۔ ''کیا بات ہے؟''

''مجھے امید نہیں کہ یہ لڑکا کسی اچھی قیمت پر بک سکے۔ اس کی داہنی آنکھ میں سقم ہے۔ پہلی نظر میں تو محسوس نہیں ہوتا مگر غور سے دیکھنے سے اصلیت معلوم ہو جاتی ہے''۔ بلاقہ خان تشویش کے عالم میں بولا۔ ابوداؤد نے مسکرا کر کندھے اچکائے۔ ''تم بے فکر رہو۔ ہمیں یہ بات بتانا ہی نہیں کہ اس کی آنکھ میں کوئی سقم ہے۔ یہ سب کے سامنے کھڑا ہے لوگ دیکھ بھال کر ہی بولی لگا رہے ہیں''۔

کچھ ہی لمحوں میں اس لڑکے کی بولی آٹھ سو درہم پر پہنچ کر رُک گئی۔ ابوداؤد نے بلاقہ خان کی جانب فاتح انداز میں مسکرا کر دیکھا۔ وہ شخص جس نے بولی لگائی تھی۔ کچھ ہی لمحوں میں اس کا مالک بن گیا۔ وہ قیمت چکانے کے لئے چبوترے پر چڑھا اور ابوداؤد کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے اپنے جبے میں ہاتھ ڈالا اور درہم نکال کر گننے لگا۔ اسی اثناء میں وہ لڑکا اس کے پہلو میں لا کھڑا کیا گیا۔ اس نے اس کی جانب ایک نگاہ ڈالی اور دوبارہ رقم گننے لگا۔ اچانک اسے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ اس نے چونک کر دوبارہ اس لڑکے کی جانب دیکھا۔ اس کی داہنی آنکھ کا سقم اس کی نگاہ سے پوشیدہ نہ رہ پایا تھا۔ اس نے اسے دھوکا دہی سمجھ کر اس بات پر واویلا مچا دیا۔ ابوداؤد نے اسے سمجھانا دھمکانا چاہا مگر وہ متمول شخص تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ اپنی بولی منسوخ کر کے واپس لوٹ گیا۔ اس شور شرابے میں تمام مجمع کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ لڑکے کی دائیں آنکھ میں سقم ہے۔ ابوداؤد کو یہ ناکامی اپنی ہتک محسوس ہونے لگی۔ کچھ ہی دیر پہلے بلاقہ خان کے سامنے وہ جو عمارت بنا رہا تھا وہ یکدم منہدم ہوگئی تھی۔ اس نے غصے کے عالم میں اس لڑکے کو ایک گھونسا رسید کر دیا۔ اس کی جگہ دوسرا لڑکا کچھ ہی لمحوں میں بک گیا مگر وہ نہ بک سکا۔ لوگ مال کے خاتمے پر وہاں سے رخصت ہوگئے۔ صرف چند لوگ وہاں محض اس خیال میں موجود رہے کہ دیکھئے سقم والی آنکھوں والا غلام بک پاتا ہے یا نہیں۔ اسی چکر میں شام ہوگئی۔ اب وہاں پندرہ بیس افراد سے زائد نہیں تھے۔ بلاقہ خان بضد تھا کہ جہاں سب بالائی ختم ہوگئی ہے وہاں یہ بال بھی باقی نہیں رہنا چاہئے۔ ابوداؤد نے آخری بار اسے دوبارہ نیلامی کے لئے کھڑا کیا۔ اس بار اس نے اپنا پرانا حربہ استعمال کیا۔ اس کے دو خاص غلام حاضرین محفل میں شامل ہوگئے۔ ابوداؤد نے کوہ قاف کی وادی کے بارے میں چھوٹا سا تبصرہ کرتے ہوئے لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ بولی کا آغاز کریں۔ چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ پھر ایک شخص نے ہمت کر کے دس درہم کی آواز لگائی۔ بلاقہ خان دس درہم کی آواز سن کر کھول اُٹھا۔ ابوداؤد کے آدمیوں نے بولی کو بڑھایا مگر بیس دینار سرخ پر یہ بولی رُک گئی۔ کافی دیر تک کوئی آواز نہ پا کر ابوداؤد نے بلاقہ خان کی جانب مایوسانہ انداز میں دیکھا۔ بلاقہ خان خود بھی سارے دن کی مصروفیت سے تھک چکا تھا اور اس لڑکے کے نہ بکنے سے تنگ آ چکا تھا۔ وہ اب جلد از جلد اس معاملے کو نبٹا کر اپنا حصہ لے کر واپس بیت الاحضر جانے کا خواہش مند تھا۔ وہ کچھ ہی لمحے پیشتر یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اگر یہ لڑکا نہ بک پایا تو وہ اسے واپسی پر کسی گہری کھائی میں دھکیل دے گا۔ بیس دینار تو کچھ بھی قیمت نہیں تھی۔ بلاقہ خان نے اسے غنیمت سمجھتے ہوئے سرہلا دیا۔ بولی منظور ہوگئی۔ کچھ ہی لمحوں میں وہ لڑکا اس شخص کے حوالے کر دیا گیا جس کی بولی بیس دینار سرخ کی تھی۔ اس نے لڑکے کا ہاتھ تھاما اور بردہ منڈی سے باہر نکل گیا۔



رات کا وقت تھا دمشق کی بردہ منڈی کا تاجر ابوداؤد اپنے تاتاری دوست کے ہمراہ ایک بلند و بالا مکان

میں موجود تھا۔ تیسری منزل پر خاص محفل کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں تاتاری شراب کے ہمراہ ساز و رقص کا انتظام بھی تھا۔ دمشق کی خاص بجلیاں وہاں اپنے جسموں کو لچکا مٹکا کر احباب محفل پر جادو گرا رہی تھیں۔ ایک کونے میں سازندے میٹھی سی دھن چھیڑے ہوئے تھے۔ بلاقہ خان اپنے دو خاص ساتھیوں کے ساتھ موجود تھا۔ یہ محفل خصوصاً اس کے لئے منعقد کی گئی تھی۔ ابوداؤد کو اپنے تصور سے بھی کہیں زیادہ نفع ہوا تھا۔ سرخ و سپید غلاموں نے جہاں اس کی جیب گرم کی تھی وہیں اس کی ساکھ کو بھی مزید مستحکم کیا تھا۔ رات بھر یہی تماشہ چلتا رہا۔ جام پر جام لنڈھائے گئے۔ دمشق کی یہ شعلہ جو پری پیکر دوشیزائیں اپنے نازک اندام بدن کی لچکاہٹ سے احباب محفل کو محظوظ کرتی رہیں۔ رات کے آخری پہر میں بلاقہ خان کو ہوش آیا کہ واپس لوٹنا چاہئے۔ وہ تو شام ڈھلتے ہی لوٹنے کا خواہش مند تھا مگر ابوداؤد نے اسے زبردستی روک لیا۔ بلاقہ خان نے اس کا دل رکھنے کے لئے ٹھہرنا مناسب سمجھا۔ اس کے ساتھیوں نے اس محفل میں شمولیت تو کی تھی مگر انہوں نے شراب کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ بلاقہ خان نے ابوداؤد کو اشارہ کیا کہ وہ جانا چاہتا ہے۔ ابوداؤد اشارہ سمجھ کر اس کے ہمراہ دوسرے کمرے میں چلا آیا۔ محفل اندر یونہی جاری رہی۔ بلاقہ خان کے ساتھ اس کے دونوں ساتھی بھی چلے آئے تھے۔ ابوداؤد نے انہیں ایک طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود ایک بڑی الماری کی جانب بڑھ گیا۔ نیلامی کا تمام حساب کتاب ایک بڑے کاغذ پر موجود تھا۔ جمع تفریق ہو چکی تھی۔ بلاقہ خان کو چوالیس ہزار دینار سرخ اس سے لینا تھے اور کام ختم۔

ابوداؤد نے ایک بڑی سی گٹھڑی نکالی اور اس کے سامنے رکھ دی۔ کچھ ہی لمحوں میں رقم گن لی گئی۔ چوالیس ہزار دینار بلاقہ خان نے اپنے ساتھیوں کی جانب بڑھائے اور نشست چھوڑ دی۔ ابوداؤد نے رقم ان کے حوالے کرتے ہوئے لہک لہک کر اپنی اتنی بڑی کامیابی پر گنگنانا شروع کر دیا۔ بلاقہ خان نے مسکرا کر اس بہکے ہوئے شرابی کی جانب دیکھا اور دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے اسے اور اس کے ساتھیوں کو ٹھٹھکنا پڑا کیونکہ دروازے سے کئی نقاب پوش اندر داخل ہونے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں۔ بلاقہ خان ابوداؤد کی چال فوراً سمجھ گیا۔ نقاب پوشوں نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

''تاتاری!'' ایک نقاب پوش غراتے ہوئے بولا۔ ''یہ سب رقم یہیں رکھ دو اور خاموشی سے باہر کا رستہ ناپو۔ اگر تم میں سے کسی نے چالاکی دکھانے کی یا دوبارہ یہاں قدم رکھنے کی کوشش کی تو وہ اپنی جان سے جائے گا''۔

''ابوداؤد!'' بلاقہ خان طیش کے عالم میں پھنکارا۔ ''یہ کھیل تمہیں مہنگا پڑے گا۔ ابھی بھی وقت ہے اپنی بے وقوفی پر تائب ہو جاؤ''۔

ابوداؤد شراب کے نشے میں جھومتا ہوا آگے بڑھا اور ایک ہی جھٹکے میں اس نے رقم کی گٹھڑی بلاقہ خان کے ساتھی سے چھین لی۔

''بلاقہ خان! میرے دوست...... دھمکی دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نہ صرف مقامی ہوں بلکہ یہاں کے قاضی بھی میری مٹھی میں ہیں۔ تم لاکھ واویلا مچاؤ۔ یہاں تمہاری کوئی بھی نہیں سنے گا۔ بہتر یہی ہوگا کہ تم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ واپس اپنے خیموں میں لوٹ جاؤ...... ورنہ......''

''ورنہ کیا ابوداؤد؟''

''زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھو گے''۔

''کس کی زندگی؟'' بلاقہ خان نے زہر خند لہجے میں کہا۔ دوسرے ہی لمحے ایک چھوٹا سا خنجر اُڑتا ہوا ابوداؤد کے سینے میں اتر گیا۔ یہ سب اتنی سرعت میں ہوا کہ نقاب پوش سمجھ نہ پائے۔ ابوداؤد کے حلق سے دبی سی

چیخ نکلی اور وہ زمین پر ڈھیر ہوتا چلا گیا۔ نقاب پوش گومگوئی کے عالم میں کھوئے ہوئے تھے کہ بلاقہ خان کے ساتھیوں کی تلواریں آناً فاناً چمکی اور وہ اسی حالت میں ایک ایک کر کے زمین پر بکھرتے چلے گئے۔ چند ہی لمحوں میں بساط الٹ دی گئی۔

بلاقہ خان کو شام کے وقت ہی ابوداؤد کے حساب کتاب کے معاملے کو لٹکانے اور ضیافت کی شرارت چھوڑنے سے شک ہو چلا تھا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ اس نے اپنے ان دونوں ساتھیوں کو سمجھا بجھا دیا تھا اسی لئے انہوں نے شراب کو منہ تک نہیں لگایا۔ وہ دونوں شمشیر زنی میں بلا کا ملکہ رکھتے تھے۔

بلاقہ خان نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا، انہوں نے بڑھ کر الماری میں موجود تمام رقم اپنے قبضے میں کر لی۔ دائیں بائیں تلاشی کے دوران ایک چور دروازہ ان کی نگاہوں میں آ گیا جہاں سے وہ فرار ہو سکتے تھے۔ منصوبے کے مطابق وہ دونوں رقم سمیت کر چور دروازے سے خیموں میں لوٹ گئے۔ آدھ گھنٹے میں وہ دونوں اسی راستے وہاں واپس لوٹ آئے تھے۔ بلاقہ خان نے ایک دوسرے خنجر سے خود کو اور انہیں زخمی کر ڈالا اور شور مچانے لگا۔ شور وغل کی آواز پر دوسرے کمرے میں چلنے والی محفل رُک گئی اور کئی لوگ اس جانب بڑھ آئے۔ جب دوسرے لوگوں نے وہاں کا حال دیکھا تو ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے فوراً کوتوالی میں اطلاع کر دی۔ منگولوں پر حملے کی اطلاع پاتے ہی کوتوال قریباً بھاگتا ہوا وہاں پہنچا۔ کوتوال کو بلاقہ خان نے تمام تفصیل بتائی کہ کس طرح ابوداؤد نے اسے وہاں بلایا اور رقم دینے کے بہانے ان پر قاتلانہ حملہ کرایا۔ رقم سمیٹنے والا معاملہ وہ گول کر گیا تھا۔ کوتوال نے وہاں کی تلاشی لی، وہاں کسی رقم کا وجود نہیں تھا۔ دیگر لوگوں کے بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ چاروں اس کمرے میں جاتے دیکھے گئے۔ نقاب پوش کس جانب سے وہاں پہنچے اس بارے میں کسی کو علم نہیں۔ حالات وشہادت بلاقہ خان کے حق میں جا رہی تھی۔ بلاقہ خان کو تھوڑی بہت پوچھ گچھ کے بعد واپس جانے کی اجازت دے دی گئی۔ بلاقہ خان اپنی خواہش پوری کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ بے گناہ بھی ثابت ہو گیا اور اپنی رقم کے ساتھ ساتھ وہ ابوداؤد کے اثاثے کا بھی مالک بن چکا تھا۔ ابوداؤد کو لالچ اور دھوکا دہی بے حد مہنگی پڑی تھی۔



جس شخص نے سقم زدہ آنکھ والا غلام خریدا تھا وہ حماۃ کا رہنے والا تھا۔ تجارت اس کا پیشہ تھا۔ وہ بڑا صاف گو اور راست باز شخص تھا اس کا نام علاءالدین بندقداری تھا۔ وہ ان دنوں دمشق میں ریشم کی ڈوری والی کمانیں بیچنے آیا ہوا تھا۔ دمشق کے لوگوں میں وہ اتنا زیادہ معروف نہیں تھا۔ اس نے دو شادیاں کی تھیں مگر قدرت کو منظور نہیں تھا کہ وہ شادی شدہ زندگی گذارے۔ ایک کے بعد ایک بیوی بخار میں مبتلا ہوئی اور اسے داغ مفارقت دے گئی۔ وہ گذشتہ تین سال سے تنہا زندگی گزار رہا تھا۔ بیویوں کے ساتھ ساتھ اسے اولاد جیسی نعمت بھی نصیب نہ ہو سکی۔ وہ اپنی حالت میں خوش رہنے والا انسان تھا۔ حالات سے سمجھوتا کر لینا اس کی فطرت بن چکا تھا۔ وہ نیلامی والے دن دوپہر کو وہاں پہنچا تھا۔ اس کا مقصد کوئی غلام وغیرہ خریدنا نہیں تھا کیونکہ وہ اتنا متمول نہیں تھا کہ مہنگے داموں غلام خرید پاتا۔ سارا دن وہیں بیت گیا۔ جب آنکھ کی خرابی سے اُس غلام کی نیلامی منسوخ ہو گئی تو وہ محض اس اشتیاق میں وہاں کھڑا رہ گیا کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے؟ پھر جب شام ڈھلنے لگی اور اس غلام کو نیلام نہ کیا جا سکا تو اس کے دل میں اس کے لئے ہمدردی کا جذبہ عود کر آیا۔ اسے معلوم تھا کہ نہ بک سکنے والے غلاموں کے ساتھ یہ بردہ فروش کیا سلوک کرتے ہیں؟ غیر انسانی مار پیٹ اور ایذائیں اس کا مقدر بن جاتی ہیں۔ اس نے دل ہی میں دُعا کی کہ اگر ہو سکا تو وہ اس کے لئے کچھ کرے گا۔ پھر اس کی دعا قبولیت کی منازل پار کر گئی اور وہ خود

اس کا مالک بن گیا۔ وہ اسے لے کر اس سرائے میں چلا آیا تھا جہاں وہ اقامت پذیر تھا۔ تمام راہ اس نے اس لڑکے سے کوئی بات نہیں کی۔ سرائے میں پہنچ کر اس نے اسے ایک جانب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ لڑکا آنکھ کے سقم کے باوجود بے حد خوش شکل تھا۔ اس کا سہما ہوا چہرہ بندقداری کا دل چیرتا چلا گیا۔ جانے کیوں آج اسے اولاد اتنی شدت سے یاد آنے لگی تھی۔ اس نے اپنے خیالوں کو جھٹکا اور اس کی جانب متوجہ ہوا۔

''لڑکے! تم جانتے ہو نا کہ آج سے میں ہی تمہارا مالک ہوں''۔

لڑکے نے سہمے ہوئے انداز میں سر ہلایا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''محمود!'' ایک کانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''اوہ! مسلمان ہو''۔

اس نے دوبارہ سر ہلا دیا۔

''کہاں کے رہنے والے ہو''۔

''یہاں سے بہت دور وادی قپچاق کا''۔

''عربی سمجھ لیتے ہو..... بول بھی سکتے ہو''۔

''تھوڑی بہت!''

''خوب!'' علاءالدین بندقداری مسکرایا۔ ''کھانا کھاؤ گے بلکہ یقیناً کھاؤ گے۔ میں بھی سارا دن تمہیں دیکھتا رہا ہوں''۔

وہ لڑکا کچھ نہیں بولا۔ علاءالدین نے کھانا منگوایا اور پھر وہ دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر ایک ہی تھالی میں کھانا کھانے لگے۔ کھانے سے فرصت پا کر علاءالدین نے اسے سونے کے لئے ایک چٹائی دی۔ وہ چٹائی پر لیٹتے ہی خراٹے بھرنے لگا۔ علاءالدین اپنے بستر پر لیٹے چھت کو گھورتا رہا۔ نیند جیسے اس کی آنکھوں سے غائب ہو گئی تھی۔ اس کا ذہن مسلسل محمود کی جانب مرتکز تھا۔ وہ طرح طرح کے خیالوں میں الجھا جانے کب نیند کی آغوش میں اُتر گیا۔ چند ہی دن بعد وہ دمشق میں اپنے کام وغیرہ نبٹا کر واپس حماۃ لوٹ گیا۔ محمود بھی اس کے ہمراہ رہا۔ وقت گزرتا گیا محمود اپنے آقا بندقداری کے رویئے سے بڑا متاثر ہوا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ غلاموں کے ساتھ بے حد بہیمانہ سلوک کیا جاتا ہے مگر بندقداری کے ساتھ رہتے ہوئے اسے پدرانہ شفقت نصیب ہوئی۔ وہ خصوصاً اس کا بڑا خیال رکھا کرتا تھا۔ دن مہینوں اور مہینے سالوں میں بدل گئے۔ محمود وقت کے ساتھ عمدہ انداز میں عربی بولنا سیکھ گیا بندقداری نے اسے معمولی سی تعلیم بھی دلائی۔ محمود اپنے آقا کے ہمراہ مختلف علاقوں میں تجارت کی غرض سے جاتا رہا۔ محمود خوش شکل ہونے کے ساتھ خوش مزاج اور خاصا ذہین بھی تھا۔ مختلف شہروں میں سفر کرنے کے دوران ایک خوبی جو اس میں پیدا ہوئی وہ یہ تھی کہ محمود کو دوسرے علاقوں کی زبانیں سیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا جلد ہی وہ عربی، مصری، حبشی اور ترکی زبان سیکھ گیا۔ وہ نہایت عمدگی کے ساتھ مختلف زبانوں میں اہل زبان کی طرح بات کر لیا کرتا۔ بندقداری محمود کی اس خوبی سے بڑا خوش ہوا۔ اس کی تجارت میں دن بدن اضافہ ہونے لگا۔ محمود اپنے آقا کی جگہ تاجروں سے مقامی زبان میں مہارت سے گفتگو کیا کرتا۔ ریشم کی ڈوریوں والی کمانیں، عمدہ قالین، گرم مصالحہ جات اور قیمتی کپڑوں کی تجارت میں بندقداری کو ایک نمایاں کامیابی حاصل ہو گئی۔

633ھ میں بندقداری کا تجارتی قافلہ شام کی سرحد کے قریب مصیاف نامی قلعے کے پاس سے گذر رہا تھا کہ قلعے کے باطنی فدائیوں نے اس پر حملہ کر دیا اور تمام مال واسباب لوٹ لیا۔ قافلے کے چیدہ چیدہ افراد کو

چن چن کر قتل کر دیا گیا۔ بندقداری اس حملے میں نہایت زخمی ہو گیا اور محمود بمشکل اسے ایک عربی گھوڑے پر ڈال کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ زخمی حالت میں اسے واپس حماۃ لایا گیا۔ محمود نے اس کی تیمارداری میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ دو ماہ کے مسلسل علاج کے بعد وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو گیا۔ اس برے زمانے میں گھر میں موجود جمع سرمایہ خرچ ہو گیا۔ بندقداری کو محمود کی خدمت کا احساس نہایت شدت سے ہوا۔ حالات کی کروٹ نے بندقداری کو بلندی سے پستی میں لا پھینکا تھا۔ باطنی فدائیوں نے اس کا تمام اثاثہ لوٹ لیا تھا۔ مزید تجارت کے لئے اس کے پاس کچھ نہ بچا تھا اگر کوئی چیز پاس تھی تو وہ سابقہ ساکھ ہی تھی۔ بندقداری نے کئی امراء سے رابطہ قائم کیا مگر کچھ نہ بن پایا۔ امراء کو بندقداری کی صلاحیت پر تو بھروسہ تھا مگر اگر وہ دوبارہ لٹ جاتا تو اپنی رقم کی واپسی ناگزیر دکھائی دیتی تھی۔ اس عرصے میں صرف ایک ہی شخص درد کی دوا بنا۔ اس کا نام علی بن الورقہ تھا۔ وہ حماۃ کا نہایت دولت مند امیر تھا۔ اس کے تعلقات جہاں تاجروں سے تھے، وہیں حکومتی عہدے دار بھی اس کا دم بھرتے تھے۔ یوں تو وہ طویل عرصے سے بندقداری کا دوست تھا مگر کبھی ایسی نوبت نہیں آئی کہ تعلقات مستحکم کیے جا سکتے۔ علی بن الورقہ دو سال قبل سے بندقداری کے زیادہ قریب ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ بندقداری نہیں محمود تھا۔ سفید فام محمود کو دیکھ کر اسے یہ خیال بری طرح ستاتا تھا کہ وہ بھی ایسے کسی سفید فام غلام کا مالک کیوں نہیں۔ اس کے علاوہ وہ اس کی صلاحیتوں کو دیکھ کر رشک کیا کرتا۔ اس کے دل میں یہ خواہش ایک عرصے سے پنپ رہی تھی کہ بندقداری محمود کو اس کے ہاتھوں بیچ دے مگر بندقداری محمود کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتا تھا۔

ایک دن علی بن الورقہ صبح سویرے بندقداری کے پاس چلا آیا۔ بندقداری نے نہایت خوش دلی سے اسے خوش آمدید کہا۔ دونوں نے نشستیں سنبھال لیں تو علی بن الورقہ نے محمود کے بارے میں پوچھا۔

''تمہارا غلام نہیں دکھائی دے رہا''۔

''وہ جامع مسجد گیا ہوا ہے۔ نماز سے فراغت کے بعد اسے واپسی پر کھانے کے لئے کچھ اشیاء لانی تھیں''۔

''بندقداری!'' علی بن الورقہ توقف سے بولا۔ ''تم اب ماشاءاللہ تندرست ہو چکے ہو میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنے کاروبار کی جانب توجہ مبذول کرنا چاہئے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم خاصے مقروض بھی ہو چکے ہو''۔

''بس یہ تقدیر کا ہیر پھیر ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ اس بار روئی کی تجارت کروں سردی کا موسم آنے والا ہے۔ ان دنوں مصر میں روئی کی خاصی مقدار کھپ جاتی ہے''۔ بندقداری نے کہا۔

''مگر روئی تو خاصی مہنگی جا رہی ہے۔ تم ایسا کرو کہ اپنا سابقہ کام یعنی ریشم کی ڈوری والی کمانیں لے جاؤ۔ اس کام میں تمہیں تجربہ بھی ہے اور مجھے امید ہے کہ تم کامیاب بھی رہو گے''۔

''نہیں!'' بندقداری نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''یہ موسم ریشم کی ڈوری والی کمانوں کا نہیں ہے۔ ایسے میں صرف روئی ہی صحیح رہے گی''۔

''مگر تم روئی کے لئے رقم کہاں سے لاؤ گے۔ جب کہ تم پہلے ہی مقروض ہو''۔ علی بن الورقہ نے استفسار بھرے لہجے میں کہا۔

''تم فکر مت کرو! اللہ بڑا مہربان ہے۔ میں نے دو ایک تاجروں سے بات چیت کی ہے مجھے امید ہے کہ وہ مجھے کچھ عرصے کے لئے مال ادھار دیدیں گے''۔ بندقداری نے جواب دیا۔

''بندقداری!'' علی بن الورقہ نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''تم تو اچھی طرح جانتے ہو کہ میں بڑا صاف گو انسان ہوں۔ جو بات دل میں ہوتی ہے وہ کہہ دیا کرتا ہوں۔ یہ بھی تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں دینے

تو کسی کے کام نہیں آتا مگر جانے کیا بات ہے کہ میرا دل کہتا ہے تمہیں اس کڑے وقت میں سے کسی طرح نکال لوں''۔

''ابن الورقہ!'' بندقداری اس کی بات سن کر مسکرایا۔ ''میں تمہارے اس جذبے کی دلی طور پر قدر کرتا ہوں اور شکر گذار ہوں۔ تمہاری حوصلہ افزائی ہی میرے لئے کافی ہے''۔

''تمہاری یہی عادت تو میرے دل کو تڑپا کر رکھ دیتی ہے۔ تم ایسا کرو کہ مجھ سے کچھ رقم بطور قرض لے لو اور روئی نقد قیمت میں خرید لو۔ میرا خیال ہے کہ ادھار کی نسبت نقد خریداری میں تم فائدے میں رہو گے''۔ علی بن الورقہ نے پیشکش کی۔

''اس میں تمہارا کیا مفاد ہو گا؟''

''دیکھو! اب دل جلانے والی باتیں مت کرو۔ میں تمہیں یہ رقم بطور قرض دے رہا ہوں نا کہ کسی مفاد کے تحت''۔ علی بن الورقہ مصنوعی غصے سے بولا۔

''دیکھو ابن الورقہ!'' بندقداری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں پہلے ہی مقروض ہوں، تجارت میں قرض لے لینا کوئی بری بات نہیں ہے مگر دوست واحباب سے قرض لینا تعلقات کو ضائع کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ میں تمہارے نیک جذبات کی بے حد قدر کرتا ہوں مگر تم سے قرض لینے کے لئے معذرت خواہ ہوں''۔

''برادر!'' علی بن الورقہ تیزی سے بولا۔ ''اس میں کوئی شک نہیں قرض سے اچھی بھلی دوستی تباہ ہو جاتی ہے مگر یہ صرف اسی صورت میں ہوتا ہے جب قرض دار قرض لوٹانے کی نیت ہی نہ رکھتا ہو۔ میں تمہیں اچھی طرح سے جانتا ہوں''۔

''مگر میں دوستوں سے قرض نہیں لینا چاہتا''۔

''یہ اپنائیت والی باتیں نہیں ہیں بلکہ میرے خیال میں تم بے کار میں ضد پر تلے ہو''۔

علی بن الورقہ نے ایک پوٹلی اس کی جانب بڑھا دی۔ بندقداری نے حیرت بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''تمہیں نئے سرے سے منظم کرنے کے لئے یہ ایک دوست کی جانب سے پانچ سو دینار سرخ کا چھوٹا سا قرض نما تحفہ ہے۔ تم ان کی مدد سے اس مقام کو واپس پا سکو گے جو تم حادثاتی طور پر کھو چکے ہو''۔ علی بن الورقہ کے آنکھوں میں خلوص اتر آیا۔

''مگ......مگر......!!!''

''اب تم ایک لفظ بھی نہیں بولو گے''۔ علی بن الورقہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''تم جو چاہتے ہو...... وہ میں نہیں چاہتا۔ پھر بھی تمہاری ضد ہے کہ میں تم سے قرض لوں تو یہ صرف ایک ہی صورت میں ہو سکتا ہے کہ تم میرے اس کاروبار میں ساجھے دار بن جاؤ۔ نفع کی صورت میں مجھے جو کچھ ملے گا وہ تمہیں نصف لینا ہو گا''۔

''میں نے تمہیں اس نیت سے قرض نہیں دیا کہ میں نفع کی صورت میں اس میں سے حصہ لوں''۔

''یہ میرا آخری فیصلہ ہے دوسری صورت میں میں تم سے قرض لینے سے قاصر ہوں''۔ بندقداری اڑ گیا۔ علی بن الورقہ خاموش ہو گیا۔

''چلو ٹھیک ہے اگر تم ایسا چاہتے ہو تو ایسے ہی سہی''۔ علی بن الورقہ نے ہتھیار ڈال دیے۔

ان دونوں میں کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اس کے بعد علی بن الورقہ نے اجازت لی اور واپس

لوٹ گیا۔ بندقداری کو جانے کیوں نہیں یقین آرہا تھا کہ علی بن الورقہ نے یہ قرض اسے پرخلوص نیت سے ہی دیا ہے۔ اس نے اس ضمن میں مزید سوچنا نامناسب سمجھا اور اسی دن دمشق کے روئی کے تاجروں سے ملاقات کر کے خاصا مال جمع کرلیا۔ دو تین ہفتے تیاری میں گذر گئے۔ نصف مال کی قیمت ادا کی گئی تھی جبکہ نصف مال کے واجبات اس کے ذمے باقی تھے۔ پانچویں ہفتے اس نے رخت سفر باندھا۔ بندقداری کی امارت میں ایک چھوٹا سا قافلہ مصر کی جانب روانہ ہوگیا۔



1097ء میں بیزنطینی (قسطنطنیہ) شہنشاہ الیکسیس کومنیس کی درخواست پر پوپ اربن ثانی نے کلرموں (جنوبی فرانس) کے مقام پر شعلہ بیان خطبہ دیا جس کا موضوع مسلمانوں سے ارض مقدس کو چھڑانا تھا۔ موسم بہار تک ڈیڑھ لاکھ کے قریب مسیحوں نے اس خطبے کی تکمیل میں قدم اُٹھایا۔ انہوں نے صلیب کو اپنا نشان منتخب کیا جو کہ بعد میں ان کی پہچان بن گیا۔ ان کی تمام لڑائیوں کا سلسلہ صلیبی جنگوں سے معروف ہوا۔ انہوں نے قسطنطنیہ سے آبنائے کو عبور کیا اور نبقیہ پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد دوری لائم فتح کیا گیا۔ کوہستان طارس سے گذر کر یہ لوگ عرب علاقوں میں داخل ہوگئے، یہاں ان کے درمیان کشمکش کا آغاز ہوگیا۔ ہر رہنما اپنی بات منوانے پر بضد تھا۔ ''لوتھارنجیا کے بالڈون'' نے ایک صلیبی گروہ کی قیادت سنبھالی اور صلیبیوں کو لے کر مشرقی جانب سے الرہا کا قصد کیا۔ 1098ء میں یہاں قبضہ کرلیا گیا اور یوں پہلی لاطینی سلطنت کی بنیاد رکھ دی گئی۔ یہی بالڈون آگے چل کر بہ لقب بالڈون اوّل یروشلم کا دوسرا بادشاہ بنا۔ صلیبیوں کا دوسرا گروہ ایک نارمن سپہ سالار ٹینکرڈ کی سرکردگی میں مغربی جانب سے مڑ کر سیلشیا میں داخل ہوگیا۔ وہ طرطوس اور گردونواح کے علاقے روندتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ اسے انطاکیہ کے پاس ایک مسلمان سلجوقی امیر یاغی سیان کے سامنے ٹھہرنا پڑا۔ سلجوقی امیر کو مزید کمک نہ ملنے پر وہ زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر پایا اور اپنوں کی غداری سے یہ شہر صلیبیوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہاں کی آبادی کو تہ تیغ کر دیا گیا اور شہر کو نذر آتش کر دیا گیا۔

صلیبی فوج کا ایک حصہ کاؤنٹ ریماں (سینٹ جلز ابی صنجیل) کی زیر قیادت وادی عاصی کے راستے آگے بڑھا۔ یہ صلیبی جنگجوؤں کا دولت مند اور ممتاز سالار تھا اس کا تعلق پروونیس (فرانس) سے تھا۔ اس نے جنوب کی سمت پیش قدمی کی اور معرۃ النعمان نامی شہر کو نذر آتش کر دیا۔ یہ ابو العلاء معری (متوفی 1057ء) کا وطن تھا جو کہ ایک مایہ ناز نابینا شاعر تھے۔ اس نے حصن الاکراد پر قبضہ کرلیا اور کچھ آگے چل کر ایک وسیع میدانی علاقے میں ایک نئی صلیبی آبادی قائم کی جو کہ دریائے عاصی کے کنارے واقع تھا۔ اس نئے شہر کا نام کریک دا شولیز رکھا گیا۔ یہاں ایک مسیحی روایت کے تحت تاریخی گرجے الناصرہ کی تعمیر کی گئی جو بعد میں صلیبی جنگجوؤں کی قیام گاہ بن کر رہ گیا۔ عربوں میں یہ شہر الکرک کے نام سے مشہور ہوا۔ یہاں مضبوط صلیبی قلعے کی تعمیر کی گئی۔ بعد میں الناصرہ کو مقدس مسیحی ہستی سے منسوب کر کے اس کی قدر و منزلت مزید بڑھادی گئی۔

ان صلیبیوں کی کارستانیاں بڑھتی چلی گئیں۔ الرہا (ایڈیسہ) انطاکیہ اور یروشلم کے بعد عکہ، صور طرابلس الشام اور بہت سے دوسرے شہر چھین لئے گئے۔ وہاں قتل وغارت اور لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا گیا۔ عباسی اور فاطمی خلافتیں موجود ہونے کے باوجود کچھ نہ کرسکیں۔ ان خلافتوں میں اب پہلے جیسا دم خم باقی نہ تھا۔ فلسطین، شام اور لبنان کے مسلمانوں پر بڑا نازک وقت آن پڑا تھا، وہ کئی برسوں تک مسیحی وحشیانہ مظالم کی چکی میں پستے رہے۔ آخر غیرت حق کو حرکت ہوئی اور ایک چھوٹے سے مسلمان حکمران کو ان کے مقابلے پر لا کھڑا کیا۔ یہ مجاہد حلب اور موصل کا حکمران عماد الدین زنگی تھا۔ اس نے صلیبیوں کو پے در پے شکستیں دے کر بہت سے شہر اور علاقے واپس لے

لئے لیکن وہ اپنے مقصد کو جاری نہ رکھ سکا اور 541ھ (1146ء) کو ایک بدبخت غلام نے اس کا چراغ حیات گل کر دیا۔ قدرت کو اس مقصد کا خاتمہ منظور نہ تھا اس کی جگہ اس کا فرزند نور الدین زنگی منتخب ہوا، اور اس نے باپ کے کام کو جاری رکھا۔ صلیبی جہاں عماد الدین کی موت پر خوش تھے وہیں ان کی خوشیاں ایک بار پھر ماند پڑ گئیں۔ نور الدین زنگی کی شدید خواہش تھی کہ وہ بیت المقدس کو ان وحشی اقوام سے آزاد کروالے مگر وہ 569ھ (1173ء) کو یہ تمنا دل میں لئے دنیائے فانی سے کوچ کر گیا۔ اس کے مشن کو اس کے بھتیجے صلاح الدین ایوبی نے جاری رکھا اور بیت المقدس صلیبیوں سے چھین لیا۔ نوے برس بعد یہ علاقہ مسلمانوں کے پاس واپس لوٹ آیا تھا۔

صلاح الدین ایوبی کی وفات کے بعد اس کے جانشین خانہ جنگی کا شکار ہوگئے۔ صلیبیوں کے حوصلے دوبارہ بلند ہوئے۔ 1195ء میں انہوں نے چوتھی صلیبی جنگ کا طبل بجادیا۔ صلاح الدین ایوبی کے سب بیٹے ان دنوں آپس میں اقتدار کی جنگ میں مصروف تھے۔ یہ صلیبیوں کے لئے سنہرا موقعہ تھا انہوں نے بیروت کی طرف سے پیش قدمی کی۔ صلاح الدین ایوبی کے چچا ملک العادل والی الکرک کو حالات کی نزاکت کا بھرپور احساس تھا، اس نے تیزی سے پیش قدمی کی اور صلیبی افواج کو بیروت کے پاس روک دیا۔ دونوں لشکروں میں جنگی جھڑپیں جاری رہیں مگر وہ آگے بڑھنے سے معذور رہے۔ بالآخر انہوں نے مجبور ہو کر مسلمانوں سے صلح کر لی۔

601ھ (1203ء) میں پاپائے روم اینوسینٹ ثالث کی دعوت پر اہل یورپ نے پانچویں صلیبی جنگ کا ارادہ کیا۔ مگر وہ فلسطین میں داخل ہونے کے بجائے قسطنطنیہ میں گھس کر اپنی ہم مذہب بازنطینی مملکت کو تاخت وتاراج کر کے واپس لوٹ گئے۔

613ھ (1215ء) میں صلیبیوں نے چھٹی جنگ کے لئے تیاریاں شروع کیں اور مصر کے راستے مملکت اسلامی میں داخل ہوئے۔ ملک العادل ان دنوں شام میں تھا۔ صلیبی لشکر نے دمیاط کا محاصرہ کیا۔ ملک العادل نے بڑے لشکر کے ساتھ مصر کی راہ لی مگر راستے میں ہی اسے پیغام اجل آپہنچا اور وہ 7 جمادی الاوّل 615ھ (1218ء) میں عالم فانی سے عالم بقا کو سدھار گیا۔ اس کے مقصد جہاد کو اس کے فرزند ناصر الدین محمد ملک الکامل نے اپنے بھائی ملک المعظم کے ساتھ مل کر پورا کیا۔ انہوں نے صلیبیوں کو اس وقت گھیر لیا جب وہ دمیاط کو تاخت وتاراج کرنے کے بعد قاہرہ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ انہیں دریائے نیل کا بند توڑ کر گہرے پانی میں پھنسا دیا گیا۔ مجبوراً انہوں نے صلح کی درخواست کی اور یوں چھٹی صلیبی جنگ ختم ہوگئی۔ اس جنگ کے ختم ہونے کے فوراً بعد ملک الکامل کی اپنے بھائی ملک المعظم سے ناچاقی پیدا ہوگئی۔ اس موقع پر ملک الکامل نے بڑی ناعاقبت اندیشی سے کام لیا اور فریڈرک ثانی حکمران جرمنی وصقلیہ سے نامہ و پیام کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس کا مقصد فریڈرک کو شام میں آنے کی دعوت دینا تھی۔

فریڈرک 629ھ (1231ء) کو شام پہنچا۔ ملک الکامل نے اس سے ملک المعظم کے خلاف تحفظ طلب کیا اور ایک معاہدہ تیار کیا گیا جس میں دس سال چھ ماہ اور دس دن کی حکومت کے لئے اس شرط پر دوستانہ معاہدہ کیا گیا کہ بیت المقدس، بیت اللحم اور ناصرہ کے علاوہ یافا اور عکہ کے درمیان جتنے شہر ہیں سب اس کے حوالے کر دیئے جائیں۔ اس ناپاک معاہدے نے صلیبیوں کی دیرینہ خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچادیا۔ جس ارض مقدس کی خاطر ہزاروں مسلمانوں نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے تھے، فریڈرک ثانی خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر اس میں داخل ہوگیا تھا۔ اس عظیم سانحہ سے عالم اسلام میں قیامت برپا ہوگئی۔ رنج وغم کے ماتمی جلوس نکالے گئے۔ مسجدوں میں اذانیں موقوف کر دی گئیں۔ مسلمان شاہ یروشلم فریڈرک ثانی کے ظلم وستم کی چکی میں مسلسل

پس رہے تھے۔ صلیبی ایک ایک کر کے کئی شہروں کو نگل گئے ۔ معاہدے کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی گئیں۔

ارض مقدس کے جنوب میں الکرک نامی قلعہ واقع تھا۔ مصر سے حجاز اور دمشق جانے والے راستے اسی مقام کے قریب تھے ۔ یہ ایک مستحکم قلعہ تھا۔ یہاں بدخصلت صلیبی قابض تھے جن کا پیشہ مسلم آزاری، قتل و غارت اور قافلوں کو لوٹنا تھا۔ حجاج کا کوئی قافلہ جونہی ادھر سے گذرتا تو شریرالنفس صلیبی ان پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑتے اور ان کے مال و اسباب لوٹ لیتے ۔ حجاج کو قتل کرنا دینی فریضہ خیال کیا جاتا تھا۔

634ھ (1237ء) میں حماۃ کے تاجر بندقداری کا قافلہ مصر سے واپس لوٹ رہا تھا۔ بندقداری نے خلاف توقع زیادہ نفع کمایا۔ وہ بے حد مسرور لوٹ رہا تھا۔ اس نے اپنے نفع کو دوچند کرنے کے لئے قاہرہ سے بھاری مقدار میں شکر خریدی۔ وہ دمشق اور حماۃ میں شکر کی مانگ سے باخبر تھا۔ یہ کوئی پہلی بار نہیں تھی کہ اسے کسی نئے تجربے سے گذرنا پڑتا ۔ وہ ہمیشہ قاہرہ سے شکر ہی خریدتا تھا۔ وہ اس خیال سے محظوظ ہو رہا تھا کہ قدرت نے اسے جس مقام سے زمین پر لا کھڑا کیا تھا وہ اب اس سے دور نہیں ہے۔ وہ جب حماۃ پہنچے گا تو مال و متاع کے ساتھ ساتھ اعلیٰ طبقات میں اسے پہلے سا مقام دوبارہ مل جائے گا۔ مگر یہ قدرت کو منظور نہیں تھا۔ الکرک کے پاس پہنچتے ہی قلعے کے صلیبیوں نے اس کے قافلے پر ہلہ بول دیا۔ وہ اس ناگہانی آفت کے لئے ذرہ بھی تیار نہیں تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس سے قبل کبھی اس کے قافلے پر اس مقام پر کوئی حملہ ہوا ہو۔ البتہ ریگستانی علاقوں میں لٹیروں کے حملوں سے وہ اچھی طرح آگاہ تھا۔ صلیبی لوگوں نے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے قافلے کو تہ تیغ کر ڈالا۔ محمود بھی اس کے ہمراہ تھا۔ اس کی عمر اس وقت صرف چودہ برس تھی۔ اس نے اپنے آقا پر ٹوٹنے والے پہاڑ کی نزاکت کو سمجھ لیا تھا اسی لئے اس نے اپنے آقا کے عربی گھوڑے پر چھلانگ لگا کر اس کی باگیں اپنے ہاتھوں میں تھام لیں۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ان وحشی لٹیروں کی گرفت سے نکل کھڑا ہوا۔ صلیبی کسی بھی شخص کو وہاں سے زندہ بچ نکلنے کا موقع نہیں دیتے تھے ۔ بندقداری کے تو ہاتھ پاؤں پھول چکے تھے، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس موقعہ پر کیا کرے ۔ ایک طرف تو اس کی ساری محنت لٹ گئی تھی تو دوسری طرف اس کی جان جانے کا خوف بھی لاحق تھا۔ ایسے میں محمود کی ہوش مندی اس کے کام آئی۔ وہ دونوں صلیبیوں کی تیروں کے بارش میں سے بچتے بچاتے اس منحوس مقام سے نکل آئے ۔ بندقداری کو دو تیر دائیں ران میں لگے وہ زخمی حالت میں وہاں سے نکل آیا۔ صلیبیوں نے جب شکر کے ذخیرے دیکھے تو انہوں نے ان دونوں کا تعاقب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ محمود اپنے حواس باختہ، زخمی اور مایوس آقا کو لے کر کسی نہ کسی طریقے سے دمشق آ پہنچا۔ سلطان دمشق اسمٰعیل ایوبی کے دربار کا در کھٹکھٹایا گیا مگر وہ اندرونی ریشہ دوانیوں کا شکار تھا۔ فریادرسی نہ ہونے پر وہ دونوں مایوسی کے عالم میں حماۃ واپس لوٹ آئے ۔ اس جان گسل واقعہ نے بندقداری کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی ۔ محمود کو اپنے آقا کی تکلیف کا شدید احساس تھا مگر وہ اپنے مالک کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس کی دلجوئی کرتا رہا، ہمت بندھاتا رہا...... مگر بندقداری میں پہلے جیسا جذبہ جگانے میں ناکام رہا۔ وہ حماۃ میں آ کر گھر بندی بن کر رہ گیا تھا۔ شرم کے مارے وہ باہر بھی نہیں نکلتا تھا کہ مقامی تاجر قرض کے لئے اس کی بے عزتی ہی نا کر ڈالیں۔ شریف آدمی کے پاس صرف ایک عزت ہی تو ہوتی ہے اگر وہ بھی داؤ پر لگ جائے تو وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ بندقداری کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ محمود بھی اپنے آقا کی اس حالت پر غمگین دپریشان تھا۔ محمود سارا دن مقامی منڈیوں میں محنت مشقت کرتا اور اپنے آقا کے لئے دو وقت کی روٹی اور دوا کا بندوبست کرتا۔

بندقداری کی واپسی کی خبر کسی نہ کسی طرح علی بن الورقہ تک پہنچ گئی۔ اسے بڑی حیرت ہوئی کہ بندقداری واپس لوٹ آیا ہے مگر اپنی آمد سے اسے مطلع کرنا گوارا نہیں سمجھا۔ اسی شام وہ اطلاع کی صداقت

پرکھنے کے لئے بندقداری کے گھر پہنچا۔ جب اس نے بندقداری کی خستہ حالت دیکھی تو ایک لمحے کے لئے اسے اپنی بصارت پر یقین نہیں آیا۔ بندقداری اسے دیکھتے ہی آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکا۔ علی بن الورقہ نے اس کی ڈھارس بندھائی اور ماجرا پوچھا۔ بندقداری نے سسکیوں میں قدرت کے مذاق کا حال اس کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ الکرک کے قلعے کے باہر جو کچھ اس کے ساتھ بیتا، وہ سن کر ایک لمحے کے لئے علی بن الورقہ بھی دہل کر رہ گیا۔ اسی دوران محمود بھی دن بھر کی مشقت سے لوٹ آیا۔ اس نے آتے ہی سلام دعا کی اور پھر اپنے آقا کو اٹھا کر اس کا منہ ہاتھ دھلایا۔ اسے بستر پر بٹھا کر اس نے پہلے کھانا کھلایا جو وہ بازار سے لایا تھا۔ بعدازاں اس نے دوا پلائی اور تکیہ جھاڑ کر اپنے آقا کو واپس لٹا دیا۔ علی بن الورقہ یہ خدمت دیکھ کر خاصا متاثر ہوا۔ بندقداری کی نقاہت دن بدن بڑھ رہی تھی۔ ٹانگ کا زخم بھرنے کے بجائے بگڑ چکا تھا۔ طبیب نے بھی اسے دیکھنے کے بعد دعا کا مشورہ دیا تھا۔ بندقداری موت کی دہلیز تک پہنچ چکا تھا۔ علی بن الورقہ نے باتوں سے اس کی ڈھارس بندھائی اور اگلی صبح آنے کا کہہ کر رخصت ہو گیا۔ دو دن گذر گئے مگر کوئی بندقداری کے پاس نہ آیا۔ محمود اپنے آقا کی خدمت میں پوری تندہی سے جتا رہا۔ تیسرے دن علی بن الورقہ اچانک صبح ہی سویرے آن وارد ہوا۔ اس دن بندقداری کی طبیعت زیادہ خراب تھی۔ بندقداری کو اس کے آنے سے کچھ سکون سا نصیب ہوا۔ علی بن الورقہ نے پہلے حال احوال پوچھا بعد میں آنے کے مقصد کی جانب متوجہ ہوا۔

''بندقداری!'' علی بن الورقہ مسکین صورت بنا کر بولا۔ ''بات موقع مناسبت سے ہی بجتی ہے مگر کیا کروں؟ مجبوری ہے بات بے وقت چھیڑنا پڑ رہی ہے''۔

''ابن الورقہ!'' بندقداری نے ایک لمحہ اس کی جانب حیرت سے دیکھا پھر گویا ہوا۔

''کھل کر بولو۔ میں تمہاری بات سمجھا نہیں''۔

''بندقداری!'' علی بن الورقہ لفظوں کو ترتیب دینے لگا۔ ''زندگی اور موت تو بے شک اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہی ہے، میں چاہوں گا کہ اللہ تمہیں شفا کاملہ نصیب فرمائے مگر تمہاری حالت دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ تم اب چند دنوں کے ہی مہمان ہو لہٰذا میں یہ بھی نہیں چاہوں گا کہ تم مقروض ہو کر دربار الٰہی میں جاؤ۔ اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ تم جلد از جلد میرا قرض چکا دو''۔

''ابن الورقہ!'' بندقداری لیٹے لیٹے مرغ بسمل کی طرح تڑپ اٹھا۔ ''یہ کیسی اغیاری باتیں کر رہے ہو؟ میری حالت تمہارے سامنے ہے ایسی حالت میں میں تمہیں ایک کھوٹی پائی بھی نہیں دے سکتا اور تم مجھ سے اپنے پانچ سو دینار طلب کر رہے ہو...... تم کیسے دوست ہو؟ کیسے مہربان ہو؟''

محمود جو ابھی ابھی نماز کی ادائیگی سے واپس آیا تھا اس کے کانوں میں بھی علی بن الورقہ کی بات کی بھنک پڑ گئی تھی۔ وہ بھی حیرت و پریشانی میں اندر چلا آیا۔

''امیر محترم!'' محمود خاموش نہ رہ سکا۔ ''آپ میرے آقا کی زبوں حالی سے بخوبی واقف ہیں پھر آپ اصرار کر رہے ہیں......''

''دیکھو لڑکے!'' علی بن الورقہ کا لہجہ یکدم بگڑ سا گیا۔ ''تم محض ایک غلام ہو، تمہیں کوئی حق نہیں کہ تم ہماری بات میں دخل اندازی کرو''۔

''محمود! تم چپ رہو''۔ بندقداری نحیف سی آواز میں بولا۔ ''ابن الورقہ اب تم ہی بتاؤ کہ میں تمہارا قرض کس طرح ادا کر سکتا ہوں۔ میرے پاس اب کچھ بھی نہیں بچا''۔

''اس مکان کو فروخت کر ڈالو''۔

''تم صحیح کہتے ہو کہ اپنے سر چھپانے کی جگہ فروخت کر کے خود دربدر دھکے کھاؤں۔ میں تمہاری اس بات کو یقیناً پورا کر دیتا مگر میں مجبور ہوں کیونکہ یہ گھر میں نے روئی کے سوداگروں کے ہاں پہلے ہی رہن رکھ دیا تھا جب میں نے ان سے مال اُٹھایا تھا۔ اس معاہدے کی دستاویز ان لوگوں کے پاس موجود ہے۔ میں یہ مکان کسی صورت میں بھی بیچ نہیں سکتا''۔

''کیا تم یہ چاہتے ہو؟ میں تمہیں اس بُری حالت میں قاضی کے پاس کھینچوں۔ میں اسی وقت اپنے قرض کی بازیابی چاہتا ہوں۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تم مرتے ہو یا زندہ بچتے ہو''۔ علی بن الورقہ غصیلے انداز میں بولا۔ وہ کمینگی کی تمام حدیں پار کرتا جا رہا تھا۔ بندقداری کے لئے یہ مقام ڈوب مرنے کے مترادف تھا۔ وہ اس وقت کو کوس رہا تھا جب اس نے اس سے رقم پکڑی تھی۔

''دیکھو ابن الورقہ!'' بندقداری سنجیدگی سے بولا۔ ''تم میرے کاروبار میں میرے حصے دار تھے اگر نفع ہوتا تو تم برابر کے حصہ کے مالک بنتے۔ اب نقصان ہو چکا ہے لہٰذا اصول کے تحت تمہیں بھی نقصان کا ساجھے دار بننا چاہئے۔ اگر یہ معاملہ قاضی کے پاس لے جانا چاہتے ہو تو مجھے کوئی خوف نہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ فیصلہ میرے حق میں ہوگا''۔ بندقداری اب منت سماجت نہیں کرنا چاہتا تھا

''بندقداری! یہ تو صریحاً بے ایمانی ہے۔ میں نے تمہارے ساتھ کوئی ایسا معاہدہ نہیں کیا تھا کہ میں تمہارے کاروبار میں حصہ دار ہوں۔ میں نے تو تمہیں رقم بطور قرض دی تھی۔ اگر تم قاضی کی بات کرتے ہو تو تم ہی جھوٹے پڑ جاؤ گے کیونکہ کاروبار زبانی نہیں ہوا کرتے ان کے لئے باقاعدہ تحریریں لکھی جاتی ہیں۔ کیا تمہارے پاس ایسی کوئی تحریر موجود ہے''۔

بندقداری اس کی بات سے مزید پریشان ہو گیا۔ اسے کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا کیونکہ اُس کی دلیل میں وزن تھا۔ زبانی کاروبار کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اگر وہ ضد بھی کرتا تو معاملہ قرآن پر چھوڑ دیا جاتا...... قرآن ..... یہ خیال آتے ہی وہ لرز اُٹھا۔ وہ اپنے کاروبار میں کبھی کتاب اللہ کو نہیں لایا تھا۔ مرنے سے پہلے وہ ایسی کوئی حرکت کرنا نہیں چاہتا تھا جس سے روزِ محشر اس کا دامن داغ دار ہو جاتا۔ وہ اپنے خیالوں کی بھول بھلیوں میں گم تھا کہ اسے علی بن الورقہ کی آواز نے چونکا دیا۔

''جلدی جلدی کرو بندقداری! مجھے اور بھی کام نبٹانا ہیں۔ میں آج یہاں سے قرض لے کر ہی جاؤں گا''۔

''اب تم خود ہی بتا ڈالو کہ تمہاری نظر میں میری کونسی چیز ایسی ہے جس کے عوض میں تمہارے قرض سے نجات پا سکوں گا''۔

بندقداری روہانسا ہو کر بولا۔

''بہت خوب!'' علی بن الورقہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ''اب یہ بھی میں طے کروں کہ تم میرا قرض کیسے لوٹاؤ گے۔ میں کچھ نہیں جانتا سیدھی طرح میری رقم لوٹا دو......''

''امیر محترم!'' محمود سے چپ نہ رہا جا سکا۔ ''آپ خوف خدا کھائیں، میرے آقا اس حالت میں نہیں ہیں کہ وہ آپ کا قرض اسی وقت لوٹا سکیں۔ انہیں کچھ مہلت دیں...... اللہ نے چاہا کوئی نہ کوئی سلسلہ بن ہی جائے

''غلام! تم حد سے مت بڑھو۔ تمہارا آقا میرا قرض دار ہے اور یہ اس وقت موت کے بستر پر لیٹا ہوا ہے۔ کسی بھی وقت اس کا دم نکل جائے گا تو پھر میری رقم کا کون ذمہ دار ہوگا؟''

علی بن الورقہ نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

''محترم امیر!'' محمود توقف سے بولا۔ ''اللہ میرے آقا کو شفاء بخشے گا۔ خدانخواستہ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میں آپ کی رقم لوٹانے کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ جیسے بھی ہوا، میں آپ کی ایک ایک پائی لوٹا دوں گا''۔

''غلام زادے!'' علی بن الورقہ آنکھیں گھما کر بولا۔ ''تم دن بھر کی مشقت کے بعد صرف چند درہم کما سکو گے، میری رقم پانچ سو دینار سرخ ہیں۔ اگر تم چاہو بھی تو میری رقم لوٹانے کے لئے تمہیں کئی برس بیت جائیں گے''۔

''امیر محترم!'' محمود ٹھوس لہجے میں گویا ہوا۔

''آپ پانچ سو دینار کی بات کرتے ہیں اگر انسان ہمت اور مدد الٰہی کو اپنے دامن سے باندھ لے تو وہ دیناروں کے پہاڑ کو بھی ہلا دیتا ہے''

''زیادہ باتیں کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ زیادہ بہتر ہوگا کہ تم میرے منہ نہ لگو''۔ علی بن الورقہ نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ محمود خاموش ہو گیا۔ اس کی باتوں نے بندقداری کی ڈھارس بندھا دی تھی۔ وہ واقعی آج اسے اپنے سگے بیٹے کی مانند دکھائی دیا تھا۔ وہ اپنی حالت زار کو دیکھ کر رو دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کیسے کڑے وقت میں ایسے ہونہار غلام نما فرزند سے نوازا جب وہ اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اگر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں تو اس کے ذمے قرض کی ادائیگی کی صورت میں نہ جانے اسے ابھی کتنے دھکے کھانا پڑیں گے۔

''ابن الورقہ!'' بندقداری اپنے آنسو پونچھتا ہوا بولا۔ ''کیا تمہارے دل میں رتی بھر بھی خوف خدا نہیں۔ تم کیسے خود غرض اور دولت کے پجاری بن گئے ہو کہ تمہیں ایک بیمار اور معذور شخص کی مجبوری دکھائی نہیں دے رہی''۔

''بندقداری!'' علی بن الورقہ منہ بسور کر بولا۔ ''سیدھی طرح میری رقم نکالو۔ مجھے نصیحت کرنے یا میرے کردار پر کیچڑ اچھالنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تمہیں اس لئے قرض نہیں دیا تھا کہ تم آنے والے وقت میں مجھے طعنے دو۔ جہاں تک رہا خوف خدا...... تو میں نے قرض تمہیں اسی جذبے کے تحت دیا تھا''۔

''تو اب وہ جذبہ کہاں گیا ہے''۔

''بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ ورنہ میں تمہیں.....'' علی بن الورقہ دانت پیس کر رہ گیا۔

''ورنہ کیا.....؟''

''ایک تو میری رقم واپس نہیں کر رہے اوپر سے باتیں بناتے ہو''۔ علی بن الورقہ چیخا۔

''امیر محترم!'' محمود کے لہجے میں کڑواہٹ ابھر آئی۔ ''انسانیت کا راستہ اختیار کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ براہ کرم آپ میرے آقا کو پریشان کرنے کے بجائے انہیں کچھ مہلت عطا فرمائیں کہ وہ آپ کے قرض کے بارے میں کچھ کر سکیں''۔

''اونہہ! کچھ کر سکیں!'' علی بن الورقہ کی آواز میں خنجر کی سی کاٹ تھی۔ ''بھلا یہ لنگڑا کیا انتظام کرے گا۔ بچ جائے گا تو ساری زندگی بستر پر معذور پڑا رہے گا۔ میں کس کے بھروسے پر اسے مہلت دوں''۔

''آپ حد سے گذر رہے ہیں!'' محمود کی آواز فرط جوش سے کانپ رہی تھی۔

''نہیں نہیں محمود! تم خاموش رہو''۔ بندقداری کراہتے ہوئے بولا۔ ''ابن الورقہ اتنے کٹھور مت بنو۔ کچھ تو عقل سے کام لو''۔

''اور کیا اب تک میں جھک مارتا دکھائی دے رہا ہوں۔ عقل ہی سے کام لے رہا ہوں تو ہی اسی وقت

قرض کی واپسی چاہتا ہوں''۔

''میں کیا کروں؟ خود کو بیچ ڈالوں''۔ بندقداری جھنجلا اُٹھا۔

''تم ایسا کرو کہ......'' علی بن الورقہ کچھ سوچنے لگا پھر توقف سے بولا۔ ''تم اپنا یہ غلام مجھے بیچ ڈالو۔ حالانکہ یہ پانچ سو دینار سرخ کا نہیں ہے مگر میں اسے غنیمت سمجھوں گا''۔

''علی بن الورقہ!'' بندقداری خود پر قابو نہ رکھ پایا اور غصے سے بستر پر سے اُٹھا۔ محمود تیزی سے آگے بڑھا اور اپنے بپھرے ہوئے آقا کو تھاما۔ اگر وہ بروقت نہ پہنچتا تو بندقداری فرط جوش میں زمین پر جا گرتا۔

''تم مجھ سے میرا آخری سہارا بھی چھیننا چاہتے ہو۔ یہ میرا غلام نہیں بیٹا ہے۔ میرے آخری لمحوں کی امید ہے۔ اسی کے بل بوتے پر میں شاید کچھ دن زندہ رہ جاؤں...... یا شاید دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو جاؤں''۔

''میں کچھ نہیں جانتا۔ قرض لوٹانے کے لئے تمہارے پاس یہی آخری پونجی بچی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اسے بھی کوئی دوسرا لے اُڑے۔ آج تمہیں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ تم قرض کی حالت میں مرنا پسند کرو گے یا پھر اپنا قرض ادا کرکے''۔ علی بن الورقہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

''کچھ تو میری حالت پر رحم کھاؤ...... کم از کم اسے اتنے عرصے تک تو نہ لے جاؤ جب تک میں زندہ ہوں میری موت کے بعد بے شک اسے تم قرض کی ادائیگی سمجھ کر رکھ لینا''۔

''بندقداری! میں کسی طرح کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ میں آج ہی قرض کی ادائیگی چاہتا ہوں۔ بھلا کل کس نے دیکھی ہے؟''

''معزز آقا!'' محمود کی آنکھیں بھی تر بتر ہو رہی تھیں۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ جس اللہ نے آپ کو اس حال تک پہنچایا ہے وہی اس کا تریاق عطا کرے گا۔ آپ بس اس کے گھر سے پر امید رہئے۔ اگر میری صورت میں آپ کا بوجھ ہلکا ہو رہا ہے تو خدارا اس موقعہ کو مت گنوایئے''۔

''تم شاید ٹھیک کہتے ہو میرے فرزند!''

بندقداری کا چہرہ الم و رنج کی تصویر بن گیا تھا۔ ''مجھے اپنے رب کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ انسانوں کے سامنے گڑگڑانے سے کچھ حاصل نہیں۔ ٹھیک ہے ابن الورقہ! تم لے جاؤ میرے فرزند کو۔ آج سے یہ تمہارا ہوا۔ یاد رکھنا کہ میں اب تمہارا مقروض نہیں رہا۔ اللہ اس بات کا گواہ ہے''۔

''ہاں ہاں! ٹکے کا غلام دے کر کہہ رہے ہو کہ میں تمہارا مقروض نہیں رہا۔ یہ تو میری مہربانی ہے کہ تم سے اتنے مہنگے داموں اپنی مجبوری خرید رہا ہوں۔ ہاں یہ بات یاد رکھنا کہ جب بھی تمہارے پاس میری رقم پوری ہو جائے تو مہربانی کرکے اپنے اس غلام کو لے کر رقم مع سود لوٹا دینا''۔

''میرے فرزند!'' بندقداری محمود کی جانب متوجہ ہوا۔ ''تم سچے مسلمان ہو، یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں مگر میری ایک نصیحت ہمیشہ یاد رکھنا کہ غلام کو ہر حال میں اپنے مالک کا تابعدار رہنا چاہئے۔ نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ غلام یا بیوی اگر اپنے مالک سے دھوکا کرے یا اسے نقصان پہنچائے یا فرار ہو جائے تو اس کی بخشش نہیں ہوگی۔ آج سے میں تمہارا آقا نہیں ہوں بلکہ یہ تمہارے آقا ہیں۔ ان کی اطاعت کرنا تمہارا فرض ہے''۔

محمود کی جھکی گردن میں خفیف سی جنبش ہوئی۔ اس نے اپنا چہرہ اوپر نہیں اُٹھایا کیونکہ وہ اپنے آقا کی آنکھوں میں بے بسی اور لاچاری کے اُمڈتے بادل نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ منتظر رہا کہ کب اس کا نیا آقا اسے ساتھ

چلنے کا حکم سنائے۔ بندقداری نے علی بن الورقہ کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے اس کے کندھوں پر پڑے بھاری بوجھ کو ہلکا کر دیا ہے مگر وہ اپنی نخوت میں اتنا محو تھا کہ اس نے کپڑے جھاڑتے ہوئے وہاں سے نکلنے میں دیر نہیں کی۔ وہ چلتے ہوئے خدا حافظ تک کہنے کا روادار نہ ہوا۔ محمود سر جھکائے نہایت خاموشی سے اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ آخری بار مڑ کر اپنے آقا کی صورت دیکھ لے جو اسے دوبارہ شاید ہی نظر آ پاتی۔ مگر وہ اپنے اندر اتنی سکت مجتمع نہ کر پایا۔ وہ بے بس اور نڈھال آنکھیں اس کے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی تھیں۔



محمود کو علی الورقہ کے گھر آئے دس بارہ دن گذر چکے تھے۔ اسے بندقداری کی فکر کھائے جا رہی تھی کہ وہ کس حال میں ہوگا؟ مگر وہ اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ محمود کا نیا آقا حماۃ کے شاہی دربار میں معزز عہدے دار بھی تھا۔ اس کے اثر و رسوخ کا دائرہ بڑی دور تک پھیلا ہوا تھا۔ علی بن الورقہ نے بندقداری کو قرض صرف اسی نیت سے دیا تھا کہ وہ اس سے سفید فام کرنجی آنکھوں والا غلام ہتھیانا چاہتا تھا۔ اسے توقع تھی کہ بندقداری ایک طویل عرصہ تک اس کی رقم نہیں لوٹا سکے گا۔ یہ تو تقدیر کی ستم ظریفی تھی کہ اسے خود ہی ایسا موقع میسر آ گیا۔ ورنہ بندقداری تو اس کی رقم کا انتظام کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ محمود کو علی بن الورقہ کی غلامی میں جانا تھا اسی لئے قدرت نے الکرک کے مقام پر بندقداری کو دوسری بار مفلس و قلاش بنا ڈالا۔ محمود نے ان دس دنوں میں چوری چھپے اپنی محنت و مشقت جاری رکھی وہ دن کے مختلف اوقات میں موقع پا کر نکل جاتا اور جو بھی مزدوری مل کر لیتا۔ اس کے پاس چند دنوں میں دو سو درہم کے قریب رقم جمع ہوگئی۔ ایک منجھے ہوئے تاجر کا تجربہ اس کے پاس تھا، کبھی کبھار وہ اس کے بڑے کام آتا۔ ایک دوکان سے مال لے کر وہ دوسری دوکان پر بیچ کر اپنا نفع حاصل کر لیتا۔ علی بن الورقہ کو بھی محمود کی حرکتوں کی سن گن مل رہی تھی مگر وہ اسے حاسد امراء کی سازش سمجھ کر نظر انداز کر دیتا تھا۔

علی بن الورقہ سارا سارا دن دربار شاہی میں گذار دیا کرتا۔ اس کی دیرینہ خواہش پوری ہو چکی تھی وہ بھی ایک سفید فام غلام کا مالک بن چکا تھا۔ حماۃ میں علی بن الورقہ دوسرا شخص تھا جس کے پاس ان دنوں سفید فام غلام تھا۔ بیس دن کے بعد محمود کو اپنے سابق آقا علاء الدین بندقداری کی وفات کی اطلاع ملی تو وہ دیوانہ سا ہو گیا۔ اس نے علی بن الورقہ سے اجازت طلب کی کہ وہ اپنے آقا کا آخری دفعہ چہرہ دیکھنا چاہتا ہے مگر سنگ دل علی بن الورقہ نے اسے سختی سے منع کر دیا۔ وہ ایک کونے میں بیٹھا کئی گھنٹے زار و قطار روتا رہا۔ علی بن الورقہ کی بیوی ام داجلہ کو اس پر رحم آ گیا اور اس نے شوہر کی غیر موجودگی میں اسے اجازت دے دی کہ وہ آخری رسومات میں شرکت کر لے۔ محمود نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور فوراً وہاں سے بندقداری کے مکان پر چلا آیا۔ بندقداری کی میت جوں کی توں پڑی ہوئی تھی۔ ناتگ کا زہر پورے جسم میں پھیل چکا تھا۔ لاش سے تعفن پھوٹ رہا تھا۔ کسی کو اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ آگے بڑھ کر اس کی تدفین کا انتظام کر دیتا۔ محمود نے ان کمائے ہوئے درہموں سے اس کے کفن دفن کا انتظام کیا اور اپنے سابق آقا کو ہمیشہ کے لئے لحد میں اتار دیا۔ وہ جب وہاں سے لوٹا تو تھکن سے چور تھا۔ گھر لوٹنے پر اس کا واسطہ علی بن الورقہ سے پڑا۔ استفسار پر جب اس نے حقیقت بیان کر دی تو اسے ایک ایسی سزا کا مزہ چکھنا پڑا کہ اس کی ہڈیاں تک جھنجھنا اُٹھیں۔ اسی دن سے محمود کا گھر سے باہر نکلنا بند کر دیا گیا۔ علی بن الورقہ کا ہاتھ کھل گیا تھا اس کا جب دل چاہتا وہ محمود کو اس بری طرح پیٹتا کہ کئی کئی دن محمود چلنے پھرنے سے معذور رہتا۔

وقت کا پہیہ آہستہ آہستہ گھومتا چلا گیا۔ 635ھ کے وسط میں علی بن الورقہ کو اپنے ننھے فرزند احمد کے لئے

اتالیق کی ضرورت پیش آئی تو یہ ذمہ داری محمود کے سر ڈال دی گئی۔ اس دور میں غلاموں سے تعلیم و تربیت کا کام لینا کوئی معیوب بات نہیں سمجھی جاتی تھی بلکہ اسے ان کی بڑی ذمہ داری قرار دیا جاتا تھا۔ محمود بالکل ان پڑھ بھی نہیں تھا۔ تعلیمات اسلامی کے زیور سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ اسے لکھنے کا فن بھی بخوبی آتا تھا۔ اس میں جو خوبی سب سے ممتاز تھی وہ دوسری زبانوں سے آگاہی تھی۔ وہ بڑی روانی اور اہل زبان کے انداز میں بولا کرتا تھا۔ یہ خوبیاں اسے سابق آقا بندقداری کی عطا کردہ تھیں۔ اتالیق بننے کی صلاحیت سے وہ ابھی بہت دور تھا۔ علی بن الورقہ اسے جانے کیا سمجھ بیٹھا تھا؟ اس کے خیال میں محمود سے بہتر کوئی دوسرا شخص احمد کو ابتدائی تعلیم و تربیت نہیں دے سکتا۔ احمد ایک کند ذہن اور کھیل تماشوں کا شوقین بچہ تھا۔ اسے سنبھالنا کافی محنت طلب کام تھا۔ محمود کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ بچہ اس کے بس کا روگ نہیں۔ اس نے اپنے آقا سے اس ضمن میں بات چیت کرنا چاہی مگر علی بن الورقہ نے دھمکی آمیز رویہ اختیار کیا۔ جس پر محمود مجبور سا ہو گیا۔ اس نے اللہ کا نام لے کر اسے ابتدائی اور اخلاقی تعلیم کا آغاز کر دیا۔ احمد کے پاس روزانہ لاکھ بہانے ہوتے۔ وہ ادھر ادھر کی باتوں میں وقت ضائع کر دیا کرتا۔ محمود نے بڑے پیار و محبت سے اسے سنوارنے کی کوششیں جاری رکھیں۔ احمد کبھی کبھار تو اس کی باتیں آسانی سے سمجھ جاتا اور کبھی کبھار بے حد تنگ کیا کرتا۔ محمود کو جہاں احمد کی تعلیم کی ذمہ داری سونپی گئی تھی وہیں گھر کے کام کاج اور امراء کے پاس آنے جانے کی خدمت بھی کرنا پڑتی۔ محمود میں یہ عادت آہستہ آہستہ پختہ ہو چکی تھی کہ وہ کام کو ہر حال میں پورا کیا کرتا۔ چاہے کام کی نوعیت کیسی ہی کیوں نہ ہوتی۔ وقت نے اسے ننھی سی عمر میں مصیبتوں اور آزمائشوں سے دوچار کر دیا تھا۔ سال و ماہ گذرتے جا رہے تھے اور محمود جسمانی نشوونما کے ساتھ ساتھ ایک باعمل اور پرعزم شخصیت کا مالک بنتا جا رہا تھا۔ اس کی کرنجی آنکھوں کا سقم اس کی خوش کلامی اور مزاج کے پردوں میں چھپ چکا تھا۔ دشت قپچاق کی یادیں ہی اس کا کل سرمایہ حیات تھیں جنہیں وہ کبھی بھی فراموش نہیں کر پایا۔ اس کی ننھی آنکھوں نے سلطنت خوارزم کی تباہی دیکھی تھی۔ مسلمانان اسلام کی کٹی پھٹی لاشیں اور ان کی کھوپڑیوں کے مینار اس کے ذہن میں آج بھی محفوظ تھے۔ اسے وحشی تاتاریوں سے سخت نفرت تھی جنہوں نے اسے گھر بار سے اکھاڑ کر غلام بنا ڈالا۔ اس کی ماں اور بہنوں کو روند ڈالا۔ اس کے ننھے ساتھیوں کو غلامی کا طوق پہنا کر وطن سے دور نہ جانے کہاں کہاں پہنچا دیا۔ مسلمانوں میں رہ کر وہ خاصا اذیت کا شکار بھی تھا کیونکہ مسلمانوں میں شعائر اسلام اور کتاب اللہ کے احکامات سے کھلا انحراف عیاں تھا۔ اس کا خاندان نومسلم کہلاتا تھا۔ اس کے دادا نے بلخ اور ثمرقندی مسلمان تاجروں کی تبلیغی مساعی کی بدولت اسلام قبول کیا۔ اس کے باپ بجحق نے سلطنت خوارزم میں پرورش پائی اور شعائر اسلامی کی بجا آوری میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے شاہ علاؤالدین خوارزم نے اپنے دربار میں ایک معزز رتبے سے نوازا۔ محمود کے خاندان میں اطمینان اور مالی خوشحالی کی فضا پروان چڑھنے لگی مگر کچھ حاسد درباریوں نے بجحق کے خلاف شاہ علاؤالدین کے کان ایسے بھرے کہ وہ اپنی مدافعت میں کچھ بھی نہیں کر پایا اور اسے عتاب شاہی کو جھیلنا پڑا۔ وہ پابند سلاسل ہوا اور زنداں خانے میں دھکیل دیا گیا۔ یہی وہ دور تھا جب سے محمود کے گھرانے پر آزمائشوں اور مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور ان کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا۔ اس کی مشفق ماں نے خود کو اور اپنے بچوں کو حاسد درباریوں کے ستم سے بچانے کے لئے اپنے آبائی وطن دشت قپچاق میں پناہ لی مگر تقدیر کی آزمائش کا دور ابھی اختتام کو نہیں پہنچا تھا۔ انہی لئے منگولوں اور تاتاریوں کے لشکر ان علاقوں کو روندتے ہوئے ہر طرف دندنانے لگے۔ اس کی ننھی آنکھوں نے اپنی ماں اور بہنوں پر ٹوٹنے والے ستم کو بھی دیکھا تھا۔ اپنے دوسرے بھائیوں کو قتل ہوتے اور زنجیروں میں جکڑے ہوئے دیکھا تھا۔ تہذیب و تمدن سے ناآشنا وحشیوں نے اسے کئی سال تک اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا اور پھر

مسلمانوں سے اس کی قیمت وصول کر لی۔ یہ کیسا انصاف تھا کہ مسلمانوں کے آزاد بچے پہلے تو قیدی بنائے گئے اور انہی کو قیمتاً لوٹا دیے گئے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ انہیں خرید کر آزاد کر دیا جاتا اور اپنے بچوں میں ملا کر اعلیٰ تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا جاتا مگر ان کے آقاؤں نے بھی انہیں غلام کے درجے سے زیادہ نہ سمجھا اور ان میں سے کئی ان کے ظلم و ستم کی چکی میں پس کر موت کے گھاٹ اتر گئے۔ کاکیشی سفید فام غلاموں کی آمد نے جہاں مسلمان امراء میں رقابت کی فضا پیدا کی، وہیں ان کی جوانمردی اور بہادری نے بڑوں کے دل بھی جیت لئے۔ محمود کو ایسا موقع میسر نہ آیا کہ اس کی بہادری اور جوانمردی کے جوہر کھل کر سامنے آتے۔ وہ تو علی بن الورقہ کے گھر میں کسی بےکار شے کی مانند زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ علی بن الورقہ اسی زعم میں اتراتا پھرتا تھا کہ اس کے پاس سفید فام غلام ہے۔ پھر جب حماۃ کے دوسرے امراء کے پاس بھی سفید فام غلام آ گئے تو محمود کی حیثیت ثانوی سی ہو گئی۔ وہ احمد کے ساتھ مغز ماری میں الجھا رہتا۔ احمد کی نالائقی نے اسے بے حد تنگ کر رکھا تھا ایک آدھ بار اس نے طیش کے عالم میں اس کو دو ہاتھ لگا دیئے جس پر اسے اچھی بھلی سزا سہنا پڑی۔ علی بن الورقہ کی بیوی ام واجلہ اپنے شوہر کی طرح بدمزاج اور اترانے میں دو ہاتھ آگے تھی۔ وہ احمد پر سختی کو برداشت کرنا اپنی توہین سمجھتی تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ احمد کی نالائقی اور خرابی کا کوئی صحیح معنوں میں ذمہ دار تھا تو وہ ام واجلہ ہی تھی۔ محمود علی بن الورقہ کے گھر میں رہ کر وقت کے ساتھ ساتھ محتاط ہو گیا تھا۔ وہ ہر کام کو بڑی سوچ بچار کے بعد عمل میں لایا کرتا۔ اسے مار پیٹ کا کوئی رنج نہیں تھا مگر وہ اپنی ذات کو ذلت کی پستیوں میں گرانے سے اجتناب برتتا۔

ایک دن ام واجلہ کی نند فاطمہ اپنے بھائی سے ملنے دمشق سے حماۃ آئی۔ وہ ایک ہفتہ تک وہاں مقیم رہی۔ وہ اکثر محمود کو دیکھ کر کسی گہری سوچ میں ڈوب جایا کرتی۔ بھاوج نے ایک ہفتہ تک اس کی خوب خاطر مدارت کی اور اس کے سامنے اپنی امارت کے ایسے ایسے پل باندھے کہ فاطمہ جل بھن کر رہ گئی۔ فاطمہ کا شوہر دمشق کے دربار میں پہرے دار کی حیثیت سے متعین تھا۔ ام واجلہ کو اس بات کا بڑا زعم تھا کہ اس کی نند ایک معمولی گھر میں بیاہی گئی ہے۔ وہ جب بھی اس سے ملتی تو اس بات کا احساس دلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی تھیں کہ اس کی مالی اور معاشرتی حیثیت بھائی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ جس دن فاطمہ نے واپس لوٹنا تھا اس دن علی بن الورقہ گھر میں موجود نہیں تھا۔ اگر بھائی کا انتظار کیا جاتا تو رات پڑ جاتی۔ فاطمہ نے فیصلہ کیا کہ وہ بھائی سے ملے بغیر ہی رخصت ہو جائے۔ اس نے ام واجلہ کو اپنی خواہش سے آگاہ کیا تو اس نے بلا کو ٹلتے دیکھ کر فوراً ہاں میں ہاں ملائی۔ اسی دوران احمد کھیلتا ہوا وہاں آ گیا۔ فاطمہ نے اسے اپنی جھولی میں بٹھایا اور پیار کرنے لگی۔ باتوں باتوں میں ام واجلہ نے بڑ ہانکی کہ اس کا بیٹا بڑا لائق ہے۔ فاطمہ نے غیر شعوری انداز میں اس سے ایک دو سوال کئے جن کے وہ صحیح طور پر جواب نہیں دے پایا۔ فاطمہ نے بچہ سمجھ کر بات کو ذہن سے نکال دیا اور کسی لمحے احمد بھی اس کی جھولی سے نکل کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ام واجلہ کے دل میں احمد والی بات مسلسل چبھتی رہی۔ اس کا سارا خیال احمد کے معاملے میں مرتکز رہا۔ جو خفت و خجالت اسے محسوس ہو رہی تھی اس سے فاطمہ لاعلم تھی۔ محمود اچانک کسی معاملے کے بارے میں پوچھنے کے لئے وہاں چلا آیا۔ ام واجلہ تو پہلے ہی بھری بیٹھی تھی۔ وہ اس کی شکل دیکھتے ہی پھٹ پڑی۔ چھڑی سے اس نے محمود کو خوب مارا۔ محمود حیران و پریشان چپ چاپ مار کھاتا رہا۔ فاطمہ پہلے تو کچھ سمجھ نہ سکی کہ ماجرا کیا ہے؟ مگر جلد ہی بات کی تہہ تک پہنچ گئی اس نے فوری طور پر دخل اندازی مناسب نہیں سمجھی۔ مگر جب ام واجلہ کا غصہ کسی حد تک ٹھنڈا ہو گیا اور محمود نیل زدہ بدن کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گیا تو فاطمہ نے اپنی بھاوج کو نصیحت کرنا چاہی۔ ام واجلہ نند کی نصیحت بھلا کیسے سن سکتی تھی؟ اس نے جلاپے میں کہا۔ ''فاطمہ خاتون! اگر تمہیں اس غلام سے اتنی ہی ہمدردی ہو رہی ہے تو اسے اپنے گھر لے جاؤ''۔

فاطمہ اس کی بات سن کر کسی سوچ میں پڑ گئی۔

''سوچ لو ام واجلہ! اگر میں اسے لے گئی تو تم ہی پچھتاؤ گی''۔

''تم ایک دفعہ لے جا کر تو دیکھو۔ خبیث اتنا کھاتا ہے کہ تمہارا میاں ایک اور ملازمت بھی کر لے تب بھی اس کی خوراک پوری نہیں کر سکے گا''۔ ام واجلہ نے ہاتھ نچا کر کہا۔

''ام واجلہ!'' فاطمہ نرمی سے بولی۔ ''کھانے والے کے رزق کا انتظام خدا کرتا ہے۔ تمہیں وہ اگر بار لگتا ہے تو مجھے دے دو''۔

''لے جاؤ بلکہ ابھی اسی لمحے اسے لے کر اپنی شکل گم کرو۔ اسی وقت میرے گھر کی دہلیز پار کر جاؤ...... میں تمہیں ایک لمحہ بھی برداشت نہیں کر سکتی''۔

ام واجلہ زچ ہوتے ہوئے بولی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے محمود کو آواز دی۔ محمود ابھی اپنی چوٹیں سہلا رہا تھا کہ دوبارہ طلبی پر سہم سا گیا۔ وہ سستی سے چلتا ہوا وہاں پہنچا۔

''خبیث!'' ام واجلہ نے آنکھیں نکالیں۔ ''تجھے کہا گیا تھا کہ احمد کو اچھی تعلیم دے تاکہ وہ آقا کی طرح دربار میں اعلیٰ عہدے کا مالک بن سکے مگر تو نے اسے نکما بنا کر رکھ دیا۔ تیری اس گھر میں اب کوئی جگہ نہیں۔ تو اس خاتون کے ساتھ اسی وقت یہاں سے نکل جا''۔

''مگر آقا کیا کہیں گے......؟'' محمود بمشکل بولا۔

''آقا کی فکر چھوڑ۔ انہیں میں خود ہی دیکھ لوں گی۔ تو یہاں سے شکل گم کرنے کی بات کر''۔

فاطمہ نے محمود کا ہاتھ پکڑا اور اپنے برقعے کو سمیٹتی ہوئی وہاں سے نکل آئی۔ محمود اس اچانک تبدیلی پر دنگ رہ گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ فاطمہ کوئی اور نہیں ہے اس کے آقا کی بہن ہی ہے۔ وہ اس کے پاس رہے یا آقا کے پاس...... وہ انہی کا ہی غلام رہے گا۔ اس نے اپنے ذہن پر زیادہ زور دینا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ خاموشی سے فاطمہ کے ساتھ چلتا رہا۔ حماۃ سے روزانہ مختلف اوقات میں قافلے دمشق روانہ ہوتے تھے۔ اس دور میں تنہا عورت کے سفر کو بری نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ فاطمہ اکیلی تھوڑی تھی اس کے ساتھ محمود تھا۔ وہ دونوں ایک قافلے کے ساتھ دمشق روانہ ہو گئے۔ وہی دمشق جہاں محمود چند سال پہلے بکا تھا۔



شام کو علی بن الورقہ دربار سے واپس لوٹا۔ اس نے کپڑے تبدیل کئے اور اپنی بہن کی بابت پوچھا۔ ام واجلہ نے بڑی لاپروائی سے اس کے رخصت ہو جانے کی اطلاع دی۔ علی بن الورقہ نے بھی بہن کی رخصتگی کو اہمیت نہیں دی۔ اس کا دھیان ادھر ادھر کے کاموں میں بٹا رہا۔ کسی موقع پر اسے محمود کی ضرورت پیش آئی تو اس نے کمرے میں ہی سے آواز دی۔ محمود تو نہیں آیا البتہ ایک دوسرا غلام فوراً پیش ہو گیا۔ علی بن الورقہ نے اس کی جانب گھور کر دیکھا اور محمود کو بلانے کا حکم دیا۔

''مالک! وہ گھر میں نہیں ہے اسی لئے میں حاضر ہوا ہوں''۔ غلام نے مؤدب لہجے میں بتایا۔

''کہاں گیا ہے یہ خبیث؟''

''مجھے معلوم نہیں!''

''جاؤ اپنی مالکہ کو یہاں بھیجو!'' علی بن الورقہ نے اسے حکم دیا۔ وہ حیران و پریشان تھا کہ آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا کہ محمود بنا بتائے یا اس کی اجازت کے بغیر رات کے وقت کہیں گیا ہو۔ اتنے میں ام واجلہ وہاں آ گئی۔

''محمود کہاں ہے؟'' سوال کیا گیا۔

''اسے میں نے فاطمہ کو بخش دیا ہے وہ اسے اپنے ساتھ دمشق لے گئی ہے''۔ ام واجلہ نے زلفیں جھٹک کر ایک ادا سے بتایا۔ علی بن الورقہ پر تو جیسے بجلی ٹوٹ پڑی تھی۔ ایک لمحے کے لئے اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ دوسرے اسی لمحے وہ جھٹکے سے اکھڑ گیا۔ کمرے میں تیز چھناکے کی سی آواز گونجی۔ ام واجلہ کا چہرہ پڑنے والے تھپڑ سے دوسری جانب گھوم گیا۔ وہ حیرت و خوف میں مبتلا اپنے شوہر کی جانب دیکھنے لگی۔

''تم نے مجھے تھپڑ مارا......'' ام واجلہ تڑپ اُٹھی۔ ''اس دو ٹکے کے غلام کے لئے تمہارا ہاتھ آج مجھ پر اُٹھ گیا''۔

علی بن الورقہ شدید غصے میں کمرے میں چکر کاٹ رہا تھا۔ اس کی سانسیں تیز تھیں اور وہ بار بار اپنی مٹھیوں کو بھینچ رہا تھا۔

''تمہیں وہ غلام کیا تکلیف دے رہا تھا کہ تم نے اسے اپنے گلے سے اتار دیا؟'' علی بن الورقہ نے بے چینی کے عالم میں کہا۔

''خبیث! سارا دن روٹیاں توڑتا ہے اور کام ذرہ بھر نہیں کرتا۔ ایک احمد کی پڑھائی کی ذمہ داری سونپی تھی۔ اس میں بھی کام چور نکلا۔ آج تمہاری بہن کے سامنے میری ہتک کروا دی۔ اس نے احمد سے سوال پوچھے اور احمد جاہلوں کی طرح منہ ہلاتا رہا۔ بھلا میں ایسے غلام کو کیسے برداشت کر سکتی ہوں؟ شکر کا کلمہ پڑھو ایک بوجھ تو ٹلا......'' ام واجلہ اپنی مگن میں بولے گئی جب کہ علی بن الورقہ محض دانت پیستا رہ گیا۔

''تم دنیا کی احمق ترین عورت ہو...... تم ایک ایسے غلام سے ہاتھ دھو بیٹھی ہو جس کی بدولت تمہارا بیٹا آنے والے وقت میں کسی ممتاز مقام پر پہنچ سکتا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ احمد نالائق اور نکما ہے۔ میں نے کچھ سوچ کر ہی یہ ذمہ داری اسے سونپی تھی اوہ خدایا...... میں اب کیا کروں؟ میں کل ہی دمشق جاؤں گا اور اسے فاطمہ سے واپس لے کر آؤں گا۔ میں نے پانچ سو دینار سرخ کی قربانی یونہی نہیں دی تھی میں نے اس میں ایسے گن دیکھ لئے تھے جو آنے والے وقت میں ہمارے خاندان کا نام روشن کرنے کے کام آ سکتے تھے۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ میں نے اسے کوئی خاص کام نہیں دیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بے کار کی روٹیاں توڑتا ہے۔ کام کرنے کے لئے میں نے تمہیں دوسرے غلام لا کر دیے ہیں وہ میرے بیٹے کا روشن مستقبل ہے۔ ابھی تو وہ لڑکپن میں ہے مگر تم خود ہی دیکھ لیتی کہ جوانی میں یہ کیا کیا کر گزرتا''۔

علی بن الورقہ ہاتھوں کو ملتا رہا۔ ام واجلہ کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا وہ خاموشی سے وہاں سے کھسک گئی۔ علی بن الورقہ نے ساری رات آنکھوں میں کاٹی۔ دوسرے دن وہ صبح سویرے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ پہلے قافلے کے ساتھ وہ دمشق روانہ ہو گیا۔ سہ پہر کے وقت وہ اپنی بہن فاطمہ کے گھر پہنچ گیا۔ بھائی کی شکل دیکھتے ہی فاطمہ اس کے آنے کا مقصد سمجھ گئی تھی۔

''علی! خیریت تو ہے؟'' فاطمہ نے پوچھا۔

''ہاں، بہن!'' علی بن الورقہ دائیں بائیں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں دراصل محمود کو واپس لینے آیا تھا۔ اس کی مجھے بے حد ضرورت ہے۔ ام واجلہ تو بے وقوف عورت ہے، اس نے بنا سوچے سمجھے محمود تمہیں دے دیا''۔

''بنا سوچے سمجھے نہیں بلکہ بلا جبر و اکراہ''۔

''چلو ایسے ہی سہی۔ بہر حال وہ میرا زرخرید غلام ہے میں اسے واپس لینے آیا ہوں''۔

''اگر میں اسے واپس لوٹانے سے انکار کر دوں تو......؟'' فاطمہ نے بھنویں سکیڑ کر کہا۔

''کیوں انکار کردو...... کس حیثیت سے انکار کرو گی تم...... وہ تمہارا غلام نہیں ہے وہ صرف میرا غلام ہے میں ہی اس کا آقا ہوں''۔ علی بن الورقہ بھڑ گیا اسے اپنی بڑی بہن کا ذرہ لحاظ باقی نہیں رہا۔

''تمیز کے دائرے میں رہو علی! اور یہ بات کان کھول کر سن لو کہ محمود اب میرا ہے اور میرے پاس ہی رہے گا۔ تم کیا کوئی بھی اسے مجھ سے نہیں چھین سکتا''۔ فاطمہ سخت لہجے میں بولی۔

علی بن الورقہ کے لئے حالات سنگین ہو رہے تھے وہ کسی بھی صورت میں محمود کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ایک ہی لمحے میں فیصلہ کرلیا۔ ایک لمبا اور چمکتا ہوا خنجر اس نے پہلو میں سے نکالا۔ فاطمہ بھائی کے اطوار دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔

''تمہاری اتنی جرأت...... ! بڑی بہن کو خنجر دکھا کر دھمکاؤ''۔ فاطمہ اس کی بے ہودہ حرکت پر جہاں صدمے سے دوچار ہوئی تھی، وہیں اس کے غصے کی انتہا باقی نہ رہی۔

''میں اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر ہر طرح کی حرکت کا مظاہرہ کرسکتا ہوں۔ اسے تم محض دھمکی مت سمجھو''۔

علی بن الورقہ آنکھیں دکھاتا ہوا بولا۔

''ہونہہ! تمہاری یہ بدتمیزانہ جرأت...... آج تمہاری محبت اور اخلاقی اقدار کی عمارت منہدم ہوگئی ہے''۔

فاطمہ کے چہرے پر کسی طرح کے خوف کے بجائے گہرا اطمینان چھایا ہوا تھا جیسے اسے خنجر کی پرواہ ہی نہ ہو۔ علی بن الورقہ بہن کے اس استحکام پر دیوانہ ہو کر جوش میں لرزنے لگا۔ اس کے ہاتھوں پر لرزش سی طاری ہوگئی۔ وہ حقیقتاً بے حد بے صبرا شخص تھا۔ اس کے قدم بڑھنے لگے۔ فاطمہ کے چہرے پر چھایا ہوا استقلال لمحہ بھر کے لئے تھرکا مگر وہ بھی کسی اہم فیصلے پر پہنچ گئی تھی۔

''ٹھیک ہے اگر تم آج اپنی اصلیت دکھانے کے درپے ہو اور مجھے مارنے پر تل گئے ہو تو آج میں بھی دیکھوں گی کہ بزدل بھائی کے ہاتھوں میں قدرت نے بہن کی موت لکھی ہے یا نہیں''۔ فاطمہ ڈٹ کر مقابلے پر کھڑی ہوگئی۔ علی بن الورقہ اپنے مفادات کے جنون میں اس قدر اندھا ہو چکا تھا کہ اسے اپنے سامنے کھڑی بہن کا چہرہ دشمن دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سب رشتے ناطے بھول چکا تھا۔ اس کے قدموں میں حرکت ہوئی اور وہ فاطمہ کے مقابل پہنچ گیا۔ اس کی آنکھیں غصے کے عالم میں دہکنے لگی۔ اس کا خنجر والا ہاتھ فضا میں بلند ہوتا چلا گیا۔

فاطمہ نے مزاحمت کے بجائے سینہ تان کر کھڑا ہونا پسند کیا تھا۔ اس سے پہلے کہ خنجر فاطمہ کے سینے کی جانب بڑھتا، ایک آہنی گرفت نے آگے بڑھ کر علی بن الورقہ کی کلائی جکڑ لی اور اس کے جارحانہ عزم کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

وہ ہاتھ کیا تھا...... ؟ کسی فولادی پنجے سے کم نہیں تھا۔ علی بن الورقہ نے متحیر نگاہوں سے اس آہنی گرفت کے مالک کی جانب دیکھا تو لمحہ بھر کے لئے اسے یوں لگا کہ جیسے آسمان ٹوٹ پڑا ہو۔ وہ ہاتھ اس کے غلام محمود کا تھا۔ سولہ سالہ محمود اب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تھا۔ اس کا دراز قد علی بن الورقہ سے کہیں نکلتا زیادہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے بازوؤں میں شیر جیسی قوت بھی ابھی نوخیز تھی۔ علی بن الورقہ کو محمود سے اس حرکت کی توقع بالکل نہیں تھی۔

''چھوڑ میرا ہاتھ!'' علی بن الورقہ سنبھلتے ہوئے دانت پیس کر بولا۔ ''تو تو میرا غلام ہے''۔

''تھا، اب نہیں ہوں......!'' محمود مختصراً بولا۔

''کیا مطلب......؟'' علی بن الورقہ کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کا اٹھا ہوا ہاتھ خود بخود ڈھیلا پڑ گیا۔

''میں اب تمہارا غلام نہیں بلکہ تمہاری بہن کا غلام ہوں۔ میرا فرض بنتا ہے کہ اپنی مالکن پر اٹھنے والے ہر ناجائز ہاتھ کو توڑ کر رکھ دوں''۔

محمود قدرے درشت لہجے میں بولا۔

علی بن الورقہ یہ سن کر بھڑک اٹھا۔ غصے اور بے بسی سے وہ نڈھال سا ہوگیا۔ اس کے قدم غیر شعوری طور پر پیچھے ہٹنے لگے۔ جسم میں بڑھاپے کے باعث نقاہت کی لہریں اٹھنے لگی۔ محمود نے قوت سے اس کا ہاتھ پیچھے جھٹک دیا۔ اسے ایک طرف تو یہ صدمہ تھا کہ محمود نے آج اس کا سامنا کرلیا تھا۔ دوسری طرف اپنی بہن سے ہونے والا انکار بھی خلاف توقع تھا۔

''تیری اتنی جرأت کیسے ہوگئی کہ تو ......''

علی بن الورقہ کو خود اپنی آواز کہیں دور سے سنائی دیتی محسوس ہوئی۔

''یہ جرأت مجھے میری قوت ایمان نے بخشی ہے۔ میرے مرحوم آقا بندقداری کی آخری نصیحت یہی تھی کہ میں جس کے پاس بھی جاؤں، صرف اسی کا تابعدار بن کر رہوں۔ میں ان کی نصیحت کو وصیت سمجھ کر ہر وقت اپنے سینے سے لگائے رکھتا ہوں'' محمود اب اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔

''تت...... تجھے بندقداری یاد رہا مگر میں کیسے بھول گیا؟ جس نے تجھے اتنا عرصہ کھانے کو روٹی دی، سر چھپانے کو اپنا گھر دیا۔ میں نے تو تجھے نہیں بیچا...... نہ ہی کسی کو بخشا ہے کہ میں اب تیرا آقا نہیں رہا''۔ اب علی بن الورقہ گھٹے گھٹے لفظوں میں بات کر رہا تھا۔

''ابن الورقہ!'' محمود فاطمہ کے سامنے جم کر کھڑا ہوگیا۔ ''تم نے جو کچھ بھی میرے ساتھ کیا وہ کوئی احسان نہیں تھا۔ وہ تیرا فرض بنتا تھا۔ تم نے نہیں، مجھے میرے اللہ نے رزق دیا...... تم تو اتنے ظالم ہو کہ کسی کو ایک وقت کی روٹی بھی نہیں دے سکتے۔ خودغرضی میں شیطان بھی تم سے پناہ مانگتا ہوگا۔ آج تمہیں اپنے احسان یاد آرہے ہیں مگر اس کل کو بھول گئے کہ جب ایک معذور شخص تمہارے سامنے گڑگڑا رہا تھا، منت سماجت کر رہا تھا اور تم اس سے اس کا آخری سہارا بھی چھین لائے۔ اس نے تو تم سے صرف اپنے مرنے تک کی مہلت مانگی تھی مگر تمہیں وہ دینا عذاب دکھائی دیا تھا۔ تم کسی کو کیا دے سکتے ہو؟ اگر تم نے مجھ پر کچھ خرچ کیا ہے تو اس کا بدلہ بھی فوراً چکا لیا۔ میں آج کے بعد تمہارا غلام نہیں...... زندگی مکافات عمل ہوتی ہے۔ کل جو کچھ تم نے کسی کے ساتھ کیا تھا آج قدرت نے ایسا ہی تمہارے ساتھ کر دکھایا۔ اس لئے جو بھی قدم اٹھانا ہو، اسے سوچ سمجھ کر ہی اٹھانا۔ میں اب جوان بھی ہوں اور مضبوط بھی''۔

''ناخلف! میں یہ معاملہ قاضی کی عدالت میں لے جاؤں گا۔ تو نے مجھ سے بغاوت و سرکشی کی ہے اور سزا میں تجھے زندگی بھر زنداں خانے کی ہوا کھلاؤں گا...... تو نے خود کو سمجھ کیا رکھا ہے؟'' علی بن الورقہ طیش کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''تمہاری بیوی نے یہ غلام مجھے بخش دیا اور بخشی ہوئی چیز واپس مانگنا، امراء کی شان کے خلاف ہے۔ اگر تم بھری عدالت میں اپنا مضحکہ اڑوانا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں''۔ محمود کے عقب میں سے فاطمہ بول پڑی۔ وہ خود کو محمود کے عقب میں بے حد محفوظ سمجھ رہی تھی۔

''بہت خوب! یہ میرا غلام ہے کہ میری بیوی کا...... اور وہ کون ہوتی ہے؟ میری ملکیتی چیز مجھ سے اجازت لئے بنا کسی دوسرے کو بخشنے والی''۔

علی بن الورقہ تڑک کر بولا۔

''ٹھیک ہے تم یہاں سے سیدھے قاضی کے پاس جاؤ اب وہی تمہارا مسئلہ حل کرے گا''۔ فاطمہ نے ہاتھ جھٹک کر لاپروائی سے کہا۔ محمود سیسہ پلائی دیوار بنا اپنی مالکہ کے سامنے کھڑا رہا۔ علی بن الورقہ کافی دیر تک اپنی بیوی اور بہن کو ہذیان بکتا رہا۔ وہ محمود کی جانب بار بار کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھتا مگر جونہی اس کی نگاہ اس کے چوڑے چکلے سینے پر پڑتی تو وہ خود کو بے بسی کے بھنور میں پھنسا محسوس کرتا۔ علی بن الورقہ نے جب دیکھا کہ بات بننے کے بجائے اب بالکل بگڑ چکی ہے تو اس نے فوراً پینترا بدلا اور چکنی چپڑی باتوں پر اتر آیا اور پستی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ نہ صرف اس نے اپنی بہن سے فوراً معافی مانگی بلکہ محمود سے بھی دونوں ہاتھ جوڑ کر واپس چلنے کی استدعا کی۔ فاطمہ اپنے بھائی کی اس دیرینہ عادت سے بخوبی واقف تھی۔ اس نے معافی تو دے دی مگر محمود کو واپس بھیجنے سے صاف انکار کر دیا۔ یہ تماشہ کافی دیر تک یونہی چلتا رہا۔ محمود خود بھی اس کے ساتھ واپس نہیں جانا چاہتا تھا اسے فاطمہ کا سہارا میسر آ گیا تو وہ خود کو مضبوط حصار میں محسوس کرنے لگا۔ علی بن الورقہ نے جب دیکھا کہ بات کسی بھی طور نہیں بن پا رہی تو اس نے انتقاماً ایک خنجر زیریں جانب سے نکالتے ہوئے ایک تیز دار محمود پر کر دیا۔ محمود بے شک پوری چوکنا کھڑا تھا مگر وہ اس ناگہانی حملے کو فوری طور پر سمجھ نہ سکا۔ ذاتی مدافعت میں اس کا بایاں بازو لاشعوری پر سامنے پھیل گیا اور خنجر بائیں بازو میں گھستا چلا گیا۔ محمود کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکلی۔ علی بن الورقہ نے اسے کمزور پاتے ہی مزید چڑھائی کرنا چاہی۔ محمود محض زخمی ہوا تھا، اس کی قوت مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس نے علی بن الورقہ کی کمر میں پشت سے ہاتھ ڈالا اور اسے دائیں بازو سے اُٹھا کر اپنے پورے زور سے زمین پر پٹخ دیا۔ علی بن الورقہ کی ناتواں اور بوڑھی ہڈیاں جھنجھنا اُٹھیں۔ وہ تکلیف سے کراہتا ہوا دوبارہ اُٹھنے کے قابل نہ رہا۔ فاطمہ کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو گیا۔ اسے اپنے بھائی کی اس جارحانہ حرکت پر شدید صدمہ پہنچا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور اس نے پاؤں سے جوتی اتار لی۔ پھر کیا تھا ...؟ بھائی بڑی بہن کے ہاتھوں جوتیوں سے پٹنے لگا۔ علی بن الورقہ نے پھر گڑگڑا کر معافی مانگنا شروع کر دی۔ فاطمہ کو اپنے بھائی پر اب ذرا اعتبار نہیں رہا تھا۔ اس نے محمود کو حکم دیا کہ وہ اس کے درندہ صفت بھائی کو اس کی نگاہوں سے اوجھل کر دے۔ محمود اس اثناء میں ایک چھوٹا سا کپڑا اپنے بازو پر باندھ چکا تھا۔ اس کی قمیض خون سے تربتر ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی مالکہ کی خواہش بجا لاتے ہوئے علی بن الورقہ کو اپنے کندھے پر بورے کی مانند لادا اور دروازے کے باہر اُٹھا کر گلی میں پٹخ ڈالا۔ اس کے بھاری بھرکم جسم کے گرنے سے خاصی آواز بلند ہوئی تھی۔ باہر کئی راہ گیر اس جانب متوجہ ہوئے تھے مگر کسی کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ ٹھہر کر ماجرا پوچھتے۔ علی بن الورقہ زمین پر گرا، بری طرح سے کراہ رہا تھا۔ وہ کراہتے ہوئے بھی اپنی بہن اور محمود کو صلواتیں سنانے سے باز نہیں آیا۔ شاید اس بار اس کی دو ایک ہڈیاں ضرور ٹوٹ گئی ہوں گی۔ محمود نے زور سے دروازہ بند کر دیا۔



قاضی عماد الدین الصالح ظہر کی نماز ادا کر کے واپس اپنی عدالت میں داخل ہوئے تو عدالت میں موجود لوگوں کے چہروں پر بے چینی سی پھیل گئی۔ یہ ملک الصالح اسمٰعیل ایوبی سلطانِ دمشق کی جانب سے قاضی مقرر تھے۔ ملک الصالح، سلطان صلاح الدین ایوبی کے بھائی ملک العادل کی اولاد میں سے تھا۔ قاضی عماد الدین لوگوں کے مسائل اور مقدمات کو نبٹانے میں ایک عمر بتا چکے تھے۔ آج کا مقدمہ بڑا دلچسپ تھا جس میں ایک مالک اور ایک غلام دونوں ایک ساتھ مدعی بھی تھے۔ صبح سے اس مقدمے پر کارروائی جاری تھی، شہادتیں سن لی گئی تھیں۔ دونوں فریقین کا موقف بھی واضح ہو چکا تھا اب فیصلے کی گھڑی تھی۔ ایک طرف انصاف کا دامن گیر علی بن الورقہ تھا تو دوسری طرف اس کی بہن فاطمہ محمود کی مالکہ کی حیثیت سے مدعیہ تھی۔

قاضی عماد الدین اس معاملہ میں خاصے پریشان تھے کیونکہ کوئی واضح شہادت ایسی نہیں تھی کہ جس پر فیصلہ کرنے میں آسانی ہوتی۔ مدعیہ کی شہادت نصف شمار کی گئی تھی۔ اسی طرح ام واجلہ کی شہادت بھی نصف گنی گئی تھی۔ ام واجلہ نے اپنے شوہر کے حق میں شہادت دی کہ میں نے فاطمہ کو غلام بخشا نہیں تھا بلکہ صرف فاطمہ کو گھر تک پہنچانے کے لئے ساتھ روانہ کیا تھا؟ اگر کوئی شہادت فاطمہ کی طرف داری میں تھی تو وہ محمود کی تھی۔ محمود چونکہ خود ایک فریق بن چکا تھا اس لئے اس کی شہادت کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا جا رہا تھا۔ لوگوں کو اس بات میں دلچسپی تھی کہ قاضی اس الجھے ہوئے تضیئے کو کیسے نبٹائیں گے......؟

قاضی عماد الدین نے ظہر کی نماز کے بعد مصلیٰ پر کافی دیر تک اس بارے میں غور کیا کہ انہیں کس فریق کے حق میں فیصلہ دینا چاہئے۔ فاطمہ کے پاس شہادت کی کمی تھی مگر اس کے چہرے پر سچائی جھلک رہی تھی۔ علی بن الورقہ کے چہرے پر انہیں تکبر اور خود نمائی سی محسوس ہوئی۔ وہ فاطمہ کے حق میں فیصلہ دینا چاہتے تھے مگر حالات و واقعات اس کے برعکس تھے۔ محمود کا چہرہ ایسا تھا کہ کوشش کے باوجود قاضی عماد الدین اس پر کوئی واضح صورت تلاش نہیں کر پائے۔ علی بن الورقہ کی استدعا یہ تھی کہ غلام بے شک اسے نہ لوٹایا جائے مگر اس کی بغاوت پر سختی کا رویہ اپنایا جائے اور اسے کڑی سزا کے طور پر قید بامشقت دی جائے تاکہ آنے والے وقت میں غلمان کو کڑی نصیحت و عبرت ہو۔ کسی حد تک اس کی استدعا درست بھی تھی مگر جانے کیوں علی بن الورقہ کے مطالبے میں قاضی عماد الدین کو قرار نہیں مل رہا تھا۔ انہیں فاطمہ کے ذاتی وصف پر شہادت مل چکی تھی کہ وہ اپنے ہمسائیوں اور احباب میں سچائی اور دیانتداری میں خاصی شہرت رکھتی ہے مگر وہ اس مقدمے میں اپنے حق میں کوئی سچائی پیش نہیں کر سکی تھی۔ اس کے گھریلو حالات بھی ایسے نہیں تھے کہ وہ غلام رکھنے کی متحمل ہو سکتی جبکہ اس کے مقابلے میں علی بن الورقہ کی امارت اور سماجی حیثیت نہایت مضبوط تھی۔ کافی سوچ بچار کے بعد وہ کھنکار کر گویا ہوئے۔ وہاں موجود لوگوں کی چہ میگوئیاں یکلخت تھم گئیں۔

''اے مومنو! بے شک اعلیٰ و ارفع عدل و انصاف کرنے والی ایک ہی اللہ کی ذات ہے۔ میں نے اس معاملے کی سماعت کے بعد جو فیصلہ کیا ہے ممکن ہے کہ آپ لوگوں کو صحیح نہ لگے مگر میرا دل اس پر مطمئن ہے۔ علی بن الورقہ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس کی بہن اس کے خاص غلام محمود کو زبردستی ہتھیانا چاہتی ہے اور وہ غلام مکمل طور پر فاطمہ کی مٹھی میں ہے، اس کے ثبوت میں جو واقعہ پیش کیا گیا ہے اس کے گواہ بھی قابل غور ہیں۔ علی بن الورقہ پر مار پیٹ اور تشدد مجھے بھی دکھائی دے رہا ہے لیکن ان کے ساتھ ساتھ محمود کے بازو پر موجود زخم بھی اپنی ہی کہانی سنا رہا ہے۔ علی بن الورقہ ایک معزز اور حکومتی عہدے دار ہے، علاوہ ازیں وہ صاحب ثروت بھی ہے۔ اس کے مقابلے میں فاطمہ کا مؤقف یہ ہے کہ ام واجلہ یعنی علی بن الورقہ کی بیوی نے اپنی خوشی اور رضامندی سے محمود کو اسے سونپا ہے۔ جس پر ام واجلہ منحرف ہے۔ میرے خیال میں بھی کچھ اسی قسم کا معاملہ ہوا ہے۔ دو خواتین کی آپس میں لڑائی ہونا یا ایک دوسری کو کوئی شے دے دینا عام سی بات ہے۔ محمود کے مؤقف سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا محمود کا مالک علی بن الورقہ ہے یا فاطمہ......؟ فاطمہ کی منکسر مزاجی اور سابقہ شہرت کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو وہ غلام رکھنے کی زیادہ حق دار ہے۔ یہ اس کی دنیاوی اچھائیوں کا انعام ہے۔ علی بن الورقہ کو صرف اس بات کی تمنا ہے کہ غلام بے شک اسے نہ دیا جائے، مگر اسے زنداں خانے میں ضرور ڈالا جائے۔ یہ انتقامی کارروائی دکھائی دیتی ہے جو کہ وہ محمود اور اپنی بہن دونوں سے لینے کا خواہش مند ہے۔ غلام پر قاتلانہ حملے کے جرم میں اسے بھی سزا دی جا سکتی ہے مگر میں یہ فیصلہ سناتا ہوں کہ اگر علی بن الورقہ اپنے جرم کی سزا سے بچنے کا خواہشمند ہے تو اسے محمود سے اور اس کی سزا کی استدعا سے محروم ہونا پڑے گا ورنہ

دونوں فریقین برابر کے جرم دار ہیں اور دونوں کو ان کے جرم کی نوعیت مدنظر رکھتے ہوئے سزا دی جائے گی''۔

قاضی عماد الدین کا فیصلہ پیچیدہ اور الجھا ہوا تھا۔ لوگ اپنی سی ہانکنے لگے۔ علی بن الورقہ نے جب اپنے جرم کی بابت سنا تو اس کا رنگ اُڑ گیا۔ اگر اسے سزا ہو جاتی تو وہ حماۃ واپس لوٹنے کے قابل نہیں رہتا تھا۔ وہاں خود پر اُٹھنے والی انگلیوں کو وہ کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی جگہ پہلو بدلنے لگا۔ محمود یوں کھڑا تھا جیسے اسے کسی بات کی پرواہ نہ ہو۔ اگر سزا ہو گئی تو بھی کچھ نہیں ہوگا اور نہ ہوئی تو بھی کوئی پہاڑ نہیں ٹوٹے گا۔ چند ہی لمحوں بعد علی بن الورقہ نے اپنی حشمت و جاہ پر محمود کو قربان کر دیا۔ وہ اپنا مقام نہیں کھونا چاہتا تھا۔ محمود کے ہاتھ سے نکل جانے کا افسوس تو اسے ضرور تھا مگر وہ ایسے دوراہے پر آن کھڑا ہوا تھا کہ جہاں اسے دو سے میں ایک شے کا انتخاب کرنا تھا۔ اس نے شاید غلط انتخاب کیا تھا...... محمود کے ساتھ اس کے بیٹے کا مستقبل جڑا تھا جبکہ عزت و ناموس صرف اسی کی زندگی تک باقی رہ پاتی۔ قاضی عماد الدین نے محمود فاطمہ کے حوالے کرتے ہوئے یہ بات خصوصاً محسوس کی کہ ان کے قلب پر گہرا اطمینان چھایا ہوا تھا جیسے ان کا فیصلہ واقعی صحیح ہو۔



''تم پھر آج ادھر آ دھمکے...... تمہیں کتنی مرتبہ سمجھایا ہے کہ میرے باپ یا بھائیوں نے تمہیں دیکھ لیا تو تمہاری لاش کے ٹکڑے کسی ویرانے میں چیل کوے کھاتے دکھائی دیں گے''۔ وہ تیزی سے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے لفظ چباتے ہوئے بولی۔

''چلو! ایسا ہی سہی...... میری بدولت چیل کوؤں کا پیٹ تو بھر جائے گا۔ میں نے ہر طرح کے ڈر اور خوف کو اپنے دل سے نکال پھینکا ہے۔ تمہارا باپ یا بھائی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے..... کیونکہ میں تو عاشق ہوں، تمہاری زلف کا اسیر ہوں''۔ وہ لاپرواہی سے ہنستا ہوا بولا۔

''مطیع الدین......!'' وہ بے بسی کے عالم میں بولی۔ ''میں نے تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے کہ میرا خیال اپنے دل سے نکال دو۔ میں تمہیں کبھی نہیں مل پاؤں گی۔ میرا تعلق منگول قبیلے سے ہے اور ہمارے بزرگ کسی باہر کے شخص سے رشتہ داری نہیں بنایا کرتے اور پھر کسی مسلمان سے...... سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ اس بات کو اپنی ذلت سمجھتے ہوئے تمہارے سارے خاندان کو تہ تیغ کر دیں گے۔ مجھ پر نہ سہی کم از کم اپنے خاندان والوں پر ترس کھاؤ''۔

''اے آفتاب پرست مہ جبیں!'' مطیع الدین نے سینے پر ادائے دلآویزی سے ہاتھ رکھتے ہوئے صدا لگائی۔ ''محبت میں خاندان نہیں ہوتے، صرف ایک محبوبہ ہوتی ہے اور دوسرا اس کا محبوب باقی سب ظالم سماج...... جب میں محبوب فہرست میں اپنا نام لکھوا چکا ہوں تو ظالم سماج سے ٹکر تو لینا ہی پڑے گی نا......''

''لگتا ہے کہ تمہارا دماغ ضرورت سے زیادہ کھسک گیا ہے۔ اسے ٹھکانے پر لانے کے لئے کسی نہ کسی کی تلوار ضرور حرکت میں آئے گی''۔

''تلوار داوزار کی باتیں مت کرو...... میں تو نگاہ کے وار سے ہلاک ہونے کا متمنی ہوں۔ بس تم ایک نگاہ الفت مجھ پر ڈال دیا کرو، میرے کئی شب و روز اسی خمار میں بیت جائیں گے''۔ مطیع الدین نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''تم باز نہیں آؤ گے مطیع!'' وہ چڑ سی گئی تھی۔ ''میں کہتی ہوں کہ یہ فریب کاری ختم کرو اور اپنے آنے کا مدعا بیان کرو''۔

''مدعا تو گوش گزار کر دیا ہے ایک نگاہ...... صرف ایک نگاہ الفت کے حریص ہیں وہ جب پائیں گے تو

خاموشی سے لوٹ جائیں گے''۔

''میرے خیال میں میرے باپ کی آنکھیں تمہاری اس حسرت کو ضرور پورا کریں گی''۔ وہ چہک کر بولی۔

''کچھ تو خیال کرو...... اتنی خوشگوار تنہائی میں کس جلاد کا نام لے رہی ہو۔ اس کی موٹی موٹی کبوتر کی سی سرخ آنکھوں سے خمار نہیں بخار ہو جائے گا۔ اس موقع تنہائی میں کچھ تو عشق و محبت کی فضا برقرار رہنے دو''۔ مطیع الدین پر شکوہ لہجے میں بولا۔

''مطیع الدین!'' وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ''مذاق کی بات چھوڑو اور عقل سے کام لو۔ تمہارا یہاں اس طرح چوری چھپے آنا بے شک تمہارے خیال میں بہادری سے موسوم کیا جاتا ہوگا مگر میرے خیال میں یہ خودکشی کرنے کے مترادف ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ منگول و تاتار مسلمانوں کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ وہ ان کے سروں کو حریصانہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اگر خوش قسمتی سے تمہارے خاندان کو منگولوں نے امان دے رکھی ہے تو اسے یوں گنوانا ٹھیک نہیں''۔

''تم صحیح کہہ رہی ہو گل دتوژ! مگر میں کیا کروں......؟ تمہیں جب تلک دیکھ نہ لوں مجھے ایک پل بھی قرار نہیں آتا۔ آنکھوں سے نیند کھو جاتی ہے۔ کسی کام میں من ہی نہیں لگتا...... ہر وقت صرف تمہاری صورت میری نگاہوں کے سامنے رقصاں رہتی ہے۔ جوں جوں عالم فراق بڑھتا ہے تو تمہاری صورت کے خدوخال مدھم پڑنے لگتے ہیں...... اور میں ایسے میں تڑپ اُٹھتا ہوں......'' مطیع الدین حالِ دل بیان کرنے میں منہمک تھا کہ گل دتوژ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''بس...... بس! جس خرابی سے میں تمہیں دور رکھنے کی سعی کرتی ہوں تم پھر اسی کا قضیہ لے کر بیٹھ جاتے ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں کیسے باز رکھوں؟ تم خوبصورت ہو...... بہادر اور جی دار ہو...... جوان و شریف النفس ہو...... یہ سچ ہے کہ تم مجھے اچھے لگتے ہو مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تمہاری یا تم میری خاطر کسی خون خرابے کی شروعات کر دیں''۔

''کیا بات ہے؟ میں آج جب سے یہاں آیا ہوں تم بار بار خون خرابے کا ذکر کئے جا رہی ہو۔ تاتاری خون کی وراثت کا اثر اپنی جگہ صحیح ہے مگر اس سے ہٹ کر تم بھی تو کوئی اچھی بات کر سکتی ہو''۔

''اچھی بات......!'' گل دتوژ نے آنکھیں نکال کر کہا۔ ''اب اچھی بات یہی ہوگی کہ میں زور سے اپنے بھائی کو آواز دوں اور تمہیں اس کے حوالے کر دوں''۔

''جب بھی بات کرو گی تو کوئی الٹی سیدھی ہی ہانکو گی۔ میں یہاں تمہاری ایسی باتیں سننے کے لئے نہیں آیا ہوں۔ صرف اور صرف تمہارے رُخِ ماہتاب کا دیدار کرنے آیا ہوں......''

''تمہارا حقیقتاً دماغ چل گیا ہے۔ میں بھلا اب کیا کر سکتی ہوں؟ میری دعا ہے کہ کل صبح طلوع ہونے والا خدائے جاودانی آفتاب تمہیں عقل و ہدایت بخشے''۔ گل دتوژ بے بسی سے بولی۔

''تم اب شاید مجھ سے اکتا چکی ہو، لہٰذا میرا لوٹ جانا اب ضروری ہو گیا ہے۔ وہ عاشق ہی کیا؟ جو موقعہ خلوت میں اپنی محبوبہ کو اداس کر کے لوٹے؟ مگر میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ تم میری ہو اور میری ہی رہو گی۔ میں تمہیں پا کر ہی دم لوں گا چاہے اس کے لئے مجھے آسمان سے تارے ہی کیوں نہ توڑ کر لانا پڑیں۔ اچھا اے محبوبہ دل نواز! میں اب جاتا ہوں''۔

مطیع الدین نے اس کے بگڑتے تیور دیکھ [illegible]

بالکونی کی دوسری جانب سے اس پر حسرت بھری نگاہ ڈالی اور پھر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ گل دتوژ دھڑکتے دل سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں وہ حقیقتاً کسی کی نگاہوں میں نہ آ جائے۔ مگر مطیع الدین کو جانے کون سا چور راستہ مل چکا تھا، جہاں سے وہ جب دل چاہے آ جایا کرتا۔ وہ کافی دیر تک وہیں کھڑی اس کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگتی رہی۔ وہ ایک منگول قبیلے کے سالار کی بیٹی تھی جو دریائے والگا کے کنارے آباد سرائے نامی شہر میں آباد تھا۔ اس کے علاوہ اس کا باپ منگولوں میں ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ اس کا نام تونائی خاں تھا۔ چنگیز خان کے لشکر میں اس نے ہزاروں مسلمانوں کا خون بہایا تھا۔ جب 624ھ میں چنگیز خان نے وفات پائی تو وہ سرائے چلا آیا۔ نئے قاآن اعظم نے سلطنت کو صوبوں میں تقسیم کیا تو یہ علاقہ قبلائی خان کے حصے میں آیا۔ یہ علاقہ اردوئے زریں کے نام سے مشہور تھا کیونکہ یہاں کے منگول قبائل کے خیمے سنہری رنگ کے ہوتے تھے اس لئے انہیں خیام زریں یا زریں خیل کہا جاتا تھا۔ اس منگولی ریاست میں سرزمینِ خوارزم، مغربی قپچاق، اردوئے زریں اور روس کا لاکھوں مربع میل رقبہ شامل تھا۔ سرائے اس پوری سلطنت کا دارالخلافہ بن چکا تھا۔ خوارزمی تہذیب کی نقالی کرتے ہوئے یہاں کے لوگوں نے بھی پختہ مکانات تعمیر کر لئے تھے۔ یہاں مسلمانوں کے تجارتی قافلے اکثر آتے تھے۔ منگول خود ان قافلوں کو تحفظ فراہم کرتے۔ مگر جونہی کوئی تاجر کوئی مشکوک حرکت کرتا پایا جاتا تو اسے بلاتحقیق قتل کر دیا جاتا۔ چنگیز خان نے مسلمانوں کے سروں کی ایک قیمت لگائی ہوئی تھی جو اس کی وفات کے ساتھ ہی ختم ہوگئی۔ منگولوں نے مسلمانوں کے سروں کی ایک عرصہ تک قیمتیں وصول کی تھیں، اب بھی وہ ان کے سروں کی جانب حریصانہ نگاہوں سے دیکھتے۔ نیا ضابطہ قانون بڑا سخت رکھا گیا تھا جس میں تاجروں اور سفارت کاروں کو مکمل تحفظ کی یقین دہانی کرائی گئی تھی۔ شکست خوردہ سلطان جلال الدین خوارزم اسی سلطنت کے زیریں حصوں میں اپنے اقتدار کی دوبارہ حصولیابی کے لئے سرگرم رہا تھا اور 628ھ میں ایک کرد کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔

مطیع الدین کا باپ نورالدین بڑا دیندار اور متقی شخص تھا اس نے اپنی زندگی اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ وہ بلخ کا رہنے والا تھا جب چنگیز خان وہاں حملہ آور ہوا تو وہ ان دنوں معہ اہل و عیال مدینہ گیا ہوا تھا۔ واپس پہنچ کر اس نے بلخ کی بربادی اور تباہ حالی دیکھی تو وہ کئی دن تک آنسو بہاتا رہا۔ اس نے اسی دن سے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہر قیمت پر ان بگڑے وحشیوں کو راہ راست پر لائے گا۔ ایک مشکل ترین امر کا پختہ عزم کئے اور مدد خدا کو اپنا محافظ خیال کرتے ہوئے اس نے اپنا رخت سفر باندھا اور سرائے چلا آیا۔ اس نے کسی زمانے میں تاتاری علاقوں میں تبلیغ اسلام کے فرائض انجام دیئے تھے جس کی بدولت اسے تاتاری زبان سے کسی حد تک واقفیت ہوگئی تھی۔ وہ مہارت سے تاتاری زبان نہیں بول سکتا تھا مگر کچھ عرصے بعد اس کی یہ خامی مٹ گئی۔ یہاں اس کی آمد کا مقصد تبلیغ و اشاعت اسلام تھا۔ وہ اپنے ساتھ اپنی بیوی اور بچوں کو لایا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی علامہ عبدالعزیز الکندی بھی اس کے ہمراہ ہوگیا۔ سرائے میں مستقلاً رہائش پذیر ہونا بے حد کڑا کام تھا مگر قدرت نے اس کی نیت کا پھل دیا اور اسے وہاں رہنے کی اجازت مل گئی۔ نورالدین روزانہ سینکڑوں تاتاریوں کو اسباق ہدایت سمجھاتا۔ پہلے پہل تو کوئی بھی اس کی بات پر کان نہیں دھرتا تھا مگر پھر آہستہ آہستہ دلوں میں ایمان کی گرمی پیدا ہونے لگی اور ایک دو تاتاری حلقہ اسلام میں داخل ہوگئے۔ یہ تعداد نہ ہونے کے برابر تھی پھر بھی یہ امید افزا ضرور تھی۔ دن آہستہ آہستہ گذرتے رہے۔ نورالدین کے مکان کے عقب میں تونائی خان کا گھر تھا جس کی بیٹی گل دتوژ گذرتی ساعتوں میں جانے کب اپنا دل مطیع الدین کو دے بیٹھی تھی۔ مطیع الدین بھی اس کے فراق میں آہیں بھرنے لگا تھا۔ نورالدین کے تونائی خان سے بے حد عمدہ تعلقات تھے مگر ان میں ابھی ایسی کوئی منزل

نہیں آئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ عزیز داری بڑھاتے۔



فاطمہ محمود کے معاملے میں اپنے بھائی کی پسپائی پر بے حد مسرور تھی۔ وہ محمود کو اپنے ساتھ لے کر جب گھر لوٹی تو اس کے خاوند ابومسعود نے اسے مبارکباد دی۔ وہ چاہتا تو دربار سلطانی کا دباؤ ڈلوا کر مقدمہ جیت سکتا تھا مگر وہ بے حد اصول پسند اور مذہبی شخص تھا۔ اس نے محمود کو اپنے گھر میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دی۔ محمود کو ان کے حسن سلوک میں اپنا سابق آقا بندقداری یاد آ جاتا۔ محمود کو اس گھر میں کبھی اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ وہ غلام ہے۔ فاطمہ کو بچوں سے بے پناہ محبت تھی اس کی ایک وجہ اکلوتا فرزند تھا جو کہ سات سال کی عمر میں بیماری کا شکار ہو کر وفات پا گیا تھا۔ اللہ نے اس کی گود دوبارہ ہری نہیں کی۔ دونوں میاں بیوی اولاد کی محرومی کے باوجود شاکر رہے۔ محمود کو پا کر جیسے انہیں جنت مل گئی تھی۔ ابومسعود اس کے لئے نئے کپڑوں اور ضروریات کی اشیاء کی فراہمی میں جتا رہتا جبکہ فاطمہ اس پر اپنے سب چاؤ ایک ایک کر کے اتارا کرتی۔ زندگی کے تین سال محمود نے جس جہنم میں کاٹے تھے، اس کا احساس تک معدوم ہوتا جا رہا تھا۔ فاطمہ نے اسے ایک درمیانے درجے کے مدرسے میں داخل کرا دیا۔ جہاں وہ مزید تعلیم حاصل کرنے لگا۔ وہ چونکہ بے حد ذہین تھا اس لئے جلد ہی اساتذہ میں مقبول ہوگیا اور وہ بھی اس پر خصوصی توجہ دینے لگے۔ محمود میں ایک عادت بڑی پختہ تھی جو کہ اس نے کڑے حالات میں بھی اپنائے رکھی تھی۔ وہ نماز پنج گانہ باقاعدگی سے ادا کیا کرتا۔ مسجدوں میں جانے سے اسے جہاں سماجی برائیوں کے خلاف ترغیب ملتی تھی وہیں وہ دوسروں کو اپنی مشاہداتی نگاہوں سے پرکھتا۔ وقت گذرتا گیا فاطمہ کی محنت رنگ لانے لگی۔ محمود کو عمدہ تعلیم تک رسائی حاصل ہوگئی۔ قرآن و فقہ میں اس کو عبور تو نہیں ہو سکا مگر وہ اسلام کے بنیادی شعائر سے بخوبی واقف ہوگیا۔

636ھ کے وسط میں ایک دن جب محمود نے اپنی نئی کامیابی کی خبر فاطمہ کو سنائی تو اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ آج اسے اپنا فوت شدہ بیٹا بڑی شدت سے یاد آنے لگا۔ محمود فاطمہ کو روتے دیکھ کر تڑپ اُٹھا۔ اُس نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ ان کے کوئی اولاد ہوئی تھی یا نہیں۔ وہ اپنے طور پر یہی اخذ کئے بیٹھا تھا کہ اولاد نہ ہونے پر یہ دونوں میاں بیوی رنجیدہ رہتے ہیں۔ اسے یہ معلوم تھا کہ وہ اسے اپنا غلام نہیں بلکہ بیٹا سمجھتے ہیں۔ محمود نے آگے بڑھ کر فاطمہ کے آنسو اپنی ہتھیلی سے پونچھ ڈالے۔ وہ آج بڑا مضطرب تھا کہ آخر ایسی کونسی وجہ ہے کہ وہ جب بھی کوئی خوشی کی خبر سناتا ہے تو فاطمہ رو پڑتی ہے۔

''میری اُم محسنہ!'' محمود ہمت کر کے بولا۔ ''ایک بات پوچھوں آپ برا تو نہیں مانیں گی''۔

''نہیں تو...... میں کیوں کر برا مانوں؟''

''میں اس بات پر بڑا پریشان ہوں کہ آپ میری کامیابی پر خوش ہوتی ہیں یا غمگین...... خدا کے لئے مجھے آج یہ حقیقت بتا ہی ڈالیے''۔

''نہیں میرے بیٹے!'' فاطمہ اس کی بات پر تڑپ سی گئی۔ ''تیری کامیابی ہی سے ہم زندہ ہیں۔ تجھے دیکھ دیکھ کر ہماری زندگی کٹ رہی ہے''۔

''مجھے کہنا تو نہیں چاہئے مگر سچائی کڑوی ہی ہوتی ہے۔ اللہ نے اگر آپ کو نعمتِ فرزند سے نہیں نوازا تو اس میں بھی کوئی بھلائی مضمر ہوگی۔ دیکھئے فرزند کے روپ میں اللہ نے مجھے جو آپ کے پاس بھیج دیا ہے''۔ محمود نگاہ جھکا کر بولا۔

''تو صحیح کہتا ہے محمود!'' فاطمہ گہری سانس لے کر بولی۔ ''اللہ کے کاموں میں بھلائی ہی ہوتی ہے اس

لئے اس نے سات سال کی عمر میں ہی اپنی دی ہوئی نعمت واپس لے لی۔ اگر آج وہ زندہ ہوتا تو...... میں جس طرح تیری کامیابی کی خبر پا کر دلشاد ہو جاتی ہوں۔ ذرا سوچ تو، اس کی کامیابی مجھے کتنی مسرت پہنچاتی۔ تو بے فکر رہ میں تیری کامیابی پر غمگین نہیں ہوں بلکہ اس میں میں اپنے فرزند کو دیکھتی ہوں''۔

محمود اس کی بات پر جہاں حیرت زدہ رہ گیا تھا وہیں اسے بے حد تاسف ہوا کہ اسے ایسی بات چھیڑنا نہیں چاہیے تھی۔

''آپ کے بیٹے کو ہوا کیا تھا؟''

''اسے بخار آ گیا تھا میں نے بہتیرے جتن کئے مگر اسے نہ بچا سکی......'' فاطمہ کی نگاہوں میں گذرے پلوں کی تصویر اُمڈ آئی، وہ سسکنے لگی۔ محمود سے نہ رہا گیا اس نے آگے بڑھ کر فاطمہ کو اپنی مضبوط بانہوں کی آغوش میں لے لیا اور اس کی ڈھارس بندھانے لگا۔ وہ کسی بیٹے سے کم نہیں تھا۔

''محمود!'' فاطمہ پلو سے اپنی آنکھیں خشک کرتی ہوئی بولی۔ ''آج اگر میرا بیٹا زندہ ہوتا تو بالکل تمہارے جیسا ہوتا۔ کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے کہ جیسے اُس نے تیری صورت میں مجھے میرا بیٹا واپس لوٹا دیا ہو''۔

''اس میں شک والی کون سی بات ہے۔ میں آپ ہی کا بیٹا ہوں''۔ محمود تیزی سے بولا۔

''تو میرا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے؟ تیرا نام تو محمود ہے اور اس کا نام تو بیبرس تھا''۔ فاطمہ نے سسکتے ہوئے ایک سرد آہ بھری۔ محمود اس کے غم کی شدت کو اپنے دل ودماغ کے دریچوں پر دستک دیتا ہوا محسوس کرنے لگا۔

''میرا نام محمود ہے تو کیا ہوا؟ نام بدلے بھی جا سکتے ہیں۔ میرا نام آج سے بیبرس ہے...... آپ کا بیبرس!'' اچانک محمود فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ فاطمہ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کی نگاہیں ایک عرصے سے پیاسی تھیں۔ ان میں ممتا کی محبت کا گہرا درد دکھائی دے رہا تھا پھر فاطمہ سے نہ رہا گیا اس نے محمود کو اپنے سینے سے چمٹا کر آنسوؤں کے دریا بہا دیے۔

غلامی ماں بیٹے کے رشتے میں تبدیل ہو گئی تھی۔ محمود اب بیبرس ہو گیا تھا۔

''بیبرس بندقداری......''

اسے اپنے مہربان آقا کی یاد کسی پل بھی نہیں بھولی تھی۔ اس نے اپنے اس نئے نام کے ساتھ اس کے لقب کو ہمیشہ کے لئے ساتھ جوڑ دیا تھا۔ فاطمہ دن بھر اسے بیبرس کے نام سے پکارا کرتی۔ وہ کبھی کبھار شفیق فاطمہ میں اپنی ماں کو دیکھتا تو اسے یوں محسوس ہوتا کہ جیسے اس کی تلاش ختم ہو گئی ہے۔ اکثر اس کی نگاہیں بھی نم ہو جایا کرتیں۔ ابومسعود بھی اس نئی تبدیلی سے سرور رہا تھا۔



مطیع الدین نے بڑی عجلت میں دیوار سے دوسری جانب چھلانگ لگائی۔ وہ آج بڑی مشکل سے توتائی خان کی نگاہوں سے بچ پایا تھا۔ وہ ان دنوں کے حالات کی نزاکت سے بخوبی واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ توتائی خان کے سامنے وہ اس کے گھر میں اپنی موجودگی کا کوئی جواز نہیں پیش کر پائے گا اور نتیجتاً اس کے ساتھ ساتھ اس کا گھرانہ بھی منگولیانہ بربریت کا شکار ہو جائے گا۔ یہ گل وتوتڑ کی ڈھیل تھی کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی۔ وہ اس قدر حواس باختہ ہو رہا تھا کہ اس نے دوسری جانب دیکھے بنا ہی چھلانگ لگا دی۔ جب اسے ایک مضبوط گرفت نے اپنے ہاتھوں میں پکڑا تو اسے ہوش آیا۔ وہ نوجوان منگول تھا، خوش شکل ہونے کے ساتھ اس کے چہرے پر منگولوں کی سی درشتی نہیں تھی۔ مطیع الدین اس نئی افتاد پر گھبرا سا گیا۔ وہ اس کی بانہوں میں جھولتا رہا۔ منگول نوجوان کے چہرے پر رونق سی پھیلی۔

''برادر! آسمان سے ٹپکے ہو یا کسی نے ٹپکا ڈالا ہے؟'' اس کا چہرہ لمحہ بھر میں کشت زعفران بن گیا۔ مطیع الدین اس کی طرف حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ اس کے وہم وخیال میں بھی منگول ایسے نہیں ہو سکتے تھے۔

''نہ ٹپکا ہوں اور نہ ہی ٹپکایا گیا ہوں بس ذرا اچھل کود کی مشق کر رہا تھا''۔

مطیع الدین نے بات بنائی۔

''ذرا دھیان سے ایسی مشقیں کیا کرو۔ آج تو میں نے سنبھال لیا ہے ورنہ کسی روز اپنی پسلیاں تڑوا بیٹھو گے''۔ نوجوان نے مسکرا کر کہا اور دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ مطیع الدین اس کے بازوؤں کے حلقے سے نکل کر زمین پر جا گرا۔ کمر میں ہلکی سی چوٹ نے اس کے منہ کا ذائقہ خراب کر دیا تھا۔

''تمہارا شکریہ......'' مطیع الدین منہ بنا کر بولا۔ نوجوان نے ہاتھ آگے بڑھا کر اسے اُٹھا کر کھڑا کر دیا۔ مطیع الدین اپنے کپڑوں پر لگی دھول جھاڑنے لگا۔

''تم چہرے سے تو ترک لگتے ہو''۔ نوجوان نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

''عمدہ پہچان ہے...... تمہاری نگاہ کی داد دینا چاہئے ورنہ اکثر لوگ مجھے عرب خیال کرتے ہیں۔ ویسے تم ہو کون......؟ خد وخال سے تو منگول دکھائی دیتے ہو مگر تمہارا چہرہ اس کی نفی کرتا ہے''۔ مطیع الدین نے پوچھا۔

''میں منگول ہی ہوں۔ سنا ہے کہ میری پیدائش ترک علاقے میں ہوئی تھی۔ میری ماں ان دنوں حاملہ تھی اور میرے باپ کے ساتھ جنگ پر نکلی تھی۔ گرجستان میں یا پھر اس کے قرب وجوار میں ہی میری پیدائش ہوئی تھی۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ مجھ پر وہ پانی اپنے نقش چھوڑ گیا ہے''۔

اس نے مطیع الدین کی تشنگی مٹا دی تھی۔

''تم یہاں کیا کر رہے تھے؟'' نوجوان نے یکدم چونک کر پوچھا۔ اچانک سوال پر مطیع الدین گڑبڑا سا گیا۔

''میں سمجھ گیا ہوں کہ کیا معاملہ ہے؟''

اس نوجوان نے کچھ دیر تک جواب نہ پا کر ہنستے ہوئے کہا۔

''کک...... کیا مطلب؟'' مطیع الدین کی حالت اب ایسی ہو رہی تھی جیسے وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔ چند لمحے پہلے کی بے فکری کافور ہو چکی تھی، ایک رنگ اس کے چہرے پر آتا، دوسرا جاتا۔

''اس کا نام کیا ہے؟'' نوجوان نے چہک کر پوچھا۔ مطیع الدین کو یوں لگا کہ جیسے آج اس کی خیریت نہیں، گردن تو لازماً اتر جائے گی۔

''کک...... کس کا...... مم مم میرا نام تو مطیع الدین ہے''۔ وہ ایک منگول کے سامنے گھبرا گیا تھا۔

''میں نے تمہارا نام نہیں پوچھا؟...... مگر تم اتنا گھبرا کیوں رہے ہو، تمہاری تو ٹانگیں بھی کانپتی دکھائی دے رہی ہیں''۔ نوجوان نے اس کے سراپے پر گہری نگاہ ڈالی۔

''نن...... نہیں تو......!''

''مسلمان ہو اسی لئے اناڑی پن کا مظاہرہ کر رہے ہو...... خیر مجھ سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں میرا نام برقائی خان ہے''۔ اس نے ڈھارس بندھائی۔

''شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو کہ تم سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم روایتی منگول نہیں دکھائی دیتے''۔ مطیع الدین اس کے لہجے سے سنبھل چکا تھا۔ وہ خود کو آنے والی کسی بھی مصیبت سے نپٹنے کے لئے تیار کرنے میں مصروف تھا۔

'' لگتا ہے ..... اب تمہارے عزائم جارحیت کی طرف قدم بڑھانے لگے ہیں''۔ برقائی خان نے اس کی نگاہوں میں مزاحمت کی کرنیں دیکھ لی تھیں۔ مطیع الدین اب قدرے حیرت سے اس کی صورت دیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

'' تم کیا چیز ہو......؟ دل کی بات آنکھوں سے پڑھ لیتے ہو'' مطیع الدین الجھے لہجے میں بولا۔

'' تمہاری بات سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے کہ تم نے میری صلاحیت کے لئے اچھے الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔ یہ صلاحیت جاودانی آسمان کی بخشی ہوئی ہے۔ جس پر کبھی کبھار میں خود بھی دنگ رہ جاتا ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ دوستی کرنا پسند کرو گے؟'' برقائی خان نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

'' یقیناً!'' مطیع الدین نے اس کی پیشکش کا خیر مقدم کیا۔'' مجھے تمہاری دوستی پر ناز ہو گا کہ میں ایک نگاہ شناس رفیق کے ساتھ زندگی کے آئندہ پل بتا سکوں گا''۔

برقائی خان نے اس کی جانب اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ مطیع الدین نے اس ہاتھ کو پکڑ کر اسے اپنی جانب کھینچ کر اسے اپنے گلے لگا لیا۔ دونوں کی اچانک ملاقات نے انہیں گہری دوستی کے بندھن میں باندھ دیا۔ ایک ایسی دوستی، جس میں آئندہ آنے والے برسوں میں کئی لازوال سوز پنہاں تھے۔

'' اب تو اس کا نام بتا دو......؟'' برقائی خان نے منہ بسور کر کہا۔ جس پر مطیع الدین نے زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ چھیڑ خانی کرتے ہوئے وہاں سے آگے بڑھ گئے۔



636ھ کے آخر میں فاطمہ کا ماموں زاد بھائی جمال الدین المراحی اسے ملنے دمشق چلا آیا۔ وہ سلطان مصر سیف الدین ابوبکر ایوبی الملک العادل ثانی کے دربار میں ایک معزز عہدے دار تھا۔

سلطان الملک العادل ثانی اپنے باپ الملک الکامل کی وفات کے بعد 635ھ میں سلطان مصر بنا تھا۔ اس کی عمر ابھی تیرہ برس کی تھی کہ اسے سلطان مصر بنا دیا گیا۔ یہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے بھائی الملک العادل اوّل کا پوتا تھا۔ درباری امور سے اسے کوئی شد بد نہیں تھی، وہ سارا دن مختلف انواع کی تفریحوں میں مگن رہا کرتا اور امور سلطنت اتابک، درباری عہدیدار اور امراء سنبھالتے۔ جمال الدین المراحی بھی انہی خاص عہدیداروں میں سے ایک تھا۔ وہ دمشق کے سلطان الملک الصالح اسمٰعیل ایوبی سے ملنے آیا تھا۔ سفارت سے فراغت پا کر اس کا دل فاطمہ سے ملنے کو چاہا تو وہ اس کے گھر چلا آیا۔ فاطمہ اس کی غیر متوقع آمد پر جہاں متحیر ہوئی وہیں اسے بے حد خوشی ہوئی۔ سارا دن پرانی یادوں اور قصوں کی نذر ہو گیا۔ اچانک جمال الدین المراحی نے علی بن الورقہ کے بارے میں پوچھ لیا تو فاطمہ نے اس کا حسن سلوک بیان کرنا شروع کر دیا۔ محمود بیبرس بھی اسی اثناء میں وہاں پہنچ گیا تھا۔ فاطمہ نے جب اپنا قصہ ختم کیا تو محمود بیبرس نے علی بن الورقہ کی اپنے آقا بندقداری کی داستان اس کے سامنے گوش گذار دی۔ جمال الدین اپنے پھوپھی زاد بھائی علی بن الورقہ کی ناشائستہ حرکات پر بڑا مغموم ہوا۔ فاطمہ نے اپنے بھائی کی ناپسندیدہ حرکات پر تاسف کا اظہار کیا تھا۔ جمال الدین المراحی محمود بیبرس میں خاصی دلچسپی لے رہا تھا جب اسے یہ معلوم ہوا کہ محمود بڑی مہارت سے مصری عربی زبان میں بھی بات کر سکتا ہے تو اس نے فرمائش کی کہ وہ اس کے ساتھ مصری زبان میں بات کرے، جب محمود بیبرس نے بات چیت شروع کی تو وہ دنگ رہ گیا تھا کہ اس کے لہجے میں ذرا بھی اجنبیت موجود تھی۔ وہ اس کی خوبی سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔ باتوں باتوں میں مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا۔ فاطمہ کا شوہر ابو مسعود بھی لوٹ آیا۔ محمود بیبرس نماز کے لئے وہاں سے اُٹھ گیا۔ فاطمہ ان دونوں کے لئے کھانے کے انتظام میں مصروف ہو گئی۔ ابو مسعود اور جمال

الدین میں حکومتی امور پر بات چیت ہوتی رہی۔ جمال الدین المراحی نے اگلی صبح واپسی کا بتایا تو ابو مسعود خاصا جز بز ہوا۔ اس کا اصرار تھا کہ وہ کم از کم ایک ہفتہ تو ان کے پاس رہتا۔

رات کو جمال الدین المراحی جب اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا تو محمود بیبرس اس کے پاس چلا آیا کہ شاید اسے کسی چیز کی ضرورت ہو یا دبوانے کی حاجت ہو۔ جمال الدین نے اسے منع کرتے ہوئے فاطمہ کو بلانے کے لئے کہا۔ محمود نے فاطمہ کو جمال الدین کا پیغام دیا تو وہ اس کے پاس چلی آئی۔ جمال الدین نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ فاطمہ نے ایک تکیہ دیوار کے ساتھ لگایا اور اس پر ٹیک لگاتے ہوئے اس کے بالمقابل بیٹھ گئی۔

'' فاطمہ بہن!'' جمال الدین قدرے توقف سے بولا۔'' میں نے تمہارے گھر کا حال بغور دیکھا ہے جو کہ تمہاری محرومیوں اور افلاس کی داستان چیخ چیخ کر سنا رہا ہے۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ تم نے ایسے میں کبھی اپنے اس بھائی کو یاد نہیں کیا''۔

'' جمال الدین!'' فاطمہ اس کی بات پر دھیما سا مسکرائی۔'' میں نہیں سمجھتی کہ محرومیاں اور افلاس کبھی ہمارے گھر میں داخل ہو پائے ہوں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہمیں بہتر زندگی سے نوازا ہے۔ مجھے ایسی امارت کبھی نہیں چاہئے تھی جو مجھے اپنے بھائی جیسا مغرور اور ظالم بنا دیتی۔ میرے پاس محبت، دل کے سکون اور عاجزی و انکساری جیسی نعمتیں ہیں۔ جن کا اکثر امراء کے پاس فقدان ہوتا ہے''۔

'' فاطمہ بہن!'' جمال الدین بولا۔'' تم صحیح کہتی ہو مگر دنیا کے کچھ نہ کچھ لوازمات بھی ہوتے ہیں، مجھے تمہارے انکار پر فخر ہے مگر تم نے اپنے بعد کے لوگوں کے بارے میں کبھی کچھ سوچا ہے''۔

'' کیا مطلب؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

فاطمہ چونک پڑی۔

'' میرا اشارہ بیبرس کی جانب ہے''۔ جمال الدین نے کہا۔

'' صاف صاف کہو! میں کچھ سمجھی نہیں''۔

فاطمہ اس کی بات پر الجھ سی گئی۔

'' بیبرس کی عمر تقریباً کتنی ہو گی؟''

جمال الدین نے ایک نیا سوال کر دیا۔

'' میرے خیال میں وہ ستارہویں برس میں قدم رکھ چکا ہے''۔ فاطمہ سوچتے ہوئے بولی۔

'' تم نے کبھی اس کے بارے میں کچھ سوچا ہے کہ وہ آنے والے وقت میں کیا کرے گا.....؟ اس کا ذریعہ معاش کیا ہو گا؟'' جمال الدین نے پوچھا۔ فاطمہ اس کی بات سن کر پریشان سی ہو گئی۔

'' اس جانب مجھے کبھی سوچنے کا خیال نہیں آیا۔ میں ابو مسعود سے مشورہ کروں گی کہ وہ اسے سفارش کر کے دربار میں کوئی کام دلوا دے''۔ فاطمہ جیسے خود سے باتیں کر رہی تھی۔

'' فاطمہ بہن!'' جمال الدین تیزی سے بولا۔'' یہ خیال دل سے نکال دو کہ ابو مسعود کی سفارش پر اسے کوئی ڈھنگ کا کام مل سکے گا۔ اگر تمہارے شوہر میں ایسی کوئی قابلیت ہوتی تو وہ آج تک اس معمولی عہدے پر ہی ٹکا نہ رہتا''۔ جمال الدین کا لہجہ آخر میں کڑوا ہو گیا تھا۔

'' تم کسی حد تک صحیح کہتے ہو..... مگر میں ایسے میں اور کیا سوچ سکتی ہوں؟'' فاطمہ زچ سی ہو گئی۔

'' دیکھو فاطمہ بہن!'' جمال الدین سیدھا ہوتا ہوا بولا۔'' تمہارے پاس کوئی خزانہ تو ہے نہیں کہ تم آنے والے کل میں نکال کر بیبرس کے حوالے کر دو کہ وہ تجارت کر سکے اور نہ ہی تمہارے شوہر کے مراسم کی کوئی ایسی

نوعیت ہے کہ تم اسے کوئی اچھا عہدہ دلوا سکو"۔ وہ یکدم خاموش سا ہو گیا۔

"تم بولتے رہو میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں"۔ فاطمہ اس کی جانب غور سے دیکھ رہی تھی۔

"میرے پاس ایک چھوٹی سی تجویز ہے جس کی بدولت تمہارے بیٹے کو ایک اچھا اور روشن مستقبل میسر آ سکتا ہے"۔ جمال الدین نے کہا۔

"میں تمہاری تجویز سننے کے لئے بے تابی کا مظاہرہ کروں یا تم اب جان بوجھ کر بات میں اسراریت پیدا کرنے پر تلے ہو"۔ فاطمہ نے اس پر طنز کیا۔

"اوہ! برا مت ماننا فاطمہ بہن!" جمال الدین کھسیانا ہو کر دانت نکالنے لگا۔ "سلطانوں کے دربار میں رہ کر کچھ ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ بات کرتے میں دائیں بائیں بہک جاتا ہوں۔ تمہید باندھنا وہاں تو مجبوری ہوتی ہے مگر عام زندگی میں بھی اس کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میرے پاس ایک تجویز ہے اگر بیبرس کو میرے ساتھ مصر بھیج دو تو میں اسے اپنے دربار میں کسی اچھے عہدے پر پہنچا سکتا ہوں۔ میں نے اس میں ایک عمدہ صلاحیت دیکھی ہے جو کہ اسے ایک دن کسی اچھے مقام تک پہنچا دے گی"۔

یہ سن کر جیسے فاطمہ کے دل پر چوٹ لگی۔

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں اس کے بغیر رہنے کا اب تصور بھی نہیں کر سکتی"۔ فاطمہ اس کی بات سن کر مزید پریشان ہو گئی۔

"دیکھو بہن!" جمال الدین سمجھاتے ہوئے بولا۔ "بچوں کے اعلیٰ اور روشن مستقبل کے بارے میں والدین اس وقت سے سوچنا شروع کر دیتے ہیں جب وہ ان کی گود میں کلکاریاں مارتے ہیں، پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب والدین کو بچوں کو عملی زندگی کے میدان میں اتارنا پڑتا ہے تو اس وقت وہ فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں معاونت دیتے ہیں، ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بیبرس کی عملی زندگی کا وقت اب شروع ہو چکا ہے، تمہیں اسے گھر میں بٹھا کر نکھٹو بنانے کے بجائے کسی کام دھندے میں لگا کر اسے اجنبیوں کے درمیان تنہا بھیج دینا چاہئے تاکہ وہ اپنے کردار کی تعمیر کر سکے، اپنے مستقبل کی اہمیت سے آگاہ ہو جائے اور کوئی ہدف مقرر کر کے اس کی جانب بڑھنا شروع کر دے۔ اگر تم سے اس کی جدائی برداشت نہیں ہوتی تو تم بھی اس کے ہمراہ مصر چلی چلو۔ اپنے بیٹے کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھو اور اس کی ترقی اپنی آنکھوں سے دیکھو"۔

"مصر! نہیں نہیں......" فاطمہ یکلخت گھبرا اٹھی۔ "میں دمشق سے باہر نہیں جا پاؤں گی۔ تم تو جانتے ہو کہ میں یہاں اسی گھر میں پلی بڑھی، جوان ہوئی، پھر ایک دن بیاہ کر میکے چلی گئی۔ میکے والوں نے جب گھر بدر کیا تو میں نے دوبارہ اسی گھر میں آ کر پناہ لی تھی۔ اسی گھر میں میری آنکھوں کے سامنے میرے والدین گذر گئے اور ان کے بعد میں نے جوانی سے بڑھاپے تک کا سفر یہیں طے کیا...... اب میں آخری عمر میں مصر چلی جاؤں...... یہ مجھ سے کبھی نہیں ہوگا"۔

"تمہیں اپنے بیٹے کی زندگی بنانے کے لئے یہ قربانی تو دینا ہی ہوگی"۔ جمال الدین بولا۔

"تم اگر کچھ کر سکتے ہو تو یہیں کر دو......تم سلطان دمشق سے سفارش کر کے بیبرس کو کوئی عہدہ دلوا دو"۔ فاطمہ کا لہجہ رندھ سا گیا تھا۔

"فاطمہ بہن!" جمال الدین فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "دمشق میں کسی سفارش کی میں تمہیں کوئی طفل تسلی نہیں دوں گا۔ میں یہاں محض حکومتی کام کے سلسلے میں آیا ہوں۔ دربار تک رسائی تو ضرور ہے مگر یہاں میری سفارش کی کوئی حیثیت نہیں۔ البتہ مصر میں میں جو چاہوں گا کر سکوں گا"۔

"ٹھیک ہے...... تمہارا بے حد شکریہ کہ تم نے میری توجہ ایک ضروری معاملے کی جانب مبذول کرائی جس سے میں بے خبر تھی۔ میں خود ہی کوئی تدبیر کروں گی شاید کوئی سبیل نکل آئے"۔ فاطمہ نے جواب دیا۔ جمال الدین اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔ اسی اثناء میں ابو مسعود بھی وہاں آ گیا۔ وہ کسی کام کے سلسلے میں باہر گیا ہوا تھا۔ جمال الدین نے بات کو ختم کرنے کے بجائے مزید بڑھا دیا۔ کافی دیر تک ان تینوں میں گرما گرم بحث جاری رہی۔ ابو مسعود نے فاطمہ کو سمجھایا کہ جمال الدین کا مؤقف درست ہے، دمشق کے بجائے مصر میں بیبرس کو اچھے مواقع مل سکیں گے۔ باتوں باتوں میں تہجد کا وقت ہو گیا۔ ابو مسعود نے صبح دربار حاضری کا عذر پیش کرتے ہوئے وہاں سے رخصت لی۔ فاطمہ بھی جمال الدین کو وہاں تنہا چھوڑ کر اٹھ گئی تاکہ وہ کچھ دیر سو سکے۔ فاطمہ مہمان خانے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ یہاں بھی کچھ دیر ابو مسعود نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ بیبرس کو خود سے جدا کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ کافی دیر تک ان دونوں میں حیل و حجت چلتی رہی، بالآخر فاطمہ نے فیصلہ کر لیا کہ اسے بیبرس کے روشن مستقبل کے لئے عارضی جدائی کا صدمہ برداشت کر لینا چاہئے۔



وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مطیع الدین اور منگول نوجوان برقائی خان میں قربت بڑھتی چلی گئی برقائی خان بلا روک ٹوک اس کے گھر آنے جانے لگا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر خود کو ادھورا محسوس کیا کرتے۔ عمر رسیدہ نور الدین کو ان دونوں کی دوستی پر بڑا ناز تھا۔ مطیع الدین سے برقائی خان نے کئی بار پوچھا کہ وہ کس حسینہ کے پیچھے دیوانہ ہوا پھرتا ہے مگر مطیع الدین لاشعوری طور پر اسے بتانے سے گریز کرتا رہا۔ برقائی خان نے کبھی بھی اس پر دباؤ نہیں ڈالا اور نہ ہی اصرار کیا کہ وہ اسے اس بارے صحیح بتائے۔ حالانکہ جس گھر میں سے وہ کودا تھا اس کے بارے میں معلومات حاصل کر لینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وہ دونوں اکثر ریچھ اور بھیڑیوں کے شکار پر دریائے والگا کے ملحقہ جنگلوں میں چلے جاتے تھے۔ یہ برف کا جنگل کہلاتا تھا کیونکہ یہاں کے درخت ہمیشہ برف سے لدے رہتے۔ برف میں سفید ریچھ اور سفید بھیڑیوں کو ڈھونڈنا اور پھر انہیں اپنے نوکیلے نیزے کا نشانہ بنانا بڑا دشوار کام سمجھا جاتا تھا۔ منگولوں کے لئے یہ کام عام سی بات تھی۔ ان کے بچے ابتدائی عمر میں ہی اس کام کی تربیت پاتے تھے۔ برقائی خان کی عقاب جیسی نگاہوں سے جانور بھی پناہ مانگتے تھے۔ مطیع الدین اس کی صلاحیت کی اکثر داد دیئے بنا نہ رہ پاتا۔

حسب عادت وہ آج پھر شکار کی نیت سے علی الصبح گھر سے روانہ ہوئے۔ برقائی خان والگا کے جنگل سے اکتاہٹ محسوس کر رہا تھا اس نے ضد کی کہ وہ سرکیشی پہاڑی پر چلیں گے۔ جہاں دوسرے کئی خونخوار جانور موجود ہوتے ہیں۔ مطیع الدین نے پہلے پہل تو انکار کیا مگر وہ اس کی ضد کے سامنے زیادہ دیر تک جم نہ سکا۔ اسے سرکیشی پہاڑی پر چلنا ہی پڑا۔ یہ دریائے والگا کے جنگل سے قریباً سو کوس دور تھی۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے کم از کم نصف دن خرچ ہو جاتا تھا جبکہ پہاڑی پر چڑھائی باقی نصف دن ہڑپ کر جایا کرتی۔ بڑے مشکل حالات میں ہی منگول ادھر کا رخ کیا کرتے تھے، جب والگا کے جنگل میں شکار ختم ہو جاتا۔ البتہ منگولوں کا ایک قبیلہ اس پہاڑی پر ہر ہفتے زوانہ ہوتا تھا۔ یہ منگول سمائی کہلاتے تھے۔ ان کا ذریعہ معاش ہی ریچھ اور بھیڑیئے تھے۔ وہ ان کو شکار کرنے کے بعد ان کی کھالیں بڑی نفاست سے اتار لیا کرتے اور انہیں سرائے لا کر مناسب داموں میں فروخت کر دیتے۔ انہی لوگوں سے منگول تاجر کھالیں خرید کر دوسرے شہروں میں جاتے تھے۔ سمائی قبیلے کے بارے میں مشہور تھا کہ اگر ان کا شکار چھیننے کی کوشش کی جائے تو وہ اپنے مخالف کو نہ صرف جان سے مار دیتے تھے بلکہ اس کی کھال اتار کر اپنے جوتے بنوایا کرتے۔ وہ اس بارے میں بڑی مسرت سے بتاتے کہ انسانی کھال کے جوتے

ہر قسم کی سردی کو زائل کر دیتے ہیں۔ سرکیشی پہاڑی کے علاوہ دوسری کئی پہاڑیوں پر ان کے مسکن تھے۔ شدید ترین سردی میں رہنا بڑی ہمت کی بات تھی۔ وہ شہروں کی زندگی کو عیاشی کہا کرتے۔

برقائی خان نے چلتے وقت جب سنائی قبیلے کے بارے میں مطیع الدین کو بتایا تو جہاں اسے ان کی دشوار ترین زندگی پر حیرت ہوئی، وہیں ان کا طرزِ عمل جان کر اس کے بدن میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے چھوٹے قد کے گھوڑے ہمراہ لئے اور اپنی منزل کی جانب بڑھنے لگے۔ یہ گھوڑے لمبے لمبے بالوں کے باعث عربی گھوڑوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کے جسم پر قدرتی طور پر اضافی چربی چڑھی ہوتی ہے اور ان کی ٹانگیں لمبے لمبے بالوں سے ڈھکی رہتی ہیں۔ جس کے باعث وہ شدید ترین سردی کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انہی گھوڑوں کی پشت پر بیٹھ کر چنگیز خان نے سلطنت خوارزم روند ڈالی تھی۔ تینوں گھوڑے برف کے میدان میں اپنے سم دھنساتے ہوئے سرکیشی پہاڑی کی جانب بڑھتے رہے۔

دوپہر ڈھلنے تک وہ سرکیشی پہاڑی کے دامن میں پہنچ گئے تھے۔ مطیع الدین نے سر اٹھا کر عقب میں دیکھا تو اسے برف کے طویل میدان کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیا۔ سورج آسمان پر موجود تو تھا مگر اس کی بے رونق ہلکی دھوپ برف کا کچھ بھی نہیں بگاڑ پا رہی تھی۔ البتہ برف کے میدان پر دھوپ طلائی رنگت بکھیر کر اسے دلکش ضرور بنا رہی تھی۔ کہیں کہیں اونچے درخت بھی دکھائی دیتے جو برف سے ڈھکے پڑے تھے اور دھوپ کی ملمع سازی کا لاجواب شاہکار بنے ہوئے تھے۔ ایسے مناظر مطیع الدین نے محض سن رکھے تھے۔ اسے انہیں کھلی آنکھوں سے دیکھنے کا موقعہ نہ مل پایا تھا۔ آج وہ قدرت کے ان حسین دلطیف نظاروں سے محظوظ بھی ہو رہا تھا، اسے کبھی کبھار یہ دنیا زمین پر نہیں آسمان پر محسوس ہوتی۔ برقائی خان اس کے چہرے پر ایک آدھ نظر ڈالتا اور اسے مسحور پا کر زیرِ لب مسکرا دیتا۔

جب برقائی خان نے اسے بتایا کہ اب پہاڑی پر چڑھائی کا سلسلہ شروع ہونے والا ہے تو مطیع الدین کوہ قاف کے تخیل سے نکل کر محتاط ہو گیا۔ انہوں نے اپنے تینوں گھوڑوں کو ترتیب سے قطار میں چلانا شروع کر دیا۔ وادی کا سفر تو انہوں نے گھوڑوں کی پیٹھ پر طے کیا تھا مگر چڑھائی میں انہیں پیدل چلنا تھا۔ اکثر راستے بے حد دشوار اور غیر متوازن تھے جن سے پھسل جانے کا خطرہ تھا۔ برقائی خان نے اسے خصوصی طور پر ان راہوں کے بارے میں قبل از وقت آگاہی دینا مناسب سمجھی۔ جونہی ایسا کوئی رستہ قریب ہوتا تو وہ خبردار کر دیتا۔ اس نے صاف الفاظ میں متنبہ کر دیا کہ یہاں سے گرنے والے کی لاش تک نہیں مل پاتی۔ ان رستوں کے ہمراہ کئی گہری کھائیاں منہ کھولے انہیں اپنی جانب کھینچ رہی تھیں۔ وہ دونوں مسلسل مسافت کے بعد سورج ڈھلنے سے پہلے ہی اپنی مقررہ جگہ پر پہنچ گئے۔ یہیں انہوں نے اپنے خیمے لگانا تھے۔ رات بسر کرنے کے بعد اگلی صبح وہ جانوروں کے شکار پر نکل پڑتے۔ برقائی خان نے تیسرے گھوڑے کی پیٹھ پر رکھے ہوئے بڑے بڑے تھیلے کو اتارا اور اس میں سے ایک بڑا خیمہ نکالا جو سنہری رنگت کا تھا۔ دونوں دوست مل کر خیمہ کو برف میں گاڑنے لگے۔ مطیع الدین نے دن بھر کی مسافت کے دوران تھکن محسوس نہ کی۔ خیمے لگتے ہی بھوک اور تکان دونوں اس پر حملہ آور ہو گئیں۔ اس نے بھوک کی شدت کا ذکر جب برقائی خان سے کیا تو اس نے قہقہہ لگا کر کھانے پینے کا سامان نکالا اور پھر دونوں اپنے خیموں کے دامن میں کھانا کھانے لگے۔ کھانے سے فراغت پاتے ہی مطیع الدین ایک بستر پر دراز ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار دکھائی دینے لگا۔ برقائی خان اسے یونہی چھوڑ کر خیمے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر گذر گئی تو مطیع الدین کو اس کا خیال آیا کہ برقائی خان کہاں چلا گیا ہے؟ اس خیال کے کوندتے ہی اس کی نیند کافور ہو گئی۔ اس نے بستر چھوڑا اور باہر نکل آیا۔ رات ہو چکی تھی اور ہر سو چاند کی مدھم سی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔

اس نے چاروں جانب نگاہ دوڑائی مگر برقائی خان کا دور تک پتہ نہیں تھا۔ تینوں گھوڑے اپنی جگہ بندھے تھے۔ مطیع الدین کچھ فاصلے تک چاروں جانب اسے تلاش کرتا رہا مگر وہ یوں غائب ہو چکا تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ جانے کیوں مطیع الدین کو خوف سا محسوس ہونے لگا۔ وہ سردی سے کانپتا ہوا واپس اپنے خیمے پر لوٹ آیا۔ شدید سردی کے عالم میں وہ خیمے کے اندر بیٹھنے کے بجائے باہر بیٹھا برقائی خان کی راہ تک رہا تھا۔



اگلی صبح جب جمال الدین کو ابو مسعود نے بتایا کہ وہ فاطمہ کو راضی کر چکا ہے تو کامیابی کی مسرت سے اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ فاطمہ نے آنسوؤں کے جلو میں بیبرس کو تیار کیا اور اسے روانگی مصر کی خبر دی۔ بیبرس اس فوری فیصلے پر ششدر رہ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اسے اگلی صبح جمال الدین کے ساتھ ہی رخصت ہونا پڑے گا۔ فاطمہ نے اسے جی بھر کر پیار کیا اور نرمی سے سمجھایا کہ اسے ایک جگہ ٹھہر کر زندگی کو منجمد نہیں کرنا چاہئے بلکہ کسی اچھے مقام کی جانب قدم بڑھاتے رہنا چاہئے۔ یہ دوری محض عارضی ہوگی۔ جب وہ کسی مقام تک پہنچ گیا تو وہ خود اس کے پاس چلی آئے گی۔ بیبرس کا دل بے حد مغموم تھا۔ وہ کسی بھی صورت میں ماں جیسی شفیق مالکن سے جدا ہونے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے پہلے تو مصر جانے سے صاف انکار کر دیا کہ وہ اسے تنہا چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا مگر فاطمہ اپنے دل کو تھامے اسے سمجھاتی رہی۔ بیبرس کو مصر بھیجنے پر اس کا من بھی رضامند نہیں تھا مگر وہ اپنے شوہر سے وعدہ کر چکی تھی کہ وہ ہر قیمت پر بیبرس کو مصر بھیجے گی تاکہ اس کا مستقبل اندھیروں سے نکل کر تابناکی کی جانب رواں ہو۔ صبح کے پہلے پہر بیبرس کا ضروری سامان باندھ کر اسے روانہ کر دیا گیا۔ چلتے وقت فاطمہ نے بیبرس کو حکم دیا تھا کہ وہ جمال الدین کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آئے اور اس کی حکم عدولی کا مرتکب نہ ہو۔ فاطمہ اور ابو مسعود دونوں اسے قافلے میں سوار کرانے ساتھ آئے تھے۔ جب تک قافلہ روانہ نہیں ہو گیا، فاطمہ بیبرس کو پند و نصائح کرتی رہی۔ جب قافلہ روانہ ہوا تو فاطمہ کی آنکھیں چھلک پڑیں اس نے تیزی سے دوسری جانب منہ پھیر لیا، کہیں اس کے آنسو بیبرس کی راہ میں رکاوٹ نہ بن جائیں۔ جمال الدین نے ہاتھ ہلا کر اسے خدا حافظ کہا۔ بیبرس گردن موڑے ان دونوں کی جانب حسرت سے دیکھتا رہا۔ وہ کیسے آقا تھے؟ جنہوں نے اس کی غلامی کو فرزندی میں بدل ڈالا اور اس کے دامن میں اتنی خوشیاں بھر دیں کہ وہ سابقہ تلخی اور کڑواہٹ کو بھول گیا۔ آج انہوں نے بیبرس کے روشن مستقبل کے لئے خود کو تنہا کر لینا گوارہ کر لیا تھا۔

قافلہ کئی دن کی مسافت طے کر کے مصر کے دارالخلافہ قاہرہ جا پہنچا۔ جب بیبرس کو قاہرہ کی فصیل دکھائی دی تو اس کی نگاہ کے سامنے بندقداری کا چہرہ گھوم گیا۔ وہ اس کے ہمراہ کئی بار اس شہر آ چکا تھا۔ مگر آج وہ یہاں بندقداری کے بغیر آیا تھا، ایک ایسے اجنبی کے ساتھ جو محض چند دن پہلے ہی اس کی زندگی میں داخل ہوا تھا اور اس نے آتے ہی بیبرس کی دنیا بدل ڈالی تھی۔ قبچاق سے شروع ہونے والا سفر ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ کاکیشیا، بلخ، دمشق، حماۃ اور اب قاہرہ۔ بیبرس صبر و تحمل سے جمال الدین کے ساتھ رہا۔ جمال الدین نے چند دن تک اسے اپنے پاس رکھا۔ بیبرس کے مشاہدے میں ایک بات آئی تھی کہ جمال الدین میں امارت کا تکبر جہاں تھا، وہیں اس کا سلوک اس کے ساتھ مناسب نہیں تھا وہ اسے فاطمہ کا بیٹا نہیں بلکہ غلام سمجھتا تھا۔ طوق غلامی اس کے گلے سے اترنے کے بعد دوبارہ اپنا حلقہ تنگ کر رہا تھا۔ بیبرس نے ایک دن جمال الدین سے بات کرنے کی کوشش کی۔

''جمال ماموں!'' بیبرس نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کی۔ ''کیا بات ہے؟ میں چند دن سے محسوس کر رہا ہوں کہ آپ مجھے جان بوجھ کر نظر انداز کر جاتے ہیں..... کیا مجھ سے کوئی خطا سرزد ہو گئی ہے؟'' جمال

الدین نے اس کی جانب غور سے دیکھا اور استہزائیہ لہجے میں بولا۔

''ہیرس!'' ہیرس کو اس کے لہجے میں درشتی محسوس ہوئی۔ ''غلام کسی کی مجبوری اور بے بسی کا فائدہ اُٹھا کر اس کی نگاہ میں ہر دلعزیز تو بن جاتا ہے مگر اسے اپنی حیثیت کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے۔ میں جانتا ہوں کہ فاطمہ اپنے بچے کی جدائی میں شدید صدمے سے دوچار تھی...... ایسے میں تمہاری آمد نے اس پر بھلا اثر ڈالا، تم نے اس کا دل اپنی چکنی چپڑی باتوں سے جیت لیا اور ماں بیٹے کا کھیل شروع کر دیا۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ میں وہاں پہنچ گیا ورنہ تم اپنے کھیل میں پوری طرح کامیاب تھے۔ اب یاد رکھو کہ میں تمہارا ماموں نہیں صرف آقا ہوں۔ آج کے بعد اگر تم نے حد تمیز پار کرنے کی کوشش کی تو میں تمہارے ساتھ آقاؤں والا سلوک کروں گا...... میرا خیال ہے کہ تم سمجھ گئے ہو''۔

ہیرس اس کا رنگ ڈھنگ یوں بدلتے دیکھ کر جہاں حیران رہ گیا تھا، وہیں وہ اپنے اوپر اتنا بڑا بہتان برداشت نہ کر پایا۔ غصے سے اس کی مٹھیاں بھنچ گئی اور آنکھوں سے دو ننھے سے آنسو پلکوں پر آکر ٹھہر گئے۔ جمال الدین نے کھلے لفظوں میں اسے اپنے آقا ہونے کا احساس دلایا۔

ہیرس سمجھ چکا تھا، اس نے معصوم فاطمہ کو دھوکا دے کر اسے ہتھیا لیا ہے، اسے بڑھاپے کے سہارے سے محروم کر دیا ہے۔ فاطمہ نے چونکہ اسے اپنی رضامندی سے اس کے حوالے کیا تھا لہٰذا اب اس پر فرض تھا کہ وہ اسے اپنے نئے آقا کے طور پر قبول کرلے۔

''آپ نے ایک معصوم عورت کو صریحاً دھوکا دیا ہے، وہ آپ کو جانے کیا سمجھتی تھی اور آپ کیا نکلے؟'' ہیرس تلخی سے بولا۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں مچل رہی تھیں مگر وہ جمال الدین پر ہاتھ اُٹھانے سے گریز کر رہا تھا۔ عنفوان شباب کی منزل تھی اگر وہ ایسے میں کچھ کر گذرتا تو اسے جائز سمجھا جاتا۔ جمال الدین کے چہرے پر اس کی بات سن کر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آج اپنے کھیل میں ناکامی پر تم کتنا تاؤ کھا رہے ہو، اپنی دھوکہ دہی کو مجھ پر ملتزم کر رہے ہو۔ بہر حال جو کچھ ہونا تھا ہو چکا...... میں اس کے لئے تمہیں معاف کرتا ہوں...... یاد رکھو آئندہ کوئی کوتاہی برداشت نہیں کروں گا۔ تم نے آج تک میرا شفقت بھرا روپ دیکھا ہے، مجھے مجبور مت کرنا کہ میں جلاد بن جاؤں۔ تمہاری جوانی پر مجھے رحم آتا ہے...... خیال رکھنا کہ میرا رحم برقرار رہے''۔

جمال الدین کے لہجے میں سختی کے ساتھ ساتھ دھمکی بھی تھی۔ ہیرس نے اس کی بات پر منہ بنایا۔ وہ فوری طور پر اسے کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔ اسے کسی مناسب موقعہ کی تلاش تھی، جب وہ اسے اس کے کیے پر سزا دے سکتا۔ فاطمہ سے جدائی اور جمال الدین کے بے اعتنائی نما دھوکے نے اسے شدید صدمے سے دوچار کیا تھا مگر اس نے جلد ہی خود پر قابو پا لیا کیونکہ ایسے ابھی کئی موڑ اس کی زندگی میں آنا تھے جن کے لئے اسے قبل از وقت تیاری کرنا تھی۔



مطیع الدین کا سردی کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ دو گھنٹے گذر چکے تھے مگر برقائی خان کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ مطیع الدین اچھی طرح جانتا تھا کہ برقائی خان غیر ذمہ دار شخص نہیں ہے، نہ ہی وہ کوئی ایسا مذاق اس کے ساتھ کر سکتا ہے۔ اگر اس نے مذاق بھی کیا ہے تو سرد ترین موسم میں اسے بھی تکلیف ہو رہی ہوگی۔ مطیع الدین نے دونوں ہتھیلیاں رگڑ کر گرم کیں۔ سردی اس کے جسم میں سرایت کر رہی تھی مگر وہ فکر مندی کے عالم میں اسے فراموش کئے ہوئے تھا۔ اچانک اسے دور جھاڑیوں میں سرسراہٹ سی سنائی دی۔ وہ تیزی سے سنبھل گیا، وہ مدھم

روشنی میں آنکھیں پھاڑے جھاڑیوں کی جانب گھور رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اسے یوں لگا کہ جیسے برقائی خان واپس لوٹ آیا ہو مگر دوسرے ہی لمحے اسے کسی جانور کا خیال آگیا۔ ممکن ہے کہ کوئی جانور وہاں آنکلا ہو۔ اگر بھیڑیا ہوا تو وہ اس سے نمٹ سکتا تھا مگر سفید ریچھ ہوا تو اس کے لئے مشکل کام ثابت ہوتا۔ جنگلی جانور کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے جھرجھری سی بدن میں دوڑتی محسوس ہوئی اور چہرے پر بے چینی سی پھیل گئی۔ سرسراہٹ دوبارہ سنائی نہیں دی۔ اس نے اسے وہم سمجھا مگر جب دوبارہ سرسراہٹ ہوئی تو اس کے کان کھڑے ہوگئے۔ اس نے پہلو میں سے لمبا سا خنجر نکال لیا۔ خیمے کے دروازے پر ان کے نیزے گڑے ہوئے تھے۔ مطیع الدین نے محتاط انداز میں اُٹھ کر ایک نیزا اکھاڑ لیا۔ نیزہ یخ ہو چکا تھا۔ وہ اب پوری طرح خبردار تھا۔ لمحہ بھر میں دوبارہ سرسراہٹ سنائی دی۔ اس مرتبہ سرسراہٹ زیادہ قریب تھی۔ مطیع الدین ذہنی طور پر پوری طرح کسی بھی ناگہانی افتاد سے نبٹنے کے لئے تیار تھا۔

اچانک جھاڑی پوری طرح اطراف میں کھسکتی چلی گئی اور اس میں سے ایک دیوہیکل سایہ برآمد ہوا۔ سایہ کو یوں برآمد ہوتے دیکھ کر مطیع الدین کو لمحہ بھر کے لئے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے تیزی سے خود کو سنبھالا۔ وہ سایہ بڑا عجیب سا تھا۔ اس کا سر تین گنا بڑا دکھائی دے رہا تھا اور وہ دو پیروں پر چل رہا تھا۔ مطیع الدین سمجھ گیا کہ یہ کوئی بڑا سفید ریچھ ہی ہو سکتا ہے۔ مگر اس کی رنگت سفید نہیں تھی۔ سفید ریچھ چاہے جیسی جسامت کے ہوں ان کی سفید رنگت دور سے ہی ان کی پہچان کرا دیتی تھی۔ مطیع الدین نے نیزہ اس کی جانب بالکل سیدھا کر دیا۔ وہ سایہ آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جونہی وہ قریب پہنچا تو مطیع الدین حملہ کرنے کے لئے چاق و چوبند ہو گیا۔

''ارے...... ارے! حملہ نہ کر دینا''۔ ایک چہکتی ہوئی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ ایک گہرا سانس سیٹی کی آواز نکالتا ہوا اس کے ہونٹوں سے خارج ہو گیا۔ وہ کوئی اور نہیں تھا برقائی خان ہی تھا جس کے سر پر لکڑیوں کا ایک بڑا سا گٹھا لدا تھا۔ اس نے خیمے کے قریب ہی وہ گٹھا پھینک دیا۔

''تم کہاں چلے گئے تھے؟ میں اتنی دیر سے تمہارے انتظار میں یہاں باہر بیٹھا پریشان ہو رہا ہوں''۔ مطیع الدین نے پرشکوہ لہجے میں کہا۔

''ابھی ٹھہرو، دم بھر سانس تو لینے دو بھئی۔ سب بتاتا ہوں''۔ برقائی خان نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس کے کندھے پر بھی کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ جب اس نے وہ شے کندھے سے اتاری تو مطیع الدین نے دیکھا، وہ ایک اوسط جسامت کا جانور تھا وہ خون سے لت پت تھا۔ برقائی خان نے خیمے کے پاس پڑے پتھر تیزی سے چننا شروع کر دیئے۔ مطیع الدین اس کا مقصد سمجھ گیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کے کام میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ دونوں نے مل کر دائرے کی شکل میں پتھر جوڑ دیئے۔ اس کام سے فارغ ہو کر برقائی خان نے لکڑیاں اس دائرے میں ڈال کر ان پر شراب کی بوتل کھول کر انڈیل دی۔ لکڑیاں بالکل خشک تھیں، جن پر مطیع الدین کو بھی حیرت تھی۔ جب لکڑیوں کو آگ دکھائی گئی تو وہ تیزی سے بھڑک اُٹھیں۔ آگ کا بڑا سا الاؤ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ خیمے کے اطراف میں آگ کی تیز روشنی پھیل گئی۔ مطیع الدین کو ایسا لگا جیسے دن نکل آیا ہو۔

برقائی خان نے خاموشی سے اس جانور کو سیدھا کیا، اور خنجر سے اس کی کھال اتارنے لگا۔ آگ کی روشنی میں مطیع الدین نے دیکھا، وہ بڑا عجیب سا جانور تھا۔ دیکھنے میں وہ مینڈھا لگتا تھا مگر اس کے بدن پر لمبے لمبے بال موجود تھے۔ بال بھی کچھ ایسے تھے جیسے کسی نے گوندکر ان کی موٹی موٹی لٹیں بنادی ہوں۔

''یہ کیا چیز ہے؟ آج سے پہلے تو میں نے اسے نہیں دیکھا''۔ مطیع الدین نے سوال کیا۔

''اسے یاخ کہتے ہیں!'' برقائی بولا۔ ''یہ: یاب جانور ہے۔ عموماً پہاڑیوں کی چوٹیوں پر پایا جاتا ہے۔ اسے بلندی کی جانب چڑھنے کی عادت ہوتی ہے۔ بڑے بزرگ کہتے ہیں کہ یہ جب نیچے کی طرف دیکھتا ہے تو گہرائی دیکھ کر اس کا دل دہل جاتا ہے اور یہ اسی خوف میں مزید اوپر چڑھتا رہتا ہے۔ اسی طرح یہ چوٹیاں سر کر لیتا ہے''۔

''مجھے تو یہ مینڈھے جیسا لگتا ہے''۔ مطیع الدین نے کہا، وہ عجیب نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ میں نے بھی سنا ہے، یہ مینڈھے کے خاندان میں سے ہے''۔

برقائی خان اس سے باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی کھال اتارنے میں بھی مصروف تھا۔

''یہ تمہیں اچانک شکار پر نکل جانے کی کیا سوجھی، میں یہاں الگ پریشان رہا کہ کہیں تمہیں کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو''۔ مطیع الدین نے منہ بسور کر پوچھا۔ اس کی بات سن کر برقائی خان کے دانت نکل آئے۔

''میرا ارادہ شکار کا نہیں تھا۔ میں تو ان جھاڑیوں میں لکڑیاں چننے گیا تھا۔ رات کو اگر آگ جلا دی جائے تو خیمہ محفوظ ہو جاتا ہے۔ جنگلی جانور آگ کی روشنی دیکھ کر دور ہی سے بھاگ جاتے ہیں۔ میں ابھی لکڑیاں چن رہا تھا کہ میری نظر اس پر جا پڑی، میں نے اس پر چھلانگ لگائی مگر یہ میرے ہاتھوں سے پھسل کر نکل گیا۔ مجھے ہاتھوں سے شکار نکلتا دیکھ کر جوش آ گیا پھر کیا تھا؟...... یہ آگے آگے اور میں اس کے تعاقب میں...... یہ چوکڑیاں بھرتا ہوا کافی دور نکل گیا تھا اس لئے مجھے دیر ہو گئی۔ میں تو سمجھا تھا کہ تم دن بھر کی تکان کے باعث گہری نیند سو رہے ہو گے''۔ برقائی خان نے اس کی کھال اتار کر ایک جانب پھینکتے ہوئے کہا۔ ''جانتے ہو یاخ کی کھال سب سے زیادہ قیمتی سمجھی جاتی ہے۔ منگول اس کھال کو اپنے سرداروں کو پیش کر کے انعامات حاصل کرتے ہیں''۔

''یاخ کی کھال میں ایسی کونسی منفرد بات ہوتی ہے؟'' مطیع الدین نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ کھال برف پر رہنے والے تمام جانوروں کی کھال میں سے زیادہ گرم ہوتی ہے۔ یاخ اپنی اسی کھال کے باعث تو پہاڑی کی چوٹی پر بھی زندہ رہ پاتا ہے۔ دیکھو کتنی حیرت کی بات ہے کہ یاخ سردی سے نہیں بلکہ بھوک سے مر جاتا ہے۔ چوٹی پر اسے کھانے کو کچھ نہیں ملتا اور وہ اپنی فطرت کے باعث نیچے آ نہیں پاتا''۔ برقائی خان خود ہی ہنسنے لگا۔ مطیع الدین یاخ کی جانب تکتا رہا۔ چند لمحوں میں برقائی خان نے یاخ کا پیٹ چاک کر دیا۔ انتڑیاں وغیرہ نکال کر یاخ کو اچھی طرح صاف کرنے کے بعد اس نے اسے ایک لمبے سے بانس میں دھاگے کی طرح پرو دیا۔ اس نے مطیع الدین کو اشارہ کیا تو مطیع الدین نے آگے بڑھ کر بانس کو ایک کنارے سے پکڑا اور اسے آگ کے سامنے ایک بڑے چوپان پر لٹکا دیا گیا۔ یہ چوپان شام کو ہی برقائی خان نے خیمہ گاڑتے وقت ساتھ بنا لیا تھا۔

''چلو! اب خیمے میں چلتے ہیں''۔ برقائی خان نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ پھر وہ دونوں خیمے میں چلے آئے۔ آگ کی حدت سے خیمہ اندر سے بھی گرم ہو رہا تھا۔ برقائی خان نے اپنا کمبل نکالا اور لیٹ گیا۔ مطیع الدین اس کی جانب دیکھ کر دل میں سوچ رہا تھا کہ پہاڑوں پر رہنے والے یہ منگول اتنا عرصہ تہذیب و تمدن سے کیسے دور رہ پائے تھے۔ ان کا طرز حیات کٹھن مرحلوں میں مضمر تھا۔ سہولیات و آسائشیں ان کے وہم و گمان میں نہیں تھیں۔ وہ انہی خیالوں میں گم نہ جانے کب نیند کی آغوش میں اتر گیا۔ وہ جانتا تھا کہ صبح تک یاخ بھن کر تیار ہو جائے گا۔



ایک دن جمال الدین نے بیبرس کو نہلا دھلا کر صاف ستھرے کپڑے پہننے کا حکم دیا۔ بیبرس اس کے

''مہربان'' حکم پر چونک سا گیا۔ اس نے اندازہ لگانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ وہ اتنا ضرور جان گیا تھا کہ جمال الدین آج اسے کہیں ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ صبح کے پہلے پہر کے آخر میں جمال الدین اسے ساتھ لے کر روانہ ہو گیا۔ جمال الدین ایک عمدہ عربی گھوڑے پر سوار تھا جبکہ بیبرس نے اس کے گھوڑے کی لگام تھام رکھی تھی۔ وہ دونوں قاہرہ کے بازاروں میں گذرتے ہوئے ایوان شاہی کی جانب جا نکلے۔ بازاروں میں گھومتے ہوئے بیبرس کو اپنا بیتا ہوا وقت یاد آیا۔ قاہرہ میں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ ایوان شاہی کے پاس جا کر جمال الدین نے اسے ایک بڑے محل نما مکان کے پاس رُکنے کا کہا۔ بیبرس نے گھوڑے کے منہ پر اپنے بازو کا حلقہ بنا کر اسے ٹھہرا دیا۔ جمال الدین گھوڑے سے اترا اور گھوڑے کو پہلو میں بنے عارضی اصطبل میں باندھنے کے لئے کہا۔ بیبرس گھوڑا لے کر اصطبل کی جانب ہو گیا۔ کچھ ہی لمحوں میں گھوڑا باندھ کر لوٹ آیا۔ جمال الدین اس کے انتظار میں وہیں کھڑا تھا۔ وہ اسے لے کر محل کے اندر داخل ہو گیا۔ دربان نے اس کی جانب دیکھا اور سر ہلا دیا۔ وہ بڑے بڑے دروازوں سے گذرتا ہوا مہمان خانے میں پہنچ گیا۔ اس کی یہاں تک رہنمائی ایک غلام نے کی تھی۔ یہ محل کسی عام شخص کا نہیں تھا بلکہ ایوبی خاندان کے بڑے ذی وقار شخص نجم الدین ایوب کا تھا جو کہ موجودہ نوعمر سلطان الملک العادل ثانی کا اتالیق تھا۔ یہ سلطان الملک العادل کا رشتے میں چچا بھی تھا۔ درباری و معزز مصری امراء نے اسے باہمی اتفاق رائے سے سلطان کا اتالیق مقرر کیا تھا۔ جمال الدین اس کے مہمان خانے میں بیٹھا اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ لمحوں بعد نجم الدین ایوب مہمان خانے میں داخل ہوا۔ تو جمال الدین اس کے استقبال میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ سلام دعا کے بعد نجم الدین ایوب نے اس سے استفسار کیا۔

''کیسے آنا ہوا جمال الدین المراحی؟''

''امیر محترم!'' جمال الدین نے روایتی انداز میں تمہید باندھی۔ ''اللہ آپ کی شان و مرتبہ بلند فرمائے اور جاہ و جلال ہمیشہ برقرار رہے۔ میں خصوصی ملاقات کے لئے حاضر ہوا تھا''۔

''ٹھیک ہے! بات مختصر کرنا''۔ نجم الدین کو اس کا خوشامدی رویہ ناگوار لگا۔

''میں پچھلے دنوں دمشق گیا ہوا تھا......''

''ہاں! میں نے تمہاری وہ سفارت والی دستاویز دیکھ لی ہے جو تم لائے تھے کیوں......؟ کوئی بات ایسی رہ گئی ہے جو تم اس میں تحریر نہیں کر سکے''۔ نجم الدین ایوب نے اس کی بات بیچ میں سے ہی کاٹ دی۔

''نن...... نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں۔ میں اس سفارت کے متعلق کوئی بات کرنے حاضر نہیں ہوا بلکہ ایک عمدہ اور لاجواب تحفہ آپ کی نذر کرنے آیا ہوں''۔ جمال الدین جلدی سے بولا۔ اسے خدشہ تھا کہ نجم الدین بات کا رُخ کسی اور جانب نہ پھیر دے۔

''ہونہہ!'' نجم الدین نے اس کے چہرے کی جانب غور سے دیکھا۔ ''کیا لائے ہو؟''

''یہ سرکیشی غلام! جس کی خوبیاں آپ دیکھنے کے بعد مجھے یاد کئے بنا نہیں رہ پائیں گے''۔ جمال الدین نے بیبرس کی جانب اشارہ کیا جو کہ اس کے پہلو میں مؤدب کھڑا تھا۔ ''میں جانتا ہوں کہ آپ کو میری بات پر حیرت ہوئی گی، آپ کا حیران ہونا بھی بجا ہے لیکن یہ کوئی معمولی غلام نہیں...... اس میں خاص باتیں پوشیدہ ہیں جو جناب کی نگاہیں جلد ہی جان جائیں گی''۔

بیبرس جمال الدین کا منہ دیکھ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے؟ اس کے خواب خیال میں بھی نہیں تھا کہ جمال الدین اس حد تک پستی میں گر جائے گا کہ اسے بیچ کر اس کی قیمت بٹورے گا۔ نجم الدین ایوب نے نگاہ اُٹھا کر بیبرس کی جانب غور سے دیکھا۔ اس کے بعد اس کی نگاہیں جمال الدین کے چہرے پر گڑ گئیں۔ وہ تیز لہجے میں بولا۔

"اپنا مفاد بیان کرو......!"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" مطیع الدین خجل سا ہو کر رہ گیا تھا۔

"بات کو دائیں بائیں گھمانے کی ضرورت نہیں ..... میں تمہارے چہرے کو اچھی طرح پڑھ رہا ہوں کہ تمہارے دل میں کیا ہے؟ اس لئے جو بات دل میں لئے یہاں آئے ہو...... وہ کہہ دو"۔ نجم الدین کی زمانہ شناس نگاہیں اس پر جمی تھیں۔

"وہ بات کچھ یہ تھی کہ......" جمال الدین نگاہیں جھکائے لفظوں کو ترتیب دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ "میرا بڑا بیٹا فرقان الدین اب اس قابل ہو چکا ہے کہ اسے کسی عہدے پر لگایا جا سکے۔ میں چاہتا تھا کہ آپ اسے قاضی القضاۃ یا صیغہ احتساب میں صاحب دیوان لگانے کا نامہ جاری کر دیتے......" وہ خود ہی خاموش ہو گیا۔

"قاضی القضاۃ یا صیغہ احتساب ہی کیوں؟" نجم الدین ایوب کڑے لہجے میں پوچھا۔

"وہ..... وہ تو یونہی منہ سے نکل گیا......!" جمال الدین گڑبڑا سا گیا۔

"میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم جیسے لوگ عدل و انصاف میں ڈنڈی مارتے ہیں اور غرباء کے حقوق غصب کر لیتے ہیں، بے ایمانی و لوٹ مار کی دوکان کھولنا چاہتے ہو اور مجھ ہی سے اس کار غلط کی اجازت مانگتے ہو۔ میرے ہاتھوں سے غلط کام کروانے چلے آئے ..." نجم الدین ایوب گرج اُٹھا، اس کی آواز فرط جوش سے پورے مہمان خانے میں گونج رہی تھی۔ بیبرس جمال الدین کا مقصد جان کر جہاں تڑپا تھا وہیں اس کے ساتھ ہونے والے سلوک کو دیکھ کر زیر لب مسکراتا رہا۔

"آپ نہ صرف میرے بارے میں غلط اندازہ لگا رہے ہیں بلکہ مجھ پر الزام بھی تھوپ رہے ہیں، یہ میں برداشت نہیں کر سکتا"۔ جمال الدین براہ راست حملے کو برداشت نہیں کر پایا اور تڑک کر بولا۔ اس کا چہرہ غصے سے تپ رہا تھا۔

"یہ بناوٹ میرے سامنے نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔ جمال الدین تم جیسے لوگوں کی رمز سے میں بخوبی واقف ہوں"۔ نجم الدین ایوب نے طنز کی۔ ساتھ ہی اس نے اپنے غلام کو اشارہ کیا، اشارہ پاتے ہی غلام وہاں سے چلا گیا کچھ دیر بعد لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی کتاب اور ایک قلمدان تھا۔ نجم الدین نے کتاب اپنی گود میں رکھ کر اس میں سے ایک کاغذ نکالا اور اس پر تیزی سے کچھ لکھنے لگا۔ کچھ ہی لمحوں میں اس نے تحریر کی ایک دوسری کاپی بنا ڈالی۔ جمال الدین اس کی جانب دیکھتے ہوئے بے چینی سے پہلو بدلتا رہا۔

"یہ لو...... اپنا غلام بھی لے جاؤ"۔

"حضور! غلام تو میں نے آپ کو نذر کیا ہے، اور میں نذر کی ہوئی چیزیں واپس نہیں لیا کرتا...... چاہے میری اس فریق سے صلاح ہو یا جھگڑا......"

جمال الدین نامہ پا کر تیزی سے بولا۔ اس کے دل میں نامہ ملنے کی خوشی میں گدگدی سی ہونے لگی۔

"کیا نام ہے تمہارا نوجوان؟"

"بیبرس بندقداری"۔ بیبرس نے اچانک اس کا رُخ اپنی جانب مڑتے دیکھ کر جواب دیا۔

"کہاں کے رہنے والے ہو"۔

"قپچاق کا"۔

"تاتاری ہو؟"

"نہیں ترک ہوں......!"

"تلوار چلانا جانتے ہو"۔

"جی ہاں! تاتاریوں سے سیکھی ہے"۔

"اگر تمہاری صلاحیتوں کا امتحان لیا جائے تو ......" نجم الدین اس سے بات کرنے کے دوران کوئی خاص بات محسوس کر رہا تھا۔

"تلوار تھامے ایک طویل زمانہ گذر گیا ہے کچھ دن کی مہلت ضرور چاہوں گا"۔

"ہونہہ! جرأت بھی ہے اور صاف گوئی بھی۔ تم کام آسکتے ہو"۔ نجم الدین نے اپنے غلام کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "اسے ساتھ لے جاؤ! اور اس کی منشاء کے مطابق مہلت دو۔ جب یہ مکمل تیاری محسوس کرے تو ہمیں خبر دینا۔ میں خود اس کا امتحان لوں گا"۔

غلام آگے بڑھا اور اسے ساتھ لے کر مہمان خانے سے باہر نکل گیا۔ نجم الدین نے جب سوالیہ نگاہوں سے جمال الدین کی جانب دیکھا تو وہ تیزی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور سلام کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے رخصت ہو جانے پر نجم الدین ایوب اُٹھا اور مسکراتا ہوا محل کے اندر لوٹ گیا۔



کوئی نوکیلی سی چیز مطیع الدین کو اپنے پہلو میں چبھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے غیر ارادی طور پر اسے پیچھے ہٹانا چاہا مگر وہ مسلسل اپنی جگہ پر قائم رہی بلکہ اس میں دباؤ بڑھتا گیا۔ چبھن درد میں بدل گئی تو مطیع الدین تڑپ اُٹھا۔ اس نے یکدم آنکھیں کھول دیں۔ وہ اپنے بستر میں ہی تھا، اس نے تیزی سے پہلو میں چبھنے والی چیز کی طرف دیکھا تو اسے نیزے کی چمکتی ہوئی انی دکھائی دی۔ اس نے تیزی سے نگاہ اُٹھائی تو اسے اپنے سامنے تین قوی ہیکل اور خونخوار منگول چہرے دکھائی دیے۔ ان میں سے ایک نے اسے نیزے کی انی چبھو کر بیدار کیا تھا۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا تو برقائی خان کا بستر خالی پڑا تھا۔ وہ اب نیند کے خمار سے مکمل طور پر باہر آ چکا تھا۔ مطیع الدین نے منگول کی اس حرکت پر کسی فوری ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ اس کی جانب استفہامیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ منگول نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول پا کر اسے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ مطیع الدین جب باہر نکلا تو سورج خاصا اونچا ہو چکا تھا۔ الاؤ میں جلائی گئی لکڑیاں اب بھی سلگ رہی تھیں۔ باہر نکل کر مطیع الدین نے دیکھا کہ وہ صرف تین نہیں تھے بلکہ پورا قبیلہ ہی وہاں موجود تھا۔ انہوں نے سرخ رنگ کے عجیب سے لباس پہنے ہوئے تھے۔ ان کی پنڈلیاں عریاں تھیں۔ پاؤں میں کھال کے بنے ہوئے جوتے تھے اور سروں پر مختلف جانوروں کے خول سجے تھے۔ ان خولوں کے نیچے کسی جانور کی کھال کے بال لٹکے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ افراد کے پاس تو چپٹی تلواریں تھیں جبکہ باقی سب کے پاس دوہرے منہ والے نیزے تھے۔ مطیع الدین ابھی تک صورت حال سمجھ نہیں پایا تھا۔ برقائی خان کو اس کی نگاہوں نے تلاش کرنا چاہا مگر وہ ان میں موجود ہوتا تو دکھائی دیتا۔ مطیع الدین کی نگاہ دوسری طرف پڑی تو وہاں ایک بڑے خول کی ٹوپی پہنے ایک منگول بڑی بے دردی سے گوشت کے بڑے ٹکڑے پر دانت گاڑھ رہا تھا۔ گوشت کا ٹکڑا اس کے ہاتھوں میں دیکھ کر اسے یاخ کا خیال آیا اس نے تیزی سے الاؤ کی جانب نظر پھیری تو وہاں ہڈیوں کے ڈھانچے کے سوا اسے کچھ نہ ملا۔ برقائی خان کا شکار کیا ہوا یاخ کھا گئے تھے۔

"تم کون لوگ ہو؟ اور یہ کیا بدتمیزی ہے؟" مطیع الدین تیز آواز میں بولا۔

"تاتاری بولتا ہے......!" ان میں کوئی بولا۔

"ہونہہ!" بڑے پتھر پر بیٹھا ہوا منگول جوان کا سردار تھا، زور سے ہنکارا۔ "شکل سے تو تو عرب لگتا ہے

مگر تاتاری بول رہا ہے۔ خیر تمہیں معلوم نہیں کہ یہ ہمارا علاقہ ہے اور کسی کو یہاں آنے کی اجازت نہیں ہے''۔

''مجھے میرا دوست یہاں لایا ہے...... وہ مجھ سے زیادہ ان علاقوں کو جانتا ہے۔ کیونکہ وہ یہیں پلا بڑھا ہے''۔ مطیع الدین کے چہرے پر پریشانی کے آثار نہیں تھے۔

''دلیر لگتے ہو!'' سردار دانت نکالتا ہوا بولا۔ ''مگر تم یہ نہیں جانتے کہ سرکیشی پہاڑی پر صرف سرخے ہی شکار کر سکتے ہیں، کسی مقامی یا مسافر کو یہاں شکار کرنے کی اجازت نہیں...... تم نے نہ صرف سرخوں کے قانون کو توڑا ہے بلکہ مقدس یاخ کو بھی اپنا نشانہ بنایا ہے، جسے شکار کرنا گناہ عظیم ہے''۔

''جنگلی جانور صرف جانور ہی ہوتے ہیں، ان میں کوئی مقدس نہیں اور نہ ہی کوئی گھٹیا۔ سب کو ایک ہی اللہ نے پیدا کیا ہے، سب اسی کی مخلوق ہیں۔ تم اپنا خیال نیک کر لو تو تمہیں فائدہ ہوگا''۔

مطیع الدین اسے اسلامی فلسفہ سمجھانے لگا۔

''مسلمان ہے اس کا سر میں لوں گا...... !'' ایک نے زور سے کلکاری لگائی، پھر کیا تھا کوئی اس کی کھال مانگ رہا تھا تو کوئی اس کے بال، اس کے بدن کے تمام اعضاء وہ بڑی بے تابی سے ٹٹولنے لگے۔ مطیع الدین نے انہیں ہٹانا چاہا تو ایک زوردار گھونسے نے اس کی قوت مدافعت کو یکدم توڑ ڈالا۔ وہ اپنا پیٹ پکڑ کر دوہرا ہوتا چلا گیا، لمحہ بھر میں وہ زمین پر منہ کے بل جا گرا۔ کئی لاتیں ایک ساتھ حرکت میں آئیں اور اس کے پیٹ پر برسنے لگیں۔

''رُک جاؤ...... اسے ہم جلب گائی میں لے جا کر قربان کریں گے''۔ سردار کی آواز پر وہ یکلخت رُک گئے۔ ایک منگول ان سب سے الگ ایک جانب کھڑا ان کی حرکتیں دیکھ رہا تھا۔ وہ سُست روی سے سردار کے پاس آیا۔

''سردار دقبا ژائی خان!'' وہ پاس جا کر بولا تو سردار نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''کیا بات ہے......؟ فسطائی!''

''تم شاید یہ نہیں دیکھ رہے کہ خیمے کا رنگ کیا ہے؟'' فسطائی خان متنبہ انداز میں بولا۔

''میں نے دیکھ لیا ہے یہ سنہری خیمہ ہے جس کے مالک اس سرزمین کے مالک کہلاتے ہیں...... مگر یہ علاقہ میرا ہے۔ میں کسی کا غلام نہیں۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی میرے علاقے میں دخل اندازی کرے وہ چاہے اردوئے زریں کا زریں خیل ہو یا ایل خانی''۔ سردار دقبا ژائی خان نے غصے سے کہا۔

''سردار سوچ سمجھ کر قدم اُٹھانا...... یہ سرخ قبیلہ کی بقا کا مسئلہ ہے''۔ فسطائی خان نے اسے مستقبل میں درپیش خطرے سے آگاہ کیا۔

''سردار میں ہوں یا تم...... اپنی حدود سے تجاوز نہ کیا کرو فسطائی''۔ وہ غصے سے بولا۔

''اسے رسیوں سے باندھ کر جلب گائی کی راہ لو''۔ سردار دقبا ژائی نے بلند آواز میں حکم دیا۔

قبیلے کے افراد نے اسے رسیوں سے مضبوطی سے باندھا اور اسی بانس پر لٹکا کر اُٹھا لیا جس پر رات کو برقائی خان نے یاخ کو پرو ڈالا تھا۔

مطیع الدین دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ برقائی خان لوٹ آئے۔ وہ اسے سوتا پا کر پھر کسی جانور کے پیچھے نکل پڑا ہوگا اگر وہ لوٹ آتا تو وہ ان وحشی منگولوں کو سنبھال لیتا۔ اسے چونکہ نیند کے عالم میں سے بیدار کیا گیا تھا، اس لئے اس کے بدن پر صرف کپڑے ہی تھے کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ کوئی ہتھیار ہوتا تو شاید وہ کچھ مزاحمت کرنے کی کوشش کرتا۔ بانس پر جانوروں کی طرح الٹا لٹکا ہوا وہ خود کو بھی جانور ہی محسوس کر رہا تھا جو کہ بے خبری

میں شکار کر لیا گیا تھا۔ قبیلہ سرخ کے افراد تاتاری زبان میں کوئی عجیب سا گیت گا رہے تھے۔ جس کے بول مطیع الدین کو صحیح طرح سمجھ نہ آ پائے۔

برقائی خان اگر وقت پر پہنچ نہ پایا تو......

مطیع الدین جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔ سرخ قبیلے والے تو اس کی تکا بوٹی الگ کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے، وہ لمحہ دور نہیں تھا کہ جب وہ ان کی بربریت کا شکار ہو جاتا۔ تقریباً نصف دن تک مسافت کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اتنی مہلت تک مطیع الدین کو کسی نہ کسی معجزے کے رونما ہونے کی پوری امید تھی۔ الٹا لٹکے لٹکے مطیع الدین کا سر چکرانے لگا تھا۔ اچانک آوازوں میں تیزی آ گئی۔ قبیلے کے افراد کی آوازیں اسے زیادہ محسوس ہونے لگیں۔ اس نے اپنی پوری قوت مجتمع کر کے اپنی گردن اُٹھائی اور اپنے سامنے دیکھا تو سرخ خیموں کا ایک بھرا ہوا میدان دکھائی دیا۔ وہ ان کی جائے رہائش تھی۔ جہاں قبیلے کے دوسرے لوگ ان کے استقبال میں وہی گیت گا رہے تھے جو کہ کافی دیر سے مطیع الدین سن رہا تھا۔ پٹائی سے اس کے بدن کا ایک ایک عضو درد کر رہا تھا دوسرا جب بھی بانس کو کوئی جھٹکا لگتا تو اس کی ساری ہڈیاں جھنجھنا اُٹھتیں۔ مسلسل دوہرا بندھا رہنے کے باعث اس کا خالی معدہ بری طرح متاثر ہوا تھا۔ درد کی ٹیسیں جب ناقابل برداشت ہوئیں تو اس کی نگاہوں کے سامنے اندھیرا پھیلنے لگا۔ اس نے بہتیرا اپنی گردن کو جھٹکا مگر بے سود...... اس کی گردن ایک جانب ڈھلک گئی۔



جمال الدین المراحی بے حد مسرور واپس لوٹا تھا۔ اس نے اپنا اصل مقصد حاصل کر لیا تھا، وہ ایک تیر سے دو شکار کر کے بے حد خوش تھا۔ ایک جانب تو اس نے فاطمہ سے سسر ہتھیا لیا تھا تو دوسری طرف اُسی کو ڈھال بنا کر اُس نے نجم الدین ایوب سے اپنے نالائق بیٹے کے لئے اعلیٰ عہدے کا مراسلہ حاصل کر لیا تھا۔ اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی بڑی مسرت سے اپنی بیوی کو یہ خوشخبری سنائی۔ بیوی اپنے شوہر کا دمکتا ہوا چہرہ دیکھ کر پھولے نہ سمائی۔ اسی اثناء میں اُس کا بیٹا فرقان الدین بھی وہاں چلا آیا۔ اُس نے آتے ہی اتنی زیادہ خوشی کے بارے میں استفسار کیا، جب اسے معلوم ہوا کہ اس کا باپ اس کے لئے اعلیٰ عہدے کا بندوبست کر چکا ہے تو وہ بھی سرشاری کے عالم میں اچھلنے لگا۔

''پدر محترم......!'' فرقان الدین فرط مسرت سے اپنے جذبات دباتا ہوا بولا۔ ''آپ ابھی تک اس اعلیٰ عہدے کو پوشیدہ کئے ہیں، بھلا مجھے بھی پتہ چلے کہ آپ اپنے بیٹے کے لئے کس مستقبل کا دروازہ کھول آئے ہیں؟''

''کیوں نہیں!'' جمال الدین مستی کے عالم میں جھومتا ہوا بولا۔ ''آخر یہ سب تمہارے مستقبل کے لئے ہی تو ہے، تمہیں بتانا تو اشد ضروری ہوگا''۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے نیفے میں ہاتھ ڈالا اور کاغذ کا لپٹا ہوا سنہرا رول اس کی جانب بڑھا دیا۔ فرقان الدین نے بڑے اشتیاق سے اس رول کو پکڑا اور اس کی تہیں کھولنے لگا۔ کاغذ کھلتے ہی اس کی نگاہیں تحریر پر پھسلنے لگیں۔ جوں جوں وہ عبارت پڑھتا چلا گیا اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

جمال الدین المراحی اُس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا کہ اس نے اپنے بیٹے کے لئے وہ ہاتھ مارا تھا جسے سن کر دوسرے لوگ ایک بار تو دانتوں میں انگلیاں لینے پر مجبور ہو جاتے۔

''یہ کیا مذاق ہے......؟''

فرقان الدین بگڑ کر بولا۔ اس کا لہجہ خاصا جارحانہ تھا، جسے جمال الدین نے فوراً محسوس کیا۔ اس نے

حقارت سے مراسلہ کو فرش پر پھینک دیا۔ جمال الدین کینہ توز نگاہوں سے اُسے دیکھتا ہوا آگے بڑھ کر نیچے جھکا اور مراسلہ اُٹھا لیا۔ اس نے مراسلہ کو پہلے تو اچھی طرح سے جھاڑا پھر اس کی نگاہیں کاغذ پر موجود تحریر پر پھسلنے لگیں۔ جوں جوں تحریر کا مفہوم اس کے دماغ میں اترتا چلا گیا توں توں اس کا چہرہ طیش و استعجاب سے کرخت و سرخ ہوتا چلا گیا۔ کچھ ہی لمحوں میں وہ غصے کی شدت سے کانپنے لگا۔ یہ مراسلہ کسی اعلیٰ عہدے کی سفارش نہیں تھا بلکہ قاضی القضاۃ کے نام ایک سادہ سا پیغام تھا کہ مراسلہ کے حامل جمال الدین المراحی کے ہونہار فرزند فرقان الدین کی کڑی آزمائش لی جائے اور اس کی قابلیت کو ہر لحاظ سے پرکھا جائے اور اس کے مطابق اس کے لئے کسی بھی عہدے کی سفارش کی جائے، اس ضمن میں جمال الدین المراحی کے شاہی مراتب تک کو ملحوظ خاطر نہ رکھا جائے۔ قاضی القضاۃ کو خصوصی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ آداب شاہی کی بجا آوری میں مگن ہونے کے بجائے عدل و انصاف سے کام لیں۔

''نجم الدین ایوب...... تمہیں یہ مذاق بہت مہنگا پڑے گا......'' جمال الدین دانت پیستا ہوا زیر لب غرایا۔ فرقان الدین نے جب اپنے باپ کے تیور دیکھے تو اس نے وہاں سے کھسکنے میں ہی عافیت سمجھی، اس نے راہ فرار اختیار کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا تھا، ممکن تھا کہ چند لمحے قبل اس نے جس استہزائیہ ردعمل کا مظاہرہ کیا تھا، اسی کا خمیازہ اُسے بھگتنا پڑ جاتا۔ جمال الدین بے بسی کے عالم میں محض مٹھیاں بھرتا رہ گیا۔ اس کی بیوی بھی حالات کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے باہر نکلنے لگی تو جمال الدین نے اسے فوراً اپنے خاص غلام ابی جریدہ کو حاضر ہونے کا حکم سنایا، وہ محض اپنی گردن اثبات میں ہلا کر رہ گئی۔

''کیا ہوا......؟ میرے آقا......!''

جمال الدین المراحی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اُس کی آواز سن کر چونک پڑا۔ اس نے نگاہیں اُٹھائیں تو اس کے سامنے ایک اوسط قامت کڑیل سیاہ فام موجود تھا۔

''آؤ...... ادھر بیٹھو''۔ جمال الدین تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ابی جریدہ خاموشی سے اس کے سامنے دوزانو بیٹھتا چلا گیا۔ جمال الدین کمرے میں موجود اونچی نشست سنبھالے ہوئے تھا۔ ابی جریدہ اُلجھی نگاہوں سے اپنی طلبی کے بارے میں منتظر تھا۔ جمال الدین نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے گھمبیر لہجے میں اپنی بات کا آغاز کیا۔

''آج ایک دیرینہ ہمدرد نے ہمارے ساتھ مکر و فریب کیا ہے، اس نے اپنے رُتبے کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے عقب سے وار کر کے ہماری غیرت و عزت کو للکارا ہے۔ وہ تو ہمارا مقدر اچھا تھا کہ بروقت حقیقت کا حال کھل گیا۔ ورنہ ہمیں کس قدر خواری کا سامنا کرنا پڑتا...... وہ شاید ہم بھی صحیح طرح نہیں جانتے۔ وہ مکار دھوکا دہی کے انجام سے شاید واقف نہیں ہے''۔

''آقا......!'' ابی جریدہ ابھی تک خود کو الجھا الجھا محسوس کر رہا تھا، وہ استفہامیہ لہجے میں بولا۔

''میں ابھی تک آپ کے مفہوم کو صحیح طرح سمجھ نہیں پایا ہوں، ذرا کھل کر بتائیے، ایسا کون بدبخت ہے جو آپ کے ساتھ دھوکا دہی کا مرتکب ہوا ہے؟ کس کی مت ماری گئی ہے جو آپ کی راہ میں روڑے اٹکانا چاہتا ہے؟''

جمال الدین اس کی بات سن کر دھیما سا مسکرایا۔ اس مسکراہٹ میں پہلے جیسا دم خم نہیں تھا۔ کھوکھلا پن اور یاسیت بے نقاب ہو رہی تھی۔ اس نے ابی جریدہ کو مختصراً حالات کی نوعیت سے آگاہ کیا، کچھ ہی لمحوں میں ابی جریدہ معاملے کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔

''میرے آقا۔ اب آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''سزا...... بلکہ خوفناک ترین سزا، جو نجم الدین ایوب کو باقی عمر تک یاد رہے''۔

''میرے پاس دو قسم کی تجاویز ہیں، جن سے ممکن ہے آپ کی انانیت کو تسکین مل سکے اور آپ کا دیرینہ ہمدرد ہزیمت اُٹھائے''۔

''میں دونوں تفصیل سے سننا پسند کروں گا''۔

جمال الدین المراحی کے چہرے پر یکدم بشاشت سی پھیل گئی۔ وہ قدرے نیچے جھکتے ہوئے سراپا گوش ہو گیا۔



برقائی خان واپس خیمے پر لوٹا تو اس کی نگاہیں حیرت سے پھیلتی گئی۔ خیمہ کے اطراف کوئی اور ہی کہانی سنا رہے تھے۔ اس نے تیزی سے کندھے سے کوئی چیز زمین پر پھینکی اور پہلو میں موجود خنجر نکال کر مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ محتاط قدموں سے خیمے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ خیمے کے باہر یاخ کی ہڈیاں بکھری پڑی تھیں، چوپان پر موجود یاخ کا پنجر اس کو منہ چڑا رہا تھا۔ سورج بادلوں کے عقب میں چھپ چکا تھا اور ہلکی ہلکی برف باری شروع ہو چکی تھی۔ برقائی خان پوری طرح چوکس تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم جماتا ہوا خیمے کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اس کی توقع کے مطابق خیمے میں کچھ نہیں تھا۔ مطیع الدین کی تلوار اور خنجر ایک جانب گرے ہوئے تھے۔ اس کا جبہ بھی خیمے کی کمانی پر لٹک رہا تھا۔ برقائی خان کو صورت حال سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ منگولوں کا کوئی گروہ وہاں وارد ہوا ہوگا اور اس نے مطیع الدین کو گرفتار کر لیا ہوگا۔ یقیناً وہ نیند کے عالم میں ہوگا، اسی لئے اس کی اشیاء اس کے بدن پر نہیں تھیں۔ برقائی خان نے خنجر پہلو میں واپس رکھ دیا اور خیمے سے باہر نکل کر چوپان کی جانب بڑھا۔ یاخ پر ایک انچ بھی گوشت باقی نہیں بچا تھا۔ اس نے چوپان کا اچھی طرح جائزہ لیا اس کے بعد وہ زمین پر گری ہوئی ہڈیوں کی جانب متوجہ ہوا۔

برقائی خان ایک ایک ہڈی اُٹھاتا اور اسے تمام زاویوں سے دیکھتا رہا۔ کافی دیر تک وہ اسی کام میں مشغول رہا۔ ہڈیوں سے فارغ ہو کر وہ خیمے کے گرد پڑے ہوئے پتھروں کو جانچنے لگا۔ اس تمام کام سے فرصت پانے پر اس نے گہرا سانس لیا۔

''ہونہہ! اس کا مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے مطیع الدین کو کوئی جسمانی گزند نہیں پہنچائی، وہ اسے زندہ گرفتار کر کے لے گئے ہیں''۔

وہ خود سے باتیں کر رہا تھا۔ ہڈیوں پر دانتوں کے خاص نشانات سے وہ اس گروہ تک پہنچ چکا تھا جس نے اس کی غیر موجودگی میں یہ کارانجام دیا تھا۔ اس نے خیمے میں موجود لکڑیوں کے ایک چھوٹے سے گٹھے کو نکالا اور چوپان کے احاطے میں آگ روشن کی۔ کچھ ہی لمحوں میں آگ بھڑکنے لگی۔ برقائی خان نے کندھے سے پھینکی ہوئی چیز کی جانب توجہ کی جو کہ شکار کیا ہوا سفید ہرن تھا۔ برقائی خان نے اسے خنجر کی مدد سے کاٹنا بنانا شروع کر دیا اور اس کے پارچے کر کے آگ کے گرد اس طرح بکھیر دیئے جیسے کپڑے سکھانے کے لئے رکھ دیئے جائیں۔ وہ ہرن کا گوشت محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اچانک اسے کوئی خیال آیا تو اس نے تیزی سے خیمے کے دائیں جانب نیچے کی اترائی میں نگاہ ڈالی، وہ لوگ اس کے گھوڑے بھی ساتھ لے گئے تھے۔

''سنہرے خیموں کی اتنی بے حرمتی...... اس کی انہیں بھاری قیمت چکانا پڑے گی''۔

برقائی خان دانت پیستا ہوا بڑبڑایا۔ اسی لمحے اسے کسی کے چلنے کی چاپ سنائی دی۔ برقائی خان کا ہاتھ لاشعوری طور پر خنجر کے دستے پر مضبوط ہوتا چلا گیا۔ اس کے کان چاپ پر لگے تھے۔



بیبرس کو نجم الدین ایوب کے محل کے بائیں جانب ایک بڑے احاطے میں ٹھہرایا گیا تھا۔ اس احاطے کے کناروں پر بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے سے کمرے غلاموں کی رہائش گاہیں تھیں۔ اس احاطے میں صرف اُن غلاموں کو رکھا جاتا تھا جو محافظ کے طور پر استعمال کئے جاتے تھے۔ یہ تمام غلام نجم الدین ایوب کی ذاتی ملکیت تھے۔ یہاں جو چیز خاص طور پر بیبرس کے مشاہدہ میں آئی تھی، وہ یہ تھی کہ نجم الدین کے غلاموں میں ترک اور سلجوقی افراد اکثریت میں تھے۔ یہ غلام جسمانی ساخت کے لحاظ سے حیرت انگیز صحت وقوت کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی وفاداری میں بھی بہترین تسلیم کئے جاتے تھے۔ نجم الدین ایوب نے اپنے ایک خاص ترک غلام ابوخویلد کو بیبرس کی جانچ و امتحان کے لئے مقرر کیا تھا۔ یہ ترک غلام ایک سخت منتظم ہونے کے ساتھ ساتھ خوش مزاج بھی تھا۔ بیبرس کو اس کے ہمراہ کبھی بدمزگی یا بوریت کا احساس نہیں ہوا۔ ابوخویلد نے بیبرس سے فن مبارزت کے مختلف امور سے متعلقہ ابتدائی امتحان لینے کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس نوجوان پر معمولی سی توجہ اسے ایک ایسا شاہکار بنا سکتی ہے جو مستقبل میں اپنا لوہا منوائے گا۔

ابوخویلد نے نجم الدین ایوب کی توجہ بیبرس کی چند اہم خوبیوں کے بارے میں مبذول کرائی تھی۔ اس نے بیبرس کی فنون حرب کی تعلیم کو نامکمل قرار دیتے ہوئے اس کی از سر نو تربیت کی سفارش بھی کی تھی۔ نجم الدین ایوب کو ابوخویلد پر مکمل بھروسہ تھا، اسی لئے اس نے بیبرس کے معاملے میں اسے کامل اختیار سونپ دیا۔ ابوخویلد نے اس ذمہ داری کو نبھانے کے لئے دن رات کڑی محنت شروع کردی۔ بیبرس کو کسی دوسرے کام میں شمولیت کی اجازت نہیں تھی۔ وہ صبح سے رات گئے تک فنون حرب کی باریکیوں کو سمجھنے میں مصروف رہتا۔ بیبرس کے مکمل ارتکاز و یکسوئی، ذوق وشوق اور انہماک نے ابوخویلد کو بڑی حد تک مطمئن کر دیا تھا۔ اسے اپنی محنت جلد ہی کارگر ہوتی دکھائی رہی تھی۔



سلطان صلاح الدین ایوبی کے بھائی ملک العادل جو کہ والیٔ الکرک تھا، نے 596ھ میں نابالغ سلطان مصر ملک المنصور کو علماء کے فتویٰ کے مطابق تخت سے اتار کر عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ ملک العادل نے ایوبی سلطنت کو جو کئی ٹکڑوں میں منقسم تھی، از سر نو متحد کیا اور 598ھ تک سارے مصر، میسوپوٹیمیا اور عرب میں ایک بار پھر طاقتور حکومت کی داغ بیل ڈالی۔ اس کے دور حکومت میں سلطان صلاح الدین ایوبی کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ 615ھ میں ملک العادل صلیبی لشکر سے مقابلے کے لئے مصر روانہ ہوا تو راستے میں بخار کے باعث وفات پا گیا۔ اس کے بعد اس کا جواں بیٹا ابوالمعالی ناصر الدین محمد الملک الکامل کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس نے چھٹی صلیبی جنگ میں اپنی مہارت اور جوانمردی کے ایسے جوہر دکھائے کہ نصرانیوں کو اپنی جانیں بچانا دشوار دکھائی دینے لگا۔ بالآخر انہوں نے مجبور ہو کر صلح کی درخواست کی۔ یوں چھٹی صلیبی جنگ ختم ہوگئی۔ ملک الکامل نے ناعاقبت اندیشی سے کام لیا اور اپنے اقتدار کی بقا کے لئے یروشلم نصرانیوں کی تحویل میں دے دیا۔ 635ھ میں ملک الکامل والیٔ مصر وفات پا گیا تو اس کی جگہ امراء نے باہمی مشورے سے اس کے نوعمر بیٹے سیف الدین ابوبکر کو الملک العادل ثانی کا لقب دے کر مصر کے تخت پر بٹھا دیا۔ اس کے چچا نجم الدین ایوب کو اس کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ نجم الدین ایوب بظاہر اتالیق تھا مگر حقیقتاً عنان سلطنت امراء کے ہاتھوں میں تھی۔

نوعمر سلطان کے مشاغل عجیب ہی تھے، وہ چونکہ وقت سے پہلے ایک بڑی سلطنت کا حکمران بن گیا تھا، اس لئے اسے تفریح کے علاوہ کسی اور بات کی پرواہ نہیں تھی۔ سارا سارا دن وہ مسخروں کی فوج ظفر موج اپنے ہمراہ رکھتا اور ان کے لطائف سے محظوظ ہوتا۔ کبھی وہ کنیزوں کے جھرمٹ میں آنکھ مچولی جیسے کھیلوں میں مشغول

رہتا۔ اسے کسی غم و فکر سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ کبھی کبھار امراء میں کوئی اس کے پاس آجایا کرتا اور اس کی خوشامد و دلجوئی کیا کرتا۔ سوائے نجم الدین ایوب کے کوئی اسے پند و نصیحت نہیں کرتا تھا۔ امراء ذاتی آسائشوں یا اپنی مطلب براری کے لئے ہی اس طرف قصد کیا کرتے تھے۔

ذی الحجہ 636ھ کی ایسی ہی ایک شام میں سلطان سیف الدین ابوبکر کو کنیز نے کسی امیر کی آمد کی اطلاع دی تو اس کے منہ کا ذائقہ کڑوا سا ہوگیا۔ اس نے مجبوراً اس سے ملنے کی حامی بھری۔ سلطان نے اسے ہدایت کی کہ امیر کو عزت و احترام سے شاہی مہمان خانے میں بٹھایا جائے۔ وہ کچھ ہی دیر میں اس سے ملاقات کریں گے۔ کنیز حکم پا کر وہاں سے رخصت ہوگئی۔

سلطان سیف الدین ابوبکر نے شاہی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے شاہی لباس زیب تن کیا اور اپنے درباری مسخروں کے جلو میں مہمان خانے کی جانب بڑھ گیا۔ مہمان خانے میں اس کی آمد کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ نووارد امیر سلطان کے استقبال کے لئے خود مہمان خانے کے صدر دروازے تک چلا آیا۔ جونہی دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو امیر نے جھک کر اس کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ لیا اور آداب شاہی بجالایا۔ سلطان سیف الدین بڑی رعونت و نخوت سے چلتا ہوا شاہی نشست پر براجمان ہوگیا۔ اس کے بیٹھنے کے بعد امیر بھی قریبی نشست پر بیٹھ گیا۔ یہ نشست آداب شاہی کو مدنظر رکھتے ہوئے قدرے نیچے بنائی گئی تھی۔

''کہو امیر مصر......! کیسے آنا ہوا؟''

''سلطان عالی مقام......! اگر اجازت ہو تو میں نزدیک آ کر کچھ کہنا چاہوں گا''۔

امیر نے عرض کیا۔

''ایسی کیا بات ہے......؟ جو تم وہیں بیٹھے نہیں کہہ سکتے''۔ نوعمر سلطان مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ جس پر سلطان کے خاص محافظ چوکنے ہوگئے۔

''میں سلطان کا سچا نمک خوار ہوں، آپ کی عظمت پر اگر کوئی آنچ آئے، یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ میں آپ سے تنہائی میں کچھ گفتگو کرنے کا خواہش مند ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ان درباریوں کو رخصت فرمادیں''۔

''امیر......!'' سلطان سیف الدین برہم سا ہوگیا۔ ''یہ سب ہمارے خاص احباب ہیں، ہم ان سے کسی قسم کا پردہ نہیں رکھتے۔ تمہیں جو کچھ بھی بیان کرنا ہے، بے فکری سے کہہ دو''۔

''میں سلطان محترم سے معذرت خواہ ہوں کہ میں اپنا مدعا ان کی موجودگی میں بیان کرنے سے قاصر ہوں''۔ امیر سر جھکا کر بولا۔

''ٹھیک ہے پھر تم جا سکتے ہو''۔

سلطان سیف الدین اپنی نشست سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہمراہ سب لوگ تیزی سے کھڑے ہوگئے تھے۔ سلطان کی بے اعتنائی سے امیر کے چہرے پر مایوسی چھانے لگی، وہ خاصا بے چین دکھائی دے رہا تھا، وہ خود پر قابو نہ پا سکا...... تیزی سے بولا۔

''میں سلطان محترم کو شاہی محل میں پروان چڑھنے والی ایک اہم سازش سے باخبر کرنا چاہتا تھا مگر آپ سننے کی خواہش نہیں رکھتے تو کوئی بات نہیں، میں بلا تامل واپس لوٹ جاتا ہوں''۔

امیر کی بات میں دم تھا جس پر سلطان سیف الدین کے قدم خود بخود رک گئے۔ وہ شکی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

''کیسی سازش ۔۔۔ ؟''

''اگر آپ مجھے خلوت میں موقع دیں تو میں کچھ عرض کر سکوں گا۔ ممکن ہے کہ آپ کی محفل میں کوئی ایسا فرد موجود ہو جو پس پردہ اس سازش میں شریک ہو اور میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتا۔۔۔!'' امیر سرگوشی نما لہجے میں بولا۔

''مجھے تمہارے تیور ٹھیک دکھائی نہیں دے رہے''۔

''سلطان محترم کو میری طرف سے کسی قسم کا شائبہ ہو تو میری جامہ تلاشی لی جا سکتی ہے''۔

''امیر کی اچھی طرح جامہ تلاشی لی جائے''۔

سلطان سیف الدین ابو بکر نے اپنے محافظوں کو حکم دیا۔ دو محافظ تیزی سے آگے بڑھے اور امیر کے بدن کو اچھی طرح ٹٹولنے لگے۔ کوئی مشتبہ شے نہ ملنے پر انہوں نے سلطان کو اشارہ کیا۔

''ٹھیک ہے ۔۔۔ تمام درباری ان دونوں محافظوں کے علاوہ مہمان خانے سے باہر چلے جائیں ۔۔۔'' سلطان نے دوسرا حکم سنایا۔

درباری آہستہ آہستہ وہاں سے ایک ایک کر کے نکلتے چلے گئے۔ کچھ ہی لمحوں میں سلطان، امیر اور دو محافظوں کے علاوہ کوئی اور فرد وہاں موجود نہیں تھا۔

''ہاں ۔۔۔ اب بولو کیا کہنا چاہتے ہو''۔

''اگر سلطان بہتر سمجھیں تو ایک محافظ کو ہدایت فرمائیں کہ وہ صدر دروازے کے پاس جا کر خاموشی سے جائزہ لے کہ وہاں کوئی درباری چھپا ہوا ہماری باتیں سننے کی کوشش تو نہیں کر رہا''۔

''امیر تم حد سے زیادہ وہمی معلوم ہوتے ہو، جاؤ تم صدر دروازے کے پاس جا کر اچھی طرح ٹٹول کر دیکھو وہاں کوئی موجود تو نہیں ہے''۔

سلطان نے ناگواری کے عالم میں ایک محافظ کو حکم دیا۔

محافظ نے بھی برا سا منہ بنایا اور صدر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ کچھ ہی لمحوں بعد اس نے واپس آ کر تیغ نگاہ امیر پر ڈالتے ہوئے نفی کا اشارہ کیا۔

''ابھی بھی کسی قسم کی کوئی تسلی باقی ہے''۔

''سلطان محترم! اپنے مزاج کو بدمزہ نہ ہونے دیں کیونکہ صورت حال ہی کچھ ایسی ہے کہ میں اتنی احتیاط پر مجبور ہوں''۔

''ہم تمہاری لب کشائی کے کب تک منتظر رہیں''۔

''معاف کیجئے سلطان محترم ۔۔۔!''

امیر کھسیانا ہو کر بولا۔ ''پہلے میں اپنا تعارف کرا دوں تاکہ آپ کو میری بات پر یقین ہو سکے۔ میرا نام جمال الدین الراحی ہے۔ اگر آپ کے علم میں ہو تو آپ کو یاد ہوگا کہ گذشتہ دنوں دمشق کی سفارت کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی تھی''۔

سلطان سیف الدین ابو بکر اس کی تمہید سے ناخوش دکھائی دے رہا تھا۔ اسے مطلب کی بات سننے میں جلدی دکھائی دیتی تھی۔ امیر جمال الدین الراحی نے جب سلطان کے چہرے پر ناپسندیدگی کے اثرات محسوس کئے تو وہ تیزی سے مطلب کی بات پر آ گیا۔

''سلطان کا جاہ و جلال سدا قائم رہے۔ میرے منہ میں خاک ۔۔۔ آپ کی تخت نشینی سے کچھ لوگ ناخوش

ہیں اور وہ پس پردہ آپ کو تخت شاہی سے معزول کرنے کی منصوبہ سازی کر رہے ہیں''۔

''کک ۔۔۔ کک ۔۔۔ کیا مطلب؟''

سلطان سیف الدین اس کی بات سن کر بوکھلا اٹھا۔ جمال الدین الراحی معصوم سی صورت بنائے خاموش کھڑا تھا۔

''کون ہیں وہ لوگ ۔۔۔!'' سلطان قدرے سنبھل گیا اور اس کے لہجے میں درشتی چھا گئی۔

''میں ان کے نام لینے سے پہلے اپنی جان کی امان چاہوں گا کیونکہ اُن کے نام جاننے کے بعد آپ کو دلی صدمہ پہنچے گا''۔ جمال الدین الراحی سر جھکا کر دھیمے لہجے میں بولا۔

''تمہیں جان کی امان ہے۔ کھل کر ان کے نام بتاؤ''۔ نوعمر سلطان پریشانی کے عالم میں بولا۔

''سلطان کے چچا نجم الدین ایوب ان میں سرفہرست ہیں''۔ جمال الدین الراحی نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کا دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔ اُسے خوف تھا کہ چچا کا نام سن کر سلطان بھڑک نہ جائے اور اسے لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔

''تم ہوش میں تو ہو امیر ۔۔۔''

سلطان سیف الدین ابو بکر فرط جوش سے بری طرح چیخا۔

''سلطان محترم! میں بالکل سچ عرض کر رہا ہوں''۔

''ہم تمہاری بات پر کیسے یقین کر لیں؟''

''میرے پاس ثبوت ہے مگر ۔۔۔!'' جمال الدین الراحی بولتے بولتے اچانک رُک گیا۔

''مگر کیا ۔۔۔؟''

''ثبوت پیش کرنے کی صورت میں مجھے اپنی جان کے جانے کا خوف ہے''۔ جمال الدین بولا۔

''تمہیں جان کی امان دی جا چکی ہے''۔

''یہ خطرہ آپ کی جانب سے نہیں بلکہ آپ کے چچا کی جانب سے ہے''۔

''تم بلا خوف ثبوت پیش کرو۔ تمہاری ہر طرح سے حفاظت کی ذمہ داری ہماری ہے''۔ نوعمر سلطان نے اسے یقین دلایا۔

جمال الدین نے ایک سنہرے کاغذ کا رول نکال کر سلطان کی خدمت میں پیش کیا۔ ایک غلام نے آگے بڑھ کر وہ مراسلہ لیا اور کھول کر اسے ایک نگاہ ڈالتے ہوئے سلطان کو پیش کر دیا۔

سلطان سیف الدین ابو بکر نے کاغذ پر نگاہ ڈالی تو ایک تحریر اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ سلطان کی نگاہیں اس تحریر کو پڑھنے میں مشغول ہو گئیں۔ اس پر کچھ یوں تحریر تھا۔

''جمال الدین الراحی ۔۔۔ اللہ تم پر اپنی رحمتوں کا نزول کرے اور تمہارے کاموں کو سہل بنائے۔ سرزمین مصر کو ایک اہم ضرورت درپیش ہے جس کے لئے تمام محب الوطن امراء اپنی جان و مال کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایک خاص مقصد کے لئے جمع ہو رہے ہیں۔ اس اجتماع میں میں تمہارا بھی خیر مقدم کرتا ہوں۔ اگر تم ہمارا ساتھ نہ دینا چاہو تو تمہیں خاموشی اختیار کرنا ہوگی۔ یہی تمہاری بھلائی میں ہوگا ورنہ حب الوطنی کے جذبے سے سرشار امراء تمہارا خون بہانے سے گریز نہیں کریں گے۔ والسلام نجم الدین ایوب''۔

''یہ کوئی ثبوت نہیں ہے کہ چچا میرے خلاف کوئی سازش تیار کر رہے ہیں''۔ سلطان سیف الدین ابو بکر بگڑ کر بولا۔

''سلطان محترم! یہ مراسلہ مجھے آپ کے بھائی نجم الدین ایوب کے خاص غلام نے دیا تھا۔ اس پر آپ کے بھائی کی مہر بھی موجود ہے۔ اس مراسلہ کو پانے کے بعد میں نے چند دن قبل ان سے ملاقات کی۔ جس کی تصدیق آپ اپنے ذرائع سے کر سکتے ہیں۔ ملاقات میں یہ عقدہ کھلا کہ وہ نیک مقصد جس کے لئے وہ سب امراء کو ہم خیال بنانے میں کوشاں ہیں، آپ کی معزولی اور ان کی تخت نشینی ہے۔ انہوں نے آپ کے لڑکپن، غفلت امور سلطنت اور آپ کی بے جا خواہشات پر بے دریغ پیسے کے ضیاع پر کڑی تنقید کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مصر کی بھلائی کے لئے یہ قدم ناگزیر ہے۔ اس بات کا میں خود گواہ ہوں اور میں حلفیہ بیان کر رہا ہوں''۔

نوعمر سلطان اس کی بات سن کر قدرے سوچ میں پڑ گیا تھا۔ جمال الدین خاموشی سے کھڑا رہا۔

''لیکن انہیں مجھے معزول کرنے کا خیال کیونکر آیا حالانکہ امور سلطنت تو میں نے انہیں ہی سونپ رکھے ہیں''۔ سلطان بے خودی کے عالم میں بڑبڑایا۔ اس نے دوبارہ مراسلہ کی تحریر کو پڑھا اور نجم الدین ایوب کی مہر کو غور سے دیکھا۔ مہر بالکل اصلی دکھائی دیتی تھی، سلطان نے یہ مہر اپنی آنکھوں سے دیکھی ہوئی تھی۔

''مجھے تمہاری وفاداری کا یہ انداز پسند آیا ہے مگر میں اس معاملے میں بلا تحقیق کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ تم اب جا سکتے ہو، دو خفیہ ہرکارے تمہاری حفاظت میں تعینات کر دیئے جائیں گے۔ اگر یہ بات سچ نکلی تو ہم تمہیں ایسا بدلہ چکائیں گے کہ تمہاری آنے والی نسلیں کبھی افلاس کا منہ نہیں دیکھیں گی''۔ نوعمر سلطان نے کہا۔

''سلطان محترم!'' جمال الدین تیزی سے بولا۔ ''اگر اجازت ہو تو میں ایک گذارش گوش گذار کرنا چاہتا ہوں''۔

''بلا دھڑک کہو......!''

''میری زندگی یوں تو اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر سلطان محترم کی وفاداری میں اگر چلی بھی گئی تو مجھے کوئی ملال نہیں ہوگا۔ بس ایک بات کی فکر دامن گیر ہے کہ میرے بعد میرے بچے بھی اس عتاب کا شکار نہ ہو جائیں۔ اگر سلطان محترم تھوڑی سی عنایت کریں تو میرے بچوں کا مستقبل نہ صرف محفوظ ہو سکتا ہے بلکہ وہ اپنی حفاظت بھی بخوبی کر سکیں گے''۔

''تم کھل کر بات کیوں نہیں کرتے''۔

''سلطان محترم!'' جمال الدین توقف سے بولا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ میرے ہونہار فرزند کو صیغہ احتساب میں کوئی چھوٹا موٹا عہدہ دے دیا جائے تاکہ وہ آپ کی خدمت کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ اپنی حفاظت بھی کر سکے''۔

''بس......! یا اور کچھ بھی......!''

''سلطان محترم! میرے لئے آپ کی نگاہ کرم ہی کافی ہے''۔ جمال الدین خوشامدی لہجے میں گویا ہوا۔ نوعمر سلطان نے اسی وقت اپنے درباری کاتب کو طلب کیا اور صیغہ احتساب میں ایک اعلیٰ عہدہ پر جمال الدین کے فرزند کو فائز کرنے کے لئے مراسلہ تیار کرنے کا حکم دیا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے چند ہی ساعتوں میں مراسلہ تیار ہو گیا جس پر سلطان نے اپنی شاہی مہر ثبت کی اور مراسلہ جمال الدین کے حوالے کر دیا گیا۔ جمال الدین شکریے کے کورنش بجالاتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا۔ سلطان سیف الدین ابوبکر نے وہیں اپنے خاص معتمدین کو طلب کر لیا تاکہ وہ اس گھمبیر معاملے کے بارے میں کوئی صلاح و مشورہ کر سکے۔



برقائی خان پوری طرح چوکنا اس جانب نگاہیں مرکوز کیئے ہوئے تھا جدھر سے کسی کے چلنے کی چاپ

سنائی دے رہی تھی۔ آگ کے دھوئیں سے اُٹھنے والے کالے بادل دیکھ کر شاید کوئی اُدھر نکل آیا تھا، یا پھر کوئی دشمن ابھی اس کی تلاش میں وہیں چھپا بیٹھا تھا جو شاید اسے اب غافل سمجھ کر اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ خنجر کے دستے پر برقائی خان کی مضبوط گرفت بدستور قائم تھی۔ کچھ ہی لمحوں بعد چاپ قدرے نزدیک سے دوبارہ سنائی دی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی جان بوجھ کر دبے قدموں چلنے کی کوشش کر رہا ہو مگر برف میں دھنسی ہوئی جھاڑیوں پر پاؤں پڑتے ہی اس کی کوشش بے کار جاتی۔ برقائی خان اپنی جگہ جما بیٹھا تو وارد کے سامنے آنے کا منتظر تھا۔

اچانک دائیں جانب کی جھاڑیوں میں سرسراہٹ بڑھ گئی اور جھاڑیوں کے بیچ میں سے ایک اجنبی چہرے نے جھانکا۔ برقائی خان مقناطیسی انداز میں آواز کی سمت میں گھوم گیا۔ چہرے پر نگاہ پڑتے ہی اس نے سکون کی سانس لی۔ وہ چہرہ بھی برقائی خان کا چہرہ حیرت بھری نگاہوں سے دیکھنے میں محو تھا۔

''سمنائی!...... چلے آؤ''۔ برقائی خان نے دھیمے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ وہ چہرہ جھاڑیوں کے عقب میں سے نکل کر اب بالکل سامنے آ گیا تھا۔ ارغوانی رنگ کے مخصوص سمنائی لباس میں ملبوس وہ چہرے سے ہی شکاری دکھائی دیتا تھا۔

''برقائی خان ......!'' اجنبی سمنائی حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''مجھے تمہیں یہاں دیکھ کر تعجب ہو رہا ہے۔ تمہیں تو اپنے بھائی کے ساتھ دارالحکومت سرائے میں ہونا چاہیے تھا''۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں خون خرابے سے باغی ہوں۔ بے شک میں منگول سہی مگر میرے خون میں منگولوں جیسی وحشت و بربریت نہیں ہے''۔ برقائی خان نے لاپروائی سے جواب دیا۔

''جانے کیوں......؟ تم مجھے کبھی کبھار سرے سے ہی منگول نہیں لگتے''۔ وہ سر جھٹک کر بولا۔

''جو چاہے سمجھ لو، میں بُرا ماننے والوں میں سے نہیں''۔ برقائی خان نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔

''یہی باتیں تو مجھے حیران کر دیتی ہیں کہ تم آخر کس چیز کے بنے ہوئے ہو''۔

''چھوڑو......! کوئی اور بات کرو''۔

''میں دھوئیں کی لکیر دیکھ کر اِدھر نکل آیا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ اپنے قبیلے کا کوئی آدمی ہوگا''۔ وہ دھیرے سے ہنسا۔

''اپنے شکار کی سناؤ۔ آج کل کیسا جا رہا ہے؟ اب تو جانور سرکیشی پہاڑیوں پر بھی مٹتے دکھائی دینے لگے ہیں''۔ برقائی خان نے قہقہہ لگا کر کہا۔ وہ بھی جھینپے انداز میں ہنسنے لگا۔

''برقائی خان......! تم اس موسم میں اس طرف کہاں آ نکلے؟ تم تو بہار میں شکار کرنے ادھر آیا کرتے ہو''۔ اس نے سوال کیا۔

''اوہ......! باتوں میں تم نے بھلا ہی دیا۔ تم نے آج صبح کے بعد سرخ قبیلہ کے افراد کو تو قرب و جوار میں نہیں دیکھا؟'' برقائی خان نے اچانک پوچھا۔

''سرخ قبیلہ کے لوگوں کو......!''

وہ غیر متوقع سوال پر چونک پڑا۔

''ہاں دیکھا تو ہے مگر تمہیں یہ بات پوچھنے کی ضرورت کیونکر پیش آئی؟''

''وہ میں تمہیں بتانا ہی بھول گیا تھا کہ میں تنہا ادھر نہیں آیا تھا بلکہ ایک دوست کی محبت کھینچ لائی تھی۔ اسی نے خواہش ظاہر کی کہ شکار کھیلا جائے میں اس کے ہمراہ اس طرف نکل آیا۔ آج صبح میں ذرا اطراف میں نکل گیا اور واپسی پر دیکھا کہ میرا دوست غائب ہے اور رات کے بھنے ہوئے شکار پر کوئی ہاتھ صاف کر گیا ہے۔ نشانات

سے تو مجھے یہی اندازہ ہوا تھا کہ یہ حرکت سرخ قبیلے والوں کی ہی ہو سکتی ہے مگر اب تمہاری تصدیق سے معاملہ مکمل طور پر میری سمجھ میں آ گیا ہے"۔

"نہیں تمہارا دوست عرب تو نہیں......؟"

"ہاں...... ہاں! مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

برقائی خان اس کی بات پر چونک اٹھا۔

"آج صبح میں نے سرخ قبیلے کے سردار دقیاڑائی خان کو سرخوں کے ہمراہ سرکیشی پہاڑیوں پر دیکھا تھا۔ سہ پہر کے بعد ایک دوسری پہاڑی کی چوٹی پر سے میں نے انہیں جلب گائی کی جانب جاتے دیکھا۔ انہوں نے بانس سے کچھ باندھ رکھا تھا۔ میں نے اشتیاق سے ان کے شکار کو غور سے دیکھا تو میں پل بھر کے لئے متحیر رہ گیا کہ ان کا شکار کوئی جانور نہیں کوئی عربی دکھائی دیتا تھا"۔

وہ برقائی خان کے چہرے پر جاہ وجلال کی شکنیں گہری ہوتے دیکھ کر پریشان سا ہو گیا۔ چند لمحے قبل کا برقائی خان اب حقیقتاً منگول ہی دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کے سپید چہرے پر چھائی ہوئی معصومیت آتش انتقام میں دہکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"ان خبیثوں کی اتنی جرأت کہ وہ سنہرے خیمے کے تقدس کو پامال کریں اور میرے عزیز دوست کو قیدی بنا کر لے جائیں۔ میں ان کی تمام نسلوں کو مٹا ڈالوں گا"۔ برقائی خان کی منگولانہ فطرت بے قابو ہونے لگی۔

"کیا......؟ انہوں نے تمہارے دوست کو سنہرے خیمے میں سے گرفتار کیا......؟"

اجنبی اس حیرت انگیز انکشاف پر دہل کر رہ گیا تھا۔ سنہرے خیمے پر ہاتھ ڈالنا بغاوت کے مترادف تھا۔ یہ چنگیز خان کے بیٹے توشی خان کے تقدس کی علامت تھا۔

چنگیز خان جب عالم اسلام کے بڑے رقبے کو تباہ و برباد کر کے واپس لوٹا تو تنکت میں اس نے تنگری خان کو خوفناک شکست دی اور اس کے ملک کو تاخت وتاراج کر ڈالا۔ اس کا زور ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔ چنگیز خان تمام عمر جنگ وجدل میں گذارنے کے بعد اب بوڑھا اور کمزور ہو چکا تھا اور اس کی عمر تہتر برس ہو چکی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس نے ایک ایسا خواب دیکھا تھا جس میں اس کی موت کا واضح اشارہ دیا گیا تھا۔ اس خواب کے بعد اس نے اپنے سب بیٹوں کو جمع کر لیا اور دیگر سرداروں کو بھی بلایا۔ اس نے منگول سلطنت کی وفاداری کا ان سب سے حلف لیا اور اس کے بعد ایک ملاقات اپنے بیٹوں سے علیحدگی میں کی۔ اس نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ میں نے اتنی بڑی سلطنت بنا دی ہے کہ جس کی ایک سمت سے دوسری سمت تک جاتے ہوئے قریباً ایک سال کی مدت صرف ہو جاتی ہے، اب تم بتاؤ کہ تم کسے میرے بعد جانشین بناؤ گے؟ تو سب نے بالاتفاق کہا کہ آپ ہمارے باپ ہیں جو فرمان دیں گے ہم اسی کی پیروی کریں گے۔ چنگیز خان توشی خان کو ولی عہد بنانے کا خواہش مند تھا مگر وہ اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی وفات پا گیا تھا لہٰذا اس نے بڑے بیٹے اوکتائی (اوغدائی) خان کو جانشین مقرر کیا۔ مستند روایات کے مطابق چنگیز خان کا انتقال 624ھ میں ہوا۔ اس کے بعد ڈیڑھ سال تک کوئی تخت نشین نہیں ہو پایا۔ اس کے بعد اوکتائی خان کی مسند نشینی عمل میں لائی گئی۔ منگول و تاتار سب نے اسے سلطنت کا دوسرا قاآن اعظم چنا تھا۔ اس نے قریباً تیرہ سال، تین ماہ حکومت کی۔ اوکتائی خان نے شراب نوشی کی کثرت کے باعث 638ھ میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کے چھوٹے بیٹے قیوق خان کو حکمران چنا گیا۔ قیوق خان بنیادی طور پر نصرانیت کی جانب مائل تھا، اسی لئے اس نے اسلام دشمنی کی انتہا کر دی۔ اس کے دور میں عارف و زاہد لوگوں کو چن چن کر قتل کیا گیا۔ اسلام کی تبلیغ کو سنگین جرم قرار دے دیا گیا۔ چنگیز خان اور اوکتائی خان نے محکوم مسلمانوں کو جو حقوق دے رکھے تھے، ان میں امتیاز برتا جانے لگا۔ جب قیوق خان نے کفر پرستی اور مسلمانوں پر ظلم وایذا کے نقوش گہرے کر دیئے تو قدرت کاملہ کو جوش آیا اور قیوق خان کو عذاب درد میں مبتلا کر دیا گیا۔ ناقابل برداشت درد کے عالم میں تڑپتے تڑپتے اس دشمن اسلام نے دم توڑا تو مسلمانوں کی جان میں جان آئی۔ انہوں نے خدائے باری تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

منگول سردار اب باتو خان کی جانب دیکھنے لگے اور اس کی حکمرانی پر متفق ہو گئے جو کہ اپنے باپ توشی خان کے ملک اردوئے زریں پر بڑی کامیابی سے انتظام حکومت چلا رہا تھا۔ چنگیز خان نے اپنی زندگی میں ہی ان علاقوں کو فتح کرنے کے بعد توشی خان کو ان کا منتظم بنا دیا تھا، توشی خان کے انتقال کے بعد اس کے فرزند باتو خان کو چنگیز خان نے اس بڑے خطے کا منتظم بنا دیا۔ وہ بااختیار ہونے کے ساتھ چنگیز خان کا ماتحت تھا۔ باتو خان نے منگول سلطنت کی دشوار ترین ذمہ داری سے معذرت اختیار کرتے ہوئے اپنا دامن صاف بچا لیا۔ منگول سرداروں نے بالآخر چنگیز خان کے دوسرے بیٹے تولی خان کے فرزند منگو خان کو متفقہ طور پر اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ باتو خان نے بھی آگے بڑھ کر اس کی اطاعت کا اعلان کیا۔ باتو خان کی حکومت پہلے بھی قاآن اعظم کے تحت تھی۔

باتو خان اسی توشی خان کا بیٹا تھا جو کہ تاریخ میں جوجی خان کے نام سے مشہور ہوا اور اسی باتو خان کا چھوٹا بھائی برقائی خان سرکیشی پہاڑی کی ایک چوٹی پر بیٹھا غم وغصے سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔



بیبرس علی الصبح نماز سے فارغ ہو کر نجم الدین ایوب کے محل کے صدر دروازے کی جانب نکل آیا۔ دروازے پر موجود پہرے دار نے اس کی جانب مشکوک نگاہوں سے دیکھا تو اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے اسے مطمئن کر دیا۔ گفتگو کا فن اُسے خوب آتا تھا، کسی کو مطمئن کرنا اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر کھلی فضا میں چہل قدمی کا خواہش مند تھا۔ جب سے وہ شاہی محل میں آیا تھا، اس کی آزادی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ آج کچھ جولانی سی طاری تھی۔ وہ دھیرے قدموں سے چلتا ہوا شاہی محل سے دور نکل آیا۔ بازار ابھی تک بند ہی تھے۔ دو ایک دوکانیں کھلی دکھائی دیں۔ بازار میں پہنچ کر بیبرس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ انہی بازاروں میں چند سال پیشتر وہ اپنے مرحوم آقا بندقداری کے ہمراہ آیا تھا۔ زندگی کا وہ رُخ کتنا حسین تھا۔ اس نے ایک پل کے لئے سوچا۔

اچانک اس کے کندھے پر کسی کے ہاتھ کے دباؤ نے اس کے خیالوں کا تسلسل منتشر کر ڈالا۔ اس نے چونک کر دیکھا تو جو صورت اسے دکھائی دی، وہ اس کی طبیعت کو مکدر کرتی چلی گئی۔ وہ صبح سویرے کسی ایسے چہرے کو دیکھنے کا قطعی خواہش مند نہیں تھا۔

"بیبرس! سناؤ کیسی گذر رہی ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے، دل مطمئن ہے اور ضمیر میں کوئی خلش باقی نہیں"۔ بیبرس نے نہایت تحمل سے جواب دیا۔

"آخر اطمینان کیوں نہ ہو؟ شاہی محلوں کے مزے جو لوٹے جا رہے ہیں"۔ وہ استہزائیہ چہکا۔

"شاہی محل میں بھی مشیت ایزدی ہی لے گئی ہے، اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے؟"

بیبرس اس کی طنز کو نظرانداز کر گیا۔

"باتیں بنانا بھی خوب آ گئی ہیں"۔

"کوئی کام کی بات کرو"۔

ہیبرس اب اکتاہٹ محسوس کرنے لگا۔

''ہونہہ! تیور بھی بدل چکے ہیں۔ چلو کوئی بات نہیں۔ یہ عیاشی چند ہی دن کی مہمان ہے''۔ وہ دیدے مٹکاتا ہوا بولا۔

''رحمت خداوندی کو عیاشی مت کہو''۔

''چلو! جو تم کہتے وہی سہی۔ میرے آقا کا کہنا ہے کہ چند ہی دن کی بات ہے ہیبرس پھر انہی کے در پہ جوتیاں گھسایا کرے گا''۔

''ٹھیک ہے اگر میرے مقدر میں یہی لکھا ہوا ہے تو میں اسی پر شاکر رہوں گا''۔ ہیبرس لاپروائی سے بولا۔ وہ اب حیرانگی سے اس کا منہ دیکھنے لگا تھا۔

''تمہیں کوئی خوف نہیں کہ آقا اپنی ذلت کا بدلہ لینے کے لئے تمہاری کھال اتروا ڈالیں گے''۔

''ان کی کیسی عزت...... جو خود ہی پستی میں گرا ہو، اسے ذلت عزت سے کیا سروکار؟''

''لگتا ہے کہ شاہی محل کے پانی نے تمہیں نڈر و بے باک بنا دیا ہے''۔

''یاد رکھو کہ خوف صرف ذات باری تعالیٰ سے ہی ہونا چاہئے۔ بندے اور تمہارے آقا جیسے حقیر و پست ذہنیت کے مالک بندے کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ تو خود خوف زدہ رہتے ہیں، انہیں کبھی جاہ و حشمت کے چھن جانے کا خوف ہوتا ہے، تو کبھی مال و اسباب کے لٹ جانے کا خدشہ ان کا سکون برباد کئے رکھتا ہے۔ میں ایسے لوگوں سے قطعی خوفزدہ نہیں ہوتا''۔

''داناؤں جیسی باتیں کرنے لگے ہو، مجھے تو تمہاری جوانی پر ترس آتا ہے۔ میرے آقا کے ارادے بڑے خوفناک ہیں''۔

''مجھے یہ سب کیوں بتا رہے ہو؟'' ہیبرس نے پوچھا۔

''جانے کیوں......؟ تم سے ہمدردی سی محسوس ہونے لگی ہے''۔ اس کا لہجہ اس کی سچائی کا عکاس تھا۔ ہیبرس اس کی صورت دیکھ کر دھیما سا مسکرایا اور اس کا شانہ تھپکنے لگا۔

''گھر جاؤ اور اس بات کا اطمینان رکھو کہ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ میرا حامی و ناصر اللہ ہے اور میں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں''۔

''جی میں آتا ہے کہ تمہیں اپنے آقا کی سچائی سے آگاہ کر ہی ڈالوں''۔ وہ لمحہ بھر توقف سے بولا۔

''سچائی..... سچائی ہی ہوتی ہے۔ ایک نہ ایک دن خود ہی سب پر آشکارا ہو جاتی ہے۔ تم اپنے مالک کی پشت پر اگر اس کا کوئی راز منکشف کرو گے تو تم روز محشر جرم وار بن جاؤ گے۔ اس دنیا میں شاید تم اسے چھپا کر سزا و جزا سے بچ جاؤ مگر اُس دنیا کی فکر کرو جہاں کوئی کسی کو محفوظ نہیں رکھ پائے گا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ تم اپنے آقا کے رازوں کی حفاظت کرو اور مجھے کسی قسم کی کوئی بات بتائے بغیر اپنا مطلوبہ کام مکمل کر کے گھر لوٹ جاؤ''۔ ہیبرس نے اسے سختی سے منع کر دیا۔

وہ ہیبرس کی بات سن کر اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ آسمان سے اُتری ہوئی کوئی انوکھی مخلوق ہو۔ اس نفسا نفسی کے عالم میں جب امراء اسباب و اختیار کے حصول کے لئے ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے سے باز نہیں آتے تھے اور غریب شخص بھی پیٹ کے دوزخ کی آگ مٹانے کے لئے نیکی و بدی کا امتیاز کھوتا جا رہا تھا، ایسے دور کشاکش میں ہیبرس واقعی کسی دوسری دنیا کا باشندہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے نگاہیں جھکائیں اور ہیبرس سے مصافحہ کیا اور اپنے بدتمیزانہ انداز کی معافی مانگی اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔ ہیبرس نے اسے ذرا بھر بھی محسوس نہیں

ہونے دیا کہ وہ اس کے لب و لہجہ سے ملول تھا بلکہ رخصت ہونے سے قبل اُسے ایک لطیف چٹکلہ سنا کر اس کے ذہن پر چھائی ہوئی دھند تک کو صاف کر دیا۔ پل بھر کے لئے ہیبرس نے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور اس کی جانب سے منہ موڑ کر واپسی کی راہ اختیار کی۔ اس کے ذہن میں اس غلام کی باتیں تیزی سے رواں تھیں۔ وہ اس کے چالاک آقا جمال الدین المراحی کا ایک پرانا اور منہ چڑھا غلام تھا۔ ہیبرس اس کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ خود کو مہان شے سمجھتا ہے اور دوسرے لوگ اس کی نگاہ میں حقیر و پست ہیں۔ خوشامدانہ طرز طبیعت نے اسے جمال الدین المراحی کا خاص غلام تو بنا ڈالا تھا مگر اس کی بڑھکیں ہانکنے کی عادت اکثر اس کے مالک کے خلاف جاتی تھی۔ یقیناً جمال الدین المراحی کسی نئی کمینگی کا مرتکب ہونے والا تھا جس میں اس کی ذات بھی ملوث تھی۔

اس بارے میں اسے کیا کرنا چاہئے......؟ وہ اب اس بارے میں سوچ و بچار میں محو تھا۔ جانے کب وہ نجم الدین ایوب کے محل میں داخل ہوا اور کب اپنے جائے قیام میں پہنچ گیا، اسے خبر نہ ہو پائی تھی۔ اس کا ذہن مسلسل متحرک تھا۔



تونائی خان اپنے جوان فرزند بوغائی خان کے ہمراہ کچھ ہی لمحے قبل جلب گائی پہنچا تھا۔ یہاں اس کی تیسری بیوی رُبابہ کا میکہ تھا۔ کچھ دن قبل وہ اپنے والدین سے ملنے کے لئے یہاں آئی تھی۔ واپسی میں تاخیر ہونے کے باعث تونائی خان خود ہی بیٹے کے ہمراہ وہاں چلا آیا۔ اس کی آمد معلوم پڑنے پر سردار دقبا ژائی خان نے خود آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ تونائی خان چنگیز خان کا رشتہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ حیثیت کا حامل فرد تھا۔ ماضی میں سلطنت منگولیانہ کے لئے اس کی خدمات سب کے سامنے عیاں تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سلطنت کے کسی بھی حصے میں جہاں کہیں بھی جاتا وہیں اس کا استقبال پرتپاک انداز میں کیا جاتا۔ سردار دقبا ژائی خان نے اس کی آمد پر مسرت کا اظہار کیا اور اسے رات کے کھانے کی دعوت دی۔ تونائی خان نے اس دعوت کو قبول کر لیا مگر وہ جلد از جلد اپنی بیوی کے گھر پہنچنے کا متمنی تھا، اس لئے اس نے معذرت کرتے ہوئے مزید گفتگو کا سلسلہ ختم کیا اور وہاں سے سیدھا سسرالی خیمے میں چلا آیا۔ جلب گائی کہنے کو ایک بڑا قصبہ تھا مگر یہاں کے لوگ مستقلاً بڑے گول خیموں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ انہیں اپنی روایات سے بے حد محبت تھی۔ وہ پختہ مکانات کو بدارواح کا مسکن قرار دیتے تھے۔ منگولوں میں بدارواح کا تصور بڑا مضبوط تھا۔ وہ جس قدر بدارواح سے خوفزدہ ہوتے تھے، اتنا خوف انہیں میدان جنگ میں بھی نہیں محسوس ہوتا تھا۔

اس کا سسر عمر رسیدہ تاتاری تھا جس کا نام منک آنہ تھا، تنگری کے خلاف مہم میں اس شخص نے چنگیز خان کے ساتھ کئی لڑائیاں لڑی تھیں۔ وہ جوانی ڈھل جانے کے بعد اب مستقلاً جلب گائی میں مقیم تھا۔ اس نے جب تونائی خان کو خیمے کے دروازے پر پایا تو وہ استعجاب و خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ اس کے وہم و خیال میں بھی نہیں تھا کہ تونائی اپنی بیوی رُبابہ کے لئے یہاں چلا آئے گا۔ منگولوں کی روایات میں بیوی کی حیثیت بے حد کمتر سمجھی جاتی تھی۔ وہ عورتوں کو محض دل افروزی اور گھریلو خدمات کا پابند سمجھتے تھے۔ ایک سے زیادہ عورتوں کو زوجیت میں رکھنا ان کے لئے عام سی بات تھی۔ سرداروں میں تو بیویوں کی تعداد دہائیوں میں پہنچ جایا کرتی۔

''ایک لمبے عرصے کے بعد تمہاری شکل دیکھنے کو ملی ہے...... تونائی خان!'' منک آنہ بولا۔

''بس اسے مصروفیت کا ہی نام دوں گا۔ دل [illegible] عرصہ سے چاہتا تھا کہ آپ سے ملاقات ہو جائے، جانے کب آپ کا بلاوا آ جائے اور میں اس شرف سے بھی محروم رہ جاؤں، اس دفعہ رُبابہ آئی ہوئی تھی، سوچا اسی کے

بہانے ہی میں بھی ذرا ہواخوری کرلوں'' ۔ تو نائی خان مسکرایا۔

''چلو اچھا کیا جو ادھر چلے آئے ۔ دقباژائی کا ایک کام تو آسان ہوا، ورنہ وہ تمہیں قاصد بھیج کر بلانے کا قصد کرتا''۔

''خیریت!'' تو نائی ڈھلکے ہوئے پپوٹوں کو قدرے اُٹھا کر بولا۔ ''ایسی کیا بات ہوگئی؟ کہ دقباژائی کو مجھے مدعو کرنا پڑتا''۔

''دقباژائی طویل عرصہ کے بعد اپنے اجداد کی عبادت کو زندہ کرنے کا خواہش مند ہے، اب اس نے اعلان کیا ہے کہ یہ عبادت نئے چاند کی روشنی پر کی جائے گی۔ نئے چاند میں ابھی اٹھارہ دن باقی ہیں''۔ منک آنہ نے وضاحت کی۔

''سرخوں کی عبادت!'' تو نائی جیسے بیٹھے بیٹھے اپنی جگہ اچھل پڑا۔ ''کہیں آپ کا اشارہ عبادت خون گیس کی جانب تو نہیں ہے.....؟''

''ہاں تم بالکل صحیح سمجھے ہو، عبادت خون گیس......یعنی نئے چاند کی رات انسانی قربانی خدائے جاودانی آفتاب کی نذر کی جائے گی۔ تاکہ اس برس خدائے جاودانی آفتاب پر بُری ارواح کا سایہ نہ پڑ سکے اور وہ پوری آب وتاب سے روشن رہے''۔

''یہ ناممکن ہے......!'' تو نائی قریباً چیختے ہوئے بولا۔ اس کا چہرہ استعجاب کی زیادتی سے بگڑ گیا۔

''کیوں؟ ناممکن کیوں......؟ آج سے پیشتر بھی تو منگول یہ عبادت سرانجام دیتے آئے ہیں''۔

منک آنہ کے تیور بدلنے لگے۔

''آپ جانتے ہیں کہ قاآن اعظم نے اس عبادت پر پابندی عائد کر رکھی ہے، تموچن نے پہلی بار اس عمل کو غیر انسانی قرار دیا تھا اور پابندی لگائی تھی۔ سب قبائل اُس وقت پابندی پر باہم رضامند ہوئے تھے۔ اب اسے دوبارہ جاری کرنا سلطنت کے قوانین توڑنے والی حرکت کے مترادف ہے، دوسرا اس عبادت میں کوئی تاتاری یا منگول قربان نہیں کیا جاسکتا''۔

''میں سب جانتا ہوں، قبیلے والے خود اس عبادت کے خلاف ہیں''۔ منک آنہ کا لہجہ حیرت انگیز طور پر بدل گیا۔ اس کے لہجے میں پہلے سی چاشنی پھر لوٹ آئی تھی۔ ''انہوں نے سردار کے اس فعل کی بھرپور مذمت کی ہے مگر دقباژائی کا کہنا ہے کہ تموچن کے ساتھ ساتھ اس کی لگائی گئی ہر پابندی بھی مر چکی ہے۔ اب تمام قبائل آزاد ہیں اور ان کی آزادی سلب کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں ہے''۔

''یعنی دقباژائی ارادۂ بغاوت میں ملوث ہے، آپ کو اُسے سمجھانا چاہئے تھا کہ وہ اکیلا قاآن اعظم کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ کیوں اپنے قبیلے کو موت کے منہ دھکیلنے کا خواہش مند ہے''۔ تو نائی خان پریشان سا ہوگیا۔

''تم کیا سمجھتے ہو کہ میں نے اُسے کچھ نہیں سمجھایا ہوگا......بہتیرا سمجھایا بجھایا مگر وہ اپنے اجداد کی روایت زندہ کرنے کی خواہش میں اندھا ہو چکا ہے، تم اب آہی نکلے ہو تو اسے طریقے سلیقے سے سمجھاؤ کہ وہ اپنی اس روش سے باز رہے''۔

''اوہ......! میں اب سمجھا کہ وہ خصوصاً میرے استقبال کے لئے کیوں آیا تھا اور پھر آج رات کے کھانے کی دعوت کے پیچھے کیا راز پوشیدہ تھا......؟''

تو نائی خان نے دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرتے ہوئے خود رفتگی کے عالم میں جواب دیا۔

''پھر تو تمہیں یہ موقعہ گنوانا نہیں چاہئے۔ اسے جلد از جلد قائل کرو۔ اس نے تو کئی سرداروں کو باضابطہ آمد کی دعوت دے ڈالی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ منگول اپنی عبادات کے چکر میں الجھ کر تفرقے کا شکار ہو جائیں، دشمنوں کا خون بہانے والے اپنوں کی گردنیں کاٹنے لگیں''۔

منک آنہ حقیقتاً دقباژائی کے فیصلے سے خوفزدہ دکھائی دے رہا تھا۔ تو نائی خان اپنے سسر کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا، اس کے ماتھے کی شکنیں گہری ہونے لگیں۔ وہ اس وقت کو تخیل کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا، جب منگول کسی بھی غلط فیصلے کے مرتکب ہو کر آپس میں برسرپیکار ہو جائیں گے۔ اس نے اس وقت کو اپنی نگاہوں کے سامنے محسوس کیا تو اس کی روح تک دہل گئی، تموچن نے دن رات کی لگاتار محنت سے جس تہذیب کا دروازہ ان پر کھولا تھا، دقباژائی اسے بند کرنے پر تلا ہوا تھا۔

تو نائی خان نے اس ضمن میں دقباژائی سے خود بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے باقی ماندہ دن دیگر لوگوں سے ملاقاتوں میں گذارا۔ رات کے آغاز پر ہی وہ دقباژائی کے خیمے کی طرف روانہ ہوا۔ دقباژائی نے اس کی آمد کی اطلاع پاتے ہی طعام کی فوری تیاری کا حکم صادر کر دیا۔ تو نائی خان کو ایک خاص خیمے میں بٹھایا گیا جو کہ دقباژائی خان کا سب سے قیمتی خیمہ سمجھا جاتا تھا۔ یہاں آنے کی خواہش ہر سرخ کی تھی مگر چند خاص غلاموں کے علاوہ اس خیمے کی جانب کسی کو نگاہ اُٹھا کر دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ خیمہ سرخ یاخ کی کھال سے تیار کیا گیا تھا جو کہ کم یابی میں اوّل درجے کا جانور تھا۔ تو نائی خان نے خیمے میں نشست سنبھالی تو شراب پیش کی گئی۔ جام کی چسکیاں خیمے کی فضا میں ابھرنے لگیں۔ دقباژائی بوڑھا دکھائی تو ضرور دیتا تھا مگر اس کے چہرے پر بشاشت کسی جوان سے کم نہ تھی۔

''میں عظیم تو نائی کی آمد پر بے حد ناز کرتا ہوں۔ دقباژائی کے لئے یہ کسی اعزاز سے کم نہیں کہ وہ اپنی موت سے پہلے اپنے سب رُفقاء کو اپنے پاس ایک ساتھ دیکھے گا''۔

اس کا چہرہ سرشاری کے عالم میں دہک رہا تھا۔ تو نائی اس کی بات کا مطلب سمجھ رہا تھا مگر اس نے خاموشی برقرار رکھی تاکہ وہ خود ہی بات کو چھیڑ سکے۔ دقباژائی اس کی جانب پوری طرح متوجہ تھا مگر تو نائی خان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ اُس کی نگاہ سے اوجھل تھے۔ وہ شراب کے خمار میں مست دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ نچاتا ہوا بولا۔

''تو نائی! جاودانی آفتاب نے مجھے ایسی ہمت وقوت بخشی ہے کہ میں اس کی حیات کی گھمبگی کو دور کرنے کی سعی کر سکوں اور عبادت خون گیس کو انجام دے کر منگولوں کو نہ صرف بد ارواح سے محفوظ کر دوں بلکہ انہیں ان کی سابق روایات کی طرف واپس موڑ دوں۔ اسی لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس نئے چاند کی آمد پر عبادت خون گیس پورے اہتمام سے کی جائے۔ لہٰذا میں تم سے باضابطہ استدعا کروں گا کہ تم بھی میرے ہمراہ کندھے سے کندھا جوڑ کر منگولوں کی روایات کو دم توڑنے سے بچاتے ہوئے آئندہ نسلوں کی بہتری کے لئے یہ فریضہ انجام دو''۔

''تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا دقباژائی۔ تم جانتے ہو کہ کیا کہہ رہے ہو؟ لگتا ہے کہ شراب کا خمار اب تمہارے دماغ کو چڑھنے لگا ہے''۔ تو نائی خان نے ناگواری سے جواب دیا۔

''یہ شراب کا خمار نہیں تو نائی......! حقیقت ہے۔ میری نگاہیں منگولوں کو جاودانی آفتاب سے دور ہٹتے دیکھ رہی ہیں۔ مسلمان ونصاریٰ آہستہ آہستہ انہیں پراگندہ کر رہے ہیں۔ اگر اس وقت کوئی قدم نہ اُٹھایا گیا تو وہ وقت دور نہیں جب جاودانی آفتاب کا نام لینے والا کوئی نہیں ہوگا''۔

''تم تخیل کی آنکھ سے جو کچھ دیکھ رہے ہو، وہ سراب کے سوا اور کچھ نہیں۔ مسلمان و نصاریٰ لاکھ سعی کریں مگر وہ جاودانی آفتاب کو کبھی نہیں مٹا پائیں گے۔ وہ روز ازل سے ابد تک یونہی پوری آب و تاب سے روشن رہے گا''۔

''تم خوش فہمی میں مبتلا ہو تو نائی! ہوش کے ناخن لو، کیا تمہاری آنکھیں دیکھ نہیں پا رہیں کہ مسلمان و نصاریٰ ہمارے بچوں کو اپنی جانب کھینچ رہے ہیں، ہمارے بچوں کی منگول روایات سے لاعلمی ان لوگوں کے لئے کامیابی بنتی جا رہی ہے، دشت قپچاق سے لے کر خوارزم تک جتنے منگول موجود ہیں ان کے بچوں کی اکثریت تیزی حلقہ اسلام میں داخل ہو رہی ہے، ایل خانی سلطنت میں نصرانی چھاتے جا رہے ہیں۔ اگر اب بھی کوئی ٹھوس قدم نہ اُٹھایا گیا تو وہ قوم جو ہماری تلواروں نے بٹھا دی تھی، جن کے مستقبل کو ہم نے اپنے گھوڑوں تلے روند دیا تھا اور جنہیں غلامی کا بدترین طوق پہنایا گیا تھا، وہ بیدار ہو جائے گی اور منگولوں کو پھر سر چھپانے کے لئے جگہ ڈھونڈنا دشوار ہو جائے گی''۔

''مجھے اب واقعی یقین ہو چلا ہے کہ تمہارے دماغ میں واقعی خلل پیدا ہو گیا ہے، تم بزدل بنتے جا رہے ہو، تمہیں منگول کہلانے کا کوئی حق نہیں ہے''۔ تو نائی خان یکدم بھڑک اُٹھا۔

''خود کو قابو میں رکھو تو نائی! میری بات تحمل سے سمجھنے کی کوشش کرو۔ سلطنت اور دولت ایک نہ ایک دن ہمارا ساتھ چھوڑ جائے گی، تموچن کی مثال لے لو، اس کی موت کے بعد کیا کچھ نہیں ہوا، قا آن اعظم نے نہ صرف مسلمان و نصاریٰ کو اعلیٰ عہدے دے ڈالے بلکہ انہیں امان بھی عطا کر رکھا ہے۔ ماضی میں منگول سلطنت میں کبھی مسلمان مستقل رہائش پذیر نہیں ہو سکتے تھے، اب ان کے بڑے بڑے محل نما مکانات ہیں''۔

''دقبا ژائی! تم حالات کو توڑ مروڑ کر پیش کر کے واقعی دوسروں کو بدظن کر سکتے ہو مگر مجھے نہیں، میں بخوبی سمجھ رہا ہوں کہ تم اپنے مطلب کی برآوری کے لئے منگولوں میں منافرت کی فضا پیدا کر رہے ہو۔ منگول کل بھی عظیم تھے اور آج بھی عظیم ہیں، آنے والا کل بھی اس بات کی تصدیق کرے گا۔ میں اب اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ تم اپنی فطری خونخواری اور سرداری چمکانے کی ہوس میں مبتلا ہو۔ عبادت خون کیس کی انجام دہی کے پس پشت اصل مقصد صرف یہی ہے کہ تمام قبائل میں تمہاری عظمت کا اعتراف کیا جا سکے''۔

تو نائی نے اسے منہ توڑ جواب دیا۔

''میری عظمت!'' دقبا ژائی استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ ''تو نائی! تم بات کو گھما پھرا کر میری ہی جانب کیوں لے آتے ہو۔ جب میں منگول قبائل کی بات کرتا ہوں تو تم اسے سمجھنے کے بجائے میری ذات میں اُلجھ جاتے ہو۔ میری ذات سے باہر نکل کر ٹھنڈے دماغ سے ذرا سوچو گے تو تمہیں میری باتیں اچھی طرح سمجھ آ سکیں گی''۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ عبادت خون کیس کے قضیئے کو چھیڑنے کا مطلب سراسر بغاوت بھی ہو سکتا ہے''۔ تو نائی خان نے متنبہ کیا۔

''یہی سمجھ لو! میں منگولیانہ روایات کو بچانے کے لئے اقدام بغاوت سے بھی باز نہیں آؤں گا''۔

''میں قا آن اعظم کے خلاف کچھ کرنے کے بارے میں سوچنا بھی گناہ سمجھتا ہوں، اس لئے تم مجھے اپنے ساتھ شامل نہ سمجھو''۔

تو نائی فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

دقبا ژائی اس کے بگڑے ہوئے چہرے کی جانب غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں درد سمٹ آیا

تھا۔

''تمہیں روایات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، ٹھیک ہے میں تنہا ہی اس مقصد کو لئے آگے بڑھوں گا۔ ممکن ہے کہ کچھ لوگ میرے ساتھی بن جائیں اور کچھ لوگ میرے دشمن ہو جائیں۔ اگر میں کامیاب ہوا تو ہر پل روایات کی حفاظت کا فریضہ انجام دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھوں گا۔ اگر میں ناکام ہو گیا تو میری بات یاد رکھنا کہ آنے والی نسلیں جاودانی آفتاب کو بھول جائیں گی اور ہر طرف دوسرے مذاہب کا ڈنکا بجنے لگے گا''۔

دقبا ژائی کا لہجہ بے حد کڑوا تھا۔ تو نائی خان نے سترحم نگاہوں سے اسے دیکھا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ آنے والے وقت میں دقبا ژائی اور سرخ قبیلے پر کڑی آفت کے بادل دیکھ رہا تھا۔



نجم الدین ایوب ظہر کی نماز کی ادائیگی سے فارغ ہو کر اپنے محل کی جانب روانہ ہوا۔ وہ سیدھا محل پہنچا۔ آج چند حکومتی امور نے اسے ضرورت سے زیادہ ہی تھکا دیا تھا۔ اسی لئے وہ محل واپس لوٹ آیا۔ وہ دوپہر میں آرام کرنا چاہتا تھا۔ وہ کمرۂ خاص میں داخل ہوا ہی تھا کہ اسے کسی نے عقب سے مخاطب کیا۔ اس نے گردن گھمائی تو اسے ابو خویلد کا چہرہ دکھائی دیا۔

''کیا بات ہے ابو خویلد؟''

''آقا ایک ضروری بات کرنا تھی''۔

''میں اس وقت خاصا تھک گیا ہوں، کیا ممکن نہیں کہ شام کو بات کی جائے''۔

''بات کی نوعیت میرے خیال میں سنگین ہے۔ اگر آپ ابھی نہیں سننا چاہتے تو شام کو سہی''۔ ابو خویلد نے مؤدب لہجے میں جواب دیا۔

''کہو! میں سن رہا ہوں''۔

''آج صبح بیبرس نماز سے فراغت کے بعد محل سے باہر سیر کے لئے گیا تھا کہ اسے راہ میں جمال الدین المراحی کا ایک غلام ملا اور اس نے باتوں باتوں میں ایسا اشارہ دیا کہ اس کا مالک بیبرس کے حصول کے لئے کوئی شاطرانہ چال چلنے کا سوچ رہا ہے۔ بیبرس نے اپنی فطرت کے تحت اس غلام کو مزید کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ بعد میں بیبرس نے واپس لوٹ کر میرے ساتھ بات کی تو میں نے اسے تسلی دی کہ ایسا کچھ نہیں ہو گا مگر بیبرس جانے کیوں مطمئن نہیں ہو پایا۔ اس نے استدعا کی کہ اسے چند گھنٹوں تک باہر جانے کی مہلت دی جائے تاکہ وہ حقیقت حال معلوم کر سکے کہ جمال الدین المراحی کیا گل کھلانے والا ہے؟ میں نے اس کے اصرار پر اپنے تئیں اسے باہر جانے کی اجازت دے دی، جس کے لئے میں معافی کا خواستگار ہوں''۔ ابو خویلد نے گردن جھکالی۔

''تو کیا ہوا؟ بیبرس تمہیں بے وقوف بنا کر فرار ہو گیا؟'' نجم الدین ایوب کے چہرے پر خفگی سی پھیل گئی۔

''نہیں ایسی بات نہیں! وہ جو اطلاعات لے کر واپس لوٹا ہے، وہ خاصی تعجب انگیز ہیں، اسی لئے میں نے سوچا کہ جونہی آپ کی واپسی ہو، میں آپ کے گوش گزار کر دوں۔ بیبرس کی اطلاع کے مطابق جمال الدین المراحی کا بیٹا جو کہ صیغۂ احتساب میں صاحب دیوان ہے، اس نے آپ کے خلاف کوئی فرد بغاوت تیار کی ہے جو کہ جلد ہی سلطان و امراء کے سامنے پیش کی جانے والی ہے۔ جمال الدین المراحی نے اپنی حیثیت کا استعمال کرتے ہوئے قاضی القضاۃ پر بھی دباؤ ڈالا ہے کہ وہ آپ کو مجرم قرار دے کر سخت ترین سزا دیں''۔

نجم الدین ایوب بے یقینی سے ابو خویلد کا چہرہ دیکھ رہا تھا جیسے وہ کوئی انہونی بات کر رہا ہو۔

"کیا تم پورے یقین و وثوق سے کہہ سکتے ہو کہ بیبرس کی طرف سے فراہم کی گئی اطلاعات بالکل صحیح اور مصدقہ ہیں"۔

"جی ہاں! میں نے بیبرس کو بے حد قریب سے دیکھا ہے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ جھوٹ و مکر سے سخت نفرت کرتا ہے"۔

"ٹھیک ہے میں اپنے تئیں بھی اس بارے میں چھان بین کراؤں گا۔ اگر ایسا کچھ ہے تو پھر اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔ ویسے مجھے حیرت ہے کہ اتنی کھچڑی پک رہی ہے اور میرے مخبر ابھی تک بے خبر ہیں۔ میرے خیال میں بیبرس کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ دوسرا قاضی القضاۃ تک اگر یہ بات پہنچ چکی ہوتی ...... تو وہ کب کا مجھے آگاہ کر چکے ہوتے"۔

نجم الدین ایوب کو جہاں یہ بات سن کر سخت حیرت ہوئی تھی وہیں وہ گومگوئی حالت کا شکار بھی تھا۔ بیبرس کی اطلاع پر یوں یقین کر لینا شاید اس کے بس میں نہیں تھا۔

اسی لمحے دوسرے غلام نے اندر آنے کی اجازت طلب کی، نجم الدین ایوب نے ابوخویلد کی جانب دیکھا تو وہ اس کا مفہوم سمجھ گیا۔ وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

"کیا بات ہے......؟ تمہیں معلوم نہیں کہ آقا اس وقت آرام کرنا چاہتے ہیں"۔

ابوخویلد نے تیز لہجے میں کہا۔

"قاضی کی جانب سے قاصد کوئی پیغام لایا ہے اور وہ فوراً آقا سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔ میں نے اسے دوبارہ آنے کا کہا تو اس نے ابھی ملنے کا اصرار کیا تو میں چلا آیا"۔

"اچھا! اسے مہمان خانے میں بٹھاؤ"۔

ابوخویلد اسے ہدایت دینے کے بعد نجم الدین ایوب کی جانب بڑھا اور قاصد کی آمد اور فوری ملاقات کی خواہش سے باخبر کیا۔ نجم الدین ایوب قاضی القضاۃ کی جانب سے پیغام کی خبر پا کر گہری سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اس نے مہمان خانے کا رُخ کیا۔ مہمان خانے میں ایک نوجوان شخص موجود تھا جو کہ اس کے داخل ہونے پر اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ سلام و دعا کے بعد نجم الدین نے اس سے آمد کی وجہ طلب کی تو اس نے ایک سنہرے کاغذ کا مراسلہ اس کی جانب بڑھا دیا۔ نجم الدین ایوب نے کاغذ کی تہہ کھولی اور پیغام پڑھنے لگا۔

"نجم الدین ایوب! اسلام علیکم! مجھے آج صبح بے حد حیرت کا سامنا ہوا، جب تمہارے مراسلے کی تکمیل کے لئے میں نے دو ہرکارے جمال الدین الراحی کے گھر روانہ کئے تھے۔ تم نے مجھے ہدایت کی تھی کہ اس کے بیٹے کو بلا کر اس کا کڑا امتحان لیا جائے اور اس کے بعد اس کی قابلیت و لیاقت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے لئے کسی عہدے کی سفارش کی جائے۔ میں نے اس کام کی انجام دہی کے لئے کئی بار پیغام بھیجا مگر الراحی کی جانب سے کوئی معاونت نہیں ہوئی۔ بہانہ بازی سے کام لیا گیا۔ جس پر میں نے آج خصوصاً اپنے مخبروں کو ہدایت کی کہ وہ معاملے کی اصلیت سامنے لائیں۔ انہوں نے جو خبر یہاں پہنچائی ہے وہ بے حد حیرت انگیز ہے۔ الراحی کے جس بیٹے کے لئے تم نے مراسلہ بھیجا تھا وہ صیغہ احتساب میں صاحب دیوان ہے۔ اسے صاحب دیوان کس کے حکم سے بنایا گیا ہے، مجھے علم نہیں ہو سکا۔ اسی لئے فوری طور پر تمہیں ہدایت کی جاتی ہے کہ معاملہ کی تحقیق کر کے دفتر القضاۃ کو باخبر کرو...... قاضی القضاۃ"۔

نجم الدین ایوب تعجب سے مراسلے کو پڑھ رہا تھا۔ جمال الدین الراحی کو اتنا بڑا اختیار کس نے دے دیا کہ وہ براہِ راست صیغہ احتساب پر اثر انداز ہو سکے۔ اگر ایسا تھا تو بیبرس کی اطلاع بالکل درست ہو سکتی تھی کیونکہ

صیغہ احتساب ہی وہ ادارہ تھا جو کسی بھی امیر یا حکمران کے مستقبل کو تاریکیوں میں بدل سکتا تھا۔ نجم الدین ایوب نے مراسلہ پڑھنے کے بعد قاصد کو روانہ کر دیا مگر تھکا ماندہ ذہن ایک الجھی ہوئی صورت حال کو صحیح طرح سمجھ نہیں پا رہا تھا۔



نورالدین پریشانی کے عالم میں تونائی خان کے دروازے پر دستک دینے کے بعد کھڑا اس کی آمد کا منتظر تھا۔ اس کے چہرے پر گہری بے چینی تھی۔ تونائی خان سے اس کی گذشتہ ملاقات محض چند بار ہی ہو پائی تھی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ تونائی خان کی سوچ مسلمانوں کے بارے میں حقیرانہ اور منفی تھی۔ نورالدین چونکہ تبلیغ اسلام کا مقصد لے کر سرائے آیا تھا اس لئے تونائی خان کو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ وہ تونائی خان کا ہمسایہ تو ضرور تھا مگر ان دونوں کے درمیان حق ہمسائیگی کی نوبت کبھی نہیں آ پائی۔ آج بیٹے کی جدائی نے نورالدین کے قدموں کا رُخ تونائی خان کے گھر کی جانب موڑ دیا تھا۔ تونائی خان اپنا لباس درست کرتا ہوا دروازے پر آیا۔ اس کی نگاہ جونہی نورالدین پر پڑی تو اس کا منہ بن گیا۔

"کہو عرب...... نورالدین......! ادھر کا رستہ کیسے بھول گئے......؟" تونائی خان کے لہجے میں بے اعتنائی کے ساتھ ساتھ گہرا طنز بھی تھا۔ اس کی بات سن کر نورالدین کے چہرے پر پھیکی سی ہنسی پھیل گئی۔

"تونائی خان! جب ساتھ میں رہنا پڑے تو بندے کو ایک دوسرے سے کام نکل ہی آتے ہیں، میں ایک اچھے ہمسائے کے پاس آیا ہوں، کیا تم حق ہمسائیگی نبھانے پر آمادہ ہو"۔

"چھوڑو! میری اور تمہاری کیا ہمسائیگی؟ تم اپنا مطلب بیان کرو!...... کیا چاہتے ہو؟"

"بات کچھ یوں ہے کہ مجھے آج معلوم ہوا ہے کہ میرے بیٹے مطیع الدین کو کسی منگول قبیلے نے سرائے کے باہر سے اغوا کر لیا ہے، تمہاری تو سرکاری دربار تک اچھی خاصی رسائی ہے، کیا تم میری کچھ مدد کر سکتے ہو"۔

نورالدین کے لبوں پر بیٹے کا نام جونہی آیا اس کی آواز رندھ سی گئی۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو......؟ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ سرائے کے کسی باشندے کو باہر کا کوئی قبیلہ اغوا کرے۔ بے شک وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔ سرزمین اردوئے زریں کے کچھ اپنے قواعد و قانون ہیں جن پر سختی سے عمل درآمد کیا جاتا ہے"۔

تونائی خان اس کی بات پر یوں حیرت زدہ رہ گیا کہ جیسے اس نے کوئی مافوق الفطرت بات کہہ ڈالی ہو۔ اس کا لہجہ بے حد غیر یقینی تھا۔

"یہ اطلاع جس شخص نے مجھے دی ہے، میں اس کی صداقت پر آنکھیں بند کر کے یقین کرتا ہوں۔ تونائی خان......! میری بوڑھی آنکھوں میں سچائی پرکھنے کی قوت ابھی باقی ہے۔ میں لفظوں اور مکالموں کی گہرائی میں اتر جایا کرتا ہوں"۔

"مجھے تمہاری خوبیوں سے کوئی سروکار نہیں، مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تمہیں کس نے اطلاع دی ہے کہ تمہارا بیٹا اغوا کیا گیا ہے...... ہو سکتا ہے کہ اس نے خود ہی کسی ذاتی رنجش پر اسے قتل کر ڈالا ہو اور تمہیں اغوا کی فرضی کہانی سنا کر حقیقت کا رُخ بدل رہا ہو"۔ تونائی خان بے اختیاری سے بولا۔

"تونائی خان! تم صرف یہ وضاحت کر دو کہ کیا تم مجھے دربار شاہی تک پہنچا سکتے ہو یا نہیں"۔ نورالدین اس کی بے اعتمادی پر تڑپ کر رہ گیا۔

"نورالدین!" تونائی خان اس کی آنکھوں میں جھلکنے والی یاسیت اور رنجیدگی کو محسوس کر چکا تھا۔ اس بار

وہ قدرے ہمدردانہ لہجے میں گویا ہوا۔ ''اندر آؤ اور سکون سے بیٹھ کر مجھے سب تفصیل سے بتاؤ کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا......؟''

تونائی خان دروازے کے پہلو میں ہٹ گیا۔ نورالدین بوجھل قدموں سے چلتا ہوا اندر داخل ہوا، اگلی ساعت میں وہ دونوں ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچ گئے۔ وہاں نہایت قیمتی ساز و سامان سے زیبائش کی گئی تھی۔ نورالدین کی نگاہیں جونہی اس آرائش پر پڑیں تو دل پر چوٹ لگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایک طرف تو بیٹے کی جدائی کا غم تھا تو دوسری جانب وہ زیبائش تھی۔ اس کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ وہ سامان اپنی الگ ہی کہانی سنا رہا تھا۔ وہ ماضی میں شاید کسی اعلیٰ ذوق کے حامل مسلمان رئیس کے گھر کی زینت رہ چکا ہوگا۔ یقیناً یہ سامان منگولی حملوں اور لوٹ مار میں بطور مالِ غنیمت اس کے ہاتھ لگا ہوگا۔

''بیٹھو نورالدین!'' اس کی سماعت سے ایک آواز ٹکرائی۔ نورالدین نے قریب ہی موجود ایک نشست سنبھال لی۔ تونائی خان نے دروازے میں کھڑے ہو کر کسی کو قہوہ لانے کی ہدایت کی۔ پھر وہ اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اس کی سوالیہ نگاہیں مسلسل نورالدین کے چہرے پر مرتکز تھیں۔ نورالدین نے اسے اپنی جانب متوجہ دیکھ کر اپنی بات کا آغاز کیا۔

''ہوا کچھ اس طرح کہ چند ماہ پیشتر ایک منگول نوجوان میرے بیٹے مطیع الدین کا دوست بن گیا۔ وہ بلا تکلف گھر میں آنا جانا شروع ہو گیا۔ میں نے جب اُسے دیکھا تو اس کے چہرے پر چھائی ہوئی معصومیت نے میرا دل بھی موہ لیا۔ میں نے اُسے اپنے گھر میں آنے جانے کی اجازت دے دی۔ کچھ دنوں بعد وہ میرے بیٹے کے ہمراہ شکار کے لئے نکل گیا۔ وہ دونوں ایک دو روز بعد واپس آ جایا کرتے تھے۔ میں مطمئن تھا کہ اس طرح میرا بیٹا آنے والے دنوں میں اس ریاست میں خود کو اجنبی محسوس نہیں کرے گا''۔

تونائی خان اس کی بات پر پہلو بدل کر رہ گیا تھا۔ وہ مسلمانوں کو اپنی سرزمین سے باہر نکالنے کا خواہشمند تھا مگر نورالدین مستقبل میں بھی یہیں بسنے کی بات کر رہا تھا۔ نورالدین اس کے چہرے کی کیفیت سے بے خبر بولے جا رہا تھا۔

''مگر گذشتہ دنوں قریباً ایک ہفتہ قبل وہ دونوں سرکیشی پہاڑی پر شکار کے لئے روانہ ہوئے حالانکہ مجھے آگاہ نہیں کیا گیا تھا کہ وہ سرکیشی پہاڑی پر جائیں گے۔ مجھے ایک دو دن تک تو کوئی فکر نہیں ہوئی مگر جب چار پانچ روز بیت گئے تو میں پریشان ہو گیا۔ میں نے تمہارے گھر پر دستک دی تو معلوم ہوا کہ تم کہیں باہر گئے ہو۔ لہٰذا میں نے کوتوالی میں جا کر اس کی گمشدگی کی اطلاع دی، انہوں نے مجھے کچھ دن تک انتظار کرنے کا کہہ کر ٹال دیا۔ میں بے حد پریشان ہوں کہ وہ مجھے بتائے بناء اتنے دنوں کے لیے کہیں نہیں جایا کرتا تو پھر اس نے اس مرتبہ کیا کیا ہے؟ آج صبح اس کا دوست واپس لوٹ آیا۔ اس کا چہرہ کافی پریشان اور ستا ہوا دکھائی دیا تو میں گھبرا گیا۔ اس نے بات کو گھما پھرا کر کرنے کے بجائے صاف لفظوں میں کہا کہ آپ کے بیٹے کو سرخ نامی قبیلے کے لوگ اغوا کر کے لے گئے ہیں، بہرحال آپ فکر نہ کیجئے، میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ اسے کوئی گزند نہ پہنچ سکے۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ میں چند ہی دنوں میں اسے صحیح سلامت واپس لے آؤں گا۔ اس کی بات پر جہاں مجھے پریشانی ہونے لگی، وہیں اس کے لہجے میں موجود مضبوط عزم نے میرے اعتماد اور بھروسہ کو بھی کسی حد تک بندھا دیا مگر اس کے جانے کے بعد مجھے خیال آیا کہ وہ بھلا تنہا کیا کر سکتا ہے.....؟ مجھے خود بھی اس بارے میں کوئی عملی قدم اُٹھانا چاہئے۔ اسی لئے میں نے تمہارے پاس آنے کا سوچا۔ پھر رُک گیا کہ تم تو سرائے میں موجود نہیں۔ میرے غلام نے مجھے آگاہ کیا کہ اس نے تمہیں رات کو دیکھا ہے۔ میں فوری طور پر چلا آیا ہوں کہ کیا تم مجھے دربارِ شاہی تک پہنچا سکتے ہو''۔

تونائی خان محویت سے اس کی باتیں سننے میں مگن تھا، اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کب اس کی جواں سالہ بیٹی گل وتوژ قہوہ کی طشت لے کر وہاں آ پہنچی۔ جب اس نے اپنی چوڑیاں دھیرے سے کھنکھنائیں تو وہ چونک پڑا۔ تونائی خان نے اس کی جانب ایک نظر ڈالی اور اسے لوٹ جانے کا کہا۔ وہ خاموشی سے واپس لوٹ گئی۔ اس نے نورالدین کی کافی باتیں سن لی تھیں۔

''مطیع الدین سرخ قبیلے کی قید میں ہے!''

اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے اس کے سینے میں نشتر اتار دیا ہو۔ اس کے معصوم دل پر ضرب سی لگی تھی۔ تونائی خان اپنی بیٹی کے چہرے پر اتار چڑھاؤ کو دیکھ نہیں پایا۔ گل وتوژ آنسوؤں کو دبائے دروازے کے اوٹ میں کھڑی رہی، شاید وہ اپنے محبوب کے بارے میں ابھی مزید سننا چاہتی تھی۔

''تمہیں پورا یقین ہے کہ تمہارے بیٹے کے اس دوست نے سرخ قبیلے ہی کا نام لیا تھا.....!'' تونائی خان نے قہوہ پیالی میں انڈیلتے ہوئے پوچھا۔ اس کے لہجے میں گہری تشویش موجود تھی۔

''ہاں......! اس نے سرخ قبیلہ کا نام لیا تھا''۔ نورالدین یقین کے ساتھ بولا۔

''تم شاید نہیں جانتے کہ سرخ قبیلہ میں میرا سسرال ہے اور میں رات جلب گائی سے ہی واپس لوٹا ہوں، جو کہ سرخ قبیلہ کی مرکزی بستی ہے''۔

''پھر تو تمہیں یقیناً میرے بیٹے کی بابت میں کچھ نہ کچھ تو معلوم ہوا ہوگا......!'' نورالدین کے چہرے پر بے چینی پھیل گئی۔

''ہونہہ.....!'' تونائی خان نے قہوہ کی چسکی لیتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا۔ ''میں یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا مگر وہاں کچھ گڑبڑ موجود ہے...... میں اس بارے میں آج ہی باتو خان سے ملنے جاؤں گا''۔

''تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو......؟ کھل کر صاف صاف الفاظ میں کہو''۔ نورالدین پریشانی کے عالم میں پہلو بدلتے ہوئے بولا۔

''دیکھو کچھ باتیں ایسی ہیں، جنہیں تم سمجھ نہیں سکتے۔ اگر میرا شبہ صحیح ہے تو یقیناً تمہارے بیٹے کی جان واقعی خطرے میں ہے۔ بہرحال میں اسے بچانے کی پوری کوشش کروں گا...... تم خود پر قابو رکھو اور حوصلہ کا دامن مت چھوڑو''۔

''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا......!''

''اس کی ضرورت نہیں......!'' تونائی خان کو اس کی یہ بات ناگوار گذری تھی۔ نورالدین اپنی جگہ پر پہلو بدلنے لگا۔

''ہاں ایک بات تو میں تم سے پوچھنا ہی بھول گیا، تمہارے بیٹے کے دوست کا کیا نام ہے؟ جس نے تمہیں اطلاع دی تھی''۔

''اس کا نام برقائی خان ہے''۔ نورالدین نے ڈھیلے سے انداز میں بتایا۔

''کک......کیا؟'' تونائی خان کو جیسے برقی رو کا جھٹکا لگا تھا۔ ''وہ سفید فام، قدرے دراز قد، جس کے چہرے پر ہر وقت معصومیت سی چھائی رہتی ہے''۔

''ہاں......ہاں! کیا تم اُسے جانتے ہو؟''

''میں تو اسے جانتا ہوں مگر کیا تم جانتے ہو کہ وہ کون ہے؟'' تونائی خان تیزی سے بولا۔

''شریف النفس منگول نوجوان ہے البتہ اُس میں منگولوں والی خصوصیات نمایاں نہیں ہیں۔ اس کا چہرہ

سچائی کا علمبردار دکھائی دیتا ہے''۔نورالدین سادہ لہجے میں اسے بتا رہا تھا جب کہ تو نائی خان حیرت بھری نگاہوں سے اس کی صورت دیکھے جا رہا تھا۔

''واقعی تمہیں اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔نورالدین......!وہ اس سلطنت کا حکمران ہے،وہ باتو خان کا چھوٹا بھائی ہے۔اگر وہ تمہیں کہہ گیا ہے کہ تمہارے بیٹے کو ساتھ لے آئے گا تو پھر تمہیں اطمینان سے گھر لوٹ جانا چاہئے''۔

اب حیرت کی باری نورالدین کی تھی۔وہ اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے واقعی اس نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔تو نائی خان نے اس مرتبہ خود اُٹھ کر اس کا کندھا تھپتھپایا اور حوصلہ افزائی کی۔اس کا انداز ہی بدل گیا تھا۔نورالدین فرطِ حیرت میں ڈوبا اپنے اللہ پر بھروسہ کئے گھر لوٹ آیا۔



ابوخویلد نے نجم الدین ایوب کا کندھا جھنجھوڑ کر اسے بیدار کیا۔نجم الدین ایوب آنکھیں مسلتا ہوا بستر پر اُٹھ بیٹھا۔وہ حیرت سے ابوخویلد کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔آج سے پہلے تو اس نے کبھی ایسی حرکت نہیں کی تھی۔بے شک وہ اس کا سب سے بااعتماد اور وفادار غلام تھا مگر ایسی بے تکلفی کا مرتکب ہونا بھی اس کی سرشت میں نہیں تھا۔ابوخویلد کے چہرے پر گہری پریشانی عیاں تھی۔

''کیا بات ہے ابوخویلد..... ؟''

''آقا! میرے منہ میں خاک،معاملہ ہی کچھ ایسا آن پڑا کہ مجھے اس گستاخی کا مرتکب ہونا پڑا''۔ابوخویلد کا لہجہ عاجزانہ تھا۔

''ہاں بولو......کیا ہوا؟''

''اسمٰعیل ایوبی نے دیگر امراء کے ساتھ مل کر بغاوت کا علم بلند کر دیا ہے،ابھی ابھی مخبر نے اطلاع دی ہے کہ وہ دمشق سے نکل کر قریبی شہروں پر حملہ آور ہونے اور انہیں لوٹ مار کا نشانہ بنانے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں''۔

''ٹھیک ہے۔تم فوراً میری روانگی کا انتظام کرو،میں خود وہاں پہنچ کر ان کو دیکھ لوں گا''۔

نجم الدین ایوب بستر میں سے نکلتا ہوا بولا۔علی الصبح ایک بری خبر سننے کے بعد بھی اس کا چہرہ پریشانی کے تاثر سے پاک تھا۔اس نے اس خبر کو یوں سنا تھا جیسے کوئی بڑی بات رونما نہیں ہوئی تھی،ابوخویلد حکم پاتے ہی تیزی سے باہر نکل گیا۔نجم الدین ایوب اپنے منتخب کردہ گورنر اسمٰعیل ایوبی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اسے یہ مذموم حرکت کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔اس نے وسوسوں کو جھٹکا اور نہانے کے لئے حمام میں گھس گیا۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ملک الکامل نے اپنی زندگی میں شام،فلسطین اور مصر کے تمام علاقوں کو فتح کر لیا تھا۔اس کی زندگی میں ہی بیت المقدس اور فلسطین کے کچھ علاقے فریڈرک ثانی کو دے دیئے گئے تھے۔جن میں بیت المقدس،بیت اللحم،ناصرہ اور یافا کے علاقے شامل تھے،عکہ کے ذیلی شہر بھی اس کے حوالے کر دیئے گئے تھے۔اس تمام صورتحال کا بنیادی مقصد صرف ملک الکامل کی وسیع و عریض حکومت کو مضبوط تر بنانا تھا۔جب اس کی وفات کا وقت آن پہنچا تو اس نے اپنی سلطنت کو چار حصوں میں بانٹ دیا۔مصر اپنے نوعمر بیٹے سیف الدین ابوبکر کو دے دیا،بلاد شرقیہ نجم الدین ایوب کو دے دیئے گئے جبکہ شام اور اس سے ملحقہ علاقے ملک الجواد کو دیئے گئے۔ان چاروں حکومتوں کو ایک دوسرے سے اس طرح مربوط کیا گیا تھا کہ ان میں کسی قسم کا اختلاف پیدا نہ ہو سکے۔یہی وجہ تھی،نجم الدین ایوب کو بلاد شرقیہ کی حکمرانی کے ساتھ ساتھ نوعمر سلطان کا اتالیق بھی مقرر کیا گیا تھا۔نجم الدین

ایوب نے اسمٰعیل ایوبی کو دمشق میں اپنا گورنر بنا رکھا تھا۔بصریٰ،واسط،اور نابلس کے علاقوں میں اس کا ایک نہایت وفادار ترک غلام حکمرانی کے فرائض سنبھالے ہوئے تھا۔اسمٰعیل ایوبی کی بغاوت بے حد پریشان کن تھی کیونکہ اس طرح سلطنت کے دیگر حصوں میں بھی پھوٹ پڑ سکتی تھی اور صلیبیوں کو مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کا سنہرا موقع مل سکتا تھا۔اُسی دن عجلت میں تیاری مکمل کی گئی اور نجم الدین ایوب اپنے غلاموں کی کثیر جماعت کے ساتھ دمشق روانہ ہو گیا۔ابھی وہ راستے میں ہی تھا کہ اسے دوسری اطلاع ملی کہ شاہ روم کیقباد بن کیخسرو بن قلیج ارسلان نے اپنی افواج کے ساتھ دمشق پر حملہ کر دیا ہے،اسمٰعیل ایوبی کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے اور دمشق پر قبضہ کر لیا گیا ہے۔رومی افواج دمشق میں لوٹ مار کر رہی ہیں اور اسے تاخت و تاراج کرنے میں مشغول ہیں۔

نجم الدین ایوب نے اپنے بھائی ملک الجواد کے ساتھ نابلس میں ملاقات کی اور اس سے مدد مانگی۔دونوں نے مل کر رومی لشکر پر حملہ کر دیا۔دمشق شہر سے باہر گھمسان کا رن پڑا۔رومی لشکر کا دایاں بازو حملے کے ساتھ مالِ غنیمت کی نگرانی پر مامور تھا۔نجم الدین ایوب نے اپنے دستوں کے ہمراہ اسی جانب سے حملوں کی شدت بڑھائی۔اس کے ترک،گرجستانی اور افریقی غلام بھی اس کے شانہ بشانہ لڑ رہے تھے۔بیبرس کا کسی عملی جنگ میں حصہ لینے کا پہلا موقع ملا تھا۔یہ اس کا پہلا عسکری تجربہ تھا۔بیبرس نے اپنی زندگی کی پہلی جنگ ایک بڑے حریف رومی لشکر کے ساتھ لڑی تھی۔رومیوں کے شانہ بشانہ صلیبی نائٹ بھی تھے۔بیبرس نے اپنے مخصوص ترک اور منگولیانہ حکمت عملی سے رومی افواج کو پریشان کر دیا تھا۔نجم الدین ایوب نے بیبرس کی لڑائی کا انداز بغور دیکھا۔کئی بار اس کے لبوں سے بے اختیار تحسین و آفرین آمیز کلمات نکل جاتے۔تمام دن حق و باطل کا یہ معرکہ جاری رہا۔کچھ صلیبی دستے رومی افواج کے ساتھ تو ضرور تھے مگر انہوں نے براہ راست جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا۔یہ ملک الکامل سے کئے گئے معاہدے کا اثر تھا یا وہ پہلے ہی تاڑ گئے تھے کہ یہاں ان کی دال نہیں گل پائے گی۔

شام ہونے سے پہلے ہی جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔رومی لشکر مالِ غنیمت چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ملک الجواد اور نجم الدین ایوب نے کافی دور تک ان کا تعاقب کیا۔دونوں صاحبان فتح و نصرت سے ہمکنار مغرب کے وقت دمشق میں داخل ہوئے۔دمشق میں حالات کو دوبارہ قابو میں لایا گیا۔جب امن و امان کی فضا قائم ہو گئی تو نجم الدین ایوب کو مصر واپسی کا خیال آیا۔یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ وہ مصری لشکر کو ساتھ نہیں لایا تھا۔اس کا خیال تھا کہ اسمٰعیل ایوبی اور باغیوں کو وہ غلاموں کی فوج سے ہی سنبھال لے گا۔رومی لشکر کے حملہ آور ہونے کا تو اسے دور دور تک شائبہ نہیں تھا۔نجم الدین ایوب نے مصر واپسی کا ارادہ ترک کر دیا اور بلاد شرقیہ کی قیادت خود سنبھالنے کا فیصلہ کیا۔یہ مشورہ اسے ملک الجواد نے ہی دیا تھا۔اس نے دمشق کو ذیلی صوبہ بناتے ہوئے بصریٰ کو اپنا مرکز بنایا۔وہ اپنے غلمان،اتباع اور امراء کے ہمراہ بصریٰ چلا آیا۔

یہیں اس نے اپنی زندگی میں پہلا دربار سجایا۔اس دربار میں بیبرس کو امراء کے ساتھ بٹھایا گیا اور اعلیٰ عہدہ کی ذمہ داری سونپی گئی۔بیبرس کے علاوہ دوسرے غلمان کو بھی حکومتی اختیارات دیئے گئے۔یہ اسلامی تاریخ میں طویل عرصہ کے بعد پہلا موقع تھا کہ غلمان کی اتنی بڑی تعداد کو امورِ سلطنت میں شامل کیا گیا تھا۔



مصر کے دارالحکومت قاہرہ میں شاہی محل کے ایک مخصوص کمرے میں کچھ افراد موجود تھے۔وہ سب ایک اہم مسئلہ پر صلاح مشورے میں مشغول تھے۔یہ مجلس شاہی مراتب سے قطع نظر منعقد کی گئی تھی۔اس مجلس کا امیر بلادِ مصر کا نوعمر سلطان سیف الدین ابوبکر ملک العادل ثانی تھا۔اس کے ہمراہ قاہرہ کے چاپلوس اور دور اندیش امراء کی ایک جماعت اور خاص محافظ وفادار غلام تھے۔امراء میں جمال الدین الراحی اور غازی عبداللہ شافعی

بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔

''سلطان محترم......!'' غازی عبداللہ شافعی اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''آپ کے بھائی نجم الدین ایوب نے رومی افواج کو شکست سے ہمکنار کر کے بلادشرقیہ پر اپنی گرفت دوبارہ مستحکم کر لی ہے اور یہ امر آپ کی حکمرانی کے لئے کسی خطرے سے کم نہیں ہے۔ قاہرہ میں تو وہ آپ کے خلاف محض چند لالچی امراء پر ہی تکیہ کئے ہوئے تھا مگر بلادشرقیہ کے مکمل استحکام کے بعد اب اس کے پاس ایک بڑا لشکر بھی موجود ہے۔ وہ فرصت پاتے ہی کسی بھی وقت مصر کا رُخ کر سکتا ہے۔ آپ کو قبل از وقت اپنی حفاظت کے بارے کامل توجہ دینا چاہئے۔ خصوصاً ان امراء کو گرفتار کرتے ہوئے زندان خانے میں ڈال دینا چاہئے جو کہ اس سے تعاون کر رہے ہیں اگر فوری یہ قدم نہ اُٹھایا گیا تو آپ کو بیرونی خطرے کے ساتھ ساتھ اندرونی سازش کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔ اس بارے میں ذرا بھی تامل سے کام نہیں لینا چاہئے''۔

''سلطانِ مکرم......!'' جمال الدین الراحی اس کی بات مکمل ہوتے ہی تیزی سے بولا۔ ''میں نے آپ کو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ نجم الدین ایوب کے ارادے نیک نہیں ہیں، وہ آپ کی کم عمری کا فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے۔ اس کا بنیادی مقصد محض اقتدار کا حصول ہے، رشتے ناطے اس کی نگاہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ ویسے امور سلطنت میں کوئی کسی کا بھائی یا بیٹا نہیں ہوا کرتا۔ آپ کو فوراً کوئی عملی قدم اُٹھانا چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جائے''۔

''ابن مقسقر......!'' سیف الدین ابوبکر نے اپنے دانا اور وفادار غلام کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟''

''آقا!'' وہ مؤدب انداز میں گویا ہوا۔ ''آپ کا اقبال بلند ہو۔ امراء مصر کی موجودگی میں بھلا میری کیا رائے ہو سکتی ہے۔ بہرحال میری ناقص رائے میں نجم الدین ایوب کو کسی ایسی دشواری میں مبتلا کر دینا مناسب ہو گا جس میں اُلجھ کر وہ بلادمصر کا رُخ کرنا بھول جائے''۔

''امیر الحاجب......! تمہارا کیا مشورہ ہے؟''

''میں آپ کے غلام سے کامل متفق ہوں، یہی واحد اور محفوظ راستہ ہے کہ نجم الدین ایوب کو دوسرے امور میں اُلجھا دیا جائے، لیکن یہ سلسلہ کڑی در کڑی جاری رہنا چاہئے تا کہ اسے اپنی فکر پڑ جائے اور وہ انہی مشکلات میں اُلجھ جائے۔ اس طرح آپ کی حیثیت بھی پردہ میں رہ جائے گی اور اسے ذرا بھر شک نہیں ہو گا کہ یہ سب آپ کا کیا دھرا ہے''۔

''غازی......! تم کیا کہتے ہو؟''

''سلطان محترم!'' غازی عبداللہ شافعی تفکر آمیز لہجے میں بولا۔ ''یہ تجویز بری نہیں ہے مگر یہ سب اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ نجم الدین ایوب کوئی بچہ نہیں ہے کہ اسے معلوم نہ ہو سکے کہ حالات کا یہ کھیل کس کا رچایا ہوا ہے؟ اور اسے جان بوجھ کر کسی جال میں پھنسایا جا رہا ہے۔ میرے خیال میں شاہ روم کو دوبارہ جنگ کی ترغیب دی جائے اور مصری افواج کے مکمل تعاون کی یقین دہانی کرائی جائے۔ اس طرح آپ کو دو فائدے حاصل ہوں گے، ایک تو شاہ روم سے آپ کے دوستانہ تعلقات کی نوعیت مزید مستحکم ہو جائے گی، جن کی بناء پر وہ بلادمصر پر حملہ آور ہونے کی کوشش نہیں کرے گا اور دوسرا گذشتہ دنوں دمشق کے معرکے میں نجم الدین ایوب کے ہاتھوں اُٹھائی گئی ہزیمت کو بھی تسکین ملے گی۔ ممکن ہے کہ اس جنگ میں نجم الدین ایوب مارا جائے، ورنہ دوسری صورت میں اسے گرفتار کر کے قیدی بنا لیا جائے گا اور آپ کے مستقبل پر موجود ایک بڑا خطرہ ہمیشہ کے لئے دم توڑ دے

گا''۔

''تمہاری بات میں دم ہے......!'' سلطان ابوبکر سر دھنتے ہوئے بولا۔ ''مگر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ شاہِ روم بلادشرقیہ پر قبضہ کرنے کے بعد بلادمصر کا رُخ کبھی نہیں کریں گے بلکہ اگر وہ بلادشرقیہ پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گئے تو وہ اردگرد کی تمام ریاستوں کو بھی ہڑپ کرنے کی کوشش کریں گے۔ کیا تم ماضی کی مثالیں بھول گئے ہو؟ نصاریٰ ہمیشہ وعدہ خلافی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ میں کم از کم شاہِ رُوم پر کسی قیمت پر بھروسہ نہیں کر سکتا، کوئی اور حل تم لوگوں کے ذہن میں ہو......تو وہ بیان کرو''۔

''سلطان محترم!'' عقبی جانب پہلو میں بیٹھا امیر دھیمے لہجے میں بولا۔ تمام لوگوں کی نگاہیں اس پر مرتکز ہو گئیں۔ وہ امیر تمام گفتگو میں بالکل خاموش رہا تھا۔ ''آپ اگر اپنے چچا عمادالدین سے مدد حاصل کریں تو وہ سب سے زیادہ مناسب ہو گا''۔

''کھل کر بتاؤ......تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''سلطان محترم! میری ناقص رائے یہ ہے کہ آپ اپنے چچا عمادالدین اسماعیل کو ایک مراسلہ بھیجیں جس میں نجم الدین ایوب کی سابقہ سازشوں اور کارستانیوں کا حال تفصیل سے موجود ہو۔ ان سے گذارش کی جائے کہ وہ نجم الدین ایوب کے علاقوں پر حملہ کر کے قابض ہو جائیں اور اسے گرفتار کر کے زندان خانے میں ڈال دیں، ہمیں بلادشرقیہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، عمادالدین اسماعیل آپ کے حقیقی چچا ہیں، ان سے یقیناً آپ کو کسی قسم کا خطرہ نہیں ہو گا۔ جہاں تک میری معلومات ہیں، انہی بلادشرقیہ سے خاصی رغبت ہے، وہ بلادمصر کا رُخ کرنا خلاف طبیعت سمجھیں گے''۔

''بہت خوب......!'' سلطان سیف الدین ابوبکر اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے بے اختیار جھوم سا گیا۔ ''تمہاری رائے سب سے زیادہ معقول ہے۔ میں ابھی چچا عمادالدین اسماعیل کو ایک مراسلہ جاری کرنے کا انتظام کرتا ہوں''۔

سلطان سیف الدین ابوبکر اس تجویز سے خاصا متاثر دکھائی دے رہا تھا۔ سلطان کے مزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے دوسرے خوشامدی امراء نے بھی بھرپور چاپلوسی کا مظاہرہ کیا اور اس آخری فیصلے پر زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ نوعمر سلطان نے اسی وقت کاتب کو طلب کیا اور ان امراء کے باہمی صلاح مشورے سے شاہی مراسلہ چچا عمادالدین اسماعیل کے نام لکھوایا۔ جس میں نجم الدین ایوب پر محل سلطانی کے خلاف سازش کرنے کے علاوہ کئی دوسرے کڑے الزامات عائد کئے گئے تھے۔ اسے حصولِ اقتدار کا حریص کہا گیا۔ اسی شام وہ مراسلہ عمادالدین اسماعیل کی جانب روانہ کر دیا گیا۔



اردوئے زریں کے دارالحکومت سرائے سے ایک گھڑ سوار تیزی سے نکلتا ہوا شرق کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ سیاہ لباس میں ملبوس تھا اور اس نے اپنا چہرہ سیاہ نقاب سے چھپا رکھا تھا۔ اس کی تیز رفتاری سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اپنی منزل پر پہنچنے میں جلدی تھی۔ نصف دن کے مسلسل اور تھکا دینے والی مسافت طے کرنے کے بعد وہ ایک بستی کے پاس جا پہنچا جو کہ قرناقہ کے نام سے مشہور تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا جہاں منگولوں کا خاص قبیلہ ازقائی آباد تھا۔ یہ قبیلہ منگولوں میں ممتاز حیثیت کا حامل تھا۔ حب الوطنی کے علاوہ جو چیز ان میں عام پائی جاتی تھی، وہ انسانی اقدار کا احترام تھا۔ چنگیز خان کے لشکر میں رہتے ہوئے بھی ان لوگوں نے قتل و غارت اور تاخت و تاراجی سے ممکنہ طور پر گریز کیا تھا۔ اُجڑے ہوئے شہروں کو آباد کرنے اور لوگوں میں خوف و ہراس کو ختم

کرنے میں ان کا کردار بڑا نمایاں رہا تھا۔

گھڑ سوار تیزی سے ان کی بستی میں داخل ہوا اور سیدھا وسطی حصے میں جا پہنچا۔ کئی لوگوں نے مڑ کر اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالی اور پھر اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ شاید اس طرح کے لوگوں کی آمد ان کے لئے کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ گھڑ سوار ایک بڑے پختہ مکان کے سامنے جا ٹھہرا۔ پختہ مکانات تو اس بستی میں چند ہی تھے۔ زیادہ تر لوگ خیموں میں رہتے تھے۔ یہ پختہ مکان ان کے سردار مانجی خان کا تھا۔ مکان کے باہر کھڑے محافظ نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی لگام تھامی۔ دوسرے ہی لمحے گھڑ سوار جھٹکے سے زمین پر اتر آیا۔ اس نے گردن کو جنبش دی تو وہ محافظ گھوڑے کو لے کر ایک طرف چل پڑا۔ گھڑ سوار نے لمحہ بھر کے لئے اس پر نگاہ ڈالی، اس کے بعد اس کے قدم مکان کے صدر دروازے کی جانب اُٹھ گئے۔ کچھ ہی لمحوں بعد وہ سردار مانجی خان کے روبرو موجود تھا۔ مانجی خان اجنبی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تشویش کے ساتھ ساتھ کئی سوال منڈلا رہے تھے۔

گھڑ سوار نے اپنے چہرے سے جونہی ڈھاٹا ہٹایا تو مانجی خان اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گیا۔ وہ بے حد خوبصورت منگول دوشیزہ تھی۔

''تم کون ہو اور کیا چاہتی ہو؟'' مانجی خان شاید ابھی تک کچھ بھی سمجھ نہیں پایا تھا۔

''سردار مانجی خان......!'' اس کے نرم و نازک لب ہلے۔ ''میں تم سے جاودانی آسمان کے نام پر مدد طلب کرنے آئی ہوں، میں کون ہوں؟ یہ تمہارے لئے اہم نہیں ہے، بس یہ سمجھ لو کہ میں مصائب کی ماری ہوں''۔

''بھلا میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''میرے باپ نے ایک مسلمان خاندان کو امان دے رکھی تھی، اس طرح وہ ہمارے معزز مہمان تھے۔ ہمیں منگولیانہ روایات کے مطابق ان کی مکمل حفاظت کرنا تھی۔ اس مسلمان خاندان کے سربراہ کا ایک طاقتور قبیلے سے جھگڑا ہو گیا جس پر وہ اسے قتل کرنے پر تل گیا۔ اتفاق سے اس قبیلے کا ایک فرد مسلمان کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ یہ ان کے غصے کو بھڑکانے کے لئے کافی تھا۔ انہوں نے سب باتوں کو پس پشت رکھتے ہوئے اس خاندان پر حملہ کر دیا، ان لوگوں کے تحفظ کی خاطر میرا باپ اور بھائی دونوں خونی میدان میں اتر آئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس قبیلے نے اُس مسلمان خاندان کے بزرگ لوگوں کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا۔ عورتوں کی پامالی کی گئی اور میرے باپ اور بھائی کو ان کی مدد کرنے کے جرم میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا''۔ وہ پری پیکر بولتے بولتے رُک گئی تھی، دبی دبی سی سسکیاں اس کے لگیں، اس کی آنکھوں میں شبنم کے موتی جگمگانے لگے۔

''میں سب سمجھ گیا ہوں، تم بالکل فکر نہ کرو۔ میں تمہاری ہر طرح سے مدد کرنے کو تیار ہوں، تم یہ واضح کرو کہ تم اب کیا چاہتی ہو؟''

''میں اس لئے آپ کے پاس آئی ہوں کہ اس مسلمان خاندان کا ایک نوجوان ابھی تک ان لوگوں کے قبضے میں ہے اور مجھے پتہ چلا ہے کہ اسے چند دنوں میں قتل کر دیا جائے گا۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ میرے باپ نے جس خاندان کو امان دی تھی کم از کم اس کا آخری چشم و چراغ زندہ بچ جائے''۔ وہ اپنے پلو سے آنسو صاف کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

''میں اپنے تئیں پوری کوشش کروں گا کہ اسے زندہ بچا لوں مگر ابھی تک تم نے ان لوگوں کی بابت کچھ نہیں بتایا جنہوں نے یہ ظلم ڈھایا ہے''۔

''وہ سرخ قبیلے کے لوگ تھے، میں نہیں جانتی کہ ان کا تعلق کس طبقہ سے تھا''۔

''سرخ قبیلہ......!'' مانجی خان حقارت سے بولا۔ ''منگولوں میں سے اگر یہ قبیلہ مٹ جائے تو خون کی ندیاں بہنا ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں، ......خون کے پیاسے.. ...وحشی درندے''۔ اس کے لہجے میں اُن کے لئے گہری نفرت موجود تھی۔

''دیکھو میں خون خرابہ پسند نہیں کرتا مگر ایک اچھے انسان کی بے حد قدر کرتا ہوں، میں انسانی ہمدردی کے جذبے کے تحت اس نوجوان کو ہر قیمت پر بچاؤں گا۔ تم بے فکر ہو کر یہاں رہو، میں آج ہی اُس کی مدد کے لئے روانگی کا بندوبست کرتا ہوں اور ہاں! تم یقیناً ازقائی قبیلے کی روایات تو جانتی ہو گی، ہم بلا معاوضہ کسی کی مدد نہیں کرتے''۔

''سردار مانجی! میں جانتی ہوں اسی لئے تمہارے پاس آئی ہوں، یہ رہا تمہارا معاوضہ......!'' اس نے پہلو میں بندھی ہوئی چھوٹی سی تھیلی اس کی جانب بڑھائی۔ سردار مانجی خان نے تیزی سے وہ تھیلی تھامی اور اپنے ہاتھ پر اُلٹ دی۔ اس میں بڑی مقدار میں سونے کے سکے موجود تھے۔ سردار مانجی نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا اور گویا ہوا۔

''ازقائی روایات کے مطابق تمہیں یہاں پناہ مل سکتی ہے، اگر تم چاہو تو یہیں مستقل طور پر مقیم ہو سکتی ہو''۔

''میں یہاں نہیں رہ سکوں گی، میرے گھر میں دو چھوٹی بہنیں اور ماں تنہا ہے اور مجھے اندھیرا ہونے سے پہلے ان کے پاس واپس لوٹنا ہے۔ آپ بس اتنی مہربانی کر دیجئے کہ اس نوجوان کو رہائی دلا کر آزاد کر دیجئے، وہ خود ہی میرے پاس چلا آئے گا''۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''جیسی تمہاری مرضی! اگر تم چاہو تو اپنے کنبے کے ہمراہ مستقل طور پر یہیں آ سکتی ہو''۔

''اس امر کا فیصلہ میں وقت آنے پر کروں گی کہ کیا کرنا چاہئے؟ پہلے آپ اس نوجوان کے بارے میں کچھ کیجئے، یہ نہ ہو کہ وہ بھی بے گناہ مارا جائے۔ میں آپ کی اس مدد کے لئے ہمیشہ مشکور رہوں گی۔ میرے باپ اور بھائی کی ارواح آپ پر سلامتی بھیجیں گی''۔

''مانجی خان اگر کوئی وعدہ کر لے تو اس پر ہر قیمت پر پورا اُترتا ہے، چاہے اس میں اس کی اپنی جان بھی کیوں نہ چلی جائے۔ تم بے فکر ہو کر اپنے گھر جاؤ، جلد ہی وہ نوجوان اپنے قدموں پر چل کر تمہارے پاس پہنچ جائے گا''۔ مانجی خان فرط جذبات میں سرشار دکھائی دے رہا تھا۔

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی، اس نے اپنے لبادے کو درست کیا اور چہرے کو دوبارہ نقاب میں چھپا لیا۔ اس نے روانگی کی اجازت طلب کی تو مانجی خان چونک کر بولا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟ میں اس نوجوان کو کیا بتاؤں گا؟ کہ تمہاری اس آزادی کی سفارش کس ماہ پیکر نے کی تھی؟''

''اس سے صرف اتنا کہہ دیجئے گا کہ جو کچھ گل سے ہو سکا اس نے کر دیا''۔

مانجی خان ہونقوں کی طرح دیدے پھاڑے کھڑا رہا۔ وہ تیزی سے باہر کی جانب لپکی اور دیکھتے ہی دیکھتے بستی سے دور ہوتی چلی گئی۔ وہ گل دقوزتھی۔ قونائی خان کی بیٹی اور مطیع الدین پر جان نثار کرنے والی محبوبہ۔ اس کے ذہن میں یہ انوکھی ترکیب آئی تھی۔ اس نے بظاہر جھوٹ سے کام لیا تھا مگر اس کا جھوٹ ہی مطیع الدین کی زندگی بچا سکتا تھا۔ مانجی خان براہ راست حملے کرنے کے بجائے چوری چھپے واردات کرنے کا عادی تھا۔ اسے اپنے طریقوں پر بے حد ناز تھا کہ وہ انسانی زندگی کو بچانے کے لئے انوکھے انداز میں کام کرتا ہے۔ گل دقوز کی بھی یہی خواہش تھی کہ کسی بھی انسانی جان کے ضیاع کے بغیر ہی مطیع الدین اپنے گھر لوٹ آئے۔ سرخ قبیلہ اس کی سوتیلی

ماں کا میکہ بھی تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ لوگ مسلمانوں سے بے حد نفرت کرتے ہیں اور انہیں قتل کرنے میں ذرا بھر تساہل سے کام نہیں لیتے۔ اس کے ذہن دماغ نے اسے اُکسایا اور وہ اپنے گھر سے دور تن تنہا یہاں تک پہنچ گئی تھی۔



بصریٰ میں رہتے ہوئے دمشق کی گلیاں ہیرس کو یاد آ رہی تھی۔ اسے بلاد شرقیہ میں آئے ہوئے چھ ماہ بیت چکے تھے مگر وہ دیگر کاموں میں اتنا مصروف رہا کہ اسے اپنی خبر تک نہ رہی۔ آج فرصت کی گھڑیاں جو میسر آئیں تو اس کے دل و دماغ پر ہیجان سا طاری ہو گیا۔ ماں جیسی مشفق خاتون فاطمہ کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا۔ دمشق یہاں سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ اس کے دل میں دمشق جانے کی خواہش مچلنے لگی۔ وہ اتنا بااختیار ہو چکا تھا کہ کسی کو کچھ بتائے بغیر دمشق روانہ ہو جاتا مگر اس کی طبیعت میں نافرمانی اور سرکشی نہیں تھی۔ اس کے دل نے بغیر اطلاع کے کہیں جانا گوارہ نہیں کیا۔ وہ سیدھا نجم الدین ایوب کی خدمت میں پہنچا۔ نجم الدین ایوب اس وقت اپنے محل کی بالائی منزل پر موجود تھا۔ وہ کسی کام میں مصروف تھا کہ ہیرس کی صورت دیکھ کر سنبھل گیا۔

''آقا!'' ہیرس لفظوں کو ترتیب دینے لگا۔ ''میں دو ایک دن کے لئے دمشق جانا چاہتا ہوں آپ کی رضامندی مطلوب ہے''۔

''دمشق....؟'' نجم الدین ایوب اس کی اچانک اور غیر متوقع فرمائش پر چونک پڑا۔ ''وہاں کس کام کی حاجت آن پڑی ہے؟''

''میں اپنی ماں سے ملنا چاہتا ہوں......!'' ہیرس نگاہیں جھکا کر بولا۔ وہ فاطمہ کے ذکر پر مغموم سا ہو گیا۔ نجم الدین ایوب اس کے جواب پر ششدر رہ گیا۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

''مگر تم نے تو بتایا تھا کہ تمہارا کوئی رشتہ دار زندہ ہے یا نہیں، اس بارے میں تم بالکل لاعلم ہو؟''

''یہ حقیقت ہے کہ میں اپنے کسی سگے کے بارے میں وثوق سے کچھ کہہ نہیں سکتا مگر ایک ہستی ایسی ہے جس کو میں اپنی ماں سمجھتا ہوں، اس کی شفقت اور صلہ رحمی میں مجھے میری ماں کی جھلک دکھائی دیتی ہے''۔

''ٹھیک ہے تم دو دن میں واپس لوٹ آنا''۔

نجم الدین ایوب نے لاپروائی سے جواب دیا شاید اسے اس بات کی کوئی پرواہ ہی نہیں تھی کہ ہیرس واپس لوٹے گا یا نہیں۔

''میں آپ کا بے حد شکر گذار ہوں......!''

ہیرس کے چہرے پر سرخی سی پھیل گئی۔ وہ وہاں سے تیز قدموں سے نکلا اور محل میں اپنے خاص کمرے میں پہنچا، وہاں سے ضروری سامان لے کر وہ سیدھا بصریٰ کے بازار گیا۔ اس نے ابومسعود کے لئے ایک عمدہ لباس خریدا اور اپنی ماں جیسی مالکہ کے لئے کچھ اشیاء لیں۔ وہ سفید رنگ کے اعلیٰ النسل گھوڑے پر سوار دمشق کی جانب نکل کھڑا ہوا۔ یہ گھوڑا اس نے شاہ روم کے لشکریوں سے چھینا تھا۔ نجم الدین ایوب نے اس کی شجاعت اور بہادری کے عوض یہ گھوڑا اُسے ہی بخش دیا تھا۔ وہ اپنے گھوڑے پر ہواؤں سے باتیں کرتا ہوا دمشق کی جانب بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ فرط جذبات سے معمور تھا۔ وہ فاطمہ خاتون کو اپنی اس منزل کی بابت آگاہ کرنے جا رہا تھا جس کے لئے اس نے اسے خود سے جدا کیا تھا۔ ایک پہر کی مسلسل مسافت کے بعد وہ دمشق کے بازاروں میں داخل ہوا۔ دمشق کی گلیوں میں چلتے ہوئے اس کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ یہ جانے کیسے جذبات تھے؟ جو اسے مغلوب

کئے جا رہے تھے۔ اس کا گھوڑا بالآخر منزل پر پہنچ ہی گیا۔ ابومسعود کے گھر کا دروازہ اس کے بالکل سامنے تھا۔ وہ ہمت بندھا کر گھوڑے سے اترا اور فاطمہ خاتون کے سامنے پیش ہونے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس نے گھوڑے کی باگیں ہاتھ میں پکڑیں اور دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ دروازے کے پہلو میں گڑھے کھونٹے سے اس نے اپنا گھوڑا باندھا اور دروازے پر کانپتے ہاتھوں سے دستک دی۔ کافی دیر گذر گئی مگر کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ اس نے توقف کرتے ہوئے دوبارہ دستک دی مگر جواب ندارد۔ ہیرس پریشان سا ہو گیا۔ اس نے دروازے کو ہلا جلا کر دیکھا۔ دروازہ اندر ہی سے بند تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی نہ کوئی تو اندر موجود ہے، مگر وہ دروازہ کھولنے میں اتنی دیر کیوں کر رہا تھا؟ کئی سوال اس کے ذہن میں اُلجھنے لگے۔ اس مرتبہ اس نے قدرے زور سے دستک دی۔ لمحہ بھر کے توقف کے بعد کسی کے شکستہ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ہیرس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں یقیناً فاطمہ خاتون ہی ہو گی اس نے سوچا۔

آہستگی سے کنڈا کھلنے کی آواز سنائی دی، دوسرے ہی لمحے دروازے کا پٹ کھل گیا جو چہرہ ہیرس کو دروازے کی اوٹ میں دکھائی دیا وہ فاطمہ کا ہرگز نہیں تھا...... وہ تو ابومسعود تھا۔ اس کی سابقہ مالکہ کا شوہر...... مگر اس کی حالت اتنی شکستہ تھی کہ ہیرس اسے دیکھ کر ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ ابومسعود چہرے سے ہی بیمار دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بمشکل پپوٹے اُٹھا کر بوجھل نگاہوں سے ہیرس کی جانب دیکھا۔ وہ شاید اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہیرس اس کی حالت دیکھ کر تڑپ سا گیا۔

''بابا! یہ آپ نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟ ماں کہاں ہے......؟'' ہیرس بے اختیار بولتا چلا گیا۔ اس کی سانسیں متزلزل تھیں۔

''کک..کون...... ہیرس!'' وہ نحیف سی آواز میں بولا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا ناتواں جسم لڑکھڑانے لگا۔ ہیرس نے ہوشمندی کا مظاہرہ کیا اور تیزی سے آگے بڑھ کر اُسے زمین پر گرنے سے بچا لیا۔ وہ بے ہوشی کے عالم میں ہیرس کی باہوں میں جھول رہا تھا۔ ہیرس نے اسے اپنے کندھے پر اُٹھایا اور سامان صحن میں ایک جانب پھینکتا ہوا اندرونی کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے کمرے میں موجود میلے سے بستر پر اسے نرمی سے لٹایا۔ اس کی نگاہیں اطراف میں فاطمہ خاتون کو ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ تیزی سے صحن میں پڑے مٹکے کی جانب بڑھا اور پیالہ میں پانی بھرنے لگا۔ تھوڑی دیر کی کاوش کے بعد وہ ابومسعود کو کچھ دیر کے لئے ہوش میں لانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ ابومسعود تیز بخار میں بھن رہا تھا۔ ہیرس نے اسے ہوش میں دیکھ کر طبیب کو لانے کا اشارہ کیا اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔



دو سائے رات کی تاریکی میں ایک خیمے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ یہ ایک خاصی بڑی بستی تھی جس میں خیموں کی لمبی چوڑی قطاریں موجود تھی۔ کئی خیموں کے دروازوں پر نصب بانسوں پر مشعلیں روشن تھیں۔ بستی پر نیم تاریکی سی چھائی ہوئی تھی۔ بستی کے وسط میں ایک بڑے اصطبل میں موجود گھوڑے بندھے اونگھ رہے تھے۔ سرد موسم میں بستی کے لوگ خیموں کے اندر دبکے پڑے نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ بستی میں چونکہ واردات یا چوری چکاری کی نوبت کبھی نہیں آتی تھی، اس لئے وہاں کوئی چوکیدار یا محافظ مقرر نہیں کیا گیا تھا۔ دونوں سایوں نے آپس میں کوئی مخصوص اشارہ کیا اور وہ ایک خیمے کی جانب تیزی سے بڑھ گئے۔ یہ خیمہ دوسرے خیموں سے قدرے مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ کپڑے کے علاوہ اس کے چاروں جانب لوہے کی موٹی موٹی زنجیریں لپٹی گئی تھیں۔ شاید یہاں کوئی اہم چیز موجود تھی جس کی حفاظت کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ ایک سائے نے اپنے کندھے

سے تھیلا اُتارا اور اس میں سے ایک بڑی قینچی نکالی۔ یہ خاص قسم کی قینچی تھی جس سے تلواروں کو ڈھالنے سے پہلے ٹکڑوں میں تبدیل کیا جاتا تھا۔ عموماً ایسی قینچیاں لوہاروں یا شمشیر گروں کے پاس ہوا کرتی تھی۔ دوسرا سایہ قینچی دیکھ کر اپنے ارد گرد پیش کا جائزہ لینے لگا۔ ہر جانب خاموشی کا راج پا کر اُس نے سر اثبات میں ہلایا۔ پہلے سائے نے تیزی سے قینچی زنجیر پر رکھی اور اس کے اوپر موٹا سا کپڑا لپیٹ دیا اور زور لگانے لگا۔ وہ بے حد محتاط دکھائی دے رہا تھا۔ کٹاک کی مدھم سی آواز آئی اور زنجیر کٹ کر دو ٹکڑے ہوگئی۔ آواز بے حد دھیمی تھی، یہ اس کی مہارت کا کمال تھا کہ اس نے قینچی سے لوہا کاٹا اور آواز کو دبا ڈالا۔

''خبردار رہنا، کوئی آواز سنو تو مجھے گھٹنا لگا دینا''۔ پہلے سائے کی دھیمی آواز ابھری۔

''ہاں...... ہاں! تم اپنا کام تیزی سے مکمل کرو، مجھے سب اندازہ ہے''۔ دوسرے نے ناگواری سے جواب دیا۔

چند ہی ساعتوں میں اس نے بھاری بھرکم زنجیروں کا جال کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ دونوں محتاط انداز سے زنجیروں کو اطراف میں کھسکا رہے تھے کہ کسی قسم کا شور پیدا نہ ہو۔ اس کام سے فراغت کے بعد ایک سائے نے خیمے کے اندر جھانکا۔ وہاں مکمل اندھیرا تھا۔ اس نے ہاتھوں سے ٹوہ لگائی۔ اسے وہاں لکڑی کے تابوت جیسی کوئی چیز محسوس ہوئی۔ اس نے اس کے چاروں جانب چھوا۔ وہ خیمے کی زمین کے برابر کا بڑا ڈبہ تھا جس میں ایک جانب سے خلا تھا، اس نے جھک کر خلا میں جھانکا۔ اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ اس نے اپنے ساتھی سے اس بابت بات کی تو وہ کوئی جواب نہیں دے پایا۔

''تم نے پوری چھان بین تو کرلی تھی کہ یہی خیمہ ہے......؟ پہلے سائے نے مڑ کر اس سے پوچھا۔

''یہ پوچھنے کا بھلا کوئی وقت ہے؟ چلو جلدی کرو وہ یقیناً اسی تابوت کے اندر ہوگا، اسے جلدی سے باہر نکالو''۔ دوسرا سایہ چڑ کر بولا۔

''تم باہر کا خیال رکھنا، میں ذرا اچھی طرح اندر دیکھ لوں''۔ پہلے سائے نے تحمل سے جواب دیا اور وہ تابوت کے اندر رینگتا ہوا داخل ہوگیا۔ تابوت کے فرش پر سیلن زدہ قالین موجود تھا، جس میں سے ناگواری بو اُٹھ رہی تھی۔ اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے اپنا ناک سکوڑا۔ وہ تابوت کی زمین پر تیزی سے ہاتھ چلا رہا تھا۔ جیسے وہاں اس کے لئے کچھ پڑا ہو۔ اچانک وہ چونک پڑا۔ اس کا ہاتھ کسی گٹھڑی سے جا ٹکرایا۔ اس نے پھرتی سے اس گٹھڑی کو ٹٹولنا شروع کردیا۔ دوسرے ہی لمحے گٹھڑی میں کچھ حرکت ہوئی اور موٹے کمبل میں لپٹی ہوئی وہ چیز اُٹھ بیٹھی۔

''کک......کون......کون ہے......؟''

ایک کانپتی ہوئی تیز آواز فضا میں گونجی۔

''ششش...... ششش تم مسلمان ہو......نا!''

''ہاں! مگر تم کون ہو......؟'' آواز اب قدرے سنبھلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''دوست! بس اب جلدی سے باہر نکلو''۔

''مگر میرے پاؤں میں تو بیڑیاں ہیں''۔

''کوئی بات نہیں! تم ذرا کھسک کر دروازے کی جانب بڑھو، میں ان کا انتظام کئے دیتا ہوں''۔

''میں کوشش کرتا ہوں''۔

پہلا سایہ تابوت سے باہر نکل کر تیزی سے خیمے کے دروازے کی جانب بڑھا اس نے گردن باہر نکالی تو

دوسرے نے پوچھا۔

''کیا رہا......؟''

''وہ اندر ہی ہے مگر پاؤں میں بیڑیاں ہیں''۔ اس نے سرگوشی میں بتایا۔

''دیر مت کرو جلدی انہیں کاٹو''۔ وہ غرایا۔

''وہی تو کرنے جارہا ہوں''۔ اس نے منہ بسور کر جواب دیا اور بڑی قینچی ہاتھ میں پکڑ کر واپس اندر لوٹ گیا۔ تابوت میں موجود قیدی کافی حد تک باہر نکل آیا تھا اور خیمے کے دروازے کے قریب پہنچ گیا تھا۔

''کافی ہمت والے لگتے ہو......!''

اس کی بات سن کر قیدی بے بسی میں مسکرایا۔ نو وارد نے بڑی مہارت سے اس کی بیڑیاں کاٹ دیں اور اسے قریباً گھسیٹتا ہوا خیمے سے باہر لے آیا۔ دوسرے نے جب قیدی کو باہر نکلتے دیکھا تو وہ بے تابی سے اپنے گرد کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے لمحہ بھر میں چاروں اطراف کو اپنی باریک بین نگاہ سے کھنگال ڈالا اور قیدی کو کھینچ کر خیمے سے مکمل طور پر باہر نکال لیا۔ دوسرے لمحے اُس کا ساتھی بھی باہر نکل آیا۔

''اسے کندھے پر اُٹھانا پڑے گا یہ چلنے کے قابل نہیں ہے''۔ پہلے نے سرگوشی کی۔

''کندھے پر اُٹھانا مناسب نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اسے یونہی گھسیٹتے ہوئے بستی سے باہر لے چلیں، وہاں گھوڑے پر ڈال دیں گے''۔

''نڈھال ویسے ہی ہے، زخمی ہوجائے گا''۔

''آزادی کے لئے اتنی قیمت کو چکانا ہی پڑے گی''۔ دوسرے نے کندھے اُچکائے۔

''تم دونوں فضول بحث میں مت پڑو۔ میں گھسٹ کر بھی چلنے کو تیار ہوں''۔ قیدی نے نحیف لہجے میں کہا۔

''چلو مزید دیر کرنا خطرے کا باعث ہوگا''۔

ان دونوں نے قیدی کے بازوؤں کو دبوچا اور قریباً اسے گھسیٹتے ہوئے لے کر چلنے لگے۔ وہ دبے قدموں خود بھی بلی کی مانند جھکے جھکے چل رہے تھے۔ ان کی حتیٰ الامکان کوشش یہی تھی کہ کہیں وہ روشنی کی زد میں نہ آجائیں۔ وہ تاریکی میں ہوتے ہوئے بستی سے باہر نکل آئے۔ بستی سے کچھ ہی دور اُن کے تین گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے قیدی کے بازو چھوڑ دیے۔ قیدی اب اپنے بازو دبانے لگا۔

''جھک جھک کر چلنے سے تو میری کمر میں درد ہونے لگی ہے''۔ ایک گہرا سانس لے کر بولا۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم اس وقت دشمن کے علاقے میں موجود ہیں، روشنی پھیلنے سے پہلے پہلے ہمیں یہاں سے کافی دور نکل جانا چاہئے''۔ دوسرے ساتھی نے آگاہ کیا۔

''تم ہر وقت غصہ ناک پر کیوں رکھتے ہو؟''

''بس کام کے دوران تم میرے ساتھ سنجیدہ رہنے کی کوشش کیا کرو''۔

''تمہارے پاس پانی تو ہوگا......!'' وہ قیدی نقاہت زدہ لہجے میں بولا۔

''پانی یہاں نہیں ملے گا، دوسرا تم نے گھوڑے کی پشت پر لیٹے ہوئے سفر کرنا ہے، بہتر یہی ہوگا کہ تم ابھی پانی نہ پیو''۔

قیدی نے آہستگی سے سر ہلایا پھر ان دونوں نے مل کر اسے گھوڑے کی پشت پر ڈالا اور اس کے ہاتھ اور پاؤں گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھ دیے تاکہ وہ راہ میں گر نہ پڑے۔ دونوں نے کچھ دیر خاموش رہ کر ارد گرد

کا جائزہ لیا اور پھر اپنے اپنے گھوڑے سنبھالے اور اپنی منزل کی جانب بڑھ گئے۔



برقائی خان ایک بڑے فوجی دستے کے ہمراہ جلب گالی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر فکر و تردد، غصے اور انتقام کے ملے جلے جذبات رقصاں تھے۔ وہ جلد از جلد جلب گالی پہنچ جانا چاہتا تھا جہاں اس کا عزیز دوست مطیع الدین اسیر تھا۔ وہ سرکیشی پہاڑی سے سیدھا اپنے بھائی باتو خان کے پاس پہنچا تھا۔ اس نے سرخوں کی کارستانی جب اس کے گوش گذار کی تو باتو خان فقط مسکرا کر رہ گیا۔ برقائی خان عجیب نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس نے باتو خان سے اپنی بے عزتی اور ناقدری کا شکوہ کیا تو وہ بڑے اطمینان سے بولا۔

''برقائی! امور سلطنت میں ایسی چھوٹی موٹی باتیں تو رونما ہوتی ہی رہتی ہیں۔ بس ٹھنڈے دماغ سے کام لو اور جذباتیت سے جس قدر ہو سکے دامن بچائے رکھو۔ امن کے ساتھ رہنا اور سب امور کو اپنی گرفت میں رکھنا ہی اصلی مردانگی ہے، اگر تم کبھی اردوئے زریں یا کسی علاقے کے حکمران بنے تو ایسی باتوں سے تمہیں روز پالا پڑے گا۔ ان سے آدمی کا کچھ نہیں بگڑتا۔ بس انسان میں ذرا سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہونی چاہئے جب کسی پر مصیبت نازل ہوتی ہے تو اپنے ساتھ دیگر کئی مسائل بھی لاتی ہے۔ ایسے مسائل جنہیں حل کرنا بسا اوقات دشوار ہو جاتا ہے۔ تم مطیع الدین کی فکر میں گھلنا چھوڑ دو اور جاؤ دوسرے امور نبٹاؤ۔ جب موقع آئے گا تو یہ معاملہ بھی دیکھ لیا جائے گا''۔

برقائی خان اپنے بھائی باتو خان کی دلیل سے متفق نہیں ہوا۔ اس نے بھرپور انداز میں اصرار کیا کہ اگر مطیع الدین کے لئے سرکاری سطح پر کچھ نہ کیا گیا تو وہ ذاتی طور پر قدم اٹھانے سے گریز نہیں کرے گا۔ باتو خان نے جب اسے بضد دیکھا تو سو سپاہیوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا دستہ اس کے ساتھ روانہ کرتے ہوئے اسے سرخوں پر چڑھائی کی اجازت دے دی۔ کاکیشیا اور اردوئے زریں کو باہم متحد رکھنا اور ان کی حفاظت کی ذمہ داری باتو خان کے سر پر تھی۔ باتو خان کے اس فعل سے سرخوں کے حلیف قبائل میں ناراضگی اور غصے کی لہر دوڑ سکتی تھی۔ باتو خان برقائی کی ضد کے سامنے مجبور ہو گیا تھا۔ اسی شام جب قوتائی خان نے سردار دقباژائی کے بارے میں یہ اطلاع دی کہ وہ عبادت خونِ گیس کا آغاز کرنے پر تلا ہوا ہے، اور اسے منگولیانہ ریاست کے نافذ قانون سے کوئی سروکار نہیں تو باتو خان کو برقائی کے عقب میں مزید دستے روانہ کرنا پڑے۔ وہ بخوبی سمجھ گیا کہ مطیع الدین پر حملہ اور اسے سنہرے خیمے سے اغوا کرنا ایک روایتی چال ہے جس کے تحت سردار دقباژائی خان اپنی بغاوت کے مقصد کو ہوا دینا چاہتا ہے۔ وہ اپنے بھائی کو کسی صورت میں شکست زدہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اب چونکہ حالات کی نوعیت بدل چکی تھی۔ پہلے وہ اس معاملے کو مسلمانوں سے نفرت کا محرک سمجھا تھا مگر صورتحال کی جدید وضاحت سے اس کی دوربین نگاہوں نے کھرے کھرے تمام تجزیہ کر لیا تھا۔ اس نے سرخوں کے حلیف قبائل کے سرداروں کو بھی سرائے میں طلب کر لیا تھا تا کہ ان کی جانب سے بھی ردعمل سامنے آ سکے۔

برقائی خان کی آمد کی اطلاع سرخ قبیلے تک پہلے پہنچ گئی تھی۔ انہوں نے اپنی بستی کے خیموں کے چاروں جانب کانٹوں کی گھنی باڑ لگا دی تھی۔

سردار دقباژائی خان نے برقائی خان کو مات دینے کے لئے کئی اقدامات کئے تھے۔ سہ پہر ہونے سے پہلے ہی برقائی خان اپنے دستے سمیت وہاں پہنچ گیا۔ کانٹوں کی باڑ دیکھ کر اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے اپنے دستے کو حکم دیا کہ وہ تمام بستی کو چاروں جانب سے گھیر لیں۔ آن کی آن میں بستی کا محاصرہ کر لیا گیا۔ ابھی برقائی خان اپنی مختصر سپاہ کو عسکری ہدایات دے رہا تھا کہ باتو خان کے بھیجے ہوئے مزید دستے بھی

وہاں پہنچ گئے۔ وہ بے حد تیز رفتاری سے سفر کرتے ہوئے آئے تھے۔ برقائی خان نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ان دستوں کے ہمراہ ایک منجھا ہوا سپہ سالار بھی بھیجا گیا تھا۔ اس نے آتے ہی برقائی خان کو مختصراً حالات بتائے اور سردار دقباژائی کی ہر قیمت پر ہلاکت یا گرفتاری کا مراسلہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بستی کے لوگ سرکاری لشکر کے اجتماع کو دیکھ کر پریشان ہونے لگے۔ سردار دقباژائی خان نے نوجوانوں اور لڑکوں کو مختلف مورچوں میں فائز کر دیا تھا۔ اس نے برقائی خان کی آمد کی اطلاع پاتے ہی ایک جوشیلی تقریر کرتے ہوئے اس لڑائی کو منگولیانہ تہذیب کے بقاء کی جنگ قرار دیا تھا اور سب لوگوں کو ذہنی طور پر تیار کیا کہ وہ اس لڑائی کو ہر قیمت پر جیتیں تا کہ دوسرے قبائل کو یہ احساس ہو کہ ہماری روایات اور تہذیب ہمارے لئے جانوں کے مقابلے میں کتنی اہم ہیں۔ اس کی جذباتی تقریر سے کچھ لوگ تو فرط جوش میں دیوانے ہو رہے تھے مگر نصف کے قریب لوگ اس لڑائی کو سردار دقباژائی کی ذاتی دشمنی کا نتیجہ قرار دے رہے تھے۔ پہل سردار دقباژائی کی جانب سے کی گئی تھی۔ اس نے تیروں کی بارش کی۔ محاصرہ کرنے والی سپاہ ایسے ہتھکنڈوں سے واقف تھی۔ اس نے ڈھالوں کو سامنے رکھتے ہوئے تیروں کی بارش ناکام بنا دی۔ اس کے بعد برقائی خان نے آتشی تیر بستی میں لگائے ہوئے مورچوں پر پھینکوانا شروع کر دیئے۔ دونوں طرف سے رات گئے تک ایسا ہی تبادلہ ہوتا رہا۔ دونوں فریق لڑائی بند کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ آدھی رات کے بعد اچانک بستی کے وسطی حصے میں عجیب سا شور بلند ہوا۔ سرکاری لشکر کے سب لوگ خوفزدہ نگاہوں سے بستی کی جانب دیکھنے لگے۔



نجم الدین ایوب اپنے شاہی محل میں تھا کہ ابو خویلد ایک مخبر کے ہمراہ اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے سلام کیا اور مخبر کی جانب اشارہ کیا۔

''کیا اطلاع لائے ہو......؟'' نجم الدین ایوب نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

''اطلاع بڑی اہم اور نامناسب ہے''۔

''جو کچھ کہنا چاہتے ہو! جلدی سے کہہ ڈالو اور یاد رکھو کہ مجھے تمہید باندھنے والے لوگ بالکل پسند نہیں ہیں''۔ نجم الدین ایوب کا لہجہ بڑا سخت تھا۔ تنبیہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے چہرہ پر کرختگی بھی بڑھ گئی۔

''معافی چاہتا ہوں! اطلاع یہ ہے کہ آپ کے چچا حاکم بعلبک عماد الدین اسماعیل نے اپنے بھتیجے الملک المجاہد اسد الدین شیر کوہ بن ناصر الدین محمد کو پیغام بھیجا ہے کہ وہ اس کے ساتھ الحاق کر لے تا کہ وہ دونوں اپنی اپنی افواج کے ہمراہ دمشق پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیں۔ اس نے یہ بھی پیغام دیا ہے کہ نجم الدین ایوب نے چونکہ دمشق سے نکل کر ایک بڑی تجارتی منڈی کو یوں آزاد چھوڑ رکھا ہے، اس پر قبضہ کرنا مالی منفعت کے لحاظ سے بے حد مفید ہے، دمشق میں چونکہ افواج موجود نہیں ہیں اس لئے اس پر قبضہ کر لینا آسان ہو گا''۔

''کیا یہ خبر مصدقہ ہے....؟'' نجم الدین ایوب نے مخبر کی جانب گھور کر دیکھا۔

''بالکل......! اس بارے میں میں نے ایک اہم سرکردہ شخصیت سے تصدیق کی ہے''۔

''حرص و طمع.... ! جانے کب یہ لعنت امت مسلمہ کا پیچھا چھوڑے گی۔ اپنے پاس جو کچھ بھی ہے، ناشکرے لوگ اس پر صبر و قناعت نہیں کرتے۔ یہ حریص و خسیس دوسروں کے مال و اقتدار چھیننے کی فکر میں کب تک مبتلا رہیں گے۔ اللہ ہی بس ہدایت دینے والا ہے''۔

نجم الدین ایوب کو چچا کی اس حرکت پر گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ اس نے صلاح الدین ایوبی کے بعد سب لوگوں کو آپس میں ہی برسرپیکار دیکھا تھا۔ جس کا داؤ چلتا وہی ہاتھ صاف کر لیتا۔ یہ دوسرا موقعہ تھا کہ بلاد شرقیہ

اس سے چھیننے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس نے اپنی افواج کو فوری تیاری کا حکم دے دیا۔ اس نے اپنے مخبر کو سختی سے تنبیہہ کی کہ وہ ان کی روانگی اور راستے کی مکمل معلومات فراہم کرتا رہے۔ مخبر نے اپنے فرض میں کوئی کوتاہی نہ برتنے کا وعدہ کیا اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔ ابوخویلد نے نجم الدین ایوب کی حوصلہ افزائی کی کوشش کی تو اسے بھی سخت جھاڑ کا سامنا ہوا۔ نجم الدین ایوب اس غیر متوقع اطلاع پر بے حد مغموم اور رنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ ابوخویلد اس کا بگڑا امزاج دیکھ کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔



چار گھنٹے کی مسلسل آرام دہ نیند کے بعد ابومسعود کی آنکھیں کھلیں تو ہیبرس نے شکر کا کلمہ ادا کیا۔ ہیبرس فوری طور پر طبیب کو ساتھ لے آیا تھا جس کے باعث اس کی جان بچ گئی تھی، ورنہ طبیب نے ابومسعود کی اتنی خستہ حالت دیکھ کر مایوسی کا اظہار کیا تھا۔ طبیب اتنی لاپرواہی اور دیر پر بھی برہم ہوا تھا۔ اس کے جانے کے بعد ہیبرس نے ابومسعود کا منہ دُھلایا اور اس کے کپڑے تبدیل کئے۔ طبیب کے دیئے ہوئے معجون کو اس کی ہدایت کے مطابق وقفے وقفے سے اس کے حلق میں اتارتا رہا۔ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں بھی ماتھے پر رکھیں تاکہ بخار کی شدت ٹوٹ سکے۔ یہ ہیبرس کی محنت ولگن کا ثمر تھا کہ ابومسعود ہوش میں آ گیا تھا۔ ابومسعود نے ہیبرس کی جانب مترحم نگاہوں سے دیکھا۔ وہ شاید کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ہیبرس نے اسے منع کر دیا۔ اسی اثناء میں مغرب کی اذان کی صدا بلند ہوئی۔ ہیبرس نے اسے نماز کے بارے بتا کر جامع مسجد کی راہ لی۔ ابومسعود بستر پر پڑے اپنی لاچاری پر آنسو بہاتا رہا۔ ہیبرس نماز سے فارغ ہو کر سیدھا طبیب کے پاس چلا آیا۔ اسے تازہ صورتحال سے آگاہ کیا۔ اس نے کچھ اور اودیہ اسے بنا کر دیں کہ اب ان کا استعمال کیا جائے۔ ہیبرس کھانے پینے کا کچھ سامان لے کر ابومسعود کے گھر چلا آیا۔ ابومسعود ایک بار پھر نیند کی آغوش میں پہنچ چکا تھا۔ ہیبرس نے اس کی نبض ٹٹولی اور اطمینان کرنے کے بعد دوسرے کاموں میں مشغول ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ابومسعود کی کراہ اُس کے کان میں پڑی تو وہ تیزی سے اس کے پاس چلا آیا۔ ابومسعود نے اسے اپنا جسم ٹوٹتا ہوا محسوس ہونے کی بابت بتایا تو وہ اسے نرمی سے دبانے لگا۔ اُسے کچھ سکون ملا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے ہیبرس کو روک دیا۔ ہیبرس نے کھانا نکال کر اسے کھلایا اور خود بھی کھایا۔ بعد میں اسے دوا دی۔ ابومسعود کچھ دیر میں دوبارہ نیند کی وادیوں میں اتر گیا۔ ہیبرس نے اُسی کمرے میں زمین پر اپنا بستر لگایا۔ عشاء کی نماز کی ادائیگی کے بعد وہ پرسکون ہو کر بستر پر لیٹ گیا تھا۔ بظاہر اس کا چہرہ پرسکون تھا مگر دل ودماغ میں سوالات کا جم غفیر تھا۔ وہ بار بار فاطمہ خاتون کے متعلق سوچ رہا تھا کہ وہ کہاں چلی گئی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اب زندہ ہی نہ ہو۔ وہ اپنے خیالوں کو مثبت انداز میں مرتب کرنے کی کوشش کرتا مگر چند ساعتوں میں وسوسے دوبارہ سر اُٹھانے لگتے۔ اسی کشمکش میں جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح فجر کے وقت خود بخود اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں جب اس کی نگاہ ابومسعود پر پڑی۔ وہ شاید اس سے پہلے بیدار ہوا تھا۔ وہ اپنے بستر سے نکلا اور غسل کیا۔ وہ اب ایک بڑے کپڑے سے اپنا بدن خشک کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بشاشت پھیلی ہوئی تھی۔ وہ رات کو جیسا نڈھال اور پژمردہ دکھائی دے رہا تھا اب ڈھونڈے سے بھی ایسے آثار نہیں مل رہے تھے۔ طبیب کی دوا نے اپنا جادو کر دکھایا تھا۔ اس نے ہیبرس کی جانب دیکھا تو محض مسکرا کر رہ گیا۔ دونوں نے جامع مسجد دمشق میں نماز ادا کی۔ اس کے بعد وہ دونوں دمشق کی گلیوں میں ٹہلتے ہوئے دریا کی جانب جا نکلے۔

''میں جانتا ہوں کہ تم کل سے کیا جاننا چاہ رہے ہو؟'' ابومسعود سنجیدگی سے بولا پھر کچھ توقف کے بعد اس نے خود ہی اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''تم یقیناً فاطمہ کے بارے میں جاننا چاہتے ہو، لیکن میں تمہیں کوئی اچھی خبر

نہیں دے سکوں گا۔ دو ماہ پہلے وہ بھی اسی طرح بخار میں مبتلا ہو کر چل بسی، میں ان دنوں دمشق میں نہیں تھا، واپسی پر معلوم ہوا کہ وہ مجھے ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گئی ہے''۔

ابومسعود کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ ہیبرس اس کے الفاظ سن کر سکتے میں چلا گیا تھا۔ وہ صدمے سے نڈھال ہو کر وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ ابومسعود نے اس کے کندھے پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم اُس سے بے حد محبت کرتے ہو، حالانکہ تم ہمارے کچھ بھی نہیں لگتے۔ تمہیں غلام کہنا تمہارے احسن سلوک اور جذبات کی توہین ہوگی۔ وہ بھی تمہیں بے حد چاہتی تھی۔ تم سے جدائی کے بعد اس نے کئی راتیں اپنی آنکھوں میں بتائی تھیں۔ بہر حال یہ سب قدرت کا لکھا تھا، اس کی سانسیں پوری ہو گئیں اور وہ چلی گئی، میری سانسیں ابھی باقی تھیں کہ تم آخری وقت میں چلے آئے اور میری زندگی کا چراغ بجھنے سے پہلے مل گئے۔ ہم نے تم پر جو احسان کیا تھا، تم نے اس کا حق ادا کر دیا۔ میں تم سے بے حد خوش ہوں اور تمہاری ترقی کے لئے ہمیشہ دعا گو رہوں گا۔ کاش وہ آج زندہ ہوتی اور اپنی آنکھوں سے تمہیں دیکھتی، تمہارا لباس، تمہارا یہ انداز اور تمہارے منصب کے بارے میں جان کر اُسے کتنی خوشی ہوتی...... اس کا اندازہ بھی لگانا دشوار ہے''۔ ابومسعود اپنی دھن میں بولے جا رہا تھا۔ ہیبرس اس کی باتیں سننے کے بجائے فاطمہ کے مشفق چہرے کو اپنی تصور کی آنکھ سے دیکھنے میں مشغول تھا۔

اسی شام ہیبرس ابومسعود کے ہمراہ فاطمہ خاتون کی آخری آرامگاہ پر گیا۔ وہاں فاتحہ خوانی کے بعد وہ دونوں واپس گھر لوٹ آئے۔ ابومسعود ابھی مکمل تندرست تو نہیں ہوا تھا البتہ اس کی حالت ایسی تھی کہ وہ اپنے لئے خود بھی کچھ کر سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ اگر اُس دن ہیبرس وقت پر نہ پہنچتا تو اسے فاطمہ کے ساتھ ساتھ ابومسعود کی وفات کی خبر سننا پڑتی۔



برقائی خان نے اپنے سپاہیوں کو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ بستی کے مختلف حصوں میں آگ لگی ہوئی تھی جو کہ آتشی تیروں کی کارستانی تھی۔ کئی خیمے جل کر خاک ہو چکے تھے۔ اب ان میں سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔ بستی کے وسطی حصے میں عجیب سی چیخ دپکار مچی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے دو گروہ آپس میں متصادم ہو گئے ہوں۔ برقائی خان بے حد عجلت کا مظاہرہ کر رہا تھا حالانکہ اس کے سپہ سالار نے مشورہ دیا تھا کہ ابھی لڑائی کو ختم کر دیا جائے، صبح ہونے پر یہ قضیہ نبٹا لیا جائے گا مگر وہ بضد تھا کہ سورج نکلنے سے پہلے ہی سرخوں کو شکست سے ہمکنار کر دیا جائے۔ رات کی تاریکی میں فتح کے امکانات زیادہ واضح تھے۔ کچھ دیر بعد شور قریب آتا ہوا محسوس ہوا۔ برقائی خان نے سپاہ کو خبردار رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے برقائی خان کے سامنے سے بستی کی باڑ اکھڑ کر اطراف میں بکھرنے لگی۔ سپاہیوں نے ڈھالوں کے حصار میں خود کو محفوظ کرتے ہوئے اپنی تلواروں کے دستوں پر گرفت مضبوط کر لی۔ یوں لگتا تھا کہ سرخ قبیلہ کے لوگ مدافعت کے بجائے کھلی جنگ کا ارادہ رکھتے ہیں۔ برقائی خان کو تاریکی میں ایک بڑا غول اپنی جانب بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔ برقائی خان پوری یکسوئی سے ان پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ غول چند لمحوں بعد برقائی خان کے مدمقابل پہنچ کر تھوڑے فاصلے پر رُک گیا۔ ان کے ہاتھوں میں سفید کپڑے لہرا رہے تھے۔

''ہم لڑنا نہیں چاہتے...... !'' ان کی جانب سے ایک آواز بلند ہوئی۔ ''پھر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' برقائی خان نے بلند آواز میں پوچھا۔

''ہم نے منک آنہ کو اپنا سردار بنا لیا اور دقباژائی کو ہلاک کر دیا ہے، سرخ قبیلہ قاآن اعظم کے احکامات کی پیروی کرنے میں ہی فخر سمجھتا ہے۔ ہم خلوص دل سے اطاعت گذار ہیں''۔

''منک آنہ کو آگے پیش کرو''۔ برقائی خان نے تیز آواز میں کہا۔ ایک عمر رسیدہ شخص اس مجمع میں سے نکل کر آگے بڑھا اور اس نے آگے بڑھ کر اپنی تلوار برقائی خان کے قدموں میں رکھ دی۔

''وہ مسلمان قیدی کہاں ہے؟'' برقائی تلخی سے بولا۔ وہ منک آنہ پر بھی اعتماد کرنے کو تیار نہیں تھا۔

''اسے کل رات یہاں سے کوئی بھگا لے گیا ہے''۔ منک آنہ گردن جھکائے بولا۔

''تم جھوٹ بولتے ہو......!'' برقائی خان آپے سے باہر ہونے لگا۔ ''مجھے ہر قیمت پر وہ شخص ابھی اور اسی وقت چاہئے''۔

''لیکن! وہ اب یہاں نہیں ہے، آپ میری بات پر یقین کریں میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں''۔

''کیا تم مجھے بچہ سمجھتے ہو کہ میں تمہاری بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لوں گا۔ مجھے ابھی اور اسی وقت وہ چاہئے، ورنہ میں سرخ قبیلہ کا ہر فرد قتل کر دوں گا''۔ برقائی خان غصے سے بپھرنے لگا۔

''ہماری جانیں آپ کے حضور موجود ہیں، چاہے جتنے سر اتار لیجئے مگر وہ واقعی کل رات فرار ہو گیا ہے یا اُسے اس کا کوئی مددگار یہاں سے لے گیا ہے''۔ منک آنہ بے بسی کے عالم میں بولا۔

برقائی خان اس کے لہجے اور صاف گوئی پر گومگو کا شکار ہونے لگا۔

''ٹھیک ہے، تم اس وقت اپنی بستی میں واپس جاؤ، میں صبح اس بات کا فیصلہ کروں گا کہ تم کتنا سچ بول رہے ہو اور کتنا جھوٹ۔ میری سپاہ تمام رات بیدار رہے گی، اگر تم نے ایسی ویسی کوئی حرکت کی تو یاد رکھنا کہ میں ایسی خوفناک سزا دوں گا کہ دوسرے قبائل عبرت پکڑیں گے''۔ برقائی خان پھنکارتا ہوا بولا۔ وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا واپس لوٹ گیا۔ اس کے تعاقب میں تمام لوگ بھی واپس بستی میں لوٹ گئے۔ ان کے جاتے ہی برقائی خان نے ایک دستے کو حکم دیا کہ وہ فوری طور پر بستی کے گرد لگائی گئی کانٹوں کی تمام باڑ ہٹا دے اور خیمے نصب کر لئے جائیں۔ صبح سورج نکلنے سے قبل ہی وہ لوگ ایسا انتظام کر چکے تھے کہ بستی میں سے کسی شرارت کا منہ توڑ جواب دیا جا سکتا۔ سپہ سالار برقائی خان کی اس حکمت عملی پر بے حد نالاں تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ رات بھر سپاہ کو بیدار رکھنے سے اگر صبح بستی کی جانب سے کوئی حملہ ہوا تو وہ انہیں بے حد مہنگا پڑے گا۔ برقائی خان اس کے نظریے سے متفق نہیں تھا۔ سورج جب خاصا بلند ہو گیا تو منک آنہ خود بستی سے باہر آیا اور اس نے برقائی خان کو ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی۔ برقائی خان کو یہ خدشہ تھا کہ کہیں انہوں نے مطیع الدین کو ہلاک نہ کر دیا ہو اور اب اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لئے فرار کی من گھڑت کہانی سنا رہے ہوں۔ منک آنہ کے لہجے سے سچائی جھلک رہی تھی۔ برقائی خان اس کے اصرار پر پریشان سا ہو گیا۔ مطیع الدین کو فرار ہونے میں کون مدد دے سکتا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ رقبا ژائی خان نے اپنے کسی حلیف کو ایسی حرکت کے لئے اکسایا ہو۔ اس نے موقعہ واردات پر خود جا کر جانچ پڑتال کا فیصلہ کیا۔ وہ محافظ دستے کے ہمراہ بستی میں داخل ہوا۔ بستی کے بیچوں بیچ رقبا ژائی خان کی کٹی پھٹی لاش پڑی تھی۔ برقائی خان پہلی نگاہ میں اسے پہچان گیا تھا۔ برقائی خان نے اس لاش کو روایات کے مطابق جلانے کی ہدایت کی تو کچھ لوگوں نے آگے بڑھ کر اس لاش پر ایک بڑا کپڑا ڈال دیا۔ وہ منک آنہ کی رہنمائی میں اس خیمہ تک آیا جہاں مطیع الدین کو اسیر کیا گیا تھا۔ خیمے کے گرد کٹی پھٹی زنجیروں کے ٹکڑے موجود تھے۔ برقائی خان نے زنجیر کے ایک ٹکڑے کو اُٹھایا اور غور سے دیکھنے لگا۔ کٹا ہوا حصہ خاصا مجروح دکھائی دے رہا تھا۔ یہ کسی بڑی قینچی کا کمال ہی ہو سکتا تھا۔ کاٹنے والے نے بڑی مہارت کا ثبوت دیا تھا کہ اس نے زنجیر کو کٹ لگانے سے پہلے ہی کمزور کر دیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے برقائی خان کے چہرے پر اطمینان سا پھیل گیا۔ اسے منک آنہ کی سچائی پر یقین ہو چکا تھا۔ وہ اس فرد تک پہنچ گیا تھا جو زنجیریں کاٹنے کا ماہر تھا۔ برقائی خان نے سرخ قبیلے سے اطاعت

اختیار کئے رکھنے اور بغاوت سے گریز پر چھوٹا سا خطاب کیا۔ منک آنہ کو باضابطہ طور پر قبیلہ کا سردار مقرر کیا گیا۔ منک آنہ اس کی آمد پر شاندار ضیافت کرنے کا خواہش مند تھا مگر برقائی خان نے اس سے معذرت کرتے ہوئے اپنی سپاہ کو شمال کی جانب کوچ کا حکم دیا۔ سپہ سالار نے چوں چراں کرنا چاہی، جس پر برقائی خان نے اُسے واپس سرائے روانہ کر دیا۔



12 محرم 637ھ میں نجم الدین ایوب کو اطلاع ملی کہ اس کا چچا عماد الدین اسماعیل حاکم بعلبک اپنے بھتیجے الملک المجاہد اسد الدین شیرکوہ حاکم حمص کے ساتھ الحاق کر کے اپنی سپاہ کے ساتھ دمشق کی جانب روانہ ہو گیا ہے۔ اس کی آمد کے راستے کا پتہ چلتے ہی نجم الدین ایوب نے فوری طور پر آگے بڑھ کر جنگ لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنے لشکر کے ساتھ وہ 16 محرم 637ھ کو بصریٰ سے نکلا اور تین دن کی مسافت کے بعد نابلس کے مقام پر پہنچ گیا۔ اس نے اسی مقام کو فیصلہ کن مبارزت کے لئے منتخب کیا۔ اس کے ہمراہ دس ہزار کے قریب افواج تھیں۔ جن میں عمائدین سلطنت اور امراء بھی شامل تھے۔ نجم الدین ایوب اپنے چچا کو منہ توڑ جواب دینے کی حکمت عملی بنا رہا تھا کہ تیسرے دن مخالف لشکر اس کے سامنے پہنچ گیا اور اس نے میدان جنگ میں اپنے خیمے گاڑنا شروع کر دیئے۔

نجم الدین ایوب نے جنگ سے پہلے روایتی سفارت روانہ کی تا کہ لڑائی کے بجائے افہام و تفہیم کی راہ نکالی جا سکے۔ سفارت جب واپس لوٹی تو اس نے نیا انکشاف کیا کہ سامنے خیمہ زن ہونے والا لشکر اس کے چچا عماد الدین اسماعیل یا اسد الدین شیرکوہ کا نہیں بلکہ اس کے عم زاد الملک الناصر داؤد کا ہے جو کہ اس جنگ میں حصہ لینے کے لئے وہاں پہنچا ہے۔ نجم الدین ایوب کو اپنے عم زاد کی اس حرکت نے خاصی تکلیف سے دوچار کیا اور وہ شدید بیمار پڑ گیا۔ الملک الناصر حملہ کرنے سے گریز کر رہا تھا اسے شاید عماد الدین اسماعیل کا انتظار تھا۔

دن گذرتے چلے گئے، یہاں تک کہ پڑاؤ ڈالے ہوئے قریباً ایک ماہ گذر گیا۔ نجم الدین ایوب خود بھی حملہ آور ہونے سے گریز کر رہا تھا، اس کی ایک وجہ بیماری سے پیدا ہونے والی جسمانی کمزوری تھی۔ دوسرا وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے عم زاد بھائی کو قیدی بنائے یا قتل کرے۔

29 صفر 637ھ کو اچانک بیبرس نابلس آ پہنچا۔ وہ نجم الدین ایوب سے اجازت لے کر دمشق گیا ہوا تھا۔ ابو مسعود کی تیمارداری میں اس نے ایک ماہ گذار دیا تھا، جب ابو مسعود مکمل طور پر صحت یاب ہو گیا تو اس نے بصریٰ روانہ ہونے کا قصد کیا مگر نجم الدین ایوب کے بارے میں جب معلوم ہوا کہ وہ نابلس میں خیمہ زن ہے، تو وہ سیدھا وہاں چلا آیا۔ اس نے آتے ہی نجم الدین سے رازداری سے تنہائی میں ملاقات کی۔ اس نے جب یہ انکشاف کیا کہ عماد الدین اسماعیل نے دوسری راہ اختیار کرتے ہوئے دمشق پر قبضہ کر لیا ہے تو نجم الدین ایوب بے حد پریشان ہوا۔ اس کا جاسوسی نظام اس موقعہ پر بری طرح سے ناکام ثابت ہوا تھا۔ عماد الدین اسماعیل نے اسے غلط راہ پر لگا کر بغیر جنگ کئے دمشق پر قبضہ کر لیا تھا۔ نجم الدین ایوب کی جانب سے مقرر کئے گئے دمشق کے گورنر کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ نجم الدین ایوب نے فوری طور پر دمشق روانہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس نے چلنے سے پہلے اپنے با اعتماد اتباع اور عمائدین کے ساتھ نئی صورت حال پر مشورہ کیا اور انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔ وہ سب فوری طور پر دمشق روانہ ہونے پر متفق تھے۔

اسی دوران نجم الدین ایوب کے لشکر کے ایک حریص و کمینہ خصلت امیر احمد رئیس تک عماد الدین اسماعیل کے ایک مخبر کی رسائی ہو گئی۔ اس نے اعلیٰ عہدے اور ہزاروں درہم کی پیشکش کرتے ہوئے اُسے اپنے دام

فریب میں جکڑ لیا۔ اس امیر نے عین اس وقت جب لشکر چلنے کی تیاری کر رہا تھا، دمشق پر قبضے کی اطلاع عام کر دی۔ سپاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ دمشق پر پہلے ہی قبضہ ہو چکا ہے تو ان میں پھوٹ پڑنے لگی۔ امراء نے اپنے دستوں کو سمجھانا چاہا مگر وہ کوئی بات سننے پر تیار نہیں تھے۔ پل بھر میں سب محنت اکارت ہو گئی۔ کثیر جماعت نے کھلے الفاظ میں نجم الدین ایوب کا ساتھ چھوڑنے کا اعلان کر دیا۔ وہ دمشق میں خون کی ہولی نہیں کھیلنا چاہتے تھے۔ دمشق میں ان کے اہل و عیال اور اقارب موجود تھے۔ دمشق میں جنگ کی صورت میں بے شمار لوگوں کی ہلاکت کا امکان تھا۔ نجم الدین ایوب نے انہیں سمجھانے کی بے حد کوشش کی کہ جنگ دمشق کے اندر نہیں بلکہ باہر لڑی جائے گی مگر وہ اپنی ہی ضد پر اڑے رہے۔ انہوں نے امیر احمد رئیس کو اپنا سربراہ مقرر کیا اور عماد الدین اسماعیل کی حمایت میں نعرے بلند کرنا شروع کر دیئے۔ نجم الدین ایوب کی حامی جماعت نے ان سے الجھنا چاہا تو اس نے بڑی مشکل سے انہیں روکا۔ نجم الدین ایوب اس عجیب صورت حال میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ اُسے اب حقیقتاً بلاد شرقیہ کی حکومت اپنے ہاتھوں سے نکلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

30 صفر 637ھ کو اس کی سپاہ کی ایک تہائی سے زیادہ تعداد نے اسے بے یار و مددگار چھوڑتے ہوئے دمشق کا قصد کیا۔ نجم الدین ایوب اپنے خاص غلاموں، محافظوں اور اتباع کی جماعت کے ساتھ میدان جنگ میں تنہا رہ گیا تھا۔ بیبرس کو خصوصی طور پر ہدایت کی گئی تھی کہ وہ کسی محفوظ مقام کی جانب نکلنے کا راستہ ہموار کرے۔ افواج کی بغاوت اور واپسی کی اطلاع الملک الناصر داؤد تک بھی پہنچ گئی۔ اس نے فوری طور پر آگے بڑھ کر نجم الدین ایوب اور اس کی حلیف جماعت کے خیموں کو چاروں طرف سے گھیر لیا تاکہ وہ کسی جانب فرار نہ ہو سکیں۔



ازقائی قبیلے میں مطیع الدین کو آئے ہوئے آج پانچواں دن تھا۔ اسے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ ان لوگوں نے کس مقصد کے تحت اسے سرخ قبیلے کی اسیری سے چھڑایا ہے اور اب ان کے ارادے کیا ہیں؟ وہ ان کے سلوک پر بھی حیران تھا۔ کیونکہ انہوں نے اسے یوں رکھا ہوا تھا جیسے وہ ان کا عزیز ترین مہمان ہو۔ مطیع الدین آزادی سے ان کی بستی میں گھوم پھر سکتا تھا مگر اسے بستی سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ مطیع الدین ایک آدھ دفعہ اس پابندی پر آگ بگولا بھی ہوا تھا۔ انہوں نے باہر کے حالات کو خطرناک قرار دے کر اسے وہیں رُکنے کی تلقین کی۔ مطیع الدین فوری طور پر سرائے پہنچنا چاہتا تھا مگر وقت کے ہاتھوں مجبور تھا۔ وہ لوگ مار دھاڑ کے قائل نہیں تھے پھر بھی مطیع الدین ان سے جان چھڑانے میں ناکام ہو گیا تھا۔ یہاں رہتے ہوئے مطیع الدین کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ یہ لوگ کچھ زیادہ حساس اور ہوشیار ہیں۔ یہ وقت سے پہلے ہی خبردار ہو جاتے ہیں۔ ان کی اس خوبی نے اسے خاصا متحیر بھی کیا تھا۔ برقائی خان کے بعد اگر وہ کسی سے اتنا متاثر ہوا تھا تو وہ ازقائی قبیلہ تھا۔

مطیع الدین نے آج ٹھان لیا تھا کہ وہ سردار مانجی خان سے خود بات کرے گا کہ اسے روانہ ہونے کی اجازت دی جائے۔ اسی لئے وہ اسے ڈھونڈتا ہوا اس کے مکان تک آ پہنچا۔ سردار مانجی خان نے اس پر اچٹتی نگاہ ڈالی اور اپنے کام میں مگن ہو گیا۔

''سردار! میں کچھ کہنا چاہتا ہوں''۔

''میں جانتا ہوں کہ تم یہاں سے جانے کی بات کرو گے مگر میں نے تمہیں پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ تم ابھی یہاں سے نہیں جا سکتے کیونکہ باہر خطرہ ہے۔ سرخ قبیلہ کے لوگ تمہیں کتوں کی مانند ڈھونڈ رہے ہیں اگر تم اپنی زندگی سے اتنے ہی اُکتا چکے ہو تو یہیں کسی سے خنجر لو اور اپنا کام تمام کر لو''۔ بات کرنے کے ساتھ ساتھ وہ سر جھکائے اپنے کام میں بھی مصروف تھا۔

''ہونہہ! پھر یہی بتا دو کہ تم نے مجھے درندہ صفت سرخ قبیلے کے چنگل سے کیوں چھڑایا ہے؟''

''میں اس امر کی وضاحت کی ضرورت نہیں سمجھتا''۔ وہ قدرے ناگواری سے بولا۔

''عجیب بات کر رہے ہو تم!'' مطیع الدین اس کے ردعمل پر تلملا اُٹھا۔

''تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم اپنے خیمے میں جاؤ اور آرام کرو، کھاؤ پیو اور عیش کرو۔ جب وقت آئے گا تو میں خود تمہیں سرائے پہنچاؤں گا''۔ سردار مانجی خان نے نصیحت آمیز لہجے میں کہا۔

''اگر میں تمہاری بات ماننے سے انکار کر دوں......!'' مطیع الدین نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

سردار مانجی خان نے اس کی جانب ایک نظر ڈالی اور استہزائیہ انداز میں مسکرانے لگا۔

''تم ایسا نہیں کر سکو گے کیونکہ تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ تم اس وقت کہاں موجود ہو......؟ اور یہاں سے تنہا نکلنے کی صورت میں میلوں دور تک تمہیں کوئی ایسا فرد نہیں ملے گا جو سرائے تک پہنچنے میں تمہاری رہنمائی کر سکے، تم ہمارے محتاج ہو''۔

''یاد رکھو! مسلمان کسی کا محتاج نہیں ہوتا''۔ مطیع الدین پُرعزم لہجے میں بولا۔

''زیادہ جذباتی ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، ہوش کے ناخن لو، میں تمہارا دشمن نہیں ہوں اور نہ ہی یہاں تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔ وقت کی مصلحت کے تحت یہ قدم اُٹھایا گیا ہے''۔

''میں تمہاری اس منطق سے عاجز ہوں، میں فوری طور پر سرائے واپس لوٹنا چاہتا ہوں اور اب میں اپنا آخری فیصلہ سنا رہا ہوں کہ میں اسی وقت یہ بستی چھوڑ کر جا رہا ہوں، اگر تم نے مجھے روکنا چاہا تو میں ہتھیار اُٹھانے سے گریز نہیں کروں گا''۔

''اگر میں یہ کہوں کہ تمہیں یہاں ٹھہرانے کی ذمہ داری کسی لڑکی نے ہمیں سونپی ہے تو کیا پھر بھی تم یہاں سے جانا چاہو گے؟''

''لڑکی نے......!'' مطیع الدین کو اپنی سماعت پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ ''تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا، بھلا کسی لڑکی کو مجھ غریب سے کیا دلچسپی...... ؟''

''سوچو......! کوئی لڑکی جو تمہاری ہمدرد ہو، تم پر مہربان ہو......!'' مانجی خان دھیمے سے مسکرایا۔ مطیع الدین حقیقتاً پریشان ہو گیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اس کے ذہن میں گل دتوژ کا چہرہ اُبھرا تھا مگر اس نے اس خیال کو رد کر دیا تھا۔ گل دتوژ کا ان لوگوں سے کیا واسطہ......؟ وہ گومگو کی حالت میں کھڑا تھا۔

''تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ کوئی لڑکی تمہارے ذہن میں موجود ضرور ہے''۔ مانجی خان نے شرارتی لہجے میں انگلی نچاتے ہوئے کہا۔

''تم جو بھی اندازہ لگاؤ، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ میں اپنے فیصلے پر اٹل ہوں، کسی لڑکی کا جھانسہ دے کر تم مجھے مزید نہیں روک سکو گے''۔ مطیع الدین نے ہر قسم کے خیال کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے جواب دیا۔ وہ یہاں سے نکلنے کا پختہ عزم کر چکا تھا۔ سردار مانجی خان نے اسے پھر بھی بضد دیکھتے ہوئے آخری تیر اس کی جانب پھینکا۔

''اگر اس لڑکی کا نام گل ہو تو کیا پھر بھی تم یہاں سے جانا چاہو گے؟''

مطیع الدین گل کا نام سنتے ہی دم بخود رہ گیا۔ اس کے دماغ کی تمام نسیں جھنجھنا اُٹھی تھیں۔ واقعی گل دتوژ نے اس کی مدد کی ہے......؟ مگر اس نے یہ سب کیسے کیا ہو گا......؟ کئی سوال اس کے ذہن میں سر اُٹھانے لگے۔



خیمے کے بستر پر پڑے بیماری سے نڈھال نجم الدین ایوب کو جب یہ اطلاع ملی کہ اس کے عم زاد الملک الناصر داؤد بن الملک المعظم نے چاروں جانب سے ان کا محاصرہ کرلیا اور فرار کی تمام راہیں مسدود کر دی ہیں تو اسے خاصی پریشانی کا سامنا ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کسی طرح بصریٰ واپس پہنچ کر حالات کو قابو میں لانے کی کوشش کرے گا مگر حاکم الکرک اس کی راہ میں دیوار بن گیا تھا۔ نجم الدین ایوب نے اپنے حلیفوں اور اتباع کی جماعت سے اس نئی صورتحال کے بارے میں باہم صلاح مشورہ کیا۔ سب بھانت بھانت کی بولیاں بولتے رہے، مگر کوئی واضح صورت دکھائی نہیں دی۔ نجم الدین ایوب نے فہم وفراست سے کام لیتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ زندہ رہنا ہے تو عزت کے ساتھ ہی جیا جائے، اگر مرنا ہی مقدر بن چکا ہے تو پھر کیوں نہ لڑتے ہوئے رُتبہ شہادت حاصل کیا جائے۔ اس نے اپنے غلاموں پر مشتمل محافظ دستے اور باقی ماندہ فوج کو سر دھڑ کی بازی لگانے کا حکم دے دیا۔ بیبرس کو اس محافظ دستے کا امیر مقرر کیا گیا۔ بیبرس کے لئے کسی دستے کی قیادت کرنا بالکل نئی بات تھی، اسے سپاہ کو ساتھ لے کر جنگی حکمت عملی تشکیل دینے کا کوئی خاص تجربہ بھی نہیں تھا۔ وہ کڑے حالات کے شکار آقا کی حکم عدولی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کام میں ابوخویلد نے اس کی کافی مدد کی۔ نئی صورت حال سے نبٹنے کے لئے اس نے خیموں کے چاروں جانب محافظوں کا ایسا جال بچھایا تھا کہ مخالف سپاہ کو نجم الدین ایوب تک پہنچنے سے پہلے کافی نقصان اُٹھانا پڑتا۔ اسی دوران بہاء الدین زہیر نے نجم الدین ایوب کے ساتھ تنہائی میں طویل ملاقات کی۔ یہ شخص نجم الدین ایوب کی جانب سے نابلس کا امیر مقرر کیا گیا تھا اور اپنی سپاہ کے ہمراہ جنگ میں شرکت کے لئے آیا تھا۔ اس نے اپنی تجویز پیش کی کہ الملک الناصر سے ایک بار پھر جنگ بندی اور صلح جوئی کی سفارت کی جائے اور افہام وتفہیم کی کوئی راہ نکالی جائے تاکہ ہماری مٹھی بھر سپاہ کے جان کا بے مقصد ضیاع نہ ہو۔ اس نے اُمید ظاہر کی کہ ممکن ہے کہ ہماری سفارت کامیابی سے ہمکنار ہو۔ نجم الدین ایوب نے اس کی صلاح کو ترجیح دیتے ہوئے بہاء الدین زہیر کو ہی اپنا سفیر مقرر کرتے ہوئے اپنے عم زاد الملک الناصر کے پاس روانہ کر دیا۔ بہاء الدین زہیر بے حد ہوش مند اور دور اندیش شخص تھا، اس نے الملک الناصر سے اس انداز سے بات چیت شروع کی کہ اس نے بآسانی جنگ کے بجائے امن کی راہ پر چلنے پر آمادگی ظاہر کردی۔ دونوں لشکروں کے درمیان یہ سلسلہ کچھ دنوں تک چلتا رہا۔ الملک الناصر نے نجم الدین ایوب کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ نجم الدین ایوب کو بظاہر اس کے قیدی کی حیثیت سے الکرک چلنا ہوگا۔ اس کے ساتھ مناسب سلوک کیا جائے گا۔ جونہی حالات سازگار ہوئے تو میں اسے باعزت رہا کر دوں گا۔ اگر نجم الدین ایوب یہ سمجھتا ہے کہ میری نیت میں کوئی کھوٹ ہے تو وہ ابھی اسی وقت بصریٰ کی جانب لوٹ سکتا ہے مگر وہ اُس بات کو ذہن نشین رکھے کہ عماد الدین اسماعیل اسے اپنے لئے خطرہ جان کر اس پر حملہ کرنے سے باز نہیں آئے گا اور یہ یقینی بات ہے کہ طاقت کی عدم موجودگی میں نجم الدین ایوب اس سے نہ صرف شکست کھا جائے گا بلکہ موت کے گھاٹ بھی اُتار دیا جائے گا، اگر اُسے مجھ پر ذرا سا بھی بھروسہ ہے تو وہ میرا ساتھ دے۔ بہاء الدین زہیر نے الملک الناصر کی پیشکش نجم الدین ایوب کے سامنے رکھ دی۔ نجم الدین ایوب پہلے تو اپنے عم زاد کی بات سن کر رنجیدہ ہوگیا۔ وہ پہلے ہی اپنی سپاہ کے باغیانہ رویئے سے سخت آزردہ تھا۔ اسے اب بصریٰ و نابلس کی باقی ماندہ افواج پر بھی کامل بھروسہ نہیں تھا۔ مجبوراً اس نے اپنے عم زاد الملک الناصر داؤد کی یہ پیشکش قبول کرنے کا فیصلہ کرلیا اور 22 ربیع الاوّل 637ھ بروز ہفتہ کو اپنے اتباع اور حلیفوں کی جماعت کے ساتھ خود کو الملک الناصر کے حوالے کر دیا۔ نجم الدین ایوب نے اپنی باقی ماندہ سپاہ کو واپس بصریٰ و نابلس لوٹ جانے کا حکم دے دیا۔ بہاء الدین زہیر نے نجم الدین ایوب کی اطاعت کو ہی اپنے لئے پسند کیا اور نابلس کی امارت ترک کرتے ہوئے الکرک کی

راہ لی۔ الملک الناصر داؤد ان کے ساتھ بے حد عزت سے پیش آیا اور انہیں اپنے ساتھ لے کر الکرک شہر آ گیا۔ اس نے اپنے اقتدار کے تحفظ کے لئے بظاہر نجم الدین ایوب کو ایک قلعے میں نظر بند کر دیا تھا۔ یہاں نجم الدین ایوب اور اس کی جماعت کو خفیہ طور پر تمام مراعات مہیا کی گئیں اور کسی قسم کی تکلیف بھی نہیں دی گئی۔ نجم الدین ایوب اپنے عم زاد پر بھروسہ تو کئے ہوئے تھا مگر وہ اپنی حفاظت سے ذرا غافل نہیں تھا۔ ابوخویلد، غازی جان اور بیبرس اس کے خاص اور وفادار غلام تھے، جنہیں خصوصاً آنکھیں کھلی رکھنے کی ہدایت کی گئی تھی۔



غازی عبداللہ شافعی بلادِ مصر کی حکومت میں شامل ایک بااعتماد امیر تھا۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ ایوبی خاندان میں وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ عیوب و نقائص پیدا ہوتے چلے گئے جو ان کے زوال کا باعث بننے لگے، صلاح الدین ایوبی کے پوتوں اور پڑپوتوں میں اپنے اپنے اقتدار کی ہوس بے حد عروج پر دکھائی دیتی تھی۔ وہ اپنے بھائیوں اور بیٹوں کے خلاف نصاریٰ سے مدد لینے سے بھی نہیں چوکتے تھے، انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ نصاریٰ ان کے دوست نہیں ہیں، وہ ان کی مدد کرنے کے ساتھ آہستہ آہستہ انہیں کمزور کر کے اس سرزمین سے نکال باہر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ حال کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ماضی سے عبرت لینے کا کسی کے پاس وقت نہیں تھا۔ مستقبل کس چڑیا کا نام ہے، اس بارے میں کچھ جاننا ان کے لئے بے معنی و بے مقصد تھا۔ عیش ونشاط کی رنگ رلیوں میں ڈوبے ان سلطانوں کی ذات پر جب کبھی آنچ آتی تو ہی یہ نصاریٰ کو سبق سکھانے کا رُخ کیا کرتے۔

بلادِ شرقیہ، بلادِ عرب، بلادِ شام، بلادِ یمن، بلادِ عراق و فارس اور بلادِ افریقہ پر ایوبی سلطانوں کی حکومت پھیلی ہوئی تھی۔ اتنے بڑے رقبے پر حکومت کے باوجود نصاریٰ بیت المقدس پر قابض تھے۔ فلسطین اور لبنان کے ساتھ ساتھ تیونس تک بحیرہ روم کی ہزاروں میل لمبی پٹی پر شیطانی آنت کی طرح صلیبیوں کے مستحکم قلعوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ انہوں نے براہ راست حملوں کے بجائے اب انہیں آپس میں ہی نبرد آزما کر ڈالا تھا۔ بغداد میں موجود اُمت مسلمہ کا دائمی خلیفہ بھی بے بسی کی تصویر دکھائی دیتا تھا۔ اُسے اپنی درباری سازشوں اور شعر وادب کی محفلیں سجائے رکھنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں تھا۔ اس کی حکومت محض بغداد تک ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اگر کوئی بیرونی حاکم اس کا حکم مان لیتا تو وہ خوشی سے سرشار ہو کر اُسے خلعت عطا کر دیا کرتا۔ یہ علیحدہ بات تھی کہ اُسی خلیفہ کی اجازت سے بنائی گئی حکومت کو ہی جائز اور سرکاری قرار دیا جاتا تھا۔ ایوبی سلطان اس بات سے بے خبر نہیں تھے۔ وہ ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچ کر جب خود تخت نشین ہوتے تو فوراً اپنی اطاعت و بیعت کا نامہ خلیفہ کی خدمت میں روانہ کر دیتے۔ اس نامے کے ہمراہ تحائف کا بڑا انبار بھی ہوتا تھا۔ خلیفہ بغداد محض ان کی اطاعت و بیعت پر ہی صبر وشکر کر کے انہیں خلعت روانہ کر دیا کرتا۔ جب خلیفہ کے حکم منوانے کا وقت آتا تو وہی سلطان خلیفہ کے حکم پر کان بھی نہیں دھرا کرتے تھے۔

سیف الدین ابوبکر بلادِ مصر و افریقہ کا نوعمر ایوبی سلطان تھا۔ اس کی حکومت محض نام کی ہی تھی۔ عنانِ حکومت امرائے مصر کے ہاتھ میں تھی۔

غازی عبداللہ شافعی ایسے ہی مصری اشراف و امراء میں سے ایک تھا۔ مصر میں شافعی مسلک سے تعلق رکھنے والوں کی تعداد بے حد زیادہ تھی، اسی لئے آئے دن شافعی اور حنفی مسلک کے افراد میں مختلف انواع کی چپقلش پیدا ہوتی رہتی۔ غازی عبداللہ شافعی کی ایک بیٹی باختہ کو اس کے شوہر نے مسلک کے اختلاف پر طلاق دے دی تو اُس نے اپنے اثر ورسوخ سے کام لیتے ہوئے اپنے داماد رضی الدین کو بغاوت کے من گھڑت مقدمہ

میں پھنسوا دیا۔ یہ محض انتقامی کارروائی تھی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ رضی الدین کی دور کی رشتہ داری جمال الدین الراجی سے بھی تھی۔ رضی الدین کی ماں روتی پیٹتی ہوئی جمال الدین الراجی کی چوکھٹ پر جا پہنچی۔ جمال الدین الراجی کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس معاملہ میں غازی عبداللہ شافعی بھی ملوث ہے تو اس کی شیطانی رگ پھڑک اٹھی۔ وہ عرصے سے اُسے نیچا دکھانے کے چکر میں تھا مگر کوئی ایسا موقعہ ہاتھ نہ لگا۔ رضی الدین کے معاملے میں اس نے اپنی ٹانگ اڑائی اور اپنے بیٹے کے ذریعے جو کہ صیغہ احتساب میں افسر مقرر تھا، از سرِ نو چھان بین کا حکم جاری کروا دیا۔ رضی الدین پر چونکہ جھوٹا مقدمہ بنایا گیا تھا اس لئے چند ہی دنوں کی تحقیق و تفتیش کے بعد اصل حقائق کی قلعی کھل گئی۔ غازی عبداللہ شافعی نے اپنے عہدے کا ناجائز اور بے جا استعمال کیا تھا۔ تمام چھان بین کے بعد جو رپورٹ تیار ہوئی، اُسے جمال الدین الراجی خود لے کر سلطان سیف الدین ابوبکر کے حضور پیش ہوا۔ بھرے دربار میں جمال الدین الراجی نے غازی عبداللہ شافعی کی ایک بے گناہ شخص پر من گھڑت مقدمے کی روداد اور ظلم وستم ڈھانے کا واویلا اس قدر بے چارگی سے مچایا کہ سب امراء غازی عبداللہ شافعی کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ غازی عبداللہ شافعی سر جھکائے لاچار کھڑا رہ گیا۔ اس کی اپنے حق میں پیش کی گئی صفائیاں بھی امراء مجلس کا دل مطمئن نہ کر پائیں۔ بالآخر اس نے اپنی بیٹی پر کئے جانے والے ستم کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ تسلیم کر لیا کہ واقعی یہ مقدمہ من گھڑت تھا مگر اس کا مقصد ظلم کرنا نہیں بلکہ احساسِ ذلت پیدا کرنا تھا تا کہ مستقبل میں رضی الدین کسی دوسرے کی بیٹی کے ساتھ ایسا نہ کر پاتا۔ غازی عبداللہ شافعی کے اعتراف جرم نے جہاں سب کو ششدر کر ڈالا تھا، وہیں کئی ایک امراء نے سلطان سیف الدین ابوبکر سے اس کی معزولی کی سفارش بھی کر دی۔ سلطان نے جب امراء کو باہم متفق دیکھا تو اس نے غازی عبداللہ شافعی کی معزولی کے ساتھ ساتھ اس کی قاہرہ سے بھی جلاوطنی کا حکم جاری کر دیا۔ غازی عبداللہ شافعی کو بھرے دربار میں جو خفت و خجالت اُٹھانا پڑی تھی، اس پر اندر ہی اندر جل بھن رہا تھا۔ اس نے جمال الدین الراجی کی جانب کینہ توز نگاہوں سے دیکھا تو جمال الدین الراجی کے چہرے پر اس کے لئے استہزائیہ مسکان سجی ہوئی تھی۔ جمال الدین الراجی نے اپنی راہ کا ایک اور کانٹا ہٹا دیا تھا۔ وہ بلادِ مصر پر اپنے اختیارات مستحکم کرنے کے ساتھ ساتھ سلطان مصر کو بھی اپنے دام میں پھنسانے کا خواہش مند دکھائی دے رہا تھا۔



ایک شام بیبرس نجم الدین ایوب کے پاس چلا آیا اور اس کی نشست کے پہلو میں خاموشی سے بیٹھ گیا۔ نجم الدین ایوب کسی گہری فکر میں مبتلا تھا۔ خفیف سی حرکت محسوس ہونے پر اس نے سر گھما کر اس کی جانب استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''آقا!'' بیبرس ہچکچاتے ہوئے بولا ''ہم یہاں کب تک یونہی پڑے رہیں گے؟''

نجم الدین ایوب اس کی بات سن کر دھیما سا مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں کڑے وقت کی سب تلخیاں عود کر آئی تھیں۔ وہ بڑی اپنائیت کے ساتھ اپنے ہاتھ سے بیبرس کا سر سہلانے لگا۔

''بیبرس! تم دوسروں کے دُکھ درد جلد محسوس کر لیتے ہو۔ میں بخوبی جانتا ہوں کہ تمہارے سینے میں ہر وقت خیر خواہی اور وفاداری کے جذبات کا سمندر موجزن رہتا ہے۔ مجھے یہ بھی احساس ہے کہ تم سے میری یہ بے چارگی اور صعوبت زدہ زندگی برداشت نہیں ہو پا رہی مگر قدرت کی جانب سے کبھی کچھ مواقع ایسے آتے ہیں کہ جن کے سامنے انسان بالکل بے بس و لاچار ہو کر رہ جاتا ہے۔ اُمورِ جہانبانی بھی کچھ اسی طرح سے ہیں۔

بخدا.....! مجھے لوگوں یا اُن کی زمینوں پر حکومت کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے اور نہ ہی میں جاہ و حشمت کا

دلدادہ ہوں۔ مجھے تو صرف دینِ اسلام کے حریفوں کا ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے جو ہمارے عقب سے بدستور اپنے گھناؤنے وار کئے جا رہے ہیں۔ مسلمان اُن کی پس پردہ عیاریوں اور مذموم حرکات سے بے خبر ہیں۔ وہ انہیں ذلیل و خوار کر کے اس سرزمین پر قبضہ جمانے کی فکر میں ہیں۔ یہاں انہیں اپنے مذہبی مقامات سے بھی کوئی دلچسپی نہیں اور نہ ہی وہ خود کو مذہب کے دائرے میں مقید کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی حریصانہ نگاہیں صرف یہاں کی تجارت، پیداوار اور مال و متاع پر جمی ہوئی ہیں۔ یہ سرزمین اُن کے لئے سونا اُگلتی ہے۔ جو اُنہیں اپنے ممالک میں نہیں مل سکتا۔ مسلمان حقیقت کو جاننے کے بجائے بدستور اپنی آنکھیں موندے ہوئے ہیں۔ اِن میں سے کچھ ایسے ہیں جنہیں محض اپنی سلطنت کی حدود بڑھانے کی حرص و طمع ہے اور وہ اپنی نفسانی خواہشوں کے غلام بن چکے ہیں۔

نجم الدین ایوب کی آواز بھرانے لگی۔ اس نے توقف کیا اور ایک نگاہ بیبرس پر ڈالی۔ بیبرس کی آنکھیں بھی اس کے کرب زدہ لہجے سے نم آلود ہو چکی تھیں۔ نجم الدین ایوب نے گہرا سانس لیا اور اپنی نشست سے ٹیک لگا کر دوبارہ گویا ہوا۔

''بیبرس! تم شاید یہ جاننا چاہتے ہو کہ ہم یہاں سے کب نکل کر واپس اپنے محلوں میں پہنچیں گے؟ تو یہ بات یاد رکھو کہ ہمارا ملک وہی ہے، جہاں ہم اس وقت موجود ہیں۔ یہی زنداں خانہ ہمارا محل ہے۔ دشمنوں سے تو مقابلہ کیا جا سکتا ہے مگر مشیت ایزدی کے خلاف ایک قدم بھی نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ ہم اگر یہاں پڑے ہیں تو یہ مشیت ایزدی کا ہی فیصلہ ہے مگر ہماری نیت صاف ہے۔ اس لئے ہمیں جلد ہی اس کا اجر ملے گا۔ ہم چونکہ دشمنانِ اسلام کے جانی دشمن ہیں، اس لئے ہماری مدد غیب سے کی جائے گی۔ دینِ اسلام کے لئے ہماری یہ خدمت ہی ہمارا اولین مقصد ہونا چاہیے۔ محل کی عیش و عشرت ایک دن یہیں رہ جائے گی۔ بس یہ دُعا کیا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی راہ میں لڑتے ہوئے شہادت کی موت نصیب کرے اور آخرت میں اپنے حضور سرخرو رکھے۔''

''آقا!'' بیبرس سر جھکائے بولا۔ ''آپ واقعی عظیم انسان ہیں، آپ کی آنکھوں میں دین کے لئے جو جذبہ میں نے دیکھا ہے۔ وہ پہلے مجھے کبھی دکھائی نہیں دیا۔ انشاء اللہ آپ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں گے اور مجھے ہر جگہ اپنا محافظ و معاون پائیں گے۔''

''تم میری فکر چھوڑو! ان لوگوں کا خیال رکھو جنہوں نے ہمارے ساتھ غلامی کی زندگی کو ترجیح دی ہے، اگر وہ چاہتے تو ہمارا ساتھ چھوڑ کر آج آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہوتے۔ مجھے اپنے عم زاد سے بھلائی کی توقع بالکل نہیں۔''

''آپ فکر و تردد نہ کریں۔ وہ سب اپنے فعل پر مطمئن ہیں اور آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انہیں ذرا بھی ملال نہیں کہ وہ مقید ہیں۔''

''کوئی نئی خبر تو نہیں پہنچی۔''

''نہیں! دمشق پر بدستور عماد الدین اسماعیل کا ہی قبضہ ہے۔ لوگوں کو اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ ان کا حاکم بدل گیا ہے۔ اُمراء ریاست بھی اسی کی چاپلوسی میں لگے ہیں۔''

''اُمراء کی بات چھوڑو۔ وہ تو اپنی غرض اور نہ ختم ہونے والی خواہشات کے غلام ہیں۔ جہاں سے ان کی جھولی میں کچھ پڑا، بس اُسی کا کلمہ ان کی زبان پر آیا۔'' نجم الدین ایوب منہ بناتے ہوئے بولا۔ بیبرس اس کے چہرے پر چھائی ہوئی یاسیت دیکھ کر جہاں مغموم ہو رہا تھا۔ وہیں اُسے محسوس ہوا کہ اس کا آقا اب تنہائی چاہتا ہے، لہٰذا اُس نے وہاں سے اُٹھنے میں ذرا تامل سے کام نہیں لیا اور وہاں سے نکل آیا۔ طرح طرح کے خیالوں کے ہجوم

میں غرق سیڑھیاں بالائی منزل کے آخری حصے کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ اچانک کسی کی سرگوشی نما آواز نے اسے چونکا دیا۔ یہ اس کی تربیت کا خاصہ تھا کہ وہ اجنبی سرگوشیوں سے فوراً ہوشیار و چوکنا ہو جایا کرتا تھا۔



برقائی خان گذشتہ کئی دنوں سے پہاڑوں اور دور دراز کے قبائلی علاقوں میں مسلسل محوِ سفر تھا۔ وہ مطیع الدین کی تلاش میں کونہ کونہ چھانتا پھر رہا تھا۔ اس کے ہمراہ سپاہ کا دستہ بھی اس کے جارحانہ انداز سے خاصا بدگمان دکھائی دیتا۔ یہ پہلی مرتبہ تھا کہ اس کے سب انداز ے غلط ثابت ہو رہے تھے۔ اس نے تلواریں اور بڑی زنجیریں کاٹنے والی تمام بڑی قینچیوں کے مالک قبائل پر اچانک چھاپے مارے مگر انہیں مطیع الدین یا سرخوں کے قبیلے میں ہونے والی واردات کا کچھ علم نہیں تھا۔ برقائی خان اپنی لگاتار ناکامی پر زچ ہو کر رہ گیا۔ اُسے خدشہ تھا کہ کہیں وہ منگولوں کے مسلمانوں سے تعصب کا نشانہ نہ بن جائے۔ البتہ اسے یہ حیرت ضرور تھی کہ وہ کون شخص تھا؟ جس نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر مطیع الدین کو سرخوں کے چنگل سے اُڑا لیا تھا۔ دوسرا اُسے مطیع الدین سے کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ ایک جگہ رُک کر کڑکتی دوپہر میں برقائی خان نے سرسبز وادی میں خیمے لگوائے۔ سپاہ نے مجبوراً خیمے گاڑتے ہوئے کینہ توز نگاہوں سے برقائی خان کو دیکھا۔ جبکہ برقائی خان نے ان کی اس حرکت پر ذرا سا بھی ردِعمل نہیں دکھایا۔ سپاہ کا کماندار خیمے لگوا کر برقائی خان کے پاس چلا آیا۔ برقائی خان نے اس پر اچٹتی نگاہ ڈالی۔

''قاآن زادے......!'' کماندار اپنی عادت کے تحت چیختے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ ''اس بے کار کی سیر و سیاحت سے میں اور میرے سپاہی تنگ آ چکے ہیں۔ تمہیں کس چیز کی تلاش ہے، اس بارے میں تو ہمیں کوئی واضح علم نہیں مگر سپاہ کے ساتھ تمہارا سلوک ناروا ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ سپاہ کا مزاج کیا ہوتا ہے؟ اس کے باوجود تم انہیں یوں گھسیٹتے پھر رہے ہو جیسے یہ تمہارے مجرم ہیں اور تم انہیں کوئی سزا دینا چاہتے ہو''۔

''کماندار......!'' برقائی خان اس کی جانب شعلہ بار نگاہوں سے دیکھتا ہوا سخت لہجے میں بولا۔ ''میرے ساتھ بات کرتے ہوئے تمہیں اپنی حدود میں رہنا چاہئے۔ تمہارا لہجہ حد سے زیادہ گستاخانہ ہے۔ میں چاہوں تو تمہیں اس بات کی سزا اسی خوفناک ویرانے میں دے سکتا ہوں اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ قاآن زادوں سے گستاخی کی سزا کیا ہو سکتی ہے؟''

''م... م...... میرا مطلب یہ نہیں تھا''۔ وہ لمحہ بھر میں مِمیا اُٹھا۔ پل بھر میں اس کی ساری اکڑ غائب ہو گئی۔

''میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تمہارا مطلب کیا ہے......؟ کیا تم مجھے نہیں دیکھ رہے کہ میں بھی تمہارے ساتھ برابر یہ صعوبت کاٹ رہا ہوں۔ مجھے کوئی شوق نہیں کہ ویرانے میں مارا مارا پھرتا پھروں۔ مجھے اپنے دوست کی تلاش ہے جو کسی قبیلے کی قید میں ہے اور میں یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کس قبیلے کی قید میں ہو سکتا ہے۔ محض شک کی بنیاد پر میں اس کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ اگر تم میں مزید ہمت باقی نہیں رہی تو میری جانب سے تمہیں کھلی اجازت ہے کہ تم واپس اپنی سپاہ کو لے کر سرائے لوٹ جاؤ''۔

''ہم واپس نہیں لوٹ سکتے۔ ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم ہر قیمت آپ کے ہمراہ رہیں اور جب بھی واپس لوٹیں تو آپ ہمارے ہمراہ ہوں''۔

کماندار کا لہجہ خاصا بدل گیا تھا۔

''میں قاآن اعظم سے اس بارے میں خود بات کر لوں گا۔ تم کھانے پینے کا ضروری سامان اور دو

گھوڑے یہاں چھوڑ دو۔ جس قدر چاہو آرام کرو اور اس کے بعد واپس لوٹ جاؤ۔ کل صبح تک تم سرائے پہنچ جاؤ گے''۔ برقائی خان نے لاپروائی سے کہا۔

''آپ یہاں تنہا رہ جائیں گے...... !''

''میں کوئی بچہ نہیں ہوں۔ اپنی حفاظت کرنا مجھے خوب آتی ہے''۔

''ہم قاآن اعظم کو واپس جا کر کیا جواب دیں گے......؟'' اس نے سراسیمگی کے عالم میں پوچھا۔

''یہ میرا مسئلہ نہیں ہے......!''

وہ کچھ نہیں بولا۔ بس خاموشی سے اپنے خیمے کی جانب لوٹ گیا۔ برقائی خان خود بھی سپاہ کے ساتھ خود کو پابند سا محسوس کر رہا تھا۔ اسے ایسے لگ رہا تھا کہ سپاہ کے ساتھ نے اس کی تمام صلاحیتیں سلب کر ڈالی ہیں۔ دو گھنٹے کے آرام کے بعد کماندار نے اپنے دستے کو واپسی کا مژدہ سنایا تو ان کے مرجھائے چہرے جیسے کھل اُٹھے۔ وہ بڑے جوش و خروش سے تیاریاں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد سپاہ کا دستہ دھول اُڑاتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا۔ برقائی خان کو ایسے لگا جیسے اس کے کندھوں پر سے کوئی بڑا بوجھ اُتر گیا ہو۔



تونائی خان کی بیٹی گل دتوژ اپنے محبوب کے انتظار کے کرب میں مبتلا تھی۔ اُسے اب تک لوٹ آنا چاہئے تھا مگر اس کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ بے چینی و بے تابی کے عالم میں کئی مرتبہ اُس کے قدم خود بخود اسی بالکونی کی جانب اُٹھ جایا کرتے، جہاں سے اُسے کبھی مطیع الدین کی معصوم سی صورت دکھائی دیا کرتی تھی۔ ازقائی قبیلے کے سردار مانجی خان نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ سرخوں کی قید سے مطیع الدین کو ضرور رہا کرائے گا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وعدہ خلافی کرنا مانجی خان کے مزاج کے خلاف تھا۔ پھر ایسی کون سی بات تھی کہ مطیع الدین ابھی تک واپس لوٹ نہیں پایا۔ حالانکہ مانجی خان نے اس سے معاوضہ بھی پیشگی موصول کر لیا تھا۔ وہ انہی خیالوں میں کھوئی اِدھر اُدھر سارا دن بھٹکتی رہتی۔ وہ اس بات سے بھی بالکل بے خبر تھی کہ اس کا باپ کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہے۔ وہ اس کی حرکات و سکنات کئی دن سے بغور دیکھ رہا تھا۔ ایک شام جب وہ بالکونی میں تنہا مطیع الدین کی خوشگوار یادوں میں محو بیٹھی تھی، کہ تونائی خان وہاں چلا آیا۔ اُس نے گل دتوژ کو عقب میں سے آواز دی۔ گل دتوژ کچھ زیادہ ہی کھوئی ہوئی تھی۔ اس نے باپ کی آواز نہ سنی۔ تونائی خان اس بار قدرے غصے میں مخاطب ہوا تو وہ بری طرح سے ہڑبڑا اُٹھی۔ اس نے تیزی سے اُٹھنے کی کوشش کی مگر اپنے ہی کپڑوں میں اُلجھ کر رہ گئی۔

''میں کچھ دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تم اپنے آپ میں نہیں ہو''۔ تونائی خان قریباً اسے گھورتے ہوئے بولا۔ گل صورتِ حال کچھ ایسی تھی کہ جیسے اسے چوری کرتے پکڑ لیا گیا ہو۔

''ن... ن...... نہیں تو ایسی تو کوئی بات نہیں......!''

''دیکھو لڑکی......! مجھ سے فضول میں کچھ چھپانے کی کوشش مت کرو''۔

''میں کیا چھپاؤں گی بھلا......!''

''میں نادان نہیں ہوں گل......! میں نے دنیا کی خاک چھانی ہے۔ جوانی کے جس دور سے تم گزری ہو۔ وہاں سے میں بھی گزر کر آیا ہوں۔ جوانی میں اکثر قدم بہک جایا کرتے ہیں۔ تمہاری بے چینی اور بے تابی بھی مجھے کوئی ایسی ہی کہانی سنا رہی ہے''۔ تونائی خان قدرے نرم لہجے میں بولا۔

''بابا......! آپ شاید کسی غلط فہمی کا شکار ہیں اگر آپ میری تنہائی سے کوئی غلط مطلب نکال بیٹھے ہیں تو اس میں میری طبیعت میں ناسازی کو دخل ہے''۔

''بہانہ بازی مت کرو لڑکی۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ جوانی کے بہانوں میں خرابی، طبیعت کا ہی سہارا لیا جاتا ہے''۔ وہ تمسخرانہ ہنسا۔ اس کے لہجے میں گہرا طنز عیاں تھا۔ گل دتوڑا اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گئی تھی۔

''دیکھو......! اگر تمہارا دل کسی پہ آ گیا ہے تو اس کا نام و پتہ مجھے بتا دو۔ میں تمہارا باپ ہوں، کوئی دشمن نہیں۔ ویسے بھی تمہاری عمر اب شادی کی ہو رہی ہے۔ اگر تمہاری ماں آج زندہ ہوتی تو یہ باتیں وہی پوچھتی۔ سوتیلی مائیں بھلائی نہیں، برائی سوچا کرتی ہیں۔ اسی لئے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری رائے کو فوقیت دینا چاہئے''۔

گل دتوڑ کا چہرہ حیا کی سرخی سے سرخ ہونے لگا۔ وہ نگاہیں نیچی کئے خاموش بیٹھی رہی۔

''کیا اُس کا تعلق ازقائی قبیلے سے ہے......؟'' تونائی خان نے قدرے توقف سے اچانک سوال کیا۔

گل دتوڑ حیرت سے گرتے گرتے بچی۔

''ٹھیک ہے......! میں سمجھ گیا ہوں''۔

''نن......نن......نہیں آپ غلط سمجھے ہیں''۔ گل دتوڑ بے اختیاری کے عالم میں تیزی سے بولتی چلی گئی۔

تونائی کے چہرے پر مسکراہٹ کی تہیں دبیز ہونے لگیں جیسے وہ اس کی حالت سے محظوظ ہو رہا ہو۔

''میں یہی جاننے کی خواہش لئے یہاں آیا ہوں......!'' تونائی خان کا لہجہ بے حد مشفقانہ تھا۔

''ایسی ویسی کوئی بات نہیں ہے''۔ وہ بے دلی سے بولی۔ اس کا ہاتھ لگاتار پلو سے کھیلنے میں مصروف تھا۔ اس کے دل پر عجب سی گدگدی طاری تھی۔ وہ اپنا مدعا زبان پر لانا بھی چاہتی تھی مگر اسے ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

''تو تم ازقائی قبیلے میں کیا کرنے گئی تھی؟''

تونائی خان نے اس بار قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ اس پیچیدہ سوال کے بارے میں گل دتوڑ کے پاس کوئی واضح جواب نہیں تھا۔ وہ اپنے ذہن میں لفظوں کو ترتیب دینے کی کوشش کرنے لگی۔

''تم خاموش کیوں ہو......؟'' تونائی خان اس کی چپ پر جھنجھلا اُٹھا۔

''میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے کہ میں ازقائی قبیلے میں کیوں گئی تھی؟ اگر میں یہ کہوں کہ یہ محض اتفاق تھا۔ میں سیر کی نیت سے گھر سے نکلی تھی کہ میرا گھوڑا بے قابو ہو گیا اور جب تک وہ تھکا...... میں ازقائی قبیلے پہنچ چکی تھی۔ میں کچھ دیر کے لئے وہاں ستانے کی نیت سے رُک گئی تھی۔ اگر میں یہ کہوں کہ یہ سب اتفاق تھا تو شاید آپ یقین نہیں کریں گے''۔

''میرا خیال ہے کہ تم اس وقت اس بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتی۔ میں فی الحال جا رہا ہوں اس موضوع پر پھر دوبارہ بات ہو گی۔ تم اس بارے میں اچھی طرح غور و خوض کر لو...... ہاں ایک بات کان کھول کر سن لو کہ میں جلد ہی تمہاری شادی طے کرنے والا ہوں۔ وقت ضائع کرنا تمہارے حق میں بہتر نہیں ہو گا''۔ تونائی خان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔ گل دتوڑ اپنے باپ کے آخری الفاظ پر پریشان ہو گئی تھی۔ وہ کافی دیر تک سکتے کے عالم میں گم صم بیٹھی رہی......!!!



مطیع الدین وہاں سے خاموشی کے عالم میں اپنے خیمے میں لوٹ آیا تھا۔ اس کا ذہن مسلسل ادھیڑ بن کا شکار تھا۔ گل...... گل...... یہ نام لگاتار اس کے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح ضربیں لگا رہا تھا۔ یہ سب کیا تھا؟ کیا واقعی گل دتوڑ نے درندہ صفت قبیلے سے اس کی جان خلاصی کرانے میں معاونت کی تھی؟ مگر کیسے......؟

مطیع الدین کا دماغ پھٹنے کے قریب ہو چکا تھا۔ سوالات کی لمبی قطار اس کے دل و دماغ میں سرایت کئے

جا رہی تھی۔ جس سے روح میں تشنگی کا عالم بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے کئی بار ان سوچوں کا دھارا موڑنے کی کوشش کی مگر ہر بار ناکامی ہی اس کا مقدر بنی۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی مانند کوندا۔

''یہی ہو سکتا ہے''۔ وہ زیر لب بڑبڑایا۔ ''یقیناً میں نے مدہوشی کے عالم میں گل دتوڑ کے بارے میں کوئی جملہ کہا ہو گا۔ جس کی اطلاع سردار مانجی خان کو دی گئی ہو گی۔ اس نے مجھے صرف اسی نام پر ہی یہاں روکنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے گل کہہ کر میری دکھتی رگ پر ہاتھ تو ڈال دیا ہے مگر اس نے پورا نام نہیں لیا۔ ہو سکتا ہے کہ سننے والے کو صرف گل ہی سمجھ آیا ہو۔ یقیناً یہی بات ہو گی''۔

ایک گہرا سانس اس کے ہونٹوں سے خارج ہو گیا۔ وہ خود کو یوں بے وقوف بنتے دیکھ کر خود ہی مسکرانے لگا۔ ''سردار مانجی خان تم بھی کمال کے داؤ پیچ کھیلتے ہو......!'' اس نے اُسے دل میں داد دی مگر اُسے میرے یہاں قیام سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ ایک دوسرا سوال ذہن میں اُبھرا۔ ممکن ہے کہ یہ اسی درندہ صفت قبیلہ کی ہی کوئی کارستانی ہو۔ انہوں نے شاہی عتاب سے بچنے کے لئے ایسا کیا ہو مگر شاہی عتاب ان پر کیسے نازل ہو سکتا ہے؟ میرے باپ کی اتنی حیثیت تو ہے نہیں کہ وہ شاہی دربار تک رسائی حاصل کر لے۔ باپ کے مشفقانہ چہرے کو تصور کے پردے پر دیکھ کر وہ بے چین سا ہو گیا تھا۔ جوان بیٹے کی گمشدگی نے اس کے باپ پر کیا اثر ڈالا ہو گا؟ وہ یہ محسوس کر کے تڑپ سا گیا۔ خیالوں کا ہجوم ایک بار پھر اس کے ذہن پر چھانے لگا۔ اچانک اُسے برقائی خان کی یاد آ گئی۔ اس کا مہربان دوست اسے خیمے میں نہ پا کر کتنا پریشان ہو رہا ہو گا۔ جانے وہ اس کی تلاش میں کہاں کہاں بھٹک رہا ہو گا؟ باپ اور مہربان دوست کے خیال نے اُسے اتنا بے تاب کر دیا تھا کہ اس نے فوراً واپس جانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اُسے ازقائی قبیلے سے فرار ہونے کے لئے کسی تدبیر کا سہارا مطلوب تھا۔



ہبرس نے تیزی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دبی دبی سی آوازیں آخری حصے میں موجود ایک چھوٹے سے کمرے سے آ رہی تھیں۔ وہ چپکے سے آگے بڑھا اور دروازے میں موجود چھوٹے سے سوراخ میں سے اندر جھانکنے لگا۔ اندر جو کوئی بھی تھا۔ وہ اُسے واضح طور پر دکھائی نہیں دیا۔ اس نے آوازوں پر غور کیا تو معلوم پڑا کہ ان میں سے ایک آواز اس کے ترک استاد اور آقا کے سب سے وفادار غلام ابوخویلد کی ہے۔ دوسری آواز کچھ انجانی سی لگی۔ اس نے بہتیری کوشش کی کہ آوازوں کا مفہوم سمجھ میں آ سکے مگر اس کے پلے کچھ نہیں پڑ رہا تھا۔ البتہ ایک آدھ دفعہ نجم الدین ایوب کا نام لیا گیا تھا جو اس کی سماعت میں اتر گیا تھا۔ اس نے لمحہ بھر میں فیصلہ کیا اور اندر کمرے میں چلا گیا۔ اندر موجود صاحبان چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگے۔ شاید ہبرس کی آمد ان کی توقع کے خلاف تھی۔ ہبرس نے تیز نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا۔ کمرے میں روشنی زیادہ نہیں تھی۔ دیوار پر آویزاں مشعل کی ملگجی زرد روشنی ماحول کو مزید پُراسرار بنائے ہوئے تھی۔ ایک چھوٹی سی لکڑی کی میز کے گرد تین افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں ابوخویلد کے علاوہ بہاء الدین زہیر اور ایک ناشناسا شخص تھا۔ وہ تینوں ہبرس کی صورت دیکھ کر حیرت کے عالم سے باہر نکل آئے۔ کچھ توقف کے بعد ابوخویلد اس سے گویا ہوا۔

''ہبرس......! تمہیں پہلے باہر دروازے پر دستک دینا چاہئے تھی۔ پھر اندر آنا چاہئے تھا''۔

''استاد محترم! میں اِس کوتاہی کی معافی چاہتا ہوں۔ میں اپنے خیالوں میں گم یہاں سے گزر رہا تھا کہ در و دیوار نے مجھے مخاطب کیا کہ یہاں کچھ گڑبڑ ہے۔ کوئی میرے آقا کے خلاف سازش کا تانا بانا تیار کر رہا ہے۔ اس لئے بلا اجازت بے دھڑک اندر گھس آیا''۔

''ہبرس! تمہارے انداز میں جارحیت کے ساتھ ساتھ بے ادبی بھی جھلک رہی ہے۔ تم یہ مت بھولو کہ تم

نجم الدین کے معمولی سے غلام ہو" ۔ بہاء الدین زہیر اس کے انداز پر پھٹ پڑا۔

"معزز امیر! میں آپ کی تہہ دل سے عزت کرتا ہوں مگر اپنے آقا کی حفاظت کرنا بھی میری ذمہ داری ہے۔ یاد رکھئے کہ جب تک میں زندہ ہوں اُن کی ذات پر کوئی حرف نہیں آنے دوں گا"۔

بہاء الدین زہیر نے کچھ بولنا چاہا تھا کہ ابوخویلد نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے منع کر دیا۔

"بیبرس! یہاں آؤ تم شاید ہماری گفتگو کو غلط مطلب دے رہے ہو" ۔ ابوخویلد نرمی سے بولا۔ "یہاں نجم الدین ایوب کے بارے میں کسی قسم کی سازش کی منصوبہ بندی نہیں کی جارہی، بلکہ ان کی نادیدہ مدد کے لئے علاح ومشورے کئے جارہے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ تم بھی چلے آئے ہو۔ یقیناً ہم اکٹھے بیٹھ کر کوئی عمدہ لائحہ عمل تیار کر سکتے ہیں"۔

ابوخویلد کے چہرے پر چھائی ہوئی سچائی کی جھلک دیکھ کر وہ لمحہ بھر کے لئے خود کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ بیبرس نے بھی آگے بڑھ کر ان کے برابر نشست سنبھال لی۔



غازی عبداللہ شافعی کو قاہرہ سے رسوا کر کے نکالا گیا تھا۔ وہ مایوسی کے عالم میں قاہرہ سے خالی ہاتھ اپنے اہل وعیال کے ساتھ نکلا اور 7 شعبان 637ھ کو شہر الکرک پہنچا۔ اس کا ارادہ دمشق جانے کا تھا مگر جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ نجم الدین ایوب قلعہ الکرک کے زندان خانے میں مقید ہے تو اس نے دمشق جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ نجم الدین ایوب سے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں جمال الدین المراحی سے خوفناک انتقام لینے کی خواہش کروٹیں لینے لگی۔

وہ ان دنوں الکرک کی ایک چھوٹی سی سرائے میں مقیم تھا۔ ایک شام اُس نے عمدہ پوشاک زیب تن کی اور قصر شاہی کی راہ لی۔ اس کے انداز واطوار سے دربان محافظوں کو معلوم ہو گیا کہ یہ شخص امراء کے طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ پوچھ گچھ کے بعد اسے شاہی مہمان خانے تک پہنچا دیا گیا۔ کافی دیر تک اسے انتظار کرنا پڑا پھر جا کر حاکم الکرک الملک الناصر داؤد کی آمد ہوئی۔ اس کی آمد پر وہ مؤدب انداز میں کھڑا ہو گیا۔ الملک الناصر داؤد نے اس کے سراپے پر گہری نگاہ ڈالی اور پھر استفہامیہ انداز میں اسے تکنے لگا۔

"حضور کا اقبال بلند ہو۔ میں نے آپ کے قیمتی وقت میں جو نقب لگائی ہے۔ اس کے لئے تہہ دل سے معذرت کا خواستگار ہوں۔ میرا نام غازی عبداللہ شافعی ہے اور میں بلادِ مصر کا باسی ہوں۔ ایک خاص امر کے لئے آپ کو تکلیف دینے کی خواہش لئے یہاں آیا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میری خواہش کو رد نہیں فرمائیں گے"۔

"میرا خیال ہے کہ میں تمہاری گفتگو کا مطلب سمجھ نہیں پایا ہوں۔ تم صاف الفاظ میں بیان کرو کہ تمہیں کیا چاہئے......؟"

"حاکم الکرک......! آپ تو سلطانِ باکمال ہیں۔ جو کچھ مجھے چاہئے وہ آپ کی قدرت و دسترس میں ہے، صرف آپ کا قول درکار ہے کہ واقعی مجھے مل جائے گا"۔

"مدعا جانے بغیر میں تمہیں کوئی قول و قرار کیونکر دے سکتا ہوں......؟"

"میں سلطان عالی کو مجبور بھی نہیں کر سکتا اگر قولِ ایفا میسر آجاتا تو میں پر امید ہو جاتا"۔

"مصری امیر......!" الملک الناصر داؤد نرم لہجے میں گویا ہوا۔ "تم بے فکر رہو، ہم حتی الامکان کوشش کریں گے کہ تمہاری ہر جائز بات کو پورا کیا جا سکے تاکہ تم یہاں سے ناخوش نہ جاؤ"۔

"میرے علم میں آیا ہے کہ بلادِ شرقیہ کے سلطان نجم الدین ایوب کو آپ نے کسی قلعہ میں قید کر رکھا ہے۔

مم......مم...... میں اُن سے ایک ملاقات کرنا چاہتا ہوں"۔ غازی عبداللہ شافعی نے ہمت باندھ کر اپنے دل کی بات کہہ ڈالی یہ الگ بات تھی کہ اس کی آواز فرطِ خوف سے لرزتی محسوس ہو رہی تھی۔

"کیا کہا تم نے...... نجم الدین سے......؟" الملک الناصر داؤد اس کی غیر متوقع فرمائش پر چونک اُٹھا۔

غازی عبداللہ شافعی کا سر غیر ارادی طور پر اثبات میں ہل گیا۔ دوسرے لمحے جیسے اسے کچھ ہوش آیا تو وہ متوحش نگاہوں سے سلطان کا چہرہ دیکھنے لگا۔ دوسری طرف الملک الناصر بھی کوئی ایسی بات سننے کے لئے پہلے سے تیار نہیں تھا۔ اس لئے ابھی تک اس کا چہرہ تصویرِ حیرت بنا ہوا تھا۔

"مصری امیر! تم نے مجھے لمحہ بھر کو پریشان کر ڈالا ہے۔ بہر کیف میں یہ جاننا چاہوں گا کہ تمہیں اُس سے کیا کام ہے......؟"

"میں اُن کے ساتھ کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ خصوصاً اُن کے چھوٹے بھائی سیف الدین ابوبکر کے حوالے سے......!"

"کیا کوئی سرکاری پیغام وغیرہ ہے......؟"

"نہیں......نہیں یہ سرکاری معاملہ نہیں بلکہ میری ان سے نجی ملاقات کہی جا سکتی ہے"۔

"اگر میں تمہیں اس امر کی اجازت نہ دوں تو......؟" الملک الناصر قدرے گھورتے ہوئے بولا۔

"مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ ناچیز کے ساتھ ایسا ناروا سلوک نہیں کریں گے"۔

الملک الناصر اس کے اندازِ بیان پر لاشعوری طور پر ہنس پڑا۔ "ٹھیک ہے تم کل صبح یہاں آجانا اور یہاں سے اجازت نامہ وصول کر لینا لیکن یاد رکھو تمہیں صرف ایک ہی ملاقات کی اجازت دی گئی ہے......!"

"میں آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ میرے پاس موزوں الفاظ نہیں، جن سے میں آپ کا شکریہ ادا کر سکوں"۔

"ملاقات کل شام تک مکمل ہو جانا چاہئے۔ کہیں یہ نہ ہو کہ زنداں خانے میں ایک اور باسی کا اضافہ ہو جائے"۔ الملک الناصر کے چہرے پر شگفتگی چھائی ہوئی تھی۔ غازی عبداللہ نے اس کی جانب دیکھا تو زچ سا ہو گیا۔ اُس نے ایک بار پھر شکریہ ادا کیا اور اس سے اجازت لے کر وہاں سے نکل آیا۔ اسے اتنی زیادہ امید نہیں تھی کہ الملک الناصر یوں آسانی کے ساتھ نجم الدین ایوب سے ملاقات کی اجازت پر رضامند ہو جائے گا۔ اس کا دل اپنی پہلی کامیابی پر بے حد مسرور تھا۔ اُس نے نجم الدین ایوب سے بغیر ملے ہی بے شمار امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ وہ بڑی بے تابی سے اگلی صبح کا انتظار کرنے لگا۔



مطیع الدین تیسرے دن کی رات کی تاریکی میں چپکے سے اُٹھا اور خیمے سے نکل کر دبے قدموں اصطبل کی جانب بڑھ گیا۔ اصطبل کے پاس پہنچ کر وہ ٹھٹھک سا گیا، کیونکہ جو اُسے وہاں دکھائی دیا تھا اس کے لئے وہ ذہنی طور پر پہلے سے تیار نہیں تھا۔ وہاں سردار مانجی خان پہلے ہی سے دو افراد کے ساتھ موجود تھا۔ مطیع الدین کے ماتھے پر پریشانی کی شکنیں نمودار ہونے لگیں کیونکہ اس کا ارادہ وہاں سے گھوڑا چرا کر فرار ہونے کا تھا۔ اس نے ان کی گفتگو پر کان لگانے کی کوشش کی تو جو کچھ اس کے کانوں میں پڑا۔ اس سے اُس کی پریشانی جاتی رہی اور چہرے پر خوشگواری کا عالم چھانے لگا۔ وہ لمحہ بھر میں اپنے اگلے قدم کے بارے میں طے کر چکا تھا۔ سردار مانجی خان انہیں کسی خاص مہم پر روانہ کرنے کے لئے وہاں آیا تھا۔ اُسے اب اپنی نئی منصوبہ بندی کے مطابق محض ان کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں سے نکلنا تھا۔ اگر وہ کامیابی کے ساتھ اُن کا تعاقب کرنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ نہ

صرف اس بستی کی حدود سے دور نکل سکتا تھا بلکہ کسی دوسرے مقام پر پہنچ کر اسے سرائے کا پتہ معلوم کرنا آسان دکھائی دیا تھا۔ اس کے ذہن میں سردار مانجی خان کی وہ بات ابھی تک گونج رہی تھی کہ اسے وہاں سے نکل کر لمبی مدت تک پہاڑی علاقوں میں دربدر بھٹکنا پڑے گا۔ اُس کے بیان کے مطابق وہاں اس بستی کے سوا دور دور تک کوئی دوسری انسانی بستی موجود نہیں تھی۔

مطیع الدین کے لئے یہ کڑا امتحان تھا کہ وہ نہ صرف ازقائی قبیلے کی نگاہوں میں آئے بغیر وہاں سے فرار ہو جاتا بلکہ اُسے اپنے آگے سفر کرنے والے دونوں صاحبان کی نگاہوں سے بچنا بھی ضروری تھا۔ وہ کافی دیر تک وہیں دبکا بیٹھا رہا۔ سردار مانجی خان اُن سے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ کافی دیر کے بعد سردار مانجی خان نے انہیں اپنے سامنے روانہ کیا۔ کچھ دور جا کر وہ تاریکی میں گم ہو گئے تو سردار مانجی خان اطمینان سے چلتا ہوا واپس اپنے مکان کی جانب بڑھ گیا۔ مطیع الدین نے اس کے جانے کے کچھ دیر بعد حرکت کی اور دبے قدموں سے چلتا ہوا اصطبل کے پاس پہنچ گیا۔ اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے اصطبل کے چاروں جانب نہایت احتیاط سے جائزہ لیا۔ وہ ہر ممکنہ خطرے کو قبل از وقت اچھی طرح جانچ لینا چاہتا تھا۔ اسے اگر کسی بات کا قلق تھا تو وہ ہتھیار کی عدم موجودگی تھی۔ اگر اس کے پاس تلوار ہوتی تو شاید اس کی ہمت بڑھ جاتی۔ خالی ہاتھوں کے ساتھ وہ اپنا دفاع کرنے سے بھی معذور تھا۔ کافی دیر تک وہ یونہی اصطبل کے گرد و نواح کا جائزہ لینے میں مصروف رہا۔ جب ہر طرح سے تسلی ہو گئی تو اس نے ایک سیاہ گھوڑے کا انتخاب کیا۔ گھوڑے کی باگیں تھام کر اس نے آہستگی کے ساتھ ایک جانب بڑھنا شروع کر دیا۔ وہ پوری طرح چوکنا تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے باگیں تھامے ہوئے تھا تو دوسرے ہاتھ سے مسلسل اس کی گردن سہلا رہا تھا۔ اسے یہ خوف بھی لاحق تھا کہ کہیں گھوڑا اُسے اجنبی جان کر بے وقت ہنہنانے نہ لگے۔ تقدیر اس کے ساتھ تھی۔ وہ خیریت کے ساتھ بستی سے باہر نکل آیا۔ اندھیری رات میں اُسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ البتہ کہیں دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ یہ یقیناً وہی گھڑسوار تھے جو کچھ دیر پہلے وہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ مطیع الدین نے اللہ کا نام لیتے ہوئے گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سواری کی۔ زین کے بغیر کسی گھوڑے پر سفر کرنا اس کے لئے پہلا اور دلچسپ تجربہ تھا۔ گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد مطیع الدین نے ایک بار پھر چاروں جانب نگاہ دوڑائی۔ ہر طرف گہری خاموشی کا قبضہ تھا۔ اس نے دھیرے سے ایڑ لگائی اور اسی سمت میں روانہ ہو گیا جدھر وہ دونوں سوار گئے تھے۔ وہ ٹاپوں کی آواز کے سہارے آگے بڑھ رہا تھا۔ اندھیری رات نے اس کا کام قدرے دشوار کر دیا تھا۔ پھر بھی وہ خدائی مدد کے سہارے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک ایسی نامعلوم منزل کی جانب جس کے بارے میں وہ خود بھی بے خبر اور لاعلم تھا۔



''ہم سب یہ بات جانتے ہیں کہ نجم الدین ایوب بڑا راسخ الایمان اور بااصول شخص ہے۔ اسے کسی قسم کی بے ایمانی پسند نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آج اس حال تک آن پہنچا ہے۔ اُمور جہانبانی میں فہم و فراست کے ساتھ سیاست سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ نجم الدین ایوب میں ایسی صلاحیت مفقود ہے بلکہ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کبھی کبھار اپنی حفاظت کے لئے غلط راہ کو اپنانا ضروری بلکہ مجبوری بن جاتا ہے۔ نجم الدین ایوب اپنی مخصوص تربیت کے باعث سچائی کی خاطر اس سودا پر کبھی آمادہ نہیں ہوتا''۔

بہاء الدین زہیر نے کچھ لمحے توقف کے بعد اپنی بات شروع کی۔ بیبرس اِن کے درمیان بیٹھ تو گیا تھا مگر اُسے ابھی یہ معلوم نہیں ہو پایا تھا کہ آخر اس مجلس کا مرکزی مقصد کیا ہے......؟ اُسے بہاء الدین زہیر کی باتوں سے اختلاف تو نہیں تھا مگر غلط راہ پر چلانے کا مشورہ اسے بھی پسند نہیں آیا۔

''تم کھل کر کہو بہاء الدین......! تمہارے خیال میں وہ کون سا راستہ ہے جس پر چلتے ہوئے ہم اپنے آقا کو اس مصیبت سے نکال پائیں گے''۔ ابوخویلد نے پوچھا۔

''میں اسی راہ کی تو بات کر رہا ہوں۔ اس راہ کا نام ہے دوہرا ردیہ، تصنع اور بدی کا جواب صرف اور صرف بدی......اگر آپ چاہتے ہیں کہ نجم الدین ایوب اپنا اقتدار واپس لینے میں کامیاب ہو جائے اور اس کے حریف اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں تو اُسے اسی راہ کو اپنانا ہوگا۔ یہ موجودہ وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ جو کچھ اس کے دل میں ہے، وہ اس کے برخلاف عمل کرتا دکھائی دے۔ جس کو نیچا دکھانا ہو اس کے ساتھ دشمنی کے ساتھ ساتھ دوستانہ مراسم بھی بنا کر رکھے اور وار اس وقت کرے، جب وہ مکمل طور پر نرغے میں آ چکا ہو۔ دشمن کو آواز دے کر وار کرنے سے تو وہ خبردار ہو جاتا ہے۔ پھر کامیابی اسی کو ہوتی ہے جو عمدہ چالیں چلتا ہے۔ البتہ اگر دشمن کو یہ باور کرایا جائے کہ ہماری جانب سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں تو وہ غافل ہو جائے گا۔ اس کو اپنی لپیٹ میں لینا آسان امر ہوگا''۔

''کیا تم اس بات کی مزید وضاحت کر سکو گے؟'' محفل میں موجود اجنبی شخص اچانک بولا۔

''بالکل......اس کی تازہ مثال حاکم الکرک ہے۔ اس نے نابلس میں حتی الامکان جنگ سے گریز کیا اور یہ باور کرایا کہ وہ جنگ نہیں کرنا چاہتا اگر وہ جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا تو وہ میدان جنگ میں سپاہ کے ساتھ کیوں اُترا تھا؟ وہ جنگ روایتی انداز میں لڑنے کے بجائے عقلی انداز میں لڑنے کا خواہش مند تھا۔ روایتی جنگ میں تو جو طاقتور ہوتا وہ جیت جاتا۔ عقلی جنگ میں طاقت کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور تم لوگوں نے یہ دیکھا کہ اس نے نجم الدین ایوب کو قصر سلطانی سے نکال کر زنداں خانے میں پہنچا دیا۔ یہ ایک سیاسی حربہ ہے۔ اس نے پیچ کی راہ اپناتے ہوئے اور دوہرا ردیہ اختیار کرتے ہوئے اپنا اصل مقصد پا لیا۔ نجم الدین ایوب کو بھی اسی راہ پر چلنے کی اشد ضرورت ہے''۔

''معزز امیر! اگر میرے آقا بھی ایسا ہی عمل اختیار کریں گے تو اُن میں اور اُن کے حریفوں میں کیا فرق باقی رہ جائے گا''۔ بیبرس ناگواری سے بولا۔ اس کا چہرہ خاصا برہم دکھائی دے رہا تھا۔

''اقتدار میں فرق نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اصل اہمیت نیت کی ہے اگر سلطان کی نیت صاف ہے اور وہ ایک ٹیڑھے معاملے کو موزوں طریقے سے سنوارنے میں ناکام رہ جاتا ہے تو یہ امر ضروری ہو جاتا ہے کہ اس ٹیڑھے معاملے کو اسی ترکیب سے حل کیا جائے۔ جس کا وہ متقاضی ہے۔ اس کی مثال امام ابی حنیفہؒ سے دی جا سکتی ہے۔ جب ایک عیسائی مبلغ نے اپنے چند پیچیدہ سوالات سے عالم اسلام کے ذہین و فطین علماء و اسلاف کو پریشان کر ڈالا تو انہوں نے آگے بڑھ کر اُسی کے انداز میں اسے لاجواب کرتے ہوئے دشمنان اسلام کا منہ ہمیشہ کے لئے بند کر ڈالا تھا''۔

بیبرس اس کی بات سن کر خاموش تو ہو گیا تھا مگر اس کا دل بہاء الدین زہیر کی باتوں سے مطمئن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ابوخویلد نے یہ بات سختی سے محسوس کی تھی۔

''برخوردار......!'' ابوخویلد نے نرم لہجے میں بیبرس کو مخاطب کیا۔ ''میں کافی دیر سے دیکھ رہا ہوں کہ تم جذبات کی رو میں بہہ کر خود پر قابو نہیں رکھ پا رہے اور ہمارے خلوص پر پے در پے بدگمانی کا مظاہرہ کر رہے ہو۔ یہ صحیح طرز فکر نہیں ہے۔ تمہیں یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہم سب اپنے آقا سے محبت کرنے والے لوگ ہیں اور آج اگر یہ صعوبت زدہ زندگی گزار رہے ہیں تو یہ بھی انہی کی بدولت ہے۔ یہاں مل بیٹھ کر مشورہ کرنے کا مقصد صرف یہی ہے کہ کوئی ایسی راہ نکالی جائے کہ آقا واپس مصر پہنچ جائیں اور وہاں مدد حاصل کرتے ہوئے بلاد شرقیہ کی

حکمرانی پر دوبارہ فائز ہو سکیں۔ ہم یہ بات بھی جانتے ہیں کہ مصر میں ہمارے کئی حریف موجود ہیں۔ ان سے نپٹنا اور عساکر مصر کی معاونت حاصل کرنا کافی دشوار کام ہے۔ ہمیں کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکالنی ہے کہ جس پر آقا کی دل آزاری بھی نہ ہو اور کام بھی پایہ تکمیل کو پہنچ جائے اگر ہم اپنی منشاء ان کے سامنے کھلے الفاظ میں بیان کر دیں تو یقین کرو کہ وہ کبھی کسی ایسے امر کی اجازت نہیں دیں گے۔ ہمارا اولین مقصد یہی ہے کہ ان کی مدد غیر محسوس طریقے سے کی جائے''۔

''میں تہہ دل سے معذرت چاہتا ہوں''۔ ہبرس کے لہجے میں خجالت و ندامت عیاں تھی۔ ''میں نے آپ سب لوگوں کی باتوں کو غلط آئینے میں دیکھا۔ میں کچھ لمحوں کے لئے یہ بھول گیا تھا کہ آپ لوگ میرے آقا کے محسن ہیں۔ بہر حال ایسے ہر امر میں آپ لوگ ہبرس کو سب سے اوّل پائیں گے''۔

''شکر ہے تمہیں سمجھانے میں ہمارا زیادہ وقت نہیں لگا''۔ دوسرا اجنبی ہنستا ہوا بولا۔

''مذاق چھوڑو کام کی بات کرو۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ہمیں کسی طریقے سے یہاں سے نکلنا ہوگا۔ میں اس بارے میں الملک الناصر سے بات کروں گا کہ وہ کم از کم مجھے نابلس واپس جانے کی اجازت دیدے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ مجھے انکار نہیں کر سکے گا۔ وہاں سے میں ایسے لوگوں تک رابطہ کروں گا جو نجم الدین ایوب کے حامی ہوں۔ ان کی اکثریت ہی ہمارا مقصد پورا کر سکتی ہے''۔

''یہ تو کافی وقت طلب کام ہوگا''۔

''ظاہر ہے کچھ وقت تو لگے گا''۔

''کوئی اور راہ نکالنا ہوگی۔ ہبرس تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے......؟'' ابوخویلد نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے اس بارے میں پہلے کبھی کچھ سوچا نہیں۔ فوری طور پر میں کیا رائے دے سکتا ہوں اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس مجلس کو پھر کسی روز پر اٹھا رکھیں۔ اس اثناء میں کوئی راہ نکال لوں گا''۔

کچھ دیر تک ان میں مزید گفت و شنید جاری رہی۔ پھر اس مجلس کو برخاست کر دیا گیا۔



دوسرے روز پہلے ہی پہر غازی عبداللہ شافعی اعلیٰ پوشاک میں ملبوس قصر شاہی جا پہنچا اور وہاں سے باآسانی اجازت نامہ حاصل کر کے ایک محافظ کی رہنمائی میں قلعہ الکرک کے زنداں خانے چلا آیا۔ ضروری مراحل نبٹانے کے بعد اُسے سیدھا نجم الدین ایوب کے پاس پہنچا دیا گیا تھا۔ نجم الدین ایوب کو اس ملاقات کی اطلاع کچھ ہی دیر پہلے دی گئی تھی۔ مصری امیر کی آمد کی اطلاع نے زنداں خانے کے سب مقیموں کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نجم الدین ایوب کے گرد تمام وفادار اور مخلص رفقاء موجود تھے۔ نجم الدین ایوب کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ دھیما سا مسکرایا۔ وہ اسے پہلی نگاہ میں ہی پہچان گیا تھا۔

''غازی عبداللہ......! کہو کیسے ہو؟ آج ہماری یاد کیسے آگئی''۔

''میں کل ہی الکرک پہنچا ہوں۔ مجھے جب یہ معلوم پڑا کہ آپ اس حال میں ہیں تو خیریت طلب کرنے چلا آیا۔ مجھے آپ کی خستہ حالی دیکھ کر بے حد افسوس ہو رہا ہے''۔

''اس بات کو چھوڑو......!'' نجم الدین گہرا سانس لے کر بولا۔ ''یہ سب تو تقدیر کے کھیل ہیں۔ وہ جسے چاہے عزت دے، جسے چاہے ذلت دے''۔

''اسے قدرت کے کھیل مت کہیئے......!'' غازی عبداللہ تیزی سے بولا۔ ''اپنوں کا ذ سازیادہ موزوں

لفظ ہے''۔

''تم چاہے جو بھی کہہ لو''۔

''آپ نہیں جانتے کہ آپ کو اس حال میں پہنچانے کا ذمہ دار کون ہے......؟ لیکن میں اسے بخوبی پہچانتا ہوں۔ دمشق کی بغاوت، عمادالدین اسماعیل کا اچانک حملہ اور الملک الناصر کا آپ کو یوں محصور کر لینا۔ کیا آپ کو یہ سب باتیں ایک ہی کڑی کا سلسلہ نہیں لگتیں''۔

''کیا مطلب......؟ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''ان سب باتوں کا ذمہ دار ایک شخص ہے جس نے آپ کے بھائی کو ورغلایا اور اسے اس بات پر اُکسایا کہ وہ اپنے چچا سے مدد حاصل کر کے آپ کو اس حال تک پہنچا دے''۔

''تم جو بھی کہنا چاہتے ہو......؟ کھل کر کہو''۔

''اس گھناؤنی سازش کا مرتکب مصری امیر جمال الدین الراحی ہے۔ جب آپ نے اس کے کسی کام میں مداخلت کی تھی تو اس نے اسی وقت بدلہ لینے کی ٹھان لی تھی۔ اس نے آپ کے خلاف آپ کے بھائی کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے حاکم دمشق کے ساتھ بھی خط و کتابت کی اور اسے بغاوت پر آمادہ کیا۔ اس کی بغاوت کی اطلاع پاتے ہی آپ مصر سے نکل گئے تو کافی اطمینان ہو گیا، لیکن جب آپ نے اپنی فہم و فراست سے بلاد شرقیہ کا نظام سنبھال لیا تو اس نے سلطان سیف الدین ابوبکر کو یہ باور کرایا کہ اس کی اطلاعات کے مطابق جلد ہی آپ بلادِ مصر کا رُخ کرنے والے ہیں۔ آپ کا بھائی یہ سمجھا کہ آپ اس سے تخت چھیننے کی خواہش رکھتے ہیں تو امیر صدر الدین کے مشورے پر اس نے عمادالدین اسماعیل سے بلاد شرقیہ پر قابض ہو کر آپ کو حکومت سے محروم کرنے کی استدعا کی۔ دوسری جانب اس نے الملک الناصر کے سامنے اپنے حق کا رونا روتے ہوئے یہ درخواست کی کہ وہ آپ کو بلادِ مصر کی جانب بڑھنے سے روکے رکھے۔ جمال الدین الراحی نے صرف آپ ہی کو اپنے گھناؤنے مقصد کا نشانہ نہیں بنایا۔ بلکہ کئی دوسرے امراء بھی اس کا شکار بن چکے ہیں۔ اُن میں سے ایک شکار میں بھی ہوں''۔

''تم جانتے ہو کہ تم کس کے سامنے کیا کہہ رہے ہو......؟ تم مجھے میرے بھائی کے خلاف حتی الامکان بھڑکانے کی کوشش کر رہے ہو۔ تمہارا چہرہ اس بات کا غماز ہے کہ اس سارے معاملے کے پیچھے صرف تمہارا انتقامی جذبہ کارفرما ہے''۔ نجم الدین ایوب غصے کے عالم میں بولا۔

''آپ کا غصہ بجا ہے۔ میں یہ سچائی کھلے لفظوں تسلیم کرتا ہوں کہ آپ کو آگاہ کرنے کے پیچھے میرا انتقامی جذبہ بھی موجود ہے مگر یہ سب سچ ہے جو میں نے آپ کے سامنے کھلی کتاب کی طرح رکھ دیا ہے''۔

''میں تمہاری اس من گھڑت کہانی کو تسلیم نہیں کرتا......!'' نجم الدین ایوب دوٹوک انداز میں بولا۔

''یہ آپ کی منشاء ہے مگر آنے والا وقت اس کڑوے سچ کو ایک دن کھول کر آپ کے سامنے رکھ دے گا''۔ غازی عبداللہ شافعی لاپروائی سے بولا۔

''مجھے تمہاری باتوں میں سے کسی خطرے کی بو محسوس ہو رہی ہے۔ تم کس جانب اشارہ کرنا چاہتے ہو......؟'' نجم الدین ایوب تذبذب میں پڑ گیا۔

''آپ کا خدشہ بالکل صحیح ہے۔ میں بھی یہی باور کرانا چاہ رہا ہوں کہ جمال الدین الراحی بلادِ مصر پر خود قابض ہونے کے خواب دیکھ رہا ہے''۔

''یہ ناممکن ہے......! اس میں ابھی اتنی جرأت پیدا نہیں ہوئی کہ وہ اتنا بڑا قدم اُٹھا سکے۔ سیف الدین

کے مشیر اور وفادار ابھی زندہ ہیں۔ وہ اس کے ناپاک ارادے کو ہرگز پورا نہیں ہونے دیں گے''۔

''ان میں سے کئی سرزمین مصر سے نکال دیئے گئے ہیں اور بعض کی وفاداری خریدی جا چکی ہے''۔ غازی عبداللہ شافعی کے مستحکم لہجے میں بلا کی کاٹ تھی۔ وہاں موجود سب لوگ ان حیرت انگیز انکشافات پر انگشت بدنداں تھے۔

''تمہارے لہجے میں سچائی کے ساتھ ساتھ عیاری ٹپک رہی ہے اور تمہارا چہرہ بھی معصومیت کی عکاسی کر رہا ہے۔ میں تمہارے اس ملے جلے انداز میں تمہاری بات کا اعتبار کیسے کر سکتا ہوں.....

''میں یہاں اپنی سچائی ثابت کرنے نہیں آیا ہوں بلکہ قبل از وقت اس خطرے سے آگاہ کرنے آیا ہوں جو جلد ہی بلاد مصر پر چھانے والا ہے اور پھر اس بدطینت شخص کی حریصانہ نگاہیں بلاد شرقیہ کی جانب بڑھیں گی۔ وہ بلا کا عیار و چالاک شخص ہے اس کے بارے میں آپ کا اندازہ نامکمل ہے اگر اسے بروقت نہ روکا گیا تو وہ ایوبی خاندان کو ان علاقوں سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دے گا''۔ غازی عبداللہ شافعی کا لہجہ بے حد سرد تھا۔ نجم الدین ایوب اس کی بات سن کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ قدرے توقف کے بعد اس نے سر اُٹھا کر پوچھا۔

''ممکن ہے تم جو بیان کر رہے ہو وہ سچ ہو مگر میں تو یہاں زنداں خانے میں قید ہوں۔ میں بھلا اب کیا کر سکتا ہوں..... ؟''

''مجھے صرف آپ کی رضامندی کی ضرورت ہے۔ باقی کی فکر کرنا میرا سر درد ہوگا۔ آپ کو یہاں سے نکالنا اور مصر تک پہنچانا میری ذمہ داری ہے''۔

''اس کے پیچھے یقیناً تمہارا کوئی مفاد ہوگا۔ تم شاید یہ نہیں جانتے کہ میں کسی بھی غلط کام کے لئے حامی نہیں بھرتا''۔

''اگر غلط کام کروانا ہی مقصود ہوتا تو میں مقید و مجبور سلطان کے پاس نہ آتا بلکہ کسی دوسرے برسراقتدار ایوبی سلطان کی مدد حاصل کرتا''۔ وہ زہرخند لہجے میں بولا۔

''تم بولتے رہو میں سن رہا ہوں''۔

''آپ کو بلاد مصر کی حکومت سے اپنے بھائی سیف الدین ابوبکر کو معزول کر کے اقتدار کا تخت خود سنبھالنا ہوگا''۔ اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

''یہ ناممکن ہے.....! میں اپنے باپ سے کئے ہوئے وعدے کو توڑ نہیں سکتا۔ اُس نے مجھے اس کا اتابک صرف اسی لئے مقرر کیا تھا کہ میں نگرانی کے ساتھ ساتھ اس کی حفاظت بھی کرتا رہوں''۔

''یہ سب جانتے ہوئے بھی.....! یہ سارا کیا دھرا آپ کے اُسی بھائی کا ہے.....؟'' غازی عبداللہ شافعی کے لہجے میں حیرت عود کر آئی۔

''تمہارا الزام ابھی ثابت نہیں ہوا کہ وہ ہی ذمہ دار ہے۔ یاد رکھو کہ اگر میں کبھی مصر پہنچ گیا تو سب سے پہلے میں اسی بات کی چھان بین کروں گا۔ اس کے بعد یہ معاملہ قاضی کے پاس پیش کیا جائے گا۔ یاد رکھو! اگر تم وہاں اپنا یہ الزام ثابت نہ کر پائے تو میں تمہیں ایسی عبرت ناک سزا دلواؤں گا کہ تمہاری آنے والی نسلیں ہمیشہ یاد رکھیں گی''۔

نجم الدین ایوب کے لہجے میں شیر کی سی گرج تھی۔ غازی عبداللہ شافعی کو بھی خوف کی شدید لہر اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''میں اب اجازت چاہوں گا''۔ وہ بے دلی سے اُٹھتا ہوا بولا۔ اس کے لہجے سے عیاں تھا کہ اسے مایوسی

اُٹھانا پڑی ہے۔ اُسے نجم الدین ایوب کی آخری بات ناگوار گزری تھی۔ نجم الدین ایوب نے بھی لاپروائی سے سر ہلا دیا تھا۔ وہ بوجھل قدموں سے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ نجم الدین ایوب نے اس کے باہر نکلتے ہی مسہری سے ٹیک لگالی تھی۔ اِسے اپنے بھائی سے اس قسم کی گھٹیا حرکت کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر یہی سچ نکلا تو..... اچانک درد کی تیز لہر اُسے اپنے سینے میں اُٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ابوخویلد شاید اس کی حالت بھانپ گیا تھا۔ تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے جسم کو دبانے لگا۔



برقائی خان اپنے گھوڑوں کے ساتھ تھکا ماندہ ازقائی قبیلے کی بستی میں داخل ہوا۔ وہ اس وقت میلے سے زرد رنگ کے لباس میں ملبوس تھا جو کہ شاہی لباس سمجھا جاتا تھا۔ کئی دن ہوئے، اُسے نہانے دھونے کی مہلت نہ مل سکی۔ سرد علاقوں میں یوں بھی بلاناغہ نہانے کی روایت موجود نہیں تھی۔ قبیلے کے لوگوں میں اس کی آمد سے سراسیمگی سی پھیلنے لگی۔ ازقائی قبیلے میں جب بھی کوئی شاہی فرد وارد ہوتا تھا۔ اُسے مصائب کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ برقائی خان کے لباس سے ہی انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ایک اور شاہی ہرکارے کی آمد ہو چکی ہے، جانے اب کونسی آفت ٹوٹے۔ سردار مانجی خان کو شاہی آدمی کی آمد کی خبر پل بھر میں پہنچا دی گئی۔ شاہی آدمی کا سن کر اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے خود پر قابو پالیا۔ وہ خود اُٹھ کر اس کے استقبال کے لئے آگے بڑھا۔ جونہی اس کی نگاہ برقائی خان پر پڑی تو حیرت و تعجب سے اُس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ اُسے پہلی نظر میں ہی پہچان گیا تھا۔ کئی بار سرائے میں وہ اسے دیکھ چکا تھا۔

''چھوٹے قاآن!'' وہ آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ ''آپ کی اچانک آمد پر جہاں ازقائی قبیلہ بے حد متحیر ہے، وہیں وہ اپنی اس عزت افزائی پر بھی نازاں ہے''۔ سردار کو جھکے دیکھ کر قبیلے کے دوسرے لوگ بھی گھٹنوں کے بل جھکتے چلے گئے۔ برقائی خان نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ اس قسم کے تکلفات و رسومات کا قائل نہیں تھا۔ وہ اپنے گھوڑے سے نیچے اُترا۔ دونوں گھوڑوں کی باگیں اس کے ایک ہاتھ میں تھی۔ سردار مانجی خان نے ایک شخص کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر باگیں برقائی خان کے ہاتھ سے لے لیں اور گھوڑے کو ایک جانب لے گیا۔ برقائی خان سردار مانجی خان کی رہنمائی میں اس کے پختہ مکان کی جانب بڑھ گیا۔ نشستیں سنبھالنے کے فوراً بعد برقائی خان کی خوب خاطر مدارات کی گئی۔ سردار مانجی خان نے تواضع کے بعد شراب کا دور شروع کرنا چاہا مگر برقائی خان نے بڑی سختی سے منع کر دیا۔ سردار مانجی خان اس ممانعت پر دنگ رہ گیا۔ کچھ لمحے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہی۔ برقائی خان نے آتے ہی یہ بات محسوس کر لی تھی کہ وہ لوگ اس کی آمد پر گھبرائے ہوئے ہیں۔ اسی لئے اس نے فوراً اپنی بات شروع نہیں کی تھی۔ اب جبکہ ان کا خوف و ہراس جاتا رہا تو وہ اپنے مقصد کی جانب متوجہ ہوا۔

''مانجی خان.....!'' برقائی خان ٹیک لگاتے بولا۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم لوگ قاآن اعظم کے لئے ہلالی تلواریں کاٹا کرتے تھے اور ان کے ٹکڑوں کو ڈھال کر نئی چپٹی تلواریں بنایا کرتے تھے۔ کیا یہ سچ ہے..... ؟''

''چھوٹے قاآن.....! آپ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ ماضی کا ایک ایک پل اس بات کا عینی شاہد ہے کہ ازقائی قبیلے نے مسلمانوں کے خلاف اپنا کردار پوری دیانت داری سے نبھایا ہے''۔

''میں یہی پوچھنا چاہ رہا تھا۔ تم لوگ ہلالی تلواروں کو کاٹنے کے لئے یقیناً بڑی قینچی کا استعمال کرتے ہو گے؟''

''ظاہر ہے، تلواریں کاٹنے کے لئے بڑی قینچی ایک ضروری اوزار ہے''۔

''اور اُس سے فولادی زنجیریں بھی تو کاٹی جا سکتی ہیں......!'' برقائی کا لہجہ قدرے گھمبیر ہوگیا۔

سردار مانجی خان کا چہرہ پل بھر کو فق پڑ گیا تھا۔ ''ہ......ہ......ہاں کاٹی تو جا سکتی ہیں......؟''

''تو پھر تم یہ بتانے میں یقیناً تردد نہیں کرو گے کہ تم نے اُسے کہاں چھپا رکھا ہے......؟''

''کک......کک......کسے......؟''

''تمہارا چہرہ جھوٹ چھپانے کی سکت نہیں رکھتا مانجی خان......! بہتر ہے جو میں پوچھ رہا ہوں وہ صاف صاف بتا دو''۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ پایا۔ آپ کس کے بارے میں بات کر رہے ہیں''۔ مانجی خان کے چہرے پر گہرا اضطراب پھیل چکا تھا۔

''میں اُسی قیدی کی بات کر رہا ہوں جسے تم سرخوں کی قید سے چھڑا لائے ہو''۔

''آپ پورے قبیلے کی تلاشی لے سکتے ہیں۔ یہاں ایسا کوئی قیدی موجود نہیں ہے''۔

''دیکھو مانجی خان......! میں کون ہوں؟ یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ میرے سامنے جھوٹ بول کر تم اپنی جان خطرے میں ڈال رہے ہو۔ میرا خنجر تمہیں لمحہ بھر میں موت کی نیند سلا دے گا''۔ برقائی خان کی آنکھیں یکا یک شعلے اگلنے لگیں۔

''وہ......تین دن پہلے یہاں سے فرار ہوگیا ہے''۔ مانجی خان کی آواز خوف سے لرز رہی تھی۔ وہ اس کے سامنے خود کو مضبوط نہیں رکھ پایا ایک ہی لمحے میں اس کی ساری ہمت جواب دے گئی تھی۔

''تم صریحاً جھوٹ بول رہے ہو''۔

''خدائے جاودانی کی قسم......! میں بالکل سچ بیان کر رہا ہوں''۔

''مگر یہ کیسے ممکن ہے......؟'' برقائی خان اس کے لہجے پر پریشان سا ہوگیا۔

''گذشتہ ہفتے اس نے یہاں سے جانے کی خواہش ضرور کی تھی مگر میں نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا۔ شاید اسی لئے وہ تین دن پہلے رات کے اندھیرے میں ہمارا ایک گھوڑا چرا کر فرار ہوگیا''۔

''تم نے اسے یہاں کیوں روکا ہوا تھا......؟'' برقائی خان کا لہجہ مزید زہریلا ہوگیا۔

''میں مجبور تھا۔ جس نے اس کی رہائی کی قیمت چکائی تھی اس کی منشاء یہی تھی کہ خطرہ دور ہونے پر ہی اسے سرائے پہنچایا جایا جائے''۔

''قیمت چکائی تھی......؟ مگر کس نے......؟'' حیران ہونے کی باری اب برقائی خان کی تھی۔

''ایک لڑکی نے......وہ کچھ عرصہ پہلے یہاں تنہا آئی اور اس نے قیدی کی رہائی کے بارے میں میرے ساتھ سودا طے کیا۔ اس نے رقم کی تھیلی مجھے دیتے ہوئے یہ ہدایت کی تھی''۔

''لڑکی......! کون تھی وہ؟'' برقائی خان اچنبھے میں پڑ گیا۔

''یہ تو میں نہیں جانتا۔ البتہ وہ منگول تھی''۔

''تم نے اس کا نام بھی نہیں پوچھا......؟''

''نام......ہاں یاد آیا اس نے اپنا نام شاید گل بتایا تھا۔ وہ بھی میں بڑے اصرار کے بعد جان پایا تھا''۔

''گل......!'' برقائی خان سوچ میں پڑ گیا۔ اس کا ذہن تو نائی خان کی بیٹی کی جانب مبذول ہوگیا۔ اس کا نام بھی تو گل ہی تھا۔ مگر اس کا ازقائی قبیلے کے ساتھ کیا واسطہ......؟ وہ خاموش الجھا بیٹھا رہا جبکہ مانجی خان کا جسم ابھی تک کانپ رہا تھا۔ قیدی کی حیثیت کوئی اعلیٰ تھی یا پھر اس لڑکی کا تعلق شاہی افراد سے تھا۔ اس نے بظاہر

یہ جھوٹ بولا تھا کہ اسے قیدی روکنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ اب اس کی یہ حرکت کیا رنگ لائے گی......؟ وہ اسی فکر میں گھلا جا رہا تھا۔ برقائی خان نے وہاں وقت برباد کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اسی لمحے وہاں سے روانگی اختیار کی۔ وہ رخصت ہوتے ہوئے سردار مانجی خان کو سختی سے خبردار کر گیا تھا کہ اگر اس کی بات غلط ثابت ہوئی تو وہ اپنی موت یقینی سمجھے۔ سردار مانجی خان اس کی دھمکی پر دہل کر رہ گیا۔ اب کیا ہونے والا تھا؟ اس بارے میں وہ بالکل لاعلم تھا۔



جمال الدین الراحی کی خوش بختی کا ستارہ ان دنوں پورے عروج پر تھا۔ وہ ایک ایک کر کے کئی سلطانی وفادار امراء کو بھرے دربار میں ذلیل و رسواء کر چکا تھا۔ شرفاء و امراء کا بڑا طبقہ اِس سے لگاتار خائف رہنے لگا تھا۔ دربار میں موجود شرفاء و امراء بھی اُس کی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور تھے۔ انہیں خدشہ لاحق تھا کہ کہیں کسی دن ان کی شامت اعمال نہ آ جائے۔ سلطان سیف الدین ابوبکر دن بہ دن جمال الدین الراحی کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو بڑی شدت و بے چینی سے محسوس کر رہا تھا مگر یہ نوعمر سلطان بھی اس کے جارحانہ انداز کے سامنے کوئی مدافعت نہ کر پایا۔ اُسے یہ خواہش ضرور تھی کہ کوئی اس کے خلاف ٹھوس معاملہ پیش کرے تاکہ وہ اِسے بھی ہمیشہ کے لئے ملک بدر کر دے مگر ایسی نوبت نہیں آ سکی۔ جمال الدین الراحی نے صرف اپنی انہی کارستانیوں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے 9 رمضان المبارک 637ھ میں اپنے گھر پر ایک خفیہ مجلس کا انعقاد کیا۔ جس میں قاہرہ کے کئی امراء و شرفاء نے شرکت کی۔ اس نے ان کے سامنے اپنا نیا منصوبہ رکھ دیا کہ وہ نوعمر سلطان کو معزول کر کے کسی مضبوط شخص کو سلطان بنانے کا خواہش مند ہے جو کہ بلادِ مصر پر مکمل اختیار رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ امراء و شرفاء اس کی بات سن کر لمحہ بھر کے لئے سناٹے میں آ گئے تھے مگر اس کی چکنی چپڑی باتوں اور بلاد مصر کو بیرونی حاکموں سے خطرات کے پیش نظر وہ اس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے۔ ایک ہفتے بعد رمضان المبارک کے دوسرے عشرے میں جمال الدین الراحی اپنی عیارانہ چالوں سے سالارِ عساکر وجیہ الدین الباقری کو بھی اپنے دامِ فریب میں لانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کی اس بدطینت حکمت عملی کے بارے میں کسی کو کانوں کان بھنک نہ پڑ سکی۔ سلطان سیف الدین ابوبکر اپنی موج مستی میں مگن رہتا تھا۔ کبھی کبھار وہ امراء کے اصرار پر دربار میں قدم ڈال دیا کرتا۔ امراء جہاں جمال الدین الراحی سے خائف تھے، وہیں وہ کمزور اور ناسمجھ سلطان سے بھی ترساں تھے۔ وہ جمال الدین کا ساتھ محض اس لئے دینے پر آمادہ ہو گئے تھے کہ کم از کم ایک کمزور سلطان سے تو گلو خلاصی ہوگی۔ انہیں اس بات کی خبر نہیں تھی کہ جمال الدین الراحی انہیں سیڑھی بنا کر عنانِ سلطنت پر خود قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ رمضان المبارک کے آخری عشرے میں نوعمر سلطان نے اعتکاف میں بیٹھنے کی خواہش ظاہر کی۔ خوشامدی امراء نے اس کے اقدام کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ اعتکاف میں ہی سلطان کے وفادار امیر احمد العنابی نے جمال الدین الراحی کی سازش کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ سلطان کو جب اس کے خوفناک عزائم کا علم ہوا تو وہ دہل کر رہ گیا۔ اس نے اعتکاف میں ہی سالار وجیہ الدین الباقری کو طلب کیا اور فوری طور پر جمال الدین الراحی کی گرفتاری کا مژدہ سنا دیا۔ وجیہ الدین الباقری پہلے ہی سلطان کے خلاف سازش کا حصہ بن چکا تھا اور اس نے جمال الدین الراحی سے بڑی رقم اینٹھ لی تھی۔ اس نے شاہی حکم کی فوری تعمیل کرانے کی یقین دہانی کرتے ہوئے وہاں سے اجازت لی اور سیدھا جمال الدین الراحی کی خدمت میں پیش ہو کر سلطان کی باخبری اور حکم کی بابت سب کچھ بتا دیا۔ جمال الدین الراحی نے مخبری کرنے والے کے بارے میں پتہ لگانا چاہا مگر وہ اس معاملے میں ناکام رہا۔ اس نے سوچ و بچار کے بعد یہ حکمت عملی طے

کی کہ اسے گرفتاری دے دینا چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلطان وجیہہ الدین الباقری سے بدگمان ہو جائے اور اسے معزول کر کے کوئی دوسرا سالار مقرر کر دیا جائے۔

اس نے دوسرے دن وجیہہ الدین الباقری کو بلا کر تمام حکمت عملی سمجھائی اور خود کو اس کے ہاتھوں گرفتار کرا دیا۔ اس کی گرفتاری سے امراء و شرفاء میں ہراس پھیل گیا۔ جمال الدین الراحی سے تمام امراء نے فرداً فرداً کوتوالی میں ملاقات کی۔ جمال الدین الراحی نے انہیں صاف لفظوں میں یہ کہہ دیا کہ اگر انہوں نے اس کی منصوبہ بندی کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچایا تو وہ ان سب کے نام سلطان کے سامنے بیان کر دے گا۔ جان و ناموس کے خوف کی خاطر وہ جمال الدین الراحی کی بات ماننے پر مجبور ہو گئے۔ بالآخر 27 رمضان 637ھ ہفتے کی رات کو سپاہ کے ایک دستے کے ساتھ نوعمر سلطان سیف الدین ابوبکر کو اعتکاف کی حالت میں حراست میں لے لیا گیا اور اسے راتوں رات قاہرہ کے باہر قلعے میں پہنچا دیا گیا۔ نوعمر سلطان کو زنداں خانے میں ڈال کر اگلی صبح اس پر الزامات کی بھرمار کرتے ہوئے اس کی معزولی کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ اعلان سالار عساکر وجیہہ الدین الباقری نے کیا تھا۔ اسی شام جمال الدین الراحی کو رہائی دی گئی اور عید الفطر سے ایک روز قبل دربار کا انعقاد کیا گیا۔ امراء و شرفاء کی قرارداد کے مطابق ایک ماہ کے اندر اندر نئے سلطان کا انتخاب عمل میں لانا طے پایا۔ اس کے لئے امراء کی ایک جماعت مقرر کی گئی جو کہ یہ بات طے کرے گی کہ نیا سلطان کون ہوگا؟ جو لوگ سلطان بننے کے خواہش مند تھے انہیں ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ اپنے نام ایک ہفتہ کے اندر اندر اس جماعت کو دے دیں۔ تاکہ وہ اُن کے بارے میں اپنی سفارشات مرتب کر سکے۔ جمال الدین الراحی نے ایک لمحہ توقف نہیں کیا۔ سب سے پہلے اُسی نے اپنا نام حاکم بلادِ مصر کے لئے پیش کیا تھا۔



بیبرس غیر محسوس انداز میں غازی عبداللہ شافعی کے پیچھے وہاں سے نکل آیا تھا۔ زندان خانے کے صدر دروازے پر اُس نے اسے جا لیا۔

''ٹھہرو.....! میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں!'' بیبرس نے اسے آواز دی۔ غازی عبداللہ نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کے قدم غیر ارادی طور رُک گئے تھے۔

''تم کون ہو......؟ میں نے تمہیں پہلے کبھی دیکھا نہیں''۔ اس کے لہجے میں تحیر عیاں تھا۔

''میں نجم الدین ایوب کا محافظ غلام ہوں۔ میں تم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں''۔

''تمہارے آقا تو میری بات پر یقین نہیں کر رہے''۔ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

''تمہیں شاید نہیں معلوم کہ وہ پے در پے صدموں سے بے حد شکستہ ہیں۔ اوپر سے بیماری نے انہیں قدرے چڑچڑا بنا دیا ہے۔ وہ جلد کسی بات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے ہیں۔ بہرکیف اس بات کو چھوڑو۔ میں انہیں سمجھا بجھا لوں گا کہ تم ان کے دوست ہو۔ تم مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ تم میرے آقا کے لئے کیا کر سکتے ہو......؟ میرا اشارہ تمہاری اُسی بات کی جانب ہے''۔

''اگر نجم الدین ایوب بلادِ مصر کی حکمرانی پر آمادہ ہو جائے تو میں اس کے لئے راہ ہموار کر سکتا ہوں۔ اس کے لئے مجھے خاصی محنت کرنا پڑے گی، لیکن یہ میرا سر درد ہے''۔

''اس تمام معاملے میں تمہیں کیا غرض ہوگی......؟''

''میں اس کمینہ خصلت شخص جمال الدین الراحی کو تمام زندگی اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتا ہوں۔ وہ میرے در پر کتے کی سی مجبور زندگی گذارے۔ بس میری یہی دلی تمنا ہے۔ ظاہر ہے قانون کے مطابق کسی بھی

آزاد شخص کو زبردستی غلام نہیں بنایا جا سکتا۔ میں سلطان کے سامنے یہی شرط رکھوں گا۔ وہ مجھے اس انتقامی کارروائی کے لئے سرکاری طور پر اجازت دے''۔

غازی عبداللہ شافعی کی آواز فرطِ جوش سے لرز رہی تھی۔ اس کا چہرہ پل بھر میں سرخ ہو چکا تھا۔

''بس صرف یہی یا اور بھی کچھ......؟''

''میرے لئے یہی سب کچھ ہے''۔

''مجھے تمہاری یہ شرط منظور ہے۔ میں نجم الدین ایوب کی جانب سے یہ وعدہ کرتا ہوں اگر تم انہیں بلادِ مصر کی حکمرانی دلانے میں کامیاب ہو گئے تو میں جمال الدین الراحی کو خود تمہاری غلامی میں دوں گا اور اس کی حیثیت ہر لحاظ سے سرکاری و قانونی ہوگی......!'' بیبرس نے مستحکم لہجے میں اس سے وعدہ کیا۔ وہ بیبرس کی بات سن کر ہی سرشار ہو گیا۔ اس کے چہرے پر مسرت و انتقام کے ملے جلے تاثرات دکھائی دینے لگے۔ وہ اس کے ساتھ بڑے جوشیلے انداز میں مصافحہ کرتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گیا۔ بیبرس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک عود کر آئی تھی۔ وہ ایک تیر سے دو شکار کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ایک طرف اُسے ماں جیسی شفیق عورت فاطمہ کو جھانسہ دیئے جانے کا قلق تھا تو دوسری جانب اس کے آقا نجم الدین کو اس برے حال تک پہنچائے جانے کا رنج بھی تھا۔ وہ خود بھی جمال الدین الراحی کو پستی میں گرانے کا خواہش مند تھا۔ وہ اس کے تکبر کے بت کو پاش پاش کر دینا چاہتا تھا۔ شاید وہ وقت اب زیادہ دور نہیں تھا بلکہ قریب آ چکا تھا۔



یکم شوال 637ھ کو عید الفطر کے دن حاکم الکرک الملک الناصر داؤد اپنے تایازاد بھائی نجم الدین ایوب کے پاس آیا۔ نجم الدین ایوب نے نماز عید اپنے اتباع اور رفقاء کے ہمراہ زندان خانے کے ایک بڑے کمرے میں ادا کی تھی۔ عید کے دن اس نے سادہ سفید لباس زیب تن کیا تھا۔ الملک الناصر نے اُسے پیش کش کی تھی کہ وہ الکرک کی عیدگاہ میں نماز عید ادا کر سکتا ہے مگر نجم الدین ایوب کو غلامی کے عالم میں عیدگاہ جانے کی تمنا نہیں تھی۔ اس نے زندان خانے کو ہی ترجیح دی۔

الملک الناصر نے آگے بڑھ کر نجم الدین ایوب سے عید ملنا چاہی تو اس نے بڑی سرد مہری سے انکار کر دیا۔ الملک الناصر نے بڑی کوشش کی کہ عید کے پُر مبارک موقعہ پر ایسی بدمزگی پیدا نہ ہو مگر نجم الدین ایوب نے اس امر کو اپنی توہین سمجھتے ہوئے سختی سے رد کر دیا۔

''عم زاد!'' الملک الناصر سنجیدگی سے اس کے سامنے فرش پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے بے حد ناراض ہو، بخدا...... میری کبھی ایسی نیت نہیں رہی کہ میں تمہیں اپنی حراست میں رکھوں اور تمہاری سلطنت بزورِ طاقت چھین لوں۔ میں الکرک کے نظام کو ہی اچھی طرح نبٹا لوں۔ میرے لئے یہی کافی ہوگا۔ تم اُربلس کی جانب نہ بڑھتے تو شاید میں بھی مدمقابل نہ آتا۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ تم شاید الکرک پر قبضہ کرنے کے خواہش مند ہو''۔

''اب جبکہ سب کچھ میرے ہاتھوں سے نکل چکا ہے تو تم میرے پاس کیا کرنے آئے ہو؟'' نجم الدین ایوب کا تند لہجہ کڑواہٹ سے بھرپور تھا۔

''یقین کرو کہ میں نے جو کچھ کیا ہے، وہ کسی کی مدد کی خاطر تھا۔ تمہارے بھائی نے میرے آگے فریاد کی تھی کہ تم اس سے اس کی سلطنت ہتھیانا چاہتے ہو۔ میں نے صرف اسی لئے آگے بڑھ کر مداخلت کی تھی۔ عماد الدین اسماعیل کا تعلق اس کے ساتھ ہے، میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں''۔ الملک الناصر سنجیدگی کے عالم میں بولا۔

’’میرے بھائی نے......؟‘‘ نجم الدین ایوب کو اپنی سانس رُکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ ’’مگر میں نے تو ایسی بات کبھی خواب میں بھی سوچی نہیں۔ یا اللہ......! یہ سب مجھے سنوانے سے پہلے تو نے مجھے اُٹھا کیوں نہیں لیا‘‘۔ نجم الدین ایوب تلخ حقیقت جاننے پر آزردہ دل ہو گیا۔

’’میں بھی اپنے اس فعل پر سخت نادم ہوں، میں زرِ ہمدردی میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ میرا چچازاد ابھی کم سن ہے اور وہ کسی کے بھی فریب میں آ سکتا ہے، یہ تو خدا کا شکر ہے کہ مصری امیر غازی عبداللہ شافعی نے بروقت میری آنکھیں کھول دیں‘‘۔

’’اوہ میں سمجھا......!‘‘ نجم الدین ایوب کو جیسے سینے سے پہاڑ ہٹتا ہوا محسوس ہوا۔ ’’غازی عبداللہ کی چکنی چپڑی باتوں میں تم بھی آ گئے۔ وہ اوّل درجے کا جھوٹا اور مکار شخص ہے۔ وہ اپنے کسی انتقام کے لئے مجھے میرے بھائی کے مقابل لا کھڑا کرنا چاہتا ہے‘‘۔

’’تم کس بھائی کی بات کر رہے ہو......؟ وہ جو مصر کے زنداں خانے میں پڑا ہے‘‘۔ الملک الناصر کا لہجہ نہایت سفاکانہ ہو گیا تھا۔

’’کیا مطلب......؟‘‘ نجم الدین ایوب بےقراری کے عالم میں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ’’تم کیا کہہ رہے ہو......؟‘‘

’’تمہارے بھائی کو اعتکاف کی حالت میں حراست میں لے کر بلادِ مصر کی حاکمیت سے ہمیشہ کے لئے معزول کر دیا گیا ہے‘‘۔ وہ مختصراً بولا۔

’’یہ کبھی نہیں ہو سکتا......!‘‘ نجم الدین ایوب کو جانے کیوں یقین نہیں ہو پا رہا تھا۔

’’میں تمہارے علم میں یہ بھی اضافہ کر دوں کہ یہ سب کارروائی جمال الدین الراحی نامی امیر نے کی ہے اور نئے سلطان کے تقرر کے لئے نام بھی طلب کر لئے گئے ہیں۔ مجھے یہ سب اطلاعات آج ہی صبح ملی ہیں، اور یہ رہا وہ خط جو تمہاری بھائی نے مجھے لکھا تھا‘‘۔ اس نے ایک نامہ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ نجم الدین ایوب کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے اسے زندہ درگور کر دیا گیا ہو۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی سے بےحد محبت کرتا تھا۔ اس کی حکومت چھن جائے یا اسے قید کر دیا جائے۔ یہ اس کی قوتِ برداشت سے باہر تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے اس نامہ کو کھولا اور پڑھتا چلا گیا۔ آخر میں ثبت مہر اسی کے بھائی ہی کی تھی۔ یہ بڑا سخت صدمہ تھا جسے اس نے نہایت تکلیف سے برداشت کیا تھا۔ الملک الناصر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ’’میرے بھائی......! یہی سچ ہے جو ہم دونوں کے لئے نہایت تکلیف کا باعث بن رہا ہے۔ میں اب یہ خواہش کروں گا کہ تم تمام پرانی باتوں اور رنجشوں کو بھلا کر میرے ساتھ شاہی محل میں چلو اور میرے سابقہ سلوک کی تلافی کا ایک موقع مجھے دو‘‘۔ اس کے لہجے میں اپنائیت چھلک رہی تھی۔

نجم الدین ایوب قریباً روتا ہوا اس کے گلے لگ گیا۔ وہ اس کے حسنِ سلوک سے بےحد متاثر ہوا تھا۔ عید الفطر کے دن نجم الدین ایوب اپنے رفقاء و اتباع کی جماعت کے ساتھ شاہی محل چلا آیا۔ اسے اب بلادِ مصر کی حکومت کو نہ صرف ایوبی خاندان میں واپس لانا تھا بلکہ اپنے بھائی کو بھی گھناؤنی سازش سے بچانا تھا۔ یہی دو مقصد تھے جن کی خاطر وہ الملک الناصر کی ہر بات تسلیم کر رہا تھا۔



مطیع الدین کو منگولوں کی سرزمین پر بھٹکتے ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ وہ جن گھڑ سواروں کے تعاقب میں نکلا تھا، انہیں تو اُسی رات میں کھو چکا تھا۔ اُسے اب کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی کہ کس جانب سفر کرنا چاہئے؟

اس نے ایک چشمے پر ٹھہر کر اچھی طرح نہا دھو کر اپنی حالت قدرے سنواری۔ چشمے کا پانی بڑا یخ بستہ تھا مگر اسے پریشانی نے اتنا مگن کر ڈالا تھا کہ وہ پانی کی یخ بستگی کو بھی فراموش کر گیا۔ اس نے نہایت خشوع و خضوع سے خدا کے حضور گڑگڑا کر غیبی مدد کی استدعا کی۔ وہاں سے نکل کر وہ مشرق کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ یہ تو برقائی خان کی رفاقت کا ثمر تھا کہ اسے کھانے پینے کی اشیاء ڈھونڈنے میں ذرا بھی تنگی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اس کے ہمراہ رہ کر وہ کئی ایسی چیزوں سے آگاہ ہو چکا تھا جن سے وقت پڑنے پر پیٹ کی آگ کو سرد کیا جا سکتا تھا۔ راہ میں جہاں کہیں اُسے ایسا پودا دکھائی دیتا تو فوراً اس سے مطلوبہ مقصد پورا کر لیتا۔ وہ مسلسل محوِ سفر رہا۔ دن رات میں بدلتا رہا اور رات دن میں۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اسے دن اور رات کے گذرنے کا احساس ختم ہونے لگا۔ وہ صحیح طرح شمار کرنے سے قاصر ہو گیا کہ اسے ازقائی قبیلے سے نکلے ہوئے کتنے روز بیت چکے ہیں۔ وہ اور اس کا گھوڑا دونوں کسی نامعلوم منزل کی جانب رواں دواں تھے۔

ایک صبح اچانک اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے چہرے پر پانی کا چھینٹا پھینکا ہو۔ وہ نیند سے ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اس کا جسم پانی سے شرابور تھا۔ عالمِ مدہوشی میں ہی اسے خیال آیا کہ رات کو سوتے وقت تو آسمان بالکل صاف تھا مگر کسی پہر بارش شروع ہو گئی ہو گی اور اسے نیند کے خمار میں پتہ ہی نہیں چل سکا۔ اس نے اپنی آنکھیں مسل کر خود کو پوری طرح بیدار کیا۔ اس کی نگاہ جب کھلے آسمان پر پڑی تو حیرت سے چہرے کی رگیں کھنچنے لگیں۔ آسمان پر چمکتا ہوا بڑا زرد سورج اس کے خیال کو رد کئے دے رہا تھا۔ اس نے چونک کر اپنے گرد نگاہ ڈالی تو دوسری بار حیرت کا جھٹکا لگا۔ اس کے قریب ہی ایک جوان منگول لڑکی موجود تھی اس کے ہاتھ میں موجود مشکیزہ اس بات کا عکاس تھا کہ اسی نے اسے پانی کے چھینٹے سے بیدار کیا تھا۔ وہ اس ویرانے میں منگولی لڑکی کو پا کر جہاں متحیر تھا وہیں اسے ایک نئی امید کا سہارا بھی ملا تھا۔



غازی عبداللہ شافعی الکرک سے سیدھا مصر پہنچا اور قاہرہ کے باہر ایک چھوٹے سے قصبے الحماء میں قیام کیا۔ یہاں پہنچنے پر اُسے یہ الم زدہ اطلاع ملی کہ جمال الدین الراحی اپنے ناپاک مقصد میں پوری طرح کامیاب ہو چکا ہے۔ اس کے بچھائے ہوئے جال میں نوعمر سلطان سیف الدین ابوبکر پھنس کر پایۂ تخت سے معزول کر دیا گیا ہے۔ وہ لمحہ بھر کے لئے دل مسوس کر رہ گیا تھا۔ سیف الدین ابوبکر جیسا بھی حکمران تھا، غازی عبداللہ شافعی کے دل میں ان کے لئے اب بھی عزت باقی تھی۔

جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا، ہونی کو بھلا کون ٹال سکتا تھا؟ اس نے متاسف بیٹھے رہنے کے بجائے فوری طور پر عملی قدم اُٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اب اس کے پاس وقت زیادہ نہیں بچا تھا۔ ایک جانب اسے جمال الدین الراحی کو مزید پیش قدمی سے روکنا تھا تو دوسری جانب نجم الدین ایوب کے لئے راہ ہموار کرنا تھی۔ اس نے فوری طور پر قاہرہ میں موجود ایسے امراء سے رابطہ قائم کرنا شروع کر دیا جو جمال الدین الراحی سے کسی نہ کسی وجہ سے خائف تھے یا پھر اُسے دل ہی دل میں ناپسند کرتے تھے۔ چونکہ جمال الدین الراحی کا منصب ہی کچھ ایسا تھا کہ امراء اپنی ناپسندیدگی کا برملا اظہار بھی نہیں کر پاتے تھے۔ غازی عبداللہ شافعی کا پیغام پاتے ہی ایسے امراء کی ایک مختصر جماعت نے اس سے فوراً رابطہ قائم کر لیا۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ غازی عبداللہ شافعی نجم الدین ایوب کو بلادِ مصر کا منتظم بنانے کا خواہش مند ہے تو انہوں نے مکمل ساتھ دینے کا عندیہ دے دیا۔ اسی جماعت نے واپس قاہرہ پہنچ کر نجم الدین ایوب کے حق میں تحریک چلانا شروع کر دی۔ امراء کا بڑا حلقہ اسی بات کا خواہش مند تھا کہ عنانِ حکومت ایوبی خاندان میں رہنی چاہئے۔ سیف الدین ابوبکر کے بعد کوئی ایسا نام ان کے سامنے موجود نہیں

تھا جو بلادِ مصر کی حکومت سنبھالنے کا اہل ہوتا۔ نجم الدین ایوب بھی ایک عرصہ سے ان کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔ دوسرا اس کے بارے میں متضاد خبریں پھیلی ہوئی تھیں کہ وہ شاید زندہ نہیں ہے۔ جب انہیں یہ خبر ملی تو وہ سب مل کر بڑے جوش و خروش سے نجم الدین ایوب کے حق میں سرگرم ہو گئے۔ بطور سربراہ حکومت، جو نام ابھی تک مجلس امرأ میں پہنچے تھے، ان میں ایک نام تو امیر جمال الدین الراحی کا تھا اور دوسرا نام الملک الصالح عماد الدین اسماعیل حاکم دمشق و بعلبک کا تھا۔ الملک الصالح کا نام امرأ کی اُس جماعت نے پیش کیا تھا، جو یہ سمجھتی تھی کہ انتظام حکومت کے لئے کسی تجربہ کار اور بارعب شخصیت کی ضرورت ہے۔ ان کی نگاہ میں عماد الدین اسماعیل ایک سخت گیر حاکم ہونے کے ساتھ بے حد شجاع بھی تھا۔ بلادِ مصر کو کسی ایسے ہی منتظم کی ضرورت تھی۔ جب اُس مجلس میں امرائے مصر کی دوسری بڑی جماعت نے نجم الدین ایوب کا نام پیش کیا تو مجلس میں شامل کئی اراکین کے چہرے کھل اُٹھے۔ جوڑ توڑ کا سلسلہ جاری رہا۔ ایک جانب جمال الدین الراحی امرائے مصر کے بالا خانوں میں خود جا کر چاپلوسی اور منت و سماجت کرتا رہا کہ وہ اسے نیا سلطان بنانے میں اس کی معاونت کریں۔ وہ مصری امرأ کی بڑی اکثریت کو اعلیٰ عہدوں کے لالچ کے جال میں پھنسا چکا تھا۔ مجلس انتخاب نے بلادِ مصر کے نئے حکمران کے لئے تینوں ناموں کا اعلان کرتے ہوئے 15 ذی قعدہ 637ھ فیصلے کی آخری تاریخ مقرر کر دی تھی۔ تمام معززین اور امرأ کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنی آراء اس تاریخ تک ان کے پاس جمع کروا دیں تا کہ رعیت کی خواہش کا احترام کیا جا سکے۔



برقائی خان وسیع و عریض حصے پر پھیلی ہوئی منگولیانہ سلطنت میں کئی ماہ کی در بدری اور خواری کے بعد اردوئے زریں خیل کے دارالحکومت سرائے میں واپس داخل ہوا۔ اس کا چہرہ خاک آلود تھا، کپڑے گرد سے اَٹے پڑے تھے۔ وہ پہلی نگاہ میں کسی بھکاری سے کم نہیں دکھائی دیتا تھا۔ زرد لباس عجیب سی مٹیالی رنگت میں بدل چکا تھا۔ سرائے کے لوگوں نے اس پر اچٹتی نگاہ ڈالی اور اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ کوئی اُسے پہچان نہیں سکا تھا کہ یہ اردوئے زریں کے حاکم عظیم باتو خان کا چھوٹا بھائی برقائی خان ہے۔ اس نے سرائے میں داخل ہونے کے بعد پل بھر ٹھہر کر چاروں جانب دور تک نگاہ دوڑائی۔ اپنائیت کے احساس کی شدت اُسے اپنی شریانوں میں دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جسم کا رُواں رُواں پھڑکنے لگا تھا۔ لمحہ بھر کے لئے اُسے یہ سب بھلا سا لگا مگر جونہی اس کا دھیان اپنے گمشدہ دوست کی جانب مبذول ہوا تو طبیعت پر تکدر سا چھانے لگا۔ لاشعوری طور پر اس نے اپنے گھوڑے کے قدموں کا رُخ نور الدین کے گھر کی جانب موڑ دیا۔ اُمید کا ایک مدھم سا ہیولا اس کے ذہن کے کسی گوشے میں مچل رہا تھا، شاید مطیع الدین از قائی قبیلے سے نجات پا کر واپس لوٹ چکا ہو۔ چند ساعتوں کے بعد وہ نور الدین کے دروازے کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ نور الدین ظہر کی نماز کی ادائیگی سے فارغ ہی ہوا تھا کہ وہ گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز پر چونک گیا۔ بیٹے کی واپسی کی اُمید میں اس کے قدم خود بخود صدر دروازے کی جانب اُٹھتے چلے گئے۔ دروازے کے باہر برقائی خان گھوڑے کی لگام ہاتھ میں تھامے شش و پنج میں مبتلا کھڑا تھا۔ چند لمحے قبل دل و دماغ میں چھائی امید کی کرن نور الدین کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی دم توڑ گئی۔ دونوں خاموشی کے عالم میں ایک دوسرے کا چہرہ تکتے رہے۔ دونوں کی آنکھوں میں گہرا استفسار جھلک رہا تھا، دونوں کے اُترے ہوئے چہروں نے خود ہی جواب بھی فراہم کر ڈالا تھا۔ آنکھیں ہی سوال اُٹھاتی اور آنکھیں ہی جواب دے دیتی۔

''اے اللہ......! تو ہی میرے بیٹے کا نگہبان ہے، اُسے اپنے حفظ و امان میں رکھنا''۔ ڈوبتے ہوئے دل

سے ایک لرزتی ہوئی دُعا نکلی۔

''بابا......! آپ مایوس مت ہوں، آپ کا بیٹا جہاں بھی ہے خیریت سے ہی ہے، وہ جلد واپس آ جائے گا۔ میں نے جاں توڑ کوشش کی تھی کہ اسے اپنے ساتھ لے کر آتا مگر شاید یہ جاودانی آسمان کو ابھی منظور نہیں ہے، وہ میرے آگے آگے بھاگتا رہا اور میں اس کے پیچھے پیچھے......''

''قاآن زادے......! بے فکر رہو میں کبھی رحمت خداوندی سے مایوس نہیں ہوا۔ میرا اللہ میرا مددگار ہے، وہ مجھ سے اولاد کی محبت کی آزمائش لینا چاہتا ہے۔ میں انشاء اللہ تعالیٰ اس کے امتحان میں سرخرو ہوں گا''۔

''بابا......! آپ کو کس نے بتایا کہ میں قاآن زادہ ہوں؟'' برقائی خان ایک لمحے کے لئے متحیر رہ گیا۔

''اعلیٰ نصب لوگوں کی شخصیت چھپائے سے بھلا چھپتی ہے کیا......؟''

''آپ کو معلوم ہو گیا خیر کوئی بری بات نہیں''۔ وہ خود سے باتیں کرنے لگا۔ ''آپ مجھے غیر مت سمجھئے، میں بھی آپ کا بیٹا ہی ہوں۔ مطیع الدین کو میں نے اپنے بھائی سے کم کبھی نہیں سمجھا''۔

''تمہیں زبان سے اقرار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، تمہاری حالت منہ بولتا ثبوت ہے''۔

''میں نہیں جانتا میرے ساتھ یہ سب کیوں ہو رہا ہے......؟ میں آج تک کبھی ناکام و نامراد نہیں رہا مگر......'' برقائی خان کا لہجہ رندھنے لگا۔ وہ لگام کو ہاتھوں میں بری طرح مسل رہا تھا۔ نور الدین خود بھی غم سے نڈھال تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر برقائی خان کا کاندھا تھپتھپایا اور اس کی حوصلہ افزائی کی۔ عجب بات تھی کہ دونوں کا غم مشترکہ تھا۔ دونوں گردشِ زمانہ کا شکار تھے۔ ایک غم خوار دوسرے غم زدہ کی ڈھارس بندھا رہا تھا۔

''میں دو ایک دن میں دوبارہ اپنے بھائی مطیع الدین کی تلاش میں نکلوں گا، میرے سپاہی بدستور اُس کے بارے میں کھوج نکالنے میں جتے ہوئے ہیں''۔

''اللہ تمہاری مدد کرے گا......''

برقائی خان بوڑھے غم زدہ باپ کے سامنے مزید ٹھہرنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔ اس نے وہاں سے رخصت ہو جانا مناسب سمجھا اور گھوڑے کی باگیں کھینچتے ہوئے وہ اپنے شاہی محل کی جانب روانہ ہو گیا۔



جمال الدین الراحی کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ نجم الدین ایوب کا نام پیش کرنے میں غازی عبداللہ شافعی کا ہاتھ ہے اور وہ آج کل قاہرہ کے باہر قصبے الحماء میں مقیم ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ وہ بڑے زور و شور سے اس کے عتاب زدہ اور اس سے ناراض امراء کی جماعت کے ہمراہ نئے سلطان کے بارے میں تحریک چلا رہا ہے۔ امراء کی وہ جماعت جسے وہ ماضی میں ذلیل کر کے قاہرہ سے نکلوا چکا تھا۔ اس کے ساتھ مل چکی تھی اور وہ سب باہمی اتفاق سے جمال الدین الراحی کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ یہ صورت حال جمال الدین الراحی کے لئے بڑی تشویش ناک تھی۔ اس نے غازی عبداللہ شافعی سے خود ملنے کا فیصلہ کیا، اگر وہ اسے منانے میں کامیاب ہو گیا تو نجم الدین ایوب کا پتہ ایک بار پھر صاف ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے غلاموں کے ساتھ الحماء پہنچا اور اس سرائے چلا آیا جہاں غازی عبداللہ شافعی ٹھہرا ہوا تھا۔ غازی عبداللہ شافعی نے جب اس کی صورت دیکھی تو اس کے تن بدن میں جیسے آگ سی لگ گئی۔ بہرحال وہ ابھی ایسے مقام پر نہیں تھا کہ اپنے غصے کا برملا اظہار کر پاتا اس نے جمال الدین الراحی کو بیٹھنے تک کا نہیں کہا۔

''میرے دوست...... میرے بھائی!''

جمال الدین اپنائیت بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں اپنے ناروا سلوک اور سابقہ کوتاہی پر [illegible]

اور معذرت طلب کرنے کے لئے خود چل کر تمہارے پاس آیا ہوں''۔

''الراحی......! وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا تمہیں یوں گڑگڑانے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ تم جاؤ اور اُس وقت کا انتظار کرو جب مجھ سے کوتاہیاں سرزد ہوں گی، میرا حسن سلوک تمہیں برداشت کرنا پڑے گا''۔ غازی عبداللہ شافعی کے چہرے پر نفرت انگیز مسکان پھیلی ہوئی تھی۔ جمال الدین الراحی فرطِ طیش میں محض پہلو بدل کر رہ گیا تھا۔

''غازی......! میں تم سے معافی مانگنے آیا تھا مگر یہاں آ کر مجھے معلوم ہوا ہے کہ میں کسی انسان کے پاس نہیں بلکہ پتھر پر ماتھا ٹھوکنے آیا ہوں۔ بہر حال یہ میری غلطی ہے مگر تم اس وقت سے پناہ مانگو جب میں بلادِ مصر کی گدی پر براجمان ہوں گا اور تم میرے سامنے پابہ زنجیر کھڑے ہو گے''۔ وہ اس کا سرد رویہ برداشت نہ کر پایا اسی لئے الفاظ چبا چبا کر ادا کر رہا تھا۔

''الراحی......! تم نے پہلے کون سی کسر چھوڑی تھی بہر کیف مجھے اپنے اللہ پر بھروسہ ہے، وہ ہی میرا نگہبان ہے۔ انشاءاللہ تم اپنے ناپاک عزائم میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکو گے''۔

''یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ کیا ہونے والا ہے......؟ میں یہاں تمہاری اوٹ پٹانگ سننے نہیں آیا ہوں بلکہ تمہیں متنبہ کرنے آیا ہوں کہ تم نے نجم الدین ایوب کے سلسلے میں جو گمراہی پھیلا رکھی ہے، اس سے باز آ جاؤ......ورنہ......!!!''

جمال الدین الراحی پر رعشہ سا طاری ہونے لگا۔ وہ دونوں مٹھیاں بار بار بھینچ رہا۔

''نجم الدین ایوب کے معاملے سے تمہارا کیا تعلق......؟ وہ مجلس انتخاب کا مسئلہ ہے کہ وہ کیا طے کرتی ہے؟ دوسرا نجم الدین ایوب میری ہی نہیں تمام بلادِ مصر کی متفقہ آواز ہے''۔

''نجم الدین ایوب بلادِ مصر تک پہنچے گا تو ہی سلطان بن سکے گا، اگر تم نے اِس کے متعلق یہ پروپیگنڈا بند نہ کیا تو خواہ مخواہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے''۔

''مجھے گیدڑ بھبھکیاں دینے کے بجائے اپنی خیر مناؤ الراحی......! میں نے جو کرنا ہے وہ کر کے ہی رہوں گا، بس تم وقت کا انتظار کرو''۔

غازی عبداللہ شافعی کے چہرے پر گہرا اعتماد دکھائی دے رہا تھا۔ جمال الدین الراحی خود کو زِچ محسوس کرنے لگا۔ اس نے اِدھر اُدھر کی ڈینگیں ماریں اور پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے نکل آیا۔ غازی عبداللہ شافعی اسے مرغ بسمل کی طرح تڑپتا دیکھ کر محظوظ ہوتا رہا۔



وجیہہ الدین الباقری بلادِ مصر کی عساکر کا امیر اعلیٰ تھا۔ اسی نے جمال الدین الراحی کے ایماء پر نوعمر سلطان سیف الدین ابوبکر کو اعتکاف کی حالت سے گرفتار کیا تھا۔ جہاں وہ جمال الدین الراحی کا ہمراز تھا، وہیں اسے اپنی ذات کے حوالے سے بھی اُس سے سخت خطرہ لاحق تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر جمال الدین الراحی سلطانِ مصر بننے میں کامیاب ہو گیا تو ممکن تھا کہ وہ اپنا راز دار سمجھتے ہوئے اُسے اپنی راہ سے ہٹانے کی کوشش کرے۔ بظاہر تو جمال الدین الراحی اسے کامل تحفظ کی ضمانت دے چکا تھا مگر سلطان کی حیثیت سے وہ اس سے کہیں زیادہ بااختیار بن جاتا۔ وہ گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ بدلتے حالات پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اُس کے دل میں ملک الصالح عماد الدین اسماعیل کو سلطانِ مصر بنانے کی خواہش پنپ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے عماد الدین اسماعیل کے ساتھ خفیہ مراسلت کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ جمال الدین الراحی اس امر سے بے خبر

تھا۔ ایک شام غازی عبداللہ شافعی اس کے پاس چلا آیا اس کے ہمراہ اُمرائے مصر کی ایک جماعت بھی تھی۔ وجیہہ الدین الباقری جہاں غازی عبداللہ شافعی کی اس دلیری پر متحیر تھا، وہیں وہ امرائے مصر کو اس کے ہمراہ دیکھ کر خاموش رہا۔ ورنہ وہ اُسے زنداں خانے میں ڈالنے میں ایک پل نہ لگاتا۔ غازی عبداللہ شافعی کو قاہرہ سے جلاوطن کیا جا چکا تھا۔ اس کی وہاں موجودگی بذاتِ خود کسی جرم سے کم نہیں تھی۔ اس نے سب احباب سے نشست سنبھالنے کے لئے کہا۔ جب سب لوگ اطمینان سے بیٹھ گئے وہ اُن کی جانب استفہامیہ نگاہوں سے متوجہ ہوا۔

''امیر العساکر......!'' ایک امیر قدرے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ یہ بات تو جانتے ہی ہیں کہ آج کل بلادِ مصر کی سلطانی کا معاملہ زدروں پر ہے، جوڑ توڑ کا سلسلہ جاری ہے۔ ہم اسی سلسلے میں حاضر ہوئے ہیں کہ آپ اپنی رائے کسی ایسے شخص کے حق میں دیں جو کہ حقیقتاً بلادِ مصر کی حاکمیت کا اہل ہو''۔

''معززین......!'' وجیہہ الدین الباقری گویا ہوا۔ ''میں آپ کے خیال سے بالکل متفق ہوں میری خود بھی دلی خواہش ہے کہ ہمارا سلطان کوئی ایسا شخص ہو جو ہماری زمین و مفادات کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ہمارے مستقبل کو محفوظ رکھنے کے قابل ہو، میں اس بارے میں غور و خوض کرتا رہتا ہوں، ابھی تک جو نام مجلس میں سامنے آئے ہیں، ان میں سے عماد الدین اسماعیل ہی ایک ایسا نام ہے جس کے بارے میں سنجیدگی سے میں سوچ رہا ہوں، جمال الدین الراحی کے سلطان بننے سے فتنہ و فساد کا امکان دکھائی دے رہا ہے۔ ہمیں اس وقت صلیبی دشمنوں سے بھی خطرہ ہے، الحمدللہ ہماری عساکر میں اتنی قوت موجود ہے کہ وہ انہیں دنداں شکن جواب دے سکیں مگر عساکر اسی وقت اپنی قوت کا مظاہرہ کر سکیں گی جب انہیں سلطان کی حمایت حاصل ہو گی۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ عماد الدین اسماعیل ہی ایسا شخص ہے جو ہماری سرحدوں کی حفاظت کرنے کی صلاحیت کا حامل ہے''۔

وجیہہ الدین الباقری نے ان کی جانب سے کسی دوسرے کے نام پیش ہونے سے قبل ہی اپنی رائے ان پر ٹھونس دی تھی، وہ شاید انہیں ایسا کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ اسے کسی دوسرے نام کی حمایت کرنے پر مجبور کرتے۔ وہ کن انکھیوں سے ان کے چہروں پر تذبذب کے آثار بھی دیکھ رہا تھا امراء اس کی بات پر بے چین دکھائی دینے لگے۔

''امیر عساکر......!'' ایک دوسرا امیر بولا۔ ''آپ کی رائے سے ہم متفق نہیں ہیں، جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آپ بلادِ مصر کے بارے میں کیا جذبات رکھتے ہیں......؟ ہم آپ کے جذبات کی قدر کرتے ہیں مگر عماد الدین اسماعیل کا نام سلطانِ مصر کے لئے منتخب کرنا صحیح امر نہیں ہے''۔

''میں آپ کی بات کا برا نہیں مناؤں گا''۔ وجیہہ الدین الباقری مسکراتے ہوئے بولا۔ ''آپ معززین مصر ہیں، آپ کے دم سے سلطنت میں امن و امان قائم ہے مگر میں یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ عماد الدین اسماعیل میں ایسی کون سی برائی ہے کہ اسے سلطان نہیں بننا چاہئے......؟''

''معزز امیر......!'' غازی عبداللہ شافعی نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا...... ''میں اپنی ناقص معلومات کے اعتبار سے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ عماد الدین اسماعیل کے بجائے نجم الدین ایوب زیادہ بہتر نام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عماد الدین اسماعیل عمر کے اس حصے میں ہے جہاں انسان کی ضمانت نہیں دی جا سکتی، جب کہ نجم الدین ایوب ایک نوجوان ہے۔ عماد الدین اسماعیل کو بلادِ مصر سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے، اگر وہ پر زور اصرار پر اس امر کی حامی بھر لیتا ہے تو وہ کسی بھی درباری امیر کو منتظم بنا کر یہاں بھیج دے گا، بلادِ شام و شرقیہ کو بلادِ مصر پر فوقیت حاصل ہو جائے گی۔ ہماری حیثیت محض خراج دینے والوں کی سی ہو گی۔ یہ قدم ہماری خود مختاری اور آزادی پر مہلک ضرب ثابت ہو گا۔ وقت گواہ ہے کہ صلیبیوں کے لئے عماد الدین اسماعیل کا رویہ بے حد ہمدردانہ رہا ہے اگر اس

کے دل میں ایمان و جہاد کی ذرا سی بھی خواہش ہوتو وہ بلادِ شام و شرقیہ کا اتنا طاقتور حکمران ہے کہ اب تلک صلیبیوں کا نام ونشان مٹا چکا ہوتا۔ ایسا شخص بھلا ہمارے مستقبل کی کیا حفاظت کرسکتا ہے؟ رہا سوال نجم الدین ایوب کا تو اس میں ایسی بات موجود ہے جو اسے سلطان بننے کا اہل ثابت کرتی ہے۔ وہ ایک عرصہ تک مصر میں مقیم رہا ہے، یہاں کے لوگ اسے جانتے ہیں، وہ اسے پسند کرتے ہیں، دوسرا وہ اس سرزمین سے محبت کرتا ہے''۔

''غازی!'' وجیہہ الدین الباقری کا چہرہ ناگواری سے سِتنے لگا۔ ''تم کل تک قصرِ سلطانی میں نجم الدین ایوب کے خلاف سازشوں کا جال بنتے رہے ہو اور آج اس کی حمایت وطرف داری میں دلیلیں پیش کررہے ہو، تمہارے کس انداز پر یقین کیا جائے؟ تم بخوبی جانتے ہو کہ قاہرہ میں تمہیں داخل نہیں ہونا چاہئے تھا، مگر تم یہاں موجود ہو؟ میں اسے یہی سمجھوں گا کہ کل تک تم جس شخص کے خلاف تھے آج اسی کے ساتھ کسی خفیہ سمجھوتے کے تحت اس کی مہم چلا رہے ہو''۔

وجیہہ الدین الباقری کی بات میں وزن تھا، کئی امیر ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ غازی عبداللہ شافعی خود کو زچ ہوتے دیکھ کر تلملا سا گیا۔

''الباقری......! میں خوب جانتا ہوں کہ تمہیں عماد الدین اسماعیل سے کیا بغض ہے؟ کل تک جمال الدین الراحی کا ساتھ دیتے رہے، اسی کے منصوبے پر عمل درآمد کرتے ہوئے تم نے سیف الدین ابوبکر کو حراست میں لیا۔ حالانکہ اُس کا کوئی قصور نہیں تھا، اس پر جھوٹے بہتان باندھ کر تم نے اپنی مطلب برآری کی اور اب تم جمال الدین الراحی کو مکھی کی طرح نکال باہر کرنا چاہتے ہو۔ تم بے حد مکار شخص ہو، میں اچھی طرح جانتا ہوں جو تم منصوبہ بنائے بیٹھے ہو، عماد الدین اسماعیل تو یہاں آنے کا نہیں، تم چاپلوسی کرتے ہوئے اس سے امارت کا عندیہ حاصل کرلو گے اور پھر تمام سلطنت تمہارے قبضے میں ہوگی۔ اگر تمہیں حکمرانی کی خواہش ہے تو مردوں کی طرح اپنا نام مجلس کے حوالے کیوں نہیں کردیتے۔ تم یہ نہیں کرسکتے کیونکہ تم یہ جانتے ہو کہ بننے والا سلطان سب سے پہلے اُن امیدواروں کو اپنی راہ سے ہٹاتا ہے جنہیں خواہش حکمرانی ہو''۔

غازی عبداللہ شافعی کی باتیں امراُ کے دل پہ لگیں، کچھ لمحے قبل وہ امیر عساکر سے متاثر دکھائی دے رہے تھے مگر اب حالات کی نئی کروٹ نے ان کے ذہن پر چھائی دبیز چادر ہٹا ڈالی تھی۔ کچھ دیر پہلے وہ غازی عبداللہ شافعی سے واقعی بدظن ہو چکے تھے مگر اس نئے انکشاف نے ان کے ذہن پر چھانے والے غبار کو مٹا ڈالا تھا۔ وہ ایک بار پھر غازی عبداللہ شافعی کے حامی دکھائی دینے لگے۔ صورت حال اپنے خلاف جاتے دیکھ کر وجیہہ الدین الباقری کے ضبط کا پیمانہ چھلک گیا۔ وہ یکدم ہتھے سے اکھڑ گیا، اس کے منہ سے ہذیان جاری ہونے لگا۔ امراُ نے فوراً بیچ میں پڑ کر معاملہ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ غازی عبداللہ شافعی نے معاملہ بگڑتے دیکھ کر وہاں سے نکلنا مناسب سمجھا۔ اس کی لگائی ہوئی ضرب صحیح نشانہ پر لگی تھی۔ وجیہہ الدین الباقری کا پوشیدہ روپ کھل کر سامنے آ گیا تھا۔



مطیع الدین تجسس بھری نگاہوں سے منگول لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموش کھڑی تھی، اس کے چہرے پر چھائی ہوئی معصومیت نے اُسے بے حد حسین بنا دیا تھا۔ اس کے جسم پر موجود قبائلی لباس کے ساتھ لدے ہوئے زیورات نے اسے خاصا منفرد بنا رکھا تھا۔ مطیع الدین لمحہ بھر کے لئے اپنی حالت زار بھول کر اس کے دلربانہ حسن میں مگن سا ہو گیا۔ جب وہ اِس کی بدستور ٹکٹکی سے نظریں کترانے لگی تو مطیع الدین کو جیسے ہوش آیا۔ وہ اپنے تئیں جھینپ سا گیا۔ دوسرے لمحے اسے اپنی صعوبت زدہ حالت یاد آ گئی تو وہ چونک پڑا۔

''تت تم کون ہو......؟''

''اوہ! تم تاتاری ہو......!''

وہ چونک سی گئی۔

''نہیں......! میں نسلاً ترک ہوں، تاتاری بھی بول سکتا ہوں، مگر تم تاتاری نہیں دکھائی دیتی، کیا تم تاتاری زبان سمجھ لیتی ہو؟''

''ہاں! تھوڑی بہت!''

''مگر تم یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور اس ویرانے میں کیا کر رہی ہو......؟'' مطیع الدین کافی حد تک سنبھل گیا تھا۔

''مسافر ہو شاید! راہ بھٹک کر ادھر نکل آئے ہو......؟''

وہ اپنی کہے جا رہی تھی، مطیع الدین اس کے اندازوں سے جز بز سا ہونے لگا۔ چند لمحے قبل وہ اسے باور کرا چکا تھا کہ وہ ترک ہے۔

''تمہارا اندازہ صحیح ہے، میں بھٹکا ہوا مسافر ہوں، مگر تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا کہ تم کون ہو......؟''

وہ یکدم کھلکھلا کر ہنس پڑی، مطیع الدین کو پل بھر کے لئے یوں لگا کہ ہزاروں سازینوں پر بے اختیاری کے عالم میں ہاتھ پڑ گیا ہو۔

''میں تو یہیں رہتی ہوں، پاس ہی میرا گاؤں ہے۔ میں اس طرف سے روزانہ گذر کر پانی بھرنے جاتی ہوں، وہ سامنے دریا دکھائی دے رہا ہے نا۔ وہاں......!''

مطیع الدین کی نگاہ اس کی انگلی کے تعاقب میں اُٹھ گئی۔ کچھ فاصلے پر اسے دریا کا چمکتا ہوا پانی دکھائی دیا۔ اسے حیرت بھی ہوئی کہ جب وہ یہاں پہنچا تھا تو اسے قریبی دریا کا احساس نہیں ہوا تھا۔ شاید تکان کی زیادتی کے باعث اس کی توجہ اس جانب نہیں ہو سکی ہوگی۔

''کہاں سے آئے ہو اجنبی......؟''

''یہ تو میں نہیں جانتا کہ میں اب کہاں سے آیا ہوں مگر یہ جانتا ہوں کہ مجھے کہاں جانا ہے......؟''

''میں کچھ سمجھی نہیں......!''

''تم نہ ہی سمجھو تو بہتر ہے۔ تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ سرائے جانے والا راستہ کون سا ہے؟ میں جلد از جلد سرائے پہنچنا چاہتا ہوں''۔

''سرائے......!!؟'' اس کے چہرے پر حیرت پھیلنے لگی۔ ''یہ کس جگہ کا نام ہے؟''

مطیع الدین اس کی بات پر چونک اُٹھا۔

''تم سرائے کے بارے میں کچھ نہیں جانتی، سرائے، زریں خیل منگولوں کا دارالحکومت ہے''۔

''اجنبی......!'' اس کے چہرے پر خوف سا دکھائی دینے لگا۔ ''تم شاید بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، تم نے کتنے دن سے کھانا نہیں کھایا؟''

مطیع الدین اس کی باتوں سے پریشان ہو گیا وہ کیا سمجھ رہی تھی یا وہ خود کہاں نکل آیا تھا دونوں باتیں اس کی سمجھ سے باہر تھیں۔ اگر وہ یہاں سے سرائے کا سراغ نہ پا سکا تو جانے اسے کب تک یونہی بھٹکنا پڑے گا۔

''تم نے پانی بھر لیا ہے یا ابھی بھرنے جانا ہے''۔ مطیع الدین نے اچانک سوال کیا۔

''تم میرے ساتھ گاؤں جانا چاہتے ہو؟''

''تمہارا اندازہ صحیح ہے''۔

''تم اپنا سامان سمیٹو، میں اتنی دیر میں پانی بھر کر آتی ہوں''۔ اس نے مٹکا نما برتن کو گھماتے ہوئے کہا۔ مطیع الدین نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے دریا پر جا پہنچی۔ مطیع الدین کپڑے جھاڑتا ہوا اُٹھا اور گھوڑے کو تھپتھپانے لگا۔ سامان نام کی کوئی چیز اس کے پاس تھی نہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ اجنبی لڑکی واپس لوٹ آئی۔ اس نے مطیع الدین کو چلنے کا اشارہ کیا۔ پانی کا برتن اس کے پہلو میں دبا ہوا تھا۔ مطیع الدین اس کے ہمراہ ایک جانب بڑھنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ گاؤں میں سے یقیناً اُسے سرائے کا راستہ معلوم ہو جائے گا۔ اجنبی لڑکی کو سرائے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ ''اگر وہ یہاں سے کبھی باہر نکلی ہوتی تو جان پاتی کہ دنیا کتنی بڑی ہے......؟'' وہ زیرِ لب مسکرانے لگا۔



باتو خان بے حد مسرور تھا، اس کا بھائی برقائی خان واپس لوٹ آیا تھا۔ کئی ماہ کی جدائی کے بعد یہ ملاقات مسرت آمیز تھی۔ برقائی خان کو اس بات کا قلق تھا کہ وہ مطیع الدین کو تلاش کرنے میں ناکام رہا۔ باتو خان نے اس کی توجہ ہٹانے کی کوشش کی اور اسے ایک بار پھر یہ باور کرایا کہ مطیع الدین کی حیثیت کچھ ایسی نہیں ہے کہ اس کے لئے غم زدہ رہا جائے۔ وہ برقائی خان کی ایک مسلمان زادے سے اتنی وابستگی سے خوش نہیں تھا۔ دوسرے دن دربار میں جب برقائی خان آیا تو خاص جشن کا اہتمام کیا گیا۔ ان تمام امور کا مقصد محض یہی تھا کہ اس کی طبیعت بہل جائے اور مطیع الدین کا خیال ذہن سے اتر جائے۔ برقائی خان کا سامنا جب تونائی خان سے ہوا تو وہ خود پر قابو نہ رکھ پایا۔

''تونائی خان......!'' برقائی خان اسے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تمہاری بیوقوف بیٹی کی چھوٹی سی نادانی نے مجھے میرے دوست سے ایک عرصے کے لئے جدا کر دیا ہے''۔

''میری بیٹی نے......! اس معاملے سے اس کا کیا تعلق......؟'' تونائی خان برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔

''تعلق ہے تونائی خان......! تمہاری بیٹی نے اسے سرخوں کے عتاب سے بچانے کے لئے ازقائی قبیلے سے مدد لی اور پھر اسے ان کے پاس محصور کروا دیا۔ اس نے ایسا کیونکر کیا......؟ میں نہیں جانتا اگر وہ یہ سب نہ کرتی تو میں اسے سرخوں سے چھڑا کر اب تک واپس لا چکا ہوتا''۔

''تم میری بیٹی پر الزام لگا رہے ہو۔ تمہارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے؟ کہ میری بیٹی نے ایسا کچھ کیا ہے......؟'' تونائی خان کرختگی سے بولا۔ اس کے لہجے میں کھوکھلے پن کا عنصر موجود تھا۔ وہ چند دن پہلے ہی اس بات کی تصدیق کر چکا تھا کہ اس کی بیٹی ازقائی قبیلے میں گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کسی ازقائی نوجوان سے تعلق جوڑ بیٹھی ہے مگر یہاں کچھ اور ہی گل کھل رہا تھا۔

''ثبوت تمہاری لرزتی ہوئی آواز ہے تونائی خان......؟ اس کے علاوہ ثبوت ازقائی قبیلے کا سردار مانجی خان ہے، وہ تمہاری بیٹی کو بھری محفل میں بھی پہچان لے گا''۔ برقائی خان کے لہجے میں تلخی تھی۔

''قاآن زادے......! تم سرِ محفل مجھے ذلیل کر رہے ہو......؟ تم میری بیٹی کو ایک مسلمان سے منسوب کر رہے ہو؟ جو کہ میری برداشت سے باہر ہے''۔

''میں تمہیں ذلیل نہیں کر رہا بلکہ احساس دلا رہا ہوں کہ تمہاری بیٹی کی چھوٹی سی غلطی نے مجھے ناکامی کا منہ دکھایا ہے، جہاں اس نے مجھے ایک غم زدہ باپ کے سامنے شرمندہ کر ڈالا ہے وہیں ایک اچھے دوست سے جدا

کر دیا ہے''۔

''بس کرو برقائی خان......! میرے لئے اتنی ذلت کافی ہے، اگر یہ سچ ہوا تو جس بیٹی کے باعث مجھے یہ دن دیکھنا پڑا ہے، میں اُسے اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتار دوں گا''۔

برقائی خان نے غصے سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ درباری استعجابیہ نظروں سے دونوں کا منہ تک رہے تھے۔ زرّیں خیل کا قاآن باتو خان بھی برقائی خان کے اس جارحانہ انداز پر پریشان تھا۔ وہ بظاہر کچھ نہیں بولا۔ مگر اسے پیدا ہونے والے حالات کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ تونائی خان اپنی رسوائی اور جگ ہنسائی کو برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ قدم پٹختا ہوا وہاں سے باہر نکل گیا۔ باتو خان نے محفل جشن کو برخاست کرنے کا حکم دیا۔ برقائی خان کے اعزاز میں دی گئی یہ محفل بدمزگی پر تمام ہوئی تھی۔



جمال الدین المراحی کے خلاف چلائی گئی جارحانہ مہم میں اب تیزی آنے لگی۔ امرأ کے ساتھ ساتھ رعیت میں بھی اس کے لئے نفرت کا اظہار دکھائی دینے لگا۔ یہ سب غازی عبداللہ شافعی اور اس کے حلیف جماعت کا کیا دھرا تھا۔ انہوں نے رعیت میں یہ ہوا اُڑا دی تھی کہ دراصل سابق نوعمر سلطان سیف الدین ابوبکر کو معزول کرنے کے پیچھے جمال الدین المراحی کی ذاتی ہوسِ اقتدار کا ہاتھ تھا۔ ایسے امرأ جنہیں وہ خصوصی مراعات اور اعلیٰ عہدوں کا لالچ دے کر ساتھ ملائے ہوئے تھا وہ بھی اب اس سے نظریں چرانے لگے تھے۔ جمال الدین المراحی کو واضح دکھائی دے رہا تھا کہ اس کی دال مزید نہیں گلے گی، آنے والے وقت میں کوئی نہ کوئی بڑی مصیبت اس کی جان کو آئے گی۔ بازی پلٹتی دکھائی دے رہی تھی، اس نے سنجیدگی سے اس بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ سلطانِ مصر کے لئے جو نام ابھی تک مجلس انتخاب کے پاس پہنچے تھے، ان میں نجم الدین ایوب اور عماد الدین اسماعیل شامل تھے۔ یہ دونوں شخص ایوبی خاندان سے تعلق رکھنے کے باعث عوام میں نہایت مقبول تھے۔ جمال الدین المراحی کا تعلق کسی طور کسی بڑے حکمران خاندان سے ثابت نہیں تھا۔ اس لئے زیادہ امکان اسی فیصلے کا تھا کہ اسے عہدہ سلطانی سے رد کر دیا جائے گا۔ نجم الدین ایوب کے بارے میں وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اسے کسی صورت بھی نہیں بخشے گا۔ صرف عماد الدین اسماعیل ہی ایک شخصیت اسے دکھائی دی جس سے اسے تحفظ حاصل ہو سکتا تھا۔ اس نے خفیہ طور پر عماد الدین اسماعیل کی حمایت کا منصوبہ بنایا۔ اس نے 20 شوال 637ھ کو ایک طویل مراسلہ عماد الدین اسماعیل کے نام تحریر کر کے بعلبک روانہ کیا۔ جس میں اس کی مکمل حمایت کی یقین دہانی کے علاوہ نجم الدین ایوب کی گرفتاری کی بھی استدعا کی گئی تھی۔ اس مراسلے میں نجم الدین ایوب کی الکرک میں موجودگی اور حاکم الکرک الملک الناصر کے تعاون کا بھی ذکر کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے نجم الدین ایوب سے ہتھیائے گئے علاقوں کا بھی ذکر کیا تھا جو کہ عماد الدین اسماعیل نے کچھ عرصہ پہلے اپنے قبضے میں لے لئے تھے۔ اس نے واضح کیا کہ نجم الدین ایوب بلادِ مصر کا سلطان بننے کے بعد اس قدر مضبوط ہو جائے گا کہ بلادِ شرقیہ کی واپسی اس کے لئے کوئی مشکل بات نہیں ہو گی۔ بلادِ شرقیہ اور بلادِ فلسطین و لبنان پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لئے ضروری ہو گا کہ عماد الدین اسماعیل آگے بڑھ کر الکرک میں موجود نجم الدین ایوب کو فوری طور پر حراست میں لے لے۔ اگر دیر ہو گئی تو معاملہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ جمال الدین المراحی نے اس قدر فصاحت و بلاغت سے یہ مراسلہ تیار کیا تھا کہ عماد الدین اسماعیل نامہ پڑھ کر وقت کی نزاکت بخوبی سمجھ گیا۔ اس نے بلادِ مصر کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے فوراً کوچ کا منصوبہ بنا لیا۔ اس کا پہلا ہدف الکرک تھا، جہاں الملک الناصر داؤد حاکم تھا۔ الکرک کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کے بعد وہ نجم الدین ایوب کو بھی گرفتار کر سکتا تھا اور پھر بلادِ مصر تو خود

اسے دعوت دے رہا تھا۔



مطیع الدین تھوڑی دیر میں اس لڑکی کے ہمراہ اس کے گاؤں پہنچ گیا۔ لڑکی کے بیان کے مطابق گاؤں نزدیک ہی تھا مگر جب وہ اس کے ساتھ چلا تو معلوم ہوا کہ گاؤں کم از کم دو گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ راستے میں بھوک نے ستایا تو مطیع الدین نے ایک چھوٹی سی جنگلی بوٹی کے پھل سے پیٹ کا جہنم ٹھنڈا کیا۔ وہ لڑکی تعجب سے اس کا منہ تکتی رہی۔

مطیع الدین نے گہری نظر گاؤں پر ڈالی تو اسے عجیب سا محسوس ہوا کہ جیسے یہ گاؤں مستقلاً یہاں آباد نہیں تھا بلکہ اسے کچھ ہی عرصہ پہلے یہاں آباد کیا گیا ہو۔ اپنے اس احساس کو وہ کوئی نام نہیں دے سکا۔ گاؤں میں اسے کئی عورتیں دکھائی دیں جنہوں نے زیورات کے بوجھ جسم پر لادے ہوئے تھے۔ وہاں موجود مردوں کی ہیئت بھی منفرد تھی۔ انہوں نے اپنے گلوں میں بڑے بڑے توے نما طوق ڈال رکھے تھے۔ ان توؤں پر خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ مطیع الدین استعجابیہ نگاہوں سے انہیں تکے جا رہا تھا۔ وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ انسان نما کون سی مخلوق ہے؟ جہاں وہ پہنچ گیا ہے۔ مطیع الدین کے گاؤں میں داخل ہونے پر بے ہنگم سا شور مچ گیا۔ سب لوگ حیرت و خوف سے اس کی جانب دیکھنے لگے۔ کئی چہرے تو اسے ایسے دکھائی دیئے جو خوف کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ سب سے بڑا توے نما طوق پہنے ایک شخص اس کی جانب بڑھا۔ اجنبی لڑکی اسے دیکھتے ہی وہاں سے کھسک لی تھی۔

"تم شاید ادھر راہ بھول کر آ نکلے ہو نوجوان"

"ہاں" مطیع الدین نے اختصار سے کام لیا۔

"نوجوان غالباً تم یہ نہیں جانتے کہ یہ علاقہ ہماری ملکیت ہے اور ہم اپنے علاقے میں اجنبیوں کی آمد سخت ناپسند کرتے ہیں"۔ اس کا لہجہ خونخوار تھا۔ مطیع الدین نے اس کے انداز سے متاثر ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

"تم شاید اس بستی کے سردار ہو ؟"

"تمہارا اندازہ صحیح ہے۔ تم چونکہ لاشعوری طور پر اس جانب نکل آئے ہو اس لئے پہلی خطا کو معاف کرنا ہمارا قانون ہے۔ تمہیں شام تک کی مہلت دی جاتی ہے کہ ہمارے علاقے سے نکل جاؤ ورنہ ہم تمہیں ہلاک کر دیں گے"۔

"سردار !" مطیع الدین اس کی جانب گھورتے ہوئے غرایا۔ "مجھے کسی کی گیدڑ بھبکیاں سننے کی عادت نہیں ہے۔ بہر کیف مجھے تمہاری بستی میں آنے یا ٹھہرنے کی کوئی خواہش نہیں ہے، میں اپنے راستے سے بھٹک گیا ہوں۔ تم صرف اتنی مہربانی کرو کہ مجھے میری راہ پر لگا دو"۔

سردار اس کے لہجے پر دنگ رہ گیا۔ اس نے آج تک کسی میں اتنی جرأت و اعتماد نہیں دیکھا تھا۔

"بہادر دکھائی دیتے ہو ؟ میں بہادروں کی قدر کرتا ہوں۔ تمہارا انداز مناسب نہیں ہے پھر بھی میں اپنے قول کے مطابق تمہیں آج شام تک کچھ نہیں کہوں گا حالانکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم آج شام تک ہمارے علاقے سے باہر نہیں جا سکو گے اور تم آج ہمارے شکار بنو گے"۔ اس کا لہجہ بے حد سفاکانہ ہو گیا تھا۔

"یہ تو وقت بتائے گا کہ شکار کون بنے گا اور شکاری کون ؟ تم میرے سوال کا جواب جلدی دے دو تاکہ میں تمہارے کھیل سے محفوظ ہونے کی کوشش کر سکوں"۔

"مجھے تمہارے شکار میں لطف آئے گا"۔

"میرے خیال میں تم میرا وقت برباد کر رہے ہو۔ مجھ کو چلنا چاہئے"۔

"نہیں تم ایسے نہیں جا سکو گے"۔ وہ اڑ گیا۔

"کیا مطلب ؟" مطیع الدین چونکا۔

"تمہیں حفاظتی تعویذ اپنے گلے میں لٹکانا ہوگا تاکہ ہمارے علاقے میں موجود اپسرائیں تمہیں اپنا شکار نہ بنا سکیں"۔

"تمہارا اشارہ غالباً اس توے کی جانب ہے ؟" مطیع الدین منہ بناتے ہوئے اس کے گلے میں موجود طوق کی جانب دیکھنے لگا۔

"سمجھدار بھی ہو"۔

"مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں، دوسرا میں بلاؤں اور اپسراؤں کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا"۔

"تم اس حفاظتی تعویذ کے بغیر یہاں سے ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے"۔

"بیکار کی ضد چھوڑو، میرا حامی و نگہبان میرا اللہ ہے !"

"میں نہیں جانتا کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو ؟" سردار الجھے ہوئے انداز میں بولا۔

"کیا تم اپنے بارے میں کچھ بتانا پسند کرو گے کہ تم کون لوگ ہو اور یہ کون سا علاقہ ہے ؟"

"ہم !" اس نے قہقہہ لگایا۔ "تم ہمیں نہیں جانتے، حیرت کا مقام ہے۔ تمام جینان جانتا ہے کہ ہم قاز ہیں"۔

"یہ جینان کون ہے ؟"

"اجنبی تم بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے ؟ کہ تم اس وقت عظیم زار کی سلطنت جینان میں ہو"۔ سردار الجھی نگاہوں سے اسے تکنے لگا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے ساتھ ہلکا سا خوف بھی دکھائی دے رہا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ زار کون ہے؟ اور یہ جینان کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ میں تو منگولی سلطنت کا باسی ہوں۔ خیام زریں خیل منگولوں کا دارالحکومت سرائے میری منزل ہے"۔

"منگولی سلطنت ؟" سردار ہچکچاتے ہوئے بولا "کہیں تمہارا اشارہ تموچن کے ملک کی طرف تو نہیں ہے"۔

"ہاں ! وہی تموچن جو چنگیز خان کے نام سے معروف ہے"۔ مطیع الدین نے بتایا۔

"نوجوان !" سردار قدرے توقف کے بعد نرمی سے بولا۔ "تم تموچن کے ملک سے بہت دور نکل آئے ہو۔ یہ جینانی (روسی) سلطنت ہے۔ یہاں زار کی حکومت چلتی ہے۔ اگر تم تموچن کے ملک کی جانب چلنا شروع کرو گے تو تمہیں کم از کم تین ماہ کی مسافت طے کرنا ہوگی تب جا کر تم اس کی سرحدوں پر پہنچ پاؤ گے"۔

سردار کی بات سن کر مطیع الدین کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار پھیل گئے۔ وہ پریشان دکھائی دینے لگا تھا۔ کیا واقعی وہ اتنی دور نکل آیا ہے؟

"تموچن کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ میرے باپ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بڑا ظالم اور ہیبت ناک حکمران تھا مگر وہ ہم سے بڑھ کر ظالم نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم تو انسانوں کے شکاری ہیں"۔

اس کے چہرے پر سفاکی گہری ہونے لگی۔

مطیع الدین اس کی بات پر غور نہیں کر رہا تھا وہ چینائی سلطنت کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ یہ کہاں واقع ہے؟ اس نے کبھی اس بارے میں کچھ سنا نہیں تھا۔ سردار نے اسے پریشان دیکھا تو ایک جانب اشارہ کیا۔ ایک شخص ایک اوسط قامت کا تعویذ لے کر وہاں چلا آیا۔ مطیع الدین اسے دیکھ کر جیسے ہوش میں آ گیا۔ سردار شاید اسے بے خبری کے عالم میں طوق پہنانے کا خواہش مند تھا۔ اس نے سرعت کا مظاہرہ کیا اور سردار کے پہلو میں موجود چینی تلوار کھینچ لی۔ یہ بڑا اہم موقعہ تھا۔ سردار اس کی ہوش مندی اور دلیرانہ جرأت پر عش عش کر اٹھا۔ تلوار مطیع الدین کے ہاتھ میں لہرا رہی تھی۔ سردار اس شخص سمیت تیزی سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔

''اگر تمہیں اپنی جان پیاری ہوگی تو کوئی میری جانب بڑھنے کی کوشش نہیں کرے گا''۔

مطیع الدین نے تیز لہجے میں کہا اور دوسرے لمحے جست لگا کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ قبیلے میں کئی مرد نکل کر اس کی جانب بڑھے۔ ان کے ہاتھوں میں بھالے اور تلواریں موجود تھیں۔ مطیع الدین کے لئے وقت ضائع کرنا بیوقوفی تھی اس لئے اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔

''نوجوان!''۔ سردار چیختی ہوئی آواز میں بولا۔ ''حفاظتی تعویذ تمہیں آفات سے بچا سکتا ہے۔ تم خواہ مخواہ بدگمان ہو رہے ہو''۔

''سردار ؟'' مطیع الدین ہنستے ہوئے بولا۔ ''میں مسلمان ہوں اور میرا یقین ہے کہ کوئی آفت میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی بشرطیکہ وہ اللہ کی جانب سے نہ ہو''۔

''نوجوان ! کھیل اب شروع ہو گیا ہے، اگر تم آج شام سے پہلے پہلے ہمارے علاقے سے زندہ نکل گئے تو کل صبح کا سورج دیکھ پاؤ گے''۔

''تم میں سے کوئی میری راہ میں آیا تو یاد رکھے کہ کل کا سورج وہ نہیں دیکھ پائے گا''۔

مطیع الدین تلوار لہراتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔ سردار نے اپنے باسیوں کو صبر و تحمل کی تلقین کی۔ وہ رات کو بآسانی مطیع الدین کو پکڑ سکتے تھے۔ ابھی رات ہونے میں دو پہروں کا فاصلہ باقی تھا۔



الملک الناصر داؤد الکرک کے شاہی محل کے ایک چھوٹے سے کمرے میں موجود تھا۔ اسے چند ہی لمحے پہلے اطلاع ملی تھی کہ عمادالدین اسماعیل اب الکرک کا رخ کرنے والا ہے۔ وہ جنگی تیاریوں میں مصروف ہے۔ کسی وقت بھی وہ بعلبک سے نکل پڑے گا۔ الملک الناصر داؤد اس کے مقابلے میں خاصا کمزور حکمران تھا۔ اس کا فوجی لشکر اتنا طاقتور اور تعداد میں زیادہ نہیں تھا کہ وہ جم کر عمادالدین اسماعیل کا مقابلہ کر سکتا۔ دوسرا یہ کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ عمادالدین اسماعیل براہ راست میدان جنگ میں لڑنے کے بجائے نفسیاتی داؤ کھیلنے کا ماہر تھا۔ وہ اپنے حریف کو لڑنے سے پہلے ہی ذہنی طور پر مفلوج کر دیا کرتا تھا۔ اس نے اپنی ذہنی سوچ کے مطابق یہ فیصلہ کیا کہ اس معاملے میں الملک الجواد کی مدد لینا مناسب ہوگی۔ یہ اس کا چچیرا بھائی تھا اور حکمران تھا۔ اس نے ایک تیز ہرکارے کے ذریعے تازہ صورت حال اس کے گوش گذار کی اور الملک الصالح عمادالدین اسماعیل کو باز رکھنے کی استدعا کی۔ الملک الجواد چند شرائط پر مدد کرنے پر آمادہ ہو گیا اور اس نے اپنی افواج کے ساتھ 2 ذی قعدہ 637 ھ کو عمادالدین اسماعیل پر اچانک حملہ کر دیا۔ الملک الجواد الملک الناصر کی آڑ میں شاید کسی پرانے زخم کا بدلہ چاہتا تھا اسی لئے اس نے الملک الناصر کو بنیاد بناتے ہوئے بلہ بول دیا۔ عمادالدین اسماعیل کو الملک الجواد کی جانب سے کسی قسم کا خدشہ نہیں تھا۔ اس کے اچانک حملے کے باعث وہ الجھ کر رہ گیا۔ الملک الجواد کے ساتھ صلیبی گروہ ٹیمپلرز کی اکثریت بھی شامل تھی۔ صلیبیوں کو عمادالدین اسماعیل سے کافی شکایات تھیں انہوں اس موقعہ کا

فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ عمادالدین اسماعیل نے ناگہانی آفت سے نمٹنے کے لئے فوری عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بعلبک کے تمام دروازے بند کر دیئے۔ الملک الجواد کی افواج محاصرہ ڈال کر بیٹھ رہیں۔ الملک الناصر کو جب محاصرے کی اطلاع ملی تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔



تونائی خان شام کے وقت نورالدین کے گھر چلا آیا۔ بھرے دربار میں برقائی خان نے جس تلخ انداز میں اس کی عزت افزائی کی تھی وہ اب بھی سانپ بن کر اس کے سینے پر لوٹ رہی تھی۔ اس نے کافی سوچ و بچار کے بعد نورالدین سے ملنے کا فیصلہ کیا تھا۔ نورالدین عصر کی نماز سے فارغ ہوا تھا کہ اسے تونائی خان کی آمد کی اطلاع ملی۔ وہ عجلت کے عالم میں مہمان خانے چلا آیا۔ اس کے ہاتھ میں تسبیح تھی، جس کے دانے وہ بے خیالی میں گرائے جا رہا تھا۔ تونائی خان نے جب نورالدین کا پرنور چہرہ دیکھا تو وہ بڑی اپنائیت سے اٹھ کر اس سے گلے ملا۔ نورالدین نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''تونائی خان !'' نورالدین تشکر آمیز لہجے میں گویا ہوا۔ ''میں اپنے گھر میں تمہاری آمد پر بے حد خوش ہوا ہوں، میرا خیال تھا کہ شاید تم کبھی مجھے اس قابل ہی نہیں سمجھو گے''۔

''نورالدین ! تم بڑے کم ظرف نکلے، میرے بارے میں ایسا سوچتے ہوئے تمہیں ذرا بھی عار نہیں آئی۔ میں آخر تمہارا ہمسایہ ہوں، ہم نے ساتھ ساتھ رہنا ہے، ہنسی خوشی ساتھ رہیں گے تو وقت اچھا گذرے گا۔ دوسرا تم بھی ایک باپ ہو اور میں بھی، ہم دونوں غیر مذہب سہی مگر پدرانہ تقاضے تو بدل نہیں سکتے''۔

''میں معذرت چاہتا ہوں کہ میری بات سے تمہارا دل دکھا۔ میرے کہنے کا مقصد یہ نہیں تھا''۔

''چھوڑو یہ بیکار کی باتیں، اپنے بیٹے کے بارے میں بتاؤ۔ اس کا کچھ پتہ لگا ؟''

''کچھ نہیں !'' نورالدین یکدم آزردہ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر یاسیت چھانے لگی۔ ''اللہ جانے وہ کس حال میں ہے؟ بس وہی اس کا حامی و ناصر ہے۔ وہ جہاں بھی ہے اللہ اسے اپنے امان میں رکھے''۔

''برقائی خان واپس آ گیا ہے ؟ تمہیں معلوم ہے کیا؟'' تونائی خان نے جھک کر پوچھا۔

''ہاں ! وہ سیدھا میرے پاس ہی آیا تھا اور اپنی ناکامی پر خاصا برہم دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اسے صبر و شکر کی تلقین کی تھی''۔

''اوہ ! میرا اندازہ صحیح نکلا''۔

''کیا مطلب ؟''

''برقائی خان تمہیں بے وقوف بنا گیا ہے''۔

''تم کیا کہنا چاہتے ہو ؟''

نورالدین بے چین سا ہو گیا تھا۔

''میرا خیال تھا کہ وہ تمہیں سچائی بتا گیا ہوگا مگر اس میں سچائی بیان کرنے کا حوصلہ ہی نہیں پیدا ہوا''۔ تونائی خان جیسے خود سے باتیں کر رہا تھا۔

''تونائی خان ! صاف صاف کہو کہ کیا بات ہے ؟''

تونائی خان کا چہرہ اچانک اتر گیا۔ وہ اپنا سر جھکائے رنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔

''تونائی خان ! تم چپ کیوں ہو؟'' نورالدین کی آواز کانپنے لگی۔

''نورالدین ! میں بھی ایک باپ ہوں، اولاد کیسے پالی جاتی ہے اور اس کا درد کیا ہوتا ہے؟ یہ میں

اچھی طرح جانتا ہوں۔ کسی کو اس کی اولاد کے بارے میں کوئی بری خبر سنانا کتنا مشکل امر ہوتا ہے؟ یہ شاید میں ہی جانتا ہوں۔ میں تمہارے پاس تعزیت کے لئے آیا تھا مگر یہ دیکھ کر مجھے مزید تکلیف ہوئی کہ تمہیں صریحاً دھوکے میں رکھا گیا ہے۔ تم ابھی تک بے خبر ہو اور یہ سمجھتے ہو کہ تمہارا بیٹا زندہ ہے۔ میں تمہیں یہ کیسے بتاؤں؟ تم جس بیٹے کی زندگی کا تصور کئے بیٹھے ہو وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا''۔

''خدا کے لئے ایسے جملے تو منہ سے مت نکالو تو نائی خان''۔ بے ساختگی میں اس کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔ دوسرے لمحے وہ کسی کٹے پیڑ کی مانند زمین بوس ہو گیا۔ تو نائی خان تیزی سے اس کی جانب لپکا اور اسے سہارا دیتے ہوئے اُٹھا کر بمشکل کرسی پر بٹھایا۔ اس نے قریب موجود پانی کی صراحی سے نورالدین کے چہرے پر چھینٹے مارے۔ کافی کوشش کے بعد نورالدین کو ہوش آیا۔ وہ بے رونق آنکھوں سے اس کی صورت دیکھے جا رہا تھا کہ شاید تو نائی خان اپنے سابقہ جملے کی تردید میں کچھ کہے۔ وہ بجھا بجھا سا اور مضمحل دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے کچھ بولنا چاہا مگر تو نائی خان نے ہاتھ سے اُسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ نورالدین کی حالت ایسی تھی جیسے اس پر پہاڑ آن پڑا ہو۔

''میں تمہاری بات پر کیسے یقین کرلوں ؟'' وہ نحیف سی آواز میں بولا۔

''یقین !'' تو نائی خان نے ایک گہرا سانس لیا، خود اس کا چہرہ بھی اترا ہوا دکھائی دینے لگا۔ ''میرے عزیز ! اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو شاید ایسا ہی سوال کرتا۔ کسی باپ کے لئے یہ یقین کر لینا کہ وہ اولاد کی نعمت سے محروم ہو گیا خاصا دشوار امر ہوتا ہے۔ مگر جو ہو چکا ہوتا ہے اس سے منہ بھی نہیں موڑا جا سکتا''۔

''تو نائی خان ! تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟'' نورالدین نے سوال کیا۔ تو نائی خان جواب اپنے ذہن میں ترتیب دینے لگا۔

''میں آج ہی شاہی دربار گیا تھا وہاں برقائی خان کی آمد پر شاندار ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔ میں بھی اس میں شامل تھا۔ برقائی خان سرود و مستی میں ایسا محو ہوا کہ اُسے کچھ ہوش باقی نہ رہا۔ شراب کے خمار نے ایسی باتوں کو اُگل ڈالا جو شاید وہ ہوش میں کبھی تسلیم نہ کرتا۔ اس نے بڑے فخریہ انداز میں یہ اقرار کیا کہ اس نے خود سرکیشی پہاڑی پر مطیع الدین کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور الزام سرخوں کے سر تھوپ دیا۔ میں چونکہ اس کے بے حد قریب تھا، اس لئے دیگر احباب کی نسبت مجھے اس کی باتوں کی زیادہ سمجھ آئی۔ میں اس کے اچانک انکشاف سے چونک پڑا۔ صرف میں ہی دربار میں ایسا شخص تھا جو یہ جانتا تھا کہ مطیع الدین کون ہے؟ اور سرکیشی پہاڑی کا معاملہ کیا تھا؟ ہمارے پاس ہی باتو خان بھی موجود تھا۔ اس نے معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے فوری طور پر دربار برخاست کر دیا اور برقائی خان کو وہاں سے ہٹا دیا۔ بعد میں باتو خان نے مجھے یہ خاص ہدایت کی تھی کہ میں اس راز کو طشت از بام نہ کروں، ورنہ سلطنت میں بدامنی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے خلاف ایک نئی لہر اُٹھ کھڑی ہوگی۔ برقائی خان انجانے میں حماقت کر بیٹھا ہے''۔

تو نائی خان اپنی سی کہے جا رہا تھا۔ نورالدین ڈوبتے دل سے اس کے زہر آلود جملے سن رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کی سماعت اس کا ساتھ چھوڑتی جا رہی ہو۔ تو نائی خان کا جملہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ کافی دیر کے بعد وہ اسے ہوش میں لانے میں کامیاب ہوا۔ نورالدین کا چہرا صدیوں کے بیمار کا سا دکھائی دے رہا تھا۔ تو نائی خان اس کی ڈھارس بندھاتا رہا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ نورالدین اسے اپنا ہمدرد سمجھ رہا ہے تو وہ اپنے اصلی مدعا کی طرف متوجہ ہوا۔

''نورالدین! میں نے سنا ہے کہ تمہارے مذہب میں ظلم برداشت کرنا بھی گناہ ہے ؟''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو ؟''

''میں ایک باپ ہونے کے ناطے تمہارے درد کا حصہ دار بننا چاہتا ہوں اور ایک ظالم کو کیفرِ کردار پہنچانے کا خواہش مند ہوں۔ باتو خان سے میں وعدہ کر چکا ہوں، میں اپنی زبان بند رکھوں گا مگر مجھ سے تمہارا حال دیکھا نہیں جا رہا۔ اس لئے حقیقت تمہارے گوش گذار دی۔ اب میں اتنا کچھ کر چکا ہوں تو میری خواہش یہ بھی ہے کہ تمہیں ہر قیمت پر انصاف دلایا جائے''۔

''میں صبر کے علاوہ اب کیا کر سکتا ہوں ؟'' نورالدین روہانسا ہو کر بولا۔

''تم یہ مت سمجھو تم منگولی سلطنت میں ہو اور یہاں تمہیں انصاف نہیں ملے گا۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا اور تمہیں انصاف دلانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھوں گا۔ تم میرے ساتھ کل کو تو الی چلنا اور برقائی خان کے خلاف مقدمہ درج کرا دینا''۔

''میں اس بارے میں ابھی سوچوں گا کہ مجھے کیا قدم اُٹھانا چاہئے؟ دوسرا میرے پاس برقائی خان کے خلاف کوئی ثبوت بھی تو نہیں ہے''۔

''ثبوت میں ہوں نا !'' تو نائی خان تیزی سے بولا۔ ''تم اب آرام کرو۔ میں کل صبح پھر آؤں گا پھر اس سلسلے میں مزید بات ہوگی''۔

نورالدین نے نحیف انداز میں اثبات میں گردن ہلائی۔ تو نائی خان کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا اس کے بعد وہ وہاں سے رخصت ہو گیا۔ تو نائی خان کی اطلاع نے نورالدین کو نڈھال کر دیا تھا۔ ایسی تکلیف دہ حالت میں بھی اس کے دل کے کسی گوشے سے دبی دبی سی آواز اُٹھ رہی تھی ایسا کچھ نہیں ہے۔ تو نائی خان صریحاً جھوٹ بول رہا ہے۔ برقائی خان ایسا نہیں کر سکتا؟ اگر وہ ایسا کرتا تو اس کے پیچھے کوئی وجہ تو ہوتی۔ تو نائی خان کی باتوں میں کچھ ایسا ضرور موجود تھا جو نورالدین کو مطمئن نہیں کر پایا تھا۔



7 ذی قعدہ 637ھ میں مصری امراء کی مجلس انتخاب نے رائے شماری کا عمل مکمل کر لیا اور اسی شام بلادِ مصر کے لئے نئے سلطان کے طور پر نجم الدین ایوب کے نام کا حتمی اعلان کر دیا گیا۔ جمال الدین المراحی نے جانب داری کا الزام لگاتے ہوئے خاصا واویلا مچایا مگر اس کی ایک نہ چلی۔ غازی عبداللہ شافعی کی چلائی گئی تحریک نے کام دکھا دیا تھا۔ امراء کا مختصر طبقہ جو کہ عماد الدین اسماعیل کا حامی تھا، محض اس لئے خاموش ہو کر رہ گیا تھا کہ عماد الدین اسماعیل کے بارے میں الملک الجواد کی جنگ کی متضاد خبروں نے اس کی شہرت خراب کر دی تھی۔ یہ بھی غازی عبداللہ شافعی کا ہی کارنامہ تھا۔ اعلان کے اگلے دن نجم الدین ایوب کو قاہرہ آنے کی باقاعدہ دعوت بھجوا دی گئی تھی۔ جمال الدین المراحی نے حالات کو پوری طرح اپنے ہاتھوں سے نکلتے دیکھ کر قاہرہ سے فرار ہونا چاہا مگر چند امراء نے اس کے منصوبے کو بروقت ناکام بنا دیا۔ یہ اُمراء کا وہ طبقہ تھا جو ماضی میں اس کی چال بازیوں کا شکار ہوا تھا، وہ کسی صورت میں اسے وہاں سے نکلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس کے گھر کے گرد پہرہ لگا دیا گیا۔ اعلان کے اگلے ہی دن جمال الدین المراحی کے خلاف الزامات کی طویل فہرست قاضی القضاۃ کے دفتر میں داخل کرا دی گئی تھی۔ جمال الدین المراحی کو اب صاف دکھائی دے رہا تھا کہ ذلت و رسوائی اس کا مقدر بننے والی ہے۔ اسے اپنی ذلت کا احساس ہونے لگا مگر وہ بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ عماد الدین اسماعیل کی جانب سے ہلکی سی امید ابھی تک باقی تھی مگر وہ خود الملک الجواد کے ہاتھوں محصور تھا۔



مطیع الدین اس عجیب گاؤں سے نکل تو آیا تھا مگر وہ ابھی تک صحیح راستے سے بے خبر تھا۔ کوئی واضح اشارہ موجود نہیں تھا۔ وہ سرائے کی جانب بڑھنا چاہتا تھا مگر قدرت اسے سرائے سے اتنا ہی دور کئے جا رہی تھی۔ وہ بھٹکتا ہوا روسی سلطنت کے بالائی حصوں میں پہنچ گیا تھا۔ سرد ہواؤں نے اسے الگ پریشان کر رکھا تھا۔ ازقائی سردار مانجی خان نے اسے سچ کہا تھا کہ وہ اس کی رہنمائی کے بغیر سرائے نہیں پہنچ سکے گا۔ وہ اس وقت کو کوسنے لگا جب اس نے بے وقوفی کرتے ہوئے ازقائی قبیلے سے قدم نکالا تھا کم از کم وہ اس وقت محفوظ تو تھا اور سرائے کے قریب بھی تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا ؟ وقت ہاتھوں سے پھسل چکا تھا۔ اسے سرائے تک پہنچنے کے لئے تین ماہ کی مسافت طے کرنا تھی اور ساتھ ہی عجیب قاژ باشندوں سے بھی محفوظ رہنا تھا۔ قاژی سردار نے بڑے اعتماد سے اسے کہا تھا کہ وہ رات تک اُن کا شکار بن جائے گا۔ اسے جلد از جلد اس بھیانک علاقے سے نکلنا تھا۔ مگر وہ کس طرف سفر کرتا ؟

اس کا گھوڑا اس کے ذہن میں اُٹھنے والی سوچوں کے دھارے کی رفتار کے ساتھ مسلسل بھاگ رہا تھا۔ اچانک کسی بات نے اس کے ذہن پر دستک دی تو وہ چونک پڑا۔ گھوڑے کی لگامیں خود بخود کھنچتی چلی گئیں۔ وہ یکدم رُک گیا پھر دوسرے ہی لمحے وہ جست لگاتے ہوئے گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ ایک خفیف سا اشارہ اس کے ذہن میں ابھرا تھا۔ قاژ سردار نے تموچن کے ملک کا ذکر کرتے ہوئے ایک مخصوص جانب گردن گھمائی تھی۔ یہ نہایت اہم بات تھی۔ اس نے لاشعوری طور پر اسے اشارہ دے دیا تھا کہ تموچن کا ملک کس جانب ہے ؟ اس وقت مطیع الدین کا ذہن دوسری جانب الجھا ہوا تھا اس لئے وہ فوری سمجھ نہیں پایا تھا۔ اب جبکہ وہ گھوڑے کی پشت پر قاژی سردار کی باتوں پر لگاتار غور کر رہا تھا تو اس کی یہ حرکت ذہن میں آ گئی۔ اب مشکل یہ تھا کہ وہ اس اشارے کو صحیح سمت دے پاتا کیونکہ وہ راستے میں کئی بل کھا چکا تھا۔ یہ خدائی مدد ہی تھی کہ اسے قاژی سردار کی معمولی سی حرکت یاد آ گئی تھی۔ اس نے گھوڑے کی لگامیں ڈھیلی چھوڑتے ہوئے اپنے ذہن پر مزید زور دینے کی کوشش کی کہ اس گاؤں سے نکلنے کے بعد اب تک وہ کتنے موڑ کاٹ چکا ہے۔ یہ خاصا پیچیدہ مرحلہ تھا۔ اسے سفر کرنا چاہئے تھا۔ اس کے پاس وقت بہت کم تھا۔ سورج غروب ہوتے ہی قاژی باشندے اس کے شکار پر نکل پڑتے۔

• مطیع الدین کافی دیر تک اسی کشمکش میں الجھا رہا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور اس نے زمین پر چھوٹی تلوار کی نوک سے گاؤں کا نقشہ بنانا شروع کر دیا۔ وہ اپنے حافظے کی تمام قوتوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کس جانب سے گاؤں میں داخل ہوا، وہ اجنبی لڑکی کس جانب چلی گئی۔ سردار کس طرف سے اس کی جانب بڑھا۔ دونوں کس رُخ سے آپس میں باتیں کرتے رہے۔ اس نے گاؤں میں موجود تمام چیزوں کو زمین پر نشانات کے ذریعے کھود ڈالا تھا۔ وہ سردار کی گردن کے اشارے کی مناسبت سے وہ رُخ معلوم کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ گاؤں سے جس رُخ نکلا تھا وہ اسے معلوم ہو گیا تھا مگر اب وہ کہاں پہنچ گیا تھا؟ یہ ابھی تک مسئلہ بنا ہوا تھا۔ وہ اپنے ذہن کو مزید کھنگالنے کی کوشش کرنے لگا مگر ہر طرف سے ناکامی ہی سامنے آتی رہی۔

وہ اب سوچ رہا تھا کہ کیا اُسے دوبارہ اسی گاؤں لوٹنا چاہئے؟ تاکہ وہ صحیح سمت کی جانب گامزن ہو سکے مگر قاژی سردار نے اسے سورج غروب تک کی مہلت دی ہے۔ اگر وہ واپسی کے بارے میں سوچتا تو سورج غروب ہونے تک وہ گاؤں سے زیادہ دور نہیں جا سکتا تھا۔ اچانک ایک خیال بجلی کی مانند اس کے ذہن میں کوندا۔ جب وہ سردار کے ساتھ محو گفتگو تھا تو سورج کس سمت میں تھا۔ اس نے غیر ارادی طور پر سورج کو دیکھا بھی

تھا۔ یہ بات بڑی اہم تھی۔ اس نے تھوڑا سا ذہن پر زور دیا تو وہ سورج کی سمت یاد کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس وقت سورج اس کے دائیں پہلو پر تھا اور سردار کی گردن خفیف انداز میں بائیں جانب گھومی تھی۔ یعنی اسے ڈھلتے سورج کے بائیں پہلو کی جانب سفر کرنا چاہئے۔ اس نے سورج کی جانب دیکھا تو چہرے پر بشاشیت سی پھیل گئی۔ اس نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے عالم سرشاری میں نعرہ لگایا اور سرعت سے گھوڑے کی پیٹھ پر جا بیٹھا۔ اس نے ایڑ لگائی اور گھوڑا ایک بار پھر ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ اسے اپنی منزل کا سراغ مل چکا تھا۔ اب وہ سرائے پہنچ سکتا تھا۔ اس نے کسی قیام کے بغیر اپنے سفر کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ اسے چینائی سلطنت سے جلد از جلد نکلنا تھا۔ قاژی باسی اس وقت تک اس کا مسلسل تعاقب کرتے رہیں گے جب تک وہ ان کی حدود سے نکل نہیں جاتا۔ ویسے بھی تین ماہ بہت زیادہ مدت تھی۔



27 ذی قعدہ 637ھ کو نجم الدین ایوب مصری امراء کی دعوت پر مصر پہنچا۔ مشہور مورخ ابن خلکان بھی اس دن مصر کے دار الحکومت قاہرہ میں موجود تھا۔ وہ خصوصی طور پر اُس دن کی مناسبت سے نئی تاریخ رقم ہوتی دیکھ رہا تھا۔ جس دن نجم الدین ایوب مصر میں داخل ہوا وہ اتوار کا دن تھا اور دوپہر کے دو بجے کا وقت تھا۔ مصری امراء کی بڑی جماعت نے بڑے پرتپاک انداز میں اس کا خیر مقدم کیا۔ یہ دوسرا استقبال تھا۔ اس سے پہلے قاہرہ سے باہر الحماء میں قاضی عبداللہ شافعی اور اس کے حلیف امراء نے انہیں خوش آمدید کہا اور پھر وہ بڑے جلوس کی شکل میں قاہرہ میں داخل ہوئے۔ نجم الدین ایوب کے ہمراہ اس کا عم زاد الملک الناصر داؤد حاکم الکرک بھی تھا۔ بہاء الدین زہیر، ابو خولید اور بیبرس اس کے اطراف میں چل رہے تھے۔ مصری امراء کے ساتھ ساتھ رعیت کا جوش و خروش بھی دیکھنے کے لائق تھا۔ نجم الدین ایوب خود بھی متحیر تھا کہ اس کی ذات کب سے اتنی اہم بن گئی تھی؟ وہ امراء اور رعیت کے جلو میں شاہی محل کے سامنے پہنچا۔ یہاں عام دربار لگایا گیا تھا۔ زریں مزین قالینوں نے خاک اور دھول کا نام و نشان مٹا ڈالا تھا۔ نجم الدین ایوب اس دن سفید عربی لباس میں ملبوس تھا، سفید عمامہ اس کے سر پہ تھا اور سفید جبہ اس کے کاندھوں پر لہرا رہا تھا۔ وہ بڑی شان سے تخت کے چبوترے پر جلوہ افروز ہوا۔ امراء کی خاص جماعت بھی اس کے ہمراہ موجود تھی۔ جبکہ دیگر امراء معززین تخت کے چبوترے کے نیچے کھڑے اس کے حق میں نعرہ بازی کر رہے تھے۔

یہ سلسلہ کچھ دیر یونہی چلتا رہا۔ ایک ضعیف العمر شخص آگے بڑھ کر چبوترے کے کنارے پر آن کھڑا ہوا تو لوگوں پر سکوت چھا گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سامنے کی جانب بلند کئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء سے آغاز کیا پھر وہ اپنے موضوع کی جانب پلٹا۔

"برادران اسلام ! یہ بڑا اہم وقت ہے، ہم گذشتہ ایک ماہ سے ایک غیر محفوظ زندگی بسر کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی کہ ہم مل بیٹھ کر باہمی رضامندی سے اپنے جان و متاع کی حفاظت کا انتظام کر سکیں۔ ہمارے ملک میں چند شر پسند عناصر کے منصوبوں کے تحت بدامنی پھیل رہی تھی، سابق سلطان چونکہ کم عمر تھا اور وہ ملک کے انتظام سنبھالنے سے قاصر تھا اس لئے اسے معزول کر دینا ہی بہتر تھا۔ سلطان سیف الدین ابو بکر نے ملکی انتظام نااہلوں کے سپرد کر کے بیت المال کو بھی نقصان پہنچایا اور خوشامدی لوگوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کرتے ہوئے شرفاء کی پگڑیاں بھی اچھالیں ایسے میں ہمیں ایسے شخص کی ضرورت محسوس ہوئی جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کو رائج کر کے ملک میں سے بدامنی کی اس ناپاک فضا کو صاف کرے۔ آپ سب لوگوں نے مجھے مجلس انتخاب کا سربراہ بنا کر بھاری ذمہ داری میرے کندھوں پر ڈال دی تھی۔ میں نے

امراؤ شرفاء سے فرداً فرداً رائے طلب کرتے ہوئے جس شخص کو آپ کے نئے سلطان کے طور پر چننا تھا اس میں وہ سب خوبیاں ہونا ضروری تھیں جو آپ کی اور ملک کی ضرورت تھی۔ ایسے شخص کو منتخب کرنا میرے لئے بڑا اہم تھا۔ میں نے ذات باری تعالیٰ سے دُعا کی کہ وہ مجھے صحیح راہ دکھا کر سب کے سامنے سرخرو کرے۔ الحمد اللہ ہمیں رب تعالیٰ نے ایسا شخص میسر کیا کہ ہم اس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے نفاذ کی توقع کر سکیں۔ مجھے جو رائے شماری آپ کی جانب سے ملی اس میں بھاری اکثریت نجم الدین ایوب کے حق میں تھی۔ میں نے آپ کی آراء و خواہش کا احترام کرتے ہوئے نجم الدین ایوب کو یہاں آنے کی دعوت دی۔ ابوالمظفر نجم الدین ایوب اب آپ کے سامنے موجود ہیں، میں آپ سب کی خواہش پر عمل کرتے ہوئے ان کی بیعت کر کے انہیں بلادِ مصر کا نیا سلطان تسلیم کرتا ہوں"۔

وہ قدرے مڑ کر نجم الدین ایوب کی جانب متوجہ ہوا۔ نجم الدین ایوب بڑی سادگی سے اپنی جگہ سے اُٹھا اور اس کے برابر آ کھڑا ہوا۔ اس عمر رسیدہ شخص نے دونوں ہاتھوں سے اس کا دایاں ہاتھ پکڑا اور اس کی پشت پر بوسہ دیا۔ اللہ اکبر کا فلک شگاف نعرہ بلند ہوا۔ بیعت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ امرأ ایک ایک کر کے چبوترے پر آتے اور بیعت کرتے۔ یہ سلسلہ عصر کی نماز تک جاری رہا۔ نماز کی ادائیگی جامع قاہرہ میں ہوئی۔ نماز کے بعد معزول سلطان کے بارے میں فیصلے کا اختیار نجم الدین ایوب کو سونپ دیا گیا۔ اسی وقت معزول سلطان سیف الدین ابوبکر کو ایک بڑی پالکی میں بٹھا کر سپاہیوں کے دستے کے جلو میں وہاں لایا گیا۔ شاہی محل کے چبوترے کے سامنے سیف الدین ابوبکر کو پالکی میں نکالا گیا۔ اس کے ہاتھ پیروں میں لوہے کی بیڑیاں ڈالی گئی تھیں۔ نجم الدین ایوب اپنے چھوٹے بھائی کی حالت دیکھ کر بے چین سا ہو گیا۔ وہ بھائی جسے اس نے بڑی محبت سے اپنے ساتھ رکھا تھا، وہ اس کے سامنے پابہ زنجیر کھڑا تھا۔ سیف الدین ابوبکر نے جب بڑے بھائی کو سامنے دیکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس کی گردن ندامت کے مارے جھک گئی تھی۔ وہ بھائی، جس کے خلاف وہ دوسروں کی باتوں میں آ کر دشمنوں کو اکساتا رہا اور اسے جان سے مارنے کی راہیں ڈھونڈتا رہا۔ وہ آج اس کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا اختیار رکھے ہوئے تھا۔

امرأ و عام بڑے انہماک سے فیصلے کے منتظر تھے۔ حاضرین ایسے خاموش تھے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ نجم الدین ایوب کو بڑا تکلیف دہ فیصلہ کرنا تھا۔ نجم الدین ایوب نے ایک گہرا سانس لیا اور دھیمے قدموں اس کی جانب بڑھا۔ وہ اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔ سیف الدین ابوبکر نے نگاہ اُٹھا کر اس کی جانب مترحم نگاہوں سے دیکھا۔ اسی لمحے ان کا عم زاد الملک الناصر داؤد چبوترے سے نیچے اتر کر دونوں کے پاس پہنچ گیا۔

"کیا ہمارے باپ نے وراثت کی تقسیم میں کوئی دھاندلی یا جانبداری کی تھی؟ کیا اس نے ہمیں ہماری حیثیت کے مطابق ہمیں پورا پورا حصہ نہیں دیا تھا؟ کیا اس نے مرتے وقت ہم سب کو باہم اتفاق و محبت سے رہنے کی تلقین نہیں کی تھی؟ اگر ایسا ہی تھا تو پھر تم نے یہ سب کیوں کیا؟" نجم الدین ایوب کی آواز میں گہرا دردا و شکوہ تھا۔ سیف الدین ابوبکر سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

"تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو ؟"

سیف الدین ابوبکر نے نظریں جھکا لیں۔

"میں تمہیں پورا پورا موقع دے رہا ہوں میرے بھائی ! میں یہ نہیں چاہتا کہ غم و غصہ میں مجھ سے کوئی غلط قدم اُٹھ جائے"۔

"میں ناسمجھی و نادانی میں بہک گیا تھا بھائی جان " سیف الدین ابوبکر کے لبوں پر حرکت ہوئی۔

اس کے لہجے میں ندامت عیاں تھی۔ نجم الدین ایوب اس کے جواب پر آگ بگولہ ہو گیا۔ اس کا پورا جسم فرط طیش میں لرزنے لگا۔ چہرہ سرخی سے دہکنے لگا۔ اسے توقع تھی کہ وہ کوئی ایسی بات کرے گا جس سے وہ اپنا جرم کسی دوسرے کے سر تھوپ دے گا مگر اس کے براہ راست اقرار جرم نے نجم الدین ایوب کو گہرے صدمے سے دوچار کیا تھا۔

"نجم الدین " ایک ہاتھ اس کے کندھے پر دباؤ ڈالنے لگا۔" غصہ تھوک دو، یہ حرام ہوتا ہے"۔

نجم الدین ایوب کی شعلہ بار نگاہیں اس آواز کی جانب گھوم گئیں۔ الملک الناصر داؤد اسے آنکھوں سے اشارہ کرتا دکھائی دیا۔ دوسرے لمحے نجم الدین ایوب کا سر غم و غصہ سے جھک گیا۔

"اگر عام فرد غلطی کرے تو شاہ معاف کرتے ہیں مگر جب شاہ غلطی کرتے ہیں تو قدرت انہیں سزا دیتی ہے۔ یہ ہی دستور ہے۔ تم نے غلطی کی، میرے ساتھ زیادتی کی، میں تمہیں معاف کر سکتا ہوں مگر تم تو رعیت کے بھی جرم دار ہو، رعیت نے تمہیں معاف نہیں کیا اور آج اس حال میں پہنچا دیا اور آج وہ مجھ سے انصاف کی توقع لئے کھڑے ہیں اور میں سخت مشکل میں ہوں کہ امور جہانبانی کا تحفظ کروں یا خون کے رشتوں کے تقدس کا"۔

"نجم الدین !" الملک الناصر داؤد بول پڑا۔" بہتر یہی ہوگا کہ تم اسے زنداں خانے میں بھیج دو۔ اس طرح تمہاری ذات پر حرف بھی نہیں آئے گا اور اللہ کے سامنے تم شرمندہ بھی نہیں ہو گے۔ اگر تم اسے ہلاک کر دیتے ہو تو بظاہر یہ عمل خراج تحسین ہوگا لوگ خوش ہو جائیں گے مگر تم روز محشر اپنے باپ کو کیا جواب دو گے؟ جس نے اپنا یہ بیٹا تمہارے سپرد کیا تھا اور پھر اپنے اللہ کو کیا منہ دکھاؤ گے"۔

نجم الدین ایوب اس کی بات سن کر تڑپ سا گیا وہ قدرے چیختے ہوئے بولا۔ "میری نظروں کے سامنے سے اسے دور لے جاؤ۔ اس کا چہرہ ہمیشہ کے لئے میری نگاہوں سے اوجھل کر دو اور زنداں خانے میں پڑا رہنے دو، وہی اس کا انجام ہے"۔

سپاہیوں کے دستے نے فوری حکم کی تعمیل کی اور اسے پالکی میں بٹھا کر واپس اسی زنداں خانے کی جانب لے گئے، جہاں سے اسے کچھ دیر پہلے لایا گیا تھا۔ نجم الدین ایوب حسرت بھری نگاہوں سے اپنے جان سے عزیز بھائی کو بدترین انجام کی جانب جاتے دیکھتا رہا۔ اس کے پہلے فیصلے پر امرأ نے اس کے حق میں نعروں کا طوفان برپا کر دیا۔ وہ نجم الدین ایوب کی دلی کیفیت سے ناآشنا اپنی دھن میں بلہ گلہ کر رہے تھے۔ الملک الناصر داؤد نے اس کی ڈھارس بندھائی اور گلے سے لگایا۔



تو نائی خان اگلی صبح نور الدین سے ملنے کے بجائے قبیلہ سرخ کی جانب نکل گیا۔ وہ بڑی احتیاط سے ایک بڑا کھیل رچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک جانب اس نے نور الدین کو ورغلانے کی کوشش کی تھی اور تمام الزام برقائی خان کے سر تھوپ دیا تھا۔ دوسری جانب وہ اپنے بیان کو حقیقت کا روپ دینے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اس نے ایک عقل مند اور ہوش مند باپ ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ دربار میں ہونے والی ذلت و رسوائی کے بعد اپنی بیٹی پر چڑھائی کر دیتا۔ اس نے گل دتوژ کو کانوں کان خبر بھی نہ ہونے دی کہ وہ جان چکا ہے کہ مطیع الدین ہی اس کا محبوب ہے جس کے لئے وہ ازقائی قبیلے میں گئی تھی اور اپنے باپ سے جھوٹ بولنے پر مجبور ہوئی تھی۔ ممکن تھا کہ اس کی بیٹی کی پسند کوئی منگول ہوتا تو وہ حالات سے سمجھوتہ کر لیتا مگر ایک مسلمان سے رشتہ جوڑنا اس کی فطرت کے سراسر خلاف تھا۔ تمام زندگی اس نے چنگیز خان کی قیادت میں مسلمانوں کا خون بہایا تھا۔ اب وہ ان کے سامنے کیسے جھک جاتا؟ یہ کسی بھی صورت ممکن نہیں تھا۔ اس نے برقائی خان کی عزت افزائی

کا بدلہ اسی کے ہتھیار سے لینے کی ٹھانی تھی۔ وہ نورالدین کے ہاتھوں برقائی خان کو ذلیل کرانا چاہتا تھا۔ اس طرح وہ باتو خان کے شاہی عتاب سے بھی بچ سکتا تھا اور اپنی بیٹی کو بھی مطیع الدین سے متنفر کر سکتا تھا۔ بس اسے صرف اس بات کی فکر لاحق تھی کہ اس کے منصوبے کی تکمیل سے قبل مطیع الدین واپس نہ لوٹ آئے۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ برقائی خان جیسا شخص اگر اسے ڈھونڈنے میں ناکام رہا ہے تو واقعی مطیع الدین جلد واپس نہیں آ سکے گا۔ یا وہ کسی بڑی مصیبت میں مبتلا ہو چکا ہے یا پھر وہ منگولوں کی سرزمین میں بھٹک گیا ہے۔ بھٹکے ہوئے مسافر دیر سے گھر لوٹا کرتے ہیں۔ یہ ایک مشہور منگولی کہاوت بھی تھی۔

وہ شام ہونے سے پہلے ہی قبیلہ سرخ میں پہنچ گیا تھا۔ سرخوں کے نئے سردار اور اس کے سسر سنک آنہ نے اس کا خیر مقدم کیا۔ وہ لمحہ بھر کے لئے اس کی صورت دیکھ کر متعجب بھی ہوا تھا۔ اس نے اس سے خیریت طلب کی تو تو تائی خان نے کچھ دیر آرام کرنے کے بعد بات کرنے کا عندیہ دیا۔ جس پر وہ چپ ہو گیا۔ جب رات کا آغاز ہوا تو کھانے کا دستر خوان لگایا گیا۔ دونوں نے گھر کے افراد سے الگ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ جب وہ دونوں کھانا کھا چکے تو سنک آنہ نے اس کی اچانک آمد کی وجہ دریافت کی۔ تو تائی خان کافی دیر سے لفظوں کو ترتیب دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ بات کا سلسلہ کہاں سے شروع کرے؟ اس نے بڑے گاؤ تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے اسے مختصر لفظوں میں مطیع الدین کے بارے میں بتایا۔ اس کے بعد اس نے اپنی بیٹی کی وابستگی کا بھی ذکر کیا۔ سنک آنہ بھی ایک مسلمان سے نواسی کا تعلق سن کر سناٹے میں آ گیا۔ جب برقائی خان کے بھرے دربار کا سلوک تو تائی خان نے بیان کیا تو سنک آنہ جل بھن کر رہ گیا۔ وہ برقائی خان کی بڑی عزت کرتا تھا مگر اپنے خاندان پر وہ کسی بھی حملے کو برداشت کرنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ تو تائی خان نے اسے اپنے پھینکے ہوئے تیر کے بارے میں بھی آگاہ کر دیا اور نورالدین کے ہاتھوں برقائی خان کو ذلیل کرانے کا بھی منصوبہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ جب تو تائی خان اپنی کہہ کر خاموش ہو گیا تو سنک آنہ بولا۔

''تو تائی خان! مجھے تمہارے ساتھ پوری ہمدردی ہے، تم مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ ہی پاؤ گے۔ برقائی خان نے تمہاری بیٹی پر نہیں بلکہ میری نواسی پر انگلی اٹھائی ہے۔ اس کی انگلی کے جواب میں پورا ہاتھ توڑ دینا ہی مردانگی ہے۔ میں ابھی تک یہ سمجھ نہیں پایا کہ تمہیں فوری طور پر میرے پاس آنے کی ضرورت کیوں پڑی؟''

''آپ شاید میرا مقصد نہیں سمجھ پائے۔ میرا یہاں آنے کا ایک ہی مطلب ہے کہ آپ کسی بھی صورت یہ اقرار نہیں کریں گے کہ مطیع الدین کو کبھی سرخوں نے اغوا کیا تھا۔ جب چرخ ہائی کا قضیہ ابھرے گا تو اسے عبادت شب خوں کے آغاز کا شوشہ قرار دیا جائے گا۔ سردار رقباز ائی خان اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے بغاوت کر کے منگولیانہ قوانین کو توڑنا چاہتا تھا اسی لئے برقائی کے حملے کی نوبت آئی''۔

''اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟''

''اس میں ہی تو میرا فائدہ ہے، جب نورالدین بھرے دربار میں برقائی خان پر الزام لگائے گا کہ وہ اس کے بیٹے کا ہتھیارا ہے تو برقائی خان ثبوت میں آپ کا نام لے گا کہ سرخوں نے مطیع الدین کو اغوا کر لیا تھا اس نے اسے قتل نہیں کیا تو آپ کو طلب کیا جائے گا اور تصدیق مانگی جائے گی۔ اگر آپ اس موقع پر ترنت ہی وعدے سے منکر ہو جاتے ہیں تو برقائی خان مجرم بن جائے گا۔ اس کے پاس دوسرا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ وہ یہ ثابت کر سکے کہ مطیع الدین کو اس نے نہیں قتل کیا۔ رہا ازقائی قبیلے کا تعلق، تو وہ میں سنبھال لوں گا۔ انہیں بھی سرخوں کے گھر میں ڈاکہ ڈالنے کی سزا ملنا چاہئے۔ بس ایک چھوٹا سا پیغام آپ کی جانب سے انہیں پہنچ جانا چاہئے''۔

سنک آنہ نے چھوٹا سا قہقہہ لگایا۔ وہ تو تائی خان کی فتنہ انگیزی کو اب پوری طرح سمجھ پایا تھا۔ تو تائی خان

اس کے قہقہے پر مطمئن دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب برقائی خان کیسے بچ سکے گا؟



دوسرے روز صبح کے وقت جمال الدین الراجی کو پابہ زنجیر نجم الدین ایوب کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ ابھی تک اپنے خاص شاہی کمرے میں ہی تھا۔ طبقہ امرا نے جہاں اس سے بہت سی توقعات وابستہ کر رکھی تھی وہیں وہ تمام معاملے جلد از جلد نمٹانے کے خواہش مند تھے۔ سابقہ حکومت کے بہت سے امور ادھورے پڑے تھے۔ وہ سب ایک ہی دن میں مکمل کرانے کے خواہش مند دکھائی دیتے تھے۔ نجم الدین ایوب کو ان کی جلد بازی پر غصہ بھی آیا اور ہنسی بھی۔ صبح سویرے جمال الدین کا چہرہ دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یہی وہ منحوس شخص تھا جس کے باعث اس کا معصوم بھائی زنداں خانے میں پہنچ چکا تھا۔ اسی کی بدولت نجم الدین ایوب کے ہاتھوں سے بلاد شرقیہ نکل گئے تھے اور قید کی صعوبت برداشت کرنا پڑی تھی۔

''اس بدبخت کو کیوں صبح صبح میرے سامنے لائے ہو؟''

''سلطان محترم! امرا و شرفاء کا خیال ہے کہ اس کا قضیہ جلد از جلد نمٹا دینا چاہئے۔ اس پر الزامات کی ایک طویل فہرست موجود ہے، اس کی بدعنوانیوں اور لوٹ مار کے ثبوت مل چکے ہیں لہٰذا اسے سزا سنا دینی چاہئے''۔

''یہ معاملہ دربار میں بھی پیش کیا جا سکتا تھا، ہماری خلوت میں کیوں اسے لایا گیا ہے؟''

''یہ میری خواہش تھی ابوالمظفر کہ دربار میں پیش کرنے سے پہلے مجھے ایک بار تخلیے میں ملاقات کا موقع ضرور دیا جائے''۔

''تمہیں میرے ساتھ ملاقات کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟ تمہیں اپنے کئے کا پھل تو مل کر ہی رہے گا''۔ نجم الدین ایوب استہزائیہ لہجے میں بولا۔

''کسے کس چیز کا پھل ملے گا؟ یہ تو وقت ہی فیصلہ کرے گا پہلے تم اپنی سلطانی تو مضبوط کر لو''۔

''تم جیسی گیدڑ بھبکیاں دینا چاہتے ہو، بعد میں دیتے رہنا، کام کی کوئی بات کرنا چاہتے ہو؟''

''میں تمہیں قبل از وقت تنبیہ کرنے آیا ہوں کہ میرے خلاف نام نہاد الزامات بے بنیاد ہیں اگر تم نے ان کی بنیاد پر کوئی غلط فیصلہ کرنے کی کوشش کی تو تمہیں اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا''۔

''یہ معاملہ دربار میں دیکھوں گا کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط؟ اب کیا کہنا چاہتے ہو؟''

جمال الدین الراجی نے جب یہ دیکھا کہ نجم الدین ایوب اس سے دبنے والا شخص نہیں تو وہ خود دبنے لگا۔

''میں تم سے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں!''

''تم اپنی خباثتوں سے کبھی باز نہیں آ سکتے۔ یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں''۔

''تم مجھے اگر آزاد کر دو تو ہمیشہ کے لئے بلاد مصر چھوڑنے کو تیار ہوں''۔

''تاکہ تم کسی دوسری جگہ جا کر منافرت کا سامان پیدا کر سکو۔ تمہارے لئے کون سی جگہ زیادہ بہتر ہونا چاہئے، اس کا فیصلہ دربار میں کیا جائے گا''

''میں اپنا تمام مال و دولت بیت المال میں جمع کرا دوں گا۔ خالی ہاتھ یہاں سے جاؤں گا۔ کسی دوسرے شہر جا کر اپنے پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے مجھے کافی تگ و دو کرنا پڑے گی۔ میں ایک دن میں دوبارہ پیر دریمسایک بن جاؤں گا''۔

اس کے لہجے میں لجاحت آمیز تلخی ٹپک رہی تھی۔

''چلو.....! ایسے لوٹا ہوا مال تو واپس مل جائے گا مگر تم نے جن لوگوں کی عزتیں اچھالی ہیں، ان کے بارے میں کیا خیال ہے.....؟ انہیں کیا حساب دو گے.....؟''

''میں سب سے فرداً فرداً معافی مانگ لوں گا، اگر کسی کا دل میری وجہ سے دکھا ہے تو میں خلوصِ نیت سے معذرت خواہ ہوں''۔

''میں نے تمہاری وجہ سے جو دن قید کی صعوبت میں گذارے ہیں ان کا کیا ہوگا......؟''

''آپ تو سلطان ہیں۔ کھلے ظرف کا مظاہرہ کیجئے''۔ اس کے لہجے میں یکا یک احترام عود کر آیا۔

''فیصلہ دربار میں ہی سنایا جائے گا۔ اسے واپس لے جاؤ''۔ نجم الدین ایوب کے چہرے پر مسکان پھیلنے لگی۔ وہ اس کی منت وساجت سے قلبی طمانیت محسوس کر رہا تھا۔



نجم الدین ایوب نے قاہرہ میں بلادِ مصر کی عنان سنبھالنے کے بعد 29 ذی قعدہ 637ھ کو بلادِ مصر کے دارالحکومت قاہرہ میں اپنا پہلا دربار منعقد کیا۔ اس دربار میں خاص وفاداروں کے ساتھ بہاء الدین زہیر، ابو خولید، امیر فارس اقطائی، قاضی القضاۃ ابن مستقز اور بیبرس کے علاوہ دیگر مصری امراء ورؤساء کی بھاری تعداد موجود تھی۔ پہلے نجم الدین ایوب کی تعریف وتوصیف میں درباری امراء قصائد پیش کرتے رہے۔ بعد ازاں نجم الدین ایوب نے حمد وثناء سے اپنے خطاب کا آغاز کیا۔ اس نے بلادِ مصر کے پیچیدہ معاملات کو خوش اسلوبی سے حل کرنے اور صلیبی دشمنوں سے نبٹنے کا عہد کیا۔ اس نے تمام تر مسائل جیسے سے ایوبی سلطنت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو یکجا کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔ اس کے لہجے میں اولوالعزمی اور شجاعت کی جھلک نمایاں تھی جسے امرائے مصر محسوس کئے بنا نہ رہ سکے۔ امراء کی جماعت نجم الدین ایوب سے بے حد متاثر دکھائی دے رہی تھی۔ جب نجم الدین ایوب نے اپنا خطاب مکمل کیا تو قاضی القضاۃ ابن مستقز نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ چوم لیا اور اس کے لئے الملک الصالح کا لقب تجویز کیا۔ امراءِ مجلس کی اس لقب کی تائید میں آوازیں گونج اٹھیں۔ نجم الدین ایوب نے اعتراض کیا کہ یہ لقب اس کے چچا کا ہے مگر اُن کے پرزور اصرار پر نجم الدین ایوب کو اسی لقب کو اپنے لئے منتخب کرنا پڑا۔ اب وہ الملک الصالح نجم الدین ایوب ہوگیا تھا۔ دربار میں اس کے حق میں نعرہ بازی کی گئی جسے اس نے سخت ناپسند کیا اور اللہ تعالیٰ کی ذات کی تعریف وتوصیف کے علاوہ کسی قسم کی نعرہ بازی کو ممنوع قرار دے دیا۔ یہ شاہی دربار تمام دن مختلف مصروفیات کے ساتھ جاری رہا۔ دوسری مسلمان ریاستوں سے مبارکباد کے پیغام موصول ہوتے رہے۔ شام کے وقت والی حران ابونصر داؤد کے قاصد نے نجم الدین ایوب کے حضور میں پیش ہو کر والی حران ابونصر داؤد کی جانب سے مبارکباد کا پیغام سنایا اور پھر نوید سنائی کہ اللہ تعالیٰ نے والی حران کو یہ شرف بخشا ہے کہ وہ صلیبیوں کو سبق سکھا سکے۔ بحکم باری تعالیٰ اس نے شاہ یروشلم فریڈرک کو عبرت ناک شکست سے دوچار کر کے بیت المقدس واپس لے لیا ہے۔ اب شاہ فریڈرک بلادِ فلسطین میں جائے پناہ تلاش کر رہا ہے۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ صحیح وقت پر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا ورنہ اسے پابہ زنجیر زنداں خانے کی ہوا کھلائی جاتی اس خوشخبری نے نجم الدین ایوب کو بے حد مسرور کیا اس نے قاصد کے لئے اعلیٰ پوشاک اور بھاری انعام کا اعلان کیا اور والی حران ابونصر داؤد کے لئے نیک تمناؤں کے ساتھ خاصی بڑی رقم روانہ کرنے کا حکم دیا تاکہ یروشلم میں ہونے والے نقصان اور تاخت وتاراجی کا بھرپور مداوا کیا جا سکے۔ یروشلم گذشتہ آٹھ برس سے صلیبیوں کے رحم وکرم پر تھا۔ انہوں نے اسے بنانے کی بجائے بے حد اجاڑا تھا۔ مسلمان آٹھ برس سے ان کے

تسلط میں رہے تھے۔ یہ صلیبیوں کے لئے بڑی تکلیف دہ اور سخت چوٹ تھی۔ ان کا مرکز ان کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔ ٹیمپلرز اور ہاسپٹلرز جیسے خونخوار گروہوں کی موجودگی میں یروشلم کا ہاتھ سے نکل جانا، ان کے لئے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔



تیسرے روز دن چڑھے تونائی خان نورالدین کے پاس چلا آیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ گذشتہ رات میں سرخوں کے قبیلے سے واپس لوٹا تھا، اسی لئے اس کی نیند پوری نہیں ہو پائی نورالدین نے اس کا چہرہ دیکھا تو وہ بجھ سا گیا۔ تونائی خان اس سے جو کچھ چاہتا تھا، اسے انجام دینے کے لئے نورالدین ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ وہ گذشتہ دو دن سے تونائی خان کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ اسے برقائی خان سے ایسی کسی حرکت کی توقع نہیں تھی۔ دوسرا اس کی عمر کا تجربہ ومشاہدہ اس کے قدم روک رہا تھا۔ وہ چہروں کو پڑھنے کے فن سے بھی آشنا تھا۔ جب وہ ترکستان میں تھا۔ وہاں بھی شاہی درباری عہدے دار اس کے پاس آیا کرتے تھے۔ اس کے سامنے اپنی کالی کرتوتوں کی داستانیں یوں مزے لے لے کر سنایا کرتے کہ جیسے انہوں نے حقیقتاً کوئی بڑا معرکہ سر کیا ہو۔ شاید اسی بات کی سزا انہیں قدرت کی جانب سے ملی کہ ان کی زمین کو منگولوں کے گھوڑوں تلے روند ڈالا گیا۔ ان کے عالی شان محل نما گھروں کو نذرِ آتش کیا گیا۔ ان کے بیٹوں کے سر ان کے سامنے تھالوں میں رکھ کر پیش کئے گئے۔ نورالدین نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا تھا مگر اس طرح کی لرزہ خیز داستانیں ضرور سنی تھیں اور چنگیز خان کے تعمیر کردہ کھوپڑیوں کے مینار آج بھی اس کے ذہن میں تازہ تھے۔

تونائی خان اس کے ہمراہ مہمان خانے چلا آیا۔ نورالدین خیالوں میں الجھا اس کے چہرے پر کسی ایسے سراغ کو تلاش کرنے کی کوشش میں تھا، جس سے وہ اس کے عزائم کی بھنک پا لیتا۔

''نورالدین......!'' تونائی خان بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوا۔ ''میں کل نہیں آسکا اس کے لئے سخت معذرت خواہ ہوں۔ دراصل کل میں یہاں موجود نہیں تھا۔ برقائی خان کے انکشاف اور اپنی بات کی تصدیق کے لئے میں سرخوں کے قبیلے گیا تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ آنے والے کل میں مجھے کوئی سبکی اٹھانا پڑے۔ میں ہر طرح سے مکمل جانچ پڑتال اور سوچ بچار کے بعد ہی کوئی قدم اٹھانے کا عادی ہوں۔ مجھے سرخوں کے قبیلے میں یہ جان کر ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی کہ انہوں نے کبھی کسی مسلمان فرد کو قیدی نہیں بنایا۔ بلکہ وہ میرے استفسار پر حیران و پریشان ہو رہے تھے۔ برقائی خان کے حوالے سے میں نے ان سے پوچھا کہ اس نے گذشتہ دنوں جو حملہ کیا تھا اس کی وجہ کیا تھی؟ تو انہوں نے وضاحت کی کہ وہ حملہ سابق مردہ سردار قباژائی خان کی عظیم منگولیانہ سلطنت کے خلاف بغاوت کا نتیجہ تھا۔ میں ابھی مزید کوشش کر رہا ہوں کہ تمام ملاقوں سے کامل تصدیق کر لوں کہ مطیع الدین کے بارے میں انہیں کسی بات سے آگاہی ہو''۔

نورالدین اس کی بات سن کر الجھ گیا۔ اس کے لہجے میں بناوٹ وتصنع نہیں تھا۔ اس کا چہرہ اس بات کا منہ بولتا ثبوت تھا کہ وہ واقعی کسی تیغ درد میں مصروف رہا ہے۔ وہ جس بات کی نفی پر خود کو آمادہ کئے ہوئے تھا وہ آہستہ آہستہ سچائی میں بدلنے لگی۔ وہ زمانہ شناس تو تھا ہی..... مگر ایک شفیق باپ بھی تھا۔

''میں تمہارا بے حد شکر گذار ہوں کہ تم مجھ جیسے ناپسندیدہ شخص کیلئے اتنی مشقت میں مبتلا ہو، مگر میرا دل اب اس سرزمین سے اٹھ سا گیا ہے۔ یہاں میں اپنا بیٹا کھو چکا ہوں۔ میں چند دنوں تک اپنے عیال کے ساتھ یہاں سے واپس لوٹ جاؤں گا۔ یہ رب جلیل کی مرضی ہے۔ بہرکیف میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا کہ اپنے بیٹے کا کسی سے انتقام لوں.....!'' نورالدین نے اپنا پہلو بچانا چاہا۔ جس پر تونائی خان پریشان سا ہوگیا۔

"جاودانی آسمان کی قسم ! میری برتائی خان سے کوئی دشمنی نہیں"۔ توتائی خان اس کے فیصلے پر تڑپ کر بولا۔ "تم میرے جذبات کی توہین کرنے کے ساتھ ایک ظالم کو اس کے کئے کی سزا نہ دے کر گناہ عظیم کے مرتکب بھی ہو رہے ہو۔ تم یہ اچھی طرح جانتے ہو۔ میں منگول سپاہی رہا ہوں، میں نے ساری زندگی مسلمانوں کا خون بہایا ہے مگر میں عمر کے اس حصے میں پہنچ گیا ہوں، جہاں مجھے اپنے کئے پر سخت ندامت ہو رہی ہے۔ شاید اسی لئے میں تم جیسے کمزور مسلمان کا ساتھ دے رہا ہوں تم مجھ سے پشیمانی و پچھتاوے کی گہری دلدل سے نکلنے کا موقع مت چھینو تم یہ بات بھی جانتے ہو کہ مجھے تم سے یا تمہارے بیٹے سے کوئی غرض نہیں حالانکہ مجھے اپنے منگول بھائی کی طرف داری کرنا چاہئے مگر میں اس کی مخالفت کر رہا ہوں۔ صرف اپنے ضمیر پر لدے بھاری جرم کا بوجھ کے خاتمے کے لئے جاودانی آسمان کے لئے ایسا ظلم مجھ پر مت ڈھاؤ"۔ اس کے لہجے میں بلا کا درد گھور کر آیا تھا۔ چہرے پر ندامت کے آنسو بہتے دکھائی دینے لگے۔ نورالدین اس کی حالت دیکھ کر بے چین سا ہو گیا۔ وہ ابھی تک یہی تصور کئے ہوئے تھا کہ وہ برتائی خان سے کوئی دیرینہ عداوت رکھتا ہے اور اسے ڈھال بنا کر اپنا مقصد پانا چاہتا ہے۔ مگر اس کی بات سن کر وہ دم بخود سا رہ گیا تھا۔ توتائی خان چہرے سے جیسا سخت گیر دکھائی دیتا تھا اسے اپنے کئے پر ندامت کا احساس ہو سکتا ہے یہ ناقابل یقین سی بات تھی۔

"توتائی خان !" نورالدین پل بھر کے توقف سے بولا۔ "یہ میں تو نہیں جانتا کہ تمہارے دل میں کیا چھپا ہے؟ اگر تم واقعی اپنے کئے پر شرمندہ ہو اور اس کی تلافی چاہتے ہو تو تمہیں اس طرح کے فعل انجام دینے کی ضرورت نہیں۔ اللہ بڑا رحیم و رحمٰن ہے۔ وہ گناہوں سے لوٹنے والوں کو معاف کر دیتا ہے اور اس کے بندوں کو بھی چاہئے کہ وہ اپنے رب کی دوبارہ نافرمانی سے بچنے کی کوشش کیا کریں"۔

"دیکھو نورالدین !" توتائی خان الجھے لہجے میں بولا۔ "تمہارا فلسفہ و منطق میری سمجھ سے باہر ہے۔ میں مسلمان نہیں ہوں کہ تمہاری بات کو سمجھ سکوں۔ مجھے جس طرح اپنی خجالت مٹانے کا طریقہ آتا ہے میں اسی طرح سے ہی مطمئن ہو سکوں گا۔ اگر تم اس معاملے سے ہٹنا چاہتے ہو تو میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ البتہ میں اس نیک کام کو ضرور جاری رکھوں گا کہ برتائی خان جیسے منہ زور اور گنہگار کو اس کے کئے کا پھل۔ شاید اسی طرح میرے ضمیر و قلب کو اطمینان نصیب ہو"۔

"ٹھیک ہے تم جو نیکی کرنا چاہتے ہو وہ کرو، اگر تمہاری تشنگی میرے سبب بجھ سکتی ہے اور تم اپنے گناہوں کا بوجھ کچھ کم کر پاؤ۔ میں تمہاری اس معاملے میں ضرور مدد کروں گا۔ تم کل چلے آنا میں تمہارے ساتھ کوتوالی چلوں گا۔ میں برتائی خان کے خلاف اپنا مقدمہ درج کرواؤں گا۔ باقی تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم کس طرح اپنا حساب گن دمنا پاتے ہو"۔ نورالدین اس کی عیاری اور بزدلی وضع داری کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کی سادہ لوحی اور مروت و شرافت نے اسے اس امر پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ توتائی خان کے خوفناک منصوبے کا حصہ بن کر برتائی خان کے لئے اذیت کا بندوبست کرتا۔



رات کے پہلے پہر نجم الدین ایوب قصر سلطانی کی بالائی منزل پر چلا آیا۔ وہ دن بھر کی گہما گہمی اور مصروفیت سے بے حد تھک چکا تھا۔ وہ ابھی بستر کا قصد کر رہا تھا کہ اسے بہاء الدین زہیر کی آمد کی اطلاع دی گئی۔ وہ لمحہ بھر کے لئے متحیر رہ گیا کہ ایسی کون سی بات تھی کہ اس نے صبح کا انتظار کرنا گوارا نہیں کیا۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے حاضر ہونے کا عندیہ دیا۔ بہاء الدین زہیر تیزی سے اندر چلا آیا۔ اس کے ہمراہ نصیرس اور ابوخویلد بھی تھے۔ نجم الدین ایوب انہیں ایک ساتھ دیکھ کر قدرے پریشان ہو گیا۔

"خیریت ہے آپ سب لوگ !"

"سلطان مکرم !" بہاء الدین زہیر ایک جانب نشست پر بیٹھتے ہوتے ہوئے بولا۔ "مجھے خفیہ ہرکاروں نے ابھی ابھی اطلاع دی ہے کہ سپہ سالار وجیہہ الدین البا قری آپ کے خلاف پوری طرح سرگرم ہے۔ وہ دراصل عماد الدین اسماعیل کو یہاں کا سلطان بنانے کا متمنی تھا۔ ناکامی کے باعث وہ اپنے آپ میں نہیں رہا اور اب اس نے خفیہ طور پر عماد الدین اسماعیل کو مراسلہ بھیجا ہے کہ وہ کسی نہ طرح بعلبک سے نکل کر بلاد مصر پر حملہ کر دے۔ مصری افواج اس کے خلاف مدافعت نہیں کریں گی"۔

"وجیہہ الدین البا قری !" نجم الدین ایوب کے ہونٹوں پر اس کا نام تھرکا۔ "یہ وہی سپہ سالار نہیں جس نے جمال الدین الرامی کے ساتھ مل کر ابوبکر کا تختہ الٹ دیا تھا"۔

"بالکل صحیح اندازہ ہے آپ کا !"

"آقا ! اسے فوراً گرفتار کر کے زنداں خانے میں ڈلوا دیا جائے"۔ ابوخویلد نے اپنی تجویز پیش کی۔

"یہ کوئی حل نہیں ہے"۔ نجم الدین ایوب نے نفی میں گردن ہلائی۔

"آقا ! اسے منصب سپہ سالاری سے ہی معزول کر دیا جائے تاکہ اس کا زور ٹوٹ جائے"۔ نصیرس نے گرہ لگائی۔

"امراء کا ایک حلقہ اسے بے حد پسند کرتا ہے اور فوری طور پر اس کی معزولی کا حکم سنانا اپنے لئے ان کی مخالفت کا باعث بنے گا۔ کیا ہمیں آغاز میں ہی مصائب کو یوں نادانی سے حل کرنا مناسب ہوگا۔ ایسا کوئی بھی قدم نئے حریف کھڑے کرنے کے مترادف ہے"۔

"سلطان مکرم !" بہاء الدین زہیر بولا۔ "آپ کسی تیز گھڑ سوار کو بعلبک کی جانب روانہ کیجئے تاکہ وہ اس قاصد کو راہ سے ہی گرفتار کر سکے جو خفیہ مراسلہ لئے محو سفر ہے"۔

"یہ کام غیر تسلی بخش ثابت ہوگا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کوئی اس بارے میں نہیں جانتا کہ بعلبک کی جانب جانے والا قاصد کب اور کس راستے سے گیا ہے اور وہ کتنی منزل دور پہنچ چکا ہے اور دوسرا ایسے کاموں میں احتیاط کو ملحوظ نظر رکھا جاتا ہے۔ وہ قاصد یہاں آ کر وجیہہ الدین البا قری کے بجائے کسی اور شخص کا نام لے لے تو پھر کیا کیا جا سکتا ہے؟ البا قری نے اسے ایسے مرحلے سے نمٹنے کے لئے مکمل تربیت دے رکھی ہوگی"۔

ابوخویلد نے اس کی بات کو رد کر دیا۔

"ابوخویلد صحیح کہہ رہا ہے۔ اس مشکل کا یہ کوئی حل نہیں۔ اگر میں وجیہہ الدین البا قری پر کوئی الزام تھوپ کر اسے عہدہ و سالاری سے فوری طور پر برخاست بھی کر دوں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے؟ کہ کل کلاں کوئی ایسا ہی دوسرا سپہ سالار سامنے نہیں آئے گا"۔ نجم الدین ایوب استہزائیہ لہجے میں بولا۔

"آقا !" نصیرس حیرت سے بولا۔ "تو کیا اسے یونہی کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ یہاں کا کھائے پئے اور نمک کھا آپ کے خلاف دوسرے سلطانوں کو بھی بھڑکاتا رہے"۔

"نہیں، میں نے ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا"۔

"تم لوگ اطلاع پاتے ہی بدحواسوں کی طرح میرے پاس دوڑے چلے آئے ہو کیا تمہارے ذہن میں اس کا حل بھی موجود ہے؟" نجم الدین ایوب کے چہرے پر [illegible] [illegible] لگے۔ نصیرس اپنے آقا کی بے فکری پر لمحہ بھر کے لئے [illegible] [illegible] زنداں خانے کی صعوبتیں اٹھا کر یہاں پہنچے تھے [illegible]

"سلطان مکرم ....!" بہاء الدین زبیر قدرے توقف سے گویا ہوا۔ "آپ وجیہہ الدین الباقری کو محض اس لئے معزول نہیں کر سکتے کہ آپ کو امراء و روساء کی ناراضگی کا خدشہ ہے"۔

"تمہارا اندازہ کسی حد تک درست بھی ہے"۔

"اگر آپ چاہیں تو امراء و روساء کو پس پشت ڈال سکتے ہیں، وہ اپنی رائے یا فیصلے آپ پر ٹھونس نہیں سکیں گے اور تو اور آپ کے سامنے ان کے اختیارات کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہو گی۔ ان کی مجلس انتخاب بھی آپ کے حکم بجا لانے کی پابند ہو جائے گی"۔

"کھل کر کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو"۔

ابو خویلد اور بیبرس بھی اس کی جانب متعجب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے کہ وہ کیسی پراسراریت پھیلانے کی کوشش میں مصروف ہے۔

"سلطان مکرم ...." بہاء الدین سنجیدگی سے بولا۔ "جب تک آپ امراء و روساء کے چنگل سے نہیں نکل پائیں گے تو آپ بااختیار نہیں ہو سکیں گے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ انہیں ثانوی درجہ میں دھکیل دیں اور ان کی حیثیت کو دربار سلطانی میں سے کم کرنے کے لئے ضروری امر یہ ہے کہ آپ فوری طور پر امیر المومنین سے رابطہ قائم کریں اور ان سے سرکاری سطح پر سلطانِ مصر کا پروانہ حاصل کریں۔ میرے خیال میں یہاں کی صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے یہی واحد حل ہے"۔

"سبحان اللہ ...." نجم الدین ایوب اس کی بات پر جھوم سا گیا۔ "بہاء الدین تم نے وہ بات کہہ ڈالی ہے، جس کی جانب میرا ذرا بھی دھیان نہیں گیا تھا۔ مجھے اس بات پر حیرت بھی ہے۔ بہر کیف میں کل ہی اس سفر کا انتظام کروائے دیتا ہوں تم خود امیر المومنین کے پاس جاؤ۔ ان سے امارت مصر کا پروانہ حاصل کرو"۔

"سلطان مکرم ....! میں اس ضمن میں معافی کا خواستگار ہوں، میں یہ فرض نہیں کر پاؤں گا"۔

"کیا مطلب ....؟"

"سلطان مکرم ....! میری جان بھی آپ کے لئے حاضر ہے مگر کیا کروں؟ یہ خبیث بیماری میری راہ میں رکاوٹ بن گئی ہے۔ کئی ماہ سے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے، دردوں سے بھی برا حال تھا۔ گذشتہ دنوں طبیب سے مشورہ کیا تو معلوم پڑا کہ بواسیر کا مرض لاحق ہو گیا ہے۔ طبیب نے لاپرواہی برتنے پر یہ کہا ہے کہ مرض اب جڑ پکڑ چکا ہے اسے اکھاڑنے میں خاصا وقت لگے گا۔ میں آپ کے لئے دل سے دعا گو ہوں، آپ بے فکری سے میری جگہ کسی اور شخص کو روانہ کر دیجئے"۔

"مجھے تم سے ہمدردی ہے کہ تم نے میرے لئے زندان خانے کا انتخاب کیا اور اس مرض کو گلے لگا لیا۔ اگر تم بروقت کوئی اور فیصلہ کرتے تو شاید یہ مرض یوں پنپ نہ سکتا۔ مجھے تمہارے خلوص اور نیت پر پورا بھروسہ ہے۔ اب تم ہی مشورہ دو کہ تمہاری جگہ کون پوری کر سکتا ہے"۔

"ابو خویلد کو روانہ کر دیجئے"۔

"نہیں .... میں اسے ابھی کہیں نہیں بھیجنا چاہتا کیونکہ میرے ذہن میں اور مسئلہ درپیش ہے جس میں مجھے فوری طور پر اس کی یہاں ضرورت پڑے گی"۔

"آقا ....!" بیبرس قدرے جھجکتے ہوئے بولا۔ "اگر یہ ذمہ داری میرے کندھوں پر ڈال دی جائے تو ...."

"تمہیں ایسے امور کا ابھی کوئی تجربہ نہیں ہے بیبرس .... مگر تمہاری سچائی اور خلوص بے داغ ہیں۔ دل تو

یہی چاہ رہا ہے کہ تمہیں روانہ کر دوں مگر ذہن مخالفت کر رہا ہے"۔

"میری سفارش بیبرس کے حق میں سمجھئے"۔ بہاء الدین قریباً ہنستے ہوئے بولا۔ وہاں موجود سبھی لوگ اس سنجیدہ موقعہ پر اس کے مزاح سے محظوظ ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر کی تکرار کے بعد یہی طے پایا کہ بیبرس کو ہی امیر المومنین کے پاس روانہ کر دیا جائے علاوہ ازیں اور نام بھی زیر غور رہے۔ نجم الدین ایوب کسی دوسرے فرد کو نامزد کر کے کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ اُسے صرف اپنے قریبی لائقین اور غلاموں پر ہی بھروسہ تھا۔ علاوہ ازیں فوری طور پر یہ راز منکشف ہونے کی صورت میں وجیہہ الدین الباقری سمیت کئی امراء اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کر سکتے تھے۔ ممکن تھا کہ مجلس انتخاب نجم الدین ایوب کے اس قدم کو آمریت کا لقب دے کر اسے معزول کرنے میں دیر نہ لگاتی۔ مصری درباری امراء کی ہمیشہ سے یہی خواہش تھی کہ سلطان کسی نہ کسی مقام پر ان کا محتاج ہو کر رہے۔ بہاء الدین زبیر نے ان کی حاکمیت ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کی راہ تجویز کر دی تھی۔



مطیع الدین کا گھوڑا ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ شام کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ قازی باشندوں کے گاؤں سے کافی دور نکل آیا تھا۔ سورج اس کے سامنے آہستہ آہستہ سفید و سنگلاخ پہاڑوں کے دامن میں اترتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ مطیع الدین ڈھلتے سورج کے ساتھ ساتھ شدید دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس کے دونوں ایڑیاں گھوڑے کو مزید تیز دوڑنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ گھوڑا شاید ایسی مشقت کا عادی رہا تھا کہ وہ اس کا حکم بجا لا رہا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دن رات میں بدل گیا۔ مطیع الدین کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا وہ اپنی طے کردہ سمت میں اُڑا جا رہا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں قازی سردار اور ان کی گردنوں میں موجود عجب توے گردش کر رہے تھے۔ وہ کسی صورت میں کسی اور قبیلے کا بندی نہیں بننا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی وہ کسی نہ کسی طرح ان کی حدود سے نکل جائے اور سرائے تک بخیریت پہنچ جائے۔ وقت اس کے ساتھ ذرا کھیل کھیل رہا تھا۔ وہ بھٹکتے بھٹکتے کہیں کا کہیں پہنچ گیا تھا۔ تمام رات سفر یونہی جاری رہا۔ برفانی زمین پر چمکتی ہوئی چاندنی اس کے لئے ممد و معاون ثابت ہوئی تھی۔ وہ رات کیا تھی؟ یوں لگتا تھا کہ سورج بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا ہو۔

رات آخری پہر کے وقت مسلسل سفر کے باعث اس کا جسم بری طرح سے جھنجھنانے لگا۔ گھوڑا بھی اب قدرے سست پڑ گیا تھا۔ دونوں مسافر تکان سے بے حال ہو چکے تھے۔ مطیع الدین نے کافی تگ و دو کے بعد ایک چشمہ ڈھونڈ نکالا۔ وہ قدرے سست روی سے چشمہ پر جا پہنچا گھوڑے سے اتر کر اس نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور اسے کھلا چھوڑ دیا۔ گھوڑا اس سے مانوس ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی وہ اسے چھوڑ کر نہیں فرار ہوا تھا۔ گھوڑا ٹانگیں بچھا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ اپنی تکان مٹانے میں مصروف ہو گیا اس کی کھال کبھی کبھار رگل جاتی۔ شاید تھکاوٹ اتارنے کا اس کا اپنا انداز تھا۔ مطیع الدین نے چشمے کے پانی سے چہرے پر چھینٹے مارے اور ایک جانب بیٹھ گیا۔ کچھ لمحوں تک وہ یونہی بیٹھا رہا۔ پھر اس نے چشمے کے پانی سے وضو کیا اور سنگلاخ زمین پر نماز ادا کی۔ وہ محض اندازے سے فجر کی نماز پڑھ رہا تھا۔ نماز کی ادائیگی سے فارغ ہو کر وہ چشمے کے ایک جانب زمین جھاڑ کر لیٹ گیا۔ وہ کچھ دیر سستانا چاہتا تھا۔ اس نے اللہ کے حضور عاجزی و انکساری سے مدد کی درخواست کی تھی۔ وہ سونا نہیں چاہتا تھا مگر تکان کی زیادتی کے باعث اس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔



غازی عبداللہ شافعی دوپہر کے وقت بیبرس کی قیام گاہ پر چلا آیا۔ اسے کہیں سے بھنک پڑ گئی تھی کہ بیبرس

آج رات بلا مصر سے باہر روانہ ہو جائے گا۔ وہ جمال الدین الراجی کے معاملے میں خاصا فکر مند تھا۔ سعر س سفر کی تیاری میں مصروف تھا۔ وہ ضروری سامان سمیٹ رہا تھا کہ اسے غازی عبداللہ شافعی کا متفکر چہرہ دکھائی دیا۔

"خیریت غازی عبداللہ!" سعر س اپنا کام چھوڑ کر اس کی جانب متوجہ ہوا۔

"مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ تم آج رات کہیں باہر جا رہے ہو۔ شاید واپسی میں چند دن بھی لگ جائیں گے"

"تمہاری معلومات درست ہیں، میں آقا کا کچھ سامان لینے الکرک جا رہا ہوں جو وہ وہاں چھوڑ آئے تھے۔ دوسرا میں وہیں سے ان کے اہل و عیال کو بھی مصر روانگی کی اطلاع دوں گا"۔

"یعنی تم کم از کم دس پندرہ دن بعد ہی واپس لوٹو گے" غازی عبداللہ شافعی کا چہرہ اتر گیا۔

"ہاں! اتنے دن تو لگ جائیں گے۔ تم اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو"۔ سعر س اس کے چہرے پر نگاہیں گاڑتا ہوا بولا۔

"اگر تمہارے پیچھے الراجی کے بارے میں کوئی اور فیصلہ کر دیا گیا تو"

"اوہ! میرا ذہن کسی اور جانب بھٹک گیا تھا۔ بہرحال تم بے فکر رہو میں تمہیں ہر صورت میں الراجی دلواؤں گا"۔

"یاد رکھو سعر س! تم نے میرے ساتھ الراجی کو میری غلامی میں دینے کا وعدہ کیا ہے"۔

"میں اپنے قول سے نہیں پھرا کرتا"۔

"ٹھیک ہے میں تمہارے بھروسے پر واپس جا رہا ہوں۔ تمہاری واپسی تک میں بے صبری سے تمہارا منتظر رہوں گا۔ یہ میں ہی جانتا ہوں کہ انتظار کی یہ گھڑیاں میرے لئے کتنی طویل و تکلیف دہ ثابت ہوں گی"۔

"مجھے تمہاری حالت کا بخوبی اندازہ ہے۔ بہرحال میں کوشش کروں گا کہ آقا سے اس سلسلے میں جانے سے پہلے کوئی بات کر سکوں"۔

"اگر ایسا ممکن ہو سکے تو میں تمہارا بے حد مشکور رہوں گا"۔ اس کے لہجے میں لجاجت جھلکنے لگی۔

سعر س نے اسے تسلی دے کر رخصت کیا۔ سعر س کے دل میں خوف تھا کہ اس نے اپنے تئیں اتنا بڑا وعدہ کر لیا تھا جس کے بارے میں آقا کو ذرا سا معلوم نہیں تھا اگر نجم الدین ایوب نے اس کی بات رد کر دی تو البتہ ایک امید کی کرن اسے دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے نجم الدین ایوب نے حران کے قاصد کے منہ سے ایک اچھی خبر پر اسے مالا مال کر دیا تھا۔ ممکن تھا کہ امیر المومنین کے امارت نامے کو پا کر وہ اس کی بات کو تسلیم کر لیں۔ اب اسے ہر حال میں یہ کوشش کرنا تھی کہ امیر المومنین سے نجم الدین ایوب کی سلطانی کا نامہ حاصل کیا جائے۔



اردوئے زریں کے قاآن اعظم باتو خان کے خفیہ ہرکاروں نے کچھ ہی لمحے پہلے تشویش ناک اطلاع دی تھی کہ نور الدین اپنے گمشدہ بیٹے کے سلسلے میں برقائی خان کے خلاف مقدمہ درج کرنے کے چکر میں ہے۔ اس قسم کی خبریں اسے کافی دنوں سے مل رہی تھیں مگر وہ ان پر توجہ نہیں دے رہا تھا۔ خصوصاً توتائی خان کی جانب سے وہ متفکر تھا کیونکہ برقائی خان نے بھری محفل میں جو رسوائی کی تھی وہ اس کا بدلہ لئے بغیر نہیں ٹل سکتا تھا۔ وہ منگولوں کی فطرت سے بخوبی واقف تھا۔ وہ خود بھی ایک منگول تھا۔ اس نے پہلے ہی دن سے اس کے پیچھے اپنے خفیہ ہرکارے دوڑا دیئے تھے کہ وہ اس کے معمول پر نگاہ رکھیں اور کوئی خاص بات معلوم ہو تو اسے فوری آگاہ

کریں۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ توتائی خان اب کیا روش اختیار کرے گا؟ اس کی توقع کے مطابق گل وتوڑ محفوظ تھی۔ اگر کوئی اور باپ ہوتا تو اپنی بیٹی کو سزا دیئے بنا نہ رہ پاتا۔ وہ سمجھ گیا کہ توتائی خان کچھ اور کرنے کے چکر میں ہے۔ جب وہ نور الدین کے گھر جاتا دیکھا گیا تو باتو خان اچھی طرح سمجھ گیا کہ وہ اپنی ہتک کا بدلہ لینے کے لئے کی تکمیل پر جانے والا ہے۔ جب اسے توتائی خان کی سرخوں کے قبیلے میں جانے کی خبر ملی تو اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ اس نے دوسرے ہی دن منک آنہ کو سرکاری طور پر منصب سرداری سے معزول کر کے اس کی جگہ سابق منگول سردار دقبا ژائی کے بیٹے جبروت خان کو مقرر کر دیا تھا۔ سرخوں کے قبیلے سے جو معاونت توتائی خان کو حاصل تھی اسے اس کی لاعلمی میں ہی ختم کر دیا گیا تھا۔ توتائی خان تک اس واقعے کی خبر نہ پہنچ پائے اس کے لئے فوری انتظامات بھی کر لئے گئے تھے۔ منک آنہ پر خراج کی رقم میں خورد برد کا الزام لگا کر اسے مختصر عرصے کے لئے زنداں خانے میں بھجوا دیا گیا۔

باتو خان بے حد بیدار مغز اور غیر معمولی طور پر ذہین تھا اس نے اپنے مرحوم باپ توشی (جوجی) خان کی سلطنت کو کمال ہوشیاری سے سنبھال رکھا تھا۔ بغاوتوں کے چھوٹے موٹے فتنوں کو وہ یوں فرو کر ڈالتا کہ ان کا وجود تاریخ کے صفحات کی زینت نہ بن پاتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی سلطنت میں کوئی بڑی ہنگامہ آرائی نہیں تھی۔ ہر سو امن و امان کا دور دورہ تھا۔ روس کی سرحدوں سے لے کر ترکستان کے زیریں علاقوں تک اس کا سکہ چلتا تھا۔ برقائی خان اس کا بھائی تھا اور وہ اپنے بھائی پر کسی ایسے الزام کی تہمت نہیں لگنے دینا چاہتا تھا کہ جس سے اس کا تابناک مستقبل تاریک پڑ جاتا۔ برقائی خان سے پہلے ہی ایک مسلمان زادے کی محبت میں کئی نادانیاں سرزد ہو چکی تھیں۔ اب اس کے سر پہ دوہری ذمہ داری تھی کہ برقائی خان کو نہ صرف مسلمان زادے کے سحر سے نکالے بلکہ اس کی توجہ امور جہاں بانی کی جانب کرائے۔ وہ اپنے بھائی سے بے حد محبت کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس پر کوئی سختی نہیں کر پایا۔ چنگیز خان کے بیٹوں میں سے توشی خان اور پوتوں میں سے برقائی خان ایک سی طبیعت کے مالک نکلے تھے۔ توشی خان منگول ہونے کے باوجود بلا مقصد خون خرابے سے حتیٰ الامکان پہلو تہی برتتا رہا۔ اسی وجہ سے چنگیز خان نے اسے زہر دلوا دیا تھا۔ اب برقائی خان بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ باتو خان اس کی جانب سے متفکر تو رہتا تھا مگر اسے راہ سے ہٹا دینے کے بارے میں وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے خدشہ تھا تو صرف اتنا کہ برقائی خان کی عادات کی خبر کہیں بڑے قاآن اعظم منگو خان تک نہ پہنچ جائے۔ وہ اسے اسی لئے امور سلطنت سے دور رکھتا تھا۔ وقت تیزی سے گذرتا جا رہا تھا۔ سلطنت کی وسعت اتنی پھیل چکی تھی کہ باتو خان کو بھائی کی معاونت کی اشد ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اس نے فوری طور پر توتائی خان پر شب خون مارنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنے خاص اور وفادار فرد کو اپنے پاس بلایا اور تنہائی میں توتائی خان کو ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سلانے کا حکم جاری کر دیا۔ تمام معاملے کی جڑ تو توتائی خان ہی تھا۔ دوسرا اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ توتائی خان کی موت کے فوراً بعد برقائی خان کو کسی مہم پر روانہ کر دیا جائے گا اور اس کی عدم موجودگی میں نور الدین کو ملک بدری کا نامہ بھیج دیا جائے گا۔ یہ مرحلہ بھی رازداری سے مکمل کیا جائے گا تا کہ برقائی خان کو اس بارے میں بھنک نہ پڑ سکے۔ بیٹے سے جدائی کے غم سے تھک ہار کر باپ کا واپس لوٹ جانا کوئی خاص بات نہیں ہو گی۔ باتو خان کی منصوبہ بندی میں کوئی جھول نہیں تھا۔ وہ سانپ کا منہ کچل دینا چاہتا تھا مگر لاٹھی کو بچانا بھی اس پر فرض تھا۔ اس کے خیال میں اس کے علاوہ اب کوئی اور راستہ باقی نہیں بچا تھا۔



قاژی سردار نے سرشام ہی اپنے قبیلے کے بہادر اور تربیت یافتہ افراد کو جمع کیا اور نئے شکار کی بابت

انہیں ضروری نوعیت کی ہدایات دیں۔ سورج کے مکمل چھپ جانے کے بعد وہ اپنے جوانوں کی معیت میں گاؤں سے نکلا۔ ان لوگوں کے ہاتھوں میں لکڑی کے لمبے لمبے بھالے تھے۔ جن کے کناروں پر تیز دھار کے پتھر رسیوں سے باندھے گئے تھے۔ ان میں کچھ افراد کے پاس چپٹی تلواریں بھی تھیں۔ وہ تیزی سے اسی سمت میں نکلے جس جانب مطیع الدین گھوڑا دوڑاتا ہوا وہاں سے فرار ہوا تھا۔ ان میں ایک شخص تیزی سے زمین پر جھک کر گھوڑے کے کھروں کے نشانات کو ڈھونڈ نکالتا اور اسی سمت میں بڑھنے کا عندیہ دیتا۔ ان لوگوں کی رفتار حیرت انگیز تھی۔ وہ پیدل بھاگ رہے تھے مگر دیکھنے میں یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ زمین پر تیرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہوں۔ کافی فاصلے پر پہنچ کر وہ اچانک رُک گئے۔

''کیا ہوا راہ نما......؟'' سردار نے استفہامیہ نگاہوں سے راہ نما سے پوچھا۔

''حیرت انگیز......!'' وہ بڑبڑایا۔ سب لوگ اس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔

''کیا دکھائی دیا ہے......؟'' سردار نے بے تابی سے پوچھا۔

''سردار......! یہاں دیکھیے۔ گھوڑے کے سم کتنے گڑھے پڑے ہیں۔ یہاں اس سوار کے اچانک رُکنے کا اشارہ مل رہا ہے۔ وہ کچھ لمحوں کے لئے یہاں رُکا ہے۔ میں نے اطراف میں اچھی طرح دیکھ لیا ہے یہاں کسی دوسرے فرد یا جانور کے نشانات نہیں مل سکے ہیں۔ یہاں اس سوار کا یکدم رُکنا معنی خیز ہے۔ حالانکہ پہلے اس کی رفتار قریباً یکساں رہی تھی''۔

''تمہارا خیال ہے کہ وہ یہاں کسی انہونی چیز کو دیکھ کر ٹھٹکا ہوگا''۔ سردار نے پوچھا۔

''کوئی اپسرا دیکھ لی ہوگی''۔ ایک نے شوشہ چھوڑا۔ سردار نے اس کی جانب غصے کے عالم میں گھور کر دیکھا تو وہ ایک طرف نکل گیا۔

''ہو سکتا ہے کہ اس کے گھوڑے کو کوئی ٹھوکر لگی ہو، اسی لئے وہ یکدم دوڑتے ہوئے رُک گیا ہو''۔ سردار نے اندیشہ ظاہر کیا۔

''نہیں سردار......! گھوڑا از خود رُکا نہیں بلکہ اسے روکا گیا ہے۔ سموں کے دباؤ سے صاف عیاں ہے کہ اسے سوار نے خود روکا ہے''۔

اسی لمحے ایک تیز آواز نے ان کی توجہ بٹا دی وہ شخص جو ابھی شوشہ چھوڑنے پر وہاں سے کھسک لیا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر موجود انہیں اپنی جانب بلا رہا تھا۔ سردار تیزی سے اس کی جانب بڑھ گیا۔ دوسرے افراد بھی اس کی تقلید میں اس طرف بڑھ گئے۔ سردار وہاں پہنچا تو وہ ہاتھ کے اشارے سے زمین پر کچھ دکھانے کی کوشش کرنے لگا۔ رات کا پہلا پہر تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ سپید چاندنی نے تمام ماحول کو منور کر رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سردار کو زمین پر کھدا ہوا بستی کا نقشہ صاف دکھائی دیا۔ وہ حیرت سے جھک کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ پہلی نظر میں پہچان چکا تھا کہ یہ نقشہ اسی کی بستی کا ہے مگر اسے یہاں کیوں بنایا گیا ہے؟ یہ سوال اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ مطیع الدین بستی کا نقشہ بنا کر اپنے سوال کو حل کرنے میں تو کامیاب ہو گیا تھا مگر وہ خوشی اور سرشاری کے عالم میں اسے مٹانا بھول گیا تھا۔ راہ نما بھی تیزی سے وہاں چلا آیا۔ وہ جھک کر زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا اور اس نے اس کھدے ہوئے نقشے میں اپنی انگلیاں پھیرنا شروع کر دیں۔ وہ تمام لوگ پاس کھڑے اُلجھی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔ سردار ابھی تک نقشے کو یہاں بنانے کا مقصد نہیں جان پایا تھا۔

''سوار نے اُس مقام پر اپنے گھوڑے کو تیز رفتاری کے عالم میں روکا اور پیدل اتر کر یہاں تک آیا! گھوڑے کے کھر کے نشان یہاں موجود نہیں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ اس نے گھوڑا کچھ لمحوں کے لئے چھوڑا

اور یہاں بیٹھ کر کچھ سوچتا رہا ہے۔ زمین پر کھدی ہوئی لکیروں کا جال ہماری بستی کا ہی ہے۔ میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں یہ اس وقت کا ہے جب وہ ہمارے درمیان موجود تھا''۔ راہ نما یکدم چپ سا ہو گیا پھر جیسے وہ اس نقشے کا راز جان گیا ہو اس کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی۔ وہ جوشیلے انداز میں بولا۔

''بلکہ یقیناً ایسا ہی ہے۔ یہاں یہ گول گول نشان جو دکھائی دے رہے ہیں یہ سب ہم لوگ ہیں۔ اس سوار نے ہماری بستی میں اپنی موجودگی اور ہم لوگوں کو یہاں کھود کر کسی صورت حال کا جائزہ لیا ہے''۔ راہ نما اب سردار کی جانب دیکھنے لگا۔

''یہ سوار کچھ ضرورت سے زیادہ ہی چالاک دکھائی دیتا ہے اس کا شکار کرنے میں ہمیں خاصی ہوشیاری اور حاضر دماغی سے کام لینا ہوگا۔ اس نے ہمیں یہ نقشہ شاید چکمہ دینے کے لئے یہاں بنایا ہے کہ ہم اس کے تعاقب میں جب یہاں پہنچیں گے تو اس نقشے میں الجھ جائیں گے اور وہ اس اثناء میں وقت کا فائدہ اُٹھا کر ہماری حدود سے باہر نکل جائے گا''۔

''نہیں سردار......! میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ یہ لکیریں اس کی گہری پریشانی کا مظہر ہیں۔ جب انسان فکر میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کے ہاتھوں میں اتنی سکت باقی نہیں رہتی کہ وہ بھرپور انداز میں کوئی کام انجام دے سکے۔ یہاں لکیروں کی گہرائی اس کی گہری فکر کی عکاسی کر رہی ہے۔ البتہ یہ آخری لکیر پہلی لکیروں سے کچھ مختلف ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ جو کچھ سوچ رہا تھا یا یہاں بنا کر وضع کرنا چاہ رہا تھا...... وہ اسے مل گیا ہو''۔

''کون سی لکیر......؟'' سردار کو جیسے کچھ یاد آ گیا اس نے تیزی سے سوال کیا۔ راہ نما نے اسے ایک چھوٹی سی لکیر دکھائی۔ اس نے لکیر کو کچھ دیر دیکھا اور پھر آسمان کی جانب دیکھنے لگا۔

''میں سمجھ گیا ہوں، یہ سب کیا ہے......؟'' سردار کے چہرے پر خباثت آمیز گہری مسکراہٹ پھیل گئی۔ سب لوگ تعجب سے اس پہیلی کے بارے میں جاننے کے خواہش مند دکھائی دے رہے تھے۔

''یہ اُس کے سوال کا جواب ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اُسے یہ جواب کیسے مل گیا......؟''

''کیسا سوال......؟''

''وہ منگولوں کی سرزمین کی جانب جانے کا خواہش مند تھا۔ اس نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ اُسے منگولوں کے ملک جانے کے لئے کس جانب سفر کرنا چاہئے تو میں نے اُسے بتانے سے انکار کر دیا تھا بلکہ اسے غلط بتایا کہ وہ علاقہ تین ماہ کی دوری پر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ صرف تین دن کی دوری پر ہے۔ بہرحال اس نے کسی نہ کسی کلیے کے تحت صحیح سمت تلاش کر لی ہے۔ ہمارے پاس اب تین دن ہیں۔ اُسے تین دن سے پہلے پہلے پکڑنا ہوگا۔ اگر وہ تاتاری سرحدوں پر پہنچ گیا تو ہم اسے نہیں پکڑ پائیں گے۔ وہ اگر رات بھر اس سمت میں مسلسل سفر کرے تو صبح ہونے تک نیلے پتھروں کے چشمے تک پہنچ جائے گا۔ اگر وہ وہاں زیادہ دیر رُکے بغیر آگے بڑھ گیا تو ہمیں اُسے پکڑنے میں خاصی دقت کا سامنا ہوگا''۔

''ہمیں نیلے پتھروں کے چشمے کی جانب مختصر راستے سے سفر کرنا چاہئے تاکہ ہم صبح کے وقت وہاں پہنچ جائیں۔ اگر وہ آرام کرنے کی غرض سے وہاں رُک گیا تو بآسانی ہماری گرفت میں آ جائے گا''۔

''اس شکار کو اتنا آسان مت سمجھو۔ وہ خاصا چالاک ہے، اسے پکڑنے کے لئے ہمیں اپنی خاص صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہوگا...... راہ نما......! اس کے گھوڑے کی بھلا صحیح رفتار کیا ہوگی......؟'' سردار نے سوال کیا۔

''سردار......! اس کے پاس سنہلی قسم کا گھوڑا ہے، میں نے خود گاؤں میں اُسے دیکھا تھا۔ اس کی رفتار

کے بارے میں آپ سے بھلا اچھی طرح اور کون جان سکتا ہے......؟''

''سنبلی گھوڑا......! ٹھیک ہے، چلو مختصر راستے کی جانب تیزی سے بڑھو۔ ہمارا ہر قیمت پر صبح کے وقت چشمے تک پہنچنا ضروری ہے''۔

ان سب نے سردار کی بات پر تائیدی انداز میں سر ہلا دیئے اور وہ اس کی رہنمائی میں تیزی سے ایک مختلف سمت میں مڑ گئے۔ وہ کسی ایسے مختصر رستے سے آگاہ تھے جس کے ذریعے وہ صبح تک مطیع الدین تک پہنچ جاتے۔



بیبرس 7 ذی الحجہ کو بلادِ فلسطین سے ہوتا ہوا سرزمینِ عرب میں داخل ہوا۔ سورج قریباً ڈھل چکا تھا۔ مدین نامی شہر سے چند میل کے فاصلے پر اس نے اپنا پڑاؤ ڈالا۔ یہاں قریب ہی ایک دوسرا قافلہ بھی مقیم تھا۔ بیبرس اپنی فطرت کے باعث نہ رہ سکا اور ان لوگوں میں جا پہنچا۔ قافلے میں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ یہ لوگ ادائیگی حج کے لئے گھروں سے نکلے ہیں اور یہ لوگ کل صبح یہاں سے نکلیں گے اور نو ذی الحجہ کی شام تک وہ میدان عرفات میں پہنچ جائیں گے یہ عازمین حج کا آخری قافلہ تھا جو ادائیگی حج کے لئے روانہ ہو رہا تھا۔ بیبرس نے حج کی بابت سنا تو۔ اس کے دل میں ادائیگی حج کی خواہش سر اُٹھانے لگی۔ وہ ابھی فریضہ حج نہیں ادا کر سکتا تھا کیونکہ اس کے پاس اپنے آقا کی اس ضمن میں کوئی اجازت نہیں تھی۔ بلا اجازت حج کرنا اس کے خیال میں مناسب نہیں تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنی بے چارگی کا احساس ہوا کہ وہ ایک مکمل آزاد انسان نہیں ہے۔ اسے اپنی مرضی سے کوئی کام کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ وہ غلام ہے۔ اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا غلامی کے طوق کو ہی اپنی گردن میں پایا۔ باپ کے زنداں خانے میں جانے کے بعد اس کی ماں پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور پھر جب منگولوں کا عذاب نازل ہوا تو وہ ماں کے مشفق گود سے نکل کر ٹھوکروں کی زد میں آ گیا۔ ایک مقام سے دوسرے مقام تک کا یہ سفر بڑا اذیت ناک تھا۔ اس کی اپنی حیثیت کھو چکی تھی۔ وہ دوسروں کے نام سے زندگی بسر کر رہا تھا۔ بچپن سے مصائب برداشت کرنے کی اسے عادت سی ہو گئی تھی۔ بچپن گذر چکا تھا۔ شباب ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ ایک بار پھر محرومی کا احساس شدت سے ستانے لگا۔ نماز کی حد تک وہ بااختیار تھا مگر حج کرنا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ وہ اپنی بے بسی پر سسکنے لگا۔ آنسوؤں کا سیلاب اس کے چہرے پر پھیل کر چپچپاہٹ پیدا کرنے لگا۔ وہ یونہی سسکتے سسکتے جانے کب نیند کی آغوش میں اُتر گیا۔ عالم خواب میں بھی اسے مکہ اور بیت اللہ کے ایمان افروز مناظر دکھائی دیتے رہے۔ وہ انہیں دیکھ کر دیوانہ سا ہو رہا تھا کہ ایک نرم و نازک ہاتھ نے اس کے شانے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ وہ مڑ کر اُس جانب متوجہ ہوا۔ ایک لمحے کے لئے وہ حیرت سے گرتے گرتے بچا۔ اس کے عقب میں اس کا آقا نجم الدین ایوب چہرے پر تبسم سجائے کھڑا تھا۔

''آقا......آپ......؟''

''ہاں میرے بیٹے......! کیا ہوا......؟ تمہارا چہرہ کیوں اترا پڑا ہے اور آنکھیں سرخ و متورم ہو رہی ہیں......کیوں رو رہے ہو''۔

''آقا......! آج مجھے اپنی بے بسی کا احساس رہا ہے۔ میں فریضہ حج ادا کرنا چاہتا ہوں مگر میرے پاس آپ کی اجازت نہیں ہے''۔

''فرائض اسلامی کے لئے میرے بیٹے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تم جاؤ اور اس فرض کو ادا کرو۔ میں خوش ہوں کہ مجھے ایسا باایمان غلام ملا ہے''۔

''آقا......! کیا واقعی میں ادائیگی حج کے لئے جا سکتا ہوں۔ مگر آپ نے جو ذمہ داری میرے کندھوں پر ڈالی ہے اس میں کوتاہی و دیر ہو جائے گی''۔

''تم اس کی پرواہ نہ کرو۔ جو کام جب ہونا ہے، تب ہی ہوگا۔ اس میں کوئی مصلحت ہے کہ حج کا مبارک دن ہمارے مقصد کے بیچ آیا ہے۔ تم اسے سعد سمجھو اور جاؤ اپنا پہلا مقصد پورا کرو''۔

''مگر......'' بیبرس نے مزید کچھ کہنا چاہا تھا کہ نجم الدین ایوب کا چہرہ اچانک اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے پورے جسم پر رعشہ سا طاری تھا۔ وہ ہڑبڑا کر بستر پر اُٹھ بیٹھا۔ اسی لمحے قریب موجود حاجیوں کے قافلے میں سے اذانِ فجر سنائی دی۔ بیبرس پریشان و حیران بیٹھا تھا۔ یہ سب کیا تھا......؟ وہ اسے کوئی نام نہیں دے پایا۔ اس نے عالم خواب میں آقا سے اجازت پائی تھی۔

''ایسا نہیں ہو سکتا......!'' وہ خودی کے عالم میں بڑبڑایا۔ ''یہ گذشتہ رات کا خیال تھا جو میرے سامنے خواب بن کر آیا ہے۔ آقا تک بھلا میری خواہش کیسے پہنچ سکتی ہے......؟ میں شاید ضرورت سے زیادہ ہی اس بارے میں سوچتا رہا ہوں''۔

اس کے چہرے پر پھیکی سی ہنسی پھیل گئی۔ وہ بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ قافلے والوں کے ساتھ نماز پڑھنا چاہتا تھا۔ کچھ ہی لمحوں میں وہ قافلے کے لوگوں کے ہمراہ نماز کے لئے کھڑا تھا۔ نماز سے فارغ ہو کر اس نے اپنے گھوڑے کو دانہ ڈلا اور پانی وغیرہ پلایا۔ وہ چند لمحوں بعد وہاں سے اپنی منزل کی جانب روانہ ہو جانا چاہتا تھا۔ خواب اس کے ذہن سے اتر چکا تھا۔ وہ اسے محض اپنا وہم سمجھ کر رد کر چکا تھا۔ فریضہ حج کے لئے ابھی کافی عمر باقی تھی۔

قافلے میں سے ایک شخص اُسے اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔ اس کا حلیہ کوئی خاص نہیں تھا۔ میلا سا لباس اور سر پر روایتی عربی عمامہ اور ہاتھ میں تسبیح موجود تھی۔ بیبرس نے اچٹتی نگاہ اس پر ڈالی اور اپنے کام میں مشغول رہا۔ وہ اجنبی قریب آ کر ٹھہر گیا۔

''میرا خیال ہے کہ تم نے حج کے لئے جانے کا ارادہ بدل دیا ہے''۔ اس کی آواز سنائی دی۔

بیبرس نے غور سے سر اُٹھاتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔ اس کا سپاٹ چہرہ دکھائی دیا۔

''آپ کو کس نے کہا ہے کہ میں ادائیگی حج کے لئے جا رہا ہوں، میں تو اپنے آقا کے ایک ضروری نوعیت کے کام کے لئے گھر سے نکلا ہوں میری منزل بغداد ہے''۔

''رات تو تم بے حد دیوانے ہو رہے تھے''۔

مختصر سے جملے نے بیبرس کو چونکا دیا۔

''کک......کک......کیا مطلب؟''

''برخوردار......!'' وہ اجنبی دھیما سا مسکرایا۔ ''جب نیک نیتی سے کسی کام کا ارادہ کیا جائے تو اس کی راہ خود بخود نکل آتی ہے، جب تک نیک نیتی تمہارے من میں شامل تھی تمہارا چہرہ جگمگا رہا تھا اب قدرے ماند پڑنے لگا ہے''۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا......''

''کیا تم رات کو حج پر روانہ ہونے کے لئے بے تاب نہیں تھے......؟''

''آپ کو کیسے پتہ چلا؟ کہ میری ایسی حالت تھی......؟'' بیبرس نے سوال کیا۔ اس کے سوال میں ہی اس کے اقرار کا جواب موجود تھا۔ جس پر وہ اب محض پہلو بدل کر رہ گیا۔

''جب تم رات کو حج پر جانا چاہتے تھے تو صبح شیطان کے غلبے میں کیوں آ گئے......؟''

''شیطان کا غلبہ مت کہیں۔ میں ایک غلام ہوں اور جب تک مجھے میرے آقا کی اجازت نہ حاصل ہو جائے میں بھلا کیسے حج کے لئے روانہ ہو سکتا ہوں......؟'' ہیرس نے بات کھول دی تھی۔

''اجازت تو تمہیں مل چکی ہے......!''

''کیسی اجازت......؟'' ہیرس ایک بار پھر چونک سا گیا۔ وہ اب اُس اجنبی کو عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

''کیا صبح سحر کے وقت تمہارے آقا نے تمہیں خواب میں اجازت نہیں دی''۔

ہیرس اس کی بات سن کر لمحہ بھر کے لئے سناٹے میں آ گیا مگر اُس نے خود کو فوراً سنبھال لیا۔

''آپ میرے خواب کے بارے میں کیسے جانتے ہیں......؟ حالانکہ میں نے ابھی تک اُسے کسی پر ظاہر بھی نہیں کیا''۔

''کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں برخوردار...... جنہیں جاننا ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر میں تمہیں یہ کہوں کہ وہ اجازت اصلی تھی۔ کسی واہمے یا وسوسے کی بدولت نہیں تھی تو کیا تم یقین کر لو گے''۔

''اندھا یقین کر لینا علامت کفر ہوتا ہے''۔

''تم خدا پر کیوں یقین کرتے ہو''۔

''آپ کی باتیں اب ناخوشگوار ہونے لگی ہیں''۔ ہیرس کا لہجہ بگڑ سا گیا۔

''میری بات کو غلط رنگ مت دو۔ کچھ باتیں اُسی کی جانب سے ہوتی ہیں۔ تمہیں تمنائے حج نے بے قرار کیا تو اُسی اللہ نے تمہاری مشکل آسان کر دی۔ اب تم اس اللہ پر یقین رکھو اور جو اجازت تمہیں نصیب ہوئی ہے اس کا فائدہ اُٹھاؤ''۔

''میں فیصلہ کرنے میں دشواری محسوس کر رہا ہوں''۔ ہیرس صاف گوئی سے بولا۔

''اللہ کا نام لو اور اس کی راہ میں نکل پڑو''۔

''مگر آپ کون ہیں......؟''

''میں اللہ کا بندہ ہوں اور کچھ نہیں''۔

ہیرس نے کچھ اور کہنا چاہا تھا مگر وہ اجنبی قافلے کی جانب لوٹ گیا۔ وہ تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ ہیرس نے اجنبی کی آمد اور اپنے خواب کو سچ تسلیم کیا اور سامان وغیرہ سمیٹ کر قافلے کی جانب بڑھ گیا۔ نجم الدین ایوب کے کچھ تحائف ساتھ لے کر بغداد جا رہا تھا جو اس نے امیر المومنین کو پیش کرنا تھے۔ ان تحائف کو ساتھ لے کر چلنا خاصا دشوار کام تھا مگر اُس نے انہیں کسی دوسرے کے سپرد کرنا گوارا نہیں کیا اور قافلے کے ساتھ مکہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ قافلے میں اُسے دو ایک بار وہ اجنبی چہرہ بھی دکھائی دیا تھا اس نے اشتیاق و تجسس سے اپنے قریبی ساتھی سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو وہ ہنسنے لگا۔

''حیرت ہے کہ تم انہیں نہیں جانتے۔ امیر المومنین نے انہیں جامع دمشق میں خطیب مقرر کر رکھا ہے۔ یہ مسلمانانِ اسلام میں شیخ الاسلام کے نام سے مشہور ہیں۔ بڑی نیک اور برگزیدہ شخصیت ہیں''۔ اسے جواب ملا۔

ہیرس اپنے احساسات کو کوئی نام نہیں دے پایا تھا۔ وہ نہ رہ سکا تو اپنی سے ان کا نام پوچھا۔

''شیخ عزالدین......؟'' مختصر سا جواب ملا۔

ہیرس اسی کشمکش و پیچ میں مبتلا رہا کہ وہ اجنبی کے روپ میں اُسی کے پاس کیوں آئے تھے۔ کیا یہ اجازت

ان کی بدولت ملی ہے......؟ اسی طرح کے خیالات کے ہجوم میں وہ ریگستانوں کو پار کرتا ہوا مکہ مکرمہ کی جانب بڑھ رہا تھا۔



شیخ ابوالخالق نجدویؒ صحرائے ترکستان کے برگزیدہ مشائخ میں سے ایک تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے مقرب بندوں میں شامل کیا تھا۔ روشن قلبی اور بصیرت میں انہیں نمایاں مقام حاصل تھا۔ وہ ان دنوں ہرات میں مقیم تھے کہ ان کے دل میں منگول شہر سرائے کی طرف روانہ ہونے کی خواہش مچلی۔ وہ جدھر سے گذرتے لوگ دور دور سے ان کے دیدار کے لئے جمع ہو جاتے۔ ضرورت مندوں اور عقیدت مندوں کے ہجوم سے فارغ ہو کر وہ کئی دن کی صعوبت اُٹھانے کے بعد سرائے جا پہنچے۔ صبح کا وقت تھا۔ سادہ سا لباس زیب تن تھا۔ پاؤں کے کھڑاؤں بھی گھس چکے تھے۔ ایڑی بار بار زمین سے رگڑ کھانے سے زخمی تھی۔ سرائے میں داخل ہونے کے بعد منگولوں کے وحشی چہروں پر جب ان کی نگاہ پڑی تو دل میں کسک سی اُٹھی۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے کچھ عرصہ پہلے مسلمانوں کے بڑے بڑے شہر اور کئی آبادیاں ویران کر ڈالی تھیں۔ انہوں نے سرائے کے صدر دروازے میں ٹھہر کر ایک پل کے لئے سوچا کہ انہیں کس جانب چلنا چاہئے؟ ابھی کوئی فیصلہ کر نہ پائے تھے کہ ایک چہرہ ان کی نگاہوں کے سامنے سے گذر گیا۔ انہوں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تو مخفی پردے ہٹتے چلے گئے۔ سچائی و نور کی کرن دکھائی دینے لگی۔ انہوں نے اس شخص کو پیچھے سے آواز دی۔

''نورالدین......!''

وہ شخص حیرت کے عالم میں تیزی سے پلٹا۔ وہ نورالدین ہی تھا جو تونائی خان کے ہمراہ کوتوالی کی جانب جا رہا تھا۔ تونائی خان بھی اس کا نام پکارے جانے پر چونک پڑا اور مڑ کر اس عمر رسیدہ شخص کی جانب دیکھنے لگا۔ جس نے اُسے آواز دی تھی۔ تونائی خان نے حلیے سے اندازہ لگایا کہ یہ کوئی مسلمان ہے۔ ممکن ہے کہ وہ نورالدین کا کوئی پرانا شناسا ہو۔ اس کے چہرے پر ناگواری سی پھیلنے لگی۔ مسلمانوں کو وہ پسند نہیں کرتا تھا اور سرائے میں دن بدن مسلمانوں کی آمد بڑھتی جا رہی تھی۔ اُس نے اس عمر رسیدہ شخص کی جانب زیادہ توجہ دینا مناسب نہیں سمجھا۔ نورالدین دھیمے قدموں سے ان کی جانب بڑھا۔ اس کی آنکھوں میں اجنبیت تھی وہ شاید انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

''معاف کیجئے میں آپ کو پہچان نہیں سکا''۔

''مگر میں تمہیں پہچان چکا ہوں۔ الحمدللہ میں صحیح وقت پر پہنچ گیا ہوں ورنہ غضب ہو جاتا''۔

''لگتا ہے آپ بڑی دور سے آئے ہیں''۔ نورالدین ان کی بات سمجھ نہیں سکا تھا اس لئے بات بدل گیا۔

''ہاں......! میں خاصی تکان محسوس کر رہا ہوں، چلو تمہارے گھر چلتے ہیں''۔

''میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں، آپ کچھ دیر یہیں میرا انتظار کریں۔ میں واپسی پر آپ کو ساتھ لیتا جاؤں گا......'' نورالدین تونائی خان کے ٹہوکے پر تیزی سے بولا۔ وہ کسی وقت ان کے قریب چلا آیا تھا۔ تونائی خان وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جلد از جلد اپنی مطلب برآری چاہتا تھا۔ اس کے چہرے پر بے چینی تھی۔ اگر نورالدین اس اجنبی کے ہمراہ گھر لوٹ جاتا تو معاملہ پھر کسی دوسرے روز پر پڑ سکتا تھا۔ اسی لئے اس نے ٹہوکا لگایا تھا۔

''تمہارا ضروری کام بے کار اور بے مقصد ہے نورالدین......! تمہیں اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا بلکہ تمہارے ساتھی کو بھی رسوائی کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگے گا''۔

''کیا مطلب ہے بڈھے کھوسٹ......؟'' تو نائی خان اپنے ذکر پر بھڑک گیا۔ نورالدین بھی اس کے بدتمیزانہ لہجے پر جز بز ہوا۔ شیخ ابوالائق نجدیؒ نے ہاتھ اُٹھا کر نورالدین کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''منگول......! تم جو کھیل رچانے نکلے ہو، قدرت کو وہ منظور نہیں لہٰذا بہتری اسی میں ہے کہ باز آ جاؤ اور ذلت کے گڑھے میں مت گرو''۔

''تم کیا کہنا چاہتے ہو کہ میں کوئی غلط کام کرنے جا رہا ہوں......؟'' تو نائی خان غصے سے بولا دے۔

''وہ ذات باری سب جانتی ہے۔ تم جو قصد لئے نکلے ہو۔ اِسے ترک کر دو۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم سزا کے دائرے میں مت آؤ''۔

''فضول بکواس کر کے میرا وقت برباد مت کرو۔ میں کسی بے گناہ کا خون رائیگاں نہیں جانے دوں گا۔ میں حق و انصاف کی راہ میں نکلا ہوں...... چلو نورالدین...... ! جلدی کرو، دیر ہو رہی ہے''۔ وہ ڈھٹائی سے بولا اور نورالدین کا بازو کھینچنے لگا۔ نورالدین کو تو نائی خان کی نیت پر پہلے ہی کچھ شک تھا کہ وہ اسے استعمال کر کے اپنا کوئی مقصد نکالنے کے چکر میں ہے۔ اب سر راہ شیخ نجدیؒ سے ملاقات اُسے مدد خداوندی لگی۔

''میرا خیال ہے کہ مجھے ابھی تمہارے ساتھ نہیں جانا چاہئے۔ فی الحال میں اِن کے ساتھ واپس گھر جا رہا ہوں۔ اس بارے میں میں سوچ وبچار کے بعد فیصلہ کروں گا کہ مجھے کیا قدم اُٹھانا چاہئے......؟''

''تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے......!'' تو نائی خان طیش میں چیخا۔ ''میں نے تمہارے لئے اپنے دن رات کا چین وسکون اجاڑا ہے اور اب جب میں اپنی منزل کے قریب پہنچنے والا ہوں تو تم مجھ سے دامن چھڑا رہے ہو''۔

''کیسی منزل...... ؟'' نورالدین اس کی بات پر چونک کر بولا۔

''میری منزل، میرے ضمیر کے چین وسکون کی منزل، میرے پچھتاوے اور پشیمانی کے مٹنے کی منزل......!'' تو نائی خان فوری طور پر سنبھل گیا تھا ورنہ اس کے منہ سے غلط بات نکل گئی تھی۔

''کیسے پچھتاوے منگول......؟'' شیخ نجدیؒ مسکرانے لگے۔ وہ ان کی مسکراہٹ پر محض پہلو بدل کر رہ گیا تھا۔ کوئی اور موقعہ ہوتا تو وہ اپنی تلوار کا فوراً استعمال کرتا۔ اب چونکہ وہ نورالدین کو یہ باور کرا چکا تھا کہ اُس کی مدد کرنے کا اصل سبب یہ تھا کہ وہ ماضی کے گناہوں سے تائب ہونا چاہتا ہے اسی لئے وہ اس کا ساتھ دے رہا ہے۔ وہ اپنا کھیل اتنی جلدی بگڑنے نہیں دینا چاہتا تھا۔

''نورالدین......! چلو تمہارے گھر چلیں، میں بے حد تکان اور بھوک محسوس کر رہا ہوں''۔ شیخ نجدیؒ نے بات بدلی۔ نورالدین خاموشی سے کھڑا تھا۔ ان کی بات سن کر تیزی سے ان کا بازو اپنی گردن میں ڈالے ایک جانب چل پڑا۔ تو نائی خان بے بسی کے عالم میں وہاں کھڑا محض دانت پیس رہا تھا۔



مطیع الدین کو نیند کی کے عالم میں ہلکی سی تھرتھراہٹ کا احساس ہوا۔ وہ اس خفیف سی آواز سے بیدار ہو گیا تھا۔ وہ تھرتھراہٹ کے متعلق سوچ رہا تھا مگر کوئی نام نہیں دے پایا۔ خوابیدہ حالت میں وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دائیں بائیں نگاہ ڈالی۔ سب کچھ دھندلا دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ اچانک اس کے ذہن پر چھایا ہوا نیند کا خمار کافور ہو گیا۔ وہ ہوش میں آ چکا تھا۔ چشمے پر نگاہ پڑتے ہی جیسے اُسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اس نے تیزی سے چشمے سے پانی کے چند چھینٹے اپنے چہرے پر مارے اور گھوڑے کی جانب بڑھ گیا۔ سورج ایک جانب دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اسے سوئے ہوئے کچھ زیادہ وقت نہیں گذرا۔ تکان ابھی بھی باقی تھی مگر اس نے فوراً

سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ چینائی سلطنت میں زیادہ دیر تک قیام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں تھرتھراہٹ کا خیال آیا۔ جس کے باعث اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے غور سے سننے کی کوشش کی مگر کچھ سنائی نہیں دیا۔ یکلخت اس کے ذہن میں برقائی خان کی ایک بات یاد آئی۔ وہ پل بھر میں تھرتھراہٹ کا سبب جان گیا۔ دوسرے لمحے اس نے اپنے کان زمین کے ساتھ لگا دیئے۔ خفیف سی تھرتھراہٹ اسے صاف سنائی دینے لگی۔ اس نے بہتیری کوشش کی کہ وہ اس تھرتھراہٹ کا مرکز جان پاتا مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ قاژی باشندے اس کا تعاقب کرتے ہوئے قریب ہی کہیں پہنچ چکے ہیں۔ لہٰذا یہاں مزید ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا''۔ وہ دھیرے سے بڑبڑایا۔ اب وہ وقت ضائع کئے بغیر مشکیزے میں پانی بھرنے لگا۔ پانی بھرتے ہی جست لگا کر گھوڑے کی پیٹھ پر جا بیٹھا۔ اس نے ایڑ لگائی اور گھوڑا ایک بار پھر ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے اپنی سمت کا اندازہ لگانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ چشمے سے کافی دور نکل چکا تھا۔



مسلمانانِ اسلام کا دینی مرکز اور الف لیلوی شہر بغداد میں ان دنوں امیر المومنین کے منصب پر خلیفہ ابو جعفر منصور بن ظاہر المستنصر باللہ براجمان تھا۔ وہ رجب 623ھ میں خلافت کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ اس کی ماں خلیفہ ظاہر بامر اللہ کی ترکن لونڈی تھی۔ وہ بے حد عادل اور نیک دل خلیفہ تھا۔ اس کا ثبوت اُن روایات کا اجراً تھا جنہیں ایک عرصے سے نام نہاد علماء نے متروک قرار دے رکھا تھا۔ علماء کی جماعتیں اپنے مسالک کو عمدہ ثابت کرنے میں شعائرِ اسلامیہ کو بھی رد کر چکی تھیں۔ خلیفہ المستنصر باللہ نے شعائرِ اسلامیہ کو روحِ حقیقی پر از سرِ نو گامزن کیا۔ مؤرخ عبداللطیف کا بیان ہے کہ اس زمانہ کے لوگ سرِ عام اسلامی محاسن یاد کرنے لگے، خلیفہ وقت کی تعریف وتوصیف ہر شخص کی زبان پر تھی، اس کی عیب جوئی کا دور تک نام ونشان نہیں تھا۔ نیک خصائل و عادات کے باعث اس کے دادا خلیفہ الناصر الدین اللہ نے اسے ہر دم عزیز رکھا۔ وہ اسے پیار سے قاضی پکارا کرتا تھا خلیفہ مستنصر باللہ نے اپنے زمانے میں اتنی فوج جمع کر لی تھی کہ اس سے پہلے آباء واجداد میں سے کسی کے پاس اتنا بڑا جری لشکر نہیں تھا۔ تاتاری جب سلطنت خوارزم روند کر بغداد کی جانب بڑھے تو خلیفہ کی بہادر فوج نے خفاجی کی زیر قیادت انہیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ خفاجی امیر المومنین کا سگا بھائی تھا اس کی خواہش تھی کہ تاتاریوں پر کاری ضرب لگائی جائے اور اسے حملہ کی اجازت دی جائے مگر امیر المومنین نے بغداد سے خطرہ ٹل جانے پر ہی تکیہ کیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ تاتاری لشکر مکمل طور پر کامیابی نہیں حاصل کر پایا تھا۔ خفاجی کا کہنا تھا کہ وہ بہت جلد بغداد پر دھاوا بول دیں گے۔ مگر اس کی بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔

خلیفہ مستنصر باللہ کا دربار یکتائے روزگار اور بے مثل شخصیات سے بھرا رہتا تھا، ان میں شیخ السلام عزالدین بن عبدالسلام، وجیہہ قیروانی، امام ابوالقاسم رافعی، یاقوت حموی، حافظ ابوالحسن بن قطان، حافظ عزالدین علی بن اثیر، ابن نغمی، شہاب سہروردی، بہاء بن شداد، ابوالعباس عونی، علامہ ابوالخطاب بن دحیہ، ابولبرکات بن مستوفی، ضیاء بن اثیر، ابن عربی، کمال بن یونس شارح شامل تھیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے نامی گرامی حضرات وہاں موجود رہتے تھے۔

بیبرس ادائیگی حج سے فارغ ہو کر وقت ضائع کئے بغیر بغداد کی جانب نکل پڑا۔ نکلتے وقت شیخ عزالدین نے اسے اپنے مقصد میں کامیاب لوٹنے کی پیش گوئی کی۔ جس پر وہ بے حد مسرور ہوا۔ وہ انتہائی تیز رفتاری سے سفر کرتے ہوئے 23 ذی الحجہ کو بغداد میں داخل ہوا۔ مسلمانانِ اسلام کے مرکز میں پہنچ کر اسے عجیب سرشاری کا

احساس ہوا۔ بغداد جس کا نام اس نے کئی بار سنا تھا مگر یہاں آنے کا اتفاق نہیں ہو سکا تھا۔ واقعی الف لیلوی داستانوں جیسا حسن و جمال کا شاہکار تھا۔ شاہراہوں اور گلی محلوں کو ایک خاص ترتیب سے بنایا گیا تھا۔ وہ ایک بڑے حمام میں پہنچا۔ وہاں اُس نے غسل کیا اور صاف لباس پہن کر قصر خلافت کی راہ لی۔ صدر دروازے پر موجود درباری نے اُسے روک کر آنے کا مقصد دریافت کیا۔ بیبرس نے جب اُسے بتایا کہ وہ قاصد ہے اور امیر المومنین سے ملاقات کرنا چاہتا ہے اور اس کے پاس سلطانِ مصر کا پیغام ہے تو درباری نے اسے قاصدوں کے دفتر کی جانب جانے کی ہدایت کی جہاں ناظم امور سفارت بیٹھتا تھا۔ بیبرس سیدھا اس کے پاس پہنچا اور اپنا مدعا بیان کیا۔ اس نے بیبرس کا چہرہ دیکھ کر حیرت کا مظاہرہ کیا۔ کسی بڑے سلطان کی جانب سے کم عمر نوجوان کو قاصد بنا کر روانہ کرنا واقعی عجیب سی بات تھی۔ اس نے بیبرس کو مہمان خانے میں ٹھہرایا اور جلد ہی ملاقات کروانے کا وعدہ کیا۔ ایسے میں تین دن بیت گئے۔ بیبرس فارغ اوقات میں بغداد کے گلی کوچوں میں گھومتا رہتا۔ اگلی شام اسے یہ نوید سنائی گئی کہ کل صبح اسے دربار خلافت میں حاضر ہونا ہے۔ یہ اس کے لئے بہت بڑا اعزاز تھا کہ اسے امیر المومنین کے سامنے پیش کیا جاتا اور وہ اپنا مدعا بیان کرتا۔ یہ ذمہ داری واقعی بڑی تھی۔ ناظم بیبرس کی حالت سے سمجھ گیا کہ اسے ایسے امور کا تجربہ نہیں ہے، وہ خوفزدہ ہونے کے ساتھ جھجک بھی رہا ہے۔ اس نے بیبرس کی ہمت بندھائی اور اسے آداب ملاقات بھی سمجھائے۔ بیبرس نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ تمام رات آنے والی صبح کے بارے میں سوچتا رہا۔

دوسرے روز وہ اعلیٰ پوشاک زیب تن کئے خاص تحائف ساتھ لئے امیر المومنین خلیفہ ابوجعفر المستنصر باللہ کے حضور پیش ہوا۔ دربار کی شان و شوکت دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی جا رہی تھی۔ خلیفہ ابوجعفر بڑے قیمتی تخت پر سب سے اونچی مسند پر موجود تھا۔ اس کے اطراف میں خاص عمائدین اور نیچے عام درباریوں کا مجمع دکھائی دے رہا تھا۔

''کہو قاصد......! کیا پیغام لائے ہو؟''

امیر المومنین کے پاس کھڑے وزیر اعظم نے اسے مخاطب کیا تو وہ جلدی سے سنبھل گیا۔ اس نے چاندی کے چھوٹے سے بکس کا منہ کھول کر تخت کی جانب بڑھایا۔ اس میں موجود سنہرے کپڑے پر نجم الدین ایوب کا اطاعت و بیعت نامہ دکھائی دے رہا تھا۔ وزیر اعظم نے ایک درباری کو اشارہ کیا۔ اس نے بڑھ کر وہ بکس بیبرس کے ہاتھوں سے لے لیا اور سر جھکائے بڑے احترام سے تخت کی سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ کچھ ہی لمحوں میں وزیر اعظم نے نجم الدین ایوب کا پیغام پڑھ کر امیر المومنین کو سنا دیا۔ اس پیغام میں بیت المقدس پر دوبارہ مسلمانوں کے قبضے کی خوشخبری بھی موجود تھی۔

خلیفہ ابوجعفر المستنصر باللہ نے جب تمام حال سنا تو اس نے فوری طور پر نجم الدین ایوب کے لئے مصر کی حکومت کا پروانہ جاری کرنے کا حکم دیا۔ اسی اثناء میں بیبرس نے دوسرے تحائف بھی امیر المومنین کے حضور پیش کر دیئے۔

''نوجوان اوپر یہاں آؤ......'' خلیفہ نے بیبرس کو پاس بلایا۔ بیبرس اپنی اس عزت افزائی پر بے حد مسرور ہوا اور ادب و احترام سے سیڑھیاں طے کرتا ہوا خلیفہ کے پاس پہنچ گیا۔

''تمہارے سلطان نے اپنی جانب سے بیعت کا اختیار تمہیں تفویض کیا ہے، کیا تم ہماری بیعت کرتے ہو......''

بیبرس نے یہ سنا تو دونوں ہاتھ امیر المومنین کے بڑھے ہوئے ہاتھ کی جانب بڑھائے اور ان کی پشت پر

بوسہ دیتے ہوئے نجم الدین ایوب اور اپنی جانب سے بیعت کا اقرار کیا۔ خلیفہ ابوجعفر کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پا کر فرطِ مسرت سے اس کے آنسو نکل آئے تھے۔ وہ امیر المومنین کی صورت میں خاندانِ نبوت کی جھلک دیکھ رہا تھا۔ حضرت عباسؓ کی اولاد میں سے کسی فرد سے ملاقات کا شرف حاصل ہونا کسی زیارت سے کم نہیں تھا۔ وہ ابھی اپنے محسوسات کے دائرے میں الجھا تھا کہ پروانہ حکومت تیار ہو کر آ گیا۔ خلیفہ ابوجعفر نے پروانہ اس کی جانب بڑھایا۔

''نوجوان......!'' خلیفہ ابوجعفر بولا۔ ''ہمیں تمہاری کم عمری اور اتنے بڑے فرض کی ذمہ داری دونوں پر تعجب ہے۔ تم سلطان کے بہت قریبی اور وفادار ساتھی ہو، شاید اسی لئے تمہیں یہ اعزاز بخشا گیا ہے۔ بہر حال اپنے سلطان سے کہنا کہ ہمیں خاندان ایوبی پر بے حد فخر ہے۔ انہوں نے بغداد کے کمزور ایام میں مسلمانانِ اسلام پر جو مہربانیاں کی ہیں، ان کے لئے ہم ان کا جتنا شکریہ ادا کریں وہ کم ہے۔ تمہارے سلطان کا نام نجم الدین ایوب ہے نا......''

بیبرس نے تیزی سے اثبات میں جواب دیا۔

''اس سے کہنا کہ اس کے جد اعلیٰ نجم الدین ایوب نے جو کارنامے انجام دیئے تھے ہم ویسے کارناموں کی توقع اس سے بھی رکھیں گے''۔

''امیر المومنین......! آپ بے فکر رہیں۔ میرا آقا بے حد شجاع اور سچا مسلمان ہے''۔ بیبرس نے کہا۔

''تمہارے شجاع آقا کے لئے ہماری جانب سے تاج شاہی، شاہی خلعت، بیس کڑیل غلام اور پانچ حسین کنیزیں ہماری جانب سے تحفہ خاص ہیں......'' خلیفہ نے بارعب لہجے میں کہا۔ بیبرس نے سر جھکا کر اُسے سلام کیا اور اپنا مدعا پورا ہونے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ وہاں سے فراغت پا کر سیدھا اپنی قیام گاہ پر واپس لوٹا۔ یہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ امیر المومنین نے اس کے لئے مزید دو دن تک یہاں ٹھہر کر ضیافت اُڑانے کا حکم بھی جاری کیا ہے۔ اس کے بعد ہی اس کی واپسی ممکن ہو سکے گی۔ دو دن تک مزید بغداد میں قیام کیا۔ جب وہ روانہ ہونے لگا تو پانچ نقاب پوش کنیزیں اور بیس غلام اور پچاس کے قریب عربی گھوڑے اس کے ساتھ روانہ کئے گئے۔ وہ سب گھوڑے تحائف سے لدے پڑے تھے۔ بیبرس خود بھی نہیں جانتا تھا کہ ان پر لدے تحائف میں کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ وہ تنہا بغداد پہنچا تھا مگر جب وہاں سے نکلا تو ایک بڑا قافلہ اس کے ہمراہ تھا۔



نور الدین شیخ نجدیؒ کے ہمراہ اپنے گھر چلا آیا۔ اس نے سب سے پہلے انہیں غسل کروایا اور اس کے بعد صاف لباس پہننے کو دیا۔ دوران غسل ہی اس نے طبیب کو بلوانے کا انتظام کر لیا تھا۔ جب شیخ نجدیؒ غسل سے فارغ ہو کر باہر نکلے تو طبیب نے ان کے پاؤں پر مرہم پٹی کی۔ شیخ نجدیؒ نے منع کرنا چاہا مگر انہیں نور الدین کی ضد کے سامنے خاموش ہونا پڑا۔ مرہم پٹی کے بعد رنگ برنگے پکوان مہمان خانے میں لائے گئے۔ شیخ نجدیؒ نے صرف ایک ہی کھانے کو کافی قرار دیا۔ نور الدین نے دوسرے پکوان کے لئے بہتیرا زور لگایا مگر انہوں نے صاف منع کر دیا۔ جب کھانے سے فرصت ہوئی تو تخت پوش کے ساتھ ٹیک لگائی نور الدین نے بڑھ کر گاؤ تکیہ پیش کرنا چاہا تو انہوں نے ''اس کی ضرورت نہیں''۔ کہہ کر منع کر دیا۔

''میں ابھی تک آپ کو پہچان نہیں سکا ہوں'' نور الدین جھینپے ہوئے لہجے میں بولا۔

''نور الدین!'' شیخ نجدیؒ نے مسکرا کر کہا۔ ''ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہوتا ہے، اس کے لئے شناخت ضروری نہیں۔ میں بھی تمہارا بھائی ہوں۔ بس دل کیا تم سے ملنے یہاں چلا آیا''۔

''آپ بجا فرما رہے ہیں مگر ہر بھائی کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کے نام سے تو کم از کم آگاہ ہو''۔

''بہت خوب......! تمہاری بات نے میرا دل خوش کر دیا۔ نام پوچھنے کا اچھا انداز اپنایا ہے''۔

''اب آپ میری بات گول کر رہے ہیں''۔

شیخ نجدیؒ نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

''میرا نام ابوالخالق ہے لوگ مجھے شیخ نجدی کے نام سے پکارتے ہیں''۔

''الحمدللہ......! میں آپ کو پہچان گیا ہوں۔ آپ کا نام عرصہ سے سن رکھا تھا۔ آج ملاقات کا شرف بھی حاصل ہو گیا''۔ نورالدین کے چہرے پر بشاشیت سی پھیل گئی۔

''مجھے آسمان پر مت بٹھاؤ نورالدین! میں حقیر سا بندہ ہوں جو بحکم باری تعالیٰ سے اس کے بندوں کو راستی کی جانب بلانے کی کوشش کرتا ہوں''۔

''شیخ جی!'' نورالدین تیزی سے ان کے قریب ہو گیا ''میں ایک عرصے سے کرب میں مبتلا ہوں کیا آپ اللہ کے حضور میری سفارش کر سکتے ہیں وہ میرے ذہن کو سکون و اطمینان بخشے''۔

''میں تمہارا اشارہ سمجھ گیا ہوں۔ کیا تم اس منگول سے میری گفتگو نہیں سمجھ پائے''۔

''ہاں مجھے اس کا کچھ اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ میرے شک کے مطابق واقعی کسی اپنے مقصد کے لئے مجھے ڈھال بنا کر استعمال کرنا چاہتا تھا۔ وہ میرے مرحوم بیٹے کا ناجائز فائدہ اُٹھانے کے چکر میں تھا''۔

''کیا کہا؟ نورالدین! مرحوم بیٹا......''

''ہاں میرا ایک ہی بیٹا تھا جو ایک عرصہ سے لاپتہ ہو گیا تھا اب کچھ اس قسم کی اطلاعات ملی ہیں کہ شاید وہ اب دنیا میں نہیں رہا''۔

''جھوٹی خبروں پر مت کان دھرا کرو، اور اللہ کی ناشکری مناسب نہیں''۔

''تو کیا میرا بیٹا ابھی زندہ ہے؟'' نورالدین اُلجھ سا گیا۔

''زندہ بھی ہے اور جلد ہی واپس لوٹے گا''۔

''وہ قوتائی خان تو کچھ اور ہی کہانی سنا رہا تھا''۔ نورالدین مسرت و استعجاب میں ڈوب گیا۔

''تم شاید اُس منگول کی بات کر رہے ہو۔ وہ اپنے کیے کی جلد ہی سزا پائے گا مگر ابھی کچھ دیر ہے''۔ شیخ نجدیؒ نے جواب دیا تو نورالدین کو ایسے لگا جیسے اس کو نئی زندگی مل گئی ہو۔ شیخ نجدیؒ کا اچانک اس سے آملنا مدد خداوندی سے کم نہیں تھا۔ وہ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس سے جلد بازی میں کوئی غلط قدم نہیں اُٹھ گیا ورنہ وہ پشیمانی کے عالم میں جان دے دیتا۔



قازی باشندے اپنے سردار کے ہمراہ نیلے پتھروں والے چشمے پر دن چڑھے پہنچے تھے۔ انہوں نے جو مختصر راستہ اختیار کیا تھا وہ خاصا دشوار اور کئی جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنے کے باوجود مقررہ وقت پر اپنی منزل پر نہیں پہنچ پائے۔ وہاں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ وہ سوار وہاں سے اگلی منزل کی جانب روانہ ہو چکا ہے۔ سردار اس جوان کی دلیری اور ہمت پر داد دیئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

''سردار......! اب کیا کریں وہ تو ہاتھوں سے نکلتا دکھائی دے رہا ہے''۔

''ہمت نہ ہارو۔ وہ ہماری پہنچ سے اتنی آسانی سے نہیں نکل پائے گا''۔

''سردار......! گھوڑے کے کھر تازہ ہیں اور دوسرا یہاں قدموں کے نشانات سے بھی واضح ہے کہ اسے یہاں سے روانہ ہوئے زیادہ وقت نہیں ہوا''۔ راہ نما نے کہا۔

''تم ذرا زمین پر کان لگا کر پتہ کرو کہ وہ کتنا دور ہو گا......؟'' سردار نے ہدایت کی۔

ایک قازی جوان تیزی سے زمین پر لیٹ گیا اس نے اپنا دم سادھ لیا تھا۔ اس کے کان زمین سے چپکے پڑے تھے۔ وہ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز صاف سن رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک یونہی لیٹا رہا۔ سردار سمیت تمام لوگ اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔

''سردار......! وہ ہم سے تین منزل کے فاصلے پر ہے۔ اس کی رفتار سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ رات پڑنے تک درّہ کے پاس پہنچ جائے گا''۔

''حیرت انگیز......!'' سردار تعجب سے بول اُٹھا ''اس جوان کی رفتار بے حد تیز ہے۔ درّہ کے دوسری جانب ضرگامی قبیلہ آباد ہے اور وہ ہمارا جانی دشمن ہے۔ اگر وہ درّہ پار کر گیا تو ہم اسے پکڑ نہیں سکیں گے''۔

''سردار......! ضرگامی قبیلہ کے لوگ اسے کسی بھی حال میں تاتاری سرحد کی جانب نہیں بڑھنے دیں گے''۔ ایک قازی بولا۔

''ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ اسے ہر حال میں ہمارا شکار بننا ہو گا۔ میں اپنی شکست تسلیم نہیں کروں گا چلو تیزی سے درے کی جانب شمالی جانب سے بڑھو۔ میں اس گھڑ سوار سے پہلے وہاں اپنا جال بچھانا چاہتا ہوں۔ یہ آخری اور فیصلہ کن معرکہ ہو گا''۔

''یاد رکھو سردار......! اگر تم یہ بازی ہار گئے تو تم ہمارے سردار نہیں رہ سکو گے۔ ہم تمہیں اپنا شکار بنا لیں گے۔ یہ اصول ہمارے بڑوں کے وضع کردہ ہیں''۔ ایک قازی تنک کر بولا۔

''مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں اور تم لوگ بھی کان کھول کر سن لو اگر تم شام سے پہلے اس درّہ تک نہ پہنچ سکے تو میں بطور سردار تم سب کو سزا دینے کا اختیار رکھتا ہوں۔ یہ میری آخری تنبیہ ہے''۔ سردار کا لہجہ یکدم سرد اور خونخوار ہو گیا تھا۔ وہ محض گردن ہلا کر رہ گئے۔ وہ سب اپنے سردار کے ساتھ نہایت سرعت سے اس درّے کی جانب بڑھنے لگے جہاں مطیع الدین شام تک پہنچنے والا تھا۔



بیبرس بغداد سے مختلف مقامات پر قیام کرتا ہوا 16 محرم 638ھ کو قاہرہ کے قریب آن پہنچا۔ اس نے تین منزل دور سے ہی اپنی آمد کی خبر دربار مصر بھجوا دی تھی۔ اس نے اپنا آخری پڑاؤ قیروان نامی بستی میں ڈالا۔ یہ بستی کسی زمانے میں عظیم الشان شہر کی صورت میں آباد تھی۔ فرعونِ مصر سے لے کر مسلمانوں کے اوّلین دور تک اسے بڑی اہمیت حاصل رہی تھی۔ فاطمی دور حکومت میں اس سے کچھ فاصلے پر نیا شہر آباد کیا گیا جسے قاہرہ کا نام دیا گیا۔ کارخانہ اقتدار قاہرہ میں منتقل ہو گیا اور پھر اس شہر کی رونقیں ماند پڑ گئیں۔ شہر اپنے سابقہ کھنڈرات کے ہمراہ سکڑ کر چھوٹے سے قصبے کی صورت میں باقی رہ گیا۔ بیبرس اسی بستی سے کچھ فاصلے پر قیام کئے ہوئے تھا۔ اس نے اپنی کامیابی کی اطلاع اور دیگر تحائف کی خبر اسی بستی کے ایک سرکاری عہدے دار کے ذریعے قاہرہ بھجوائی تھی۔ نجم الدین ایوب بیبرس کی کامیاب واپسی سے بے حد مسرور ہوا۔ فوری طور پر ابوخویلد کی امارت میں پچاس گھڑ سواروں کا دستہ بیبرس کی جانب روانہ کیا گیا۔ امرائے مصر کو جب کسی کی آمد کی خبر ہوئی تو وہ سخت متحیر ہوئے کہ ایسا کون سا فرد آ رہا ہے جس کے لئے اتنا بڑا اور نہایت سرعت سے بندوبست کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے اِدھر اُدھر سے کھوج لگانے کی بڑی کوشش کی مگر کسی کو معلوم ہی نہیں کہ یہ سب کیوں کیا جا رہا ہے؟ بیبرس کے بھیجے ہوئے قاصد کو دربار

کے شاہی مہمان خانے میں ٹھہرا دیا گیا تھا اور اسے باہر نکل کر کسی سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ ابو خویلد بیبرس کے پاس پہنچا تو اس نے اس کی تعریف و توصیف میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ بیبرس اپنے استاد کے منہ سے اپنی تعریف سن کر بس خوش ہوا اور ان کے دونوں ہاتھ تھام کر اپنی خوش بختی پر رونے لگا۔ ابو خویلد نے اس کی کمر تھپتھپا کر ہمت بندھائی کہ وہ ایک ایسے امتحان میں سے بخوبی نکل آیا تھا جس میں بڑے بڑے سورما ناکام رہ جایا کرتے ہیں۔ بیبرس اور اس کا قافلہ ابو خویلد کے گھڑ سوار دستے کی رہنمائی میں شام ہونے سے قبل ہی قاہرہ کے صدر دروازے پر پہنچ گیا۔ وہاں امرأ و اشراف کی بڑی تعداد موجود تھی جو کہ محض اس تجسس سے وہاں جمع تھے کہ کون آرہا ہے؟ جب ان کی نگاہ بیبرس پر پڑی تو ان میں سے کئی ایک نے منہ بسور لئے۔ البتہ اس کے ہمراہ پالکیوں میں خواتین اور حبشی مردوں کا ساتھ ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ نجم الدین ایوب خود ان کے استقبال کے لئے صدر دروازے تک آیا تھا۔ بیبرس اور ابو خویلد نے جب اپنے آقا کو سامنے دیکھا تو گھوڑوں سے نیچے اتر کر اس کے پاس آن پہنچے۔ بیبرس نے اپنے آقا سے مصافحہ کیا اور اپنی کامیابی کی نوید سنانا چاہی تو نجم الدین ایوب نے اشارے سے منع کر دیا۔ یہ قافلہ سلطان نجم الدین ایوب کے جلو میں شاہی محل تک پہنچ گیا۔ سلطان نجم الدین ایوب شاہی محل کے باہر دیوان کے چبوترے پر چڑھ آیا۔ پھر تمام بغدادی کنیزوں اور غلاموں کو چبوترے کے پہلو میں ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا۔ امرأ و اعیانِ شہر کی جماعت اس عجیب و غریب کھیل کو دیکھ کر اندازے لگانے میں مصروف تھی، قیاسات کی بھرمار ہو رہی تھی۔ مجمع کی آوازوں نے کچھ بھی سننا دشوار کر رکھا تھا۔ اچانک نجم الدین ایوب نے ہاتھ کا اشارہ کیا تو مجمع کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

"میرے مصاحبو اور ساتھیو! میں نے گذشتہ دنوں ایک درخواست بھجوائی تھی جسے بحکم باری تعالیٰ منظوری نصیب ہوئی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ سب یہ جاننے کے لئے بے چین ہیں کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں چاہوں گا کہ قاضی القضاۃ ابن مستقر یہاں میرے پاس تشریف لائیں اور آپ سب کو تجسس کے دائرے سے آزاد کر ڈالیں"۔

قاضی القضاۃ ابن مستقر خود لاعلم تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ وہ آہستہ آہستہ چبوترے کا زینہ طے کر کے سلطان نجم الدین ایوب کے مقابل پہنچ گیا اس کی آنکھوں میں گہرا استفسار موجود تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولنے کی کوشش کرتا، نجم الدین ایوب نے اُسے روک دیا اور بیبرس کو اشارہ کیا۔ بیبرس اشارہ پاتے ہی جست لگا کر چبوترے پر پہنچ گیا۔

"فرمان شاہی ان کے حوالے کر دو تاکہ وہ پڑھ کر دوسرے تمام لوگوں کو سنا سکیں"۔

بیبرس نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور ایک سنہرے بکس کو اپنے لبادے سے نکالا اور اس کا ڈھکن کھول کر بکس ان کی جانب بڑھا دیا۔ ابن مستقر کی مشاق نگاہیں پہلی نظر میں پہچان گئی تھی کہ یہ شاہی فرمان کہاں سے آیا ہے؟ ایک دھیمی سی مسکان اس کے چہرے پر پھیلی۔ اس نے سلطان نجم الدین ایوب کی جانب دیکھ کر اس کی ذہانت کی داد دی۔ شاہی مراسلہ اس نے نہایت غور سے پڑھا اور اس کے بعد آگے بڑھ کر نجم الدین ایوب کو امیر المومنین کی جانب سے بلادِ مصر کی قانونی امارت ملنے پر مبارکباد دی اس کا چہرہ خوشی سے دمکتا دکھائی دیا۔ لوگ مزید وقت گذرنے پر شدید اُلجھن کا شکار ہونے لگے۔ ابن مستقر نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بلند آواز میں امیر المومنین ابو جعفر مستنصر باللہ کا شاہی مراسلہ پڑھ کر سنایا جس میں نجم الدین ایوب کو خلیفہ بغداد کی جانب سے بلادِ مصر کے تمام اختیارات تفویض کر دیئے جانے اور امیر المومنین کے لئے بیعت لینے کا اختیار بھی سونپے جانے کا تذکرہ موجود تھا۔ امرأ مصر نے جب امیر المومنین کے شاہی فرمان کو سنا تو ان کے چہروں پر بشاشیت پھیل گئی۔

سلطان نجم الدین ایوب، الملک الصالح اور امیر المومنین کے نعروں سے فضا گونجنے لگی۔ قاہرہ کے لوگوں نے امیر المومنین کے بارے میں محض سن رکھا تھا، امیر المومنین کو دیکھنے کی توفیق انہیں نصیب نہیں ہوئی تھی، اسی لئے ان میں فرطِ مسرت سے اتنا جوش دکھائی دے رہا تھا۔ نجم الدین ایوب خود بھی آج بے حد خوش تھا۔ وہ اب بلادِ مصر کا مکمل اور بااختیار حاکم تھا۔ کوئی امیر اس کی ٹانگ کھینچنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ مجمع میں موجود کئی چہرے بجھے اور پژمردہ بھی دکھائی دیئے تھے جو کہ چند ساعتوں بعد وہاں سے نکل آئے تھے۔ وہ ایسے امرأ تھے جنہیں سلطان کے اس اقدام پر بے حد افسوس ہوا تھا یا پھر اپنی حاکمیت خطرے میں پڑتی دکھائی دے رہی تھی۔



شیخ الاسلام علامہ عز الدینؒ بن عبد السلام دمشقی کا شمار علمائے حق کی اُس بابرکت اور مقدس جماعت میں ہوتا ہے جس کے علم و فضل، زہد و ورع، حق گوئی و بے باکی اور جرأت و استقامت کے درخشندہ واقعات سے تاریخ اسلام کے صفحات منور ہیں۔ علامہ عز الدینؒ 578ھ میں دمشق میں پیدا ہوئے اور اپنے دور کے مشاہیر و جید علماء کے سایہ شفقت میں رہ کر ان کے دست مبارک پر بیعت کی۔ شیخ عز الدینؒ نے جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ان میں سیف الدین آمدیؒ، حافظ ابو محمد القاسمؒ اور فخر الدین بن عساکر جیسے اکابر علماء شامل تھے۔ شیخ عز الدینؒ نے سن بلوغت میں قدم رکھنے سے قبل ہی قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر اور دوسرے علوم اسلامیہ میں درجۂ تبحر پا لیا تھا۔ انہیں سلطان العلماءؒ اور امام وقت تسلیم کیا گیا۔ ان کے ہم عصر علامہ شیخ جمال الدین ابن حاجبؒ انہیں فقہ میں امام غزالیؒ کے پایہ کا عالم گردانتے تھے۔ امام ذہبیؒ انہیں درجہ اجتہاد میں کامل اور مستند تسلیم کیا کرتے۔ علامہ عز الدینؒ کئی سال سے دمشق کے زاویہ غزالیہ میں درس و تدریس میں مشغول تھے۔ اس کے ساتھ امیر المومنین کے فرمان کے مطابق جامع اموی دمشق میں خطابت اور امامت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ الملک الکامل نے جب دمشق کا دورہ کیا تو انہیں دمشق کا عہدہ قضاۃ بااصرار پیش کیا لیکن انہوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ البتہ دربار بغداد میں ایوبی حکومت کا سفیر بننا پسند کیا اور کچھ عرصہ تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ الملک الکامل کی وفات کے بعد وہ واپس دمشق لوٹ آئے، اپنے سابقہ طرز حیات کو اپناتے ہوئے درس و افتاء اور وعظ و ہدایت میں مشغول ہو گئے۔

شیخ عز الدینؒ بڑے خود دار، باوقار اور بارُعب شخصیت کے مالک تھے۔ وہ خود کو شاہی مراتب اور درباری پیچیدگیوں اور جھمیلوں سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے تبحر علمی، زہد و ریاضت اور حق گوئی کی بدولت وہ شام کی سب سے بڑی دینی شخصیت متصور کئے جاتے۔ 637ھ میں جب الملک الصالح عماد الدین اسماعیل نے نجم الدین ایوب سے دمشق ہتھیایا تو انہوں نے عماد الدین اسماعیل کے اس فعل پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ عماد الدین اسماعیل نے ان کی پسند و ناپسند کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ جب عماد الدین اسماعیل کو قاہرہ سے مراسلے ملنا شروع ہوئے تو اس کی نیت میں فتور پیدا ہونے لگا وہ بلاد شرقیہ و شام کے ساتھ ساتھ بلادِ مصر پر بھی للچائی نگاہیں ڈالنے لگا۔ جس دن اس نے مصر کی جانب کوچ کرنا تھا اسی دن الملک الجواد کے محاصرے نے اس کا دماغ خراب کر کے رکھ دیا۔ وہ نجم الدین ایوب کی اس چال کو بخوبی سمجھ گیا کہ وہ وقت کی نزاکت سے فائدہ اُٹھا لے گا۔ حالانکہ یہ چال نجم الدین ایوب کے علم میں بھی نہیں تھی۔ یہ قدم الملک الناصر نے محض اپنی حکومت بچانے کے لئے اُٹھایا تھا۔ اس نے اپنی حکمت و بصیرت سے الملک الجواد کے لشکر کو محاصرہ ختم کرنے اور واپس لوٹنے پر راضی کر لیا تھا۔ اس نے اپنے بھائی والی غلطی دہرانے میں ذرا گریز نہیں کیا۔ اس نے فوری طور پر مفرور شاہ یروشلم فریڈرک اور صلیبی گروہوں کے ساتھ دوستی کا ہاتھ ملایا اور ان سے اپنے بھتیجے سلطان مصر نجم الدین ایوب

کے خلاف مدد طلب کی۔ اس مدد کے عوض اس نے نہ صرف انہیں صیدا، شقیف اور دوسرے اہم قلعوں کا پروانہ لکھ کر دے دیا بلکہ انہیں کھلے بندوں دمشق میں گھومنے پھرنے اور ہتھیار خریدنے کی اجازت بھی دے دی۔ صلیبی بے دھڑک دمشق میں داخل ہوتے اور یہاں سے ہتھیار خریدتے اور مسلمانوں کو کینہ توز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے واپس لوٹ جاتے۔ ان کی آنکھوں میں ان کی نادانی کا تمسخر جھلکتا کہ آنیوالا کل انہی ہتھیاروں سے انہی کی گردنیں کاٹے گا۔ مسلمانوں میں غلط قسم کی تجارت کی وباء چل نکلی تھی، وہ دوسروں کی ریس میں صلیبیوں کو ہتھیار بیچنا زیادہ پسند کرتے۔ شیخ عزالدینؒ نے جب یہ صورت دیکھی تو انہیں عماد الدین اسماعیل کی بے حمیتی سے سخت صدمہ پہنچا۔ انہوں نے فوراً جامع اموی میں فتویٰ جاری کر دیا کہ نصرانیوں اور یہودیوں کے ہاتھ ہتھیار بیچنا حرام ہے کیونکہ وہ دشمنان اسلام ہیں اور وہ یہی ہتھیار مسلمانوں کے خلاف استعمال کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے شاہ دمشق عماد الدین اسماعیل کا نام خطبۂ جمعہ سے خارج کر دیا اور اس کے لئے دعا موقوف کرتے ہوئے صرف یہ دعا مانگی۔

''الٰہی! اسلام اور دین محمد ﷺ کے حلقہ بگوشوں کی مدد فرما اور انہیں نصرت سے نواز، اور دشمنانِ اسلام کو ذلیل وخوار فرما اور ہمیں ایسے بے دین گروہ سے محفوظ رکھ''۔

عماد الدین اسماعیل کو جب شیخ عزالدینؒ کے بارے میں اطلاع پہنچی تو وہ سخت غضبناک ہوا، اس نے فوری طور پر انہیں تمام سرکاری و دینی مناصب سے برطرف کرتے ہوئے ان پر اپنی اطاعت کا دباؤ ڈالا۔ شیخ عزالدینؒ کے دل میں جو کچھ تھا انہوں نے اس کے منہ پر صاف کہہ ڈالا۔ عماد الدین اسماعیل نے انہیں کچھ دن تک نظر بند رکھا، لیکن شیخ عزالدینؒ تمام تر سختیوں کے باوجود اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ عمائدین شہر کے سخت دباؤ کے باعث اس نے قید کی صعوبت ختم کر دی، لیکن جب عماد الدین اسماعیل کے ساتھ ساتھ والی حمص الملک الاشرف بھی صلیبی پرچم تلے چلا آیا تو آپ کا دل اٹھ گیا، دمشق و حمص کے مسلمانوں کی بے بسی حد سے گذرنے لگی تو شیخ عزالدینؒ بددلی سے اپنا بستر سمیٹنے لگے۔ انہوں نے سرزمین مصر کو اپنی جائے قیام کے لئے منتخب کیا تھا، دمشق کے لوگوں کو جب آپ کی روانگی کا علم ہوا وہ گروہ درگروہ آپ کے گرد جمع ہونے لگے، ان میں شیخ عزالدینؒ کی اچانک مصر روانگی کے بارے میں گہرا اضطراب پیدا ہونے لگا۔ آپ نے انہیں وہاں سے ہٹ جانے کے لئے کہا تو وہ مایوس واپس لوٹ گئے۔ اسی شام اعیان اور امرأ شہر کا ایک وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے استدعا کی کہ آپ مصر جانے کا ارادہ ترک کر دیں، ہم والئی دمشق کو راضی کر لیں گے، آپ صرف اتنا کر دیں کہ الملک الصالح اسماعیل کے پاس جا کر اس کی دست بوسی کر لیں۔

یہ سن کر شیخ عزالدینؒ دھیما سا مسکرا کر بولے۔

''صاحبو! مجھے تو یہ بھی گوارہ نہیں کہ بادشاہ میرے ہاتھ کو بوسہ دے چہ جائیکہ میں اس کی دست بوسی کروں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اس آفت سے آزاد رکھا ہے، جس میں تم لوگ گرفتار ہو۔ لوگو! تم کسی اور عالم میں ہو اور میں کسی اور عالم میں۔ اس لئے میرا راستہ نہ روکو''۔

اعیان و امرأ شہر اپنا سا منہ لے کر لوٹ گئے۔ اس کے چند دن بعد ہی شیخ عزالدینؒ اپنے اہل و عیال کے ہمراہ دمشق سے نکل پڑے۔



قوتائی خان شیخ نجد دیؒ کی اچانک آمد پر بے حد پریشان تھا، اس کا منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچنے والا تھا کہ وہ بیچ میں کود پڑے۔ قوتائی خان بے چینی کے عالم میں کمرے میں چکر کاٹ رہا تھا۔ وہ جب گھر سے نکلا تھا تو اس کا

چہرہ خوش و خرم تھا مگر جب واپس لوٹا تو چہرے کے خد و خال بگڑے ہوئے تھے۔ گھر کے کسی فرد نے اس سے کوئی سوال جواب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے، ایسی حالت میں پوچھے گئے کسی بھی سوال کی صورت میں انہیں شدید عتاب سے گذرنا پڑے گا۔ تھوڑی دیر بعد قوتائی خان نے ایک غلام کو حاضر ہونے کا حکم سنایا۔ وہ غلام گھر سے باہر کے امور پر مقرر تھا۔ اپنی طلبی پاتے ہی اندر چلا آیا۔ پل بھر میں وہ قوتائی خان کے سامنے مؤدب انداز میں کھڑا تھا۔ قوتائی خان اپنے تئیں غصے اور ناکامی کے ملے جلے جذبات کی آگ میں سلگ رہا تھا۔ اس نے ایک تیز نگاہ اس پر ڈالی تو وہ اپنی جگہ کھڑے کھڑے کانپ کر رہ گیا۔ قوتائی خان نے نظریں اس کے چہرے پر سے ہٹائیں اور کمرے کے پہلو کی جانب بنے ہوئے چھوٹے سے طاق کی جانب بڑھ گیا، طاق میں سے اس نے نفیس سیاہ پتھر کی صراحی نکالی۔ دوسرے پل شراب کی صراحی اس کے منہ کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ شراب اس کے چہرے کے ساتھ ساتھ کپڑوں کو بھی تر بتر کر رہی تھی۔ وہ غلام خاموش کھڑا دیکھتا رہا۔ اُسے کچھ کچھ سمجھ آ چکا تھا کہ اس کا مالک کسی سنگین اُلجھن میں مبتلا ہے۔ شراب نے اس کے غصے کو قدرے زائل کر دیا تو وہ ایک جانب بیٹھ گیا۔ اب وہ غلام کو بے تکے انداز میں گھورے جا رہا تھا۔

''تم جانتے ہو کہ میں نے تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے......؟'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

غلام نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''تم بھلا کیسے جانو گے......؟ میں نے تمہیں کچھ بتایا ہی نہیں''۔ وہ خود ہی قہقہہ لگا کر بولا۔ ''بیٹھ جاؤ۔ میں تم سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا ہوں''۔

غلام خاموشی سے اس کے سامنے فرش پر دوزانو بیٹھ گیا۔ وہ چہرے کے خد و خال سے ازبک باشندہ دکھائی دیتا تھا۔

''چند دن پہلے کی بات ہے، قاآن اعظم باتو خان کے چھوٹے منہ زور بھائی، برقائی خان نے سر دربار میری عزت اچھالی تھی، میں نے اس سے بدلہ لینے کی ٹھانی اور اس کے ہتھیار کو اسی پر استعمال کرنا چاہا، وہ ہتھیار اس کا ایک مسلمان دوست تھا، جو کہ کچھ عرصہ پہلے اس کے ساتھ شکار پر گیا اور لاپتہ ہو گیا۔ میں نے اس مسلمان نوجوان کے باپ کو اپنی مٹھی میں لے کر اسے یقین دہانی کرا دی، کہ درحقیقت اُس کے بیٹے کو برقائی خان نے قتل کر کے سرکیشی پہاڑی کی کسی گہری کھائی میں پھینک دیا ہے۔ اس نے میری بات پر پہلے پہل تو بے یقینی کا مظاہرہ کیا مگر میری کامیاب اداکاری رنگ لائی وہ یقین کرنے پر مجبور ہو گیا، میں نے اُسے مشورہ دیا، وہ کوتوالی میں برقائی خان کے خلاف اپنے بیٹے کے قتل کا مقدمہ درج کرائے تاکہ اُسے انصاف مل سکے اور برقائی کو موت کی سزا، مگر عین موقعہ پر ایک خبیث بوڑھا بیچ میں آن کودا اور سارا کھیل بگاڑ کر رکھ دیا، وہ نورالدین یعنی اس مقتول لڑکے کے باپ کو بہلا پھسلا کر گھر لے گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں چونکہ غلط کام کرنے جا رہا ہوں، اس لئے نورالدین کو مجھ سے دور رہنا چاہئے''۔

شراب کے نشے کی سرخی قوتائی خان کی آنکھوں میں نظر آنے لگی۔ اب اس کے چہرے پر یہ امتیاز کرنا مشکل ہو گیا کہ وہ غصے کے عالم میں ہے یا نشے کے

''خان......! اب آپ کیا چاہتے ہیں......؟ اس اجنبی بوڑھے کو راستے سے ہٹا دیا جائے جس کے باعث آپ کا منصوبہ بگڑ گیا ہے''۔

''اس سے کچھ نہیں ہو گا......! اس نورالدین کے بچے کو اب یہ سمجھانا بڑا مشکل ہو گا کہ وہ بوڑھا جھوٹ بول رہا ہے''۔

''خان......!'' غلام اپنی نیلی پتلیوں کو تیز تیز حرکت دینے لگا۔ ''آپ خاصے ذہین ہیں، کوئی نہ کوئی حل تو آپ کے ذہن میں ہوگا''۔

''تمہیں میں نے یہاں کہانی سنانے کے لئے بلایا ہے کیا......؟'' قوتائی خان یکدم آپے سے باہر ہوگیا۔

''مم...... میرا یہ مطلب نہیں تھا خان! بھلا میں آپ کے سامنے کیا حیثیت رکھتا ہوں''۔

''میں کچھ نہیں جانتا......! تمہیں چند ساعتوں میں مجھے کوئی ایسا مشورہ دینا ہوگا جو میرے ذہن میں ابھی تک نہیں آپایا''۔

وہ غلام حکم سن کر تذبذب میں پڑ گیا۔ وہ انتہائی ذہین تھا، اسی ذہانت کے باعث اسے قوتائی خان نے ایک دوسرے منگول کو راہ سے ہٹا کر حاصل کیا تھا۔ چونکہ پہلے بھی کئی معاملوں میں اسی غلام کے مشورے کام آ چکے تھے اسی لئے قوتائی خان کو آخری امید اسی سے وابستہ تھی۔

''خان......!'' غلام متفکر لہجے میں گویا ہوا۔ ''میری عقل کے مطابق ایک ہی حل ہے کہ تمام منصوبے کو الٹا دیا جائے''۔

''کیا مطلب......؟'' قوتائی خان نے تیوری چڑھائی۔

''میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ گذشتہ کئی دن سے اس مسلمان سے مل جل رہے ہیں، یقیناً اب تک اُس گھر کے باقی مکین بھی آپ کی صورت سے واقف ہو چکے ہوں گے۔ آپ پہلے نورالدین کے ذریعے مقدمہ دائر کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اب اس کوشش کو اس گھر کے کسی اور مکین کے سپرد کر دیا جائے تو کام نکل جائے گا''۔

''ذرا کھل کر بتاؤ''۔ قوتائی خان سنبھل کر سیدھا ہو گیا تھا۔

''دیکھئے خان......! کل رات میں دو سپاہی زرد لباس میں نورالدین کے گھر میں شب خون ماریں گے اور صرف نورالدین اور اجنبی بوڑھے کو قتل کر دیں گے۔ قتل کرنے کے بعد وہ گھر کے مکینوں کو دھمکائیں گے کہ وہ لوگ یہ شہر چھوڑ کر بھاگ جائیں ورنہ ان کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے گا اور پھر صبح آپ تو ان کے گھر جائیں گے ہی''۔

''لاجواب......!'' قوتائی خان کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی۔ ''میں اگلی صبح اس کے گھر جاؤں گا اور قتل کے سانحے پر پہلے حیرت اور پھر افسوس کروں گا جب وہ مجھے دھمکی کے بارے میں بتائیں گے تو میں ان کی دلجوئی کرتے ہوئے انہیں پوری مدد کی پیش کش کروں گا، ان میں سے کوئی فرد تو میرے دام میں آ ہی جائے گا''۔

غلام محض مسکرا کر رہ گیا تھا۔



مطیع الدین کو اپنے سامنے ایک بڑا سا پہاڑی درّہ دکھائی دے رہا تھا۔ درّے میں سے گذرنے والا راستہ قدرے تنگ ہو گیا تھا۔ مطیع الدین پر درّے کی صورت دیکھ کر جانے کیوں اضمحلال سا طاری ہونے لگا۔ اس نے بے خیالی میں اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ اس کی چھٹی حس اسے کسی انجانے خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ جو اس درّے کے قرب و جوار میں موجود تھا۔ وہ گھوڑے سے اتر آیا۔ گھوڑے کی لگام تھامے وہ درّے کے اطراف میں گہری نگاہ سے انجانے خطرے کو تلاش کرنے لگا۔ اسے دور دور تک کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کیا درّے کے دوسرے جانب کوئی موجود ہے یا وہ کسی بڑی مصیبت میں مبتلا ہونے والا ہے۔ اس نے درّے

کے سلسلے کو بھرپور انداز میں دیکھا۔ پہاڑیوں کا چھوٹا سا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ برف سے لپٹی ہوئی ان پہاڑیوں میں صرف یہی واحد درّہ ایسا دکھائی دے رہا تھا جو اسے دوسری جانب پہنچنے میں مددگار ثابت ہو سکتا تھا اس نے ایک پل کے لئے سوچا کہ اگر وہ اس درّے کے بجائے پہاڑی کے اوپر سے گھوم کر پار کرنے کی کوشش کرے تو کیا قباحت درپیش ہو سکتی ہے۔ پہاڑی کی اونچائی خاصی تھی، ممکن تھا کہ پورا دن اسی سلسلے میں صرف ہو جاتا۔ پھر یکایک اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس درّے میں نہیں گذرے گا بلکہ پہاڑی کے اوپر سے چکر کاٹ کر دوسری جانب اترے گا اس طرح اسے درپیش کسی انجانے خطرے سے نمٹنے میں قدرے آسانی ہو سکتی ہے۔ اس نے ایک بار پھر گھوڑے پر سواری کی اور اسے درّے کے پہلو کی جانب رُخ موڑتے ہوئے ایڑ لگائی۔ گھوڑا اپنے سوار کی خواہش کے مطابق پہاڑی کے پہلو میں دشوار راستے پر گامزن ہو گیا۔



غازی عبداللہ شافعی بڑے اہتمام سے جمال الدین الراحی سے ملاقات کے لئے زنداں خانے میں پہنچا۔ وہ اس کی خستہ حالی دیکھ کر دلی تسکین حاصل کرنا چاہتا تھا۔ زنداں خانے میں اسے جمال الدین کا اُترا ہوا چہرہ دکھائی دیا تو طمانیت کا گہرا احساس محسوس ہوا۔ جمال الدین کی نگاہ جب اس پر پڑی تو وہ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا رہا۔ غازی عبداللہ شافعی نے پہرے دار کو اشارہ کیا کہ وہ اس کے لئے زنداں خانے کا دروازہ کھول دے۔ پہرے دار اس کا حکم بجالایا۔ بھیانک سی چرچراہٹ سے زنداں خانے کا دروازہ کھل گیا۔ غازی عبداللہ شافعی نخوت بھرے انداز سے اندر داخل ہوا۔ وہ اس کے مدمقابل پہنچ گیا۔

''سناؤ الراحی......! کیسے ہو......؟ کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی یہاں''۔

''غازی......! میں جانتا تھا کہ تم ضرور آؤ گے، تمہیں اپنی ذلت کا احساس یہاں کھینچ لائے گا۔ میں تم سے بہت بہتر حال میں ہوں کیونکہ مجھے کسی قسم کی ذلت کا کوئی احساس نہیں جھنجھوڑتا۔ میں نے سب کو ذہنی طور پر ایسا بنا دیا ہے کہ وہ آرام و سکون میں رہنے کے باوجود اپنے تئیں اندر ہی اندر گھلتے رہیں گے۔ تم بھی انہیں میں سے ایک ہو، تمہاری یہاں آمد میری کامیابی کی علامت ہے''۔

غازی عبداللہ اس کے تضحیک آمیز لہجے پر کھولنے لگا۔ اس کے چہرے پر غصے کے سائے لرز رہے تھے جنہیں وہ کافی کوشش سے دبانے میں مصروف تھا۔

''الراحی......! بے فکر رہو، تمہارے اطمینان کی عمر زیادہ لمبی نہیں، میں تمہیں ایک ایسی زندگی سے متعارف کرانے والا ہوں جس کے بارے میں تم نے کبھی بھول کر بھی نہیں سوچا ہوگا۔ تم بہت جلد میری غلامی میں ذلت کی روٹی کھایا کرو گے''۔

''تم مجھے اپنا غلام بناؤ گے......؟'' جمال الدین الراحی اس کی بات پر چونک اُٹھا۔ ''مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ دستور کے مطابق امرائیں سے کسی کو غلام نہیں بنایا جاسکتا''۔

''میں ایک نیا دستور رقم کروں گا۔ میں نے اسی شرط پر نجم الدین ایوب کو سلطان مصر بنوایا ہے کہ وہ تمہیں قانونی طور پر میری غلامی میں دیں گے اور اب بہت جلد وہ وعدہ وفا ہونے والا ہے''۔

''ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا......! امرا کی جماعت سلطانِ مصر کے اس اقدام کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوگی، اگر سلطانِ مصر نے ان کے فیصلے کو تسلیم نہیں کیا تو پھر وہ دن دور نہیں کہ وہ اسے معزول کر ڈالیں''۔

''نجم الدین ایوب کو اب کوئی معزول نہیں کرسکتا، اس کے ہاتھ بڑے مضبوط ہو چکے ہیں''۔ غازی عبداللہ اس کی لاعلمی پر چہکنے لگا۔ جمال الدین الراحی اس کے چہرے پر پھیلے اطمینان اور پختہ عزم کو دیکھ کر

پریشان سا ہو گیا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں''۔ وہ بمشکل بولا۔

''الراحی......! سلطان مصر نجم الدین ایوب کے پاس امیر المومنین کی جانب سے بلادِ مصر کی امارت کا حکم نامہ موجود ہے، اب مصری امرأ کی جماعت اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی''۔

''یعنی نجم الدین ایوب میرے اشارے کو سمجھ گیا تھا''۔ جمال الدین الراحی مبہم انداز میں بڑبڑایا۔

''کیسا اشارہ......؟'' اب چونکنے کی باری غازی عبداللہ شافعی کی تھی۔

''خیر چھوڑو......! اس بات کو، مجھے پورا یقین ہے کہ نجم الدین ایوب مجھے کسی کا غلام نہیں بنائے گا کیونکہ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ ایک بااصول شخص ہے''۔

''وقت ہی تمہاری اس خوش فہمی کو غلط ثابت کرے گا، مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں تو تمہیں اس امر سے آگاہ کرنے آیا تھا کہ میں نے اپنے محل کے عقبی حصے میں جہاں گھوڑوں کا اصطبل واقع ہے، اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا کمرہ تمہاری رہائش کے لئے بنوادیا ہے۔ ہاں ایک بات تو میں بھول ہی گیا کہ تم تنہا میری غلامی میں آنا پسند کرو گے یا بمعہ اہل وعیال۔ میں اتنا سنگدل نہیں ہوں کہ تمہیں تمہارے بیوی بچوں سے جدا کردوں''۔

جمال الدین کے چہرے پر زلزلے کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ غازی عبداللہ اس وقت ارباب اقتدار میں سے ایک ہے اس کی بات کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرا امرأ کی ایک ایسی جماعت بھی موجود تھی جو کہ اس کے ظلم وستم کا نشانہ بن چکی تھی، وہ غازی عبداللہ کے اس اقدام کی تعریف کرے گی۔ سب لوگ اسے نیچا دکھانے اور ذلت کے گڑھے میں پھینکنے میں کوشاں دکھائی دے رہے تھے۔ غازی عبداللہ وہاں دیر تک موجود رہا اور اس تمام عرصے میں وہ اسے طنز وطعن کے نشتر چبھوتا رہا۔ جمال الدین الراحی نے مزید کچھ بات چیت کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ خاموشی کا دامن تھامے رکھا، وہ خیالات کی رو میں بہہ کر اپنی ذلت آمیزی کو بخوبی محسوس کر رہا تھا۔ اسی اثناء میں غازی عبداللہ شافعی تو وہاں سے رخصت ہو گیا تھا مگر اسے یونہی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ یہیں کہیں موجود ہے۔ وقت نے اسے عروج سے پستی کی جانب دھکیل دیا تھا مگر وہ پستی میں بھی بلندی پر پہنچنے کا عزم باندھے ہوئے تھا مگر غلامی کی ذلت نے اس کے عزم کو پل بھر میں پاش پاش کر ڈالا۔



امیر المومنین کی جانب سے نجم الدین ایوب کو مصر کی امارت تفویض کئے جانے پر بلادِ مصر کے امرأ کی ایک جماعت میں ہلچل سی مچ گئی، ان میں بیشتر ایسے لوگ تھے جو نجم الدین ایوب کو سلطان بنانے کے خلاف تھے۔ ان سب کا اجتماع سپہ سالار وجیہ الدین الباقری کے گھر پر ہوا۔ وجیہ الدین الباقری خود بھی نجم الدین ایوب کے اس قدم پر دم بخود رہ گیا تھا، اُسے اب اپنا مستقبل بھی صاف خطرے میں دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کے محل میں امرأ بیٹھے اپنی اپنی بولیاں بولنے میں مصروف تھے۔

''معززین...... !'' وجیہ الدین الباقری نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش ہونے کا اشارہ کیا ''آپ اگر جانوروں کی مانند یہاں غل مچائیں گے تو میں آپ سب کو رخصت کر دوں گا''۔

''کیا مطلب......؟ کیا ہم یہاں اپنا وقت یونہی برباد کرنے کے لئے آئے ہیں''۔ ایک امیر تنک کر بولا۔ وجیہ الدین الباقری نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے دوبارہ کہا۔ ''دیکھئے......! ہمیں جو مسئلہ درپیش ہے اس کے بارے میں سنجیدگی سے گفتگو کی جائے تا کہ سلطان مصر کو آمر بننے سے روکا جا سکے۔ اس نے ایسی طاقت حاصل کر لی ہے جس کے زور پر وہ اپنی مرضی ہم سب پر ٹھونس سکتا ہے اور کوئی اس کی منشاء کے خلاف سوچ نہیں

سکتا، جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔ میں نے پہلے ہی امرأ کی جماعت کو مشورہ دیا تھا کہ وہ نجم الدین ایوب کے بجائے عمادالدین اسماعیل کو حاکم مصر بنائیں مگر اشرافِ مصر نے میری سنی ان سنی کر دی''۔

''تم ہمیں الزام نہ دو، اگر ہم نجم الدین ایوب کے حامی ہوتے تو آج تمہارے پاس نہ آتے بلکہ اپنے گھروں میں بیٹھے ہوتے''۔ ایک امیر نے صفائی پیش کی۔

''بخدا......! میں آپ کو الزام نہیں دے رہا بلکہ آپ کے جذبات کی تہ دل سے قدر کرتا ہوں کہ آپ سب لوگ یہاں صرف اس لئے آئے ہیں کہ بلادِ مصر پر آمریت کا آغاز نہ ہونے دیں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ مجھے کوئی ایسا لائحہ عمل بتایئے کہ جس سے ہمارے مقاصد کامیابی سے ہمکنار ہوں''۔

''سالارِ اعظم...... ! اب ہم بھلا کیا بتائیں، کچھ بھی تو سجھائی نہیں دے رہا''۔ ایک امیر مایوسی کے عالم میں بولا۔ دوسرے کئی امرأ کے چہرے بھی کچھ ایسے ہی جذبات کی غمازی کر رہے تھے۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں سلطان کے پاس خود جا کر اسے متنبہ کرنا چاہئے کہ وہ اپنے امور کو دیکھ بھال کر ہم پر مسلط کرنے کی کوشش کرے، اگر اس نے کوئی ایسی روش اختیار کرنے کی کوشش کی جو ہمارے اور رعایا کے مفادات کے منافی ہوئی تو ہم اس کی راہ میں آہنی دیوار ثابت ہوں گے''۔

''یہ تو بے بسی وناتوانی کا کھلا اعلان ہو گا''۔

''آپ اسے بے بسی کہئے یا کچھ اور، سلطان کو باور کرانے سے وہ معاملات میں احتیاط برتے گا''۔

''میرے پاس ایک تجویز ہے''۔ وجیہ الدین الباقری نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ سب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

''میرا رابطہ عمادالدین اسماعیل سے ابھی تک قائم ہے، میں نے اسے بلادِ مصر پر حملہ آور ہونے کی پیشکش بھی کی ہے۔ ایسے میں خفیہ طور پر اپنی افواج کو عین موقعہ پر میدان سے ہٹالوں گا جب جنگ کا آغاز ہونے والا ہو گا۔ ایسے میں نجم الدین ایوب نہتا رہ جائے گا اور اس کے حلیف اتنے قلیل ہوں گے کہ جنگ کے پہلے ہی ہلے میں فیصلہ ہو جائے گا۔ آپ لوگ صرف اتنا کیجئے کہ اپنے تیئں عمادالدین اسماعیل کو یہ باور کرانے کی کوشش کریں کہ بلادِ مصر کے سب امرأ اس کے ہمقدم ہیں''۔

وجیہ الدین الباقری کی بات سن کر ان کے ستے ہوئے چہروں پر رونق سی آگئی تھی۔

''سالارِ اعظم آپ بے فکر رہئے، اس کام میں آپ ہمیں بے حد فعال پائیں گے، ہم آج ہی سے مراسلت کا سلسلہ شروع کر دیں گے''۔

''اگر سلطان مصر نے آپ کو جنگ برپا ہونے سے پہلے ہی معزول کر دیا تو......؟'' ایک امیر تفکر آمیز لہجے میں بولا۔

''اس بات کی فکر مت کیجئے۔ میں نے اس کا بھی پیشگی انتظام کر رکھا ہے جو وقت آنے پر ہی عیاں ہو گا۔ یاد رکھئے نجم الدین ایوب پر اگر عمادالدین نے حملہ کر دیا تو اس کی شکست یقینی ہے، چاہے میں عہدہ سالاری پر رہوں یا نہ رہوں''۔ وجیہ الدین ٹھوس و مستحکم لہجے میں بولا۔ امرأ کی جماعت کے چہروں پر اطمینان دکھائی دینے لگا۔



برقائی خان کو اردوئے زریں کے قاآن اعظم باتو خان نے اچانک طلب کیا۔ وہ اس وقت اپنے محل میں بربط پر میٹھی سی دھن چھیڑے ہوئے تھا، اپنی اچانک طلبی پر اسے حیرت بھی ہوئی اور تجسس بھی۔ وہ اپنی کمین گاہ

سے نکل کر سیدھا باتو خان کے محل میں جا پہنچا۔ باتو خان ایک بڑے وسیع و عریض کمرے میں تنہا موجود تھا۔ اس نے زرد رنگ کا جھلملاتا ہوا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ برقائی خان نے حاضر ہونے کے بعد منگولی انداز میں زمین پر بیٹھ کر جھک کر اسے سلامی دی۔ باتو خان نے اسے اُٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ اُٹھ گیا۔ باتو خان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ برقائی خان نفیس شاہی کرسی پر براجمان ہو گیا۔ باتو خان اس کے سامنے ٹہلنے لگا۔

''بڑے قاآن......!'' برقائی مؤدب لہجے میں بولا ''خیریت تو ہے۔ مجھے یوں اچانک طلب کیا گیا''۔

''برقائی......! میں کئی دن سے کچھ معاملوں میں فکر مند ہوں، قزوین میں آئے دن مسلمانوں کے بیچ میں فرقہ وارانہ ہنگامے ہوتے رہتے ہیں، دل تو چاہتا ہے کہ انہیں ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دوں، مگر کچھ ایسی وجوہات ہیں کہ انہیں اپنی رعیت میں شامل رکھنا ضروری ہے''۔

''اس میں کیا مشکل ہے مسلمانوں کے ان گروہوں کو اِدھر اُدھر بکھیر دیجئے جو ہنگامہ آرائی کا موجب بنتے ہیں''۔

''خیر وہ معاملہ تو میں سنبھال ہی لوں گا، تمہیں ایک خاص کام کے لئے بلوایا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں امورِ حکومت میں اب دلچسپی لینا چاہئے۔ میں کئی بار خود کو اکیلا محسوس کرتا ہوں۔ یوں تو عہدیداران کی ایک لمبی قطار میرے گرد موجود رہتی ہے جو کہ میرے ایک اشارے پر اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے تیار ہیں مگر میں کئی جگہ پر ایسے اقدامات کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں جو کہ اخلاقیات کے منافی ہوتے ہیں، یہ کچھ خامیاں ہیں جنہیں میں ان عہدیداران پر منکشف نہیں کرنا چاہتا۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہونا''۔

''جی ہاں......! بڑے قاآن، میں بخوبی آپ کا مسئلہ سمجھ رہا ہوں، آپ مجھے حکم دیجئے کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''گذشتہ دو سال سے ہماری سلطنت کی ایک سرحدی شاہراہ پر ایک باغی منگول قبیلہ قابض ہے، جو کہ وہاں سے گذرنے والے تمام قافلوں سے خراج کی مد میں بڑی رقم بٹور لیتا ہے۔ اگر کوئی اسے خراج نہ دے تو اسے لوٹ مار کا نشانہ بنا لیا جاتا ہے۔ تاجر حضرات کئی بار شکایت لے کر آئے ہیں۔ میں نے اس مہم پر تین منگول سردار روانہ کئے ہیں مگر وہ قبیلہ انہیں چکمہ دینے میں کامیاب رہا۔ وہ کئی ماہ تک وہاں کی خاک چھان کر واپس لوٹ آئے۔ اس قبیلے کی تربیت کچھ ایسی ہے کہ وہ خطرہ محسوس ہونے پر پہاڑی سلسلوں میں روپوش ہو جاتے ہیں کہ تلاش کرنے والا بے بس ہو جاتا ہے''۔

''بڑے قاآن......! مجھے اس معاملے میں کیا کرنا ہوگا، آپ مجھے حکم دیجئے''۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم اس مہم کی ذمہ داری سنبھالو اور پورے قبیلے کو گرفتار کر کے یہاں پیش کرو۔ میں ان لوگوں کی صلاحیتوں سے بے حد متاثر ہوں اور یہ چاہتا ہوں ان کی منفی سوچ بدل دی جائے اور ان کی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ان سے مثبت کام لئے جائیں''۔

''ٹھیک ہے بڑے قاآن......! میں آج ہی اس مہم پر نکل پڑتا ہوں، جلد ہی آپ کو کامیابی کی نوید سناؤں گا''۔

''میں نے اس مہم میں تمہارا انتخاب بڑا سوچ سمجھ کر کیا ہے، مجھے پوری توقع ہے کہ تمہاری صحرا نوردی کی عادت تمہیں ضرور کامیابی کی منزل تک لے جائے گی''۔

''میں آپ کی حوصلہ افزائی پر مشکور و ممنون ہوں۔ مجھ سے وابستہ آپ کی توقعات یقیناً پوری ہوں گی''۔

''میں نے شاہی دستوں کو روانگی کی تیاری کا حکم دے دیا ہے تم جتنی سپاہ لے جانا چاہو، لے جا سکتے ہو''۔

''ٹھیک ہے میں اس ضمن میں سوچ کر فیصلہ کروں گا۔ ہاں ایک بات تو آپ نے مجھے بتائی نہیں کہ وہ قبیلہ کہاں اور کس نام سے پایا جاتا ہے؟''

''اس قبیلے کا نام ضرگام ہے اور کوہ فلک بوس کے دامن میں مقیم رہتا ہے''۔

''اب آپ بے فکر ہو جایئے''۔ برقائی نے مؤدب لہجے میں جواب دیا اور رخصت کی اجازت طلب کی۔



گل وتوژ کے دل و دماغ پر گذشتہ کئی دن سے عجیب سی کیفیت طاری تھی جسے وہ کوئی نام نہیں دے پائی۔ جانے کیوں اسے شک سا ہونے لگا تھا کہ اس کا باپ قونائی خان مطیع الدین کے بارے میں اس کی وابستگی اور پوشیدہ تعلقات جان گیا ہے اور اسی لئے وہ کئی دن سے نورالدین کے آگے پیچھے دکھائی دے رہا ہے، وہ اپنے باپ کی کمینگی سے بخوبی واقف تھی کہ وہ کسی مسلمان کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتا۔ نورالدین کے گھر میں ضرورت سے زیادہ اس کی آمد و رفت ضرور کسی بڑی سازش یا تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔

گل وتوژ نے اپنے تئیں معاملے کی کھوج لگانے کا ارادہ کیا۔ اس نے مطیع الدین کی تلاش میں خود روانہ ہونے کے لئے اسباب کا بندوبست کیا۔ وہ اپنے باپ کو بغیر کچھ بتائے چپکے سے گھر سے نکلی اور گھوڑے پر سوار ہو کر اسی جانب روانہ ہو گئی جہاں ازقائی قبیلہ موجود تھا۔ وہ ازقائی قبیلے سے اپنی تلاش کا کام شروع کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنی حفاظت کے لئے چھوٹی تلوار اور ایک لمبا خنجر ساتھ رکھ لیا تھا۔ وہ تمام دن سفر کرتی رہی اور سہ پہر کے وہ ازقائی قبیلے میں پہنچ گئی۔ ازقائی قبیلے نے حیرت و استعجاب سے اس کا خیر مقدم کیا۔ سردار مانجی خان اس کی صورت دیکھتے ہی اسے پہچان گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی۔

''آؤ گل......! سردار مانجی خان تمہیں اپنے قبیلے میں خوش آمدید کہتا ہے''۔

''سردار......! میں نے تمہیں ایک کام سونپا تھا جو آج تک مکمل نہیں ہو پایا۔ کیا تمہارے قبیلے کی صلاحیتوں کو زنگ لگ چکا ہے''۔ گل وتوژ کا لہجہ طنز سے بھرا ہوا تھا۔

''کیا مطلب......؟ تمہارا کام تو کب کا مکمل ہو گیا تھا اور تمہاری ہدایت کے مطابق اس نوجوان کو میں نے ایک رہنما کے ہمراہ سرائے کے راستے پر ڈال دیا تھا۔ کیا وہ تم تک نہیں پہنچا......؟''

''نہیں پہنچا ہے تو ہی میری صورت تمہیں دوبارہ دکھائی دے رہی ہے''۔

''گل......! میں عہد و قول کے معاملے میں بے حد پکا ہوں، میں نے کبھی عہد شکنی نہیں کی۔ تم مجھ پر بے وجہ شک مت کرو۔ میرے جوانوں نے اپنی جان پر کھیل کر اس نوجوان کو سرخوں کے قبیلے سے نکالا تھا''۔ سردار کا لہجہ بگڑنے لگا۔

''میں نے سنا ہے کہ ازقائی قبیلہ کام مکمل ہونے پر ثبوت سنبھال کر رکھتا ہے''۔ گل وتوژ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سردار مانجی خان پہلو بدل کر رہ گیا۔ جانے وہ اس کی مسکراہٹ پر مضطرب ہوا تھا یا اس کی بات پر۔

''تم نے صحیح سنا ہے، ثبوت یہ ہے کہ اس نوجوان کا نام مطیع الدین تھا''۔

''یہ کوئی ثبوت نہیں مانجی خان......!'' گل وتوژ تیز لہجے میں بولی۔ ''ممکن ہے کہ گذشتہ ملاقات میں میں نے ہی تمہیں اس کا نام بتا دیا ہو یا سرائے میں تمہیں یہ نام بآسانی مل گیا ہو کیونکہ شاہی وزرے تک مطیع الدین کے

بارے میں سرگوشیاں عام سنائی دیتی ہیں''۔

''لڑکی! تم حد سے بڑھ رہی ہو، تم میرے قبیلے کی مہارت اور ذمہ داری پر شک کر رہی ہو۔ اگر میں کہہ رہا ہوں کہ اسے سرخوں سے آزادی دلا دی گئی ہے تو یہی سچ ہے''۔

''مجھے تم پر یا قبیلے پر شک کرنے کی ضرورت نہیں، مجھے تو صرف وہ ثبوت درکار ہے جو ازقائی لوگ کسی کام کو مکمل کرنے کے بعد خصوصی طور پر سنبھال کر رکھتے ہیں''۔

''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں کیونکہ اس نوجوان کے پاس تن پر کپڑوں کے علاوہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے بطور ثبوت رکھا جا سکتا''۔

''ایسے میں کپڑے ہی ثبوت میں رکھ لئے جاتے ہیں مانجی خان۔ تمہارے قبیلے میں دوسرے کپڑوں کی کوئی کمی نہیں ہے''۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر وہ اپنے کپڑے کسی کو دینے پر آمادہ ہی نہیں تھا میں بھلا کیسے اس کے کپڑے رکھ لیتا''۔ سردار مانجی خان نے جواب دیا۔

''چلو میں ایک لمحہ کے لئے تمہاری بات پر یقین کر لیتی ہوں کہ تم نے اسے سرخوں کے قبیلے سے آزادی دلا دی تھی تو پھر وہ اب کہاں ہے؟ جبکہ تمہارا ارادہ نما بھی اس کے ساتھ تھا''۔

''میرا ارادہ نما اسے سرائے کے راستے پر چھوڑ کر واپس لوٹ آیا تھا، اُسے گھر تک پہنچانا تو میری ذمہ داری نہیں تھی۔ وہ کہیں بھی نکل گیا ہوگا یا ممکن ہے کہ وہ گھر پہنچ چکا ہو اور تم مجھ سے جھوٹ بول کر اپنی رقم واپس لینا چاہتی ہو''۔ سردار کا لہجہ سرد ہونے لگا۔

''مجھے رقم کی کوئی فکر نہیں، مجھے وہ نوجوان چاہئے۔ تم چاہو تو تمہیں مزید رقم بھی دی جا سکتی ہے''۔

نئی پیشکش کافی پرکشش تھی مانجی خان کی آنکھوں میں پیدا ہونے والی چمک مزید بڑھنے لگی

''میں اپنے کھوجی اس مقصد کے روانہ کر دیتا ہوں کہ وہ کوئی نشان ڈھونڈ نکالیں کہ وہ نوجوان کس جانب نکل گیا ہے۔ ویسے مجھے کوئی توقع نہیں کہ اتنے دن گذرنے کے بعد وہ کسی قسم کی کامیابی حاصل کر سکیں گے''۔

''میں کسی ایسے کام کے لئے تمہیں رقم نہیں دے سکتی جس میں اگر مگر شامل ہو۔ مجھے صرف یقینی نتیجہ چاہئے''۔ گل دتوڑ نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''میں اسی وقت اپنی تمام کوشش کرتا ہوں، کل شام تک شاید کوئی خبر آ جائے''۔

''مگر میں کل شام تک یہاں رُک نہیں چاہوں گی، تم ان کھوجیوں کو میرے ساتھ روانہ کر دو، تا کہ اگر کوئی نشان معلوم پڑے تو میں اسی پر روانہ ہو جاؤں''۔

''رُکنا تو تمہیں پڑے گا گل خاتون''۔ سردار مانجی لاپروائی سے سر جھٹکتا ہوا بولا۔

''کیا مطلب؟'' گل دتوڑ کے لہجے میں ہلکی سی لرزش عیاں تھی۔ اس کی چھٹی حس اسے کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔

''تمہیں میری میزبانی کا شرف حاصل کئے بغیر یہاں سے جانے کی اجازت نہیں ہوگی''۔ وہ پراسرار مسکراہٹ چہرے پر سجائے بولا۔

''مجھے تمہاری نیت میں فتور دکھائی دے رہا ہے مانجی خان! یاد رکھو میں ایک منگول لڑکی ہوں''۔

''کسی مسلمان کے پیچھے یوں مارا مارا پھرنا بھی منگول لڑکیوں کو زیب نہیں دیتا گل خاتون!'' سردار استہزائیہ لہجے میں بولا۔

''تمہیں میری ذاتیات سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہئے، تم قیمت لے کر کام کرتے ہو، اب جبکہ تم قیمت وصول کر چکے ہو، مجھے کام مکمل چاہئے''۔ گل دتوڑ اس اثناء میں کافی سنبھل گئی تھی۔

''جس کام کی قیمت لی گئی تھی وہ تو کب کا مکمل کیا جا چکا ہے گل خاتون، اب تو مہمان نوازی کا مرحلہ درپیش ہے''۔ وہ بھدے سے دانت نکال کر ہنسنے لگا۔ گل دتوڑ کے چہرے پر اس کے لئے نفرت کی لہر دوڑ نے لگی۔

''مجھے تمہاری مہمان نوازی سے کوئی غرض نہیں، میں یہاں بے مقصد رُکنا نہیں چاہتی''۔

''بے مقصد نہ کہو، اصل مقصد تو رات میں ہی سامنے آئے گا۔ مجھے شراب کی مستی میں مسرور لڑکیاں بے حد بھاتی ہیں''۔

''سردار مانجی خان! اپنی حدود کو پار کرنے کی کوشش مت کرو، میں اسی وقت واپس لوٹ رہی ہوں، اگر تم میں ذرا سی ہمت ہے تو میرا راستہ روک کر دکھاؤ''۔ گل دتوڑ نے خود کو ذہنی طور پر ہر قسم کی صورت حال سے نبٹنے کے لئے تیار کر لیا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ غیر محسوس انداز میں لباس میں چھپے لمبے پھل کے خنجر کے دستے پر اپنی گرفت جما چکا تھا اس نے اسی لمحے اپنا رخ موڑا اور گھوڑے پر سوار ہونا چاہا۔ سردار مانجی خان شکار کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر دیوانہ سا ہو گیا اور وہ تیزی سے عقبی سمت سے اس پر جھپٹ پڑا۔ اس نے اپنی مضبوط بانہوں کے حصار میں گل دتوڑ کو لینا چاہا تھا اسی لمحے گل دتوڑ کا دایاں ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا اور خنجر کے کئی پے در پے وار اس کی پسلیوں میں اترتے چلے گئے۔ سردار مانجی خان کا چہرہ تکلیف کی شدت سے بگڑنے لگا۔ وہ کسی اچانک ردعمل کے لئے تیار نہیں تھا۔ بے خبری میں وہ گل دتوڑ کے ہاتھوں گھائل ہو گیا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ خنجر کے کئی وار اترنے پر بھی اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکل پائی۔ وہ اپنے بائیں پہلو کو تھامے زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ گل دتوڑ نے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ تیزی سے گھوڑے پر سوار ہوئی اور ایڑ لگا دی۔ اس سے پہلے کہ قبیلے کے دوسرے لوگ سردار پر حملے سے واقف ہو جاتے، وہ ان کے علاقے سے نکل جانا چاہتی تھی۔

❁ ❁ ❁

سلطان مصر نجم الدین ایوب کے پاس امراء کی کارستانیوں کی خبریں مسلسل پہنچ رہی تھیں۔ وہ حالات پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ وہ چاہتا تو ایک ہی پل میں ان سب کو گرفتار کر کے زنداں خانے کی تاریکیوں میں دھکیل دیتا مگر وہ انہیں سدھرنے کے مواقع دینا چاہتا تھا۔ ویسے تو اسے امراء کی ریشہ دوانیوں کی کوئی فکر نہیں تھی۔ امیر المومنین کی جانب سے موصول ہونے والے مراسلے کی رو سے اس کی حکومت مضبوط ہو چکی تھی۔ امیر المومنین کی جانب سے بھیجے گئے بغدادی غلاموں کو اس نے اپنے حفاظتی دستے میں شامل کر دیا تھا جو کہ ہر وقت اس کے قریب رہتے۔ ایک شام نجم الدین ایوب اپنے خاص مصاحبین میں موجود تھا کہ امراء کی شورشوں کا تذکرہ چھڑ گیا۔ نجم الدین ایوب نے اس معاملے کو زیادہ توجہ دینا مناسب نہیں سمجھی مگر بہاء الدین زبیر نے اصرار کیا کہ امراء کو غلط روش اختیار کرنے کا موقع نہیں دینا چاہئے۔

''بہاء الدین! تم چاہتے ہو کہ میں ایک ایسے معاملے کو جان بوجھ کر ہوا دے دوں جس کا دبے رہنا ہی ہمارے حق میں ہے''۔

''سلطان عالی! میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ طبقہ امراء پر کسی قسم کی زیادتی سے کام لیا جائے مقصد صرف اتنا ہے کہ وہ اپنی بے کار کی کالی کرتوتوں میں توانائیاں ضائع کرنے کے بجائے مملکت کی فلاح و بہبود میں حصہ لیں''۔

"بہاء الدین ! یہ لوگ فلاح و بہبود کے لئے پیدا نہیں ہوئے بلکہ ان کی نس نس میں خود غرضی اور حرص زر رچی ہوئی ہے۔ اپنے معاشرے میں اعلیٰ درجات پانے کے لئے یہ کسی پاگل کتے سے کم نہیں۔ اگر انہیں چھیڑا گیا تو یہ ہمیں ہی کاٹ کھانے کو دوڑیں گے۔ بہتر یہی ہوگا کہ تم ان کی بابت سوچنا چھوڑ دو"۔

"سلطان مکرم ! انہیں اتنی لاپروائی سے نہیں لینا چاہئے، وہ خفیہ طور پر کوئی ایسی بھیانک سازش کر سکتے ہیں جس سے آپ کسی بڑی مشکل میں پڑ جائیں گے"۔

"ان میں اتنی قوت باقی نہیں کہ وہ کوئی ایسا کھیل رچا سکیں، وہ جس تالاب کی مچھلیاں ہیں میں بخوبی جانتا ہوں"۔

"سلطان مکرم !" ایک کھنکھتی ہوئی مترنم آواز کمرے میں گونجی۔ "اگر اس باندی کو اجازت ہو تو وہ کچھ عرض کرے"۔

سب لوگوں کی گردنیں یک لخت اس آواز کی جانب گھوم گئیں۔ وہ سفید ریشم کے زریں لباس میں ملبوس تھی۔ اس کا چہرہ آداب شاہی کے مطابق نقاب کی اوٹ میں تھا۔ اس کے لباس پر موجود زریں نقش و نگار کی چمک سے سب کی آنکھیں خیرہ ہوئے جا رہی تھیں۔ سلطان نے اس کی جانب حیرت سے دیکھا۔ وہ پہلی ہی نظر میں اسے پہچان گیا تھا وہ بغداد کی کنیزوں میں سے ایک تھی۔

"کہو تم کیا کہنا چاہتی ہو ؟"

"میں ادھر سے گذر رہی تھی کہ آپ کی باتیں میرے کانوں میں پڑیں، میں رک کر بات سننے لگی جس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔ آپ کا سوچنا اپنی جگہ درست سہی مگر دشمن کو کمزور سمجھنا عقلمندی نہیں۔ امرا کے طبقوں میں اس قسم کی حرکتیں کوئی نئی بات نہیں۔ امیرالمومنین کے دربار میں بھی روزانہ ایسی ہی حرکتیں دیکھنے کو ملتی تھیں۔ میں اس ضمن میں یہ تجویز پیش کرنے کی جسارت کرنا چاہتی ہوں کہ ایسے امرا کو قابو کرنے میں ذرا دیر نہیں کرنا چاہئے"۔

"کیا مطلب ؟ کیا ہم ان کی ناجائز اور بے جا فرمائشوں کو پورا کر دیں؟"

"میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں سلطان مکرم ! میں نے جو بات کہی ہے آپ اسے سمجھ نہیں سکے"۔

"تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو کھل کر اور صاف لفظوں میں بیان کرو"۔

"سلطان مکرم !" وہ قدرے سہم کر بولی۔ "میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ان پر کسی نہ کسی موقع پر عنایات کی جاتی رہیں۔ کیوں نہ آپ وقت کے انتظار کے بجائے پہلے ہی ان پر خاص قسم کے انعامات کی بارش کر دیں"۔

"تاکہ وہ پہلے سے زیادہ طاقتور ہو جائیں"۔ ایک امیر نے تنک کر کہا۔

"اسے بات پوری کرنے دو۔ ہاں تم بولتی رہو میں سن رہا ہوں"۔ نجم الدین ایوب نے سخت لہجے میں امیر کو خاموش کرا دیا تھا۔

"آپ سب سے پہلے ایسے امرا کی فہرست بنایئے جو کسی نہ کسی طور پر آپ کے خلاف سازش کا حصہ بن رہے ہیں۔ اس کے بعد ان امرا کو اپنے پاس بلایئے اور انہیں اس طرح کی ذمہ داریاں سونپ دیں جو کہ قدرے مشکل ہوں۔ اس کے بعد انہیں ایک جگہ اکٹھا رہنے کا موقعہ بھی نہ دیجئے بلکہ اپنی مملکت کے مختلف حصوں میں انہیں بکھیر دیں۔ اس طرح یہ لوگ سازشوں میں ملوث ہونے کے بجائے اپنے ذمے لگے امور کی انجام دہی میں الجھ جائیں گے اور دوسرا انہیں قطعی احساس بھی نہیں ہوگا کہ انہیں جان بوجھ کر علیحدہ کیا گیا ہے۔ وہ ان ذمہ

داریوں کو اپنی شایان شان سمجھتے ہوئے آپ کے احسانوں تلے دب جائیں گے۔ صرف اس موقع پر یہ کوشش کرنا ہوگی کہ ان کے ذمے لگائے گئے امور کی نوعیت ایسی ہو جس میں انہیں کسی قسم کا اجتماع کرنے کا موقعہ میسر نہ ہو"۔

"سبحان اللہ !" نجم الدین اس کی بات سن کر جھوم سا گیا۔ "باندی! ہمیں تمہارا مشورہ بے حد بھایا ہے۔ تم نے صحیح معنوں میں ثابت کر دیا ہے کہ امیرالمومنین کے حرم میں نایاب گوہر پائے جاتے ہیں۔ تمہارا نام کیا ہے ؟"

"کنیز کو "وررالمعنیٰ" کہا جاتا ہے"۔ اس نے سر خم کر کے جواب دیا۔

"اچھا تو یہ بتاؤ کہ اگر ان میں کوئی امیر اپنی سابقہ روش سے باز نہ آئے تو پھر کیا کیا جائے ؟"

"اس کے لئے بھی ایک تجویز ہے کہ اس امیر کو ایک موقع مزید دیجئے کہ وہ اپنی روش کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔ اسے کسی ایسے عہدے پر فائز کیجئے جو پہلے سے بہتر ہو اور اس کے لئے خصوصاً ایسی جگہ منتخب کی جائے جہاں اس کے رشتہ دار موجود ہوں۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنوں کو دیکھ کر اترانے کی کوشش کرتا ہے اور وہ انہیں رعب سے مرعوب کر کے دلی تسکین پاتا ہے۔ اگر ایسے بھی بات نہ بن سکے تو پھر اس کی تحقیقات کا حکم جاری کر دیا جائے کہ اس پر جو ذمہ داری عائد کی گئی تھی اس میں اس نے کتنی تیزی اور ذمہ داری کا مظاہرہ کیا ہے۔ امیر قسم کے لوگ ہمیشہ کام سست روی اور دیر سے کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس کی بہت سی خامیاں تحقیق میں سامنے آجائیں گی۔ ایسے وہ یقیناً خوفزدہ ہوگا اور تحقیقاتی گروہ کی منت سماجت پر اتر آئے گا۔ میرے خیال میں اس کے لئے اتنا ہی کافی ہوگا۔ اگر وہ پھر بھی ڈھٹائی پر قائم رہے تو اسے سزا دینے کا جواز تو آپ کے پاس موجود ہے ہی"۔

"واہ !" نجم الدین ایوب اس کنیز سے بے حد متاثر دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے پاس ایک ایسے مسئلے کا آسان حل موجود تھا جسے سلجھانے میں کئی ذہین دماغ بھی ناکارہ دکھائی دے رہے تھے۔ سلطان نجم الدین ایوب نے کچھ ضروری امور پر غور کیا اور محفل برخاست کر دی۔ محل میں ذاتی کمرے میں پہنچ کر اس نے وررالمعنیٰ کو دوبارہ طلب کیا۔ کچھ ہی دیر میں کنیز وہاں پہنچ گئی۔ نجم الدین ایوب نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ فوراً حکم بجا لائی۔

"میرے ذہن میں ایک اور الجھن ہے جس کے بارے میں میں کوئی واضح فیصلہ نہیں کر پا رہا، اسی لئے تمہیں یہاں بلوایا ہے کہ شاید تمہارے پاس کوئی حل موجود ہو"۔

"آپ ارشاد فرمایئے ! باندی اپنے فہم و ادراک کو بروئے کار لاتے ہوئے پوری سعی کرے گی کہ آپ کو الجھن سے نجات مل سکے"۔

"معاملہ کچھ یوں ہے کہ جب میں بلاد شرقیہ میں تھا تو عین اس وقت میری سپاہ نے دھوکا دیا تھا جب دشمن ہمارے سامنے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ سپاہ کی بغاوت کے باعث میں میدان جنگ میں تنہا رہ گیا اور حریف لشکر کے ہاتھوں مجھے قید کی صعوبت اٹھانا پڑی۔ میں نے سپاہ کی تنخواہ کی ادائیگی میں بھی کبھی دیر نہیں کی پھر بھی انہوں نے مجھے دھوکا دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اب پھر اسی طرح کا ماحول بن رہا ہے۔ مجھے خفیہ طور پر اس قسم کی اطلاعات مل رہی ہیں کہ سپاہ کا سالار اعلیٰ میرے خلاف کسی سازش کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ سپاہ مکمل طور پر اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ ممکن ہے کہ ان میں میرے حق میں بھی کچھ مخلص لوگ موجود ہوں، مگر اکثریت باغیوں کی ہی ہے"۔

"سلطان عالی ! کیا آپ مجھے اس سازش کے بارے میں آگاہ کر سکیں گے ؟"

''اس سازش کے بارے میں صحیح طور پر تو کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ وہ کس انداز میں پایۂ تکمیل تک پہنچائی جائے گی۔ البتہ ایسے شواہد ضرور ملے ہیں کہ میرے چچا عمادالدین اسماعیل کو میرے مقابلے پر لایا جا رہا ہے تا کہ وہ مجھے شکست دے کر بلاد مصر پر قابض ہو سکے۔ ماضی میں بھی وہ مجھ سے بلاد شرقیہ چھین چکا ہے''۔

''میں سمجھ گئی ہوں کیا کیا جا رہا ہوگا ؟ سپہ سالار پس پردہ اس سے ملا ہوا ہے یا اسی کا کوئی خاص بندہ ترقی پا کر اس عہدے تک پہنچ چکا ہے۔ جب آپ کا چچا اپنی افواج کے ساتھ قاہرہ کے گرد محاصرہ قائم کرے گا تو سپاہ بغاوت کا اعلان کرتے ہوئے آپ کو گرفتار کر کے اس کے حوالے کر دیں گی''۔

''ہاں مجھے بھی کچھ کچھ اندازہ ہے مگر اس کا کوئی حل سجھائی نہیں دے رہا''۔

''اس کا حل میرے پاس موجود ہے'' وہ دلربایانہ مسکراہٹ سجائے بولی۔ باتوں باتوں میں جانے کب اس نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دیا تھا یا خود ہی چہرے سے گر پڑا تھا جس کا اسے احساس تک نہیں ہوا تھا۔ نجم الدین ایوب کی نگاہ جب اس کے حسن پر پڑی تو چکا چوندی ہو گئی۔ ہر طرح کا خیال یکدم اس کے ذہن سے محو ہو گیا تھا۔ خلیفہ بغداد نے واقعی شہ پارہ اسے عطا کیا تھا۔ وہ خیالات کے ہجوم میں مستغرق تھا کہ وردالمعنی نے اپنے نازک ہاتھ سے اسے دھیرے سے ہلا دیا۔ نجم الدین ایوب چونک کر سنبھل سا گیا۔

''میں سلطان عالی کی ہی ملکیت ہوں، اس لئے سلطان عالی کو متحیر متعجب ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرے چہرے پر پھیلا ہوا حسن جو آپ کو متاثر کر رہا ہے، یہ عارضی ہے، وقت کے دھارے کے ساتھ یہ پھیکا اور ماند پڑ جائے گا''۔

اس کی باتیں سلطان کے دل میں گھر کر رہی تھیں۔ سلطان اس کی ذہانت کا تو قائل ہو چکا تھا مگر خود سپردگی کے اس انداز سے وہ تڑپ سا گیا۔ وردالمعنی سلطان کی دلی کیفیت سے آگاہ تھی مگر اس نے چہرے کو چھپا کر خود کو اہم بنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

''میں کہہ رہی تھی کہ اس الجھن کا آسان حل یہ ہے کہ آپ رضا کارانہ طور پر رکھی ہوئی فوج سے جان چھڑا لیں بلکہ باقاعدہ فوج کے رواج کو اپنائیں۔ باقاعدہ فوج میں آپ کو کسی قسم کی تنگی یا سکی نہیں اٹھانا پڑے گی''۔

''تم باقاعدہ فوج سے کیا مراد لیتی ہو ؟''

''باقاعدہ فوج سے مراد، ایسے لوگ ہیں جو کہ آپ کے زیر سایہ عسکری تربیت حاصل کریں اور وہ آپ کے مکمل وفادار ہوں۔ ان کی تعداد اتنی ہونی چاہئے کہ وہ کم ہوتے ہوئے بھی زیادہ دکھائی دیں اور ان کی عسکری تربیت میں خصوصی توجہ سے کام لیا جائے تا کہ ایک ایک سپاہی مکمل سپہ سالار جیسی خوبیوں کا حامل ہو۔ اگر آپ کا خزانہ اس بوجھ کو اٹھانے کے قابل ہے تو نوعمر بچوں اور بارہ چودہ سال کے غلاموں کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ میں نے سن رکھا ہے کہ سرکیشی غلام بے حد بہادر اور وفادار ہوتے ہیں''۔

''تمہاری تجویز شاندار ہے مگر اس پر عمل درآمد میں کچھ عرصہ لگے گا اور پھر کوئی مثبت نتیجہ نکلے گا''۔

''فوری طور پر آپ کو یہ کرنا چاہئے کہ موجودہ سپہ سالار کو سرحدی علاقوں میں تعینات کر دیا جائے تا کہ وہ صلیبی لٹیروں کو چن چن کر قتل کرتا رہے۔ اس طرح وہ ایک نہ ختم ہونے والی مصروفیت میں مبتلا ہو جائے گا۔ میری اطلاعات کے مطابق صلیبی لٹیروں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔ اس سے جہاں آپ کا ایک دشمن ختم ہوتا رہے گا وہیں مسلمان رعایا بھی سکھ کا سانس لے سکے گی''۔

''اگر سپہ سالار اپنی افواج کو ساتھ لے کر مصر پر حملہ آور ہو گیا تو ؟'' نجم الدین ایوب سارے پہلو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''میں آپ کی طرف سے ایسی غلطی کا تصور بھی نہیں کر سکتی کہ آپ تمام کی تمام سپاہ اس کے ہمراہ کر دیں گے۔ سب سے پہلے افواج کو تین بڑے حصوں میں بانٹ دیجئے۔ دو حصوں پر اپنے وفادار سپہ سالار مقرر کیجئے اور تیسرے حصے کی کمان اسے سونپ دیجئے۔ اس کا ظاہری منصب سپہ سالار اعلیٰ کا ہی رکھا جائے گا مگر اسے طاقت صرف ایک حصہ کی حاصل ہوگی۔ اس طرح اگر وہ کسی قسم کی شرارت کا مرتکب ہوتا ہے تو باسانی اس سے نبٹا جا سکتا ہے''۔

''بخدا تم واقعی امور جہاں بانی میں ماہر ہو، تم نہ صرف خوبصورت ہو بلکہ ذہانت میں بھی تمہارا کوئی جواب نہیں۔ میں تمہاری باتیں سن کر دنگ رہ گیا ہوں۔ اتنی سی عمر اور ایسی پختہ ذہنی۔ تمہاری جگہ باندیوں میں نہیں بلکہ ایوان اعلیٰ میں ہونی چاہئے''۔

''سلطان کا ایوان میرے لئے کسی اعزاز سے کم نہیں ہے''۔ وہ شوخی بھرے لہجے میں بولی۔

وردالمعنی نے ایک ہی دن میں سلطان کی کایا پلٹ ڈالی تھی، جہاں وہ اس کی اعلیٰ ذہانت کا گرویدہ ہوا تھا وہیں اس کے حسن کی بھی تاب نہ لا سکا تھا۔ پل بھر میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ وردالمعنی کو کنیز بنائے رکھنا ظلم ہوگا۔ اگلی ہی صبح اس نے وردالمعنی سے عقد کر لیا۔ یہ اس کا عقد ثانی تھا۔ پہلی بیوی سے اس کے تین بیٹے تھے جو کہ ابھی تک مصری سرزمین تک نہیں پہنچ پائے تھے۔ نجم الدین ایوب کے اس اچانک اقدام پر طرح طرح کی باتیں بنائی گئیں مگر یہ نجم الدین ایوب ہی جانتا تھا کہ اس کا فیصلہ کتنا درست اور صحیح تھا۔ نجم الدین ایوب نے تیسرے دن دربار میں وردالمعنی کو بطور ملکہ متعارف کرایا اور اسے شجرۃ الدر کا لقب دیا۔ وہ کنیز جس نے خلیفہ ابوجعفر مستنصر باللہ کے حرم خاص میں ہوش سنبھالا تھا، آج سلطان مصر کے دل کے تخت پر براجمان ہو کر مصر کی ملکہ بن چکی تھی۔ اسے آداب شاہی سے مکمل واقفیت اور امور جہانبانی سے خصوصی آگاہی رکھنے کا یہ صلہ ملا تھا کہ نجم الدین ایوب جیسا سلطان بھی اس کا گرویدہ ہو گیا تھا۔



برقائی خان اپنی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے ایک ملاقات نورالدین سے کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے اپنی روانگی کی اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ یہ تسلی بھی دینا چاہتا تھا کہ اسے قوی امید ہے کہ درپیش مہم میں وہ مطیع الدین کو تلاش کرنے میں کامیابی سے ہمکنار ہو جائے گا۔ وہ اسی نیت سے نورالدین کے گھر چلا آیا۔ نورالدین اسے دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔ جب سے شیخ نجد دیؒ نے بیٹے کی زندگی کی خبر سنائی تھی نورالدین کا دل برقائی خان کی جانب سے بالکل صاف ہو چکا تھا۔ نورالدین برقائی خان کو ساتھ لے کر اندر چلا آیا۔ مہمان خانے میں ایک اجنبی صورت دیکھ کر برقائی خان چونک سا گیا۔ نورالدین نے اس اجنبی شخص کا تعارف کرایا کہ یہ ترکستان کی برگزیدہ شخصیت شیخ ابوالخالق نجد دیؒ ہیں۔ برقائی خان نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے آگے بڑھا دیا۔ شیخ نجد دیؒ بڑے غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر برقائی خان کا ہاتھ تھاما تو برقائی خان کے جسم میں بجلی سی کوندنے لگی۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ خود کو یکلخت نڈھال سا محسوس کر رہا تھا۔ شیخ نجد دیؒ کے ہاتھ میں جانے کیا بات تھی کہ برقائی خان کو اپنے جسم سے جان نکلتی محسوس ہونے لگی۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

''خان زادے !'' شیخ نجد دیؒ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ ''امتحان کا مرحلہ شروع ہوا اور تم ابھی سے گھبرا گئے ہو''۔

''م م میں کچھ سمجھا نہیں''۔ برقائی خان بمشکل بولا۔ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ نورالدین، برقائی خان کے چہرے پر کرب دیکھ کر پریشان سا ہو گیا۔

''شیخ جی !'' نورالدین تیزی سے بولا۔ ''یہ اپنا بچہ ہے، اس پر نگاہ کرم رکھنی چاہئے''۔

"جس پر اللہ کی نگاہ ہو جائے اسے کسی دوسرے کی نگاہ کی حاجت نہیں رہتی نورالدین"۔

"یہ منگول شہزادہ ہے"۔

"مجھے کئی دن سے اسی کی تلاش تھی، میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے......؟ اس کی صورت دیکھتے ہی سارے پردے ہٹ گئے ہیں"۔

"مگر میں تو آپ کو نہیں جانتا"۔ برقائی خان شیخ نجدیؒ کے سامنے خود کو کمزور پا رہا تھا۔

"خان زادے......!" شیخ نجدیؒ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔ "تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو، ذرا اپنے دل میں جھانک کر تو دیکھو، کیا تمہارے اندر عرصہ سے طلب و جستجو کی وہ بے چینی موجود نہیں تھی جسے دور کرنے کے لئے تم پہاڑوں، ویرانوں اور بیابانوں کی خاک چھانا کرتے تھے"۔

"میں ایسی جگہوں پر محض سکون کی تلاش میں جاتا رہا ہوں، شہروں میں مجھے دم گھٹتا محسوس ہوتا تھا۔ میرے خیال میں اور کوئی وجہ نہیں ہے"۔

"سرکیشی پہاڑی کی چوٹی پر تم کیوں جاتے تھے؟" شیخ نجدیؒ توقف کے بعد بولے۔

"یاخ کے شکار کے لئے"۔

"آسمان کی جانب گردن اُٹھا کر تم وہاں کیا تلاش کرتے تھے؟"

"انتہا اور اونچائی کی حدیں"۔

"کیا تمہیں اپنے سوال کا جواب کبھی ملا؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا"۔

"اگر میں تمہیں جواب مہیا کر دوں تو؟"

"میں ابھی تک سمجھ نہیں پایا کہ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں اور آپ کے سامنے میری قوت جواب کیوں دے گئی ہے......؟"

"تمہاری قوت برقرار ہے لڑکے! اسے لگنے کے لئے صحیح سمت کی ضرورت ہے"۔

"آپ ہی صحیح سمت متعین کر دیں"۔

"اسی لئے تو میں یہاں آیا ہوں۔ آگے آؤ......! اپنا سر ذرا میرے سینے سے لگا کر دیکھنے کی کوشش کرو، صحیح سمت تمہیں دکھائی دے گی"۔

برقائی خان غیر ارادی طور پر آگے بڑھ گیا، دوسرے لمحے اس کا سر شیخ نجدیؒ کے سینے سے لگا ہوا تھا۔ سر سینے سے لگتے ہی اس کی آنکھوں کے سامنے سے سیاہ دبیز پردہ ہٹتا چلا گیا۔ روشنیوں کا سیلاب اس کے دماغ کو منور کرنے لگا۔ وہ سرشاری اور خوف میں ڈوبا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اسی لمحے کسی کا ہاتھ اسے اپنے سر کے بالوں میں رینگتا ہوا محسوس ہوا۔ جوں جوں ہاتھ کی حرکت بڑھتی گئی قلب و دماغ میں تسکین کے سمندر بہنے لگے۔ جہاں عجیب سا شور برپا تھا وہاں سکوت سا طاری ہو گیا۔ اسی لمحے شیخ نجدیؒ نے برقائی خان کا سر اپنے سینے سے الگ کر دیا۔ نورالدین خاموشی سے بیٹھا سب دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ برقائی خان کے چہرے پر پڑی تو وہ عجیب سے نور سے سرفراز دکھائی دیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ دوسرے لمحے برقائی خان کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ ہچکیاں بھر کر رونے لگا۔ نورالدین نے آگے بڑھنا چاہا مگر شیخ نجدیؒ نے اشارہ سے روک دیا۔ جب برقائی خان کے آنسو تھم گئے اور نڈھال ہونے کے باوجود پُرسکون دکھائی دینے لگا تو شیخ نجدیؒ نے نورالدین سے کہا۔

"نورالدین......! جاؤ پانی کا برتن لاؤ، خان زادے کو وضو کراؤ۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ہدایت بخشی ہے اور

صراطِ مستقیم پر چلنے کے لئے منتخب کر لیا ہے"۔

نورالدین شیخ نجدیؒ کی بات سن کر لمحہ بھر کے لئے ہکا بکا رہ گیا اور جونہی مطلب اس کی سمجھ میں آیا تو وہ فرطِ مسرت سے دوڑتا ہوا اندر چلا گیا۔ کچھ دیر میں شیخ نجدیؒ نے اپنے ہاتھوں سے برقائی خان کو وضو کرایا اور کلمہ حق پڑھا کر اسے ہمیشہ کے لئے اس تلاش سے نجات دلا دی جس میں وہ ایک عرصہ سے بھٹک رہا تھا۔ اس کی صحیح راہ متعین کر دی گئی تھی۔ منگولوں کے شاہی خاندان بلکہ چنگیز خان کے خاندان میں سے وہ پہلا فرد تھا جسے اللہ تعالیٰ نے ہدایت بخشی تھی۔ ایک طویل عرصہ سے صحراؤں میں بھٹکنے والی قوم، جس کا پیشہ غارت گری تھا، جو تہذیب و تمدن سے ناآشنا تھی، جس کے نزدیک انسانی جان کی کوئی وقعت نہیں تھی، جس کا ظلم و ستم حد سے بڑھ چکا تھا، اس قوم کو اللہ تعالیٰ نے منتخب کر لیا تھا۔ اب اسے آگے چل کر دین اسلام کی خدمت و حفاظت کرنا تھی۔ برقائی خان اسلام قبول کرنے کے بعد خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اس کے سینے سے ہر قسم کا بوجھ ہٹ چکا تھا۔ اس نے نورالدین کو اپنی مہم اور مطیع الدین کی دوبارہ تلاش کی بابت بتایا۔

"خان زادے......!" شیخ نجدیؒ بولے۔ "جاؤ، اس بار تمہیں کوئی ناکامی نہیں ہو گی، تمہاری مہم بھی کامیاب رہے گی اور جہاں تم جا رہے ہو، وہیں تمہیں اپنا دوست بھی مل جائے گا"۔

"کیا واقعی......؟" برقائی خان بے یقینی کے عالم میں بولا۔

"جب بھی کوئی کام شروع کرنے لگو تو ایک بار سچے دل سے اللہ تعالیٰ کو یاد کر لیا کرنا۔ تمہاری منزل آسان ہو جائے گی۔ وہ خالق اعلیٰ ہے، اپنی مخلوق پر بے حد شفقت کرنے والا ہے"۔

شیخ نجدیؒ نے برقائی خان کو اسلام کے بنیادی ارکان کے بارے میں کچھ ضروری ہدایات دیں اور دروازے تک رخصت کرنے کے لئے کر ساتھ آئے۔

"خان زادے......! یہ ہماری پہلی اور آخری ملاقات ہے، آئندہ تم مجھ سے نہیں مل سکو گے، مجھے تلاش کرنے کی کوشش بھی نہ کرنا بلکہ راستی کی جانب شروع کئے گئے اس سفر کو جاری رکھنا، تمہاری اولاد سے ابھی اللہ تعالیٰ نے بہت سے کام لینے ہیں"۔ شیخ نجدیؒ نے تنبیہ و ہدایت کی۔ برقائی خان کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ شیخ نجدی سے جدا ہو مگر ادائیگی فرض کے احساس اور دوست کا پتہ معلوم ہونے پر اس کے جسم میں شرارے سے پھوٹ رہے تھے۔ اس نے دونوں کو سلام کیا اور رخصت ہو گیا۔ وہ محض اطلاع دینے کی غرض سے وہاں آیا تھا مگر جب لوٹا تو اس کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔



گل وتوژ گھوڑے کو دیوانہ وار بھگاتی ہوئی ازقائی قبیلے سے باہر لے آئی تھی۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ جب سردار مانچی خان زخمی ہو کر زمین پر گرا تھا اس وقت دوسرے لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے اور انہوں نے اس کی واپسی پر کوئی توجہ نہ دی۔ گل وتوژ جب کافی دور نکل آئی تو اس کے حواس کچھ ٹھکانے آئے۔ قریب ہی ایک چشمہ موجود تھا۔ وہ گھوڑے سے اتر آئی اور پانی کے چھینٹے چہرے پر مارے۔ جب وہ ازقائی قبیلے سے نکلی تھی تو اس کے حواس مختل ہو چکے تھے، وہ خود کو جتنا مضبوط سمجھتی تھی اتنی مضبوطی کا مظاہرہ شاید اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آیا اب اسے واپس لوٹ جانا چاہئے یا مطیع الدین کی تلاش میں نکلنا چاہئے؟ مطیع الدین اس وقت کہاں ہو سکتا ہے یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ اس نے گھوڑے کی لگام کو چشمے کے کنارے پر موجود ایک بڑے پتھر کے نیچے دبا دیا تھا۔ وہ کچھ لمحات کے لئے سستانا چاہتی تھی۔ وہ پورے انہماک سے صورت حال کا تجزیہ کرنے میں مصروف تھی کہ اسی لمحے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ وہ بدک

کراٹھی۔ تیزی سے اس نے گھوڑے کی لگام پتھر کے نیچے سے کھینچی اور اسے کھینچتے ہوئے ایک جانب لے گئی۔ اسے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ گھڑسوار کس طرف سے چشمے کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ پل بھر میں اس نے فیصلہ کرلیا کہ اسے کوئی مصیبت مول لئے بغیر اپنے گھر کی راہ لینا چاہئے۔ اس نے گھوڑے پر چھلانگ لگائی اور دوسرے لمحے گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ اس کا رُخ سرائے کی جانب ہی تھا لیکن جب گھڑسواروں کا ایک چھوٹا سا دستہ اسے اپنے سامنے دکھائی دیا تو اسے اپنی سٹی گم ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ بوکھلاہٹ کا شکار ہو چکی تھی، گھوڑے کی لگام اس کے ہاتھ سے جانے کب نکل گئی، اسے خبر نہ ہو سکی۔



جمال الدین الراحی زنداں خانے میں زندگی کی گھڑیاں گن گن کر گزار رہا تھا۔ جب سے اسے غازی عبداللہ شافعی کے خوفناک عزائم کی خبر ہوئی تھی اس کی نیند و سکون اُڑ گیا تھا۔ وہ قید کی صعوبت تو برداشت کرسکتا تھا مگر غلامی کی ذلت برداشت کرنا اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ وہ کئی دن تک غور کرتا رہا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ اسے بخوبی علم تھا کہ غازی عبداللہ شافعی وہ شخص ہے جس نے نجم الدین ایوب کو سلطانِ مصر بنوانے کے لئے تحریک کا آغاز کیا تھا۔ وہ اس مہم کو محض اس کی ملک بدری ختم کرانے کا باعث سمجھتا رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ کسی ایسی شرط کے بل بوتے پر نجم الدین ایوب کی مدد کر رہا ہے جو کہ اسے ذلت کے گڑھے میں پھینک دے گی۔ اسے اپنا انجام بے حد خوفناک دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ایک شام پہرے دار سے درخواست کی وہ اپنے گھر کے کسی فرد سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ جواب طلبی پر اس نے اپنے وفادار غلام کا نام پیش کیا۔ پہرے دار اس عجیب سی فرمائش پر متحیر ہوا۔ بہر حال اس نے اس غلام سے ملاقات کا بندوبست کرا دیا۔ وہ غلام جب اس سے ملنے آیا تو جمال الدین الراحی نے اسے اپنی کوٹھری میں بلوا لیا۔ خلوت میں اس نے غلام سے دھیمے لہجے میں بے شمار باتیں کی اور کچھ معاملوں کے بارے میں پتہ لگا کر کل تک جواب دینے کے لئے کہا۔ پہریدار کو جب یہ معلوم ہوا کہ وہ غلام کل دوبارہ ملاقات کے لئے آئے گا تو وہ جز بز سا ہوا۔ غلام بڑا ہوشیار تھا۔ اس نے چند سکے پہریدار کی جھولی میں ڈال دیئے جس پر اس کا اعتراض ختم ہو گیا۔ دوسرے دن غلام جمال الدین الراحی کی ہدایات کے مطابق معلومات حاصل کر کے واپس لوٹا اور تمام حالات اس کے گوش گذار کر دیئے۔ اس کے بعد اس نے اس سے مطلوبہ شے کی بابت پوچھا تو اس نے کانپتے ہاتھوں سے ایک چھوٹی سی پڑیا اس کی جانب بڑھا دی۔ یہ زہر تھا جو کہ جمال الدین الراحی نے اپنے لئے تجویز کیا تھا۔ وہ ایک بار پوری طرح اطمینان کر لینا چاہتا تھا کہ غازی عبداللہ شافعی نے جو کچھ اس سے کہا ہے۔ کیا وہ واقعی سچ ہے یا یونہی اس نے اس کے سامنے ڈینگ ماری ہے۔ غلام نے تحقیق کر کے بتایا کہ یہ سب سچ ہے۔ امراء کے حلقے میں اس ضمن میں مختلف قسم کی چہ میگوئیاں جاری ہیں۔ غلام سے تصدیق کے بعد اس کی آخری امید بھی دم توڑ گئی تھی۔ اس نے اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے اپنے غلام کو سختی سے ہدایت کی تھی کہ اگر اس کے بارے میں جو کچھ اس نے سن رکھا ہے سب سچ ہو تو وہ اسے زہر کی پڑیا لا دے اور اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرے۔ غلام نے جب زہر کی پڑیا اس کی جانب بڑھائی تھی تو وہ اپنے مالک کی بے بسی پر رو دیا۔ جمال الدین الراحی نے اسے اپنے اہل و عیال کے بارے میں کچھ ہدایات دیں اور رخصت کر دیا۔ وہ غلام بوجھل قدموں سے اپنے آقا کی صورت دیکھتا ہوا چلا گیا۔ اسی رات کھانے کے ہمراہ جمال الدین الراحی نے زہر کی پڑیا اپنے جسم میں اتار دی۔ زہر سریع الاثر تھا جس نے پلک جھپکتے ہی اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔



شیخ عزالدینؒ 638ھ میں قاہرہ تشریف لے آئے۔ سلطان نجم الدین ایوب کو جب ان کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ خود ان کے استقبال کے لئے پہنچا۔ وہ شیخ عزالدینؒ سے بے حد عقیدت رکھتا تھا۔ اس نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور قاہرہ میں ایک بڑے محل میں ٹھہرایا۔ شیخ عزالدینؒ نے اسے بہتیرا روکنا چاہا مگر وہ فرطِ عقیدت سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ شیخ عزالدینؒ نے اس کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا۔ سلطان نجم الدین ایوب نے شیخ عزالدین کو محکمہ اوقاف کا سربراہ مقرر کیا اور ساتھ ہی جامع عمرو بن العاصؓ کی خطابت بھی ان کے سپرد کر دی۔ کچھ عرصہ بعد سلطان نجم الدین ایوب نے مدرسہ صالحیہ کی بنیاد رکھی تو شیخ عزالدینؒ کو اس مدرسہ کا استاذ اعلیٰ مقرر کیا۔ شیخ عزالدینؒ پورے انہماک اور دل جمعی کے ساتھ درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ انہوں نے مصر میں موجود چاروں مسالک کو اس خوبی و کمال سے سنبھالا کہ سب مسالک کے لوگ آپ کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے۔ ان کے خطبات میں کوئی ایسا معاملہ زیر بحث نہ ہوتا جس سے قاہرہ میں مذہبی منافرت پیدا ہو پاتی۔ قاہرہ میں مقیم رہ کر انہوں نے بندگانِ خدا کو مستفیض کیا۔ دمشق کی طرح انہوں نے یہاں بھی اپنا شیوۂ حق گوئی قائم رکھا اور کسی دینی معاملہ میں کبھی مداہنت یا سکوتِ مصلحت آمیز سے کام نہیں لیا۔

ایک دفعہ سلطان نجم الدین ایوب کے حاجب امیر فخرالدین نے ایک مسجد کی چھت پر طبل خانے کی عمارت تعمیر کرا دی جس میں بوقت ضرورت نوبت بجائی جاتی تھی۔ شیخ عزالدینؒ کے پاس جب لوگوں نے شکایت کی تو انہوں پل بھر میں بحیثیت قاضی و مہتمم مسجد پر سے اس عمارت کو گرانے کا حکم جاری کر دیا۔ امیر فخرالدین کو اس تعمیر کے جرم میں ساقط الشہادۃ قرار دے دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے عہدۂ قضا سے مستعفی ہونے کا اعلان کر دیا اور عدالت سے اُٹھ کر گھر تشریف لے آئے۔ سلطان نجم الدین ایوب کو جب علم ہوا تو وہ ننگے پاؤں دوڑتا ہوا ان کے گھر پہنچا اور ان سے معافی طلب کی۔ انہیں راضی کر کے وہ واپس مسند عدالت تک لایا اور خود جا کر اپنی نگرانی میں مسجد پر سے نوبت خانہ کی عمارت کو منہدم کرایا۔ اس غیر معمولی واقعہ سے شیخ عزالدینؒ کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی تھی۔ امیر فخرالدین نے شیخ عزالدینؒ کے اس اقدام کو ناپسند کیا اور ان کی جانب سے ساقط الشہادۃ قرار دیئے جانے پر کوئی توجہ نہ کی۔ کچھ دن بعد امیر المومنین خلیفہ بغداد مستعصم باللہ کے پاس نجم الدین ایوب کی جانب سے ایک سفارت بھیجی گئی۔ سفیر نے امیر المومنین کی خدمت میں باریاب ہو کر سلطان مصر کا پیغام سنایا تو امیر المومنین نے اس سے پوچھا کہ کیا یہ پیغام تم نے خود سلطان نجم الدین ایوب کی زبانی سنا ہے یا کسی اور سے؟ اس نے جواب دیا کہ یہ پیغام حاجب سلطانی امیر فخرالدین کی زبانی سنا ہے تو اس پر خلیفہ بغداد نے ارشاد فرمایا کہ امیر فخرالدین کی زبان کا کہا ہوا معتبر نہیں ہو سکتا کیونکہ شیخ الاسلام عزالدینؒ نے اسے ساقط الشہادۃ قرار دے رکھا ہے۔ چنانچہ سفیر واپس مصر آیا اور براہ راست سلطان نجم الدین ایوب کی خدمت میں پیش ہو کر امیر المومنین کا پیغام سنایا۔ سلطان نجم الدین ایوب نے خود اسے پیغام کے جملے کہے اور وہ دوبارہ بغداد روانہ ہوا۔ اس غیر معمولی واقعہ نے سلطان نجم الدین ایوب کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑا اور اس نے امیر فخرالدین کو حاجب کے عہدے سے معزول کر دیا۔



رات کے وقت ایک سیاہ پوش سایہ تیزی سے ایک دیوار پھلانگ کر ایک گھر میں کود گیا۔ دیوار سے کودنے کے بعد تیزی سے دائیں بائیں نگاہ دوڑائی۔ ہر طرف گہری خاموشی پا کر وہ جھکے جھکے سامنے دکھائی دینے والے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے دروازے پر ہاتھ ڈال کر اسے اندر کی جانب دھکا دیا تو معلوم ہوا کہ وہ اندر سے بند کیا گیا ہے۔ اس نے پیچھے ہٹ کر مکان کی بناوٹ پر نگاہ ڈالی۔ سامنے ایک بالکونی دکھائی دے رہی

تھی۔ اس کے علاوہ کچھ کھڑکیاں بھی تھیں مگر وہ سب بھی بند تھیں۔ گھر میں داخل ہونے کا واحد راستہ وہی بالکونی تھی۔ اس نے قدرے توقف کے بعد اپنے لباس میں سے ایک باریک سی ڈوری کا گچھا نکالا اور اس کے ایک سرے پر چھوٹا سا آنکڑہ باندھنے لگا۔ کچھ دیر میں وہ اپنا کام مکمل کر چکا تھا۔ اس نے ڈوری کو عمودی رخ گھمانا شروع کیا۔ اس کی نگاہیں تیزی سے قرب و جوار میں متحرک تھیں۔ وہ کسی قسم کے خطرے سے نبٹنے کے لئے پوری طرح سے تیار دکھائی دے رہا تھا۔ دوسرے لمحے ڈوری اس کے ہاتھ سے نکل کر بالکونی کی جانب بڑھ گئی۔ اس کی پہلی ہی کوشش کامیاب ہوئی تھی۔ آنکڑہ بالکونی میں کسی جگہ پھنس چکا تھا۔ اس نے ڈوری کو کھینچ کر دو تین جھٹکے دے کر اس کی مضبوطی کا اندازہ کیا۔ اگلے لمحے وہ ڈوری کے ساتھ چپکا ہوا اوپر کی جانب چڑھ رہا تھا۔ باریک ڈوری کے سہارے اوپر کی جانب چڑھنا کسی عام شخص کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ اس میں بڑی مہارت درکار تھی۔ وہ واقعی اپنے کام میں مشاق تھا۔ تھوڑی سی محنت کے بعد وہ بالکونی میں پہنچ گیا۔ بالکونی کے سرے پر اسے دروازہ دکھائی دیا جو کہ بھڑا ہوا تھا۔ دروازے کی درز میں سے اس نے جھانک کر اندر دیکھا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ یہ کسی کی خواب گاہ تھی۔ بستر پر بچھی ہوئی بے شکن چادر چیخ چیخ کر اعلان کر رہی تھی کہ اس پر استراحت کرنے والا ابھی تک پہنچا نہیں۔ اس نے کمرے میں سے گذر کر دوسرے دروازے کی جانب حرکت کی۔ دروازہ حسب توقع کھلا ہوا تھا۔ وہ دروازے سے نکل کر گھر کے اندر موجود راہداری میں پہنچ گیا۔ کچھ دیر تک وہ مختلف کمروں میں جھانکتا رہا۔ شاید اسے مطلوبہ شے نہیں مل رہی تھی۔ کئی ایک کمروں میں اسے کچھ لوگ بھی سوتے دکھائی دیے۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نچلی منزل پر آ گیا جہاں ایک بڑا کمرہ پہلو میں موجود تھا۔ وہ اس کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ دروازہ نہایت آہستگی سے کھول کر اس نے درز میں سے اندر جھانکا تو بستر پر سونے والی شخصیت اسے صاف دکھائی دینے لگی۔ بستر کے پہلو میں بنے ہوئے طاق میں موجود دیئے کی روشنی سے کمرے کا تمام ماحول اس کے سامنے واضح ہو رہا تھا۔ اس نے دائیں بائیں مڑ کر اچھی طرح دیکھا اور احتیاط سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے بستر کے قریب جا کر ایک بار اس شخصیت کو غور سے دیکھا۔ شاید وہ اپنا اطمینان کر لینا چاہتا تھا۔ وہ بڑی بڑی مونچھوں والا شخص گرد و پیش سے بے خبر نیند میں ڈوبا خراٹے بھر رہا تھا۔ سیاہ پوش نے تیزی سے ایک لمبے پھل کا خنجر نکالا اور اس کی نوک کو دیکھنے لگا۔ خنجر کی نوک پر سیال دار چیز چمک رہی تھی۔ یہ انتہائی سریع الاثر زہر تھا۔ اجنبی نے جھٹکے سے چادر اس سوتے شخص سے اتار پھینکی اور اس کی گردن پر اپنے مضبوط ہاتھ سے گرفت جما دی۔ سوتا ہوا شخص ہڑبڑا کر بیدار ہو گیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتا خنجر کا پھل اس کے سینے میں اتر چکا تھا۔ اس کے حلق سے عجیب کی خرخراہٹ نکلی اور دوسرے پل وہ اس سیاہ پوش سائے کی گرفت میں ڈھیلا پڑتا چلا گیا۔ اس کی گردن ایک جانب ڈھلک گئی تھی۔ کھلی بے جان آنکھوں میں خوف کے سائے ابھی تک لرزتے دکھائی دے رہے تھے۔ سائے نے اس کے جسم کو ٹٹول کر اچھی طرح دیکھا کہ کیا وہ مر چکا ہے۔ دل کی دھڑکن بند ہو چکی تھی۔ چہرہ کچھ ہی دیر میں بگڑنے لگا۔ سیاہ پوش سایہ اس کی جانب حقارت سے دیکھتا ہوا وہاں سے نکل آیا۔ وہ پوری احتیاط سے اس گھر سے صحیح سلامت نکل آیا تھا۔ وہ جس مہم پر نکلا تھا وہ پایہ تکمیل تک پہنچ چکی تھی۔ مرنے والا ایک نامی گرامی منگول سردار قونائی خان تھا جس نے چنگیز خان کے ہمراہ کئی بڑی جنگوں میں حصہ لیا تھا۔ منگول سلطنت کی تشکیل میں اس کا بھی ہاتھ تھا مگر وہ اپنے بستر پر آج بے خبری کے عالم میں موت کے گھاٹ اتر گیا تھا۔



سلطان نجم الدین ایوب نے اپنی نئی ملکہ شجرۃ الدُّر کی تجاویز پر عمل کرتے ہوئے فوج کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصے پر اپنے خاص غلام ابوخویلد کو، دوسرے حصے پر ایک مملوک امیر ارسلان الطائی کو جبکہ

تیسرے حصے پر وجیہ الدین الباقری کو سپہ سالار مقرر کر دیا۔ اس نے واضح طور پر یہ قانون بنایا کہ تینوں حصوں کے سالار دوسرے حصوں کی سپاہ پر اثر انداز نہیں ہو سکیں گے، اس کے ساتھ ہی اس نے دشت قپچاق، سرکیشی، قزوینی اور ترکستان کے سفید فام غلاموں کو بڑی تعداد میں خریدنا شروع کر دیا۔ ان غلاموں کی عمریں بہت کم تھیں۔ بردہ فروش تاجروں کی ان دنوں چاندی تھی، وہ بڑی تعداد میں غلام بچوں کو قاہرہ میں لاتے اور نجم الدین ایوب کے خدمت میں پیش کر کے اچھی قیمت حاصل کرتے۔ قاہرہ میں ان غلاموں کی مانگ کے باعث صاحب ثروت لوگوں نے بھی بڑی تعداد میں ان غلاموں کو خرید کر نجم الدین ایوب کی خدمت میں پیش کرنا شروع کر دیا۔ یہ لوگ کہنے کو تو غلام تھے مگر ان کی گوناں گوں خوبیوں نے انہیں ممتاز بنا دیا۔ انہیں مملوک (غلام) کہا جاتا تھا۔ نجم الدین ایوب نے قریباً بارہ ہزار سے زائد مملوک خریدے۔ اس نے ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی۔ اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ انہیں حربی فنون بڑی توجہ سے سکھائے گئے جس کا اثر یہ ہوا کہ ان میں اکثر نہ صرف فنونِ حرب میں غیر معمولی قابلیت کے مالک بن گئے بلکہ علوم اسلامی (قرآن، حدیث، فقہ) میں بھی درجہ کمال تک جا پہنچے۔ سلطان نجم الدین ایوب نے ان ممالیک کی باقاعدہ فوج تشکیل دی جو نہایت منظم اور فن حرب و ضرب میں طاق تھی۔ اس نے اپنے ذاتی محافظ دستے کے لئے بھی اسی فوج میں سے مہارت یافتہ جوان چنے۔ مصری کو اس محافظ دستے کا امیر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ سلطان نجم الدین ایوب نے حکومتی انتظامیہ میں مصری امرا کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کے لئے عمدہ صلاحیتوں کے مالک ممالیک کو بڑے بڑے عہدوں پر فائز کر دیا۔ ان اقدامات سے سلطان نجم الدین ایوب کی پوزیشن مزید مستحکم ہو گئی تھی، اسے اندرونی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے نجات مل گئی۔ سازشی قسم کے امرا کو اس نے آغاز میں ہی مختلف علاقوں میں ان کی حیثیت کے مطابق عہدوں پر فائز کر دیا تھا۔ امرا کے منتشر ہونے سے وجیہ الدین الباقری کی سازش ناکام ہو گئی۔ عماد الدین اسماعیل جو کہ بلادِ مصر پر حملہ کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا، مصری امرا کی یکدم لاتعلقی پر مایوس ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ سلطان نجم الدین ایوب نے ممالیک کی بڑی تعداد کو فعال بنا لیا تھا اور ان کی رسائی دربارِ عالیہ تک کر دی تھی، اس لئے یہ خطرہ منڈلانے لگا تھا کہ کہیں یہ بے قابو نہ ہو جائیں۔ ملکہ شجرۃ الدر نے اس مسئلہ کا حل یہ پیش کیا کہ انہیں بھی دو بڑے حصوں میں منقسم کر دیا جائے اور ان میں آگے بڑھنے اور دوسرے سے افضل ہونے کی دوڑ شروع کرا دی جائے۔ سلطان نجم الدین ایوب نے ان کی بڑی تعداد کو قاہرہ سے باہر جزیرہ روضہ میں آباد کر دیا جہاں ان کی رہائش کے لئے بیرکیں بنوائی گئیں۔ بعض مملوک سرداروں نے سلطان نجم الدین کی اجازت سے وہاں اپنے طور پر مکانات بھی تعمیر کر لئے۔ یہ سردار بعد میں امرا میں شمار ہونے لگے۔ کچھ ہی عرصہ میں یہاں ایک مستحکم قلعہ تعمیر کر لیا گیا۔ یہ مقام دریائے نیل کے اس حصے میں واقع تھا جہاں سے دریا دو شاخوں میں بٹ جاتا تھا۔ اس لئے ان ممالیک کو دریائی یا بحری ممالیک کے نام سے جانا جانے لگا۔ ممالیک کے دوسرے بڑے گروہ کو سلطان صلاح الدین ایوبی کے تعمیر کردہ قلعہ قاہرہ کے برجوں میں سکونت فراہم کی گئی۔ وہ ممالیک برجی کہلائے جانے لگے۔ سلطان نجم الدین ایوب پانچ سال کے عرصے میں مسلسل مصروف رہا اور اپنے دفاع کو مضبوط بنانے میں مشغول رہا۔ سلطان نے خاندان کے بکھرے ہوئے شیرازے کو سمیٹنے کا آغاز کیا۔ بحری، برج اور رضاکارانہ فوج کی موجودگی میں چھوٹے چھوٹے حکمران خود بخود سلطان نجم الدین کی اطاعت پر مجبور ہو گئے۔ سلطان نے انہیں معزول کرنے کے بجائے ان کی حوصلہ افزائی کی اور انہیں امن و راستی کا رستہ اختیار کرنے پر اپنی خوشنودی کا عندیہ دیا۔



گل وتوژ کا گھوڑا بے لگام ہو چکا تھا۔ وہ منہ اٹھائے گھڑ سواروں کی جانب سرپٹ دوڑا جا رہا تھا۔ گل

دقوز گھوڑے کی باگیں چھٹ جانے پر مزید خوفزدہ ہوگئی۔ گھڑسوار اپنی جانب بڑھنے والے گھوڑے کو دیکھ کر چونک پڑے۔ ان میں سے ایک صورتِ حال کو شاید سمجھ چکا تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ گل دقوز کے گھوڑے کو قابو کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ گھوڑے پر ایک حسین وجمیل لڑکی کو پاکر وہ بے حد حیران ہوا۔ گل دقوز سہمی سہمی اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اسی اثناء میں باقی گھڑسوار بھی اس کے نزدیک پہنچ گئے۔ وہ سب منگول سپاہی تھے۔ ان کے لباس پر زرد رنگ کے مخصوص نشان صاف دکھائی دے رہے تھے۔

''لڑکی تم کون ہو اور اس ویرانے میں کیا کرتی پھر رہی ہو......؟'' ایک گھڑسوار سخت لہجے میں بولا۔

''مم...... میں شاہی خاندان میں سے ہوں، سیر کے لئے ادھر آنکلی تھی کہ گھوڑا بے قابو ہوگیا''۔

''کس کی بیٹی ہو......؟''

''میں تونائی خان کی بیٹی ہوں''۔

''اوہ ...! کیا تم جانتی ہو کہ تمہارا باپ آج کل کہاں ہے......؟'' دوسرا سپاہی قدرے نرم لہجے میں بولا۔ گل دقوز اس کے لہجے سے چونک پڑی اس نے حیرت وپریشانی سے گردن نفی میں ہلائی۔

''لڑکی......! سیر وتفریح کے بجائے اپنے گھر کی راہ لو۔ تمہارے باپ کو گذشتہ رات قتل کر دیا گیا ہے۔ پورے سرائے میں اس کی پُراسرار موت پر چہ میگوئیاں کی جا رہی ہیں''۔

''کک... کیا مطلب......؟'' گل دقوز لمحہ بھر کے لئے ساکت ہوگئی تھی۔

''مطلب وہی ہے جو تم نے سنا اور سمجھا ہے۔ چلو اب یہاں وقت ضائع کرنے کے بجائے گھر کی طرف بھاگو''۔

''مگر میرے باپ کی تو کسی سے دشمنی نہیں تھی''۔ وہ زیرِلب بڑبڑائی۔

''لڑکی یہ تمہارے پہلو میں خون کیسا لگا ہے......؟'' ایک سپاہی نے اس کی قمیض کے دامن کی جانب اشارہ کیا۔ گل دقوز خون کی بابت سن کر چونک پڑی۔ وہ تیزی سے جھک کر اپنے پہلو کی جانب دیکھنے لگی۔ اس کی قمیض کے دامن کے ایک طرف خون کے چھینٹے صاف دکھائی دیئے۔ وہ خون دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ اس نے سوچا کہ ممکن ہے کہ سردار مانجی خان کے پہلو میں خنجر اتارتے وقت خون کے یہ چھینٹے اس کے دامن پر آلگے ہوں۔ سردار مانجی خان کا خیال آتے ہی اس کے چہرے پر بدحواسی سی چھانے لگی۔ وہ کسی کے قتل کے جرم کی مرتکب ہو چکی تھی۔ وہ خود کو سپاہیوں کے بیچ مجرم محسوس کرنے لگی۔ گھبراہٹ کے عالم میں اسے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ صرف گھر جانے کے حوالے سے بولتی رہی۔ خون کے چھینٹے دیکھنے کے بعد سپاہی اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ وہ یہ اندازہ لگا رہے تھے کہ کہیں اس لڑکی نے ہی خود اپنے باپ کو قتل نہ کیا ہو۔ انہوں نے سختی سے جواب طلبی کی تو وہ روہانسی سی دکھائی دینے لگی۔ سپاہیوں نے معاملہ گھمبیر سمجھتے ہوئے اسے اپنی حراست میں لے لیا اور سرائے کی جانب روانہ ہوگئے۔



ربیع الاوّل 643ھ تک نجم الدین ایوب بلادِ مصر اور بلادِ فلسطین میں امن وامان کی فضا قائم کرنے میں بھرپور انداز میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے ماضی کے پرانے زخم کا بدلہ لینے کی غرض سے تمام لشکروں کو تیاری کا حکم دے دیا۔ وہ اپنے چچا الملک الصالح عماد الدین اسماعیل سے بلادِ شرقیہ کے تمام علاقے واپس حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی عماد الدین اسماعیل کی ڈھیل کے باعث ایک عرصہ سے صلیبی لٹیرے ان علاقوں میں من مانی

کرتے پھر رہے تھے۔ ان کی اوچھی حرکتوں کی وجہ سے یہاں کے مسلمانوں کے لئے زندگی گذارنا دوبھر ہو چکا تھا۔ یہاں کے رئیس وامراٗ کئی بار نجم الدین ایوب سے مدد طلب کر چکے تھے مگر وہ فوری طور پر اس طرف توجہ نہیں دے پایا تھا۔ عماد الدین اسماعیل کو نجم الدین ایوب کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو اس نے پورے زور وشور سے تیاریاں کرتے ہوئے بڑے لشکر کے ساتھ دمشق کے باہر پڑاؤ ڈالا۔ نجم الدین ایوب مسلسل تیز رفتاری سے سفر کرتا ہوا 4 جمادی الاوّل 643ھ کو اس کے سامنے خیمہ زن ہوا۔ دونوں کے درمیان سفارت کا آغاز ہوا مگر وہ کسی بہتری کی جانب نہیں بڑھ پایا۔ بالآخر 8 جمادی الاوّل کو فیصلہ کن معرکے کا آغاز ہوا۔ نجم الدین ایوب کے لشکر میں فارس اقطائی، وجیہ الدین الباقری، بیبرس، امیر فخر الدین، ارسلان الطائی جیسی سرکردہ شخصیات موجود تھیں جو کہ فن حرب میں یکتائے روزگار سمجھی جاتی تھیں۔ دن کے دوسرے پہر میں ہی جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوگئی۔ عماد الدین اسماعیل کے ساتھ صلیبی حلیف بھی شامل تھے جو کہ نجم الدین ایوب کو کسی صورت بھی بلادِ شرقیہ پر قابض نہیں ہونے دینا چاہتے تھے کیونکہ اس سے ان کے تمام مفادات پر کاری ضرب لگتی۔ ممالیک کی تیار کی گئی فوج کے لئے میدانِ جنگ میں اترنے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ انہوں نے جان توڑ کر لڑائی کی۔ تیسرے پہر کے آغاز سے قبل ہی عماد الدین کی سپاہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ عماد الدین اسماعیل کے سالاروں نے جب میدان کا نقشہ بدلتے دیکھا تو انہوں نے بھی جان بچانے میں سپاہ کی تقلید کی۔ عماد الدین اسماعیل نے بے حد کوشش کی کہ فوج میں انتشار نہ پیدا ہو مگر وہ ناکام رہا اور لڑتے ہوئے موت کے گھاٹ اتر گیا۔ جنگ میں فتح نجم الدین ایوب کے حصے میں آئی۔ اس نے عماد الدین اسماعیل کی گرفتار فوج کی جان بخشی کرتے ہوئے انہیں آزاد کر دیا اور 9 جمادی الاوّل کو دمشق میں فاتح کی حیثیت سے قدم رکھا۔ دمشق کے امراٗ نے حسبِ عادت نئے سلطان کا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ سلطان نجم الدین ایوب نے یہیں ٹھہر کر کچھ عرصہ تک مختلف بگڑے ہوئے معاملات کو درست کیا اور صلیبی لٹیروں کو گرفتار کر کے سخت سزائیں دیں۔ صلیبی علاقوں پر مختلف امراٗ کی زیرِ قیادت مہمات روانہ کی گئیں اور انہیں پیچھے دھکیل کر ساحلی قلعوں کی جانب ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ سلطان نجم الدین ایوب بلادِ مصر وفلسطین کی طرح دوسرے علاقوں میں بھی اصلاحات کرنے کا خواہشمند تھا اسی لئے اس نے مصر واپسی کے بجائے 644ھ کے اوائل میں حماۃ کی جانب کوچ کیا اور ایک فیصلہ کن لڑائی کے بعد اسے بھی فتح کرلیا۔ بلادِ شرقیہ واپس اس کی حکمرانی میں شامل ہو چکے تھے۔ دمشق کی طرح حماۃ میں بھی ضرورت کے تحت نئی نئی اصلاحات کی گئیں اور قریباً پورا سال یہیں گذار دیا۔ سال کے آخر میں ذی قعدہ کے مہینے کی 19 تاریخ کو سلطان نجم الدین ایوب حماۃ سے واپس ہوا اور دمشق پہنچا۔ یہاں چند دن کے قیام کے بعد اس نے واپسی اختیار کی اور مصر لوٹ آیا۔ اب اس کے زیرِ سایہ علاقوں میں بلادِ مصر، بلادِ فلسطین اور بلادِ شرقیہ شامل تھے۔ سلطان نجم الدین ایوب نے پوری جانفشانی سے بھٹکے ہوئے مسلمانوں کو راہِ راست پر لانے کے لئے جگہ جگہ مدارس بنوائے تاکہ نئی نسلیں صحیح معنوں میں اسلامی تعلیمات سے روشناس ہوسکیں۔ ان مدارس کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں میں فوجی کیمپ قائم کئے گئے جہاں نوجوانوں کو حربی فنون کی تربیت دی جاتی تھی۔

12 شوال 645ھ میں اس کا چھوٹا بھائی سیف الدین ابوبکر قلعہ قاہرہ کے زنداں خانے کی صعوبتیں برداشت کرتا ہوا چل بسا۔ یہ بلادِ مصر کا سابق سلطان تھا۔ وہ قریباً ساڑھے آٹھ سال سے حالت اسیری میں تھا۔ نجم الدین ایوب کو جب اس کا علم ہوا تو وہ خود وہاں آیا اور اسے غسل دے کر بابُ النصر کے باہر شمس الدین کے قبرستان میں نہایت خاموشی کے ساتھ قبر میں اتار دیا گیا۔

646ھ میں سلطان نجم الدین ایوب بلادِ شام میں شورشوں کی اطلاع پا کر دوبارہ قاہرہ سے مکمل افواج

کے ساتھ نکلا اور شعبان کے آغاز تک دمشق پہنچ گیا۔ یہاں ٹھہر کر اسے معلوم ہوا کہ حمص کے والی نے بغاوت کا علم بلند کر دیا ہے تو اس نے ارسلان الطائی کی زیر قیادت ایک بڑا لشکر روانہ کیا جس نے حمص کا محاصرہ کر لیا اور اہل شہر نے تنگ آ کر والئی حمص الملک الاشرف کو خود ہی گرفتار کر کے ارسلان الطائی کے حوالے کر دیا۔ الملک الاشرف کو سلطان نجم الدین ایوب کی خدمت میں پیش کیا گیا تو اس نے معافی کی استدعا کی۔ اس کی جان بخشی کرتے ہوئے بغاوت کے جرم میں ہمیشہ کے لئے زنداں خانے میں دھکیل دیا گیا۔ الملک الاشرف کے باپ نے سلطان کے چچا عماد الدین اسماعیل کے ساتھ الحاق کر کے ماضی میں بلادِ شرقیہ پر قبضہ کیا تھا۔ اس فعل کی سزا اس کے بیٹے کو دی گئی تھی۔

نجم الدین ایوب پورا سال دمشق میں ہی ٹھہرا رہا یہاں اس کی طبیعت خراب رہنے لگی تو مصر کی جانب لوٹ گیا۔ اب شام سے لے کر مصر تک اس کا کوئی حریف باقی نہیں رہا تھا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے بعد یہ دوسرا بڑا حکمران تھا جس نے اتنے بڑے رقبے کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔



فارس الدین اقطائی سرزمین قزوین کا رہنے والا تھا۔ وہ چھ سال قبل مصر آیا تھا۔ فارس اقطائی بھی تاتاریوں کی وحشیانہ بربریت کا شکار تھا۔ اس کے والدین کو اس کی نگاہوں کے سامنے بے رحمی سے قتل کر دیا گیا اور اُسے ہمیشہ کے لئے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ جب یہ سانحہ ہوا اس وقت اس کی عمر چھ برس تھی۔ زمانے کی صعوبتیں اُٹھاتے اُٹھاتے وہ بلادِ مصر آن پہنچا۔ نجم الدین ایوب جب ممالیک کی فوج مرتب کر رہا تھا اس وقت اسے بھی خرید لیا گیا۔ بیبرس کے بعد یہ دوسرا خاص فرد تھا جسے ابو خویلد نے حربی علوم کے لئے خصوصی طور پر منتخب کیا تھا۔ فارس اقطائی عمر میں بیبرس سے سات سال بڑا تھا۔ صحیح تعلیم و تربیت نے اُسے فراست و دانائی جیسی صفات سے آراستہ کر دیا تھا۔ وہ جلد ہی عمائدین سلطنت میں شامل ہو گیا اور فوج کے ایک بڑے حصے کا امیر مقرر کر دیا گیا۔ سلطان نجم الدین کی زیر قیادت اس نے دمشق اور اس کے اطراف میں کئی لڑائیاں لڑی تھیں۔ اپنی جوانمردی اور جوہر شجاعت کے باعث یہ سلطان کی نگاہوں میں مقبول و معروف تھا۔ اس کی عمدہ طبیعت و عادتوں نے دیگر احباب کی طرح بیبرس کو بھی اس کے قریب کر دیا تھا۔ دونوں میں گہری دوستی قائم ہو چکی تھی۔ بیبرس سلطانی محافظ دستے کا امیر ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر امور پر بھی مقرر تھا۔ اسے جب بھی موقعہ ملتا تو وہ شیخ عز الدینؒ کی خدمت میں جا بیٹھتا۔ شیخ عز الدینؒ بھی اسے خصوصی توجہ دیا کرتے۔ فارس اقطائی مسلمان تو تھا مگر شعائرِ اسلامی میں خاص رغبت نہیں رکھتا تھا۔ وہ اکثر و بیشتر ان امور سے کنی کترا جایا کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ شیخ عز الدینؒ کے پاس بیٹھنے سے ہچکچاتا۔ بیبرس نے کئی بار اسے ساتھ چلنے کی پیشکش کی لیکن وہ کسی نہ کسی بہانے سے ٹال جاتا۔



647ھ میں سلطان نجم الدین ایوب شامی علاقوں میں ہی موجود تھا۔ اس کی طبیعت بار بار خراب ہو جاتی جس پر سفر کی رفتار کم کر دی جاتی۔ وہ دمشق سے نکل کر قاہرہ پہنچنا چاہتا تھا مگر خرابی طبیعت کے باعث اسے کئی کئی ماہ تک قیام کرنا پڑتا۔ طبیب اپنی کوششوں میں مصروف تھے کہ سلطان نجم الدین ایوب کو صحت یابی ہو۔ ملکہ شجرۃ الدر بھی سلطان کے ہمراہ تھی اور وقتاً فوقتاً اس کی ڈھارس بندھاتی رہتی۔ ایک شام ساحلی علاقوں سے قاصد نے آ کر سلطان نجم الدین ایوب کو اطلاع دی کہ صلیبی لشکر سمندر کے راستے بلادِ مصر پر حملہ آور ہو گیا ہے۔ اطلاع پاتے ہی نجم الدین ایوب اپنی بیماری وغیرہ سب بھول گیا اور پوری رفتار سے سفر کرتا ہوا اشموم جا پہنچا اور صلیبی لشکر کا انتظار کرنے لگا۔

اس واقعے کا پس منظر یہ ہے کہ 647ھ میں صلیبیوں میں ایک بار پھر سرزمین مقدس واپس لینے کا خیال پیدا ہوا۔ اس بار اس مہم کا بار شہنشاہِ فرانس لوئی نہم (لوئیس) کے کندھوں پر تھا۔ بیت المقدس کو مسلمانوں سے چھڑانے کے لئے تمام تر تجاویز پر غور کیا گیا۔ مختلف مشوروں کے بعد یہ نتیجہ سامنے آیا کہ جب تک سلطان مصر نجم الدین ایوب کو شکست سے دو چار نہیں کیا جاتا تب تک بیت المقدس پر مکمل قبضہ ممکن نہیں۔ عیسائی مؤرخین کا بیان ہے کہ تمام صلیبی جنگوں کے مقابلے میں یہ حقیقی معنوں میں مقدس صلیبی جنگ کہلائے جانے کی مستحق تھی، جس میں سرزمین مقدس کو مسلمانوں سے چھڑانے کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد کارفرما نہیں تھا۔ مؤرخوں کے مطابق، شاہ فرانس لوئی نہم نے مشرق پر محض دینی جذبہ اور مذہبی جوش کے تحت چڑھائی کی تھی اور اس کا مقصد وحید مقدس علاقوں کو مسلمانوں کے قبضے سے چھڑا کر مسیحیت کے جھنڈے بلند کرنا تھا۔ اس کے پیش رو صلیبی جنگجو ارضِ مقدس پر صرف دینی جذبہ کی بناء پر حملہ آور نہیں ہوئے تھے بلکہ اموال اور قیدیوں سے اپنے آپ کو مالا مال کرنا اور وہاں کے سرسبز و شاداب خطوں میں اپنی مملکت قائم کرنا بھی ان کے مدنظر تھا۔ ان مؤرخین نے لوئی نہم کے بارے میں کچھ زیادہ ہی بڑھا چڑھا کر لکھا ہے خصوصاً اس کی سیرت کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ وہ ایک نہایت پرہیز گار، بے لوث، درویش صفت، عبادت گذار اور نیک طینت بادشاہ تھا جس کا دل و دماغ دین مسیحی کے جذبے سے معمور تھا۔ میدانِ جنگ میں وہ شجاعت کا پیکر بن جاتا تھا اور مصیبت کے وقت صبر و استقامت کو ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ اسی لئے مسیحی آج بھی اسے سینٹ لوئی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ بلادِ مصر پر حملہ آور ہونے کی حقیقی وجہ بھی یہی تھی کہ یہی وہ واحد مضبوط مملکت تھی جو اس کی راہ میں مزاحم ہو سکتی تھی۔ اگر اس خطے پر وہ قبضہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو پھر کوئی ایسی طاقت باقی نہیں تھی جو ان کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی۔ شاہ لوئی اپنے جرار لشکر کے ساتھ 20 صفر 647ھ میں جمعہ کے دن سمندر سے خشکی پر اترا اور ہفتہ کے دن انہوں نے آسانی سے جیرہ کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ صلیبی اپنی وحشیانہ خصلت سے مجبور تھے انہوں نے یہاں قتل و غارت کا بازار گرم کیا اور تمام شہر کو اپنی درندگی کا نشانہ بنایا۔ جیرہ سے فارغ ہو کر وہ دمیاط کی جانب بڑھے۔ یہاں انہیں تھوڑی سی مزاحمت کا سامنا ہوا مگر جلد ہی وہ اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب ہو گئے اور شہر ان کے ہتھے چڑھ گیا۔ یہاں بھی ان کا سلوک کچھ مختلف نہ تھا۔ شہر کو بے دردی سے تاخت و تاراج کیا گیا۔ کئی لوگ صلیبیوں کے خوف سے اپنے گھر بار چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے۔ 22 صفر تک صلیبیوں نے دمیاط پر مکمل قبضہ کر لیا تھا۔

سلطان نجم الدین ایوب اشموم میں خیمہ زن صلیبیوں کا انتظار کر رہا تھا۔ جب اسے دمیاط پر قبضے کی خبر ملی تو وہ برق رفتاری سے سفر کرتا ہوا منصورہ کے میدان میں آ پہنچا۔ اس نے یہیں پڑاؤ ڈال دیا تھا کیونکہ صلیبی اسی میدان سے گذر کر دوسرے کسی شہر کی جانب جا سکتے تھے۔ ادھر شاہ لوئی کو بھی سلطانِ مصر کی آمد کی اطلاع مل گئی تھی۔ دونوں جانب زور و شور سے ایک بڑی جنگ کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ اسی دوران سلطان مصر نجم الدین ایوب کی طبیعت بہت زیادہ بگڑ گئی۔ عمائدین سلطنت میں بے چینی سی پیدا ہونے لگی۔ دشمن ان کے سامنے تھا اور سلطان نجم الدین ایوب بستر پر پڑا تھا۔ سلطان نے ان کی پوری طرح حوصلہ افزائی کی کہ وہ بے فکر رہیں۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی وہ بھلا چنگا ہو جائے گا اور بذاتِ خود میدان جنگ میں اتر کر صلیبیوں کو سرزمین مصر میں داخل ہونے کی سزا دے گا۔

15 شعبان 647ھ پیر کی رات سلطان نجم الدین ایوب پر کھانسی کا ایسا طویل دورہ پڑا کہ وہ اسی کی روح نکلنے پر ہی ختم ہوا۔ سلطانِ مصر صلیبیوں کو شکست دینے کا خواب دل میں لئے دنیا چھوڑ چکا تھا۔ ملکہ شجرۃ الدر اور عمائدین خاص کے لئے یہ مرحلہ بے حد اہم تھا۔ سامنے دشمن کی افواج خیمہ زن ہو چکی تھیں۔ ان کی تعداد بہت

زیادہ تھی۔ ادھر قدرت نے سلطان نجم الدین ایوب کا وقت پورا کر دیا تھا۔ اس کی موت کی خبر سے پوری فوج ہل کر رہ جاتی۔ مسلمانوں کی واضح شکست کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔



گل وقوژ سرائے شہر کی سرکاری کوتوالی کے تنگ احاطے میں دو دن سے بند تھی۔ اسے سرائے سے کئی کوس دور گرفتار کیا گیا تھا۔ قمیص کے دامن پر لگے خون کے دھبوں نے اسے مجرم بنا دیا تھا۔ اس کے باپ قونائی خان کو رات کی تاریکی میں نامعلوم حملہ آور نے موت کی نیند سلا دیا تھا، جس کا علم ہونے پر وہ غم سے نڈھال ہو گئی تھی۔ اس کا باپ جیسی بھی خصلت کا شخص تھا، سرائے کے متمول امرأ میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ سلطنت کے منتظمین میں سے ایک تھا۔ انہیں ایک مضبوط ریاستی شخص کے ایسے وحشیانہ قتل کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ ان میں سے بیشتر ایسے تھے جو شدید خوف میں تھے۔ انہیں یہ اندیشہ تھا کہ اب کہیں ان کی باری نہ آ جائے۔ کوتوالی میں گل وقوژ کی آمد پر جب یہ بات کھلی کہ جب اسے گرفتار کیا گیا تو وہ اپنے باپ کو قتل کر کے فرار ہو رہی تھی تو ان امرأ کے چہروں پر اطمینان دکھائی دینے لگا۔ وہ قونائی خان کی موت کا سبب گھریلو رنجش کو قرار دینے لگے۔ البتہ کئی ایک افراد میں تشویش برقرار رہی۔ ان میں زیادہ تر ایسے تھے جن کی قونائی خان کے گھر تک رسائی تھی۔ انہوں نے باپ اور بیٹی کے درمیان کوئی ایسی بات محسوس نہیں کی تھی جو قتل کا سبب بنتی۔ ان کا خیال تھا کہ معاملہ درحقیقت کچھ اور ہے اور اسے زبردستی گھریلو رنجش بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ان کے ذہن میں برقائی خان کی قونائی خان کے ساتھ تکرار بھی محفوظ تھی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اسی شام برقائی خان سرائے سے سپاہیوں کے ہمراہ ضرگا کی قبیلے کی سرکوبی کے لئے نکلا تھا جس رات قونائی خان کا قتل ہوا۔ ڈھکی چھپی سرگوشیوں میں وہ لوگ قونائی خان کے قتل کو برقائی خان کا کیا دھرا قرار دے رہے تھے۔

گل وقوژ کو ایک ہفتے کی نظر بندی کے بعد باہر لایا گیا۔ اس نے اپنے باپ کی آخری رسومات میں شرکت کی۔ منگولوں میں مردوں کو دفنانے کا رواج قدرے مختلف تھا۔ وہ ایک بڑا سا تہہ خانہ بناتے اور وہاں گھر کا پورا ساز و سامان سجا کر ایک بڑے بنچ نما بستر پر میت ڈال دیتے۔ اس کے بعد کسی ایسے غلام کو لاش کی حفاظت کے لئے مامور کر دیتے جو آقا کا خاص وفادار سمجھا جاتا۔ اس کے بعد تہہ خانے میں لاش کو بڑے اہتمام سے رکھ دیا جاتا اور اس تہہ خانے کو اوپر سے مکمل طور پر بند کر دیا جاتا۔ تہہ خانے کی سطح پر منوں کے حساب سے مٹی اور پتھر پھینک دیئے جاتے۔ یوں مالک کی لاش کے ساتھ وفادار غلام کو بھی زندہ درگور ہونا پڑتا تھا۔ لاش کو تہہ خانے میں رکھنے پر جاودانی آسمان کی عبادت کی جاتی۔ اس عبادت میں مردوں کے شانہ بشانہ خواتین بھی شریک ہوتیں۔

گل وقوژ بھی اپنے باپ کی آخری رسومات میں شامل ہوئی تھی۔ سرائے کی خواتین کو جب یہ معلوم ہوا کہ وہ اپنے باپ کی قاتلہ ہے تو وہ اسے جلواتیں بھی سناتی رہیں۔ گل وقوژ کے پاس کوئی ایسا ثبوت نہیں تھا کہ وہ اپنے آپ کو اس قتل سے بری ثابت کر پاتی۔ اس کی قمیص پر جو خون کے دھبے موجود تھے وہ تو ازقائی قبیلے کے سردار مانجی خان کے تھے۔ اگر وہ سچ کا اعتراف کرتی تو بھی اس کی گردن میں موت کا پھندا پڑتا کیونکہ وہ منگول قانون کے خلاف ایک سردار کے قتل کی مرتکب ہوئی تھی۔

قونائی خان کی آخری رسومات کے بعد اسے پھر نظر بند کر دیا گیا۔ قریباً دس دن کے بعد اسے دوبارہ وہاں سے نکالا گیا اور منگول منصف کی عدالت میں لایا گیا۔ وہاں سرائے شہر کے بیشتر رئیس و امرأ موجود تھے جو کہ قونائی خان کے قتل کے مقدمے کا حال سننے کے لئے بے تاب تھے۔ گل وقوژ کو مجرموں والے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں میں بیڑیاں ڈالی گئی تھیں۔ اس کی حالت بے حد پتلی ہو رہی تھی۔ چہرہ آنسوؤں کے

نشانات اور خاک سے اٹا پڑا تھا۔ بال کئی دن سے صاف نہ ہونے کی وجہ سے کھچڑی سے دکھائی دے رہے تھے۔ لباس پر خون کے دھبے سیاہ پڑ چکے تھے۔

منگول منصف نے اس پر تیز نگاہ ڈال کر مقدمے کی کارروائی کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے منگول کوتوال نے اس پر قتل عمد کی فردِ جرم عائد کی اور سرائے کے باہر سے گرفتاری کو فرار کی کہانی قرار دیا۔ بعد ازاں ان سپاہیوں کا فرداً فرداً بیان لیا گیا جنہوں نے اسے گرفتار کیا تھا۔ ان سب کے بیانات قریباً ملتے جلتے تھے۔ انہوں نے یہ بیان دیا تھا کہ گل وقوژ خون کے دھبوں کے استفسار پر گھبرا گئی اور کوئی معقول جواب دینے سے قاصر رہی جس کے باعث انہوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ قونائی خان کے قتل کے بارے میں کھوجی کی ماہرانہ رائے کو بھی سنا گیا۔ کھوجی کا کہنا تھا کہ قتل کرنے والا فرد بے حد مضبوط جسم کا مالک ہے اور اس کے وار کی گہرائی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خنجر کے استعمال میں مہارت رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کے بارے میں کوئی اندازہ قائم نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کس جانب سے گھر میں داخل ہوا ہوگا۔ یہ کہنا بھی بعید از قیاس نہیں ہے کہ اس قتل کا ذمہ دار گھر ہی کا کوئی فرد ہو۔ گل وقوژ کے خنجر پر موجود خون کے دھبوں کو ایک مسلمان طبیب نے جانچا تھا جس نے اپنے بیان میں خنجر پر موجود نشانات انسانی خون سے تعبیر کئے تھے۔ علاوہ ازیں لباس پر موجود خون کے دھبوں کا نمونہ بھی اُسی طبیب نے ملاحظہ کیا تھا۔ اس بارے میں اس کا کہنا تھا کہ خنجر اور لباس پر موجود خون کے نشانات ایک ہی شخص کے خون کے ہیں۔ کارروائی کے دوران یہ بات تو ثابت ہو چکی تھی کہ گل وقوژ کسی نہ کسی قتل میں ضرور ملوث ہے۔ تمام تحقیق مکمل ہونے پر گل وقوژ سے اصلیت طلب کی گئی۔

گل وقوژ مقدمے کی کارروائی کے دوران یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اسے حقیقت بیان کر دینی چاہئے وہ اپنے باپ کے قتل کی مرتکب نہیں ہوئی تھی۔ اگر وہ اب خاموش رہی تو اس کے باپ کا قاتل ہمیشہ سزا سے بچا رہے گا۔ وہ گویا ہوئی۔

''معزز منصف...! میں پہلے بھی یہ کہہ چکی ہوں کہ میں نے اپنے باپ کو قتل نہیں کیا ہے اور اب بھی اپنے بیان پر قائم ہوں۔ رہا سوال ان خون کے دھبوں کا جنہوں نے میرے کردار اور عزت کو داغ دار کر ڈالا ہے، ان کی حقیقت بیان کرنے سے میں پہلے خوفزدہ تھی مگر اب میں اپنے باپ کے اصلی قاتل کو سزا دلوانے کے لئے اس حقیقت پر سے پردہ اٹھاؤں گی''۔ گل وقوژ پُر اعتماد تھی اور چہرے سے گہرا اطمینان جھلک رہا تھا۔ گل وقوژ کی بات سن کر وہاں موجود افراد میں چہ میگوئیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جسے منصف کی تنبیہ نے ختم کیا۔ گل وقوژ نے ان سب لوگوں کی جانب نگاہ دوڑائی اور توقف کے بعد دوبارہ بولی۔

''یہ خون کے دھبے میرے باپ کے خون کے نہیں بلکہ ازقائی قبیلے کے سردار مانجی خان کے ہیں''۔ یہ ایک نیا انکشاف تھا جس پر سب دم بخود رہ گئے۔ گل وقوژ نے ان کے چہروں پر استہزائیہ نگاہ ڈالی۔

''میں اس روز صبح سویرے ہی گھر سے تیار ہو کر نکلی تھی۔ میں نے ازقائی سردار کو ایک گمشدہ شخص کی تلاش کا کام سونپا تھا جو کہ اس نے طویل عرصہ گذر جانے کے بعد بھی پورا نہیں کیا تھا۔ میں نے اسے اس شخص کی تلاش کا پورا پورا معاوضہ ادا کیا تھا۔ اسی سلسلے میں، میں گھر سے نکلی اور دن کی دوسری ساعت میں ازقائی قبیلے میں پہنچ گئی۔ سردار مانجی خان نے مجھے دیکھ کر حیلہ جوئی کا سہارا لیا۔ اس نے کام کے مکمل ہونے کا دعویٰ کرنے اور مجھے جھوٹا قرار دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ جب میں نے ذرا سختی کا لہجہ اختیار کیا تو اس نے کام نہ ہو سکنے کا عذر پیش کیا۔ اس سے دوبارہ نیا وعدہ لے کر میں جب وہاں سے واپس لوٹنے لگی تو اس نے مجھے وہیں قیام کے لئے کہا، میرے انکار پر وہ بدتمیزی پر اتر آیا۔ اس کی نیت میں کھوٹ دیکھ کر میں نے وہاں سے نکلنے کی کوشش کی تو وہ مجھ پر

جھپٹ پڑا۔ اسی لمحے میں نے فیصلہ کیا کہ اس کے ساتھ نرمی کا سلوک کرنا حماقت ہوگی لہٰذا میں نے اپنا خنجر اس کے جسم میں اتار دیا۔ وہ زخم کھا کر پیچھے کی جانب ہٹا تو میں تیزی سے وہاں سے نکل آئی۔ میں اس وقت سخت گھبراہٹ کی شکار تھی کہ راستے میں مجھے یہ سپاہی مل گئے۔ انہوں نے جب مجھے یہ بتایا کہ میرے باپ کو قتل کر دیا گیا ہے تو میں شدید صدمے سے دوچار ہوگئی۔ اسی دوران ان میں سے کسی کی نگاہ میرے کپڑوں پر موجود خون کے دھبوں پر پڑی تو انہوں نے اس کے بارے میں وضاحت طلب کی۔ میں بوکھلاہٹ، خوف اور صدمے کی شکار تھی لہٰذا میں انہیں کوئی جواب نہ دے سکی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اصلیت کو کھول دیا جائے تاکہ جس کسی نے بھی میرے باپ کو قتل کیا ہے اسے گرفتار کیا جائے اور اسے سزا دی جائے۔ میں نہیں جانتی کہ سردار مانجی خان میرے خنجر کے وار سے ہلاک ہو چکا ہے یا محض زخمی ہوا ہے۔ میرے لئے آپ جو سزا تجویز کریں گے مجھے منظور ہے''۔

گل وتوژ چپ ہوگئی تھی۔ سب لوگ اس کی باتیں سن کر انگشت بدنداں تھے۔ اگر گل وتوژ نے اپنے باپ کو قتل نہیں کیا ہے تو پھر تونائی خان کو کس نے قتل کیا ہے؟ منگول منصف نئی صورتِ حال سن کر سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اس نے کوتوال کو ہدایت کی کہ وہ اس مقدمے کی دوبارہ تفتیش کرے اور لڑکی کے بیان کے مطابق ازقائی قبیلے میں مانجی خان کی بابت تمام حالات معلوم کئے جائیں۔ تمام تحقیقات مکمل ہونے پر ہی دوبارہ مقدمہ پیش کیا جائے۔ گل وتوژ کو ابھی نظر بند رکھا جائے۔ اس معاملے کی مکمل چھان بین کے بعد ہی اس کا فیصلہ کیا جائے گا۔ منگول منصف کے فیصلے کے بعد کوتوالِ شہر نے گل وتوژ کو دوبارہ تاریک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ وہ اب نئے خطوط پر قتل کی تحقیقات کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔



خیمے میں گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ سب لوگ سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ ایسے حالات میں کیا کیا جائے؟ سلطان ملک الصالح نجم الدین ایوب کی اچانک وفات سے کئی مسائل سر اُٹھاتے دکھائی دے رہے تھے۔ سامنے طاقتور صلیبی لشکر خیمہ زن تھا جو کہ فیصلہ کن معرکہ لڑنے کا تہیہ کئے ہوئے تھا۔ بلادِ مصر سے لے کر ارضِ مقدس تک ایک طاقتور نصرانی مملکت کا قیام اس کا عزم تھا۔ نجم الدین ایوب نے اپنے دس سالہ عہد حکومت میں حکومتی ڈھانچے کو مضبوط بنائے رکھا تھا۔ اس نے اندرونی شورشوں کو دبانے کے ساتھ ساتھ ایوبی خاندان کے شہزادوں اور سلطانوں کو مٹھی میں لے رکھا تھا۔ ان میں سے بیشتر ایسے لوگ تھے جو کہ اپنی حکمرانی کی خواہش دل میں لئے پھرتے تھے۔ ایسے وقت میں نجم الدین ایوب کی وفات ان کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کر سکتی تھی۔ نصرانی لشکر کی موجودگی میں ان ایوبی شہزادوں کا انتشار اسلامی سلطنت کو ناقابل یقین حد تک مشکلات سے دوچار کر سکتا تھا۔ ملکہ شجرۃ الدر نے حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے سلطان نجم الدین ایوب کے خیمے پر کڑا پہرہ لگا دیا تھا۔ خاص معتمد افراد ہی خیمے میں داخل ہو سکتے تھے۔ بیبرس، نجم الدین ایوب کا خاص غلام ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے حفاظتی دستے کا امیر بھی تھا۔ یہ ذمہ داری اس کے کندھوں پر ڈالی گئی۔ وہ خود صدمے سے نڈھال ہوا جا رہا تھا۔ اس کے شفیق اور مہربان آقا کا سایہ اس کے سر سے ہمیشہ کے لئے اُٹھ چکا تھا۔ وہ اس بھری دنیا میں خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔ ملکہ شجرۃ الدر نے اسے خصوصاً ہدایت کی تھی کہ وہ نہ صرف اپنے جذبات کو قابو میں رکھے بلکہ ہر ممکن کوشش کرے کہ سلطان کی وفات کی خبر کسی قیمت پر بھی اس خیمے سے باہر نہ نکل سکے۔ اسے ایسے امرا اور رئیسانِ مصر و شام کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آنے کی بھی کھلی اجازت دے دی گئی تھی جو نجم الدین ایوب سے ملنے کی ضد کریں۔ بیبرس نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ پاتا۔ اس نے

آنسوؤں کو سمیٹنے کے لئے آنکھوں کی دکھن کا بہانہ کیا ہوا تھا کہ شاید ایسے ہی اس کے دل کا غبار نکل رہا ہے۔ کئی امرا نے اس کا بہانہ سن کر اسے آرام کرنے کا مشورہ بھی دیا مگر اس نے اپنے فرض سے کوتاہی مناسب نہ سمجھنے کا جواز پیش کر کے انہیں خاموش کر دیا تھا۔ ملکہ شجرۃ الدر نے سب سے پہلے بحری مملوک امرا کے ساتھ، جو کہ نجم الدین ایوب کے قریبی ساتھی تھے، مشورہ کر کے نجم الدین ایوب کے جواں سال بیٹے توران شاہ کو بلوا بھیجا۔ توران شاہ ملکہ شجرۃ الدر کا سوتیلا بیٹا تھا۔ نجم الدین ایوب کے بعد یہی ایک ایسا نوجوان تھا جسے امورِ جہانبانی کی کسی حد تک سمجھ بوجھ تھی۔ ملکہ شجرۃ الدر کا حقیقی بیٹا خلیل کم عمری میں ہی علالت کے باعث وفات پا چکا تھا۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو شاید ملکہ شجرۃ الدر تاجِ حکمرانی اس کے سر پر رکھنے کے بارے میں سوچتی۔ لشکر میں ابھی تک سلطان نجم الدین ایوب کی شدید علالت کی خبریں زیر بحث تھیں۔ سپاہی دن رات اپنے مہربان سلطان کی صحت یابی کے لئے دعائیں مانگتے۔ حکومتی امرا اور رئیس نصرانی لشکر کی موجودگی کے باعث سخت بے چین تھے۔ انہیں ایسے میں سلطان سے ملاقات کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی مگر خیمے کے محافظ انہیں خیمے کے نزدیک بھی پھٹکنے نہ دیتے۔ ان کا بس یہی جواب تھا کہ یہ سلطان کا اپنا حکم ہے کہ انہیں مکمل آرام کی سخت ضرورت ہے لہٰذا انہیں آرام کرنے دیا جائے۔ ضرورت پڑنے پر وہ خود ہی ملاقات کریں گے۔

''ملکہ عالیہ.....!'' فارس الدین اقطائی مؤدب لہجے میں بولا۔ ''آخر ہم یہ کب تک چھپائیں رکھیں گے کہ سلطان اب دنیا میں نہیں رہے؟''

''اقطائی.....! ہم سمجھتے ہیں کہ صورتِ حال بے حد تشویش ناک ہے مگر ہمیں یہ خبر تب تک پوشیدہ رکھنی ہے جب تک توران شاہ یہاں نہیں پہنچ جاتا''۔

''ملکہ عالیہ.....!'' بہاء الدین زہیر بے تابی سے بولا۔ ''توران شاہ تو حصین کیفا میں ہے۔ اسے یہاں پہنچنے میں کم از کم بارہ دن لگ سکتے ہیں۔ دیگر امرا بار بار سلطان سے ملنے کی ضد کر رہے ہیں انہیں ایسے کب تک روکا جا سکتا ہے؟ دوسرا سلطان کی میت کو فوری طور پر دفنانا ضروری ہے۔ زیادہ دن تک طبیب اُسے نہیں سنبھال سکے گا''۔

''تمہارا کہنا بجا ہے مگر میں اپنے طور پر کچھ نہیں کر سکتی۔ جب تک توران شاہ خود نہ پہنچ جائے سلطان کی میت کو دفنا دینا نئے فساد کو جنم دینے کے مترادف ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ امرا کے مسائل کو آپ لوگ سن کر ان کی تشفی کرتے رہیں تاکہ انہیں سلطان سے ملاقات کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو''۔

''ملکہ عالیہ.....! یہ ممکن نہیں ہے۔ امرا کا حلقہ ہماری بات سے مطمئن نہیں ہوتا۔ انہیں سلطان کے منہ سے جواب سننے کی عادت ہے۔ جب تک سلطان ان کے سامنے نہیں جائیں گے وہ ایسی ہی بے یقینی کا مظاہرہ کرتے رہیں گے۔ اگر انہیں زیادہ دیر تک ملاقات سے روکا گیا تو ممکن ہے کہ کچھ فسادی امرا افواہوں کا بازار گرم کر دیں۔ اس وقت کوئی بھی الٹی سیدھی افواہ مسلمان سپاہیوں کے حوصلے پست کرنے کے لئے کافی ثابت ہو سکتی ہے''۔ احمد طولائی نے کہا۔

''ایسے حالات میں تو میں صرف اتنا ہی کر سکتی ہوں کہ سلطان کی میت کو نہایت خاموشی سے یہاں سے ہٹا دیا جائے اور لشکر میں یہ مشہور کر دیا جائے کہ طبیب کے مشورے کے باعث انہیں دس بارہ دن کے لئے منصورہ کے سرکاری طبیب خانے میں منتقل کر دیا گیا ہے، یہاں کی آب و ہوا انہیں موافق نہیں''۔

''یہ خیال بالکل صحیح ہے''۔ رئیس العساکر جاشنکیر ایبک نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''اس طرح امرا میں بددلی پھیلنے کا اندیشہ ٹل جائے گا۔ بس یہ حکم سنانا پڑے گا کہ سلطان کی سختی سے ہدایت ہے کہ کوئی فرد میدان جنگ

سے اتنی دیر تک نہیں ہٹ سکتا، جب تک سلطان صحت یاب ہو کر واپس نہ لوٹ آئیں۔ اس طرح امرأ کا غول ان کے تعاقب میں منصورہ جانے سے بھی گریز کرے گا۔ ایک چھوٹا سا دستہ سرکاری طبیب خانے میں تعینات کر دیا جائے تاکہ کسی کو شک بھی نہ ہو سکے اور دوسرا چند سپاہیوں کو اس مقام پر عام لباس میں مقرر کر دیا جائے جہاں سلطان کی میت رکھی جائے گی تاکہ کسی کو شک بھی نہ گذرے اور حالات ہمارے قابو میں رہیں''۔

''ملکہ عالیہ......!'' ابوخولید نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔ ''میرے منہ میں خاک، خدانخواستہ نصرانی لشکر نے ان حالات میں حملہ کر دیا تو پھر کیا کیا جائے گا......؟''

''غلام زادے......!'' رئیس العساکر جاشنگیر ایک طنزیہ لہجے میں گویا ہوا۔ ''کڑے حالات میں بھی ہم دشمن کا منہ توڑ دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں''۔

''امیر عساکر......! مجھے سپاہوں کی صلاحیتوں پر کوئی شک نہیں مگر سپاہی سلطان کو اپنے ساتھ دیکھ کر پرجوش ہو جاتے ہیں۔ یہ ان کے لئے پہلا موقعہ ہوگا کہ وہ سلطان کو اپنے ساتھ نہیں پائیں گے''۔

''تم لوگ اس مسئلے پر آپس میں بحث مت کرو۔ میں جنگ کے معاملے کو اتنی دیر تک سنبھال لوں گا جب تک نئے سلطان کا تقرر نہیں ہو جاتا''۔ بہاء الدین زہیر نے بدمزگی پیدا ہوتے دیکھ کر جلدی سے کہا۔ ملکہ شجرۃ الدر ان دونوں افراد کے درمیان مداخلت کرنے والی تھی کہ بہاء الدین زہیر کی بات سن کر وہ خاموش رہی۔ کڑواہٹ والا موضوع ختم ہو گیا تو ملکہ شجرۃ الدر نے جنگ اور سپاہیوں کے حوالے سے کچھ حکم جاری کئے اور یہ طے پایا کہ میت کو آج رات ہی منصورہ کی جامع مسجد میں پہنچا دیا جائے۔ توران شاہ کی آمد پر اسے فوراً قاہرہ لے جایا جائے اور کفن دفن کا اہتمام کیا جائے۔ میدان جنگ کے معاملات کو نیا سلطان خود سنبھال لے گا۔



مطیع الدین درّے کے الٹی جانب کئی میل دور نکل آیا تھا۔ وہ تیز رفتاری سے سفر کرتا ہوا ایک چٹیل پہاڑ پر پہنچ گیا تھا۔ یہاں سے دوسری جانب کا منظر اسے دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے گھوڑے سے اتر کر دوسری جانب پھیلے ہوئے پتھریلے میدان میں نگاہ دوڑائی جہاں کہیں کہیں سبزہ موجود تھا۔ اس کی نگاہ گھومتی ہوئی ایک خاص مقام پر ٹھہر گئی اور وہ چونک کر اس مقام کو غور سے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ خیموں کا جھرمٹ تھا جو کہ کافی فاصلے پر اسے دھندلے دھبے کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو ہاتھ سے ڈھانپ کر ان خیموں کو صحیح طرح دیکھنے کی کوشش کی۔ اچانک اسے اپنے رگ و پے میں بجلی کی سی لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔ وہ پہچان گیا تھا کہ ان خیموں کی بناوٹ منگولوں کے خیموں جیسی تھی۔ اس نے دل میں سوچا کہ کیا وہ واقعی منگولیانہ ریاست کے قریب پہنچ گیا ہے۔ ان خیموں میں منگولوں کا کون سا قبیلہ ہو سکتا تھا، اس بارے میں کچھ اندازہ لگانا مشکل تھا۔ مطیع الدین نے گھوڑے کی پیٹھ تھپتھپائی اور کچھ لمحوں کے لئے اسے چھوڑ دیا۔ وہ اس چٹیل پہاڑ پر چڑھتے وقت سوچ رہا تھا کہ گھوڑے کو آرام ملنا چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ گھوڑے سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے۔ سرائے تک پیدل پہنچنا اس کے بس کا کام نہیں تھا۔ اگر وہ قبیلہ انسانیت سے روشناس ہوا تو ممکن ہے کہ اسے کچھ دنوں کے لئے سہارا مل جائے اور سرائے کی جانب جانے والے صحیح راستے کا پتہ بھی چل جائے۔ وہ ایک بڑے پتھر سے ٹیک لگا کر ستانے لگا۔ اسی لمحے اچانک اس کے ذہن میں تاتاری باشندوں کا خیال کوندا۔ وہ اس کی تلاش میں تعاقب کرتے ہوئے کہاں تک پہنچ چکے ہوں گے۔ اس نے اپنی گردن جیتانی سرزمین کی جانب دوڑائی۔ وہ بڑے انہاک سے دور تک مشاہدہ کر رہا تھا کہ کہیں کوئی حرکت ہو تو اس کی نگاہ میں آ جائے۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکان پھیل گئی۔ اسے تاتاری سردار کا کھوکھلا دعویٰ یاد آنے لگا جو کہ اسے اپنا شکار بنانے کا منصوبہ بنائے کہیں

بھٹک رہا ہوگا۔ اچانک اسے پہاڑ کی ایک جانب سے کسی قسم کی حرکت کا احساس ہوا اور وہ تیزی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے پرسکون چہرے پر سراسیمگی پھیلنے لگی۔ اس نے تلوار نیام سے نکال کر دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لی تھی۔ وہ قدرے جھکے ہوئے انداز میں اس جانب بڑھ گیا جہاں حرکت کا شبہ ہوا تھا۔ وہ جگہ پہاڑ سے نیچے کی جانب جانے والا کوئی راستہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کے ذہن میں تاتاری قبیلہ چھایا ہوا تھا۔ وہ منگول قبیلے کی جانب جانے سے پہلے ان سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے خود کو تیار کر چکا تھا۔ وہ سست روی سے اس نیچے جانے والے رستے کے قریب پہنچ گیا۔ اس کی نگاہیں پوری طرح چوکنا تھیں اچانک اسے اپنے جسم پر پہاڑ گرتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ جو کچھ بھی تھا اُس کی عقبی جانب سے جسم پر آن پڑا تھا۔ مطیع الدین اس بوجھ سے غیر متوازن سا ہو گیا اور لڑکھڑاتے ہوئے گر گیا۔ وہ پہاڑ سے نیچے کی جانب جانے والے رستے پر قلابازیاں کھانے لگا۔ اچانک کسی پتھر سے اس کا سر ٹکرایا اور اس کے ہوش و حواس گم ہونے لگے۔ مطیع الدین نے بڑی کوشش کی کہ وہ سنبھل جائے اور خود کو تاریکی کے سمندر میں ڈوبنے سے بچا لے مگر وقت کو ایسا منظور نہیں تھا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔



قابع ارسفند منصورہ کا رہنے والا تھا۔ اس کی عمر تقریباً اڑتیس برس تھی۔ اس کی تمام زندگی محنت و مشقت کی چکی پیستے گذری تھی۔ وہ خوشحال گھرانے کا فرد تو تھا نہیں کہ کچھ عرصہ اچھے دن دیکھ پاتا۔ اس کے پاس کوئی ہنر بھی نہیں تھا کہ کوئی صحیح راہ متعین کر پاتا۔ اسی لئے اُس نے دھوکا دہی اور فریب کا پیشہ اپنا لیا تھا۔ وہ دولتمند و متمول لوگوں کے لئے مختلف مقدمات میں جھوٹی شہادت فراہم کرتا اور بددیانت امرأ کے پاس چند ٹکوں کے لئے اپنا ایمان بیچ ڈالتا۔ یہ اتفاق تھا کہ اس کا گھر منصورہ کی جامع مسجد کے بالکل سامنے تھا۔ مسجد کے واعظ بھی اسے راہِ راست پر نہ لا سکے۔ وہ جب انہیں سنا کرتا تو حقارت بھری مسکان سے انہیں فریب اور سراب کے نام دیتا۔ وہ جامع مسجد کے امام اور موذن کو اپنے سے بڑا فریبی کہا کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ فریبی لوگوں کو بہلا پھسلا کر ان کا مال بٹورتے ہیں، اور تو اور حکومت سے بھی سرکاری وظیفے حاصل کرتے ہیں۔ اگر وہ کسی ''مستحق'' کے لئے جھوٹ بول کر اسے فائدہ پہنچا دیتا ہے تو اس میں کیا برائی ہے۔ وہ جھوٹ گھڑتا ہے تو کسی کی بھلائی کے لئے، انہیں بیوقوف بنانے کے لئے تو نہیں۔ یہ اس کا اپنا فلسفہ تھا۔

وہ کئی دن سے کچھ اجنبی لوگوں کو مسجد کے صحن و دروازے پر دیکھ رہا تھا۔ ان کی دن رات وہاں موجودگی اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ وہ تجسس سے کئی بار ان کے قریب پہنچا اور ان سے وہاں ٹھہرنے کا مدعا پوچھنے کی کوشش کی۔ انہوں نے مسافر کہہ کر اسے ٹال دیا مگر وہ ان کے بیان سے مطمئن نہیں ہو سکا۔ اسے یقین تھا کہ جامع مسجد میں ان لوگوں کی موجودگی کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہے۔ اس کے ذہن میں یہ خیال پنپ رہا تھا کہ یہ لوگ کسی نہ کسی سازشی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو کہ کسی خاص مہم پر یہاں آئے ہیں۔ اس نے حب الوطنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کوتوالی میں بھی ان لوگوں کی شکایت کی مگر الٹا کوتوالی کے امیر نے اسے سختی سے ڈانٹ پلائی کہ اسے اس معاملے میں دلچسپی لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ خود ان کی نگرانی کر رہا ہے۔ کوتوال شہر کے غیر تسلی بخش رویے نے اس کے شک کو مزید پختہ کر دیا تھا کہ واقعی کوئی بڑی گڑبڑ ہے۔ حالات ویسے نہیں ہیں جیسے وہ سمجھ رہا تھا۔ یہ معاملہ اس کی سمجھ سے بالاتر بنتا جا رہا تھا۔ پھر اُس دن تو وہ واقعی چونک اُٹھا جب ایک بوڑھا شخص وہاں مستقل ہی مقیم ہو گیا۔ وہ بوڑھا شخص مسجد کے حجرے کے دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے سارا سارا دن وہیں بیٹھا رہتا۔ بس نماز اور وضو کے لئے ہی وہ وہاں سے چند لمحوں کے لئے ہٹتا۔ جب وہ وہاں سے ہٹ جاتا تو اس کی جگہ ایک دوسرا آدمی لے لیتا۔ قابع ارسفند نے دو تین دن لگاتار مختلف اوقات میں ان کے معمول کا جائزہ لیا تو کچھ کچھ اس کی

سمجھ میں آنے لگا کہ اصل راز حجرے کے اندر موجود ہے جس کی حفاظت کی جا رہی ہے۔ حجرے کے اندر کیا تھا؟ اسی بات کا پتہ لگانا اس کا مقصد بن گیا۔ یہ تجسس کا غلبہ ہی تھا کہ وہ پانچوں وقت باقاعدگی سے مسجد میں پہنچ جاتا کرتا۔ نماز پڑھنا تو محض بہانہ تھا۔ بوڑھے شخص کے بارے میں جب اسے یہ پتہ چلا کہ وہ مسجد کے مؤذن کا باپ ہے اور آخری ایام بیٹے کے پاس گذارنے کے لیے وہاں آیا ہے تو اس کا چہرہ حیرت کی تصویر بن گیا۔ بوڑھے شخص نے محافظوں کو قابع ارسفند کی جانب سے چوکنا رہنے کی ہدایت کر رکھی تھی مگر محافظ بوڑھے شخص کے شک پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ایک ہفتہ ایسے ہی گذر گیا۔ قابع ارسفند اپنے تجسس کی تسکین میں بری طرح ناکام رہا تھا۔ اس نے اجنبی افراد کی موجودگی کے اوقات کی مکمل فہرست بھی تیار کر لی تھی کہ کون سے وقت وہاں کون سا فرد موجود ہوتا ہے اور ان افراد کے مشاغل کیا کیا ہیں؟ علاوہ ازیں اس نے رات کے محافظوں کے اونگھنے کا مخصوص وقت بھی اپنی فہرست میں درج کر رکھا تھا۔ وہ اس عرصے میں کوئی سراغ پا سکتا تھا بس وہ بوڑھا شخص آڑے آ جاتا تھا جو کہ رات بھر اونگھتے ہوئے معمولی سے کھٹکے سے چوکنا ہو جاتا تھا۔

سوموار کا دن تھا کہ اس کی لگاتار محنت رنگ لے آئی۔ وہ بوڑھا آج اسے شام سے ہی مسجد میں دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں اس کے بارے میں پوچھا تو کسی نے جواب دیا کہ وہ کئی دن سے بیمار تھا اور طبیعت زیادہ بگڑنے پر اسے سرکاری طبیب خانے بھجوا دیا گیا ہے۔ قابع ارسفند نے رات کے دوسرے پہر تک اس کا انتظار کیا مگر وہ واپس نہیں لوٹا۔ جب اسے کامل یقین ہو گیا کہ بوڑھا شخص آج واپس نہیں آئے گا تو اس نے آج رات اس راز کا پتہ لگانے کا تہیہ کر لیا جو کئی دنوں سے اسے بے چین کئے ہوئے تھا۔



مطیع الدین کو منہ میں کسیلے ذائقے کا احساس ہوا تو اس کے حواس بیدار ہونے لگے۔ اس کے جسم کا حال کچھ ایسا تھا کہ جیسے کسی نے اسے چکی کے پاٹوں میں رکھ کر پیس ڈالا ہو۔ مطیع الدین کراہتے ہوئے اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک اس کے ذہن کے پردے پر بے ہوشی سے پہلے کی ناگہانی صورت حال گردش کرنے لگی۔ اس پر کوئی بھاری بھرکم چیز گری تھی جس نے اس کا توازن بگاڑ ڈالا اور وہ پہاڑ کے زیریں رستے پر پٹخنیاں کھاتا ہوا گرتا چلا گیا تھا۔

اس نے گردن گھمانے کی کوشش کی تو گردن کی رگیں جھنجھنا اٹھیں۔ وہ محض کراہ کر رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے جسم کی قوت کو بحال کرنے کی کوشش کی اور ہمت کر کے بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا۔ بیٹھنے کے بعد اس نے نظریں گھمائیں تو حیرت سے لب کھلے رہ گئے۔ وہ پہاڑی کے اسی پتھر کے ساتھ ٹیک لگائے لیٹا ہوا تھا جہاں اسے کسی قسم کی حرکت کا احساس ہوا تھا۔ نیچے کی طرف جانے والا راستہ اسے اپنے سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ مطیع الدین نے دائیں بائیں بھی دیکھا مگر وہاں اسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ تو نیچے گر گیا تھا، پھر اوپر کیسے آن پہنچا؟ یقیناً کوئی نہ کوئی ضرور یہاں موجود ہے۔ تھوڑی دیر میں کھڑا ہو چکا تھا۔ جسم میں شدید درد پھیلا ہوا تھا۔ کسی خیال کے پیش نظر مطیع الدین نے اپنے جسم کو ٹٹولا اور جسم پر کوئی زخم نہ پا کر مطمئن ہو گیا البتہ ہلکی پھلکی خراشیں گھٹنوں اور کہنیوں پر موجود تھیں۔ وہ اپنے جسم کو ہلکے پھلکے انداز میں حرکت دینے لگا۔ اسے اس بات کا اندازہ تھا کہ وہ ابھی تک دشمن کی حدود میں ہے۔ قاڑی باشندے اسے تلاش کرتے ہوئے یہاں کسی بھی وقت پہنچ سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں اسے خود پر گرنے والی اس بھاری بھرکم چیز کو تلاش کرنا تھا۔ وہ تھوڑی ہی دیر میں اس قابل ہو گیا کہ آسانی سے چہل قدمی کر سکتا تھا۔ مطیع الدین نے اپنے دائیں بائیں اس نامعلوم وزنی چیز کو تلاش کرنے کی بے حد کوشش کی مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔ اچانک اسے اپنے گھوڑے کا خیال آیا۔ گھوڑے کا دور دور تک

پتہ نہیں تھا۔ گھوڑے کی غیر موجودگی نے اسے لمحہ بھر میں حواس باختہ کر ڈالا، گھوڑے کے بغیر تو سفر جاری رکھنا اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ اس نے نگاہ اُٹھا کر سفید خیموں کے جھرمٹ کی جانب دیکھا تو قدرے اطمینان ہوا۔ خیموں کا جھرمٹ اپنی جگہ موجود تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اس قبیلے تک پہنچ کر مدد حاصل کر سکتا تھا۔ یہ علیحدہ بات تھی کہ اسے اس قبیلے سے بھی خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔

مطیع الدین نے اللہ کا نام لے کر پہاڑ سے نیچے اترنے کا عزم کیا اور منگول قبیلے کی جانب قدم بڑھا دیا۔ وہ اب دن ڈھلنے سے پہلے پہلے اس قبیلے تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وہ نیچے اترنے والے پتھریلے راستے پر سست روی سے رواں تھا۔ بکھرے پتھروں کے ریزوں پر کسی بھی وقت پھسل جانے کا امکان تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نہایت احتیاط برت رہا تھا۔ اچانک عقبی جانب سے بلند ہونے والی ایک تیز آواز نے اسے چونکا دیا، مطیع الدین مشینی انداز میں عقبی جانب گھومتا چلا گیا، پہاڑ کی سطح کافی دور تھی مگر جو کچھ اسے وہاں دکھائی دے رہا تھا، اس کی سٹی گم کر دینے کے لئے کافی تھا۔



قابع ارسفند نے خاموشی سے سیاہ لباس پہنا اور چہرے پر سیاہ رومال لپیٹا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ وقت ان محافظوں کے اونگھنے کا ہے۔ وہ انہی لمحات سے فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا۔ وہ نہایت خاموشی سے اپنے کمرے کی بالکونی کے ذریعے جامع مسجد کے ساتھ برگد کے واحد درخت پر چڑھا۔ یہ درخت اس کے گھر کو مسجد سے ملانے کا کام کرتا تھا۔ وہ برگد پر جھولتا ہوا تھوڑی سی محنت کے بعد مسجد کی دیوار تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ مسجد کے صدر دروازے سے وہ اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ان دنوں مسجد کے صدر دروازے پر رات کے وقت بڑا سا قفل ڈال دیا جاتا تھا۔ دیوار پر پہنچنے کے بعد وضو خانے تک پہنچ گیا۔ وضو خانے کے قریب دو محافظ موجود تھے جو کہ نیند کی آغوش میں پہنچ چکے تھے۔ شاید محافظوں کو یقین تھا کہ جامع مسجد میں بھلا رات کے وقت کس نے داخل ہونا ہے؟ جبکہ مسجد بھی بند تھی۔ قابع ارسفند پوری احتیاط برت رہا تھا۔ وہ آواز پیدا کئے بغیر فرش پر اتر آیا۔ وہ دائیں بائیں جائزہ لیتا ہوا حجرے کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ حجرے کے پاس چھوٹی سی مشعل روشن تھی۔ مسجد میں اندھیرا اس قدر تھا کہ سیاہ لباس میں اس کا دکھائی دینا محال تھا۔ وہ حجرے کے دروازے کی اوٹ میں دیوار کے ساتھ لگا کچھ دیر تک یونہی کھڑا رہا۔ جب اسے کسی قسم کا کھٹکا محسوس نہ ہوا تو اس نے دھیرے سے دروازے کو اندر کی جانب دھکیلا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ قابع ارسفند کی سانس تیز تیز چلنے لگی۔ وہ دروازے سے ہٹ کر کچھ دیر تک دبکا رہا کہ اگر کوئی اندر موجود ہے تو وہ باہر نکل آئے۔ مگر جب دیر تک کوئی جواب نہ ملا تو اس نے ہمت کر کے حجرے کے دروازے کو مکمل طور پر کھول دیا اور سرعت کے ساتھ اندر گھس گیا۔

حجرے کے اندر پہنچ کر اس نے اپنی آنکھوں کو اچھی طرح جھپکا۔ حجرہ مکمل طور پر تاریک تھا۔ اُس نے کچھ دیر تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی سعی کی مگر کچھ دیکھنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ جس راز کو جاننے کے لئے وہ وہاں پہنچا تھا، وہ ابھی تک اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اس نے آخری داؤ کے طور پر باہر لگی ہوئی مشعل اندر لانے کا فیصلہ کیا۔ وہ اب خود کو ہر قسم کے حالات سے نبٹنے کے لیے تیار کر چکا تھا۔ وہ حجرے سے باہر نکلا اور محافظوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے اس نے آہستہ سے مشعل اتاری اور پھر تیزی سے مشعل سمیت حجرے میں داخل ہو گیا۔ اندر پہنچتے ہی اس کا رنگ یکدم پھیکا پڑ گیا۔ وہاں ایک چارپائی پر کوئی شخص سفید چادر لپیٹے سو رہا تھا۔ پل بھر کے لئے تو قابع ارسفند کی سٹی گم ہو گئی تھی۔ اس نے سوئے ہوئے شخص میں کوئی حرکت نہ پا کر اپنی ہمت کو دوبارہ مستحکم کیا اور دبے پاؤں اس کے قریب پہنچا۔ اچانک اسے عجیب سا احساس ہوا کہ وہ اتنی دیر حجرے کے گرد طرح طرح کی

حرکتیں کر رہا تھا پھر بھی اس سوئے شخص کی آنکھ نہیں کھلی۔ پھر جب وہ مشعل حجرے میں لے آیا تو بھی اس کے جسم میں کسمساہٹ پیدا نہیں ہوئی۔ اس نے مشعل دیوار کے طاق پر ٹانگی اور اس سوئے شخص کے سر کی جانب پہنچ گیا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس نے قریباً کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چادر کا کنارہ سرکایا۔ سر کے بال اسے دکھائی دینے لگے۔ وہ ٹھہر کر جوابی ردعمل کا انتظار کرنے لگا۔ کسی حرکت کو نہ پا کر اس نے سفید چادر کو اتنا سرکا ڈالا کہ اب چہرہ بھی صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا نہایت گہری نیند سویا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ قدرے جھک کر اس شخص کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ کوئی اجنبی تھا۔ قابع ارسفند نے پہلے کبھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سا سکوت اور جلد کی سفیدی دیکھ کر وہ کچھ خوفزدہ سا ہونے لگا۔ پھر اچانک اسے احساس ہوا کہ سوئے ہوئے شخص میں زندگی کی رمق باقی نہیں ہے۔ اس نے تنفس کی آمدورفت محسوس کرنے کے لئے اپنا ہاتھ دھیرے سے اس کی ناک کے پاس کیا مگر سانس ہوتی تو اس کے ہاتھ سے ٹکراتی۔ جب اسے مکمل یقین ہوگیا کہ یہ لاش ہے تو ایک لمحے کے لئے اسے شدید خوف محسوس ہوا لیکن فوراً ہی اس کا تجسس خوف پر غالب آ گیا بلکہ تجسس سے زیادہ اسے اس بات پر حیرت تھی کہ ایک لاش کی اتنی کڑی حفاظت کی کیا ضرورت ہے اور دوسرا اُسے دفن کرنے کے بجائے یہاں رکھنے کی کیا تک ہے؟ اب وہ بے فکری سے اس لاش کا جائزہ لینے لگا۔ جب اس کی نگاہ لاش کے ہاتھ میں پہنی ہوئی قیمتی انگوٹھیوں پر پڑی تو اس کا دل باغ باغ ہوگیا۔ اس نے تیزی سے ایک قیمتی انگوٹھی اتار لی۔ وہ چاہتا تو تمام انگوٹھیاں اتار سکتا تھا مگر اس نے ایک ہی انگوٹھی کو غنیمت سمجھا تھا۔ اچانک اسے کسی کھٹکے کی آواز سنائی دی تو وہ بوکھلا اُٹھا۔ اس نے تیزی سے سر باہر نکال کر دیکھا تو اسے اندازہ ہوگیا کہ کوئی مسجد کے باہر موجود ہے۔ یکایک بوڑھے شخص کا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ وہ عجلت میں حجرے سے باہر نکلا اور قریباً بھاگتے ہوئے وضو خانے کی جانب بڑھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ محافظ گہری نیند سو رہے تھے۔ دیوار میں بنے طاقچوں میں سے ایک پر پاؤں جما کر وہ دیوار پر چڑھا اور احتیاط سے بڑھتا ہوا برگد کے درخت تک پہنچ گیا۔ اسی لمحے مسجد کے صدر دروازے کے کھلنے کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ اس نے جان بچ جانے پر شکر ادا کیا۔ کچھ ہی لمحوں میں وہ اپنی بالکونی میں موجود کھڑا گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اس نے اپنی کھڑکی کی درز میں سے مسجد کی جانب نگاہ ڈالی۔ اس کے اندازے کے مطابق بوڑھا شخص ہی وہاں پہنچا تھا جو کہ محافظوں پر برستا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ مسجد میں کھلبلی مچی محسوس کر کے اس کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ اس نے پہلی فرصت میں لاش کے ہاتھ سے اتاری قیمتی انگوٹھی کو فرش کے چور خانے میں محفوظ کیا تھا۔



توران شاہ سلطان نجم الدین کے حکم پر حصین کیفا آیا تھا۔ یہاں کے امیر نے بغاوت کا علم بلند کر دیا جس پر سلطان نجم الدین ایوب نے ایک لشکر کے ساتھ اسے اس باغی امیر کی سرکوبی کے لئے یہاں بھیج دیا۔ باغی امیر کو شکست دینے کے بعد اسے گرفتار کر کے سلطان کی خدمت میں بھیج دیا گیا تھا۔ پھر اسے یہ حکم موصول ہوا کہ وہ حصین کیفا میں ہی رُکے اور وہاں کا انتظام سنبھال لے۔ جب اسے صلیبی لشکر کی آمد کا علم ہوا تو اس نے اپنے باپ سلطان نجم الدین کی خدمت میں عرض پیش کی کہ یہ مہم اسے سونپی جائے لیکن سلطان نجم الدین ایوب نے اُسے وہیں ٹھہرنے کا حکم دے کر خود صلیبی لشکر کی طرف روانہ ہوگیا تھا۔ جب اسے اطلاع ملی کہ منصورہ میں اس کا باپ شدید علالت کے باعث وفات پا چکا ہے اور صلیبی لشکر ان کے سامنے خیمہ زن ہے، علاوہ ازیں ملکہ شجرۃ الدر کی خواہش ہے کہ سلطانی کا بار اس کے کندھوں ڈال دیا جائے تو اس نے اپنے مملوک امرا کو تمام حالات سے آگاہ کرتے ہوئے فوری روانگی کا حکم دیا۔

یہ عجیب اتفاق تھا کہ سلطان نجم الدین ایوب کے امرا میں ان مملوکوں کی تعداد زیادہ تھی جو بحری مملوک کہلاتے تھے جبکہ توران شاہ کے امرا میں مملوکوں کا وہ گروہ شامل تھا جو برجی مملوک کہلاتے تھے۔ برجی مملوکوں میں سب سے قابل اور معزز امیر برکیارک تھا۔ اسے توران شاہ کا دست راست کہا جاتا تھا۔ برکیارک نے توران شاہ کو اس طرح اپنے حصار میں جکڑ رکھا تھا کہ کئی معاملات میں خود فیصلے سنا دیا کرتا اور توران شاہ چاہتے ہوئے بھی اس کے فیصلوں پر کوئی مزاحمت نہ کر پاتا۔ برکیارک بے حد ذہین اور زمانہ شناس شخص تھا۔ اس نے بہت پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ سلطان نجم الدین ایوب کے بعد کوئی طاقت توران شاہ کو سلطان بننے سے روک نہیں سکتی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ توران شاہ کے ساتھ رہا۔

سلطان نجم الدین ایوب کی وفات کی خبر سن کر اسے عجیب سی مسرت ہوئی پھر جب اسے یہ معلوم ہوا کہ توران شاہ کو نئے سلطان کے طور پر نامزد کر دیا گیا ہے اور تاجپوشی کے لئے فوری طور پر منصورہ میں بلایا گیا ہے تو اس کی عجلت دیکھنے کے لائق تھی۔ قریباً پندرہ ہزار سپاہ کے لشکر کے ساتھ توران شاہ حصین کیفا سے نکلا اور برق رفتاری سے منصورہ کی راہ لی۔ اس کے ہمراہ سپاہ کا جو لشکر تھا اس میں نو ہزار سے زیادہ برجی مملوک شامل تھے۔



برقائی خان اپنے چھوٹے سے لشکر کے ساتھ تیز رفتاری سے شمالی سرحد کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کا ہدف ضرگامی قبیلہ تھا جس کی سرکوبی کی ذمہ داری اس کے بھائی باتو خان نے اسے سونپی تھی۔ اس کے ساتھ سفر کرنے والا لشکر اس کی اس عادت سے نالاں تھا کہ برقائی خان مختصر وقفوں کے بعد پڑاؤ ڈالنے کے بجائے مسلسل سفر کرنے کو ترجیح دیتا تھا جبکہ سپاہ کو تھوڑے تھوڑے سفر کے بعد آرام کرنے کی عادت پڑ چکی تھی۔ وہ طوعاً و کرہاً اس کے ساتھ گھسٹ رہی تھی۔

برقائی خان سپاہ کے حال سے بھی خوب واقف تھا۔ وہ زیر لب ان کی ناگفتہ بہ حالت پر مسکراتا رہا اور اپنا سفر بھی جاری رکھا۔ وہ سپاہ کو مضبوط اور ہر دم توانا دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ چنگیز خان کی وفات کے بعد سپاہ کو کوئی ایسا بڑا معرکہ میسر نہیں آ پایا تھا کہ ان کی پھرتی و چستی برقرار رہ پاتی۔ چھوٹے چھوٹے معرکوں نے انہیں نکما کر ڈالا تھا۔ برقائی خان اپنے ساتھ رہنے والی سپاہ کو ازسرنو منظم اور پہلے جیسا توانا بنانے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ ضرگامی قبیلے کو بے خبری کے عالم میں گرفتار کرنے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی سپاہ کو قیام کے لئے بے حد کم وقت فراہم کرتا۔ اسے اس بات کا خوف تھا کہ لشکر کی آمد کی اطلاع قبل از وقت ضرگامی قبیلے کو نہ ہو جائے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو وہ پہاڑوں میں گم ہو جاتے اور پہاڑوں میں ان کو تلاش کرنا اور جنگ کرنا سپاہ کے حق میں بہتر نہیں تھا۔

کئی روز کے طویل سفر کے بعد وہ اس مقام تک پہنچ گئے جہاں ضرگامی قبیلے کے پڑاؤ کی اطلاع ملی تھی۔ وہاں جلی ہوئی لکڑیوں اور بکھری ہوئی بے کار اشیاء کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ برقائی خان نے اس جگہ کا بغور جائزہ لیا تو اسے یہ اندازہ لگانے میں ذرا مشکل نہیں ہوئی کہ ضرگامی قبیلہ اس جگہ کو کچھ دن پہلے تک استعمال کرتا رہا تھا۔ اس سے یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یا تو اسے منگول لشکر کی آمد کی بھنک پڑ گئی تھی جس کے باعث وہ یہاں سے کہیں اور روانہ ہوگیا تھا یا وہ اپنی مرضی سے خوراک کی تلاش میں آگے کی جانب نکل گیا ہے۔ برقائی خان خود گھوم پھر کر اس جگہ کو جانچنے میں مصروف تھا کہ اسے سپاہ میں موجود ایک کھوجی نے یہ اطلاع پہنچائی کہ اس نے ضرگامی قبیلے کے کوچ کی سمت تلاش کر لی ہے۔ برقائی خان اس کے ساتھ اس جگہ پہنچا جہاں کچھ ایسے نشانات ابھی تازہ تھے جو ضرگامی قبیلے کے سفر کی سمت کا اشارہ دے رہے تھے۔ برقائی خان نے لشکر میں موجود اس علاقے سے آشنائی رکھنے والے افراد کو طلب کیا اور اس سمت کے متعلق ضروری معلومات حاصل کیں۔ جب اسے یہ معلوم ہوا

کہ یہ رستہ جینائی سلطنت میں داخل ہونے والے واحد درّے کی جانب جاتا ہے تو اس کا ماتھا ٹھنک گیا۔ جینائی سلطنت کے زاروں کی منگولوں سے ذرا بھی نہیں بنتی تھی۔ منگولوں اور ان کے درمیان طویل سنگلاخ سرخ پہاڑی سلسلے کی دیوار ہی امن و امان کو قائم رکھے ہوئے تھی۔ چنگیز خان جب زندہ تھا تو صرف ایک بار اس پہاڑی سلسلے کو عبور کیا گیا تھا۔ دوبارہ اس جانب جانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔

برقائی خان نے اپنے لشکر کو ایک طویل صف میں آراستہ کیا اور جینائی سلطنت کی جانب پیش قدمی کرنا شروع کر دی۔ برقائی خان کو ضرگامی قبیلے کے ساتھ ساتھ جینائی لشکر سے مبارزت کا بھی اندیشہ تھا۔

تمام دن کی مسافت کے بعد برقائی خان ضرگامی قبیلے کے نئے ٹھکانے تک پہنچ گیا۔ اسے دور سے ہی سفید خیموں کا جھرمٹ دکھائی دیا تو اس نے سپاہ کی پیش قدمی روک دی اور پڑاؤ ڈالنے کا حکم دے دیا۔ لشکر تمام دن ضرگامی قبیلے کی تلاش میں سفر کرتے ہوئے تھکان محسوس کر رہا تھا۔ انہیں خدشہ تھا کہ برقائی خان کہیں اسی وقت حملے کا حکم نہ ٹھونس دے۔ خیمے لگانے میں خاصا وقت لگا۔ شام ہو چکی تھی۔ برقائی خان سوچ رہا تھا کہ وہ ضرگامی قبیلے کے بالکل قریب پہنچ چکا ہے، ممکن ہے کہ انہیں منگول لشکر کی آمد کا پتہ چل جائے اور وہ رات کی تاریکی میں ہی فرار ہو جائیں۔ اس کی باریک بیں نگاہوں نے لشکر کی خستہ حالی کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اسی لئے پڑاؤ کا حکم دیا گیا تھا۔ اگلی صبح تک سپاہ یقیناً تازہ دم ہو چکی ہوں گی۔ رات کے پہلے پہر میں برقائی خان کے خیمے میں اطلاع پہنچی کہ ضرگامی قبیلے کا سردار دیگر عمائدین کے ہمراہ شرف باریابی کا طلب گار ہے تو برقائی خان حیران رہ گیا۔ وہ ضرگامی قبیلے کی سرکوبی کے لئے اتنا سفر طے کر کے آیا تھا اور یہاں ماجرا ہی کچھ اور تھا۔ برقائی خان نے سپاہی کو حکم دیا کہ ان لوگوں کو اس کے خیمے میں بھیج دیا جائے۔ سپاہی حکم پا کر باہر نکل گیا اور برقائی خان یکایک پیدا ہونے والی نئی صورت حال کے بارے میں سوچنے لگا۔



ابوخویلد بے تابی اور تیز رفتاری سے جامع مسجد منصورہ کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اندر پہنچا۔ اندر پہنچنے پر اس کی نگاہ ایک محافظ پر پڑی جو کہ سر جھکائے غافل سا کھڑا تھا۔ ابوخویلد اس کے قریب آیا اور ایک زوردار چانٹا اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ محافظ ابوخویلد کی صورت دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ چانٹے سے زیادہ ابوخویلد کی شخصیت کا خوف اس کے چہرے پر طاری تھا۔

''بیبرس کہاں ہے ؟''

''اس طرف اندر !''

ابوخویلد نے اس پر تیز نگاہ ڈالتے ہوئے مسجد کے اندرونی حصے کی راہ لی۔ وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا مسجد کے حجرے کے پاس پہنچ گیا۔ حجرے کے قریب موجود بوڑھے شخص نے اس کی صورت دیکھی تو وہ چونک کر کھڑا ہو گیا۔ ابوخویلد ابھی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ بیبرس کی صورت اسے کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ مسجد میں چند ایک لوگ موجود تھے جو کہ نماز ادا کر رہے تھے۔ ابوخویلد نے مڑ کر دروازے کی جانب نگاہ دوڑائی، وہاں ایک محافظ کھڑا تھا۔ بوڑھا شخص نحیف قدموں سے ابوخویلد کی جانب بڑھا۔ ابوخویلد بوڑھے شخص کو اپنی جانب آتا دیکھ کر تیز نگاہوں سے اسے گھورنے لگا۔ وہ بوڑھا اس کے بالکل نزدیک آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ابوخویلد اب استفسارانہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''استاد محترم ! میں کل کے واقعے پر بے حد نادم ہوں، نادانی کے مرتکب محافظوں کو کوتوال کے پاس پہنچا دیا گیا ہے تاکہ حالات کی مناسبت سے ان کے بارے میں فیصلہ کیا جائے۔'' وہ بوڑھا شخص گھمبیر آواز میں

بولا۔ اس کی آواز سن کر ابوخویلد کا چہرہ حیرت کی تصویر بنا دکھائی دینے لگا۔ وہ بلاشبہ بیبرس کی ہی آواز تھی مگر دکھائی دینے والا چہرہ کسی اور کا تھا۔

''حت ! تم نے یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے ؟'' ابوخویلد حیران ہوتا ہوا بولا۔

''یہ وقت کا تقاضا ہی سمجھئے، میں نہیں چاہتا تھا کہ محافظ میری موجودگی سے باخبر ہیں۔ انہیں یہی معلوم ہو کہ میں یہاں موجود نہیں ہوں اور میں آقا کی نگرانی کے ساتھ ساتھ ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ بھی لیتا رہوں۔''

''مگر کل یہ سب کیسے ہوا ؟''

''مجھے کوتوال نے خبر دی تھی کہ دو امیر سلطان سے ملنے کے لئے طبیب خانے آن پہنچے ہیں اور وہ کسی صورت بھی نہیں ٹل رہے ہیں تو میں طبیب خانے پہنچا اور ان امراء کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔ انہوں نے جب بے حد اصرار کیا اور میری بات ماننے سے صاف انکار کر دیا تو میں نے انہیں حکم سلطانی کے مطابق گرفتار کر کے نظر بند کرا دیا۔ بس اسی دوران میری غیر موجودگی کا کسی نے فائدہ اٹھا لیا۔''

''کچھ پتہ چلا کہ وہ کون ہو سکتا ہے اور اس کا یہ سب کرنے کا مقصد کیا تھا ؟''

''میں نے بغور جائزہ لیا ہے، میرے خیال کے مطابق کسی عادی چور کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ جاتے ہوئے سلطان کی ایک انگوٹھی چرا کر لے گیا ہے۔ صرف ایک انگوٹھی چرانا کسی کم ظرف اور بزدل چور کی ہی علامت ہو سکتی ہے۔ میں نے کوتوال شہر کو خبردار کر دیا ہے کہ وہ تمام جوہریوں کے پاس جائے اور انگوٹھی کی بابت معلوم کرے۔ علاوہ ازیں شہر سے باہر جانے والے افراد کی تلاشی بھی لے۔''

''وہ بھلا اب کہاں ملے گا ؟ ہو سکتا ہے کہ وہ کل رات ہی شہر سے نکل گیا ہو۔''

''بہرحال میں اس کا پتہ لگا کر چھوڑوں گا۔ وہ چاہے پاتال میں کیوں نہ پہنچ جائے، اپنے کیے کی سزا ضرور پائے گا۔'' بیبرس کا لہجہ خونخوار ہونے لگا۔

''تمہارے ذمے جو کام لگایا گیا ہے اسے آنکھیں کھول کر انجام دو۔ آئندہ کوئی امیر طبیب خانے پہنچے گا تو اسے سیدھا زنداں خانے میں ڈال دیا جائے گا۔ میں اس بارے میں کوتوال کو آگاہ کر دوں گا۔ تم اب یہاں سے اتنی دیر تک نہیں جا سکتے جب تک نئے سلطان کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ ہو جائے۔ ملکہ عالیہ کا حکم ہے کہ کسی صورت میں سپاہ یا امراء کو اس بات کا علم نہیں ہونا چاہئے ورنہ منصورہ کے میدان میں مسلمان زبردست شکست سے دوچار ہو جائیں گے۔''

ابوخویلد ایک ایک لفظ چبا کر ادا کر رہا تھا۔ بیبرس اس کی باتیں سننے کے ساتھ ساتھ دائیں بائیں بھی دیکھ رہا تھا، وہ اپنے چہرے پر ایسا تاثر طاری کیے ہوئے تھا جیسے کسی مذہبی مسئلے کا جواب سن رہا ہو۔ ابوخویلد اپنی بات مکمل کر کے تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ بیبرس نے مسجد میں موجود نمازیوں پر ایک بار پھر نگاہ ڈالی اور حجرے کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

نمازیوں میں سے ایک آنکھیں پونچھتا ہوا اٹھا، اپنی ٹوپی اتار کر بغل میں دبائی اور بوجھل قدموں سے باہر نکل آیا۔ بیبرس نے اسے باہر نکلتے ہوئے بغور دیکھا، وہ اسے پہچان گیا تھا کہ یہ وہی سامنے مکان میں رہنے والا تابع ارسنغد تھا جو کہ کچھ دنوں سے اجنبی افراد کی کھوج لگانے میں مصروف تھا۔ اس کی بے جا مصروفیت کا خیال آتے ہی بیبرس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ بیبرس کوتوال شہر کو خصوصاً اس شخص پر کڑی نظر رکھنے کا حکم پہلے دے چکا تھا۔ مسجد سے باہر نکل کر تابع ارسنغد کے چہرے پر اطمینان چھا گیا تھا۔ وہ نماز کے بہانے

ان دونوں کی گفتگو سن چکا تھا۔ اسے اپنی تلاش کا واضح جواب مل چکا تھا کہ مسجد کے حجرے میں جس شخص کی لاش موجود تھی وہ کوئی اور نہیں بلکہ سلطان مصر ہی تھا۔ جس کی موت کو کسی وجہ سے پوشیدہ رکھنے کی سعی کی جا رہی تھی۔ وہ اب یہ سوچ رہا تھا کہ اس پوشیدگی کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟



وہ چھوٹے قد کا خاصا فربہ منگول تھا۔ اس کا تعلق ضرگامی قبیلے سے تھا۔ اس کے والدین اس کے بے جا موٹاپے سے بے حد پریشان تھے۔ وہ گھر بھر کے کھانے کی اچھی خاصی مقدار چٹ کر جایا کرتا۔ بے ہنگم انداز میں اسے پاؤں اتنے زور سے پٹخنے کی عادت تھی کہ چھوٹے چھوٹے پتھر پس جایا کرتے۔ ضرگامی قبیلے کے لوگ اسے پینو کہہ کر چھیڑا کرتے۔ بھاری بھرکم ڈیل ڈول کے باوجود وہ بے حد خوش مزاج اور منکسار طبیعت کا مالک تھا۔ منگول روایات کے مطابق اسے شمشیر زنی اور دیگر فنون کی مکمل تربیت دی گئی تھی۔ وہ تربیت یافتہ تو نہیں تھا مگر اکثر اپنے وزن اور اضافی قوت کے سبب مقابلوں میں جیت جایا کرتا تھا۔ اس کا نام فو کنا جو خان تھا۔ اس کا باپ اس کی سے بے حد عاجز تھا۔ وہ اکثر و بیشتر اسے برا بھلا کہتا رہتا۔ اس نے فو کنا جو خان کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ روزانہ سامنے کے پہاڑوں پر پیدل چل کر جائے اور کسی نہ کسی جانور کو شکار کر کے اپنے کندھے پر اٹھا کر قبیلے میں لایا کرے تاکہ اس کی خوش خوراکی کا سامان پیدا ہو اور اس مشقت کے باعث اس کے وزن میں بھی کسی حد تک کمی ہو۔ ان پہاڑوں کے دوسری جانب جینانی سلطنت تھی جس کے بارے میں اسے سختی سے متنبہ کر دیا گیا تھا کہ اسے شکار کے پیچھے دوسری جانب اترنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے مگر جوانی کے جوش اور سیلانی طبیعت کے باعث اکثر وہ اس کے حکم کی خلاف ورزی کر لیا کرتا۔ وہ اس دن ایک ریچھ کا تعاقب کرتے کرتے پہاڑ کی بالائی سطح پر آن پہنچا تھا۔ اس نے خنجر کے کٹیلے وار سے ریچھ کو گھائل کر دیا تھا۔ فو کنا جو خان کے ساتھ ریچھ نے کافی دیر تک زور آزمائی کی۔ یہ تو فو کنا جو خان کی خوش قسمتی تھی کہ اس نے بروقت ریچھ کے پیٹ میں خنجر گھونپ ڈالا۔ ریچھ جبلی طور پر دھینگا مشتی میں مصروف رہا جس کے باعث خنجر کے پھل نے اس کے پیٹ کو کافی گہرائی تک چاک کر دیا۔ پیٹ میں سے بدستور خون بہہ رہا تھا۔ تیزی سے ایک جانب بھاگ نکلا۔ فو کنا جو خان کو بخوبی اندازہ تھا کہ یہ ریچھ زیادہ دور تک نہیں جا پائے گا۔ اسی لئے وہ اس کے تعاقب میں نکل پڑا۔ وہ اپنے وزنی ڈیل ڈول کے باعث زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرنے سے قاصر تھا مگر وہ ریچھ کے پیٹ سے بہنے والے خون کی لکیر کے سہارے اس کا تعاقب کرتا رہا۔ ریچھ پہاڑ کے اوپر چڑھتا چلا گیا۔ بالائی سطح پر ایک دوسرے انسان کو موجود پا کر وہ غضبناک ہو گیا تھا۔ وہ شخص اس کی جانب پیٹھ کئے دوسری جانب کچھ دیکھنے میں مشغول تھا۔ ریچھ نے غصے کی حالت میں اس پر چھلانگ لگاتے ہوئے حملہ کر دیا۔ وہ شخص بے خبری کے عالم میں اپنے توازن پر قابو نہ رکھ سکا اور منہ کے بل لڑھکنیاں کھاتا ہوا گہرائی میں گرتا چلا گیا۔ ریچھ نے پوری طاقت کو جمع کرتے ہوئے چھلانگ لگائی تھی، وہ بھی اپنے توازن کو بروقت سنبھال نہ سکا اور لڑھکتا ہوا ایک بڑے درخت سے جا ٹکرایا۔ زخمی ہونے کے علاوہ درخت کے ساتھ خطرناک ٹکر نے اسے دنیا سے ہمیشہ کے لئے بیگانہ کر دیا۔ اس کا سر ایک جانب ڈھلک گیا۔ فو کنا جو خان ہانپتا ہوا پہاڑ کی بالائی سطح پر پہنچا تو وہاں خون کے بکھرے چھینٹے دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اسے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ اس مقام پر زخمی ریچھ کی کسی نہ کسی سے مڈبھیڑ ضرور ہوئی ہے۔ اسی لمحے اسے اپنے شکار کا خیال آیا۔ وہ تیزی سے آگے کی جانب بڑھا۔ اسے خدشہ تھا کہ یہاں موجود کوئی دوسرا فرد اس کے شکار پر قابض نہ ہو جائے۔ اس نے خون کی پھیلی ہوئی لکیر کے سہارے آگے بڑھ کر اس گہرائی کی جانب دیکھا تو اسے مردہ ریچھ درخت کے پاس گرا ہوا دکھائی دیا۔ وہ قدرے نیچے اتر کر اس کی جانب بڑھا تو اسے

گہرائی میں کسی شخص کی لاش دکھائی دی۔ وہ لاش دیکھ کر ٹھٹک رہ گیا۔ اس نے قیاس کیا کہ ممکن ہے کہ اسی شخص سے ریچھ کی آخری ملاقات ہوئی ہو اور زخمی ریچھ نے اسے اپنے انتقام کا نشانہ بنا ڈالا ہو۔ ریچھ کے قریب پہنچ کر اس نے ریچھ کو خنجر کی نوک چبھو کر ہلایا جلایا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ واقعی مر چکا ہے تو اس کے ہونٹوں سے اطمینان کا سانس نکلا۔ ریچھ کو قریباً گھسیٹ کر وہ پہاڑ کی بالائی سطح تک لے آیا۔ یہ چھوٹا سا عمل تھا مگر اس کی سانس یوں پھول رہی تھی جیسے وہ صدیوں کا سفر طے کر کے آیا ہو۔ فو کنا جو خان نے چند لمحے ایک پتھر پر بیٹھ کر سانس لی۔ اسی اثناء میں اسے گہرائی میں پڑی لاش کا خیال آیا۔ اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ عود کر آیا۔ وہ دھیمے قدموں سے گہرائی میں اترتا چلا گیا۔ گہرائی میں موجود شخص کی سانس چل رہی تھی۔ البتہ وہ بے ہوش تھا۔ فو کنا جو خان نے اس کے جسم کو ٹٹول کر دیکھا۔ اس کی کمر پر خون کے دھبے دکھائی دیے جو کہ ریچھ کے خون کے ہی تھے۔ اس نے کمر عریاں کر کے دیکھی تو وہاں کوئی زخم موجود نہیں تھا۔ بے ہوش شخص کے جسم پر ہلکی پھلکی خراشیں تھیں۔ اس نے بے ہوش شخص کو کندھے پر اٹھایا اور اوپر کی جانب چل پڑا۔ اسے آج پہلی بار کسی شخص کو کندھے پر اٹھانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اسے یہ جان کر بے حد خوشگواری کا احساس ہوا کہ کسی زندہ یا بے ہوش صحت مند شخص کا وزن اس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وہ بے ہوش شخص کو یوں اٹھائے چل رہا تھا جیسے اس نے کوئی بچہ اٹھا رکھا ہو۔ پہاڑ کی بالائی سطح پر پہنچ کر اس نے ایک پتھر کے ساتھ اسے نرمی سے لٹا دیا۔ اسی لمحے اسے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا، کچھ پرے ایک گھوڑا موجود تھا۔ فو کنا جو خان نے پل بھر میں فیصلہ کیا کہ وہ ریچھ کو گھوڑے پر لاد کر اپنی بستی میں لے جائے گا۔ بے ہوش شخص کا خیال آتے ہی اس نے اسے بھی ساتھ لے جانے کا ارادہ کیا۔ پھر کسی خیال سے اس نے ریچھ کو گھوڑے پر لادا اور اپنی بستی کی جانب روانہ ہو گیا جو تھوڑے فاصلے پر سفید خیموں کی صورت میں دکھائی دے رہی تھی۔ وہ گھوڑے کی پشت پر بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ ریچھ کو بستی میں چھوڑ کر اپنے باپ کے ساتھ دوبارہ وہاں لوٹے گا تاکہ وہ اس بے ہوش شخص کے بارے میں کوئی واضح فیصلہ کر سکے کہ اس اجنبی کو ضرگامی بستی میں لانا مناسب ہے یا نہیں۔



تابع ارسفند بے چینی کے عالم میں پورا دن سلطان کی لاش کی حجرے میں موجودگی کے بارے میں قیاس آرائیاں کرتا رہا۔ شام تک وہ معاملے کی تہہ میں پہنچ چکا تھا۔ سلطان کی وفات کو محض اس لئے صیغہ راز میں رکھا جا رہا تھا کہ مسلمان لشکر صلیبی لشکر کے سامنے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ ایسے میں سلطان کی وفات کی خبر سپاہ کے لئے کسی قیامت سے کم نہیں تھی۔ علاوہ ازیں صلیبی لشکر سے نبٹنے کے لئے کسی دوسری اہل شخصیت کا انتظار کیا جا رہا تھا جو کہ منصورہ سے بہت دور تھی۔ ایسے حالات میں اگر صلیبی لشکر کو ذرا سی بھنک پڑ جاتی کہ اسلامی لشکر کو اب سلطان نجم الدین ایوب کی قیادت حاصل نہیں رہی تو وہ ان پر وقت ضائع کئے بغیر حملہ آور ہو جاتا۔ مسلمانوں کے لئے کسی مستحکم قیادت کے بغیر جنگ لڑنا خاصا دشوار کام تھا۔ تابع ارسفند جب مکمل طور پر اپنا تجزیہ کر چکا تو وہ محض مسکرا کر رہ گیا کہ وہ ابھی بھی اتنی اہلیت کا حامل تھا کہ دوسروں کی اصلیت کے نقاب الٹ دے اور گمراہی پر ایسا پردہ ڈال دے کہ کسی کو رتی بھر شک نہ ہو۔ وہ ساری زندگی عیش و عشرت کے تعاقب میں بھاگتا رہا مگر وہ اس کے ہاتھ آنے کے بجائے اس سے دور بھاگتی رہی۔ اب اس کے ہاتھ ایک سنہرا موقعہ لگا تھا۔ بے شمار دولت حاصل کرنے کا اس سے عمدہ موقعہ شاید ہی اس کی زندگی میں دوبارہ آپاتا۔ اس نے فوری طور پر فیصلہ کیا کہ وہ آج رات تک منصورہ سے نکل جائے گا اور کل صبح تک حیرہ کے عقب میں پہنچ جائے گا۔ یہ راستہ تھوڑا طویل ضرور تھا مگر ہر لحاظ سے محفوظ تھا۔ وہ صلیبی لشکر میں سلطان کی وفات کی اطلاع پہنچانے کا مذموم ارادہ کر چکا تھا۔ اسے امید تھی کہ

صلیبی سالار اس کی اطلاع پر اسے اتنا بھاری انعام ضرور دے گا کہ اس کی باقی زندگی عیش و نشاط میں گذر سکے گی۔ قابع ارسفند کو اس بات کا اندازہ تھا کہ اگر وہ شخصیت جس کا بے چینی سے انتظار کیا جا رہا ہے، بروقت پہنچ گئی تو اس کی تمام محنت اکارت جائے گی، اس لئے اسے جو کچھ کرنا ہے وہ فوری ہونا چاہئے، اس کے پاس وقت بے حد کم تھا۔ اسی لئے اس نے آج رات میں ہی منصورہ چھوڑنے کا پختہ عزم کر لیا تھا۔ جب رات کا پہلا پہر شروع ہوا تو اس نے سفر کی تیاری مکمل کر لی، اچانک اس کے ذہن میں اس بوڑھے کی بات گونجی کہ اس نے کوتوال شہر کو شہر سے باہر جانے والوں پر کڑی نگاہ رکھنے کی ہدایت کر رکھی ہے۔ قابع ارسفند یہ سوچ کر کچھ پریشان ہو گیا۔ آج ہی اسے شہر سے نکلنا تھا اور باہر موجود سپاہیوں سے واسطہ پڑنے پر اسے کوئی نہ کوئی جواز بھی چاہئے تھا۔ اسی لمحے اس کے ذہن کے پردوں پر بوڑھے کی دوسری بات گونجی کہ وہ اصلی صورت کے بجائے بوڑھے کے بہروپ میں تھا۔ یہ خیال باعث تسکین تھا کیونکہ وہ خود بھی مختلف مقدمات میں ایسے بہروپ بدل کر جاتا رہا تھا۔ اس کے بہروپ پر آج تک کسی کو شک نہیں گذرا۔ اس نے ایک صندوق سے اپنا روپ بدلنے والا سامان نکالا اور تھوڑی سی محنت کے بعد وہ خود کو یکسر بدل چکا تھا۔ اس نے آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو وہ اپنی عمر سے بیس سال بڑا دکھائی دے رہا تھا۔ کوتوال کو دھوکا دینا اب کوئی مشکل نہیں تھا۔ اس نے فرش کے چور خانے سے سلطان کی انگوٹھی نکالی اور اپنے جوتے کے خفیہ خانے میں چھپائی۔

ایک بڑی سی لاٹھی لے کر وہ گھر سے باہر نکلا۔ اس نے دائیں بائیں نگاہ دوڑائی۔ دور دور تک کسی ذی روح کا نشان نہیں تھا۔ وہ لاٹھی ٹیکتے ہوئے شہر کے صدر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ وہاں حسب توقع سپاہیوں کے دستے نے اسے روکا اور اس کی مکمل جامہ تلاشی لی۔ اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے سوال جواب کئے۔ قابع ارسفند نے چالاکی و عیاری سے انہیں یہ یقین دلایا کہ وہ نزدیکی بستی میرواں تک جا رہا ہے جہاں اس کے ایک عزیز کا انتقال ہو گیا ہے۔ اسے صبح سے پہلے وہاں پہنچنا ہے تاکہ اس کے جنازہ میں شرکت کر سکے۔ سپاہیوں نے اس سے میرواں کے متعلق کئی قسم کے سوالات کئے، وہاں کے چند ایک معروف افراد کے نام بھی اس سے پوچھے گئے۔ قابع ارسفند کے لئے میرواں بستی کوئی اجنبی نہیں تھی۔ وہاں کے کئی امرا کے لئے اس کی ''گواہی'' کام میں لائی گئی تھی۔ اس لئے وہ اطمینان سے تمام سوالات کے جواب دیتا رہا۔ البتہ اس نے اس امر پر حیرت کا اظہار ضرور کیا تھا کہ وہ آج سے پہلے بھی رات کے اوقات میں میرواں جاتا رہا ہے مگر پہلے تو ایسی پوچھ گچھ کبھی نہیں کی گئی تھی۔ سپاہیوں نے کسی مجرم کی تلاش کا عذر پیش کرتے ہوئے اسے جانے کی اجازت دیدی۔ قابع ارسفند وہاں سے نکلنے کے بعد سیدھا میرواں بستی میں پہنچا اور وہاں کے ایک امیر سے گھوڑا حاصل کیا اور حیرہ کا رستہ لیا۔ وہ کامیابی کی خوشی میں سرشار حیرہ کی جانب اڑا جا رہا تھا جو کہ کچھ عرصہ پہلے صلیبی جنگجوؤں کے ستم کا شکار ہو کر تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ اس کے ہاتھ ایک ایسا راز لگ چکا تھا جو مسلمانوں کے لئے کڑے امتحان کا آغاز ہو سکتا تھا۔

قابع ارسفند کے لئے یہ راہیں انجانی نہیں تھیں۔ فجر تک وہ حیرہ پہنچ گیا۔ حیرہ کی حالت زار دیکھ کر اسے حیرت بھی ہوئی کہ خوش و خرم جیتا جاگتا شہر کھنڈرات کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر کسی پشیمانی کا احساس نہیں ہوا کہ شہر کی حالت جن لوگوں نے ایسی بگاڑ ڈالی تھی، وہ انہی کے پاس اسلامی لشکر کی سب سے بڑی کمزوری کا راز بیچنے جا رہا ہے۔

وہ حیرہ سے ہوتا ہوا صلیبی لشکر کی پشت پر پہنچ گیا۔ صلیبی محافظوں نے جب ایک گھڑ سوار کو لشکر کی جانب آتے دیکھا تو وہ بہت حیران ہوئے۔ وہ جب صلیبی لشکر میں پہنچا تو صبح ہو چکی تھی۔ لشکر کے پاس پہنچنے پر محافظ سپاہ

نے اسے تلواروں اور نیزوں کے حصار میں لے لیا۔ قابع ارسفند نے چیخ کر خود کو ان کا دوست قرار دیا اور ایک اہم اطلاع کے لئے امیر لشکر سے ملاقات کی استدعا کی۔ محافظ سپاہ نے اس کے گھوڑے کی باگ تھام کر اسے نیچے اتارا اور اس کی جامہ تلاشی لی۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ قابع ارسفند اپنے اصلی صورت میں وہاں آیا تھا۔ اس نے اپنا بہروپ میرواں نامی بستی میں ہی بدل ڈالا تھا۔ صلیبی لشکر کے امیر شاہ لوئی نہم تک قابع ارسفند کی اطلاع پہنچائی گئی۔

جب لوئی نہم کو یہ بتایا گیا کہ نو وارد نہ صرف مسلمان ہے بلکہ نہتا بھی ہے تو اسے سن کر حیرت ہوئی۔ قابع ارسفند کو دوپہر کے بعد شاہ لوئی کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ قابع ارسفند نے شاہ لوئی کو جھک کر سلامی دی۔ شاہ لوئی نے بے زاری سے اس کے آنے کے مقصد کے بارے میں دریافت کیا۔

''معزز امیر کا اقبال بلند ہو۔ میرے پاس آپ کے لئے قیمتی اطلاع ہے جو کہ اس معرکہ میں آپ کی یقینی فتح کا سبب بن سکتی ہے''۔

''کوئی بھی اطلاع سنانے سے پہلے یاد رکھو، اگر اس کا کامل ثبوت تمہارے پاس موجود ہو تو ہی الفاظ منہ سے نکالنا ورنہ ہم تمہاری اطلاع کو کوئی اہمیت نہیں دیں گے بلکہ تمہاری اس لشکر میں آمد کو جرم سمجھتے ہوئے کڑی سزا بھی دی جائے گی''۔ ایک سالار کڑکتی ہوئی آواز میں بولا۔ شاہ لوئی نہم نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''ہاں تم کہو جو کہنا چاہتے ہو''۔

''امیر لشکر!'' قابع ارسفند دونوں ہاتھ ملتا ہوا بولا۔ ''میں منصورہ کا ایک چھوٹا سا تاجر ہوں، آپ کے لئے وہاں سے رات بھر سفر کرتا ہوا یہاں پہنچا ہوں، میرے پاس جو اطلاع ہے وہ سو فیصد درست ہے۔ علاوہ ازیں اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کے لئے میرے پاس اس کا ثبوت بھی ہے''۔

قابع ارسفند یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ صلیبی سردار اور شاہ لوئی نہم اس کی جانب مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

''میں تمہاری منشاء سے خوب آگاہ ہوں، تم بے فکر رہو، تمہاری فراہم کردہ اطلاع اگر ہمارے لئے کارآمد ثابت ہوئی تو اس کا بڑا معاوضہ ادا کیا جائے گا''۔

''میں امیر لشکر کا بے حد مشکور ہوں کہ انہوں نے فوراً ہی میری دلی خواہش سے آگاہی حاصل کر لی۔ میں اپنے راز کے انکشاف سے پہلے امیر لشکر سے عہد کے چند جملے سننے کی استدعا کروں گا''۔ قابع ارسفند نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''تم شاید نہیں جانتے ہو کہ شاہ لوئی کے دربار سے آج تک کسی کو بے مراد واپس نہیں بھیجا گیا۔ تمہیں بھی خالی ہاتھ نہیں جانے دیا جائے گا''۔

''آپ لوگوں کو یہ جان کر شدید حیرت ہو گی کہ بلاد مصر کے سلطان کا گذشتہ ہفتے انتقال ہو چکا ہے اور مسلمان سپاہ اس وقت بغیر کسی قیادت کے میدان جنگ میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ سلطان کی موت کو ابھی تک صیغہ راز میں رکھا گیا ہے کہ سپاہ کے حوصلے نہ ٹوٹ جائیں''۔

صلیبی سردار اس عجیب خبر پر حیران رہ گئے۔ ان کے مخبروں کی اطلاعات کے مطابق سلطان منصورہ کے طبیب خانے میں داخل تھا۔ علاوہ ازیں سلطان کی جانب سے صلیبی لشکر کے ساتھ لگاتار پیغامات و مراسلات کا سلسلہ جاری تھا۔

''تمہیں یقیناً کوئی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے یا تم ہمیں بہکانے کا سامان پیدا کر رہے ہو''۔ شاہ لوئی برہمی

سے بولا۔

''امیر لشکر! '' قابع ارسفند کے چہرے پر دھیمی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''مجھے آپ کو بہکا کر کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ اگر آپ کو میری خبر سے کوئی سروکار نہیں تو مجھے اجازت دیجئے کہ میں واپس اپنے شہر لوٹ کر اس دوسرے سلطان کا انتخاب ہوتا دیکھ سکوں جس کے ساتھ آپ کا جلد سابقہ پڑنے والا ہے''۔

''مگر ہمارے مخبروں کی اطلاعات یکسر مختلف ہیں''۔ ایک صلیبی سردار بولا۔

''مجھے آپ کے مخبروں سے بھی کوئی سروکار نہیں اور نہ ہی میں کوئی مخبر یا سپاہی ہوں کہ میدان جنگ میں موجود رہ کر یہ جاننے کی کوشش کروں کہ وہاں کیا کھیل رچایا جا رہا ہے''۔

''تم کچھ دیر پہلے کہہ رہے تھے کہ تمہارے پاس اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے مکمل ثبوت بھی موجود ہے''۔

''امیر لشکر! '' قابع ارسفند مسکراتے ہوئے بولا ''اگر آپ اپنے مخبروں کی بات پر ہی تکیہ کرتے رہے تو آپ کو صرف یہی اطلاع ملے گی کہ فلاں وقت میں نئے سلطان کا انتخاب ہو چکا ہے۔ آپ کو کبھی یہ اطلاع نہیں مل پائے گی کہ منصورہ کی جامع مسجد میں سفید پوش محافظ سلطان کی لاش کی حفاظت کر رہے ہیں اور طبیب خانے کے خاص کمرے میں ایسا بندوبست کیا گیا ہے کہ وہاں سلطان کی موجودگی کا ڈھونگ برقرار رکھا جا سکے''۔

''تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟ '' ایک صلیبی سردار تنک کر بولا۔

''میں اس جامع مسجد کے سامنے رہائش پذیر ہوں، میری نگاہوں سے کوئی ایسی بات چھپی رہنا محال ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے سلطان کی سفید کفن میں لپٹی ہوئی لاش دیکھی ہے''۔

''ٹھیک ہے ہم مانتے ہیں کہ تم اپنی اطلاع میں سچے ہو مگر وہ ثبوت کہاں ہے جس کا کچھ دیر پہلے تم نے دعویٰ کیا تھا؟ '' شاہ لوئی نہم نرمی سے بولا۔ وہ نو وارد کی اطلاع کے تمام پہلوؤں پر غور کر رہا تھا۔ ممکن تھا کہ صلیبی لشکر میں سے اسے کسی سازش کے تحت بھیجا گیا ہو۔

قابع ارسفند نے جھک کر اپنی جوتی اتاری تو صلیبی محافظوں کی تلواریں نیاموں سے باہر نکل آئیں۔ ایک تلوار کی نوک اس کی شہ رگ میں چبھنے لگی تھی۔ قابع ارسفند کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے اس جوتی کی جانب تیزی سے اشارے کرنا شروع کر دیئے۔ شاہ لوئی نہم اس کی حرکت پر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اس نے تلواروں کو ہٹانے کا اشارہ دیا۔ تلواریں اس کے جسم سے دور تو ہٹ گئی تھیں مگر ان کا رُخ بدستور اس کی جانب تھا۔ قابع ارسفند نے جوتی کے خفیہ خانے میں سے انگوٹھی نکالی اور سب لوگوں کو دکھانے لگا۔

''یہ کیا چیز ہے؟ '' شاہ لوئی نے دریافت کیا۔

''یہ میری بات کا ثبوت ہے امیر لشکر! '' قابع ارسفند تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''یہ انگوٹھی مرحوم سلطان کی ہے جو کہ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کی لاش کے ہاتھ میں سے اتاری تھی۔ اگر آپ کے پاس کوئی ایسا فرد موجود ہو جو اس انگوٹھی کو پہچانتا ہو تو میری بات کی تصدیق کر دے گا''۔

شاہ لوئی نہم کے اشارے پر ایک امیر نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے انگوٹھی لی اور شاہ لوئی نہم کی خدمت میں پیش کی۔ شاہ لوئی نہم انگوٹھی کو بغور دیکھنے لگا۔ انگوٹھی میں بیش قیمت نگینہ جڑا ہوا تھا ایسی انگوٹھی کا کسی شاہ کے پاس ہونا ہی ممکن تھا۔ اس نے باریک بینی سے جائزہ لینے کے بعد اس کے گرد سے سپاہ کا محاصرہ ہٹا دیا اور اسے لے کر اپنے امرا کے ہمراہ خیمے میں چلا آیا۔ خیمہ اندر سے کسی محل سے کم نہیں تھا۔ یہاں اسے اطمینان سے بٹھایا گیا اور تمام واقعہ پوری تفصیل سے دوبارہ سنا گیا۔ واقعہ سننے کے بیچ میں اس سے طرح طرح کے سوال کئے

گئے۔ یہ جرح محض اس کی گفتگو کی سچائی کو جانچنے کے لئے تھی۔ تھوڑی دیر بعد اسے شراب کا جام پیش کیا گیا۔ اس نے امرا کے ہمراہ بیٹھ کر چند ایک بار شراب نوشی کی تھی مگر ایسی قیمتی شراب پہلے اس کی زندگی میں کبھی نہیں آئی تھی۔ وہ ابھی پہلے جام کی چسکیاں لے رہا تھا کہ وہاں موجود سازندوں نے بھڑکیلی سی دھن چھیڑ دی، دھن چھڑتے ہی کئی حسین و خوبرو دوشیزائیں خیمے میں داخل ہوئیں اور محو رقص ہو گئیں۔ ان کے لچکیلے جسموں پر لباس برائے نام تھا۔ شباب و شراب کی محفل نے قابع ارسفند کے رہے سہے ہوش بھی اُڑا دیئے۔ وہ بھی ان کے ساتھ جھومنے لگا۔ شراب کے نشے میں وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگا۔ شاہ لوئی نے اسی دوران دوبارہ سلطان کی لاش والا معاملہ چھیڑ دیا۔ قابع ارسفند شراب کے نشے میں دھت اب جوش و خروش سے وہی واقعہ بیان کر رہا تھا۔

شاہ لوئی نہم نے اپنے مخصوص طریقے سے قابع ارسفند کی سچائی پرکھنے کے بعد سالار و امرا کو فوری طور پر جنگ کے لئے تیاری کا حکم دے دیا تھا۔ وہ ارادہ کر چکا تھا کہ اب اسلامی لشکر میں نئے سلطان کے انتخاب کی نوبت بھی نہیں آنے دی جائے گی۔ اس نے امرا و سالاروں کو واضح الفاظ میں یہ حکم سنا دیا تھا کہ کل صبح ہر قیمت پر فیصلہ کن معرکے کا آغاز کر دیا جائے گا تاکہ ارضِ مقدس تک تیزی سے رسائی ممکن ہو سکے۔ بلاشبہ مصر کی حکومت ہی صلیبی جنگجوؤں کے لئے سب سے بڑی اور آہنی دیوار تھی، اسے گرا دینا بے حد ضروری خیال کیا جا رہا تھا۔ ایسے میں سلطان کی اچانک موت کی اطلاع کو یسوع مسیح کی رضامندی کا ساتھ قرار دیا گیا۔

❁ ❁ ❁

ضرگامی سردار تین آدمیوں کے ساتھ خیمے میں داخل ہوا۔ اس کے عقب میں دو سرکاری سپاہی بھی اندر چلے آئے۔ برقائی خان نے ضرگامی سردار اور اس کے ساتھیوں کو بیٹھنے کے لئے کہا اور دونوں سپاہیوں کو باہر نکل جانے کا حکم سنایا۔ سپاہی اس حکم پر متحیر رہ گئے۔ ہو سکتا تھا کہ ضرگامی لوگ برقائی خان کو نقصان پہنچانے کی سعی کرتے اس لئے برقائی خان کی حفاظت کرنا بھی ضروری تھا۔ ضرگامی سردار اس کی بے خوفی سے متاثر دکھائی دے رہا تھا۔ جب سب لوگوں نے نشستیں سنبھال لیں تو برقائی خان اصل مقصد کی جانب آیا۔

''ضرگامی سردار کی غیر متوقع آمد میرے لئے باعث حیرت ہے۔ میں برقائی خان ہوں، بہرحال آپ لوگ کہیے جو کچھ کہنا چاہتے ہیں''۔ برقائی خان نے کہا۔

''ہم قاآن زادے کو اپنے علاقے میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ میرا نام اژلائی خان ہے، قبیلے کے لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ اس لشکر کے امیر آپ ہیں، ہم لوگ شام کے وقت سے آپ کے خیموں کو دیکھ کر پریشان ہو رہے ہیں کہ آخر کیا ماجرا ہے کہ عظیم باتو خان کی زرّیں خیل فوج اچانک اس علاقے میں آن وارد ہوئی؟ کیا ہمارے متعلق کوئی غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے یا چینائی سلطنت کی سرکوبی پیش نگاہ ہے؟ ''

''سردار اژلائی خان! '' برقائی خان قدرے تلخ لہجے میں بولا۔ ''زیادہ معصوم بننے کی ضرورت نہیں، تم نے اپنے قبیلے کے ساتھ شمالی گذرگاہوں پر جو طوفانِ بدتمیزی برپا کر رکھا ہے میں اسی کی سزا دینے کے لئے یہاں آیا ہوں''۔

''قاآن زادے کی بات کا مطلب میں سمجھ نہیں پایا۔ ہماری کس بدتمیزی کی جانب اشارہ ہے؟ '' سردار اژلائی خان بولا۔

''تم لوگوں نے عرصے سے ان گذرگاہوں پر لوٹ مار کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے اور مجھ سے سوال کرتے ہو کہ ہماری غلطی کیا ہے؟ '' برقائی خان اس کی اداکاری پر بھڑک اُٹھا۔

''قاآن زادے! '' سردار اژلائی اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''لوٹ مار اور ضرگامی قبیلہ، دونوں

متضاد لفظ ہیں۔ ہم لوگ تو پُر امن زندگی گذارتے ہیں۔ رہی بات شمالی گذرگاہوں کی تو وہ یہاں سے کم از کم پانچ دن کی مسافت پر ہیں۔ ہم لوگ محض لوٹ مار کے لئے وہاں جائیں اور پھر اپنے علاقے میں واپس لوٹیں تو کم از کم دس بارہ دن کا عرصہ لگے گا۔ دوسرا اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جب ہم وہاں پہنچیں گے تو لٹنے کے لئے کوئی تجارتی قافلہ وہاں پہلے سے ہمارا منتظر ہوگا؟ میرا خیال ہے کہ آپ کو کسی نے بہکایا ہے یا پھر ہمارے ساتھ دشمنی کرتے ہوئے کسی نے غلط بیانی سے کام لیا ہے اور آپ بلا تصدیق اس جانب آ نکلے ہیں''۔

''یعنی تم مجھے یہ باور کرانا چاہتے ہو کہ ضرگامی قبیلہ پُر امن اور نیک خصائل کا حامل ہے.....؟'' برقائی خان کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

''قاآن زادے.....!'' سردار اژلائی خان اپنے جوش کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ حاکم ہیں اور ضرگامی قبیلہ آپ کا اطاعت گزار ہے۔ آپ بلا تحقیق ہماری نیک نیتی پر شک نہ کیجئے۔ ہم کل بھی زریں خیل قاآن کے محکوم تھے اور آج بھی ہیں۔ آپ ایسی نوبت پیدا مت کیجئے کہ ہماری سلامتی اور اطاعت دونوں خطرے میں پڑ جائے۔ ہم بھی منگول ہیں''۔

''تمہارے پاس اپنی بات کی سچائی کا کیا ثبوت ہے.....؟'' برقائی خان اس کی گفتگو سے کچھ کچھ اُلجھ رہا تھا۔ اسے انسانوں کو پرکھنے کا فن خوب آتا تھا۔ اژلائی خان کی باتوں سے قطعاً ایسا تاثر نہیں مل رہا تھا کہ وہ لوگ ایسی گھناؤنی حرکات کے مرتکب رہے ہوں گے۔

''ثبوت.....! ہمارے خیمے ہیں، آپ خود چل کر دیکھئے۔ اگر کوئی ایک بھی ایسی چیز آپ کو مل جائے تو پورا قبیلہ آپ کا مجرم ہوگا''۔ سردار اژلائی خان نے مستحکم انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے کل تمہارے قبیلے کی مکمل تلاشی لی جائے گی۔ ابھی اسی وقت میری سپاہ کے دستے تمہارے قبیلے میں جائیں گے جو کہ تمہاری کسی بھی غلط حرکت پر طبل بجا دیں گے۔ یاد رکھو کہ طبل رات کے کسی بھی پہر میں بجا تو صبح تک تم میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکے گا۔ دوسری بات، اگر میرے سپاہیوں کو تمہاری جانب سے ذرا سی خراش بھی پہنچی تو اس کی بھاری قیمت تمہیں ادا کرنا ہوگی''۔ برقائی خان نے سخت لہجے میں کہا۔

سردار اژلائی محض سر ہلا کر رہ گیا۔ اس کے بعد برقائی خان نے ایک دستے کے سالار کو طلب کیا اور اسے صورتِ حال سمجھائی۔ سرکاری فوج کا ایک دستہ ضرگامی سردار کی رہنمائی میں قبیلے کی جانب روانہ ہو گیا۔ برقائی خان ان لوگوں کے جانے کے بعد گہری سوچ میں پڑ گیا کہ ان لوگوں کی گفتگو اور انداز و اطوار سے یہ اندازہ لگانا بے حد مشکل تھا کہ وہ کبھی کسی ایسی واردات کے مرتکب ہوئے ہوں۔ دوسرا ضرگامی سردار کے بقول شمالی گذرگاہ بھی اتنا قریب نہیں تھی پھر باتو خان کو غلط اطلاعات کیوں دی گئیں؟ دوسرا قاآن اعظم کا یہ کہنا کہ ضرگامی قبیلے پر جب بھی لشکر کشی کی جاتی ہے تو وہ پہاڑوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ بڑی عجیب سی بات تھی، پہاڑ تو سامنے دکھائی دے رہے تھے مگر وہ جینائی سلطنت کا حصہ تھے۔ منگول باشندے ایک مصیبت سے بچنے کے لئے دوسرے عذاب میں خود کو کیسے ڈال سکتے تھے؟ جینائی سلطنت میں منگولوں کی موجودگی خود کسی جرم سے کم نہیں تھی زار کے سپاہی ان منگولوں کی اپنے علاقوں میں موجودگی پر موت کی سزا دینے کے عادی تھے۔ جو کچھ بھی تھا بڑا غیر واضح اور مبہم تھا۔ ضرگامی قبیلہ قصوروار نہیں تھا تو کیا باتو خان نے جان بوجھ کر اسے اس جانب بھیجا تھا؟ جبکہ اس کے ذہن میں شیخ نجدیؒ کی بات موجود تھی کہ اسے اس مہم میں کامیابی نصیب ہوگی۔ وہ طرح طرح کے خیالات میں اُلجھا رات کے کسی پہر میں سو گیا تھا۔

اگلی صبح برقائی خان لشکر کے ساتھ ضرگامی بستی میں چلا آیا۔ اس کے تعینات کردہ دستے نے رات بھر کی

کارروائی کی تفصیل اسے پیش کی۔ ضرگامی بستی میں پہنچ کر برقائی خان کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ اژلائی خان کا بیان سچائی پر مبنی تھا۔ بستی میں بے سروسامانی کا عالم تھا۔ بستی کے لوگوں کے پاس ڈھنگ کے لباس تک نہیں تھے۔ جگہ جگہ جانوروں کی ہڈیوں کے انبار لگے دکھائی دے رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ ان کا گذر بسر صرف ان ویرانوں میں پائے جانے والے جانوروں پر ہی تھا۔ برقائی خان مختلف گھروں میں خود گیا اور وہاں موجود اشیاء کا بھی جائزہ لیا۔ ضرگامی سردار کے بیان کے عین مطابق ان کے پاس سے کوئی ایسی چیز برآمد نہیں ہو پائی تھی جو کسی بھی تجارتی قافلے سے کوئی تعلق جوڑ سکتی۔ خیموں کا کپڑا دور سے سفید دکھائی دیتا تھا مگر قریب سے ان کی زردی مائل اصلیت بھی چھپی نہ رہ سکی۔ اژلائی خان نے برقائی خان کے ٹھہرنے کا مکمل بندوبست پہلے سے کر رکھا تھا۔ اسے ایک عمدہ اور صاف ستھرے خیمے میں لایا گیا۔ خیموں کے وسط میں آگ کا چھوٹا سا الاؤ روشن تھا۔ ضرگامی خواتین نے برقائی خان کی آمد پر خوشی کے اظہار پر ایک روایتی گیت گانا شروع کر دیا۔ اسی دوران ایک ریچھ کی کھال اتار کر اسے بڑے سے بانس کے ذریعے آگ پر چڑھا دیا گیا۔ یہ اس قبیلے کا طعام تھا۔ برقائی اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ اسے اپنے بھائی باتو خان کی تضاد بیانی پر حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے کتنے وثوق سے ضرگامی قبیلے کے بارے میں مجرمانہ حرکات کی تفصیل اس کے سامنے بیان کی تھی اور یہاں سب کچھ اس کے برعکس دکھائی دے رہا تھا۔ اچانک اس کے دماغ میں ایک برق سی کوندی۔ ہو نہ ہو باتو خان نے جان بوجھ کر اسے سرائے سے باہر روانہ کیا ہے مگر اسے سرائے سے باہر بھیجنے کا اصل مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ برقائی خان اُلجھ سا گیا۔ صورتِ حال واضح نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ان تمام امکانات پر نگاہ دوڑانے کی کوشش کر رہا تھا جن کے باعث باتو خان نے اسے اتنی دور بھیجنے کی ضرورت محسوس کی۔ ضرگامی خواتین اپنے آپ میں مگن روایتی گیت لہک لہک کر گاتی رہیں۔ برقائی خان کے سپاہی بھی ان کے بے ہنگم سے گیت پر سر دھن رہے تھے۔ اسی لمحے کوئی زور سے چیخا۔ خواتین گھبرا کر خاموش ہو گئیں۔ ایک ضرگامی قریباً دوڑتا ہوا بستی میں داخل ہوا۔ سب لوگ حیرت و پریشانی سے اس کا منہ دیکھ رہے تھے۔ اس نے اپنے عقبی جانب اشارہ کرتے ہوئے تیز آواز میں کہا۔

''قاژی آ گئے.....!''

قبیلے میں عجیب سی بھگدڑ مچ گئی۔ برقائی خان جو خیالات کے بھنور میں ڈوبا بیٹھا تھا، اس عجیب سی صورتِ حال پر چونک پڑا۔ وہ تیزی سے نکل کر باہر آیا۔ باہر لوگ اپنے خیموں میں سے ہتھیار نکالتے دکھائی دے رہے تھے۔

برقائی خان تیز قدموں سے خیموں کے جھرمٹ میں سے باہر نکلا۔ خیموں کے باہر اسے سردار اژلائی خان دکھائی دیا جو اپنے قبیلے کے لوگوں کو پُرسکون رہنے کی ہدایت دے رہا تھا۔

''سردار اژلائی خان.....! کیا ہوا.....؟'' برقائی خان نے اس کی جانب بڑھتے ہوئے پوچھا۔

''قاآن زادے.....! وہ سامنے دیکھئے، پہاڑوں پر قاژی قبیلے کے لوگ دکھائی دے رہے ہیں، وہ اکثر و بیشتر یہاں آتے ہیں اور ہمارے قبیلے کے لوگوں میں سے کسی نہ کسی کو ہلاک کر کے ساتھ لے جاتے ہیں۔ آج بھی ان کی آمد کسی بڑے خطرے کا اعلان کر رہی ہے''۔

برقائی خان نے سامنے نگاہ دوڑائی تو قاژی قبیلے کے لوگوں کے چمکتے بھالے اور نیزوں کی انیاں دکھائی دیں۔ برقائی خان نے سردار کو حوصلہ دیا۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اگر آج قاژی قبیلے نے اس جانب آنے کی کوشش کی تو انہیں ایسا سبق سکھایا جائے گا کہ وہ ہمیشہ کے لئے یہ راستہ ہی بھول جائیں گے''۔

سردار نے سرکاری لشکر کا حوالہ دے کر اپنی بستی کے لوگوں کو قدرے پُرسکون کیا۔ اسی لمحے ایک عورت

چیختی چلاتی سردار اثرلائی خان کے قدموں میں آگری۔

''جاودانی آسمان کے لئے! میرے خاونداور بچے کو بچالیجئے''۔ وہ مسلسل چیخے جارہی تھی۔

''اطمینان سے بات کرو، یہ بتاؤ کہ تمہارا مسئلہ کیا ہے.....؟'' سردار اثرلائی خان نے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''میرا شوہر اور بیٹا دونوں تھوڑی دیر پہلے اس جانب گئے ہیں''۔ وہ عورت پہاڑ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے چیخی۔

''تم اس پیٹو فونا جو کی بات کر رہی ہو جو صبح یہ ریچھ شکار کر کے لایا تھا''۔ سردار اثرلائی بے یقینی کے عالم میں بولا۔

''ہاں ہاں.....! وہ ریچھ ہم لوگوں کے حوالے کر کے کچھ دیر تک اپنے باپ کے ساتھ باتیں کرتا رہا پھر وہ اس کے ساتھ دوبارہ پہاڑ کی جانب چلا گیا تھا''۔ عورت چیخنے کے ساتھ ساتھ اب زاروقطار رونے لگی۔

برقائی خان نے دوبارہ پہاڑ کی جانب دیکھا۔ اس بار وہ قاڑی باشندوں کی تعداد کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر لمحہ بھر میں اس نے فیصلہ کرلیا کہ اس عورت کے بیٹے کو ہر حال میں بچانا ضروری ہے۔ اس نے اپنے ایک دستے کے امیر کو فوری طور پر پہاڑ کی جانب روانہ کر دیا۔ سردار اثرلائی خان نے برقائی خان کو روکنے کی بہتیری کوشش کی کہ وہ قبیلے کے لوگوں کو روانہ کر کے معاملہ سنبھال لے گا مگر برقائی خان نے اسے سختی سے چپ کرادیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد برقائی خان اپنے خاص دستے کے ساتھ تیز رفتار گھوڑوں پر سوار پہاڑ کی جانب اُڑا جا رہا تھا۔ وہ اپنے میزبان کے گھر پر قیامت ٹوٹتی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ اس علاقے کے قاآن کا بھائی تھا۔ اپنے علاقوں کی حفاظت کرنا بھی تو اسی کی ذمہ داری تھی۔ وہ قاڑی باشندوں کو سبق سکھانے کا عزم کر چکا تھا۔ ضرگامی قبیلے کے لوگوں کی نگاہیں اُڑتی ہوئی دُھول کا تعاقب کر رہی تھیں۔

❁ ❁ ❁

بیبرس کو صبح کوتوالِ شہر نے اطلاع دی کہ جس شخص پر نگاہ رکھنے کا حکم دیا گیا تھا وہ رات کے وقت اپنے گھر میں جاتا تو دیکھا گیا مگر رات کے کسی پہر میں نظر بچا کر شہر سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ یہ خبر کوتوالِ شہر نے خود دینے کے بجائے ایک سپاہی کے ہاتھ بھیجی تھی۔ بیبرس خبر سننے کے بعد لمحہ بھر کے لئے سناٹے میں آ گیا۔ اسے اس شخص پر کئی دن سے شک تھا کہ وہ کوئی مخبر ہے جو کہ سلطان کے راز کو جاننے کے درپے ہے۔ بیبرس کی عدم موجودگی میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو چکا تھا مگر کوئی ایسا ثبوت موجود نہیں تھا کہ اس پر ہاتھ ڈالا جا سکتا۔ بیبرس نے کوتوالِ شہر کو کڑی تاکید کی تھی کہ اس شخص کو کسی قیمت پر شہر سے باہر نہ نکلنے دیا جائے، اس کے علاوہ اس کے پاس آنے جانے والے ہر شخص کو بھی نگرانی میں رکھا جائے۔ کوتوالِ شہر نے بیبرس کی بات پر سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اب چونکہ اس سے غلطی ہو چکی تھی اس لئے وہ اس کے سامنے آنے سے کترا رہا تھا۔ بیبرس نے کوتوال کی گوشمالی کرنے کے بجائے تیزی سے اپنی جگہ ایک دوسرے قابل مملوک کو متعین کیا اور خود لشکر کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس تازہ صورتِ حال کے بارے میں امرأ کو آگاہ کرنا بے حد ضروری تھا۔ وہ تیز رفتاری سے سفر کرتا ہوا لشکرِ اسلامی میں پہنچا۔ وہاں موجود امرأ نے اس کی صورت دیکھی تو سلطان کی طبیعت کی بابت سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ بیبرس نے انہیں یہ کہہ کر خود سے الگ کیا کہ وہ سلطان کا ایک اہم پیغام لے کر آیا ہے۔ فارغ ہونے پر وہ طبیعت کے بارے میں بات کرے گا۔ وہ سیدھا رئیس العساکر جاشنگیر ایبک کے پاس جا پہنچا۔ ملکہ شجرۃ الدر کو بھی بیبرس کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ خود رئیس العساکر کے خیمے میں چلی آئی۔ کئی دیگر امرأ وہاں

پہنچ چکے تھے۔ بیبرس نے چند لوگوں کے علاوہ سب لوگوں سے درخواست کی کہ وہ باہر چلے جائیں کیونکہ یہ پیغام صرف رئیس العساکر کے لئے ہے۔ کئی امرأ منہ بنا کر باہر نکل گئے۔ جب صرف قابلِ اعتماد لوگ وہاں رہ گئے تو جاشنگیر ایبک نے آنے کی وجہ طلب کی۔

''مجھے یہ بتاتے ہوئے بے حد ندامت کا سامنا ہے کہ آقا کی وفات کی خبر منصورہ کی جامع مسجد سے اُڑالی گئی ہے''۔ بیبرس نگاہیں جھکا کر بولا۔

''اس بارے میں تو ابوخویلد نے ہمیں پہلے آگاہ کر دیا تھا۔ میں نے ایک خصوصی دستے کو منصورہ کے صدر دروازے پر تعینات کرنے کا حکم جاری کر دیا ہے۔ تم اس بارے میں فکر مت کرو''۔

''امیر العساکر.....!'' بیبرس لفظ چبا کر بولا۔ ''آپ کے حکم کے عمل درآمد میں ابھی دیر ہو گی۔ جس شخص نے سلطان کی میت کے بارے میں خبر چرائی تھی، وہ کوتوالِ شہر کی نادانی کے باعث کل رات کسی وقت شہر چھوڑ کر روانہ ہو چکا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اب تک نصرانیوں تک یہ بات پہنچا چکا ہو''۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو.....؟'' جاشنگیر نے شدید حیرت سے کہا۔ ''اگر اس شخص کی بابت تمہیں معلوم ہو گیا تھا تو اسے فوراً گرفتار کیوں نہیں کیا گیا؟ اس معاملے میں ذرا سی بھی لاپروائی کا انجام کیا ہو سکتا ہے، یہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے''۔

''رئیس العساکر.....! اس شخص پر محض شک تھا۔ پھر وہ برسوں سے اسی جگہ پر مقیم تھا، اس کے نصرانیوں سے کسی رابطے کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ ایسے میں اسے گرفتار کر کے اس کی اہمیت کو خواہ مخواہ ہر ایک کی نظروں لانا مناسب نہیں تھا''۔ بیبرس نے جواب دیا۔

ملکہ شجرۃ الدر نے کہا۔ ''میرا خیال ہے آپ لوگ آپس میں اُلجھنے سے گریز کریں، اگر یہ خبر نصرانیوں کی جانب سے ہمارے لشکر میں پھیلانے کی کوشش کی گئی تو اسے روکنا آسان ہے، سپاہ کو صرف یہ باور کرا دینا کافی ہے کہ دشمن ان کے سلطان کی بیماری کا ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش کر رہا ہے اور ایسی افواہیں پھیلا کر وہ مسلمانوں کے حوصلے پست کرنا چاہتا ہے۔ رہا یہ امکان کہ نصرانی قبل از وقت جنگ کا اعلان کر دیں گے تو اس کے لئے آپ سب لوگوں کو ذہنی طور پر تیار ہو جانا چاہئے کیونکہ مجھے دکھائی دے رہا ہے کہ وہ وقت قریب ہی ہے۔ اب آپ سب لوگوں کے باہمی اتحاد اور ہم آہنگی کا کڑا امتحان شروع ہونے والا ہے۔ بیبرس تم اپنے دستے میں پہنچ کر جنگ کی تیاری کرو۔ جامع مسجد میں جتنے سپاہ موجود ہیں وہ کافی ہیں، جس خبر کو چھپانے کا مسئلہ درپیش تھا جب وہ ہی افشا ہو چکی ہے تو وہاں رُکنے کا کیا فائدہ؟ احمد طولائی تم نے بائیں بازو کی ذمہ داری سنبھالنی ہے۔ فارس الدین اقطائی تمہیں دائیں بازو کو سنبھالنا ہے۔ رئیس العساکر جاشنگیر ایبک قلب میں رہنے کے ساتھ ساتھ وہیں سے ہدایات جاری کریں گے۔ تمام افراد کا یہ فرض ہے کہ وہ جنگ کی حکمتِ عملی میں رئیس العساکر کا مکمل ساتھ دیں، کسی کو اپنی مرضی برتنے کی اجازت نہیں ہو گی۔ آپ سب لوگ اسی وقت اپنے اپنے امور کی انجام دہی پر جت جائیے تاکہ جس وقت نصرانی لشکر ہمیں جنگ کے لئے للکارے آواز دے تو ہمیں ہمہ تن تیار پائے''۔

ملکہ شجرۃ الدر نے اپنی بات مکمل کی۔ سب لوگوں نے اس بات کا عہد کیا کہ وہ اس جنگ میں سلطان نجم الدین ایوب کی عدم موجودگی کے باوجود فتح کو یقینی بنائیں گے۔ بیبرس بھی اپنے مخصوص دستے میں پہنچ گیا۔ وہ اس اسلامی لشکر میں دو سو سپاہیوں کے دستے کا امیر تھا۔

❁ ❁ ❁

پہاڑ کی بالائی سطح پر قاڑی سردار اپنے ساتھیوں سمیت موجود تھا۔ قاڑی باشندوں کے خونخوار چہروں کو

ایسے عالم میں دیکھ کر مطیع الدین کی سٹی گم ہونے لگی۔ حالانکہ وہ ان کی پہنچ سے کافی دور تھا مگر جسم میں پوری توانائی کے فقدان پر اسے ان کے ساتھ نبٹنے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا۔ قاڑی سردار نے اپنے قبیلے کے نوجوانوں کو حکم دیا کہ وہ کسی بھی صورت اجنبی کو اس پہاڑ سے نیچے نہ اُترنے دیں، اگر اجنبی پہاڑ سے نیچے اترنے میں کامیاب ہو گیا تو تمام لوگوں کی لاشیں اسی پہاڑ پر عبرت کا نشان بنا دی جائیں گی۔ قاڑی نوجوان اپنے سردار کا حکم پاتے ہی تیزی سے پہاڑ سے نیچے اترنے لگے۔ وہ اپنی حدود سے نکل کر منگولی ریاست کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ قاڑی سردار کی ہر ممکن کوشش تھی کہ وہ جلد از جلد اجنبی کو قابو میں کر لیں تا کہ انہیں ضرگامی قبیلے سے الجھنے کی نوبت پیش نہ آئے۔ قاڑی نوجوانوں کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر مطیع الدین کے جسم میں بجلیاں بھر گئیں۔ وہ جسم میں اُٹھنے والی ٹیسوں کی پرواہ کئے بغیر تیزی سے نیچے اتر رہا تھا۔ ایسے حالات میں اگر اس کے پاس گھوڑا موجود ہوتا تو قاڑی باشندے مایوسی کے عالم میں ہاتھ ملتے دکھائی دیتے۔ اسے اپنی تلوار کے بارے میں پہلی بار خیال آیا تھا۔ اس نے تیزی سے اپنی نیام پر ہاتھ ڈالا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ فوئنا جوخان نے اسے بے ہوشی کے عالم میں پتھر کے ساتھ، لٹاتے وقت ایک جانب گری تلوار اُٹھا کر اس کی نیام میں ڈال دی تھی۔ مطیع الدین نے تلوار نیام سے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ وہ تیز رفتاری کے ساتھ ساتھ محتاط بھی تھا۔ وہ دوبارہ گہرائی میں لڑھکنے سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی رفتار میں اتنی سرعت نہیں تھی جتنی پھرتی کا مظاہرہ قاڑی جوان کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں قاڑی جوانوں نے مطیع الدین کو نرغے میں لے لیا۔ وہ اس کے چاروں جانب گھیرا ڈالنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ مطیع الدین خود کو نرغے میں پا کر ان سے آخری مبارزت کے لئے خود کو تیار کر چکا تھا۔ اسی دوران قاڑی سردار بھی نیچے اتر آیا۔

''اجنبی......! میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ تم ہمارے شکار ہو اور کوئی طاقت تمہیں ہماری دسترس سے بچا نہیں سکتی۔ مجھے تمہاری ذہانت پر بے حد حیرت ہے کہ تم نے کس عمدگی سے منگولیانہ ریاست کا نہ صرف پتہ لگا لیا بلکہ وترے میں ہماری موجودگی کو بھی بھانپ لیا۔ تمہارے اس طویل چکر کے باعث ہمیں اس جانب آنے میں کافی وقت کا سامنا رہا، مگر پھر بھی ہم بروقت پہنچ گئے''۔

''قاڑی سردار......! میرے ساتھ میرا اللہ ہے، تم بے فکر رہو، میں تمہارے لئے ترنوالہ ہرگز ثابت نہ ہوں گا۔ تم یہاں تک میرا تعاقب کرتے کرتے تو پہنچ ہی گئے ہو، بہر حال اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم آپس میں اپنی اپنی مہارت کا مظاہرہ کریں''۔

''مجھے خوشی ہے کہ اس بار ہمارا پالا ایک ہوشیار اور نڈر شخص سے پڑا ہے۔ جہاں مجھے تمہاری سرکوبی پر خوشی ہو گی وہیں تمہاری موت پر افسوس بھی رہے گا۔ کاش کہ تم قاڑی ہوتے''۔

سردار نے اپنے جوانوں کو حملے کا اشارہ کیا۔ قاڑی جوان مختلف زاویوں سے مطیع الدین پر حملہ آور ہونے لگے۔ ان کے پاس لمبے لمبے نیزے اور بھالے تھے۔ مطیع الدین اپنی مہارت سے ان کے واروں کو روکتا رہا۔ وہ مسلسل کوئی ایسا موقعہ تلاش کر رہا تھا کہ اسے خلاء ملے اور وہ نیچے کی جانب پہنچ سکے۔ ڈھلوانی سطح پر اسے اپنے دفاع میں خاصی دشواری ہو رہی تھی۔ قاڑی باشندوں نے اسے اس طرح گھیر رکھا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نیچے نہیں کھسک سکتا تھا۔

خود کو پوری طرح گھرا ہوا دیکھ کر مطیع الدین دیوانہ سا ہو گیا۔ اس کی تلوار کے واروں میں تیزی پیدا ہو گئی۔ دیوانگی کے عالم میں وہ تین جوانوں کو زخمی کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اسی لمحے کسی کی للکار سنائی دی۔ سب لوگ چونک پڑے۔ مطیع الدین کی توجہ پل بھر کے لئے چوک گئی۔ تھوڑی دور دو ضرگامی بھاگتے ہوئے اس

کی مدد کے لئے بڑھ رہے تھے۔ مطیع الدین کو غافل پا کر ایک قاڑی جوان کا وار چل گیا اور نیزے کی نوکیلی انی اس کی ران میں اتر گئی۔ مطیع الدین کو یوں لگا کہ جیسے کسی نے اس کی ران کو چیر کر رکھ دیا ہو۔ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا گر پڑا۔ قاڑی جوان نے نیزے کو گوشت میں گھمایا اور ناقابل برداشت درد کے باعث مطیع الدین کے حلق سے کراہیں نکلنے لگیں۔ ضرگامی مطیع الدین کو گرتے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ ان کے پاس صرف تلواریں تھیں۔ قاڑی سردار نے مطیع الدین کے گرنے پر چیخ نما نعرہ بلند کیا جو شاید اس کی نصرت کا اعلان تھا۔ اس نے ضرگامی افراد پر نظر ڈالی تو ایک موٹا تازہ شکار دیکھ کر اس کی منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے اپنے بے ڈھنگے عصا سے جوانوں کو اشارہ کیا۔ جوان خونخوار انداز میں اپنے نیزے گھماتے ہوئے ان کی جانب بڑھنے لگے۔ وہ ضرگامی افراد درحقیقت فوئنا جوخان اور اس کا باپ تھا جو کہ مطیع الدین کی مدد کرنے کے لئے وہاں پہنچے تھے۔ فوئنا جوخان کے باپ نے اسے مطیع الدین کو وہاں چھوڑ کر آنے پر برا بھلا کہا تھا اور فوراً اسے لانے کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔ انہیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ پہاڑ پر ان کا پالا قاڑی قبیلے کے لوگوں سے پڑ جائے گا۔



جس بات کا خدشہ تھا وہی عمل پذیر ہوئی۔ قابع ارسفند کی مخبری نے لشکر اسلام کے لئے اس صلیبی جنگ کا آغاز کر دیا تھا جسے ملکہ شجرۃ الدر ابھی ٹال دینا چاہتی تھی۔ شاہ لوئی نہم کے حکم پر 11 ذی الحجہ 647ھ کی صبح طبل جنگ بجا دیا گیا اور منصورہ کے باہر میدان میں صلیبی سپاہ صف آرا ہونے لگیں۔ ملکہ شجرۃ الدر کا اندازہ صحیح نکلا۔ گذشتہ شام کو کئے گئے فیصلے کے مطابق تمام امرائے عساکر ذہنی طور پر پہلے سے ہی تیار تھے۔ ملکہ شجرۃ الدر نے سلطان نجم الدین ایوب کی جگہ اسلامی لشکر سے ایک پُر جوش خطاب کیا اور مسلمانوں کو جہاد کے فریضہ کی اہمیت یاد دلائی، وہاں کے بے گناہ افراد کو صلیبی افواج نے نہایت بیدردی سے اپنی اسلام دشمنی کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ ملکہ شجرۃ الدر نے سپاہ میں جوش وخروش کو بڑھانے کے لئے سلطان کی بیماری کا ذکر کر کے اس مرحلے کو ان کے لئے امتحان کی گھڑی قرار دیتے ہوئے کہا کہ سلطان منصورہ میں مقیم اپنی جانباز عساکر کی اعلیٰ کارگذاری کے منتظر ہیں۔ وہ اپنی بیماری کے ہاتھوں فی الحال معذور ہیں ورنہ وہ شوقِ جہاد میں آپ کے شانہ بشانہ موجود ہوتے۔ ملکہ شجرۃ الدر کے خطاب نے سپاہ کے تن بدن میں بجلیاں بھر دی تھیں۔ وہ اپنے دیرینہ حریف کو سبق سکھانے کے لئے بے قرار ہونے لگے۔ رئیس العساکر جاشنگیر ایبک نے نہایت تحمل مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی سپاہ ترتیب سے میدان میں اتاریں۔ دائیں اور بائیں بازو کے سالار بھی اس سے بھرپور تعاون کر رہے تھے۔ مملوک سپاہ کا جوش وجذبہ دیکھنے کے لائق تھا۔ وہ پہلی بار صلیبی قوت سے نبرد آزما ہونے والے تھے۔ یہ ایک طرح سے ان کا کڑا امتحان بھی تھا کہ وہ ایک بڑے حریف کے مقابلے میں کیسی کارگذاری کا مظاہرہ کرتے ہیں؟ تمام مملوک امرا اپنی سپاہ کے ضمن میں مطمئن اور بے خوف دکھائی دے رہے تھے۔ دونوں افواج کی صف آرائی کا عمل کافی دیر تک جاری رہا۔ ایک جانب شاہ لوئی نہم اپنے سالاروں اور عمائدین کے ساتھ اسلامی لشکر کا مشاہدہ وتجزیہ کرنے میں مصروف تھا تو دوسری طرف میلوں تک پھیلے ہوئے صلیبی لشکر کی صف بندی پر ملکہ شجرۃ الدر اور رئیس العساکر جاشنگیر ایبک کی گہری نگاہیں گڑی تھیں۔ صلیبی لشکر ایک مخصوص لباس میں ملبوس تھا جس میں صلیب کا نشان نمایاں تھا۔ شاہ لوئی نہم لشکر کے قلب میں موجود تھا۔ اس کے عقب میں ایک بڑی صلیب بھی موجود تھی جسے ایک بڑے رتھ پر نصب کیا گیا تھا۔ صلیب کو ساتھ رکھنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ صلیبی سپاہی کسی مرحلے پر کمزور پڑنے پر بھی میدان جنگ سے بددل نہ ہوں اور فرار ہونے کی کوشش نہ کریں بلکہ یسوع کے حق کی سربلندی کے لئے موت کو گلے لگانے والی مثال کو ہمیشہ یاد رکھیں۔

صلیبی لشکر میں ان کے کچھ حلیف مسلمان امیر بھی ان کے شانہ بشانہ موجود تھے جو اپنے اپنے سبز جھنڈوں کو اُٹھائے دور سے ہی دکھائی دے رہے تھے۔ ان مسلمان حلیفوں میں ایک شخصیت امیر مونس کی تھی۔ اسے ذی الحجہ 637ء میں سلطان نجم الدین ایوب نے جزیرہ سے معزول کرتے ہوئے مصر طلب کیا تھا۔ اسے اپنی جان کا خوف دامن گیر ہوا اور اس نے صلیبی علاقوں میں پناہ لینا بہتر سمجھا۔ اس نے وہاں پر پناہ گزین رہتے ہوئے جزیرہ کے رئیس العسا کر کو نہ صرف اپنی مٹھی میں کیا بلکہ خفیہ طور پر امیر الکرک الملک الناصر اور امیر حمص ابراہیم کو اپنے ساتھ ملایا۔ وہ ابھی نجم الدین ایوب کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے تھے کہ انہیں شاہ لوئی نہم کی آمد کی خبر مل گئی۔ انہوں نے سلطان نجم الدین ایوب کے مقابلے میں خود کو کمزور محسوس کرتے ہوئے چند شرائط پر شاہ لوئی نہم جیسی بڑی اور مضبوط قوت سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

ملکہ شجرۃ الدر کے ساتھ ساتھ کئی امرا کو صلیبی لشکر میں اسلامی پرچم دیکھ کر تاسف ہوا۔ جنگ کے آغاز سے قبل بہاء الدین زہیر خود سفارت لے کر صلیبی لشکر پہنچا۔ شاہ لوئی نہم جنگ کی مکمل تیاری کر چکا تھا۔ وہ مصر سے یروشلم تک ایک عظیم مسیحی سلطنت کے قیام کا خواب لے کر یہاں پہنچا تھا۔ پہلے معرکے کے آغاز پر اس کے مذہبی جنون کا پیمانہ انتہا کو چھو رہا تھا۔ اس نے نہایت حقارت سے نہ صرف سفارت ٹھکرا دی بلکہ کسی بھی صورت میں جنگ نہ ٹلنے کا واضح اعلان کیا۔ دن کے دوسرے پہر میں باقاعدہ جنگ کا آغاز ہوا۔ ملکہ شجرۃ الدر نے میدان میں موجود لشکر اسلامی کو آٹھ بڑے حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے بائیں بازو کو آگے بڑھایا۔ شمشیریں ٹکرانے لگیں، میدان کٹے پھٹے اعضاء سے بھرنے لگا۔ کشت و خون کا معرکہ شروع ہو چکا تھا۔ مملوک سپاہ بڑی شجاعت اور بہادری سے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ پہلے معرکے میں اسلامی لشکر کا سالار احمد طولانی تھا جس نے صلیبیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں سبق سکھانے کی پوری کوشش کی۔ شاہ لوئی نہم نے پہلے دن میں صرف ایک بڑے دستے کو میدان میں اتارا تھا۔ وہ ممالیک کے بارے میں بہت کچھ سن چکا تھا۔ دونوں جانب دفاعی حکمت عملی اختیار کی گئی تھی۔ لطف کی بات یہ تھی کہ شاہ لوئی نہم نے صلیبی لشکر کو استعمال کرنے کے بجائے اپنے مسلمان حلیفوں کو پہلے دن کے معرکے میں استعمال کیا تھا۔ شاید مقابلے پر مسلمان بھائیوں کو پا کر اسلامی لشکر نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ نہ کر پایا۔ پہلے دن میں صلیبیوں کی جانب سے پینسٹھ اور مسلمانوں کی جانب سے تیس افراد کام آئے۔



نوکتا جوخان اجنبی کو گرتے دیکھ کر پریشان سا ہو گیا تھا مگر اس نے خود پر بدحواسی کو مسلط نہیں ہونے دیا۔ ایک تیز چیخ کے ساتھ اس نے قاژی باشندوں کو للکارا اور اپنی چپٹی تلوار گھماتا ہوا اُن کی جانب بے ہنگم انداز میں بڑھتا چلا گیا۔ نوکتا جوخان کا باپ بدلتی ہوئی صورتِ حال کو بھانپ چکا تھا۔ شاید اسی لئے اس نے اپنے بیٹے کو باز رکھنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ بیٹے کو موت کے منہ میں جاتے دیکھ کر اس کے جذبۂ پدری نے جوش مارا اور وہ بھی للکارتا ہوا بیٹے کے تعاقب میں لپکا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اتنے افراد کے ساتھ بھڑنا خودکشی کے مترادف ہوگا مگر اسے پیٹھ دکھا کر بھاگنا یا لڑے بغیر مرنا بھی گوارا نہیں تھا۔

قاژی سردار کا حکم پا کر قبیلے کے نوجوان مطیع الدین کو اسی حالت میں چھوڑ کر ان دونوں کی جانب بڑھے۔ وہ تیز رفتاری سے ان کے گرد پھیلتے گئے۔ نوکتا جوخان اور اس کا باپ مکمل طور پر ان کے حصار میں تھے۔

''تمہارا سردار اپنے وعدے پر پورا اترا ہے۔ اس اجنبی کو نہ صرف شکار کر لیا گیا ہے بلکہ ایک نیا شکار بھی اب تمہارے سامنے موجود ہے۔ میرا حکم ہے کہ اسے کم سے کم زخم لگا کر قابو کیا جائے اور زندہ قبیلے میں لے جایا

جائے تاکہ قبیلے والوں کی پیاس بجھائی جا سکے''۔ قاژی سردار اپنی لاٹھی بے ہنگم انداز میں گھماتے ہوئے بولا۔ قاژی نوجوان سردار کا حکم پاتے ہی جوش و خروش کا مظاہرہ کرنے لگے۔

نوکتا جوخان کا جسم بھاری بھرکم تھا، اس لئے وہ چستی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا چنانچہ اس کا باپ اس کی کمر کی جانب آ گیا تھا۔ قاژی نوجوان دائرے کی شکل میں گھومتے ہوئے نیزے کی انیاں ان کو مارتے۔ وہ دونوں تلوار کی دھار سے ان کے واروں کو دائیں بائیں کر دیتے۔ یہ سلسلہ کچھ دیر تک جاری رہا۔ دونوں باپ بیٹے نہایت محتاط انداز میں مقابلہ کر رہے تھے۔ قاژی سردار وقت گزرنے پر جھنجھلاہٹ کا شکار ہونے لگا۔ اسی لمحے اس کی نگاہ کھلے میدان میں اُٹھنے والے گرد و غبار پر پڑی جو گھوڑوں کی ٹاپوں سے اُٹھ رہا تھا۔ وہ غور سے اس جانب دیکھنے لگا۔ کچھ ہی لمحوں میں اسے اندازہ ہونے لگا کہ گھوڑوں پر سوار لوگوں کے ارادے کیا ہو سکتے ہیں۔ اس لئے اس نے آواز بلند کرتے ہوئے اپنے نوجوانوں کو خطرے کا احساس دلایا۔ سردار کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ اس وقت منگولوں کی حدود میں موجود ہیں، اگر انہیں یہاں گھیر لیا گیا تو جان بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

قاژی نوجوان اپنے سردار کے اشارے پر اب جارحانہ انداز میں حملے کرنے لگے۔ وہ جلد از جلد موٹے منگول کو اپنے قبضہ میں لانا چاہتے تھے۔ اگر سردار انہیں منگول کو جان سے مارنے کا حکم دیتا تو شاید اب تک وہ اس کا کام تمام کر چکے ہوتے۔ اسے زندہ گرفتار کرنا خاصا مشکل کام تھا۔ نوکتا جوخان کے بائیں کندھے کے پاس نیزے کی انی رگڑ کھاتی ہوئی گزرنے لگی تو اس نے اس پر ہاتھ ڈال کر تیزی سے جھٹکا دیا۔ قاژی نوجوان کے پاؤں زمین سے اکھڑتے چلے گئے اور وہ نوکتا جوخان کے سر سے اُڑتا ہوا دوسری جانب موجود قاژی نوجوانوں کے نیزوں میں گر گیا۔ ایک چیخ اس کے حلق سے نکلی اور اس کا سر ڈھلک گیا۔ قاژی سردار یہ دیکھ کر غصے سے دیوانہ ہو گیا۔ اس نے موٹے منگول کو موت کی سزا سناتے ہوئے قاژی نوجوانوں کو یہ حکم دیا کہ وہ تیزی سے اس کا کام تمام کر کے یہاں سے اپنی حدود کی جانب بڑھنے کی کوشش کریں۔

میدان میں دکھائی دینے والے گھوڑے اب کافی واضح ہو چکے تھے۔ یہ دیکھ کر سردار نے واپسی اختیار کرنا مناسب سمجھی۔ اگر وہ اپنی حدود میں پہنچ کر قیام کرتا تو شاید وہ منگولوں کو یہ باور کرنے میں کامیاب ہو جاتا کہ وہ مجرم نہیں ہے۔ اس نے غیر محسوس انداز میں پیچھے ہٹنا شروع کر دیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے تیزی سے واپس لوٹنے کی کوشش کی تو قاژی نوجوان اپنے سردار کو بزدل سمجھیں گے اور اس کے عمل کو فرار قیاس کرتے ہوئے منگول کو چھوڑ کر اس پر حملہ آور ہو جائیں گے۔ اسی لمحے اس کے حلق سے ایک چیخ بلند ہوئی اور وہ زمین پر ڈھیر ہوتا چلا گیا۔ قاژی نوجوان اپنے سردار کی چیخ سن کر اس کی جانب متوجہ ہوئے۔ سردار کو زمین بوس ہوتے دیکھ کر ان کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔



جینانی سلطنت کے سرحدی محافظ کا سالار جوزیف آرام کر رہا تھا کہ اسے خبر ملی کہ منگول سپاہ کا ایک لشکر جینانی سلطنت کی جانب بڑھتا دکھائی دے رہا ہے۔ سرحدی محافظوں کا یہ دستہ دو سو افراد پر مشتمل تھا جو اس پہاڑی سے جنوب کی جانب دس فرلانگ کے فاصلے پر ایک غار میں مقیم تھا۔ اس کا کام سرحدی دخل اندازیوں کا قلع قمع کرنا اور جینانی سلطنت پر ہونے والے ہر قسم کے حملوں کی پیشگی خبر زار کے دربار تک پہنچانا تھا۔ چنگیز خان کی وفات کے بعد کسی دوسرے قاآنِ اعظم کی نگاہ جینانی سلطنت کی جانب نہیں اُٹھی، شاید اسی لئے سرحدی اخراجات کو کم کرنے کے لئے سپاہیوں کا ایک بڑا حصہ یہاں سے واپس بلا لیا گیا تھا۔ جوزیف منگول حملہ آوروں کی بابت سن کر لمحہ بھر کے لئے حیران رہ گیا۔ اس نے اس خبر کو پہلے پہل اپنا خواب تصور کیا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے

خبر لانے والے سے دوبارہ استفسار کیا تھا۔ جب اسے یقین ہوا تو وہ تیزی سے غار میں سے باہر نکلا۔ باہر نکلتے ہی وہ اس جانب نگاہیں دوڑانے لگا جہاں ایک چھوٹا سا دستہ برقائی خان کی قیادت میں جینائی سرحد کی جانب بڑھتا دکھائی دے رہا تھا۔

''حیرت انگیز!'' جوزیف بڑبڑایا۔ ''مگر یہ منگول درزے والے راستے کی جانب بڑھنے کے بجائے اس جانب کیوں جا رہے ہیں؟''

اس کا نائب بھی اس کے عقب میں پہنچ چکا تھا۔ جوزیف نے پشت پر کسی کی موجودگی محسوس کرتے ہوئے گردن گھمائی۔ نائب کا چہرہ دیکھ کر اس نے اپنے سوال کو دوہرایا۔

''مجھے بھی اس حرکت پر حیرت ہے کہ اگر یہ لوگ جینائی سلطنت میں داخل ہونا چاہتے ہیں تو یہ نیچی پہاڑی کی جانب کیوں بڑھ رہے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ اس جانب کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے''۔

''وہاں کیسی گڑبڑ ہو سکتی ہے؟'' جوزیف اُلجھے انداز میں بولا۔ ''بہر حال تم فوری طور پر اپنے سپاہیوں کو تیار کرو۔ ہم خود وہاں جا کر دیکھتے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے''۔

''کیا دربار خبر بھجوا دی جائے؟''

''نہیں! اس کی ضرورت نہیں ہے''۔

''تمام سپاہی ساتھ لئے جائیں یا ایک دستہ کافی ہوگا؟''

جوزیف اس پر ایک تیز نگاہ ڈال کر بولا۔ ''تم فضول باتیں بہت کرتے ہو۔ جتنے سپاہی ہو سکیں، تیار کر دو۔ دوسرا تمہیں میرے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم یہیں رہ کر نظر رکھو گے۔ اگر کوئی گھمبیر معاملہ درپیش ہوا تو میں تمہیں سرخ کپڑے کا اشارہ دے دوں گا۔ تم اسی وقت دربار کے لئے ایک قاصد روانہ کر دینا۔ سمجھ گئے ہو یا مزید کچھ سمجھانا باقی ہے؟''

نائب کھسیانا سا ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ جوزیف ضرگامی قبیلے سے نکلنے والے اس چھوٹے سے دستے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ شکل وصورت سے وہ سپاہی معلوم ہوتے تھے، کیونکہ ان کے لباس قریباً ایک سے دکھائی دے رہے تھے۔ ضرگامی قبیلے کے لوگ مختلف رنگوں کے لباس میں دکھائی دیا کرتے تھے۔ کبھی اسے کوئی ایسا واقعہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا کہ جب ضرگامی قبیلے کے لوگوں نے ایک ہی رنگ کا لباس زیب تن کیا ہو۔ اس نے خیالوں کو پرے دھکیلا اور نیچی پہاڑی کی سمت کچھ آگے بڑھ کر ایک بڑے پتھر پر پہنچا اور آگے کو جھک کر اس جانب ہونے والی سرگرمیوں کو غور سے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہاں جو کچھ بھی تھا اس کی نگاہوں کے حصار میں نہیں آ پایا۔



صلیبی لشکر سے نبرد آزمائی میں اٹھارہ دن بیت چکے تھے۔ رئیس العساکر ملکہ شجرۃ الدر کی ہدایت پر جارحانہ حملوں سے گریز کر رہا تھا۔ اس کی دفاعی حکمت عملی ایسی موثر تھی کہ صلیبی لشکر اٹھارہ دنوں میں پورا زور لگا لینے کے باوجود کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کر پایا۔ اسلامی لشکر کی جانب سے ابو خویلد نے دفاعی حکمت عملی سے انحراف کیا اور وہ جارحانہ انداز میں صلیبی صفوں میں گھستا چلا گیا۔ اس کے جرأت مندانہ فعل اور اعلیٰ شمشیر زنی کے مظاہرے نے صلیبی صفوں میں انتشار پیدا کر دیا تھا۔ صلیبی سپاہیوں کی گردنیں تن سے جدا کرتا ہوا جب وہ واپس لوٹا تو اس کا تمام جسم خون سے تر بتر تھا اور جسم پر بارہ گہرے زخم آئے تھے۔ ملکہ شجرۃ الدر نے اسے فوری طور پر سرکاری طبیب خانے میں منتقل کرتے ہوئے کہا تھا کہ صحت یابی کے بعد اسے اپنے اس جرم کی کڑی سزا بھگتنا

ہوگی۔ ملکہ شجرۃ الدر کی جانب سے یہ نہایت سخت اقدام تھا، جس نے دوسرے جوشیلے امرائے لشکر کو مقررہ قاعدے کی حدود پھلانگنے سے باز رکھا تھا۔

ملکہ شجرۃ الدر کو توران شاہ کی آمد کا بے چینی سے انتظار تھا۔ اسے گزشتہ ہفتے میں پہنچ جانا چاہئے تھا مگر وہ راستے میں بیمار پڑ گیا اور کئی دن تک بستر پر پڑا رہا۔ صحت یابی کے بعد اس نے تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا اور 29 ذی الحجہ کو دوپہر کے وقت منصورہ کے میدان میں پہنچ گیا۔ جنگ جاری تھی۔ توران شاہ کی آمد پر فلک شگاف نعرہ بلند ہوا اور جنگ میں تیزی پیدا ہوگئی۔ شاہ لوئی نہم مسلمانوں کی نئی کمک کی اطلاع پا کر پریشان ہوگیا۔ اس نے دفاعی حکمت عملی کو برقرار رکھتے ہوئے وہ دن نہایت مشکل سے گزارا۔ شام کو جنگ بندی پر لاشوں کا شمار کیا گیا تو میدان میں صلیبی سپاہیوں کی لاشیں کثرت سے پائی گئیں۔ یہ منظر صلیبی لشکر کے حوصلے پست کرنے کے لئے کافی تھا۔ توران شاہ نے خود آگے بڑھ کر پے در پے حملوں کا سلسلہ شروع کیا تھا جس پر وہ جوشیلے سپاہی جو حکم نہ ملنے پر دبے دبے انداز میں جنگ لڑ رہے تھے، شہ پاتے ہی اپنے جوہر دکھانے لگے۔

شام کو توران شاہ کی ہدایت پر سلطان نجم الدین ایوب کی موت کا باضابطہ اعلان کیا گیا۔ اپنے محبوب سلطان کے انتقال کی خبر پا کر مسلمانوں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ ملکہ شجرۃ الدر نے مملوک امراً کو پہلے سے توران شاہ کے انتخاب کی ہدایت کر رکھی تھی، اسی لئے توران شاہ کے نام کو متفقہ طور پر نئے سلطان کے لئے منظور کر لیا گیا۔ اگلی صبح جنگ کے آغاز سے پہلے باقاعدہ رسم تاجپوشی کا اعلان کیا گیا۔ تمام رات اسلامی لشکر میں سلطان نجم الدین ایوب کے لئے مغفرت کی دعائیں کی جاتی رہیں۔



ایک گھڑ سوار تیز رفتاری سے برقائی خان کے نزدیک آیا۔ برقائی خان قاڑی باشندوں کی سرکوبی کے خیال میں مستغرق تھا، پہلو میں حرکت محسوس کر کے چونک پڑا۔ برقائی خان نے سر کو جنبش دیتے ہوئے اس سے استفسار کیا تو اُس نے ہاتھ کے اشارے سے برقائی خان کی توجہ شمال کی جانب مبذول کرانے کی سعی کی۔ برقائی خان نے سر گھما کر دیکھا تو اُسے شمال کی جانب سے جینائی سپاہ کے سفید گھوڑوں کا دھندلا سا غول پہاڑی سے اُترتا ہوا دکھائی دیا۔ یہ فیصلہ بڑا مشکل تھا کہ قاڑی باشندوں سے نبٹنے کے ساتھ ساتھ جینائی لشکر کو بھی دعوتِ مبارزت دی جائے یا ان سے کنی کترا کے نکل جائے۔ برقائی خان نے لمحہ بھر میں انہیں بھی دیکھنے کا فیصلہ کیا اور سر اثبات میں ہلاتے ہوئے اسے اشارہ کیا تو اُس سپاہی نے اپنے گھوڑے کا رُخ موڑتے ہوئے واپسی کا رستہ اختیار کیا۔ اس نے تمام سپاہیوں کے گذرنے کے بعد گھوڑے کی پیٹھ پر ڈالا گیا ایک بڑا سا کپڑا اپنی تلوار کی نوک پر اُٹھا کر ضرگامی قبیلے کی جانب تیزی سے لہرانا شروع کر دیا۔ یہ ایک طرح کی علامت تھی کہ وہاں موجود باقی تمام سپاہی فوری طور پر ان کے عقب میں مدد کے لئے روانہ ہو جائیں۔ برقائی خان نے اپنے سواروں کو تیز رفتاری سے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ قاڑی باشندوں کو جینائی دستے کی مدد حاصل ہونے سے پہلے پہلے سبق سکھانا چاہتا تھا۔ منگول سپاہی جینائی دستے کو پہاڑی سے اترتا دیکھ کر حالات کی نزاکت کو سمجھ چکے تھے۔ گھوڑوں کی رفتار میں نمایاں اضافہ اس بات کا ثبوت تھا۔



سرس جنگ کے دوران دو بار صلیبی سپاہی کا بہروپ بدل کر صلیبی لشکر میں داخل ہوا تھا۔ وہ نہ صرف وہاں صلیبی سپاہیوں کے فنِ حرب کا بغور جائزہ لیتا رہا بلکہ وہاں سے کسی بڑی خبر کو اڑانے کی فکر میں بھی رہا مگر اس معاملے میں اسے کوئی خاص کامیابی نہیں حاصل ہو پائی تھی۔ آج توران شاہ کی آمد پر صلیبی لشکر کو کافی نقصان اُٹھانا

پڑا تھا، اسی افراتفری کا فائدہ اُٹھا کر وہ دوبارہ صلیبی لشکر میں داخل ہوگیا۔ چند دن صلیبیوں میں رہ کر اس نے اپنی مخصوص صلاحیت کے بل پر رومی زبان پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ وہ ان کے درمیان اس انداز میں رومی زبان میں بات چیت کرتا کہ صلیبی اسے مقامی سمجھنے کے بجائے ٹمپلرز کے گروہ کا کوئی فرد سمجھتے۔ ہیرس نے اپنی ہردلعزیز عادت سے کئی سپاہیوں کو گرویدہ کر لیا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ کسی بھی فرد کو اس پر شک نہ ہو پایا کہ وہ مسلمان جاسوس ہے۔ رات کے وقت شراب کا دور شروع ہوا تو ہیرس کے لئے امتحان کی گھڑی شروع ہوگئی۔ شراب سے انکار اس کے لئے برے نتائج پیدا کر سکتا تھا۔ وہ اس وقت ایک بڑے دستے کے سالار کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا۔

''تم قسطنطنیہ میں کس جگہ رہا کرتے تھے؟'' صلیبی سالار نے شراب کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

''قسطنطنیہ میں، میں مقدس کلیسا کے بائیں جانب واقع سینٹ پطرس نامی محلے میں رہا کرتا تھا۔ وہ بھی کیا دن تھے ماسٹر! بس مقدس باپ ایک دن خواب میں چلا آیا اور بولا تم میرے کیسے بیٹے ہو کہ میرے گھر پر باہر سے آکر دشمن قابض ہوگئے ہیں اور تم یہاں غفلت کی نیند سو رہے ہو۔ بس پھر کیا تھا، میں نے سب کچھ اپنے بھائی جوزف کے پاس چھوڑا اور لشکر کے ساتھ چلا آیا''۔ ہیرس گہری سانس بھر کر بولا۔

''قسطنطنیہ میں سینٹ پطرس نامی محلّہ میں نے کبھی سنا نہیں!'' سالار چہرے کو ہاتھ سے مسلنے لگا۔ ''خیر ہوگا کہیں؟ تم جام کیوں نہیں لے رہے؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''ماسٹر! میں جام نہیں لوں گا، میں نے مقدس ماں کے سامنے قسم کھائی ہے کہ جب تک خداوند یسوع کے گھر کو ناپاک دشمنوں سے چھڑا نہیں لوں گا ایک قطرہ شراب بھی حلق سے نیچے نہیں اتاروں گا''۔

''وہ دن اب زیادہ دور نہیں''۔ سالار بے ڈھنگے انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''دو ایک روز میں ہم یہ میدان مار ہی لیں گے۔ تم بے فکری سے دل کھول کر پیو۔ یہ شاہ لوئی کا مال ہے''۔

''مجھے افسوس ہے ماسٹر کہ میں یہ نہیں کر سکوں گا، میں اگر اب بہک گیا تو شاید وہ کام کبھی نہ کر پاؤں جس کے لئے مجھے میرے باپ نے اس دنیا میں بھیجا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کو میری ضد پر غصہ آ سکتا ہے مگر میں مقدس ماں کے سامنے کئے گئے وعدے کو توڑ نہیں سکتا''۔

''تم تو برا مان گئے برادر!'' سالار جلدی سے بولا۔ ''چلو آج کی شراب تمہاری طرف ادھار رہی، یروشلم میں پہنچ کر ساتھ ہی پئیں گے۔ میں یروشلم میں تمہیں تلاش کروں گا۔ مگر میں تمہیں تلاش کہاں کروں گا؟ اچھا کوئی بات نہیں۔ اتوار کی سروس میں کبھی نہ کبھی تو ملاقات ہو ہی جائے گی''۔ وہ شراب کے نشے میں بہکنے لگا تھا۔

''میں تو آج بڑا فکر مند ہوا ہوں کہ دشمنوں کی نئی کمک پہنچ گئی ہے اور افواہ گرم ہے کہ ابھی مزید کمک پیچھے پیچھے آ رہی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو ان کی تعداد ہم سے بڑھ جائے گی''۔ ہیرس تاسف بھرے لہجے میں رنجیدگی سے بولا۔

''یوں دل نہ چھوڑو!'' سالار خمار کے عالم میں اس کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''ایک چھوڑ دس بار کمک پہنچ جائے۔ شاہ لوئی کے بازوؤں میں بڑا دم ہے۔ اس نے یہاں کے کافی لوگ خرید لئے ہیں۔ تم دیکھ لینا ایک آدھ دن میں کوئی نہ کوئی بڑا عہدے دار شاہ لوئی کی مٹھی میں ہوگا۔ شاہ کے پاس بے شمار دولت ہے، حریص مسلمان خود بخود خوشبو سونگھتے سونگھتے پہنچ جاتے ہیں۔ اسی تاجر کی بات لے لو جس نے سلطان کی موت کی خبر شاہ لوئی کو لا کر دی تھی، خبیث اپنے انجام سے بے فکر شاہی خیمے میں رنگ رلیاں منا رہا ہے۔ ذرا جنگ ختم تو ہو لینے دو، دیکھ لینا اس کا حشر کیا کیا جائے گا؟'' سالار جام کو لہراتے ہوئے بول رہا تھا۔

اس کی بات سن کر ہیرس کے کان کھڑے ہوگئے۔ وہ تیزی سے بولا۔ ''تم اسی شخص کی بات کر رہے ہو جو یہ کہتا تھا کہ میں جامع مسجد منصورہ کے سامنے رہتا ہوں اور میں نے اپنی آنکھوں سے سلطان کی لاش دیکھی تھی؟''

''ہاں ہاں! مگر یہ سب باتیں تمہیں کیسے معلوم ہوئیں؟'' سالار چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ وہ اب مشکوک نگاہوں سے ہیرس کو گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے کبھی شراب پی ہی نہ ہو۔ ہیرس دل ہی دل میں اس کی قوتِ ارادی کا معترف ہوگیا۔

''اس میں چونکنے والی کون سی بات ہے؟'' اس نے منہ بنا کر جواب دیا۔

''یہ بات تو صرف چند بڑے سالاروں کو ہی معلوم ہے۔ تم تو عام سپاہی ہو!'' سالار مطمئن نہیں ہوا۔

''تم خوامخواہ شکوک و شبہات کا شکار ہو رہے ہو، میں کوئی غیب نہیں جانتا۔ تم جیسے ایک مہربان سے یہ سب معلوم پڑا تھا، میں تو اس خبیث کو جانتا تک نہیں، تمہارے منہ سے اس کا ذکر سنا تو اپنی بات کی تصدیق کرنا چاہی''۔ ہیرس نے بات سنبھالتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر سالار کے رویئے سے ناگواری جھلکنے لگی۔

''بھئی خفا ہونے کی کیا ضرورت ہے؟'' سالار اس کے مزاج کو سمجھ گیا تھا، اسے مناتے ہوئے بولا۔

''کیا کروں؟ ایسی جگہ پر ہوں جہاں ہر کوئی دشمن دکھائی دیتا ہے، دوسرے میرا منصب بھی کچھ ایسا ہے کہ ہر جانب سے آنکھیں کھلی رکھنا ضروری ہے''۔

''ممکن ہے کہ تم اپنے فرض کی انجام دہی کے لئے یہ سب صحیح سمجھتے ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ مجھے تمہارے اس بے ہودہ رویئے سے سخت تکلیف پہنچی ہے''۔ ہیرس روکھے لہجے میں بولا۔

''چلو بھئی اب غصہ تھوک دو۔ میں تو یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ ایک ایک جام ہو جائے۔ شاید اسی طرح تمہارا غصہ پہلے جیسی خوش مزاجی میں بدل جائے۔ خداوند کی قسم! آج بڑے دنوں بعد میں خود کو اتنا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں''۔ سالار منت سماجت پر اتر آیا تھا۔ ہیرس کے چہرے پر اس کی بات سن کر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کھل کر ہنسو یار!'' سالار ایک ہی سانس میں جام حلق میں اتار گیا۔ ساتھ بیٹھے سپاہی نے تیزی سے بڑھ کر اس کا خالی جام دوبارہ بھر دیا۔ شراب کی گندی بو سے ہیرس کا سر چکرا رہا تھا مگر وہ کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود پر قابو پائے ہوئے تھا۔

''میں نے ایک ہمدرد سے سنا ہے کہ یروشلم میں ہمارے استقبال کی تیاریاں زور و شور سے جاری ہیں''۔ ہیرس نے نئی بات شروع کی۔

''یروشلم میں ہی نہیں، بلادِ فلسطین کے ہر شہر میں کہو''۔ سالار سرشاری کے عالم میں بولا۔ ''شاہِ یروشلم عکہ میں تیار بیٹھا ہے، بس ایک خبر اسے پہنچنے کی دیر ہے، وہ اپنے لشکر سے بلادِ فلسطین میں ایسی قیامت برپا کرے گا کہ مسلمانوں کے ہوش اُڑ جائیں گے۔ شاہ لوئی کا کہنا ہے کہ وہ اس معرکہ میں کامیابی حاصل کر لیں پھر شاہ یروشلم کو بھی پیش قدمی کا عندیہ دے دیا جائے گا۔ سنا ہے کہ سلطان نجم الدین ایوب بڑا زور آور اور تجربہ کار شخص تھا، یہ اسی کا کارنامہ تھا کہ بلادِ مصر سے بلادِ شام تک اس کا سکہ چلتا تھا۔ شاہ لوئی نے اس کی موت کو مبارک خیال کرتے ہوئے یہ قیاس کیا ہے کہ اب کوئی طاقت ہمیں یروشلم پہنچنے سے نہیں روک سکے گی''۔

''مقدس باپ تمہاری باتوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے''۔ ہیرس آہ بھر کر بولا۔ ''شاہ لوئی کو چاہیے تھا کہ وہ یروشلم کا محاذ بھی کھول دیتے۔ اس طرح مسلمان دو حصوں میں بٹ کر رہ جاتے اور انہیں جلد ہی مغلوب کر لیا جاتا۔ خیر یہ تو بادشاہوں کا کام ہے۔ وہ زیادہ بہتر جانتے ہیں کہ کیا مناسب ہے؟'' ہیرس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ بالآخر وہ ایک بڑی خبر حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا مگر اس نے اپنی خوشی اور کامیابی کو سپاٹ چہرے

کے تلے ایسے دبا رکھا تھا کہ کوئی جان نہ پائے۔ ہیرس نے صلیبی لشکر میں انتشار کے حوالے سے یہ بھی معلوم کرلیا تھا کہ صلیبی سالار گومگو کا شکار ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مسلمانوں کو زیادہ مہلت ملنے کی صورت میں مزید کمک ملتی رہے گی۔ کوئی بھرپور فیصلہ کن حکمت عملی اختیار کی جائے۔ کچھ لوگ بلادِ مصر پر حملے کو شاہ لوئی کا غلط فیصلہ قرار دے رہے تھے۔ ہیرس جان چکا تھا کہ اب صلیبی لشکر میں زیادہ دن تک مدافعت کا دم باقی نہیں ہے۔ وہ نصف رات کے قریب سالار سے اجازت لے کر اٹھا اور صلیبی لشکر میں گھومنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں اسے یہ اندازہ ہوگیا کہ ایک سپاہی بدستور اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ سالار اس کی جانب سے واقعی مشکوک ہوگیا تھا۔ اس نے شاہ یروشلم کی باتیں جان بوجھ کر اس سے کی تھیں تاکہ اگر وہ مسلمان جاسوس ہے تو اپنے سالاروں کو یہ باور کرادے کہ بہت جلد ہی صلیبی ان سے اپنی زمین واپس لے لیں گے۔ یہ سالار کی نادانی تھی یا عقلمندی کہ اس نے اپنی مجلس میں موجود ایک سپاہی کو ہیرس کے پیچھے لگا دیا تھا جسے ہیرس پہلے دیکھ چکا تھا، اسی لئے وہ جلد ہی اس کے تعاقب سے آگاہ ہوگیا۔ ہیرس شاہی خیموں کی جانب نکل آیا تھا۔ یہاں پہرے دار اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہوشیار دکھائی دے رہے تھے۔ ایک محافظ نے اسے متنبہ کیا کہ وہ واپس لوٹ جائے، اس علاقے میں عام سپاہیوں کی آمد ممنوع ہے۔ ہیرس نے کندھے اچکاتے ہوئے واپسی اختیار کی۔ وہ جان بوجھ کر اسی سپاہی کی جانب بڑھا تھا جو کافی دیر سے اس کے تعاقب میں تھا۔ صلیبی سپاہی ہیرس کو یکا یک اپنی جانب آتا دیکھ کر گھبرا گیا۔ چالاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ تیزی سے اپنا رُخ دوسری طرف کر کے قریب موجود خیمے میں کچھ دیکھنے لگا۔ ہیرس جونہی اس کے پاس پہنچا تو اس کا دایاں ہاتھ حرکت میں آیا اور وہ سپاہی زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ ہیرس نے دائیں بائیں دیکھا۔ مشعلوں کی روشنی تاریکی مٹانے کے لئے ناکافی تھی۔ کئی سپاہی کھلے میدان میں پڑے اونگھ رہے تھے۔ ہیرس نے اس سپاہی کو سہارا دے کر خیمے کے ساتھ بٹھا دیا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ مختلف خیموں کے بیچ میں گھومتا رہا پھر موقعہ پا کر وہاں سے نکل آیا۔ اپنے لشکر سے تھوڑی دور اس نے صلیبی لباس اتار کر پھینک دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ صلیبی بھی کیسے واہیات لباس پہنتے ہیں کہ سانس ہی گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ وہ اب اپنے خیمے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں اطراف میں دور دور تک کا جائزہ لیتی رہیں۔ پھر وہ اسلامی لشکر میں داخل ہوگیا۔



برجی مملوک امیر برکیارک رات کے پہلے پہر میں توران شاہ کے خیمے میں چلا آیا۔ کچھ دیر پہلے اس نے خیمے میں سے رئیس العساکر جاشنگیر ایبک اور دیگر عمائدین کو نکلتے دیکھا تھا۔ توران شاہ کو تنہا پا کر اس نے ملاقات کرلینا مناسب سمجھا۔ خیمے کے محافظ نے اس کا چہرہ دیکھ کر اسے اندر جانے سے نہ روکا۔ وہ خیمے کا دبیز پردہ اُٹھا کر اندر داخل ہوگیا۔ توران شاہ بستر پر لیٹ چکا تھا۔ وہ تیز رفتاری سے سفر اور دن بھر کی جنگ کے باعث نہایت تھک چکا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ برکیارک کی شکل دیکھ کر اس نے پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجالی۔

''خیریت ہے برکیارک؟''

''میں سلطان کی خدمت میں کچھ ضروری امور پیش کرنے کا خواہشمند تھا، اسی لئے چلا آیا''۔

''اگر صبح ان امور پر بات چیت کرلی جائے تو کوئی حرج نہیں ہوگا''۔ توران شاہ نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

''میں سلطانِ محترم کی تھکان سے بخوبی آگاہ ہوں مگر مجبوری ہے۔ کچھ باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں دیر کرنا سلطان کے لئے درست نہیں ہوگا''۔ امیر برکیارک مؤدب انداز میں بولا۔

''بیٹھو!'' توران شاہ بستر پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''سلطان بخوبی جانتے ہیں کہ بندہ آپ کا پرانا وفادار اور خیر خواہ ہے''۔

''تمہید مت باندھو، کام کی بات کرو''۔

امیر برکیارک کے چہرے پر دھیمی سی ناگواری کا تاثر ابھرا مگر اس نے تیزی سے اسے مسکراہٹ میں بدل لیا۔ ''میں یہ کہنے کے لئے حاضر ہوا تھا کہ یہاں پہنچنے کے بعد کچھ ایسی باتیں سننے میں آئی ہیں جو آنے والے کل میں آپ کے لئے بہتر ثابت نہیں ہوں گی''۔

''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' توران شاہ اس کے پُراسرار لہجے پر جزبز ہو کر بولا۔

''مجھے معلوم ہے کہ کل صبح جنگ کے آغاز سے پہلے آپ کو باہمی رضامندی سے نیا سلطان منتخب کیا جائے گا مگر یہ منصب سلطانی عارضی ہوگا''۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' توران شاہ اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گیا۔

''میں نے وہی عرض کیا ہے جو آپ نے سماعت فرمایا ہے۔ مجھے یہاں پہنچے ہوئے زیادہ دیر نہیں گذری مگر میں اپنے محسن آقا اور نئے سلطان کے بارے یہاں کے لوگوں سے ان کی رائے حاصل کرنے سے غافل نہیں رہا۔ میں نے بڑی محنت سے یہ بات کھوج نکالی ہے کہ تمام امرأ اور عمائدین آپس میں متحد و متفق ہیں۔ وہ صرف صلیبی جنگ کے لئے آپ کو استعمال کر رہے ہیں۔ جونہی صلیبی جنگ کا فیصلہ ہوا وہ آپ کو اس منصب سے ہٹا دیں گے۔ آپ یہ بات تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ منصب سلطانی کے لئے ایک علیحدہ سرکاری مجلس انتخاب موجود ہے''۔

''مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تمام امرأ اور عمائدین سے میری بات چیت ہوچکی ہے، مجھے تو کوئی ایسی بات محسوس نہیں ہوئی۔ غالباً تمہیں وہم ہوا ہے یا کسی نے کوئی غلط خبر دی ہوگی''۔

''سلطانِ محترم! آپ میری قابلیت اور وفاداری پر شک کر رہے ہیں۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں نے آپ کی خدمت میں کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی''۔

''یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ عمائدین سلطنت یہ طے کئے بیٹھے ہیں کہ صلیبی جنگ کے اختتام کے بعد وہ مجھے معزول کردیں گے اور میری جگہ کسی دوسرے فرد کو سلطان بنائیں گے، مگر تم خود ہی سوچو کہ میرے بعد ایسا کون ہے جو بلادِ مصر سے لے کر بلادِ شام تک سلطنت کو سنبھال سکے۔ میرے پاس امورِ جہانبانی کا تجربہ ہے اور تو اور میرے باپ نے مجھے اپنی زندگی میں ہی بلادِ شام و شرقیہ کا منتظم بنا دیا تھا''۔

''امرأ و عمائدین کس فرد کو سلطان بنانے کے متمنی ہیں اس ضمن میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ یہ بات طے ہے کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ایسا کچھ ضرور ہوگا۔ آپ بااختیار سلطان ہیں، آپ جو مناسب سمجھیں وہی کریں''۔ امیر برکیارک سر جھکا کر بولا۔ اس کے چہرے پر اندیشے لرزتے دکھائی دے رہے تھے۔ توران شاہ اس کے چہرے کو کچھ دیر تک بغور دیکھتا رہا۔ اسے ماضی میں کوئی ایسی مثال یاد نہ تھی جب امیر برکیارک نے اس کے حق میں غلط سوچا یا کیا ہو، البتہ یہ شکایت ضرور تھی کہ وہ اپنے منصب کی حدود سے تجاوز کر جایا کرتا تھا۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے توران شاہ کو کوئی نقصان پہنچتا۔ امیر برکیارک نے توران شاہ کو سوچ میں ڈوبا دیکھ کر وہاں سے نکلنے کا ارادہ کیا۔ توران شاہ نے اس بات کو محسوس کرلیا۔

''تم شاید جانا چاہتے ہو؟''

''میرا خیال ہے کہ میں نے اپنی بات مکمل کرلی ہے، اب آپ کو آرام کرنا چاہئے تاکہ صبح کے لئے تازہ دم ہوسکیں''۔

''تم شاید مجھے کوئی مشورہ دینا چاہتے تھے؟''

''میں آپ کے حکم کا منتظر ہوں''۔

''ممکن ہے کہ جیسا تم نے بیان کیا ہے ویسا ہی کوئی کھیل میرے ساتھ رچایا جا رہا ہو۔ ایسے حالات میں، میں کوئی نیا تجربہ کرنے کا خواہشمند نہیں ہوں۔ تم بتاؤ ان حالات میں مجھے کیا قدم اُٹھانا چاہئے؟''

''میرے خیال میں آپ کو ایسے امرأ سے تعلق مضبوط بنانا چاہئے جو تہ دل سے آپ کے وفادار اور خیر خواہ ہوں۔ کچھ حریص امرأ کو داد و دہش کے ذریعے قابو میں رکھا جا سکتا ہے''۔

''ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہوگا۔ تم اب جانا چاہو تو جا سکتے ہو''۔ توران شاہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ امیر برکیارک اپنی بات مکمل کر چکا تھا۔ وہ جس مقصد کے لئے آیا تھا وہ پورا ہو چکا تھا۔ وہ ان عمائدین سلطنت کو کمزور کرنا چاہتا تھا جو انتظامِ سلطنت میں مضبوط خیال کئے جاتے تھے۔ اس کی نگاہ میں، کمزور اور زر خرید عمائدین کے ساتھ حکومت کرنا آسان کام تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ توران شاہ تو نام کا ہی سلطان ہوگا، اصل حکومت تو وہ ہی کرے گا۔ اپنے اقتدار کو مضبوط بنانے کے لئے ضروری تھا کہ اپنے مخالفین کو پہلے مرحلے میں ہی کچل ڈالا جائے۔ توران شاہ امیر برکیارک کے عزائم سے بے خبر اپنے منصب سلطانی کو مضبوط بنانے کی منصوبہ بندی میں مصروف تھا۔



مطیع الدین نیزے کے گھاؤ سے زمین پر گر پڑا تھا۔ اسے ان منگولوں کی بے وقوفی پر غصہ بھی آ رہا تھا، اگر وہ بے وقت نہ چیخ مارتے تو وہ اپنا دفاع عمدہ انداز میں جاری رکھتا اور کم از کم اس گھاؤ سے تو محفوظ رہ پاتا۔ قاڑی سردار کے منگولوں کی طرف متوجہ ہونے نے اسے موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ اپنے جسم سے بہنے والے خون کو روکنے کا بندوبست کر سکے۔ زبان دانتوں تلے دباتے ہوئے اس نے ران میں دھنسے ہوئے نیزے کو نکالنے کی کوشش کی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد نیزہ اس کی ران سے نکل آیا مگر خون کے بہاؤ میں تیزی آ گئی تھی۔ اس نے دائیں ہاتھ سے زخم کو دبائے رکھا اور بائیں ہاتھ سے اپنی قمیض گلے سے اتاری۔ وہ زمین پر گرے گرے منگولوں کو لڑتے ہوئے بھی دیکھ رہا تھا۔ یہ مرحلہ بڑا مشکل تھا۔ تکلیف کی شدت اور خون بہنے سے اس پر نقاہت غالب آ رہی تھی۔ وہ خود کو سنبھالے رکھنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کچھ ہی دیر میں اپنے زخم کو قمیض سے اچھی طرح لپیٹ کر باندھ دیا تھا۔ قاڑی نوجوانوں پر بھی اس کی کڑی نگاہ تھی۔ وہ اس کی جانب سے غافل ہو کر منگولوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے تھے۔ قاڑی سردار کچھ فاصلے پر اس کی جانب پشت کئے کھڑا اپنے نوجوانوں کی حوصلہ افزائی میں مصروف تھا۔ مطیع الدین نے سر گھما کر اوپر پہاڑ کی جانب دیکھا۔ وہاں کوئی دوسرا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اچانک اس کی نگاہ اپنی تلوار پر پڑی جو کہ اس سے تھوڑے فاصلے پر گری پڑی تھی۔ وہ آہستگی سے گھسٹتا ہوا تلوار کے پاس پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی نگاہیں بدستور سردار پر جمی ہوئی تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں اچانک قاڑی سردار نے مڑ کر اس کی جانب دیکھ لیا تو اسے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں مشکل پیش آئے گی۔ کچھ ہی لمحوں میں وہ تلوار کو اپنے قبضے میں لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے تلوار کو سہارا بناتے ہوئے اُٹھنا چاہا۔ ٹانگ سے اُٹھنے والے شدید درد سے اس کے حلق سے دبی دبی چیخ نکل گئی تھی مگر لڑائی کے شور اور ہنگامے نے قاڑی سردار کو اس سے بے خبر رکھا تھا۔ اچانک قاڑی سردار کے جسم میں حرکت دیکھ کر مطیع الدین کو اپنے جسم میں بجلیاں کوندتی محسوس ہوئیں۔ قاڑی سردار نہایت آہستگی سے پیچھے کی جانب ہٹ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ مطیع الدین کے بالکل سامنے پہنچ گیا تھا۔ وہ اس بات سے غافل تھا کہ اس کے پیچھے بھی کوئی موجود ہو

سکتا ہے۔ مطیع الدین نے اپنی تمام تر قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے جسم کا وزن ایک ٹانگ پر ڈالا اور تلوار اٹھا کے پورے زور سے وار کیا۔ تلوار قاڑی سردار کے کندھے کو کاٹتی ہوئی نیچے اتر گئی تھی۔ قاڑی سردار کے حلق سے اذیت بھری چیخ نکلی۔ اس کا بایاں شانہ کٹ کر جھولنے لگا۔ وہ زمین پر گر پڑا اور بری طرح تڑپنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے مطیع الدین کے لئے اب بھی نفرت جھلک رہی تھی۔ مطیع الدین اس کی صورت دیکھ کر دھیرے سے مسکرایا۔ اس نے اپنی کہی ہوئی بات آج پوری کر دی تھی کہ وقت آنے پر پتہ چلے گا کہ کون کس کا شکار بنے گا؟ قاڑی سردار مطیع الدین کے شکار کو نکلا تھا مگر قدرت نے اسے خود شکاری سے شکار بنا ڈالا تھا۔ قاڑی نوجوان اپنے سردار کی چیخ سن کر جونہی اس جانب متوجہ ہوئے تو نوئنا جو خان کا وار چل گیا۔ اس کی تلوار کئی نوجوانوں کو گھائل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ سردار کے مارے جانے سے قاڑی نوجوانوں میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ بازی پلٹتے دیکھ کر وہ فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ مطیع الدین ابھی ان کی زد میں کھڑا تھا لیکن قدرت کی جانب سے اس کی عمر ابھی باقی تھی کہ قاڑی نوجوان اس کے دائیں بائیں سے نکلتے چلے گئے۔ ان میں سے کسی کی ہمت نہیں پڑی کہ وہ مطیع الدین پر حملہ کرے۔ نوئنا جو خان قریباً ہانپتا ہوا ان کے عقب میں بھاگ رہا تھا۔ جونہی نوئنا جو خان کا باپ مطیع الدین کے پاس پہنچا تو مطیع الدین اس کی باہوں میں جھول گیا۔ نوئنا جو خان کا باپ اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر مطیع الدین کی بے ہوشی کے باعث اس کا سوال ادھورا رہ گیا۔ نوئنا جو خان نے بمشکل پہاڑی کے بالائی حصے تک قاڑی نوجوانوں کا پیچھا کیا۔ انہیں فرار ہوتا دیکھ کر وہ آہستہ قدموں سے نیچے چلا آیا۔ اجنبی کو اپنے باپ کی باہوں میں بے ہوش دیکھ کر اس نے برا سا منہ بنایا۔ ''بابا! قسم ہے جاودانی آسمان کی، میں نے آج تک اتنی جلدی جلدی بے ہوش ہونے والا یہ پہلا آدمی دیکھا۔ میں جب بھی اس کے پاس آیا ہوں یہ بس..... بابا! میں اتنی خوفناک شے تو نہیں''۔

''اپنی بیہودہ بکواس بند کرو اور اسے کندھے پر اُٹھا۔ شکر کر کہ اس نے قاڑی سردار کو بروقت ہلاک کر ڈالا ورنہ آج ہماری لاشیں بستی میں جانے کے بجائے قاڑی قبیلے میں جا رہی ہوتیں''۔

نوئنا جو خان نے اپنے باپ کی بات سن کر برا سا منہ بنایا۔ دوسرے لمحے اس نے ایک بار پھر مطیع الدین کو اپنے کندھے پر اُٹھا لیا۔ مطیع الدین کو کندھے پر اُٹھانا اس کے لئے کوئی نیا کام نہیں تھا۔ اس کی نگاہ قریب آتے ہوئے گھوڑوں پر پڑی تو وہ چونک اُٹھا۔ اس نے اپنے باپ کو بھی اس جانب متوجہ کیا۔ یہ وہی منگول سپاہی دکھائی دیتے تھے جو آج صبح ہی ان کے قبیلے میں آئے تھے۔



توران شاہ کی رسم تاجپوشی کا انعقاد منصورہ کے پڑاؤ میں کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ ملکہ شجرۃ الدر نے بوقت صبح صادق ایک طویل ملاقات میں اُسے دیگر پیش آمدہ امور سے باخبر کر دیا تھا۔ توران شاہ نے دبے لفظوں میں عمائدین کی رضامندی اور وفاداری کے ضمن میں استفسار کیا۔ ملکہ شجرۃ الدر نے تمام لوگوں کو سلطان نجم الدین ایوب کا وفادار قرار دیا۔ ملکہ شجرۃ الدر اس کے دل میں چھپے اندیشوں کو نہ بھانپ سکی ورنہ عمائدین سلطنت کی طرف سے اس کے تمام شکوک و شبہات کا ازالہ کر دیتی۔ توران شاہ نے اپنے باپ کی تقلید کرتے ہوئے سفید ریشمی شاہی لباس زیب تن کیا جس پر چمکدار نقرئی پٹیاں بنی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے حفاظتی دستے کے جلو میں اپنے خیمے سے نکلا اور پڑاؤ کے وسط میں تیار کئے گئے چبوترے پر پہنچ گیا۔ اس کے دائیں جانب قاضی عز الدینؒ اور بائیں جانب رئیس العساکر جاشنگیر ایبک موجود تھے۔ چبوترے پر لگائی گئی کرسیوں پر دیگر عمائدین اور امرأ موجود تھے۔ قاضی عز الدینؒ نے سب سے پہلے سلطان نجم الدین ایوب کے لئے فاتحہ خوانی کی، اس کے بعد اس نے

مجلس انتخاب کا وہ فیصلہ سنایا جس میں متفقہ طور پر توران شاہ کو تخت بلادِ مصر و شام کا خود مختار سلطان منتخب کیا گیا تھا۔ غیاث الدین توران شاہ کی سلطانی کے اعلان پر لشکر اسلامی میں تکبیر کے نعرے بلند ہونے لگے۔ توران شاہ نے اپنے خطاب میں نجم الدین ایوب کے سابقہ طرزِ عمل کو جاری رکھنے کے عزم کا اعادہ کیا اور تمام مسلمان حکمرانوں سے استدعا کی کہ وہ صلیبی لشکر کی مدد کرنے کے بجائے اپنے دین اسلام کی خدمت کو ترجیح دیں۔ علاوہ ازیں اس نے صلیبی لشکر کے خلاف جارحانہ جنگ کا بھی اعلان کیا۔ اس نے اپنے لئے الملک المعظم کا لقب اختیار کیا۔ ان معاملات سے فارغ ہو کر اس نے سابقہ امراء اور عمائدین کے عہدوں میں بھی تبدیلیاں کیں۔ امیر برکیارک کو اپنا نائب السلطنت مقرر کرتے ہوئے اس نے چیدہ چیدہ مناصب پر برجی ممالیک کو مقرر کیا۔ برجی ممالیک کی بڑی تعداد اس کے ساتھ حصن کیفا سے آئی تھی۔ جن امراء نے اسے اپنا سلطان منتخب کیا تھا، اُن میں سے قریباً اسی فی صد لوگوں کو ان کے عہدوں سے معزول کر دیا گیا تھا۔ ملکہ شجرۃ الدر سلطان توران شاہ کے ان اقدامات پر محض پہلو بدل کر رہ گئی۔ وہ اب امورِ سلطنت میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ البتہ اس نے دبے الفاظ میں توران شاہ کے ان غیر متوقع فیصلوں کو غلط قرار دیا۔ برجی ممالیک ایک عرصے سے عسکری معاملات میں پھنسے رہے تھے۔ توران شاہ کی اس عنایت پر وہ خوشی سے دیوانے دکھائی دے رہے تھے۔ بحری ممالیک کافی عرصے سے سلطان نجم الدین ایوب کے ساتھ مختلف مقامات پر اپنی خدمات انجام دے رہے تھے چنانچہ ان کے لئے یہ اعلان بے حد دل شکن تھا۔ توران شاہ اپنے اقتدار کو مضبوط بنانے کی فکر میں یہ بات بھول چکا تھا کہ سلطان نجم الدین ایوب نے ان امراء کو ان کی خاص صلاحیتوں کی بنا پر اعلیٰ عہدے سونپ رکھے تھے۔ توران شاہ کے خطاب و اعلانات کے بعد اس کی عام بیعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ بحری ممالیک نے نہایت خاموشی سے اس کی بیعت کرتے ہوئے اپنے عہدے توران شاہ کے ساتھ آئے ہوئے برجی ممالیک کے حوالے کر دیئے۔ بیعت کا سلسلہ زیادہ وسیع نہیں کیا گیا تھا۔ دن کے پہلے پہر میں تمام امور کو نبٹا لیا گیا۔ اسی وقت شاہ لوئی نہم کی جانب سے سفارت پہنچی جس میں توران شاہ کو سلطان منتخب کئے جانے پر مبارکباد کے علاوہ آج کے دن میں جنگ نہ کرنے کا مژدہ بھی دیا گیا تھا۔ توران شاہ نے قاصد کو یہ پیغام دے کر واپس کر دیا کہ یہ معاملات ہمارے لئے ایسے ہی ہیں جیسے ایک وقت کا کھانا۔ تم اپنی افواج میدان میں اتارو، ہم انشاء اللہ آج ہی فیصلہ کر دیں گے کہ کون معرکہ میں بازی لے جائے گا۔ قاصد نو منتخب سلطان کا پیغام لے کر واپس لوٹ گیا لیکن شاہ لوئی نہم نے اس دن اپنی فوجیں میدان میں نہیں اتاریں۔ شاید وہ یہ بات جانتا تھا کہ نئے سلطان کی موجودگی میں مسلمانوں کا جوش و جذبہ دیوانگی سے کم نہیں ہوگا۔ وہ تمام دن دیگر مصروفیات کی نذر ہو گیا۔



برقائی خان تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے نیچی پہاڑی کے دامن میں پہنچ گیا تھا۔ اسے قاڑی باشندے فرار ہوتے دکھائی دیئے تو وہ یہ سمجھا کہ شاید منگول سپاہیوں کی آمد سے وہ خوفزدہ ہو کر میدان چھوڑ گئے ہیں۔ اُسے اب جینائی دستے کا بھی انتظار تھا جو کافی قریب دکھائی دے رہا تھا۔ فو ئناجو خان اور اس کے باپ کو پہاڑی سے نیچے آتا دیکھ کر برقائی خان نے وہیں رُکنے کا فیصلہ کیا۔ سوئے فو ئناجو خان کے کندھے پر کچھ دکھائی دے رہا تھا جسے برقائی خان شناخت نہ کر پایا۔ وہ کبھی فو ئناجو خان پر نگاہ ڈالتا تو کبھی جینائی سپاہیوں کی جانب۔ تھوڑی دیر میں فو ئناجو خان اپنے باپ کے ساتھ نیچے اُتر آیا۔ اس کے باپ نے برقائی خان کو سامنے پا کر تیزی سے زمین پر جھک کر تعظیم پیش کی۔ فو ئناجو خان نے اپنے باپ کی تقلید کرنا چاہی مگر برقائی خان نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ وہ اس کے کندھے پر لدے انسانی جسم کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

''یہ کسے اُٹھا رکھا ہے اور اوپر کیا ہو رہا تھا؟'' برقائی خان نے سوال کیا۔

''قا آن زادے! میں بتاتا ہوں''۔ بوڑھا منگول آگے بڑھ کر بولا۔ ''میرا یہ بیٹا تھوڑا سا بے وقوف ہے، صبح اس نے خبر دی کہ ایک اجنبی پہاڑی پر بے ہوش پڑا ہے، میں اسے چھوڑ کر شکار کئے ہوئے ریچھ کو لے آیا ہوں تو مجھے بڑا غصہ آیا۔ میں اس کے ہمراہ نیچی پہاڑی پر چلا آیا کہ اس اجنبی کو ساتھ لے کر بستی میں پہنچوں مگر یہاں پہنچ کر دیکھا کہ وہ قاڑی باشندوں سے نبرد آزما ہے۔ ہم نے اس کی مدد کرنے کی کوشش کی، ہمارے قریب پہنچنے سے پہلے ہی قاڑی باشندوں نے اسے زخمی کر ڈالا۔ جانے کیوں قاڑی اسے لے جانے کے بجائے ہماری جانب متوجہ ہو گئے اور انہوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ بس جاودانی آسمان کا کرم تھا کہ جان بچ گئی۔ اس اجنبی نے بروقت قاڑی سردار کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ قاڑی لوگ اپنے سردار کی موت دیکھ کر فرار ہو گئے''۔

''زندہ ہے کیا؟''

''ہاں نبض دیکھی ہے میں نے، چل رہی ہے''۔

''کچھ پتہ چلا کہ کون ہے؟''

''نہیں! میں پوچھنے ہی والا تھا کہ یہ بے ہوش ہو گیا''۔

''ذرا اس کا چہرہ تو دکھاؤ''۔

بوڑھے منگول نے فو ئناجو خان کو اشارہ کیا۔ فو ئناجو خان نے آہستگی سے اجنبی کو کندھے سے اتار کر زمین پر لٹا دیا۔ اس کے کپڑے خون سے سرخ ہو رہے تھے اور گردن ڈھلکی ہوئی تھی۔ فو ئناجو خان نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اس کا چہرہ برقائی خان کی جانب کیا۔ مطیع الدین کا چہرہ دیکھتے ہی برقائی خان کا پورا جسم جیسے زلزلے کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس پر کپکپی سی طاری ہونے لگی۔ وہ گھوڑے سے پھسلتا ہوا تیزی سے نیچے اُتر آیا۔ وہ دوست جس کی تلاش میں اس نے بلادِ اردوئے زریں کے سارے ویرانے چھان مارے تھے، وہ اس کے سامنے زمین پر خون میں تر بتر پڑا تھا۔

''میرا بھائی...... میرا دوست!'' برقائی خان کے منہ سے بمشکل نکلا۔ وہ اس کا سر اپنی گود میں لئے دیوانہ وار اُسے چومے جا رہا تھا۔ منگول سپاہی تعجب سے اپنے سالار کی حرکات دیکھ رہے تھے۔ فو ئناجو خان اور اس کے باپ کے چہرے کے تاثرات بھی اُن سے مختلف نہ تھے۔ اسی لمحے جینائی دستے کا سالار جوزیف اپنے سپاہیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ منگول سپاہی اپنے سالار برقائی خان کی بے ساختہ حرکات کی جانب متوجہ تھے، جنیائی سپاہیوں کی چاروں جانب موجودگی بھانپ کر چوکنے ہو گئے۔ جنیائی دستے نے منگولوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔



ایک بڑے خیمے میں تیس کے قریب لوگ موجود تھے۔ ان سب کے چہروں پر پریشانی چھائی ہوئی تھی۔ یہ سب بحری ممالیک تھے جنہیں آج سلطان توران شاہ نے ان کے عہدوں سے معزول کر دیا تھا۔ وہ اب اعلیٰ عہدیداروں کے بجائے عام سپاہی بن چکے تھے۔ انہیں ان کے اعلیٰ خیموں میں سے نکال کر عام سپاہ کے خیموں میں پہنچا دیا گیا تھا۔ ان میں سے اکثر پر غم و غصے کی کیفیت طاری تھی۔

انہی میں بیبرس بھی تھا۔ وہ نجم الدین ایوب کے عہد میں سلطانی دستے کا امیر مقرر تھا۔ توران شاہ نے اسے بھی معزول کر دیا تھا۔ یہاں موجود شخصیات میں فارس الدین اقطائی، احمد طولائی، آقسنر، علم الدین جینی، بلی چولاک، احمد قزوینی اور عبداللہ قاف نمایاں تھے۔ یہ لوگ سابقہ دور میں اہم عہدوں پر فائز تھے۔ ان کے علاوہ

دیگر لوگ بھی اعلیٰ عہدیدار تھے مگر ان کی اہمیت صرف مخصوص علاقوں تک محدود تھی۔ سلطان توران شاہ کے حکم نے ان کے دل میں نفرت بھر رکھی تھی۔

''یوں چپ بیٹھنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا''۔ علی چولاک بولا۔

''اب ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟'' ایک امیر بے بسی کے عالم میں بولا۔

''میں نے سوچ لیا ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہوگا''۔ فارس الدین اقطائی گھمبیر لہجے میں بولا۔ اس کی بات سن کر سب چونک پڑے۔

''مجھے آپ سب لوگوں کی حمایت درکار ہے۔ میں جو سوچ رہا ہوں، اس کی کامیابی راز داری اور مکمل اتحاد کی متقاضی ہے۔ مجھے امید ہے آپ سب لوگ اپنے اپنے مناصب پر دوبارہ فائز ہونے کے خواہشمند ہوں گے''۔

''تم کھل کر بتاؤ، ہماری فکر نہ کرو، ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ ہماری منزل بھی ایک ہی ہے۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا ہے۔ اب اگر یہ ناؤ بھی ڈوبے گی تو سب کا ایک ہی انجام ہوگا''۔ احمد چولاک جلدی سے بولا۔

فارس الدین اقطائی کی نگاہیں دوسرے لوگوں کی جانب اُٹھ گئیں۔ وہ سب اس کا ساتھ دینے پر پوری طرح آمادہ دکھائی دے رہے تھے۔

''تم سب لوگ یاد رکھو کہ میری منصوبہ بندی ناکامی کا شکار ہوئی تو تم میں سے کوئی زندہ نہیں بچ پائے گا۔ اس لئے ایک بار پھر سوچ لو''۔

''اقطائی! تم بجھارتیں بجھوائے جاؤ گے یا کچھ منہ سے بھی پھوٹو گے؟'' عبداللہ قاف منہ بنا کر بولا۔

''اقطائی تو ہمیں پہلے ہی خوفزدہ کرنے پر تلا ہے کہ اگر کچھ کرنا بھی ہو تو ہم پہلے ہی خوف کا شکار ہو جائیں تاکہ وقت پڑنے پر ہمارے ہاتھ پیر ہی پھول جائیں''۔ احمد قزوینی ہنستا ہوا بولا۔

''بات مذاق میں مت اُڑاؤ''۔ فارس الدین اقطائی بدستور سنجیدگی سے بولا۔ ''میں توران شاہ کو راہ سے ہٹانے کی منصوبہ بندی کر رہا ہوں اور یہ کام کوئی مذاق نہیں ہے''۔

''تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا اقطائی!'' علم الدین جینی بے اختیاری کے عالم میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

''میں اسی لئے کہہ رہا ہوں کہ میری بات تحمل سے سنو اور پھر فیصلہ کرو کہ کیا تم سب لوگ میرا ساتھ دے سکتے ہو یا نہیں؟''

''اقطائی!'' بیبرس نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔ ''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم اس وقت ایک نازک صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ ہمارے سامنے صلیبی لشکر موجود ہے جو ہمیں ہر قیمت پر مٹانے کے درپے ہے۔ اسی سلسلے میں پہلے سلطان نجم الدین ایوب کی موت کو کافی دن تک مخفی رکھا گیا تھا کہ کہیں اسلامی لشکر بددلی کا شکار نہ ہو جائے۔ اگر ان حالات میں سلطان توران شاہ کے ساتھ کوئی ایسا ناگہانی واقعہ رونما ہوا تو اس کے نتائج کیا نکل سکتے ہیں؟''

''میں نے سب پہلوؤں پر اچھی طرح غور کر لیا ہے۔ تم صلیبی لشکر کی فکر نہ کرو۔ ہمارا ہر منصوبہ صلیبی لشکر کی سرکوبی کے بعد ہی عمل میں آئے گا۔ میں اس بات کو فراموش نہیں کر سکتا کہ جب تک ہماری زمین ہمارے قبضے میں ہے تب تک ہی ہمارا عہدہ اور منصب باقی ہے۔ صلیبی لشکر پر کل ایسا خوفناک حملہ کیا جائے گا کہ وہ میدان چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گا''۔

''اگر صلیبی لشکر کا معاملہ نبٹ جائے تو اس کے بعد میں تمہارا ہر طرح سے مدد کرنے کو تیار ہوں''۔ بیبرس نے جواب دیا۔ اس کے بعد فارس الدین اقطائی نے اپنا منصوبہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ وہ لوگ فارس الدین اقطائی کے منصوبے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے رہے۔ گفتگو کے آخر میں فارس الدین اقطائی نے مسکراتے ہوئے جب یہ انکشاف کیا کہ اس تمام منصوبہ سازی میں رئیس العساکر جاشنگیر ایبک کی رضامندی بھی شامل ہے تو وہاں موجود سب لوگوں کے چہروں پر حیرت و مسرت چھانے لگی۔



برقائی خان جینائی دستے کی آمد پر اُٹھا۔ اس نے قوینا جو خان کے باپ کو قریب بلایا۔ قریب آنے پر برقائی خان نے مطیع الدین کو اس کے حوالے کیا اور ہدایت دی کہ وہ اسے گھوڑے پر لاد کر تیز رفتاری سے بستی میں لے جائے اور اس کی مرہم پٹی کا بندوبست کیا جائے۔ برقائی خان نے اسے واضح لفظوں میں بتا دیا کہ اس اجنبی کی جان ہر قیمت پر بچانی ہے کیونکہ وہ اس کے لئے بڑا اہم ہے۔

مطیع الدین کے بے ہوش جسم کو گھوڑے پر لاد کر جونہی بوڑھا منگول روانہ ہونے لگا تو جوزنیف نے اسے روک دیا۔

''یہاں سے کوئی شخص اتنی دیر تک واپس نہیں لوٹ سکتا جب تک مجھے یہ نہ معلوم ہو جائے کہ منگولوں کو جرأت کیسے ہوئی کہ وہ ہمارے علاقے میں بلا اجازت دندناتے پھریں''۔

''جینائی! ہوش کے ناخن لو اور تمیز کے دائرے میں رہ کر بات کرو، تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہاں اردوئے زرّیں کے قاآنِ اعظم کے چھوٹے بھائی برقائی خان موجود ہیں''۔ ایک سپاہی آپے سے باہر ہوتا ہوا بولا۔

''قاآن کا بھائی ہو یا کسی غریب کا۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں، مجھے صرف اپنے سوال کا جواب چاہئے''۔ جوزنیف اکھڑ لہجے میں بولا۔

''تمہیں تمہارے سوال کا جواب مل جائے گا، ہم سب یہیں ہیں۔ یہ شخص زخمی ہے، کافی خون بہہ چکا ہے اس کا۔ اسے طبی مدد کی فوری ضرورت ہے۔ اسے جانے دو، میں خود تمہیں تمہارے سوال کا جواب دوں گا۔ میرا نام برقائی خان ہے''۔

''میں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا......''

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو اور یہ بھی مت بھولو کہ تم اس وقت منگولوں کی سرزمین پر کھڑے ہو۔ میں چاہوں تو تمہارے گھوڑوں کے نیچے سے اسی وقت یہ زمین کھینچ لی جائے گی''۔ برقائی خان نے سرد لہجے میں اسے متنبہ کیا۔

''قاآن زادے! ایسی باتیں کرنا بند کرو اور سیدھی طرح سے میری بات کا جواب دو۔ دوسری صورت میں، میں اپنے سپاہیوں کو حملہ کرنے کا حکم دے دوں گا''۔ جوزنیف سخت لہجے میں بولا۔

''ذرا پیچھے مڑ کر دیکھو''۔ برقائی خان نے اطمینان سے اس کی توجہ منگول سپاہ کی جانب مبذول کرائی جو کہ ضرگامی قبیلے سے برقائی خان کا تعاقب کرتے ہوئے پہنچ چکی تھیں اور اب جینائی سپاہیوں کو اپنے حصار میں لے رہی تھیں۔ جوزنیف یہ دیکھ کر پریشان سا ہو گیا۔

''میں تمہیں ایک موقعہ اور دیتا ہوں۔ اس زخمی کو روانہ ہونے دو۔ میں ابھی یہیں موجود ہوں''۔ برقائی خان نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔ اسے جانے دو''۔ جونزیف نے اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ بوڑھا منگول تین سپاہیوں کے ساتھ مطیع الدین کو گھوڑے پر لادے وہاں سے ضرگامی بستی کی جانب روانہ ہوگیا۔ اسے جاتا دیکھ کر برقائی خان نے جست لگائی اور اپنے گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ وہ گھوڑے کو بڑھاتے ہوئے جونزیف کے مقابل آن کھڑا ہوا۔

''جینانی امیر!'' برقائی خان سرد لہجے میں گویا ہوا۔ ''آج مجھے ایک ایسی خوشی نصیب ہوئی ہے کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تمہارا سر ابھی تک دھڑ پر موجود ہے۔ میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ واپس جا رہا ہوں۔ اگر تم نے کوئی شرارت کرنے کی کوشش کی تو میں صرف ایک بار جان بخشتا ہوں دوسری بار میری تلوار بات کرتی ہے۔ میں یہاں تم سے مقابلہ کرنے نہیں آیا ہوں۔ میری آمد کا مقصد وہی زخمی شخص تھا، اس کی مجھے ایک عرصے سے تلاش تھی۔ سمجھ گئے تم؟''

''قاآن زادے! تمہارے اس خونخوار لہجے سے میں خوفزدہ ہونے والا نہیں۔ بے شک میرے سپاہیوں کی تعداد تھوڑی سہی مگر ان کی جرأت منگولوں نے ابھی دیکھی نہیں''۔ جونزیف بگڑ کر بولا۔

''میرا خیال ہے تم واقعی اپنی جان گنوانے پر تلے ہو''۔ برقائی خان نے کہا۔

''میں بہادر جینانی ہوں، جان کی پرواہ بزدل منگولوں کو ہوتی ہوگی''۔ جونزیف طنزیہ لہجے میں بولا۔ برقائی خان اس کی بات پر محض مسکرا کر رہ گیا۔

''جینانی سپاہیو!'' برقائی خان بلند آواز میں بولا۔ ''میرا مقصد تم لوگوں سے اُلجھنا نہیں ہے۔ تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو کہ تم اس وقت منگولوں کی زمین پر کھڑے ہو۔ میں نے تمہارے امیر کو واپس لوٹنے کا مشورہ دیا ہے مگر وہ جان بوجھ کر تم لوگوں کو ہلاکت میں ڈالنے پر تلا ہے۔ تم اپنے عقب میں دیکھ سکتے ہو کہ منگول سپاہی کتنی تعداد میں ہیں اور کیسے چاق و چوبند کھڑے ہیں۔ میں یہاں خون خرابہ نہیں چاہتا۔ میں تمہارے امیر کو تنہا مقابلے کی دعوت دے رہا ہوں، وہ اپنی مردانگی کا جس قدر مظاہرہ کرسکتا ہے کر لے، تاکہ اس کے دل میں کوئی حسرت باقی نہ رہے۔ اگر تم لوگوں میں سے کسی نے اس کی مدد کرنا چاہی تو وہ اپنے انجام سے واقف رہے''۔

جینانی سپاہی خود کو منگولوں کے نرغے میں دیکھ کر پریشان ہورہے تھے۔ جب انہوں نے برقائی خان کی بات سنی تو لمحہ بھر کے لئے حیرت میں مبتلا ہوگئے کہ منگولوں کی سفاکی اس قدر نرمی میں کیسے بدل گئی ہے۔

''تم میری توہین کر رہے ہو۔ میرے سپاہیوں کو میرے خلاف بھڑکانے کے ارتکاب میں تمہاری سزا موت مقرر کردی گئی ہے قاآن زادے۔ سپاہیو! اپنے امیر کے حکم کی تعمیل کرو اور منگولوں پر ٹوٹ پڑو، ان میں ایک بھی واپس جانے نہ پائے''۔ جونزیف تیز لہجے میں بولا۔ دوسرے لمحے اس کی سٹی گم ہونے لگی۔ تمام سپاہی اپنی جگہ ساکت کھڑے تھے۔ وہ حالات کی نزاکت بھانپ چکے تھے۔

''تم دیکھ چکے ہو کہ کوئی سپاہی خوامخواہ موت کے منہ میں جانے کو تیار نہیں ہے۔ بہتری اسی میں ہے کہ اپنی سپاہ کو لے کر واپس لوٹ جاؤ''۔ برقائی خان نے کہا۔ جونزیف اپنی ہتک پر تلملا اُٹھا۔ اس نے تنہا ہی مقابلے پر آنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ اپنی نیام سے تلوار نکالتا ہوا گھوڑے سے نیچے اتر آیا تھا۔ وہ تلوار کو ہوا میں لہراتے ہوئے برقائی خان کو مقابلے پر اکسا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ برقائی خان گھوڑے سے نیچے اترتا، فوئنا جو خان اپنی تلوار بے نیام کرتے ہوئے آگے بڑھا۔

''قاآن زادے! اگر اس غلام کو یہ شرف بخشا جائے تو مہربانی ہوگی''۔

برقائی خان گول مٹول نوجوان کی جرأت پر مسکرایا اور سر سے اثبات کا اشارہ کیا۔

''مجھے امید ہے کہ تم منگولوں کی عزت برقرار رکھو گے''۔ برقائی خان نے اس کی ہمت بندھائی۔

فوئنا جو خان تلوار لہراتا ہوا جونزیف کے مقابل پہنچ گیا تھا۔ جونزیف ایک ادنیٰ منگول کو مقابلے میں پاکر مشتعل ہوگیا۔ اس نے پوری قوت سے وار کیا۔ فوئنا جو خان اپنے وزن کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے نہ صرف اسے روکنے میں بلکہ ایک بھاری بھرکم گھونسے سے جونزیف کے ہوش اڑانے میں بھی کامیاب ہوگیا۔ جونزیف گھونسے کی ضرب سے اچھل کر زمین پر گرا۔ برقائی خان فوئنا جو خان کی حاضر دماغی دیکھ کر متاثر ہوا۔ فوئنا جو خان نے تھوڑی دیر میں جونزیف کی تلوار دور پھینک کر اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا۔ جونزیف کے کپڑے تار تار ہو چکے تھے۔ جسم پر پڑنے والی ضربوں کے نیل واضح دکھائی دے رہے تھے۔ جب وہ بالکل نڈھال ہوگیا تو فوئنا جو خان پیچھے ہٹ گیا۔ اسی لمحے ایک تیر جونزیف کے سینے میں پیوست ہوگیا۔ یہ تیر کسی جینانی نے چلایا تھا۔ برقائی خان نے جینانی سپاہیوں کو واپس لوٹنے کا اشارہ کیا تو وہ جونزیف کی لاش وہیں چھوڑ کر واپس روانہ ہوگئے۔ برقائی خان نے اچٹتی نگاہ جونزیف پر ڈالی اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر ضرگامی بستی کا رُخ کیا۔ اس کی سپاہ بھی اس کے تعاقب میں روانہ ہوگئی۔ البتہ موٹا فوئنا جو خان پیچھے رہ گیا تھا۔



امیر برکیارک کو اس کے خفیہ مخبر نے چند ہی لمحے پہلے اطلاع دی تھی کہ معزول امرأ نے بڑے خیمے میں کوئی سازش تیار کی ہے۔ وہ ٹھیک طرح سے ان کی باتیں نہیں سن پایا۔ البتہ ان کی گفتگو میں سلطان توران شاہ کا نام بار بار آ رہا تھا۔ امیر برکیارک کے لئے یہ ایک نہایت اہم خبر تھی۔ توران شاہ کی سلطانی اس کے لئے نہایت ضروری امر بن چکی تھی۔ اس نے اپنی عیاری سے بحری ممالیک کو معزول کروا کر نہ صرف اپنا مقصد پا لیا تھا بلکہ اس کی توقع کے مطابق اسے نائب السلطنت کا عہدہ بھی حاصل ہو چکا تھا۔ اب اس عہدے کی حفاظت کے لئے ضروری تھا کہ تمام معزول امرأ کو اس حد تک بے بس کر دیا جائے کہ ان میں سے کوئی بھی اس قابل نہ رہے کہ اس کے خلاف آواز بلند کرسکے۔ اس نے معزول امرأ کی کڑی نگرانی کے احکامات جاری کرتے ہوئے ان کی حرکات و سکنات کے بارے میں پل پل کی خبر حاصل کرنے کا بندوبست کیا۔ اس نے توران شاہ تک یہ خبر پہنچانا ضروری سمجھا۔ وہ رات میں سلطان توران شاہ کے شاہی خیمے میں جا دھمکا۔ توران شاہ اس کی بے وقت آمد پر جھنجھلا گیا۔

''اب کیا بات ہوگئی ہے؟ بے وقت ہی منہ اُٹھائے چلے آتے ہو''۔

''سلطان!'' امیر برکیارک نے ہیجانی لہجے میں کہا۔ ''ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ کے معزول کردہ امرا آپ کے خلاف کوئی سنگین سازش کر رہے ہیں۔ اسی لئے آپ کو باخبر کرنے چلا آیا ہوں''۔

''تم جب بھی آتے ہو کوئی منحوس خبر ساتھ ہوتی ہے۔ بولو! کیسی سازش پنپ رہی ہے؟''

''سازش کی تہہ تک پہنچنے کے لئے میں نے ان امرأ کی کڑی نگرانی کا حکم دے دیا ہے۔ میرے خیال میں وہ زخم خوردہ ہیں، اس لئے آپ کو منصب سلطانی سے معزول کرانے کے لئے کوئی لائحہ عمل تیار کر رہے ہیں''۔

''میرے منصب کی بات چھوڑو۔ اس کے بارے میں، میں نے انتظام کرلیا ہے۔ مجھے کوئی معزول نہیں کرسکتا''۔

''بہرحال اب آپ آرام کیجئے۔ میں اس ضمن میں مزید کھوج لگا کر آپ کو مطلع کردوں گا، البتہ میری ایک رائے ہے.....'' امیر برکیارک بولتے بولتے رُک گیا۔

''میں سن رہا ہوں''۔

''اگر ان معزول امرأ کو کل کے معرکے میں ہراول دستے میں بھیج دیا جائے تو آپ ان کی سازشوں سے

ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ دربار کی عشرت میں مبتلا یہ لوگ پہلے ہی ہلے میں صاف ہو جائیں گے"۔

"تمہاری تجویز معقول ہے مگر ابھی تک ان کے خلاف تم کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکے کہ وہ واقعی کسی جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں"۔

"سلطان محترم کو یہ بات معلوم ہونا چاہئے کہ میں آپ کا نمک خوار ہوں اور ان لوگوں سے میری کوئی دشمنی بھی نہیں۔ میں تو کل تک انہیں جانتا بھی نہیں تھا۔ آپ کے ساتھ یہاں آنے پر ہی ان کی حرکات و سکنات معلوم ہوئیں جو میں نے آپ کے گوش گذار کر دیں"۔

"شاید تم صحیح کہتے ہو"۔ توران شاہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ "ٹھیک ہے۔ تم جاؤ، میں خود ہی ان کا بندوبست کرلوں گا"۔

امیر برکیارک نے مزید کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی سے باہر نکل آیا۔ وہ گذشتہ چند دنوں میں سلطان توران شاہ میں پیدا ہونے والی ایک نئی تبدیلی بھانپ چکا تھا۔ وہ کرتا وہی سب کچھ تھا جو امیر برکیارک اُسے تجویز کرتا تھا مگر امیر برکیارک کے سامنے وہ ہمیشہ یہی ظاہر کرتا کہ وہ خود فیصلہ کرے گا۔ وہ خوشی سے سرشار اپنے خیمے میں چلا آیا۔ وہ اپنے تصور کی آنکھ سے کل کے معرکے میں ان تمام معزول امرأ کی لاشیں دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی کامیابی پر اتنا غافل تھا کہ اسے محسوس ہی نہ ہو سکا کہ اس کے تعاقب میں آنے والا بیبرس، توران شاہ سے اس کی تمام گفتگو سن چکا ہے اور وہ کل کے معرکے میں کی جانے والی اس سازش کے بارے میں اپنے ساتھیوں کو آگاہ کرنے جا رہا ہے۔



مطیع الدین کو جب ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک نرم بستر پر موجود پایا۔ وہ دیر تک آنکھیں جھپکتا رہا۔ اس کے ذہن کے پردوں پر بیتی پہاڑی پر پیش آنے والے واقعات گھومنے لگے۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ منگول قبیلے نے اس کی مدد کی ہے۔ خیمے کی اندرونی بناوٹ پر غور کرنے سے اسے احساس ہوا کہ یہ خیمہ عام خیموں سے مختلف ہے۔ اسے بخوبی یاد تھا کہ عموماً سرداروں کے خیمے ہی ایسی سج دھج لئے ہوتے تھے۔ اس نے اپنے جسم کو حرکت دینا چاہی۔ درد کی شدید لہر نے اس کے پورے بدن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ہلکی سی کراہ اس کے منہ سے نکلی۔ اس کی دائیں ٹانگ شدید دُکھ رہی تھی۔ کسی خیال کے تحت اس نے اپنی ٹانگ کو ٹٹولا۔ شاید اسے ٹانگ کاٹ دیئے جانے کا خدشہ ہوا تھا۔ ٹانگ اپنی جگہ موجود تھی۔ البتہ اسے کسی ٹھوس شے کے ساتھ سختی سے باندھا گیا تھا۔ اس کا لباس بھی تبدیل کیا جا چکا تھا۔ مطیع الدین ایک لمحے کے لئے منگول قبیلے کی اتنی مہربانی پر حیران رہ گیا۔ اس نے دوبارہ اُٹھنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ ٹانگ اس قدر سختی سے باندھی گئی تھی کہ اسے ہلانا جلانا دوبھر ہو رہا تھا۔ مطیع الدین کو اپنے حلق میں کانٹے چبھتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس نے نحیف لہجے میں آواز دی۔ "کوئی ہے؟"

مطیع الدین کی آواز باہر موجود شخص کے کان تک جا پہنچی۔ اسے برقائی خان نے خاص طور پر خیمے کے باہر تعینات کیا تھا۔ وہ ضرگامی نہیں بلکہ منگول دستے کا سپاہی تھا۔ وہ خیمے کا پردہ اُٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔ اس نے مطیع الدین کو ہوش میں دیکھا تو لمحہ بھر کے لئے متحیر ہوا کیونکہ طبیب نے کم از کم چوبیس گھنٹے سے پہلے تک اس کے ہوش میں نہ آنے کی پیش گوئی کر رکھی تھی جبکہ وہ نصف دن گذرنے پر ہی ہوش میں آ گیا تھا۔ محافظ سپاہی اس کی جانب مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ مطیع الدین نے اس سے پانی مانگا۔ اس نے پہلو میں موجود ایک صراحی سے پانی چھوٹے سے کوزے میں بھرا اور اس کی جانب بڑھا دیا۔ مطیع الدین نے ایک بار پھر اُٹھنے کی کوشش کی مگر

پھر ناکام رہ گیا۔ محافظ سپاہی یہ دیکھ کر اس کے سرہانے کی جانب آ بیٹھا اور اس کی گردن میں بازو ڈال کر اسے سہارا دے کر پانی پلانے لگا۔ مطیع الدین نے بمشکل تمام پانی کے چند گھونٹ حلق سے اتارے۔ نقاہت کا غلبہ ایسا شدید تھا کہ اتنی سی مشقت میں ہی وہ بری طرح ہانپنے لگا۔ چند لمحوں بعد اس کی سانسیں بحال ہوئیں۔ محافظ برتن رکھنے کے بعد دوبارہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔

"تم بتا سکتے ہو کہ یہ کون سا قبیلہ ہے؟"

"یہ ضرگامی قبیلہ ہے"۔ محافظ نے مختصر جواب دیا۔ مطیع الدین سر ہلا کر رہ گیا پھر اس نے دوبارہ اسے مخاطب کیا۔ "تم جانتے ہو کہ سرائے شہر یہاں سے کتنی دور ہے؟"

محافظ سپاہی اس کی بات سن کر مسکرانے لگا۔

"بالکل! اگر میں نہیں جانوں گا تو کون جانے گا۔ میں سرائے کا ہی رہنے والا ہوں"۔

اس کی بات سن کر مطیع الدین کو ایسے لگا جیسے اسے اپنی منزل مل گئی ہو۔ اس نے بے اختیار ہو کر اُٹھنے کی کوشش کی مگر درد کے شدید جھٹکے نے اسے کراہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"آپ آرام سے لیٹے رہئے۔ طبیب کا کہنا ہے کہ آپ کو کچھ دن تک آرام کی ضرورت ہے۔ آپ کا زخم کافی خراب ہو چکا تھا، اگر ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو آپ کی جان جا سکتی تھی"۔

"سنو تم ابھی کچھ دن یہیں ٹھہرنا، جب تک میں تندرست نہیں ہو جاتا تم سرائے مت لوٹنا۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ میرا گھر بھی وہیں ہے"۔ مطیع الدین بے تابی سے بولا۔

"میں اپنے قیام کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا کیونکہ میں تو عام سپاہی ہوں۔ جب بھی مجھے حکم ملا سرائے روانہ ہو جاؤں گا۔ بہرحال آپ فکر مند نہ ہوں۔ میں اپنے سالار سے آپ کے بارے میں بات کروں گا"۔

"میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکا۔ کیا تم یہاں کے مکین نہیں ہو؟" مطیع الدین تذبذب میں بولا۔

"آپ کا اندازہ درست ہے، میں چند دن قبل ہی ایک مہم کے سلسلے میں اپنے سالار کے ساتھ یہاں آیا ہوں"۔ وہ بولا۔

"تم اپنے سالار کو مجھ سے ضرور ملانا، میں خود اس سے بات کروں گا"۔ مطیع الدین نے اسے ہدایت کی۔ وہ سر ہلانے لگا۔ اسی لمحے ایک چہکتی ہوئی آواز مطیع الدین کے کانوں میں پڑی۔

"مجھ سے تم کیا بات کرو گے اناڑی عاشق؟"

مطیع الدین آواز سن کر بری طرح چونک پڑا۔ یہ وہ آواز تھی جو اس کی سماعت میں ایک عرصے محفوظ تھی اور جسے سننے کو اس کے کان ترس گئے تھے۔ وہ غیر شعوری طور پر کر کے بل اُٹھتا چلا گیا۔ درد کا کوئی احساس تک اس کے بدن میں باقی نہیں رہا تھا۔ اس کی نگاہیں بے چینی و بے قراری سے اس آواز کے مالک کو تلاش کر رہی تھیں۔



یکم محرم 648ھ کو منصورہ کے میدان میں گھمسان کا رن پڑا۔ صلیبی لشکر کی دفاعی حکمت عملی کو بھی ناکام بنا دیا گیا۔ بحری اور برجی ممالیک نے میدان میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا تھا۔ بیبرس اپنے دستے کے ہمراہ دو دفعہ صلیبی لشکر کے قلب پر حملہ آور ہوا مگر اُسے قلب میں زیادہ اندر تک داخل ہونے کا موقع نہ مل سکا۔ بیبرس کے لئے یہ دن بڑی اہمیت کا حامل تھا کیونکہ توران شاہ نے اس کے کئی ساتھیوں کو ہراول دستے میں بھیج دیا تھا۔ معزول امرأ کے لئے جنگ لڑنا کوئی نئی بات نہیں تھی مگر ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جنہیں ابھی تلوار چلانا بھی

ڈھنگ سے نہیں آتا تھا۔ وہ حصولِ علم میں اس قدر مشغول رہے تھے کہ انہیں کبھی فنونِ حرب میں مہارت حاصل کرنے کا خیال بھی نہیں آیا۔ ان کی علمی صلاحیتوں نے ہی انہیں اعلیٰ مناصب تک پہنچا دیا تھا، ایسے امراً کو فارس اقطائی نے تجربہ کار سپاہیوں کے ساتھ شامل کر دیا تھا۔ وہ نہ صرف صلیبی لشکر کے دانت کھٹے کرنے میں مصروف رہے بلکہ ان امراً کی حفاظت کی ذمہ داری بھی نبھاتے رہے۔ امراً کی زیادہ تعداد بیبرس کے ساتھ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بیبرس کئی بار قلب پر حملہ آور ہونے کے باوجود پیچھے ہٹتا رہا۔ امیر برکیارک کے رچائے ہوئے خوفناک کھیل کو بحری ممالیک نے باہمی تعاون سے شام تک بری طرح ناکام بنا دیا تھا۔

مغرب سے کچھ دیر پہلے دونوں جانب سے جنگ بندی کا طبل بجا۔ شاہ لوئی نہم اپنی سپاہ کی ناقص کارکردگی پر خاصا برہم دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے کئی سالاروں کو برطرف کر کے ان کی جگہ دوسرے لوگوں کو تعینات کیا۔ یہ سب تبدیلیاں محض دل کی تسلی تھی۔ صلیبی لشکر کی مجموعی کارکردگی اسلامی لشکر کے سامنے ماند پڑ چکی تھی۔ شاہ لوئی نہم کو اپنا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بلادِ مصر کی جانب سے اپنی پوری قوت کے ساتھ صرف اس لئے حملہ آور ہوا تھا کہ یہی ایک ایسی حکومت تھی جو یروشلم تک رسائی میں رکاوٹ کا باعث بن سکتی تھی۔ اس نے تمام سپاہیوں کو اتنا نوازا تھا کہ وہ اس کے دیوانے دکھائی دے رہے تھے۔ شاہ لوئی نہم کو بھی ان سے اعلیٰ کارکردگی کی توقع تھی جو اب دن بہ دن مایوسی میں بدلتی جا رہی تھی۔ وہ اپنی پرجوش تقریروں سے بھی ان میں وہ جذبۂ ایمانی بیدار نہیں کر پایا جس کے بل بوتے پر وہ سردھڑ کی بازی لگاتے۔ مسلمانوں کی عجیب سی دہشت ان پر طاری تھی حالانکہ وہ ان کے مقابلے میں تعداد میں کم تھے۔ شاہ لوئی نہم نے چیدہ چیدہ سالاروں کے ساتھ ایک خفیہ مجلس منعقد کی جس میں آنے والی کل کے معرکے کے بارے میں کئی اہم امور موضوعِ بحث رہے۔ شاہ لوئی نہم اب زیادہ دیر تک منصورہ کے میدان میں نہیں رُکنا چاہتا تھا۔ وہ آنے والی کل میں کوئی فیصلہ کن کارروائی کرنے پر مصر دکھائی دے رہا تھا۔ سابق شاہ یروشلم فریڈرک ثانی نے مراسلات کے ذریعے یہ واضح انداز میں باور کرا دیا تھا کہ وہ اتنی دیر تک اپنے لشکر کے ساتھ پیش قدمی نہیں کر سکتا جب تک اسے شاہ لوئی نہم کی اسلامی لشکر کے خلاف واضح فتح کی اطلاع نہ مل جائے۔ علاوہ ازیں اس نے اپنے صلیبی لشکر کو بلادِ فلسطین سے نکال کر بلادِ مصر کی جانب لانے سے بھی کھلے لفظوں میں انکار کر دیا تھا۔

شاہ لوئی نہم پریشان کن صورتِ حال میں پھنس چکا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ وہ خاموشی سے میدان چھوڑ کر فرار ہو جائے مگر یہ بات اس کے شاہانہ غرور کے سراسر خلاف تھی۔ اٹھارہ بیس دن کے معرکے میں صلیبی لشکر کی ایک بڑی تعداد میدان میں کام آ چکی تھی۔ یہ صورتِ حال صلیبی سپاہیوں کے لئے بے حد تشویش ناک تھی۔ وہ دبے لفظوں میں شاہ لوئی نہم کی اس ڈھٹائی کو خودکشی قرار دے رہے تھے۔ صلیبی لشکر میں ہونے والی چہ میگوئیاں شاہ لوئی نہم تک بھی پہنچ رہی تھیں مگر وہ ان حالات میں جنگی حکمتِ عملی میں تبدیلی کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ جنگ کا میدان تو سپاہیوں نے جیتنا ہوتا ہے، تنہا سالارِ اعظم بھلا کیا کر سکتا ہے؟ دو محرم 648ھ (5 اپریل 1250ء) کو منصورہ کے میدان میں فیصلہ کن جنگ کا آغاز ہوا۔ شاہ لوئی نہم کی طرف سے کی گئی تبدیلیوں کے باعث کسی حد تک صلیبی لشکر کی کارکردگی میں بہتری دکھائی دی۔ یہ دیکھ کر شاہ لوئی نہم کی ہمت بندھنے لگی مگر دوپہر ڈھلتے ہی اسلامی لشکر کی جانب سے ایک ایسا ریلا آیا کہ وہ کارکردگی بھی صفر ہو گئی۔ بحری و برجی ممالیک نے توران شاہ کی قیادت میں اپنی تلواروں کے جوہر دکھاتے ہوئے صلیبی لشکر کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ شام تک اسلامی لشکر کافی حد تک آگے بڑھ چکا تھا۔ شاہ لوئی نہم نے اپنی ناکامی دیکھ کر رات کو کئے گئے فیصلے کے دوسرے حصے پر عمل درآمد کا فیصلہ کیا۔ اس کے اشارے پر چیدہ چیدہ سالاروں نے اپنے دستوں کو بڑے منظم طریقے سے پیچھے ہٹنا

شروع کر دیا۔ وہ پیچھے ہٹتے ہوئے دمیاط کے شمال کی طرف بڑھنے لگے۔ رئیس العساکر جاشنگیر ایک صلیبی چال کو ان کی کمزوری سمجھتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ فارس الدین اقطائی نے صلیبی لشکر کو حصار میں لینے کی تجویز پیش کی جسے فوری طور پر منظور کر لیا گیا اور اسلامی لشکر کو سرعت سے پسپا ہونے والے صلیبی لشکر کے پہلوؤں میں بکھیر دیا گیا۔ ممالیک پہلے ہی صلیبیوں سے فیصلہ کن انداز میں دو دو ہاتھ کرنے کے لئے بے تاب ہو رہے تھے۔ اجازت ملتے ہی انہوں نے حملوں کا ایسا میدان گرم کر دیا کہ صلیبی لشکر کے وہم و گمان سے باہر تھا۔ ہر طرف لاشوں کے انبار لگنا شروع ہو گئے۔ ممالیک کے جارحانہ حملوں سے دائیں و بائیں بازو میں انتشار پیدا ہو گیا۔ بھگدڑ سے سارا نظم و ضبط چوپٹ ہو کر رہ گیا۔ صلیبی سالاروں نے حالات کو قابو کرنے میں بہتیرا زور لگایا مگر وہ لشکر میں پھیلنے والی افراتفری پر قابو نہ پا سکے۔ رئیس العساکر جاشنگیر ایک نے بروقت عمدہ قدم اُٹھایا تھا۔ مغرب کے وقت تک تمام صلیبی لشکر اسلامی لشکر کے نرغے میں آ چکا تھا۔ ابھی تک قلب میں نظم باقی تھا جس کے باعث مسلمانوں کو اندر داخل ہونے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ بیبرس نے اللہ کا نام لیتے ہوئے اپنے دستے کو قلب میں داخل کرنے کی جان توڑ کوشش کا آغاز کیا۔ وہ کئی دن سے مسلسل قلب میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا مگر کوئی نہ کوئی وجہ آڑے آ جاتی تھی۔ وہ جان ہتھیلی پر رکھتے ہوئے اتنی جوانمردی سے لڑا کہ صلیبی صفیں درہم برہم ہونے لگیں۔ وہ اپنے جانبازانہ حملوں سے قلب کو توڑ دینے میں کامیاب ہو گیا۔ قلب کا نظم ونسق ٹوٹنے کی دیر تھی کہ صلیبی لشکر کے چھکے چھوٹ گئے۔ رات کے پہلے پہر تک جنگ کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ ساتویں صلیبی جنگ صلیبیوں کی ذلت آمیز شکست پر ختم ہو گئی۔ اس جنگ میں بیبرس کی اعلیٰ کارکردگی نے اس کا مقام خاصا اونچا کر دیا تھا۔ توران شاہ نے خوش ہو کر اسے ایک ہزار سپاہیوں کے دستے کا سالار مقرر کیا تھا۔ علاوہ ازیں اسے بیش قیمت انعامات سے بھی نوازا گیا تھا۔

عرب مؤرخین کے بیان کے مطابق اس دن کے معرکے میں صلیبی مقتولوں، زخمیوں اور قیدیوں کی تعداد پچاس ہزار کے لگ بھگ تھی اور ان کے مال اسباب کے نقصان کا کوئی حساب نہیں تھا۔ شاہ لوئی نہم کو اس کے اعلیٰ سالاروں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ سلطان توران شاہ کے سامنے جب شاہ لوئی نہم کو پیش کیا گیا تو اس نے فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے اس کی جان بخش دی۔ بحری امراً کی بڑی تعداد شاہ لوئی نہم کو قتل کرنے کا مطالبہ کر رہی تھی۔ سلطان توران شاہ نے قابو میں آئے دشمن کو قتل کرنے کے بجائے محض نظر بند کرنے پر اکتفا کیا۔ شاہ لوئی کو منصورہ کے رئیس امیر فخر الدین بن لقمان کے گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس کی خدمت کے لئے ایک ہمہ وقتی خادم صبیح المعظمی کو مقرر کیا گیا۔ اس صلیبی جنگ میں ایک فرانسیسی مؤرخ دی جان ویل بھی مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر ہوا تھا۔



''میں نے سارا انتظام کر لیا ہے، کل دوپہر کو جب سلطان اپنے محل سے باہر نکلے گا تو ہمارا کام شروع ہو جائے گا۔ تم لوگ پوری طرح تیار رہنا، کسی قسم کی گڑبڑ نہیں ہونی چاہئے۔ سپاہیوں پر بھی کڑی نگاہ رکھنا ہوگی، کہیں ان سے کوئی چوک نہ ہو جائے۔'' فارس الدین اقطائی بولا۔

''تم نے اُن لوگوں سے سلیقے سے بات چیت کر لی ہے، تمہیں پورا یقین ہے نا کہ وہ عین وقت پر ہمیں دھوکا نہیں دیں گے؟'' علی چولاک دائیں بائیں دیکھتا ہوا بولا۔

''مجھے تو ان پر پورا بھروسہ ہے، باقی سب اللہ ہی جانتا ہے کہ سلطان کی تقدیر میں کیا لکھا ہے۔''

''اگر سلطان قلعے سے باہر نہ نکلا تو ہمارے لئے مشکل ہو جائے گی۔'' عبداللہ قاف نے خدشہ ظاہر کیا۔

فارس الدین اقطائی نے اس کی بات پر اسے گھور کر دیکھا۔ ''ہمت ہارنے والی باتیں تمہیں زیب نہیں دیتیں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں نے اپنی جان داؤ پر لگا دی ہے۔ اگر سلطان کے کسی وفادار کو بھنک بھی پڑ گئی تو اس کی کم از کم سزا موت ہو گی۔ جب میں روشنی کی کرن دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں تو پھر تم لوگ کیوں میری توجہ تاریکی کی جانب بٹانے کی کوشش کر رہے ہو؟''

''سلطان کے بعد کوئی دوسرا فرد دکھائی نہیں دے رہا جسے سلطان بنایا جائے گا۔ کیا تمہیں کامل بھروسہ ہے کہ آنے والے دنوں میں نیا سلطان ہمارے مناصب بحال کر دے گا؟'' علی چولاک بولا۔

''اس بارے میں تو میں بھی نہیں جانتا کہ آنے والے کل میں کون سا چہرہ سامنے آئے گا۔ جاشنکیر ایبک نے ہمارے عہدوں کی واپسی کی مکمل ضمانت دی ہے''۔ فارس الدین اقطائی نے کہا۔

''اقطائی!'' بیبرس نے اسے مخاطب کیا۔ ''میرے تمام سپاہی تمہارے لئے حاضر ہیں مگر میں اس معاملے میں براہِ راست حصہ نہیں لینا چاہتا''۔

''بیبرس میرے دوست!'' فارس الدین اقطائی اُسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ ''ہم میں سے کوئی بھی اس معاملے میں براہِ راست حصہ نہیں لے رہا ہے۔ ہمیں اپنے محفوظ کل کے لئے پس پردہ ہی رہنا ہو گا۔ منصورہ میں موجود تمہارے سپاہی ہی ہماری اصل طاقت ہیں''۔

''پھر بھی مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا''۔

''میں جانتا ہوں کہ تم تھوڑے سے جذباتی آدمی ہو لیکن یہ صرف میرا یا تمہارا معاملہ نہیں ہے۔ اس سے ان تمام لوگوں کی امیدیں وابستہ ہیں جو اپنی قابلیت کی ناقدری کے غم میں مبتلا ہیں۔ ہم یہ سب صرف ان کی بہتری کے لئے کر رہے ہیں۔ کیا تم یہ چاہو گے کہ اتنی بڑی اسلامی ریاست پارہ پارہ ہو جائے؟ سلطان نجم الدین ایوب نے کڑی محنت سے جس بکھرے ہوئے شیرازے کو اکٹھا کیا ہے، وہ دوبارہ بکھر جائے؟ سلطان توران شاہ ایک ناکام اور نااہل حکمران کے طور پر سامنے آیا ہے۔ اس کا زیادہ دیر تک اقتدار میں رہنا مسلمانوں کے لیے بہتر نہیں ہے۔ مجھے مختلف علاقوں سے بدستور ایسی خبریں مل رہی ہیں کہ برجی امیر نجم الدین ایوب کی موت کا فائدہ اُٹھانے کی فکر میں ہیں۔ تم دیکھ لینا کہ آج کل میں ہی ایسی خبریں موصول ہونا شروع ہو جائیں گی کہ فلاں علاقے میں بغاوت ہو گئی۔ توران شاہ اگر اپنے درباری فیصلوں میں ہی غلطی کر رہا ہے تو کیا وہ ان باغی امراُ کی سرکوبی کے لئے صحیح فیصلے کر سکے گا؟ میں نہیں سمجھتا کہ وہ کوئی درست فیصلہ کر پائے گا۔ برجی امراُ کو فوقیت دینے کا سیدھا سادا یہی مطلب ہے کہ وہ صرف اپنا اقتدار مضبوط کرنا چاہتا ہے''۔

''اقطائی!'' بیبرس دھیمے لہجے میں بولا۔ ''مجھے تمہاری تمام باتوں سے اتفاق ہے مگر جو کچھ تم کل کرنے والے ہو، مجھے ایک آنکھ نہیں بھا رہا''۔

''تو کیا ہم تمہاری وفاداری پر شک کریں؟'' عبداللہ قاف تیز لہجے میں بولا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں پہلے بھی خاموش رکن کی حیثیت سے تمہارے ساتھ تھا اور آج بھی ہوں مگر میں اپنی رائے کا اظہار کرنے میں عار نہیں سمجھتا''۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ تم لوگ آپس میں مت الجھو۔ تمام معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔ اگر کسی وقت اس بات کی ذمہ داری لینے کی نوبت آئی تو میں خود اس سازش کو اپنی گردن پر لے لوں گا''۔ فارس الدین اقطائی نے کہا۔

وہ لوگ آپس میں کافی دیر تک بات چیت کرتے رہے۔ وہ خفیہ طور پر منصورہ کے ایک مکان میں مقیم تھے۔ وہ سرکاری لشکر میں واپس جانے کے بجائے لوٹ کر منصورہ میں داخل ہو گئے تھے۔ بیبرس کے مشورے پر

رئیس العساکر جاشنکیر ایبک نے تمام برجی سپاہیوں کو بیبرس کے دستے سے نکال کر ان کی جگہ بحری ممالیک کو شامل کر دیا تھا۔ یہ عمل نہایت رازداری سے انجام پذیر ہوا تھا۔ اب منصورہ میں سپاہیوں کا ایک بڑا دستہ موجود تھا جس کی قیادت بیبرس کے ذمے تھی اور اس دستے میں تمام سپاہی بحری مملوک تھے۔ انہیں آنے والے کل کے بارے اچھی طرح سمجھایا جا چکا تھا۔

کافی دیر تک بات چیت کا سلسلہ جاری رہا تو بیبرس نے ان سے اجازت طلب کی کیونکہ دیر تک اس کا اپنی جگہ سے غائب رہنا اسے مشکوک بنا سکتا تھا۔ اس کے ساتھی اسے دروازے تک رخصت کرنے کے لئے آئے اور کل کے بارے میں دوبارہ یاد دہانی کرائی۔ بیبرس انہیں تسلی دیتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا۔ فارس الدین اقطائی واپس اندر آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ علی چولاک اور عبداللہ قاف کمرے کے وسط میں بے قراری سے ٹہل رہے تھے۔ فارس الدین اقطائی نے انہیں آرام سے بیٹھنے کا مشورہ دیا تھا۔ اچانک دروازے پر زوردار ضربیں پڑنا شروع ہو گئیں۔ کمرے میں موجود سب لوگوں کی سانسیں ایک بار رُکی کی رُکی رہ گئی تھیں۔

''دروازہ کھولو۔ اندر کون ہے؟'' ایک بلند آواز گونجی۔ آواز سنتے ہی اندر موجود سب لوگوں کے رنگ زرد پڑ گئے تھے۔ بلاشبہ وہ آواز نائب السلطنت امیر برکیارک کی ہی تھی۔ وہ خوف کے مارے ایک دوسرے کے چہرے دیکھنے لگے۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اُڑتی دکھائی دے رہی تھیں۔ عبداللہ قاف پہلے ہی کمزور دل کا مالک واقع ہوا تھا۔ خوف سے اس کا چہرہ سیاہ پڑ چکا تھا۔ ''تو کیا بیبرس نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے؟'' فارس الدین اقطائی کے دل میں خیال پیدا ہوا۔



گل وتوز زنداں خانے میں نظر بند تھی۔ اسے یہ رعایت دی گئی تھی کہ پسند کے کھانے اور حسب خواہش لباس کی تبدیلی میں آزادی حاصل تھی۔ وہ جب سے زنداں خانے میں آئی تھی، پہلی بار اُس نے اِس رعایت کا استعمال کیا تھا۔ نہا دھو کر جب اس نے پرانے بوسیدہ لباس سے چھٹکارا حاصل کیا تو اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ بے حد ہلکی پھلکی ہو گئی ہو۔ وہ اپنی بہتر حالت میں بھی رنجیدہ دکھائی دیتی تھی کیونکہ اسے وہ آزادی حاصل نہیں تھی جس کی اسے تمنا تھی۔ وہ نہ صرف اپنے مقتول باپ کے لئے جاودانی آسمان کی مخصوص عبادت سے محروم تھی بلکہ اس قاتل کی تلاش میں بھی کوئی معاونت نہیں کر سکتی تھی جس نے رات کی تاریکی کا فائدہ اُٹھایا تھا۔ محبوب سے جدائی کا غم جان پہ پہاڑ بنا کھڑا تھا۔ وہ جب بھی مطیع الدین کے بارے میں سوچتی تو اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ یہ کیسی بے بسی تھی کہ اس کے ہم وطنوں نے ہی اسے ایک بے بنیاد الزام میں دھر لیا تھا۔ اسے رہ رہ کر اذقائی سردار پر طیش آتا کہ نہ اس کی نیت میں فتور پیدا ہوتا، نہ وہ اس پر حملہ کرتی اور نہ ہی اس کے خون کے چھینٹے اس کے لباس کو داغدار کرتے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ کبھی کبھی تو اسے یوں لگتا کہ جیسے اس اندھیرے زنداں خانے میں ہی اس کی زندگی تمام ہو جائے گی۔ وہ اندازے سے وقت کا تعین کرتی اور جاودانی آسمان سے گڑگڑا گڑگڑا کر مدد مانگا کرتی۔

پھر ایک دن اس کی دُعائیں قبولیت کی منزل پر جا پہنچیں اور اسے صاف ستھرے لباس میں ایک بار پھر منگول منصف کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا گیا۔ دن کا اُجالا اور لوگوں کے چہرے دیکھ کر کسی حد تک اس کی ڈھارس بندھی۔

منگول منصف نے اس پر تیز نگاہ ڈالتے ہوئے کارروائی کے آغاز کا اشارہ کیا۔ سب سے پہلے کوتوال شہر نے اپنی کارگذاری پیش کی۔ اس کی تفتیش ایسی حیرت انگیز تھی کہ گل وتوز کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔

اس نے اپنی تفتیش کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا کہ ازقائی قبیلے کے سردار تک رسائی حاصل کرتے ہوئے گل وقوژ کے بیان کو جانچنے کی کوشش میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ ایسا کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ازقائی قبیلے میں ایک عرصہ سے کوئی اجنبی خاتون نہیں دیکھی گئی، دوسری بات یہ سامنے آئی ہے کہ ازقائی قبیلے کے کسی سردار کا نام مانجی خان نہیں ہے۔ ازقائی قبیلے کا سردار جموروش خان میرے ساتھ اپنا بیان قلم بند کرانے کے لئے یہاں موجود ہے۔ تمام تفتیش کی روشنی میں میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ لڑکی ہی اپنے باپ کی قاتلہ ہے اور یہ ہماری توجہ بھٹکا کر محض ہمارا وقت ضائع کر رہی ہے۔ کوتوال شہر کے بعد ازقائی قبیلے کے سردار کو حاضر ہونے کا حکم دیا گیا۔

ازقائی قبیلے کا سردار جموروش خان جب سامنے آیا تو گل وقوژ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ پچاس سال کا عمر رسیدہ منگول تھا جس کا چہرہ بالکل سپاٹ اور کرختگی کا تاثر لئے ہوئے تھا۔ یہ واقعی مانجی خان نہیں تھا۔

''کیا تم اس لڑکی کو جانتے ہو یا پہلے کبھی اس کا چہرہ دیکھا ہے؟'' منگول منصف نے سوال کیا۔

جموروش خان نے گل وقوژ کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے اپنا سر نفی میں ہلایا۔

''تم کب سے ازقائی قبیلے کے سردار ہو؟''

''قریباً سات آٹھ برس ہو گئے ہیں''۔

''تم اپنے دماغ پر ایک بار پھر زور دے کر یاد کرو۔ کیا یہ لڑکی کبھی تمہارے قبیلے میں آئی تھی؟''

''جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے، میں نے اس لڑکی کو کبھی بھی اپنے قبیلے میں نہیں دیکھا''۔

''کیا تمہارے قبیلے میں کوئی مانجی خان نام کا شخص موجود ہے؟''

''اب کوئی نہیں ہے، البتہ مجھ سے پہلے سردار کا نام مانجی خان ہی تھا، جسے مرے ہوئے قریباً سات آٹھ برس ہو چکے ہیں''۔

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ ازقائی قبیلے کا سردار مانجی خان ہی تھا اور گذشتہ قرولتائی میں وہ مجھ سے ملا بھی تھا''۔ منگول منصف نے آنکھیں نکالتے ہوئے اسے گھورا۔ ''تمہیں جھوٹ بولنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''

''عظیم منصف! میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ آپ کی یادداشت کمزور ہو گئی ہے مگر یہ ضرور کہوں گا کہ یقیناً آپ کسی غلط فہمی کا شکار ہیں''۔ ازقائی سردار نے اپنی ذلت پر تلملا کر کہا۔

''نہ میری یادداشت کمزور ہے اور نہ ہی مجھے کوئی غلط فہمی ہو سکتی ہے کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ازقائی قبیلے کا حقیقی پیشہ کیا ہے اور وہ کیسے بلاخوف ہر طرح کا غیر قانونی کام سرانجام دیتے ہیں؟'' منگول منصف الفاظ چبا کر بولا۔

''آپ اب نہ صرف میرے ساتھ بلکہ میرے قبیلے کے سادہ لوح لوگوں کے ساتھ بھی زیادتی کر رہے ہیں''۔ جموروش خان اپنے جوش پر بند باندھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''بہرحال یہ بات طے ہے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو، میں کوتوال کو دوبارہ ہدایت کرتا ہوں کہ وہ جلد از جلد معاملے کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرے اور ازقائی سردار مانجی خان کو ہر قیمت پر اس معزز عدالت میں پیش کرے اور جموروش خان کو آخری بار تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ خود ہی پوشیدہ سچ کا اظہار کر دے ورنہ حقیقت سامنے آنے پر اسے معزز عدالت کی توہین اور دروغ گوئی کے جرم میں موت کی سزا دی جائے گی''۔

جموروش خان منگول منصف کی بات سن کر پہلو بدل کر رہ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گذر گئے۔ منگول منصف اس کی کیفیت پر نگاہ رکھے ہوئے تھا، اس کی باریک بین نظروں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔ ازقائی سردار یقیناً زخمی ہوا ہو گا اور وہ اب پوشیدہ رہ کر اس لڑکی سے انتقام لینا چاہتا ہے۔ اس نے کوتوال شہر سے اس بابت میں جواب طلب کیا تو اس نے اپنی ساری توجہ اور مصروفیت کا بار ازقائی قبیلے کے سر پہ ڈال کر اپنی جان بچانے کی کوشش کی۔

منگول منصف نے اس معاملے کو جلد از جلد نبٹانے کی ہدایت کرتے ہوئے انہیں جانے کی اجازت دے دی۔ گل وقوژ کے بارے میں پہلا حکم برقرار رکھا گیا کہ معاملہ کی حقیقت سامنے آنے تک اسے بدستور نظر بند رکھا جائے گا۔ کوتوال شہر نے گل وقوژ کو تین سپاہیوں کے ساتھ واپس بھیج دیا۔ اسے ابھی ایک دوسرے مقدمے کی کارروائی میں شریک ہونا تھا۔ سپاہی گل وقوژ کو لے کر زنداں خانے کی جانب چل پڑے۔

گل وقوژ حالات کی نئی کروٹ پر ششدر تھی۔ اچانک وہ اپنے پہلو میں اُٹھنے والے بے ہنگم شور پر چونک کر متوجہ ہوئی۔ وہ دس بارہ افراد تھے جنہوں نے اپنے چہروں پر ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔ انہوں نے کمال سرعت سے سپاہیوں کو زخمی کر کے گرا دیا اور ان میں سے ایک تیزی سے گل وقوژ کی جانب بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کپڑا لہرا رہا تھا۔ گل وقوژ خوف وحیرت سے بت بنی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اجنبی کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر وہ گھبرا سی گئی۔ اجنبی کا ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا اور لہراتا ہوا کپڑا گل وقوژ کے چہرے کا احاطہ کرنے لگا۔ گل وقوژ کو بس اتنا یاد رہا کہ ایک کپڑا اس کے چہرے کی جانب بڑھا پھر اس کی آنکھوں کے سامنے گہرا اندھیرا چھا گیا۔ وہ کچھ سمجھ نہیں سکی کہ سب کیا ہو رہا تھا۔ ان افراد نے تیزی سے گل وقوژ کو ایک گھوڑے پر لادا اور خود بھی جست لگا کر گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ چند لمحوں میں وہ بے ہوش گل وقوژ کو لئے سرائے کی گلیوں میں گم ہو گئے۔ وہاں موجود راہگیر حیرت واستعجاب کی تصویر بنے رہ گئے تھے۔



وہ رات کی تاریکی میں دبے قدموں ایک محل نما مکان کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس مکان کے گرد کڑے پہرے کا انتظام کیا گیا تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سپاہی دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ان سب کی نگاہوں سے بچ کر مکان کے اندر داخل ہونا چاہتا تھا۔ سیاہ موٹا لبادہ اُسے تاریکی کا جزو بنائے ہوئے تھا۔ وہ قدم پھونک پھونک کر رکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ اُسے کسی ایسے حصے کی تلاش تھی جہاں سے وہ دیوار پھاند کے اندر داخل ہو جاتا۔ کافی دیر تک یونہی رینگتے رہنے کے بعد اس کے دل کی مراد بر آئی۔ وہ شمالی جانب پہنچ چکا تھا جہاں دو سپاہی نیند سے اونگھ رہے تھے۔ اس نے کافی دیر تک خاموشی سے وہاں دبک کر ان کا جائزہ لیا۔ وہ سپاہی بدستور اسی حالت میں دکھائی دیتے رہے۔ وہ آہستگی سے حرکت میں آیا اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ دیوار کے ساتھ جا چپکا۔ سپاہی بدستور اونگھ رہے تھے۔ اس نے ان پر ایک حقارت بھری نگاہ ڈالی اور نہایت مہارت سے کسی مکڑی کی مانند دیوار پر چڑھنے لگا۔ اینٹوں کے درمیان بنے ہوئے رخنوں اور کونوں کھدروں پر پاؤں جماتا اور سہارے تلاش کرتا وہ اوپر چڑھتا گیا اور تھوڑی دیر میں دیوار کی بالائی سطح تک پہنچ گیا۔

وہ دیوار پر کچھ دیر اکڑوں بیٹھا رہا۔ وہ اب دونوں جانب دیکھ رہا تھا۔ اندر پہرے کا کوئی انتظام دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے اچھی طرح اطمینان کر لینے کے بعد دیوار سے چھلانگ لگا دی۔ نیچے گھاس کا فرش تھا، اسی وجہ سے اس کے کودنے کی دھمک کچھ زیادہ نہیں ہوئی۔ اس کی نگاہیں تیزی سے دائیں بائیں گھوم رہی تھیں۔ اپنے تئیں مطمئن ہونے کے بعد وہ نہایت سرعت سے کیکڑے کی مانند رینگتا ہوا مکان کی اندرونی جانب بڑھنے

لگا۔ کچھ ہی دیر میں وہ برآمدے میں پہنچ چکا تھا۔ یہاں ایک شخص زمین پر بستر لگائے گہری نیند سو رہا تھا۔ آنے والے نے اس کی سانسوں کی ہموار آمدورفت سے اس کی نیند کی گہرائی کا اندازہ کیا اور مطمئن ہونے کے بعد اندر کی طرف بڑھ گیا۔ اس محل نما مکان کے اندر کئی کمرے دکھائی دیئے۔ ان میں سے وہ کمرہ کہاں ہو سکتا تھا جہاں اسے پہنچنا تھا؟ اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ وہ ایک ایک کر کے کمروں میں نگاہ ڈالتا ہوا بڑھتا چلا گیا۔ نیچے کے تمام کمرے خالی دکھائی دیئے۔ وہ زینے سے اوپر پہنچ گیا۔ یہاں سب کمروں کے دروازوں پر قفل پڑے ہوئے تھے۔ اس نے کمروں کی سلاخدار کھڑکیوں سے اندر جھانکا یہاں کچھ لوگ بے خبری کے عالم میں سوئے ہوئے دکھائی دیئے۔ اس نے ہلکا سا کھنکارا کرتے ہوئے انہیں اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں یہ آواز نیچے سوئے ہوئے شخص کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔ کافی دیر کی کوشش کے بعد ان میں سے ایک شخص بیدار ہو گیا۔ وہ کھٹکے کی آواز کے تعاقب میں کھڑکی کی طرف بڑھا اور وہاں کسی کو پا کر وہ چونک پڑا۔

''کک... کک... کون ہے؟'' اس کے حلق سے بمشکل نکلا۔

''دوست! میرے پاس وقت کم ہے، مجھے جلدی سے بتاؤ کہ شاہ فرانس کس جانب؟''

''اس قطار کے آخری کمرے میں......''

''خاموشی سے اپنی جگہ جا کر لیٹ جاؤ، اور کسی قسم کا شور نہ پیدا ہونے دینا، میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کے یہاں پہنچ پایا ہوں''۔ سیاہ پوش نے اسے ہدایت کی۔

''مگر تم کون ہو؟''

''میرا وقت ضائع نہ کرو''۔

سیاہ پوش تیزی سے آخری کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ آخری کمرے کی کھڑکی کے سامنے پہنچ کر اس نے اندر جھانکا۔ وہاں ایک ہی بستر دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے لوہے کی سلاخ میں ہاتھ ڈال کر دھیمے انداز میں کھڑکی کھٹکھٹائی۔ چند ایک بار کی کوشش پر بستر پر سوئے ہوئے شخص نے کروٹ لی تو اس نے ایک مخصوص انداز میں دستک دینا شروع کر دی۔ بستر پر لیٹا ہوا شخص اس مخصوص دستک پر چونک کر بیدار ہو گیا۔ وہ بستر پر بیٹھے دائیں بائیں دیکھنے لگا، شاید وہ آواز کی سمت کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ آواز دروازے کے پہلو میں موجود کھڑکی کے پاس سے آ رہی ہے تو وہ اس جانب بڑھ گیا۔

''میں شاہ فرانس کی خدمت میں شاہ یروشلم کا سلام پیش کرتا ہوں''۔ سیاہ پوش اس کے قریب پہنچنے پر دھیرے سے بولا۔

''کہو ٹیمپلر! کیسے آنا ہوا؟''

''شاہ یروشلم نے یہ پیغام بھیجا ہے کہ فرانسیسی لشکر کی شکست اور آپ کی گرفتاری کی بابت سن کر ارض مقدس کے نصاریٰ کو بے حد صدمہ پہنچا ہے، آپ جس مقصد کے لئے فرانس سے یہاں تک پہنچے ہیں، وہ بڑا کٹھن اور دشوار ہے، بہرکیف آپ ہمت نہ ہاریئے گا۔ تمام مسلمان حکمران مال و دولت کے حریص ہوتے ہیں، آپ انہیں فدیہ کی صورت میں وہ جو رقم مانگیں دے کر اس جگہ سے نکلنے کی کوشش کریں۔ جونہی آپ کو ان سے چھٹکارا نصیب ہو، فوری طور پر عکہ تشریف لے آیئے۔ یہاں ایک بڑا لشکر آپ کے استقبال کے لئے موجود ہے۔ ماضی میں مجھ سے سرزد ہونے والی کوتاہی کو دل سے نکال دیں کیونکہ وہ وقت کا تقاضا تھا۔ میری افواج کسی صورت ارض مقدس سے باہر نکلنے پر رضامند نہیں تھیں۔ اگر آپ کے پاس فدیے کے لئے کافی رقم نہ ہو تو اس ضمن میں فوری طور پر مجھ سے رابطہ کیجئے۔ میں بلاتاخیر اس کا بندوبست کر دوں گا''۔

شاہ فرانس لوئی نہم نے ٹیمپلر کی باتیں سننے کے بعد تاسف بھری مسکراہٹ چہرے پر بکھیری۔ وہ وقت گزرنے کے بعد اس کی مدد کی یقین دہانی پر محض پہلو بدل کر رہ گیا تھا۔

''اپنے شاہ سے جا کر کہو کہ میں ایک بار تمہارے پاس ضرور آؤں گا، وہ میرا انتظار کرے، ابھی کئی شکوے ایسے ہیں جنہیں دور کرنا باقی ہے۔ ان مسلمانوں سے کیسے نبٹنا ہے، اس بارے میں میں اچھی طرح جانتا ہوں''۔

''میں شاہ فرانس کے لئے فی الحال کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ یہاں کافی تعداد میں سپاہی موجود ہیں جن کے ساتھ بھڑنا جان گنوانے کے مترادف ہو گا دوسرا ٹیمپلرز کا قلعہ بھی یہاں سے کافی دور ہے''۔ سیاہ پوش نے ہمدردی جتانے کی کوشش کی۔

''میں سب جانتا ہوں، تمہیں میرے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے''۔

سیاہ پوش نے واپس لوٹنے کی اجازت طلب کی۔ شاہ لوئی نہم نے سر ہلا کر جانے کی اجازت دی۔ وہ وہاں سے دبے قدموں واپس لوٹ گیا۔ نیچے موجود ہمہ وقتی خادم صبیح المعظمی بے خبر سو رہا تھا۔ ٹیمپلر چوکنے انداز میں شاہی دیوار تک آیا اور چیلے کے سے انداز میں دوسری طرف اتر گیا۔ باہر موجود سپاہی اب اونگھنے کے بجائے نیند کی خوابناک وادی میں پہنچ چکے تھے۔ اس نے ان پر نگاہِ غلط انداز ڈالتے ہوئے وہاں سے نکلنے میں دیر نہیں کی تھی۔



امیر برکیارک ہاتھوں کو مسلتا ہوا بے قراری کے عالم میں دروازے کے سامنے ٹہل رہا تھا۔ دروازہ کھلنے کی کوئی امید نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بیبرس کے تعاقب میں یہاں تک پہنچ پایا تھا۔ اس کے ذاتی مخبر نے بیبرس کی پُراسرار سرگرمیوں کی اطلاع جب دی تھی تو وہ بیبرس کی جانب سے چوکنا ہو گیا تھا۔ اس نے بیبرس کے محتاط تعاقب کی ذمہ داری تین دوسرے مخبروں کو سونپ دی۔ آج جب اس کے مخبر نے بیبرس کی اس مکان میں پہنچنے کی اطلاع دی تو وہ وقت ضائع کئے بغیر بیس سپاہیوں کا دستہ لئے اس مکان تک آ دھمکا۔

سپاہی پوری قوت سے دروازہ پیٹنے میں مصروف تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا امیر برکیارک کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ بالآخر جب اس کی جھنجلاہٹ نکتۂ عروج پر جا پہنچی تو اس نے سپاہیوں کو دروازہ توڑنے کا حکم دے دیا۔ سپاہیوں نے حکم پاتے ہی دروازے پر زورآزمائی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دروازہ قبضوں سے اکھاڑ دیا گیا۔ دوسرے گھروں کے مکین شور کی آواز سن کر وہاں جمع ہونے لگے۔ امیر برکیارک نے انہیں قرب و جوار میں جمع ہوتا دیکھ کر تیز لہجے میں اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹنے کا حکم دیا۔ جمع ہونے والے لوگ سمجھ چکے تھے کہ یہ کوئی سرکاری معاملہ ہے۔ اس خدشے کے پیش نظر کہ کہیں وہ بھی نہ دھر لئے جائیں، آہستہ آہستہ وہاں سے کھسکنے لگے۔

دروازہ ٹوٹنے پر امیر برکیارک نے اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ وہ محتاط انداز میں اندر داخل ہو گئے۔ سپاہی ہر قسم کی غیر متوقع صورتحال سے نمٹنے کے لئے پوری طرح تیار دکھائی دے رہے تھے۔ امیر برکیارک بھی تلوار بے نیام کئے ان کے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔ دو راہداریوں کو پار کرنے کے بعد وہ اس کمرے تک پہنچ گیا جہاں تین افراد موجود تھے۔ ان کے چہروں پر پریشانی چھائی ہوئی تھی۔ اُن لوگوں کی صورت دیکھ کر امیر برکیارک کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی۔ انہیں تحقیر بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے سپاہی عجب تذبذب کا شکار تھے۔ ان کے سامنے جو لوگ موجود تھے، وہ ان کے سالار اعلیٰ تھے۔ اپنے سالاروں کو گرفتار

کرنے کی ذمہ داری نبھانے کا وقت آن پڑا تھا۔ وہ مخمصے میں مبتلا ہونے لگے۔ ان کی ننگی تلواروں کا رُخ ان تینوں کی جانب تھا۔

''مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تم لوگ قاہرہ واپس نہیں لوٹو گے۔ میں نے جان بوجھ کر سلطان سے کہہ کر بیبرس کا مخصوص دستہ منصورہ میں رکوایا تھا تاکہ تم لوگوں تک آسانی سے رسائی حاصل ہو سکے۔ اب میں تمہیں پابہ زنجیر سلطان توران شاہ کے سامنے پیش کر کے اپنی بات کا ثبوت دوں گا کہ میں نے زندگی میں کبھی غلطی نہیں کی اور میرا شک ہمیشہ درست نکلتا ہے''۔

''امیر برکیارک!'' فارس الدین اقطائی جو اس دوران سنبھل چکا تھا تمسخرانہ لہجے میں بولا۔ ''یہ تو تمہارا خواب ہی رہے گا کہ تم ہمیں پابہ زنجیر سلطان کے سامنے پیش کر سکو گے''۔

''مجھے حیرت ہے کہ تم ابھی بھی بچ نکلنے کی امید لگائے ہوئے ہو''۔

''ٹھیک ہے، تم ہم سب لوگوں کو یہاں سے گرفتار کر کے لے جاؤ، مگر ہمیں سلطان کے سامنے پیش کرنے کے لئے تمہارے پاس کیا جواز ہے؟''

''تم نے سلطان کی حکم عدولی کی ہے، تمہیں قاہرہ لوٹنے کا حکم دیا گیا تھا مگر تم وہاں جانے کے بجائے یہاں چھپ کر کوئی خفیہ کھیل کھیلنے میں مصروف ہو۔ کیا یہ تمہارے جرم کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے؟''

''ٹھیک ہے کہ ہم منصورہ میں موجود ہیں۔ یہ احکامِ شاہی کی خلاف ورزی سہی مگر یہ کوئی اتنا بڑا جرم نہیں کہ تم ہمیں گرفتار کرنے کی کوشش کرو''۔

''یہ تو تمہیں سلطان کے سامنے پیش ہو کر بتانا ہی پڑے گا کہ تم چوروں کی طرح جو یہاں چھپے بیٹھے ہو، اس کے پیچھے کیا سازش پل رہی ہے''۔

''تمہارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ ہم یہاں محض اس لئے مقیم ہیں کہ سلطان توران شاہ کے خلاف سازش تیار کریں؟'' احمد چولاک تنک کر بولا۔

''برکیارک!'' فارس الدین اقطائی نرم لہجے مین بولا۔ ''تمہیں یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، ورنہ ایسی کوئی بات نہیں جو تم سمجھ رہے ہو''۔

''مجھے سبق پڑھانے کی کوشش نہ کرو، مجھے تمہاری ہڈیوں سے بھی راز اگلوانے کا فن آتا ہے۔ سپاہیو! ان کے دونوں ہاتھ زنجیروں سے باندھ کر قلعے میں لے چلو۔ اگر ان میں سے کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کرے تو اس کا سر تن سے جدا کر دینا''۔

امیر برکیارک کا حکم سن کر سپاہی تذبذب کے شکار ہو گئے۔ وہ دونوں کی صورت دیکھ رہے تھے۔

امیر برکیارک سپاہیوں کی جھجک کو تاڑ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ ماضی میں یہ لوگ چونکہ ان پر افسران مقرر تھے، اسی لئے سپاہی اپنے معزول افسروں کی گرفتاری سے جھجک رہے ہیں۔ اس نے گرجتی ہوئی آواز میں انہیں تنبیہ کی۔

''وقت کیوں ضائع کر رہے ہو؟ تم سلطان کے وفادار ہو، اپنے سلطان کی حفاظت تم پر فرض ہے، یہ اسی فرض کا ایک حصہ ہے''۔

دو سپاہی حکم کی تکمیل کے لئے آگے بڑھے۔ احمد چولاک کے چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگا۔ اسی وقت ایک گرجدار آواز سپاہیوں کے عقب سے گونجی۔

''ٹھہرو!''

سپاہیوں کے بڑھتے قدم رُک گئے۔ وہ اس جانب دیکھنے لگے جدھر سے انہیں رُکنے کا حکم سنانے والی

آواز سنائی دی تھی۔



گل دتوژ جب عالم بے ہوشی سے بیدار ہوئی تو اس نے خود کو ایک آرام دہ بستر پر پایا۔ اس نے اپنے اردگرد حیرت سے دیکھا۔ پھر اس کے ذہن کے پردوں پر بیتے ہوئے واقعے کی کڑیاں مربوط ہو گئیں۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ڈھاٹے سے چھپائے گئے چہرے گھومنے لگے۔ وہ سہمی نگاہوں سے اس خیمے کے در و دیوار دیکھ رہی تھی جہاں وہ اس وقت موجود تھی۔ خیمے کی اندرونی بناوٹ میں کوئی خاص بات نہیں تھی، جس پر وہ کوئی اندازہ قائم کر پاتی۔ ایک خیال کے تحت اس نے خود کو ٹٹولا۔ اس کا جسم پوری طرح آزاد تھا۔ وہ بستر سے نکل کر کھڑی ہو گئی۔ وہ دھیمے قدموں سے خیمے کے دروازے کی جانب بڑھی۔ خیمے کا پردہ اُٹھا کر جب اس نے باہر نظر ڈالی تو لمحہ بھر کے لئے دنگ رہ گئی۔ وہ اس وقت کسی کھلے علاقے میں موجود تھی، جہاں پتھریلی زمین پر کہیں کہیں برف کے گالے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ خیمے سے باہر نکل آئی۔ ایک بار پھر اسے حیرت کا شکار ہونا پڑا۔ وہاں صرف اسی کا اکیلا خیمہ ایستادہ تھا۔ دور دور تک کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اسے اس ویرانے میں تنہا کس نے چھوڑا ہے؟ یہ سوال اس کے ذہن کو جھنجھوڑنے لگا۔ اسے محض اتنا یاد تھا کہ کسی نے کپڑا اس کے چہرے پر ڈال کر اسے ہوش سے بیگانہ کر دیا تھا۔ وہ کون ہو سکتا ہے؟ اس بارے میں اندازہ لگانا دشوار تھا۔ وہ اذقائی قبیلے کے اجنبی سردار کے بارے میں سوچنے لگی، جس نے حالات کو ناقابل یقین حد تک تبدیل کر دیا تھا۔ مانچی خان کو اس نے خنجر گھونپا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں خیال پیدا ہوا کہ کہیں یہ کارستانی اسی کی نہ ہو۔ اگر واقعی یہ حرکت سردار مانچی خان نے ہی کی ہے تو وہ کسی بڑی مصیبت میں پھنسنے والی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ حرکت اس نے نہ کی ہو، مطیع الدین کے حوالے سے بھی اسے یہ شک گذرا، مگر وہ تو خود ایک عرصے سے لاپتہ تھا۔ خیالوں کے بھنور میں پھنسی وہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ اس نے اِدھر اُدھر گھوم کر گرد و نواح کا جائزہ لیا کہ شاید کہیں کوئی چھپا بیٹھا دکھائی دے مگر وہاں حقیقتاً کوئی موجود نہیں تھا۔ وہ دوبارہ خیمے میں داخل ہوئی۔ وہاں موجود سامان کو الٹ پلٹ کر وہ کوئی سراغ تلاش کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گئی۔ اسے اپنے باپ تونائی خان کے ساتھ چند بار سفر کرنے کا موقع ملا تھا جس کے سبب وہ کئی منگول قبیلوں کے رہن سہن اور ان کے خیموں کے طرزِ تعمیر سے واقف ہو چکی تھی۔ خیمے کی بناوٹ کو پہچاننے میں وہ پہلے ہی مات کھا چکی تھی۔ وہ عام خیموں جیسا ہی لگ رہا تھا۔ اس کا سفید رنگ عام شکاری منگولوں کے استعمال میں آنے والے خیموں جیسا تھا البتہ وہ قدرے میلا دکھائی دے رہا تھا۔ خیمے میں عام سا سامان موجود تھا، جس کی ضرورت کسی بھی سفر میں پیش آ سکتی تھی۔

وہ اپنی مسلسل ناکامی پر جھنجھلا سی گئی۔ تھک ہار کر وہ ایک بار پھر باہر نکل آئی۔ آخر وہ کون تھا جس نے اسے زنداں خانے سے نکال کر اس ویرانے میں لا پھینکا تھا؟ وہ خیمے کے قریب ایک پتھر پر ٹانگیں پسار کر بیٹھ گئی اور اس نامعلوم فرد کا انتظار کرنے لگی۔ اسے زیادہ دیر تک انتظار کی صعوبت برداشت نہیں کرنا پڑی۔ تھوڑی دیر بعد دور سے ایک چھوٹا سا غبار اُٹھتا دکھائی دیا۔ وہ غبار کو دیکھ کر چونک پڑی اور آنکھیں پھاڑ کر اسے غور سے دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں اس غبار سے ایک گھڑسوار برآمد ہوا۔ وہ تیز رفتاری سے اسی جانب بڑھتا آ رہا تھا۔ گل دتوژ جانے کیوں کسی اَن دیکھے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ وہ بے تابی سے ہاتھ مسلنے لگی۔ خیمے میں تلاشی کے دوران اسے کوئی ایسی چیز نہیں مل پائی تھی جسے وہ بطور ہتھیار استعمال کر پاتی۔



خیمے کا پردہ اُٹھا اور بلند قامت برقائی خان اندر داخل ہوگیا۔ مطیع الدین اسے بے یقینی کے انداز میں دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی بصارت پر اعتبار نہیں آرہا تھا کہ کیا واقعی برقائی خان ہی اس کی نگاہوں کے سامنے کھڑا ہے۔ وہ اس کی صورت دیکھ کر گنگ سا رہ گیا تھا۔ کافی دیر تک اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا بات کرے؟ ایک پل کے لئے تو اسے یہ سب خواب محسوس ہوا۔ اس نے خود کو چٹکی بھری اور تکلیف ہونے پر کراہ کر رہ گیا۔ وہ کوئی خواب نہیں تھا، برقائی خان بذاتِ خود اس کی نگاہوں کے سامنے موجود تھا۔ برقائی خان نے اس کے ششدر چہرے کو دیکھتے ہوئے سپاہی کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔

''تم اب کچھ منہ سے پھوٹو گے کہ یونہی ہونق بنے بیٹھے رہو گے؟'' برقائی خان نے اس کے انداز پر پھبتی کسی۔

یکا یک مطیع الدین کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ برقائی خان اس کی جانب بڑھا اور اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کی ڈھارس بندھانے لگا۔ مطیع الدین اسے اچانک اپنے سامنے پا کر خوش بھی تھا اور غمگین بھی۔

''چلو اب بس کرو، مجھے لڑکیوں کی طرح آنسو بہانے والے مرد ہرگز پسند نہیں''۔ برقائی خان کی اپنی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔ مطیع الدین نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا جیسے کوئی وہ چھوٹا بچہ ہو جسے اپنوں سے بچھڑ جانے کا خوف لاحق ہو۔ برقائی خان اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے بچوں کی طرح پچکار رہا تھا۔ اس کا لہجہ ایسا تھا مطیع الدین روتے روتے ہنس پڑا۔

''یہ کس قسم کی اداکاری کر رہے ہو بھئی؟ کبھی رو کر دکھاتے ہو اور کبھی روتے میں ہنس کر۔ اتنے دن دور رہ کر یہی کچھ سیکھا ہے کیا؟'' برقائی بولا۔

''تم میرے جذبات کا مذاق اُڑا رہے ہو کیا؟'' مطیع الدین کا منہ بن گیا۔

''واہ بھئی واہ! عورتوں کی طرح ناز و ادا بھی''۔

مطیع الدین اس کی بات پر کھل اُٹھا۔ وہ دونوں آپس میں گذرے وقت کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ بڑے دنوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ گذرے وقت کے بے شمار قصے ان کے پاس موجود تھے جو وہ ایک دوسرے کو سنانے کے لئے بے تاب ہو رہے تھے۔ مطیع الدین نے اپنے باپ کے بارے میں پوچھا تو برقائی خان نے اسے تسلی دی۔ مطیع الدین نے جھجکتے انداز میں جب گل دتوز کے بارے میں پوچھا تو برقائی خان کے لبوں سے بلند قہقہہ نکل گیا۔ اس نے بے اختیار ایک زوردار ہاتھ اس کے کندھے پر دے مارا۔ مطیع الدین پہلے ہی تکلیف سے دوچار تھا، ہاتھ پڑتے ہی وہ تڑپ اُٹھا۔ اس کے لبوں سے تیز کراہ نکلی۔ برقائی خان کو دوسرے لمحے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ ہڑبڑا کر وہ معذرت طلب کرنے لگا۔ مطیع الدین کی تیز کراہ پر اس کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ مطیع الدین اس کا ٹپٹایا ہوا چہرہ دیکھ کر اپنی تکلیف لمحہ بھر کے لئے بھول گیا اور اس کی شکل دیکھ کر ہنسنے لگا۔ برقائی خان محض مسکرا کر رہ گیا تھا۔ وہ مطیع الدین کی سنگین حالت سے آگاہ تھا۔ اسے اس کی قوتِ ارادی پر رشک آرہا تھا کہ اس قدر تکلیف سے دوچار ہونے کے باوجود وہ خوش و خرم دکھائی دے رہا تھا۔ اسے اب مطیع الدین کی صحت یابی کا انتظار تھا تا کہ وہ واپسی کا سفر اختیار کرتا۔ اس نے اپنے لشکر کو ایک دوسرے سردار کی قیادت میں واپس لوٹنے کا حکم دے دیا۔ بیس سپاہی اس نے اپنے ساتھ رکھے تا کہ جینائی محافظوں کی جانب سے کسی شرارت کا مقابلہ کیا جا سکے۔ اسے امید تھی کہ اب جینائی محافظوں میں سے کوئی اس کی طرف نہیں بڑھے گا، پھر بھی احتیاط ضروری تھی۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو واضح طور پر یہ حکم دے رکھا تھا کہ وہ اپنے کھانے کے بندوبست

کے ساتھ ساتھ میزبان ضرگامی قبیلے کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھیں۔ سرگامی سردار نے میزبانی کے فرائض کے حوالے سے تمام ذمہ داریاں نبھانے کی پیشکش کی تھی مگر برقائی خان اُن کی خستہ حالی دیکھتے ہوئے اس بات پر آمادہ نہیں ہوا تھا۔



امیر برکیارک اپنے عقب میں کسی کی موجودگی پر چونک کر پلٹا۔ نیبرس اس کے سامنے کھڑا اُسے درشت نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ نیبرس کی شکل دیکھتے ہی برکیارک کا چہرہ کھل اُٹھا۔

''تم بھی یہیں موجود ہو، اب تو میری بات کو کوئی جھٹلا ہی نہیں سکتا۔ سپاہیو! اسے بھی گرفتار کر لو۔ اس کی بات پر کان دھرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ پورا ٹولہ ہی غداروں کا ہے''۔ امیر برکیارک نے سپاہیوں کو ہدایت کی۔ سپاہی ابھی تک ساکت کھڑے تھے۔

''برکیارک!'' نیبرس چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ ''کہتے ہیں کہ شیطان کی جب کم بختی آتی ہے تو وہ اللہ کے نیک بندوں کے پاس چلا آتا ہے، تمہارے بخت بھی کچھ ایسے ہی دکھائی دے رہے ہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ نائب السلطنت کا عہدہ پا کر تم اتنے طاقتور ہو گئے ہو کہ جہاں چاہو دندناتے پھرو اور جو کچھ کہو وہ سچ مان لیا جائے''۔

''نیبرس! تمیز کے دائرے میں رہ کر بات کرو۔ میری زبان تم سے زیادہ لمبی ہے۔ یہ سپاہی تمہیں گرفتار کر کے لے جائیں گے کیونکہ یہ سلطان کے وفادار ہیں اور اسی سے تنخواہ پاتے ہیں''۔ برکیارک سخت لہجے میں بولا۔

''ان میں کوئی سپاہی بھی تمہاری بات نہیں مانے گا۔ تم چاہو تو کوشش کر کے دیکھ سکتے ہو''۔ نیبرس نہایت اطمینان سے چلتا ہوا فارس الدین اقطائی کے پہلو میں پڑی ہوئی نشست پر جا بیٹھا۔

''سپاہیو!'' امیر برکیارک نے انہیں آنکھیں دکھائیں۔ ''یاد رکھو میری حکم عدولی کرو گے تو میں تمہاری کھال کھنچوا دوں گا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میری کیا حیثیت ہے''۔

''تمہاری جو بھی حیثیت ہے، وہ ان کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی، کیونکہ اس وقت ان کا سالار ان کے سامنے موجود ہے۔ جب دستے کا سالار سامنے ہو تو تمام سپاہی صرف اسی کی اطاعت کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ سپاہیوں کی تربیت کا بنیادی جزو ہے''۔

امیر برکیارک نے جب یہ محسوس کر لیا کہ یہاں اس کی دال نہیں گل سکتی تو وہ پاؤں پٹخ کر بولا۔ ''میں تم سب کو دیکھ لوں گا''۔

وہ غم و غصے کی حالت میں دروازے کی جانب مڑا۔ اسی لمحے نیبرس نے اسے آواز دے کر روک دیا۔

''امیر برکیارک! تم آئے تو اپنی مرضی سے ہی تھے مگر تم اپنی مرضی سے یہاں سے جا نہیں سکتے، جب تک ہم اجازت نہیں دیں گے''۔

''کک...... کیا...... مطلب؟'' وہ گڑبڑا گیا۔

''مطلب تو تم سمجھ رہے ہو نائب السلطنت''۔ فارس الدین اقطائی ہنس کر بولا۔

''تم ایسا نہیں کر سکتے!'' امیر برکیارک بازی پلٹتے دیکھ کر پریشان دکھائی دینے لگا۔

''جو تم کرنا چاہتے تھے وہ تو تم کر نہیں سکے مگر جو ہم کرنا چاہتے ہیں اس سے تم ہمیں باز نہیں رکھ سکتے''۔ فارس الدین اقطائی نے کہا۔

دوسرے لمحے سپاہیوں نے امیر برکیارک کو زنجیروں کے جال میں ایسے لپیٹ ڈالا کہ اس کے لئے معمولی سی حرکت کرنا بھی دشوار ہو گیا۔ وہ بری طرح مچل رہا تھا، اس کی زبان سے ہذیان جاری تھا۔ امیر برکیارک اس بارے میں کسی کو کچھ بتا کر نہیں آیا تھا، کیونکہ اسے قطعی امید نہیں تھی کہ معاملہ یہ شکل اختیار کر جائے گا۔ ضرورت سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی نے اسے بالکل بے بس کر دیا تھا۔

فارس الدین اقطائی نے تھوڑی دیر اس کی بکواس سنی پھر جب اکتا گیا تو اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس کا منہ بند کر دیا۔ اس امر سے فارغ ہو کر فارس الدین اقطائی نے سبرس کا شکریہ ادا کیا کہ اس کی بروقت آمد نے معاملے کو بگڑنے سے بچا لیا۔ سبرس نے اس کی ڈھارس بندھائی اور اس امر کا انکشاف کیا کہ وہ اُس کی آمد سے پہلے سے باخبر تھا۔ اس کے جاسوسوں کو وہ پہلے ہی دن سے تاڑ گیا تھا۔ آج وہ اسی لئے جلدی یہاں سے نکل گیا تھا کہ کہیں وہ چوہے دان میں نہ پھنس جائے۔ جب اس نے اسے اس جانب آتا دیکھا تو ایک جانب ہٹ گیا۔ پھر اس کے تعاقب میں واپس لوٹ آیا۔



تھوڑی دیر میں وہ گھڑ سوار گل وتوژ کے قریب پہنچ گیا۔ وہ طویل القامت شخص تھا۔ وضع ولباس سے وہ منگول ہی دکھائی دے رہا تھا۔ سیاہ ڈھاٹے سے اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا، اسی لئے گل وتوژ کوئی اندازہ نہیں قائم کر پائی کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔ اس نے گل وتوژ کو دور سے ہی دیکھ لیا تھا، اسی لئے وہ اپنے گھوڑے کو اس کی جانب بڑھا لایا۔ قریب پہنچ کر اس نے گل وتوژ کے گرد ایک چکر کاٹا۔ گل وتوژ پریشانی کے عالم میں اس کے ساتھ ساتھ گھومتی چلی گئی۔ پھر اس نے اپنے گھوڑے کو ٹھہرایا اور جست لگا کر نیچے آ گیا۔ وہ گل وتوژ کی جانب بڑھا اور اس کے بالکل مدمقابل آن کھڑا ہوا۔

''تت..... تم کون ہو اور مجھے یہاں اس ویرانے میں کیوں لائے ہو؟'' گل وتوژ ہمت کر کے بولی۔ اس کی بات سن کر نو وارد ہنسنے لگا۔

''میرا خیال تھا کہ تم مجھے پہلی نظر ہی میں پہچان جاؤ گی مگر چہرہ دیکھ کر ہی میں پہچانا جا سکوں گا، یہ مجھے ہرگز امید نہیں تھی''۔

گل وتوژ اس کی آواز سن کر مخمصے میں پڑ گئی۔ یہ آواز اور لہجہ اس کی سماعت میں محفوظ تھا مگر وہ کون ہو سکتا ہے؟ اس بارے میں اس کا ذہن اس کی مدد نہیں کر پایا۔ اجنبی نے اسے یوں پریشان دیکھ کر اپنے چہرے کو بے نقاب کر ڈالا۔ وہ ایک خوش شکل اور وجیہہ تاتاری نوجوان تھا۔ گل وتوژ اس کی صورت دیکھتے ہی سناٹے میں آ گئی۔ اسے یہ ہرگز توقع نہیں تھی کہ اس کے سامنے موجود نوجوان اس کا ماموں زاد اور منک آنہ کا پوتا ہو سکتا ہے۔ اسے دیکھے ایک زمانہ بیت چکا تھا۔ کئی برس پہلے جب وہ اپنے نانا منک آنہ کے پاس گئی تھی تو اسے ملی تھی۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کے قد میں غیر معمولی اضافہ ہوا تھا، چہرے کے خدوخال میں کوئی زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

''شنگ! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میرا ذہن تو ماؤف ہونے والا ہے۔ تم مجھے سرائے سے اس طرح اغوا کر کے یہاں لے آئے؟''

''اور کیا میں تمہیں ان لوگوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیتا جو تمہیں موت کی سزا سنانے پر تلے بیٹھے تھے؟''

''یہ تم نے بہت غلط کیا شنگ! وہ لوگ مجھے اب حقیقتاً اپنے باپ کی قاتل سمجھیں گے''۔ گل وتوژ تاسف بھرے لہجے میں بولی۔

''بے وقوف! تم نہیں جانتیں کہ وہاں کیا کھیل رچایا گیا ہے۔ چلو اندر، میں تمہیں تفصیل سے سب بتاتا ہوں۔ یہاں کافی خنکی ہے، کچھ دیر اور یہاں رکیں تو بیمار پڑ جاؤ گی''۔ شنگ نے خیمے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دونوں خیمے کی جانب بڑھ گئے۔ خیمے میں پہنچ کر شنگ نے ایک کونے میں پڑے صندوق میں سے شراب کی صراحی نکالی۔ وہ شاید کافی دیر سے شراب کی طلب محسوس کر رہا تھا، اسی لئے اس نے صراحی سے دو تین گھونٹ اپنے حلق میں اتار لئے۔ گل وتوژ خیمے کے وسط میں کھڑی اس کی صورت دیکھتی رہی۔ شنگ نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ گل وتوژ نڈھال سی بستر پر بیٹھ گئی۔ شنگ وہیں صندوق پر ہی بیٹھ گیا تھا۔

''شنگ جلدی سے بتاؤ، میں سخت اضطراب میں ہوں''۔ گل وتوژ نے کہا۔

''گل! بڑے افسوس کی بات ہے، تم نے نہ تو مجھ سے میرا حال دریافت کیا اور نہ ہی یہ پوچھا کہ میں اب تک کہاں تھا''۔ اس نے شکوہ کیا۔

''یہ سب میں بعد میں پوچھ لوں گی، تم نہیں جانتے کہ میں گذشتہ چند دنوں سے کس اذیت کا شکار ہوں، نہ صرف میرے باپ کے قتل کا الزام مجھ پر لگا دیا گیا بلکہ حالات کو یوں توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے کہ میں سوچ سوچ کر ہی ہلکان ہو گئی ہوں''۔

''اچھا بابا! بتاتا ہوں، تم پیو گی کیا؟'' شنگ نے شراب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے ایسی مہلت نہیں ہے''۔ گل وتوژ نے ناگواری سے جواب دیا۔

''ناراض کیوں ہوتی ہو؟ میں نے سوچا کہ سردی بڑھ رہی ہے شاید گرمائی کے لئے تمہیں اس کی ضرورت ہو''۔

''تم جان بوجھ کر وقت ضائع کر رہے ہو''۔

''تسلی رکھو! کچھ ہی دیر میں تم سب کچھ سمجھ جاؤ گی، تم نے کون سا ابھی واپس لوٹنا ہے''۔

شنگ کچھ دیر تک شراب نوشی میں مشغول رہا پھر اس نے صراحی ایک جانب رکھ دی۔ وہ ویسے بھی زیادہ نہیں پیتا تھا مگر آج اس نے خود بھی گریز کرنا ضروری سمجھا۔ اس کے قریب ایک خوبصورت لڑکی موجود تھی، تنہائی بھی تھی، وہ ایسے میں بہکنے سے خود کو باز رکھنا چاہتا تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم اپنے باپ کے قاتل کے بارے میں بھی جاننا چاہ رہی ہو گی''۔

''ہاں!'' گل وتوژ نے ٹکا سا جواب دیا۔ اسی لمحے اس کا ماتھا ٹھنکا۔ ''کہیں تم تو..... !''

''ارے نہیں..... نہیں! خواہ مخواہ شک نہ کیا کرو۔ دراصل تمہارے باپ کے قتل کے پیچھے شاہی خاندان کے ارکان کا ہاتھ ہے''۔ اس نے انکشاف کیا۔ گل وتوژ اس کی بات سن کر لمحہ بھر کے لئے دنگ رہ گئی، اس کی پھیلی آنکھوں میں بے یقینی جھلک رہی تھی۔

''کچھ دن قبل اچانک شاہی حکم آیا کہ منک آنہ کو سرداری کے عہدے سے معزول کر دیا جائے اور اس پر بدعنوانی کا مقدمہ تھوپ کر اسے بے بس بنا دیا جائے۔ یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ کوئی سمجھ نہیں سکا کہ کیا ہو رہا ہے۔ میں اپنے طور پر وہاں سے نکلا کہ تمہارے باپ کو یہ ساری صورت حال بتا سکوں۔ یہاں یہ بھی جان لو کہ اس شاہی فرمان سے دو دن پہلے تمہارا باپ عجلت کی حالت میں سرخوں کے قبیلے میں آیا تھا۔ میں جب یہاں پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ تونائی خان کو گذشتہ رات کسی نے قتل کر ڈالا ہے۔ جانے کیوں یہ بات مجھے کچھ عجیب سی لگی۔ میں سرائے ٹھہر گیا کہ قاتل کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکے۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ تمہیں اپنے باپ کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے تو میرا شک یقین میں بدل گیا کہ یہ واقعی کوئی بڑی منصوبہ بندی ہی ہے۔ تونائی خان

ریاست کا اہم عہدے دار تھا۔ اس کے بارے میں شاہی خاندان کی خاموشی میرے شک کو مضبوط بنانے لگی۔ جب میں نے تمہارا بیان سنا تو تیزی سے ازاقائی قبیلے جا پہنچا۔ وہاں معلوم ہوا کہ سردار مانجی خان کوئی گہرا گھاؤ کھا کر بستر پر پڑا ہے، جس پر مجھے یقین ہو گیا کہ تم سچ کہہ رہی تھیں۔ ابھی میں وہیں موجود تھا کہ ایک شاہی فرمان وہاں پہنچا۔ مانجی خان کو معزول کر کے اس کی جگہ فوری طور پر نیا سردار نامزد کر دیا گیا۔ مجھے اُس وقت مکمل طور پر یقین ہو گیا کہ واقعی شاہی خاندان کا کوئی فرد تمہارے باپ کے قتل میں ملوث ہے اور وہ اس قتل کی واردات کو غلط رنگ دینا چاہتا ہے۔ میں اسی وقت سیدھا اپنے قبیلے میں پہنچا اور وہاں اپنے دادا سے مل کر ساری صورتِ حال ان کے گوش گذار کر دی۔ انہوں نے میری بات سن کر مجھے ہدایت کی کہ میں کسی بھی طریقے سے تمہیں زنداں خانے سے نکال لاؤں کیونکہ تو نائی خان کی موت کو جلد ہی سرد خانے میں ڈال کر فراموش کر دیا جائے گا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ اس ناکردہ جرم میں تم ماری جاؤ''۔

شنگ اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہو گیا۔ گل وتوژ کے ذہن میں خوف سا طاری تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس گھناؤنے کھیل میں اُسے پھانس لیا جائے گا۔ ایسے حالات میں تو اس کے خلاف گواہیوں کی قطار لگ سکتی تھی۔

''تم سمجھتے ہو کہ تمہاری اس حرکت سے میں زندہ رہ پاؤں گی؟'' گل وتوژ نے اچانک سوال کیا۔

''کیا مطلب؟ تم سمجھتی ہو کہ ریاستی سپاہی اب تمہاری کھوج میں نکل پڑیں گے؟''

''میں اب واپس سرائے نہیں جا پاؤں گی؟''

''وہاں اب رکھا ہی کیا ہے؟ اپنے نانا کے قبیلے میں رہ کر باقی زندگی وہیں بسر کرنا''۔

''تم یہ سب آسانی سے کہہ سکتے ہو۔ مگر میرے لئے یہ ممکن نہیں۔ میں ہر قیمت پر سرائے میں ہی رہنا پسند کروں گی''۔

''بے کار ضد مت کرو۔ فی الحال تو اپنے نانا کے پاس چلو۔ وہ خود ہی تمہیں سمجھا لیں گے''۔

''نہیں! میں واپس سرائے ہی جاؤں گی'' گل وتوژ کا لہجہ چٹان کی طرح مضبوط تھا۔

''تمہارا دماغ چل گیا ہے کیا؟'' شنگ تیز آواز میں بولا ''وہاں موت تمہاری منتظر ہے''۔

''میں سرائے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی''۔ گل وتوژ نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ وہ ایک ایسے دوراہے پر پہنچ گئی تھی جہاں پر وہ اپنے باپ کو کھونے کے بعد اپنے محبوب مطیع الدین کو کھو رہی تھی۔ سرائے میں رہتے ہوئے اسے یہ امید تو تھی کہ کبھی وہ واپس لوٹے گا تو اس سے ملاقات ہو گی، مگر سرائے کو چھوڑ کر تو یہ امید بھی اندھیرے میں گم ہو جاتی۔

''بہرحال میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تمہیں منک آنہ کے پاس تو جانا ہی پڑے گا۔ وہاں پہنچ کر جو تم کرنا چاہو گی وہی کرنا''۔ شنگ کے چہرے پر یاسیت چھا گئی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی بات سن کر گل وتوژ بے حد خوش ہو گی مگر اس کا ردعمل بڑا جارحانہ تھا۔ گل وتوژ کے بس میں کچھ نہیں تھا۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔ وہ شنگ کے بارے میں اتنا جانتی تھی کہ وہ جس بات کو ایک بار ٹھان لے تو اسے پورا کر کے ہی دم لیتا ہے۔ وہ اسے منک آنہ کے پاس ضرور لے جائے گا۔ بے شک اس کی مرضی اس میں شامل نہ ہو۔



9 صفر 648ھ کو صبح کے وقت سلطان توران شاہ اپنے کمرے سے باہر نکل کر کھلے آسمان تلے وسیع و عریض صحن میں آن بیٹھا۔ اس کی پسندیدہ کنیزیں بھی اس کے ہمراہ تھیں۔ صبح کا ناشتہ منصورہ کے شاہی قلعے کے

دالان میں ہی لگایا گیا تھا۔ شاہی کنیزیں مختلف پکوان باری باری لاتیں اور ان کے دسترخوان پر سجاتی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد رقص و سرود کی محفل شروع ہو گئی۔ خوبصورت کنیزیں لچک لچک کر اپنے حسن و جمال کی بجلیاں گرا رہی تھیں۔ سلطان توران شاہ نے کھانے کے دوران اپنی خاص کنیزوں سے مختلف امور پر گفتگو بھی جاری رکھی۔ اس کا حفاظتی دستہ دالان کے چاروں سمت اپنے فرائض کی انجام دہی میں چوکنا کھڑا تھا۔ سلطان توران شاہ نے اپنے حفاظتی دستے میں برجی مملوک شامل کر رکھے تھے۔ یہ لوگ حصن کیفا میں بھی اس کے ساتھ رہتے تھے۔ سلطان توران شاہ کو ان کی وفاداری پر مکمل بھروسہ تھا۔ شاہ لوئی نہم اپنے عمائدین کے ساتھ ابھی تک نظر بند تھا۔ اس کے بارے میں کوئی واضح فیصلہ نہیں کیا گیا تھا۔ سلطان توران شاہ پہلے اسے اپنے ساتھ قاہرہ لے جانا چاہتا تھا۔ بعد ازاں وہ اسے پابہ زنجیر بلادِ فلسطین میں گھمانے کا خواہش مند تھا۔ یہ اَمر طے تھا کہ ربیع الاوّل کا چاند دیکھ کر منصورہ سے قاہرہ کی جانب کوچ کیا جائے گا۔

سلطان توران شاہ کھانے سے فارغ ہو کر رقص کی جانب متوجہ ہو گیا۔ دسترخوان سے برتن سمیٹے جانے لگے۔ اچانک ایک محافظ سپاہی اس کی جانب بڑھا۔ توران شاہ اس کی آمد پر چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگا کیونکہ پہلے کبھی ایسا ہوا نہیں تھا۔

''کہو کیا بات ہے؟'' سلطان توران شاہ نے قریب پہنچنے پر اس سے دریافت کیا۔ سپاہی نے جھک کر اسے تعظیم دی اور پھر اچانک اس نے اپنے لباس میں سے ایک لمبے پھل والا خنجر نکالا اور سلطان توران شاہ پر حملہ کر دیا۔ سلطان توران شاہ کو ایسی کوئی توقع نہیں تھی۔ وہ بوکھلا گیا۔ خود کو بچانے کے لئے اس نے تیزی سے پہلو بدلنا چاہا لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ خنجر کا پھل اس کی پسلیوں میں اتر گیا۔ تیز کراہ اس کے حلق سے نکلی۔ کنیزیں سلطان پر حملہ ہوتا دیکھ کر گھبرا گئیں۔ دالان میں چیخ و پکار پھیل گئی۔ دوسرے محافظ سپاہیوں نے جب یہ منظر دیکھا تو وہ اپنی تلواریں نکال کر اس جانب لپکے۔ سلطان توران شاہ کے قریب پہنچنے پر ان میں سے کچھ سپاہیوں نے اپنے ساتھیوں پر حملہ کر دیا۔ وہ دو حصوں میں منقسم ہو کر آپس میں ہی نبرد آزما ہو گئے۔ خنجر والے سپاہی نے دوبارہ حملہ کرنے کی کوشش کی مگر ایک کنیز نے شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تلوار کے ایک ہی وار سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پھر اس نے توران شاہ کو سہارا دے کر اُٹھایا۔ پسلیوں کے درمیان گہرا گھاؤ دکھائی دے رہا تھا۔ سلطان توران شاہ نے اپنا جبہ اتار کر ایک طرف پھینکا اور دونوں ہاتھوں سے زخم کو دبا لیا۔ خون بہہ رہا تھا۔

''سلطان محترم!'' وہ کنیز بولی۔ ''یہ جگہ غیر محفوظ ہے''۔

''میں سمجھ رہا ہوں۔ تم فوری طور پر گھوڑا تیار کرو میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں''۔

کنیز حکم پاتے ہی اصطبل کی جانب لپکی۔ تین وفادار محافظ توران شاہ کے پاس پہنچ چکے تھے۔ وہ حملہ آوروں سے سلطان کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ دالان میں موجود تمام سپاہی آپس میں بری طرح الجھے دکھائی دے رہے تھے۔

''مجھے سہارا دے کر اصطبل کی جانب لے چلو''۔ سلطان توران شاہ نے قریب موجود اپنے وفاداروں سے کہا۔ ان میں دو تیزی سے اس کی جانب بڑھے اور انہوں نے سہارا دے کر اسے کھڑا کیا۔ اسے اُٹھائے اصطبل کی جانب بڑھنے لگے۔ تیسرا سپاہی انہیں محفوظ رکھنے کی غرض سے پشت پر موجود رہا اور حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے پیچھے ہٹتا رہا۔ تھوڑی دیر میں وہ سب اصطبل میں پہنچ گئے۔ انہوں نے سلطان توران شاہ کو ایک گھوڑے پر سوار کرایا اور کنیز کو سلطان کے پیچھے بٹھا دیا تا کہ وہ سلطان کے گھوڑے کو سنبھال سکے۔ انہوں نے بھی گھوڑے سنبھالے اور چار گھوڑے منصورہ کے شاہی قلعے سے باہر نکل گئے۔

سلطان توران شاہ کو اس وقت فوری طبی امداد کی ضرورت تھی مگر یہاں کے حالات ان کے حق میں نہیں تھے۔ وفاداروں نے منصورہ سے باہر نکل کر استفسار کیا کہ کس جانب کوچ کیا جائے تو سلطان توران شاہ نے دمیاط کا رُخ کرنے کی ہدایت کی کیونکہ وہ قریب ترین شہر تھا جہاں سے اسے طبی مدد مل سکتی تھی۔ انہوں نے تیز رفتاری سے اس جانب رُخ کیا۔ اسی لمحے ایک وفادار نے جب یہ اطلاع دی کہ باغی سپاہیوں کا بڑا دستہ ان کا تعاقب کر رہا ہے تو سلطان توران شاہ کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے۔



ملکہ شجرۃ الدر کو جب اطلاع ملی کہ سلطان توران شاہ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا ہے تو وہ دم بخود رہ گئی۔ اس نے تفصیل طلب کی۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ حملہ آور سلطان کے اپنے محافظ تھے تو وہ بے یقینی کے عالم میں مبتلا ہوگئی۔ اطلاع لانے والے نے جب اسے سلطان توران شاہ کے بارے میں یہ بتایا کہ وہ اپنے حلیف سپاہیوں کے ساتھ منصورہ سے باہر نکل گیا ہے تو اس کی پریشانی میں مزید اضافہ ہوگیا۔ وہ تاسف سے ہاتھ مل رہی تھی کہ توران شاہ کو کسی صورت بھی منصورہ نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ اس نے فوراً بیبرس کو پیش ہونے کا حکم دیا تاکہ وہ اپنے دستے کے ساتھ سلطان کی مدد کو روانہ ہو۔ اطلاع دہندہ نے جب یہ انکشاف کیا کہ تمام دستہ سلطان کے تعاقب میں روانہ ہو چکا ہے تو ملکہ شجرۃ الدر کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ وہ بے یقینی کے عالم میں بولی۔

''تم شاید یہ کہنا چاہتے ہو کہ سلطان توران شاہ کے خلاف عسکری بغاوت کی گئی ہے؟''

''جی یقیناً...... میں نے خود سالار فارس الدین اقطائی کو گھوڑے پر سوار دستے میں موجود دیکھا ہے''۔

''فارس الدین اقطائی!'' ملکہ شجرۃ الدر اس کا نام سن کر چونک پڑی۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ بحری ممالیک نے اپنے ردعمل کا اظہار کر ڈالا۔ اس منصوبہ بندی میں جاشنگیر ایبک کا بھی ہاتھ ہوگا''۔ وہ بڑبڑائی پھر کچھ سوچتے ہوئے سپاہی سے مخاطب ہوئی۔ ''ٹھیک ہے، تم جاؤ میں دیکھتی ہوں کہ کیا ہو سکتا ہے؟''

ملکہ شجرۃ الدر نے اسے روانہ کیا اور خود قلعے کے اس حصے کی جانب بڑھ گئی جہاں بیبرس مقیم تھا۔ اسے جانے کیوں یقین تھا کہ نجم الدین ایوب کا یہ وفادار غلام اس حرکت میں ملوث نہیں ہو سکتا۔ بیبرس کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے ٹھہر کر بیبرس کو آواز دی مگر اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ محتاط انداز میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ کمرے کی کھلی کھڑکی کے باعث اندر روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ اس کی نظر زمین پر گٹھڑی بنے ہوئے شخص پر جا پڑی۔ اس کے پاس ہی خون کے چھینٹے بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکے۔ وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھی اور اسے سیدھا کیا۔ اس کی توقع کے مطابق وہ بیبرس ہی تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور وہ بے ہوش تھا۔ ملکہ شجرۃ الدر نے اس کی سانس دیکھی اور تیزی سے باہر نکل کر غلاموں کو آواز دی۔ بیبرس کے ہاتھ کھول کر اسے بستر پر لٹایا گیا اور شاہی طبیب کو طلب کیا گیا۔ شاہی طبیب نے آ کر بیبرس کا معائنہ کیا۔ بیبرس کے سر پر چوٹ آئی تھی۔ شاہی طبیب نے اس کے زخم کی مرہم پٹی کی اور اس کام سے فارغ ہو کر ملکہ شجرۃ الدر کو بتایا کہ کسی بھاری شے سے اس کے سر پر ضرب لگائی گئی ہے۔ فی الحال اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ ممکن تھا کہ اگر زیادہ دیر ہو جاتی تو جسم کا کافی خون نکل جاتا۔

ملکہ شجرۃ الدر نے دو کنیزوں کو وہیں رُکنے کا حکم دیا کہ جونہی بیبرس کو ہوش آئے تو اسے خبر کی جائے۔



سلطان توران شاہ تیز رفتاری سے دمیاط پہنچ گیا۔ اس کے وفاداروں نے اسے دمیاط کے قلعے کے ایک برج میں چھپا دیا، وہیں طبیب کو رازداری سے لایا گیا اور اس کے زخم کی مرہم پٹی کی گئی۔ دمیاط شہر کی حالت کچھ

اچھی نہیں تھی۔ صلیبی لشکر اس کی شان وشوکت کو بری طرح روندتا ہوا گذرا تھا۔ فارس الدین اقطائی مملوک دستے کے ساتھ وہاں پہنچ گیا اور سلطان توران شاہ کی تلاش میں جت گیا۔ نصف دن ڈھل چکا تھا مگر سلطان کی جائے پناہ کے بارے میں انہیں کچھ آگاہی نہ ہو سکی۔ احمد چولاک نے فارس الدین اقطائی کو مشورہ دیا کہ سلطان کے بارے میں آخری خبر یہی ملی تھی کہ وہ زخمی ہوگیا ہے، یقیناً اس نے کسی نہ کسی طبیب کی خدمات حاصل کی ہوں گی۔ طبیبوں سے اگر پوچھ گچھ کی جائے تو ہمیں کوئی سراغ مل سکے گا۔ فارس الدین اقطائی کو یہ مشورہ پسند آیا اور مختلف سپاہیوں کو اس کام پر مامور کر دیا گیا۔ سپاہیوں نے وہ طبیب کھوج نکالا جو سلطان توران شاہ کی مرہم پٹی کر کے آیا تھا۔ اس طبیب کو منہ بند رکھنے کی تلقین کی گئی تھی مگر فارس الدین اقطائی نے حالات کا ایسا رُخ اس کے سامنے پیش کیا کہ وہ خود ہی بک پڑا کہ سلطان قلعے کے برج میں موجود ہے۔ یہ اطلاع پاتے ہی فارس الدین اقطائی نے وقت ضائع کئے بغیر پانچ سو مملوک سپاہیوں کو یکجا کر کے قلعے کے اس برج کو گھیر لیا۔ سلطان توران شاہ کے وفاداروں نے جب یہ منظر دیکھا تو انہوں نے توران شاہ سے استدعا کی وہ رسی کی مدد سے برج کے عقبی جانب اتر جائے اور دریا عبور کر کے کسی طرح قاہرہ پہنچنے کی کوشش کرے۔ وہ ان سپاہیوں کو کچھ دیر کے لئے الجھائے رکھنے کی کوشش کریں گے۔ سلطان توران شاہ نے اس تجویز پر عمل کیا اور برج کی عقبی جانب بڑھ گیا۔ اسی لمحے ممالیک دستے نے نفط کی پچکاریاں برج کی جانب پھینکنی شروع کر دیں۔ مملوک سپاہیوں پر عجیب سا غیظ وغضب طاری تھا۔ برج کے اندر پچکاریوں کے مسلسل گرنے سے آگ لگ گئی۔ وفادار سپاہی اس آگ کو کپڑوں کی مدد سے بجھاتے رہے۔ اسی دوران برج دھوئیں کی لپیٹ میں آ گیا۔ دھوئیں کا فائدہ اُٹھا کر سلطان توران شاہ کمند کے ذریعے نیچے اترنے میں کامیاب ہو گیا۔ برج میں موجود سپاہی آگ کی شدت کو برداشت نہ کر پائے اور انہوں نے جھروکوں سے چھلانگیں لگا دیں۔

سلطان توران شاہ حملہ آوروں کی نظروں سے چھپتا ہوا دریا کی جانب بڑھ رہا تھا کہ ایک مملوک سپاہی کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ اس نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو باخبر کیا۔ مملوک یہ سنتے ہی دیوانہ وار اس جانب بھاگے۔ انہیں اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر سلطان توران شاہ دریا کی طرف بھاگ اٹھا۔ نزدیک ترین مملوک سپاہی نے اسے ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر دور ہی سے نیزہ کھینچ مارا جو اُڑتا ہوا سلطان کے جسم کو چیرتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔

خون کا فوارہ توران شاہ کے جسم سے پھوٹ پڑا۔ وہ اس شدید ضرب سے زمین پر اوندھے منہ گر پڑا۔ دریا کا کنارہ دو قدم کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ سلطان توران شاہ نے ایک بار پھر اپنی جان بچانے کی کوشش کی۔ وہ اپنی طاقت کو یکجا کر کے اُٹھا اور خود کو کسی طرح دریا میں پھینک دیا اور ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے تیرنے کی کوشش کرنے لگا۔

مملوک سپاہی دریا کے کنارے آ جمع ہوئے۔ وہ دریا میں زخمی سلطان کو تیرتا دیکھ رہے تھے۔ فارس الدین نے پہنچ کر جب یہ منظر دیکھا تو اس نے طیش کے عالم میں سپاہیوں کو اسے دریا سے باہر نکالنے کا حکم دیا۔ سپاہی یہ حکم پاتے ہی دریا میں کود گئے اور تھوڑی دیر بعد سلطان توران شاہ کو کنارے پر کھینچ لائے۔

توران شاہ کی سانس ابھی چل رہی تھی۔ وہ بے بسی کے عالم میں زمین پر پڑا ان سب کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ فارس الدین اقطائی نے اس کی جانب حقارت سے دیکھتے ہوئے اپنی تلوار بلند کی اور دوسرے لمحے سلطان کا سرتن سے کٹ کر جدا ہو گیا۔ اس کے کٹے سر کو ایک نیزے پر چڑھا کر ساتھ لئے مملوک سپاہی منصورہ کی جانب لوٹ گئے۔



بیبرس کو جب ہوش آیا تو ملکہ شجرۃ الدر کو اطلاع پہنچا دی گئی۔ وہ وقت ضائع کئے بغیر وہاں پہنچی۔ بیبرس اس کی آمد پر اُٹھ بیٹھا۔ وہ شاید کھڑا ہونا چاہتا تھا مگر نقاہت سے اس کا سر چکرا گیا۔

''لیٹے رہو بیبرس!'' ملکہ شجرۃ الدر نے ہدایت کی۔ ''ہمیں یہ بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

''سلطان محترم خطرے میں ہیں......'' بیبرس اچانک کچھ یاد آنے پر تیزی سے بولا۔

''میں جانتی ہوں، سلطان پر قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے اور وہ منصورہ سے نکل گئے ہیں۔ تم صرف یہ بتاؤ کہ سپاہ کے سالار تم ہو، پھر سپاہی کیوں سلطان کے تعاقب میں گئے ہیں؟''

''یہ سب نائب السلطنت کا کیا دھرا ہے۔ وہ صبح سویرے میرے پاس آیا اور مجھے بتانے لگا کہ اس کا ارادہ سلطان کو قتل کرنے کا ہے اور میں اس کا ساتھ دوں۔ اس نے مجھے اعلیٰ عہدے اور بلادِ شرقیہ کی امارت اور ان گنت وظائف کی پیش کش کی۔ میں اس کی باتیں سن کر حیران ہو گیا۔ میں نے حملے کی منصوبہ بندی جاننے کی غرض سے اس کے سامنے حامی بھر لی۔ اس نے مجھے بتایا کہ سلطان توران شاہ کے محافظ اس کی مٹھی میں ہیں، بس اسے میرے سپاہی درکار ہیں تا کہ وہ معاملے میں مداخلت کرنے کے بجائے اس کا ساتھ دیں۔ میں اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی کہ اس فعل سے نقصان ہو سکتا ہے۔ صلیبی لشکر بے شک شکست کھا چکا ہے مگر بھگوڑے سپاہی اس کمزور صورتِ حال کا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اس نے سمجھنے کے بجائے مجھے ہراساں کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس نے مجھے خبردار کیا کہ وہ اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ اُٹھا سکتا ہے اور یہ وقت گذرنے کے بعد مجھے سخت سزا بھی دے سکتا ہے۔ میں اس کی بات سن کر غصے میں آ گیا۔ میں اسے سبق سکھانے کی نیت سے اس کی جانب بڑھا ہی تھا کہ اچانک اس نے تلوار کے دستے سے میرے سر پر ضرب لگائی اور میرے ہوش گم ہو گئے''۔ بیبرس نے جواب دیا۔

''مگر مجھے تو اطلاع ملی ہے کہ تمہارے دستے کی سالاری فارس الدین اقطائی کر رہا تھا''۔ ملکہ شجرۃ الدر اس کی جانب شک زدہ نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

''اس بارے میں میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ میں تو صبح سے یہاں پڑا تھا''۔ بیبرس نے کہا۔

''مجھے شک ہے کہ تم سب بحری مملوک آپس میں ملے ہوئے ہو۔ بہر حال وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔ تم فی الحال آرام کرو۔ یاد رکھو، اگر تم قصوروار نکلے تو تمہیں بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ کڑی سزا دی جائے گی''۔ ملکہ شجرۃ الدر نے متنبہ کیا اور وہاں سے لوٹ گئی۔ وہ بیبرس کی باتوں میں صداقت تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے اپنے مرحوم شوہر نجم الدین ایوب کی وہ بات یاد تھی کہ بیبرس بکنے والا غلام نہیں ہے، وہ تہ دل سے اس کا وفادار غلام ہے۔ جس پر وہ اپنی آنکھیں بند کر کے بھروسہ کر سکتا ہے۔



9 محرم 648ھ کی شام کو سورج غروب ہونے سے پہلے باغی مملوک سلطان توران شاہ کا بریدہ سر نیزے پر لٹکائے منصورہ میں داخل ہوئے۔ وہ بے ہنگم انداز میں نعرے لگاتے ہوئے شہر میں آئے تھے۔ پانچ سو سپاہیوں کے دستے کی اس انداز کی آمد سے پورے شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ لوگ معاملے کی تہہ میں پہنچنے کے بجائے اپنے گھروں میں دبک گئے۔ ملکہ شجرۃ الدر نے شور شرابے پر اپنے کمرے کی بڑی بالکونی میں سے منصورہ کے بازار میں جھانکا۔ اس بالکونی پر امیر شہر قیام کر کے اپنے فرمان سنایا کرتا تھا۔ ملکہ شجرۃ الدر کی نگاہیں جب سلطان توران شاہ کے کٹے ہوئے سر پڑیں تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بے اختیار اس کی زبان سے انا للہ کا کلمہ جاری ہو گیا۔ وہ تاسف بھری نگاہوں سے ان باغی سپاہیوں کی مسرت دیکھ رہی تھی جو اپنی کامیابی پر پھولے

نہ سما رہے تھے۔ شاہی قلعے سے کچھ فاصلے پر امیر لقمان کے محل نما مکان کی بالائی منزل پر کھڑا شاہ فرانس لوئی نہم یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کے پہلو میں فرانسیسی مؤرخ ژی جان ویل بھی موجود تھا۔ شیخ عز الدینؒ بن عبدالسلام دمشقی نے جب یہ منظر دیکھا تو وہ رہ نہ سکے اور سپاہیوں کے ہجوم میں گھس گئے۔ سپاہیوں نے جب انہیں دیکھا تو وہ خاموش ہو گئے اور ہٹ کر انہیں راستہ دینے لگے۔ شیخ عز الدینؒ بڑھ کر فارس الدین اقطائی کے مدمقابل جا کھڑے ہوئے۔ فارس الدین اقطائی انہیں اپنے سامنے پا کر شرمندہ سا ہو گیا۔

''تم نے جو کچھ کیا ہے، کیا یہ صحیح تھا؟'' شیخ عز الدینؒ بلند آواز میں بولے۔

''اللہ بہتر جانتا ہے''۔

''اپنے اس گناہ میں اللہ کو شامل نہ کرو، تمہیں جس شخص نے اس قابل بنایا کہ تم سر اُٹھا کر جی سکو آج اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی تم نے اپنے ہاتھ اس کی اولاد کے خون سے رنگ لئے۔ یہ سب کرتے ہوئے تمہیں ذرا بھی شرم نہ آئی؟''

''میں نے جو کچھ بھی کیا ہے، اس ریاست کے بہتر مفاد کے لئے کیا ہے، سلطان توران شاہ کے فیصلے بچگانہ تھے جو آنے والے وقت میں امت مسلمہ کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتے تھے''۔

''تمہیں کون روک سکتا ہے؟ طاقت آج تمہارے پاس ہے، دلیلیں تم گھڑ سکتے ہو، مگر آخرت میں اپنے اللہ کے سامنے کیا جواب دو گے اسے کیسے مطمئن کر سکو گے؟ وہ تو دلوں کے بھید سے خوب آشنا ہے''۔ شیخ عز الدینؒ نے کہا۔

''دیکھئے حضرت! آپ اس معاملے کو میرے اور اللہ کے درمیان چھوڑ دیں، اور میرے سپاہی کہیں آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا بیٹھیں''۔ فارس الدین اقطائی اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔

شیخ عز الدینؒ اس کی بات سن کر برہم ہونے لگے کہ اسی وقت ملکہ شجرۃ الدر بھی وہاں پہنچ گئی۔ اس نے شیخ عز الدینؒ سے وہاں سے ہٹ جانے کی درخواست کی کیونکہ ایسے مخدوش حالات میں ان کی جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ ان کی لعن طعن پر باغی سپاہ بھڑک سکتی تھیں۔ شیخ عز الدینؒ نے سلطان توران شاہ کے سر کو فوراً نیزے سے اتارنے کا حکم دیا اور اس کے دھڑ کو دمیاط سے منگوانے کا حکم سنایا تا کہ اس کی لاش کی مزید بے حرمتی نہ ہو۔ ملکہ شجرۃ الدر نے آگے بڑھ کر فارس الدین اقطائی کو کینہ توز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے انسانیت پر قائم رہنے کی تلقین کی۔ فارس الدین اقطائی شیخ عز الدینؒ سے خائف تھا۔ اس نے فوراً سلطان کا سر نیزے سے اتار دیا اور چند سپاہیوں کو سلطان توران شاہ کا دھڑ لانے کے لئے دمیاط روانہ کر دیا گیا جو وہ ہیں دریا کے کنارے پر چھوڑ آئے تھے۔ سر بریدہ دھڑ کے پہنچنے پر ہی سلطان توران شاہ کی تدفین کرنا تھی۔

شیخ عز الدینؒ کے جانے کے بعد فارس الدین اقطائی گھوڑے سے اتر کر ملکہ شجرۃ الدر کے مقابل آن کھڑا ہوا۔

''میں جانتا ہوں کہ یہ سب غلط ہے مگر میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر میں آگے نہ آتا تو آج میری جگہ کوئی اور امیر ہو سکتا تھا۔ برجی امراء کو فوقیت دینا ہی سلطان توران شاہ کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ اگر وہ سارا نظام حسب سابق رہنے دیتے تو شاید یہ دن کبھی نہ دیکھنا پڑتا''۔

''مجھے تمہاری صفائی کی ضرورت نہیں ہے''۔ ملکہ شجرۃ الدر نے کرخت لہجے میں کہا۔

''میں جانتا ہوں۔ آپ مجھے جو سزا دینا چاہیں بے شک دیں تا کہ آپ کا غصہ ختم ہو سکے''۔

''میں سزا و جزا پر قادر نہیں ہوں۔ یہ تم لوگوں کا اجتماعی فعل ہے، میں کس کس کو سزائیں دوں؟ اگر میں

تمہیں سزا دے دوں تو میں یہ بات بخوبی جانتی ہوں کہ تمہارے گروہ میں سے دوسرا فرد سامنے آئے گا اور انتقامی جذبے کے تحت مجھے بھی ہلاک کرنے سے باز نہیں رہے گا''۔

''مجھے معلوم ہے کہ تخت کا اب کوئی وارث باقی نہیں رہا۔ جو لوگ خود کو وارث سمجھتے ہیں ان میں کوئی بھی اتنا اہل نہیں کہ وہ اتنی بڑی سلطنت کو قابو میں رکھ سکے۔ میں آپ کو اقتدار سنبھالنے کی دعوت دیتا ہوں۔ میرے خیال میں ایوبی خاندان میں آپ سے بہتر کوئی فرد نہیں ہے''۔

''مجھے اقتدار کی کوئی تمنا نہیں''۔ ملکہ شجرۃ الدر نے ٹکا سا جواب دیا۔

''اسی لئے تو میں آپ کو یہ دعوت دے رہا ہوں۔ اگر آپ کے دل میں ایسی ہوس موجود ہوتی تو شاید میں یہ قدم کبھی نہیں اُٹھاتا''۔

''کیا تمہیں اس بات کا خدشہ نہیں ہے کہ اگر میں تخت حکومت پر آ گئی تو تم زندہ نہیں رہ سکو گے؟''

ملکہ شجرۃ الدر کی بات سن کر فارس الدین اقطائی ہنس پڑا۔ ''مجھے اپنی موت کے عوض اس ریاست کو بچانا منظور ہوگا''۔

ملکہ شجرۃ الدر اس کی بات سن کر خاموش ہو گئی اور کوئی جواب دیئے بغیر واپس لوٹ گئی۔ فارس الدین اقطائی نے تمام دستوں کو اپنی اپنی رہائش گاہوں پر جانے کا حکم دیا۔ منصورہ کے کئی امیر اپنے تجسس کو دور کرنے کے لئے شاہی دربار میں پہنچنے لگے۔ امیر فارس الدین اقطائی کی جانب سے شہر کی انتظامیہ کو خصوصی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ امن عامہ کو برقرار رکھیں۔



مطیع الدین کافی حد تک تندرست ہو چکا تھا۔ ران کا زخم ابھی پوری طرح مندمل نہیں ہو پایا تھا البتہ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو چکا تھا۔ طبیب نے اگرچہ اسے ابھی زیادہ چلنے پھرنے سے منع کیا تھا مگر وہ ایک ہی چھت تلے پڑا اکتاہٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ ایک دن وہ طبیب کی ہدایت کو پس پشت ڈال کر خیمے سے باہر نکل آیا۔ اسے چلنے میں تھوڑی بہت دشواری ہو رہی تھی۔ باہر نکل کر جب اس کی نگاہ نیلے آسمان پر پڑی تو اسے یوں لگا کہ جیسے وہ قید تنہائی کاٹ کر نکلا ہو۔ خیمے کے باہر موجود محافظ نے اسے دیکھ کر کچھ کہنا چاہا مگر مطیع الدین نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ ضرگامی لوگ اس کی جانب حیرت سے دیکھتے رہے پھر اپنے اپنے کاموں میں مگن ہو گئے۔ اس کی نگاہیں برقائی خان کو تلاش کرنے لگیں۔ برقائی خان نے اپنے خیمے بستی سے باہر لگوا رکھے تھے۔ وہیں اس کے باقی ماندہ سپاہیوں کے خیمے بھی موجود تھے۔ وہ شاید بستی میں رہ کر وہاں کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مطیع الدین لنگڑاتے ہوئے آگے بڑھا تو ایک بوڑھا شخص اس کی جانب بڑھ آیا۔ مطیع الدین اس کی صورت دیکھ کر چونک سا گیا۔ اسے یوں لگا کہ جیسے اس نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ وہ کریاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ بوڑھا شخص اسے تذبذب کا شکار دیکھ کر خود ہی بولا۔

''شاید مجھے پہچان نہیں پا رہے ہو''۔

''میں کوشش کر رہا ہوں''۔ مطیع الدین بولا۔

''ارے میں تم سے وہیں ملا تھا پہاڑی پر۔ تم قاڑی باشندوں سے نبرد آزما تھے۔ میں نے اور میرے بیٹے نے مل کر تمہاری جان بچائی تھی''۔ وہ تیزی سے بولا۔

''اوہ ہاں یاد آیا...... میں تمہارا بڑا مشکور ہوں۔ تمہاری مداخلت کے باعث ہی قاڑی سردار اپنی خواہش کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا پایا''۔

''اس میں شکریے والی کون سی بات ہے، وہ تو میرے بیٹے نے بے وقوفی کی تھی کہ تمہیں وہیں بے ہوشی کے عالم چھوڑ آیا تھا ورنہ تمہاری یہ حالت نہ ہوتی''۔ بوڑھا ہنستا ہوا بولا۔

''وہ موٹا سا...... تمہارا بیٹا ہے؟'' مطیع الدین اس کی صحت کو دیکھ کر حیرت سے بولا۔

''بالکل! موٹا تو کھانے پینے سے ہوا ہے۔ ویسے ہے بڑا نرم دل''۔

وہ باتیں کر رہے تھے کہ نوکناجو خان اِدھر آ نکلا۔ اس کی نظر جب مطیع الدین پر پڑی تو وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھ آیا۔ اسے شاید یہ خدشہ لاحق تھا کہ اسے بات کرنے کا موقعہ نہ مل سکے اور وہ پھر سے بے ہوش ہو جائے۔ نوکناجو خان کو آتا دیکھ کر بوڑھا ہنس کر بولا۔ ''تم نے اس کا ذکر کیا، لو وہ آن حاضر ہوا''۔ مطیع الدین نوکناجو خان کی صورت دیکھنے لگا۔ نوکناجو خان نے قریب آتے ہی اس سے زوردار مصافحہ کیا۔

''شکر ہے کہ اس مرتبہ میرے قریب آنے پر تم ہوش میں ہی ہو۔ ورنہ جب بھی تمہیں دیکھا بے ہوشی کے عالم میں ہی دیکھا ہے''۔

''تم نے مجھے کب دیکھ لیا؟'' مطیع الدین حیرت سے بولا۔

''پہلی بار اس وقت جب تم بڑے ریچھ کی ٹکر کھا کر کھائی میں جا گرے تھے تو میں نے ہی تمہیں وہاں سے اُٹھا کر پہاڑی پر پہنچایا تھا، دوسری مرتبہ اس وقت جب میں قاڑیوں کو بھگا کر تمہارے پاس آیا تو تم بے ہوش تھے''۔

''اچھا تو وہ تم ہی تھے جس نے میرا گھوڑا چرایا تھا''۔ مطیع الدین آنکھیں نکال کر بولا۔

''ارے بھئی ناراض مت ہو، میں نے چرایا نہیں تھا بلکہ کچھ دیر کے لئے اپنے تصرف میں لیا تھا۔ وہ تمہاری امانت یہیں موجود ہے۔ اگر مجھے معلوم پڑ جاتا کہ وہاں قاڑی موجود ہیں تو میں ریچھ کے بجائے تمہیں گھوڑے پر لاد کر بستی لے آتا۔ بہرحال اب تو وقت گذر گیا ہے''۔

''وہ طبیب تو بتا رہا تھا کہ ابھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے اور تم باہر نکل آئے''۔ بوڑھا شخص چونک کر بولا۔

''بابا! تم بھی بے تکی بات کرتے ہو، اتنے دن سے بے چارا خیمے میں پڑا ہے۔ خیمہ تو اسے کاٹنے کو دوڑتا ہوگا۔ اچھا کیا کہ باہر نکل آیا۔ چہل قدمی سے فائدہ ہی ہوتا ہے کوئی نقصان تو نہیں''۔ نوکناجو خان بگڑ کر بولا۔ بوڑھا شخص اسے گھورنے لگا۔

''ارے بھئی آپس میں مت الجھو۔ میں واپس چلا جاتا ہوں''۔ مطیع الدین نے فوراً بات گھمائی۔

''ارے نہیں...... نہیں! ایسی کوئی بات نہیں، جب تک میں بابا کو ایسی باتیں نہ سناؤں، انہیں بھی چین نہیں آتا''۔ نوکناجو خان بول پڑا۔

''آؤ...... میں تمہیں چہل قدمی میں مدد دوں۔ میرا نام نوکناجو خان ہے''۔

مطیع الدین نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ اس کا ہاتھ تھامے بستی سے باہر کی جانب چل پڑا۔

''ایک بات پوچھوں! برا تو نہیں مانو گے؟''

''کیا......؟''

''یہ قاآن زادہ تمہارا کیا لگتا ہے؟''

''کون قاآن زادہ؟'' مطیع الدین نے حیرت سے پوچھا۔

''ارے وہی سالار۔ جس نے تمہاری جینانی محافظوں سے جان بچائی تھی''۔

''تمہارا اشارہ شاید برقائی خان کی جانب ہے مگر یہ جینائی محافظوں کا کیا قصہ ہے؟''

''میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔ تمہیں بھلا اس بارے میں کیا پتہ ہوگا۔ تم تو اس وقت روایتی عادت کا شکار تھے۔ تمہاری بے ہوشی کے عالم میں جنیائی سرحدی سپاہی تمہیں پہاڑی سے لانے میں رکاوٹ پیدا کر رہے تھے جس پر سالار نے انہیں باز رکھا اور مجھے ان کے امیر سے لڑنے کا موقعہ دیا۔ میں نے تو ایک ہی داؤ میں اسے چت کر دیا تھا''۔

مطیع الدین اس کی باتیں سن رہا تھا مگر اس کا ذہن قاآن زادے کے الفاظ پر اٹکا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ لقب صرف شاہی خاندان کے اس فرد کے لئے مخصوص تھا جو بادشاہ کا خون کا رشتہ دار ہوتا تھا۔

''تم نے برقائی خان کو قاآن زادہ کیوں کہا؟ اس کا تعلق تو شاہی خاندان سے نہیں ہے''۔ مطیع الدین اُلجھے ہوئے انداز میں بولا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تم نہیں جانتے کہ وہ اردوئے زریں کے عظیم قاآن اعظم باتو خان کا چھوٹا بھائی ہے''۔ فوئناجو خان اس کی جانب یوں دیکھنے لگا جیسے اس نے کوئی انوکھا سوال کر دیا ہو۔

مطیع الدین اس کی بات سن کر لمحہ بھر کو دنگ رہ گیا۔ اس نے کبھی برقائی خان سے اس ضمن میں کوئی سوال نہیں کیا تھا بلکہ وہ تو اسے عام سا منگول سمجھتا رہا تھا۔ برقائی خان میں عام منگولوں والی بھی کوئی بات نہیں دکھائی دیتی تھی پھر اس کا تعلق چنگیز خان کے خاندان سے ہونا اس کے لئے واقعی اچنبھے کی بات تھی۔ چنگیز خانی گرم خون اتنا سرد پڑ سکتا ہے یہ حیرت انگیز امر تھا۔ وہ دونوں چلتے چلتے بستی سے باہر نکل آئے تھے۔

''کیا تمہیں مکمل یقین ہے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ سچ ہے؟'' مطیع الدین نے دوبارہ پوچھا۔

''تم مجھے حیران کئے دے رہے ہو، وہ شخص تمہارے لئے اتنا بے چین ہو رہا تھا، تمہیں بھائی اور دوست کہہ رہا تھا اور ایک تم ہو کہ اسے صحیح طرح جانتے تک نہیں''۔ فوئناجو خان اُلجھن کا شکار دکھائی دینے لگا۔

''تم ایسا کرو کہ مجھے اس کے پاس لے چلو''۔

''وہ سامنے جو زرد خیمے دکھائی دے رہے ہیں اسی کے ہیں''۔ فوئناجو خان نے اشارہ کیا۔

وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ان خیموں تک پہنچ گئے۔ محافظوں نے برقائی خان کو ان کی آمد کی خبر کر دی تھی۔ اسی لئے برقائی خان خود باہر نکل آیا۔ مطیع الدین کو اپنے قدموں پر آتے دیکھ کر اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ وہ قریباً بھاگتا ہوا ان کے پاس پہنچا۔

''مطیع الدین! صحتمندی مبارک ہو، تمہیں اپنے قدموں پر چلتا ہوا دیکھ کر میں پھولے نہیں سما رہا''۔ برقائی خان مسرت آمیز لہجے میں بولا۔

''یہ منگول جو کہہ رہا ہے اس میں کہاں تک صداقت ہے؟'' مطیع الدین نے اُلٹا سوال کیا۔

''فوئناجو خان، کیا کہا ہے تم نے اسے......؟'' برقائی اس کی جانب گھور کر دیکھتے ہوئے بولا۔

فوئناجو خان اس کے لہجے سے گڑبڑا گیا، وہ جلدی سے اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔ ''جاودانی آسمان کی قسم! میں نے تو صرف آپ کے بارے میں اسے بتایا تھا، اور تو کچھ نہیں کہا''۔

''یہی کہ تم ایک قاآن زادے ہو اور یہ بات تم نے مجھ سے آج تک چھپائے رکھی''۔ مطیع الدین نے لقمہ دیا۔

''اس میں چھپانے والی بھلا کیا بات ہے؟ تم نے کبھی میرے بارے میں پوچھا ہی نہیں''۔ برقائی خان نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''تم نے مجھے اندھیرے میں رکھا اور کہتے ہو کہ میں نے نہیں پوچھا''۔ مطیع الدین نے شکوہ کیا۔

''اچھا بھئی یونہی سہی! اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں کیا ہوں۔ ہماری دوستی پہلے جیسی ہی رہے گی۔ تم شاید جانتے نہیں کہ میں تمہیں بھائیوں کی طرح عزیز رکھتا ہوں''۔

مطیع الدین اس کی بات سن کر شرمندہ دکھائی دینے لگا۔ اسے یوں لگا کہ جیسے اس سے کوئی بڑی غلطی سرزد ہوگئی ہو۔

''یہ عجیب سے منہ نہ بناؤ۔ گل وتوژ نے ایسا منہ دیکھ لیا تو وہ تم سے شادی کرنے سے انکار کر دے گی''۔ برقائی خان نے قہقہہ لگایا۔ مطیع الدین بھی کھسیانا ہو کر ہنسنے لگا۔ فوئناجو خان ان کی باتیں سن رہا تھا، انہیں ہنستا ہوا دیکھ کر خود بھی ان کے ساتھ شریک ہوگیا۔ اس کی آواز ان دونوں سے زیادہ بلند تھی۔ برقائی خان اس کی اس بے ساختہ حرکت پر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ مطیع الدین کو بھی صورت حال کا احساس ہو چکا تھا۔ وہ بھی برقائی خان کی تقلید کر رہا تھا۔ چند لمحے پہلے کی شکایتیں یوں غائب ہوگئی تھیں جیسے انہیں کبھی لب پہ لایا ہی نہ گیا ہو۔ فوئناجو خان انہیں بری طرح لوٹ پوٹ ہوتے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔

''بھئی تم لوگ کس بات پر اتنا خوش ہو رہے ہو؟'' اس نے معصومیت سے سوال کیا۔ اس کا سوال سن کر برقائی کے قہقہے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ فوئناجو خان ہونقوں کی طرح ان کی صورت دیکھے جا رہا تھا۔



1 محرم 648ھ کو باغی امرأ اور منصورہ کے امرأ نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ملکہ شجرۃ الدر کو ہی تاج پہنا دیا جائے۔ رئیس العساکر جاشنکیر ایبک تک منصوبے کی مکمل اطلاع پہنچ چکی تھی۔ وہ خبر پاتے ہی قاہرہ سے منصورہ کی جانب روانہ ہوا۔ سلطان توران شاہ کے قتل کے اگلے دن تک وہ منصورہ پہنچ گیا تھا۔ اس کے ساتھ کئی مملوک قائدین اور معزول امرأ بھی آئے تھے۔ جب انہیں یہ خبر ملی کہ سلطان توران شاہ کو انجام تک پہنچا دیا گیا ہے تو ان کے پژمردہ چہرے پھر سے کھل اُٹھے۔ انہوں نے فارس الدین اقطائی سے طویل ملاقات کی۔ سلطنت کے استحکام کے سلسلے میں فارس الدین نے ان سب کے سامنے ملکہ شجرۃ الدر کو اقتدار سونپنے کی تجویز رکھی۔ امرأ کی جماعت نے اپنے عہدوں کے یقینی تحفظ کو شرط بنا کر اس تجویز کی حمایت کر دی۔ تمام معاملات کے طے ہونے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس سلسلے میں کوئی دیر نہ کی جائے بلکہ آج ہی اس معاملے کو نبٹا دیا جائے۔ رئیس العساکر نے خود ملکہ کے پاس جا کر ساری صورت حال گوش گذار کر دی کہ امرأ کے حلقے کی خواہش ہے کہ سلطان نجم الدین ایوب کے تعینات کردہ عہدوں پر انہیں بحال رکھا جائے۔ ملکہ شجرۃ الدر حالات کی نزاکت سے اچھی طرح آگاہ تھی۔ ایسے حالات میں مملوکوں سے دشمنی مول لینا اس کے حق میں بہتر نہیں تھا۔ اس نے حامی بھر لی۔ شام کے وقت تاج پوشی کی سادہ سی رسم کا اہتمام کیا گیا۔ حلقہ امرأ نے ملکہ شجرۃ الدر کو المستعصمہ الصالحۃ الملکۃ المسلمین عصمت الدنیاء الدین ام الملک المنصور خلیل کا خطاب دیتے ہوئے بلادِ مصر و شام کے تخت پر بٹھا دیا۔ ملکہ شجرۃ الدر پہلے خلیفہ مستعصم باللہ کے حرم میں محض ایک باندی تھی۔ وہاں سے سلطان نجم الدین ایوب کے پروانہ سلطانی کے ساتھ تحفتاً بلادِ مصر پہنچی۔ اپنی ذہانت وفراست سے اس نے سلطان نجم الدین ایوب کا دل جیت لیا اور اس کی ملکہ بننے کا اعزاز حاصل کیا۔ سلطان نجم الدین ایوب کا ایک بیٹا اس کے بطن سے بھی ہوا تھا۔ اس کا نام خلیل الدین رکھا گیا۔ قدرت کو یہ منظور نہیں تھا کہ وہ جوانی کی منزلیں طے کرتا، چھ سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اسی بیٹے کی نسبت سے اس کی کنیت ام الخلیل تھی۔ ملکہ شجرۃ الدر کو عنان اقتدار سونپنے کا اصل سبب یہی تھا کہ مما لیک وقت کی نزاکت سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ صلیبی جنگ کے اثرات ابھی

تازہ ہیں، شاہ فرانس لوئی نہم ان کے پاس قید تو ضرور ہے مگر اس کی آزادی کے لئے صلیبی جان توڑ بازی لگانے سے باز نہیں رہ پائیں گے۔ فوری طور پر تو انہیں شکست دے کر ان کی کمر توڑ دی گئی تھی۔ اگر اس معاملے کو طول دیا گیا تو حالات نئی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ دوسرا ایوبی امراً کی جانب سے بھی انہیں خطرہ لاحق تھا کہ وہ حکومت کے لالچ میں بغاوت سے باز نہیں آئیں گے۔ علاوہ ازیں سب سے اہم معاملہ معزول امراً کی بحالی کا تھا۔ ان کے بحال ہونے پر ہی وہ انتظامِ حکومت میں حصہ لے سکتے تھے۔ ملکہ شجرۃ الدر نے سب سے پہلے ان معزول امراً کو ان کے سابقہ عہدوں پر فائز کیا اور دوسرے نمبر پر تمام ایوبی عاملین کو اطاعت کی ہدایت کی۔ بغاوت کرنے پر ان سے سختی سے باز پرس کئے جانے کا فرمان جاری کیا گیا۔ 17 صفر 648ھ کو ملکہ شجرۃ الدر کے سامنے شاہ لوئی نہم کا معاملہ پیش کیا گیا۔ مملیک کا خیال تھا کہ پچاس ہزار کے لگ بھگ جنگی قیدیوں کا بار اُٹھانا ریاست کے لئے خاصا مہنگا سودا ثابت ہوگا۔ ملکہ نے اس معاملے پر بات چیت کے لئے بہاء الدین زہیر کو شاہ لوئی نہم کے پاس بھیجا اور یہ پیغام بھجوایا کہ اگر صلیبی جنگجو پُر امن رہنے کا وعدہ کریں اور بلادِ مصر سے فوراً نکل جانے کا عہد کرنے کے ساتھ ساتھ تاوانِ جنگ اور فدیہ کے طور پر ایک خطیر رقم دربارِ مصر کی خدمت میں پیش کریں تو انہیں شاہ لوئی نہم سمیت بلادِ مصر سے باعزت جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔ شرائط نہ ماننے کی صورت میں جنگی قیدیوں کو شاہ سمیت زندگی کی قید سے آزاد کر دیا جائے گا۔

شاہ لوئی تو کافی دنوں سے اس پیش کش کا منتظر تھا۔ اس نے پہلی ہی نشست میں بہاء الدین زہیر کو یہ یقین دہانی کرائی کہ اسے ملکہ شجرۃ الدر کی تمام شرائط بلا تامل منظور ہیں چنانچہ ڈیڑھ ماہ کی قید کے بعد اسے آزادی کا سورج دیکھنا نصیب ہوا۔ وہ اپنے شکست خوردہ سپاہیوں اور عمائدین کو ساتھ لے کر بلادِ مصر پر حسرت بھری نگاہ ڈالتا ہوا سمندر کے راستے عکہ کی جانب روانہ ہوگیا جہاں سابق شاہ یروشلم فریڈرک ثانی بے تابی سے اس کا منتظر تھا۔ شاہ لوئی جس عظیم مقصد کو لے کر بلادِ مصر اُترا تھا وہ مسلمانوں کے جذبۂ ایمانی کے سامنے ذلت کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ فرانس سے جو بلند و بانگ دعوے کر کے نکلا تھا، وہ باطل ثابت ہو چکے تھے۔ وہ ہزیمت اُٹھانے کے بعد فرانس واپس لوٹنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ملکہ شجرۃ الدر کے سر پر مملیک نے جس امتحان کی تلوار لٹکائی تھی اس میں وہ بخوبی سرخرو ہو چکی تھی۔ مملیک امراً اپنے فیصلے پر مطمئن دکھائی دے رہے تھے۔

بحری مملیک نے امیر برکیارک کا معاملہ ملکہ کے سامنے پیش کرنے کے بجائے خود ہی اسے سزا دی اور اس کی آنکھیں نکلوا کر حصن کیفا واپس بھجوا دیا اور دیگر سرکردہ برجی مملوک امراً کو تنبیہ کی کہ اگر انہوں نے کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش کی تو ان کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جائے گا۔



گل وقوژا اپنے ماموں زاد شنگ کے ساتھ نہ چاہتے ہوئے بھی قبیلہ سرخ پہنچ گئی۔ اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ منک آنہ نے اپنی نواسی کو دیکھ کر بھرپور مسرت کا اظہار کیا۔ منک آنہ کو باتو خان نے معزول کر کے نظر بند کر دیا تھا مگر قونائی خان کے قتل کے کچھ دن بعد اس کی نظر بندی کو ختم کر دیا گیا۔ گل وقوژ نے اپنی صفائی پیش کرنا چاہی مگر منک آنہ نے اس موضوع کو ٹال دیا۔ چند دن گل وقوژ گھر میں رہی، اسے دوسری خواتین کے ساتھ گھریلو کام کاج پر مامور کر دیا گیا تھا۔ گل وقوژ نے اس امر پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا مگر کسی کو بھی اس کی پسند و ناپسند کی کوئی پرواہ نہیں تھی شنگ بھی اس دن کے بعد اسے دوبارہ دکھائی نہیں دیا البتہ منک آنہ کی کچھ سرگرمیاں اسے پُراسرار سی لگیں، وہ باتوں کے دوران کن انکھیوں سے اس کی جانب دیکھتا تو جانے کیوں گل وقوژ کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ وہ یہ بات بری طرح سے محسوس کر رہی تھی کہ مختلف اوقات میں اسے ہی

موضوعِ گفتگو بنایا جاتا ہے۔ کبھی کبھی اس کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا کہ کہیں وہ اسے ہی اپنے باپ کا قاتل تو نہیں سمجھتے لیکن جب اسے شنگ کی باتیں یاد آتیں وہ اپنے اس خیال کو ذہن سے جھٹکنے پر مجبور ہو جاتی۔

ایک دن منک آنہ نے اسے اپنے مخصوص خیمے میں طلب کیا۔ اس کے بدن پر ایسا لرزہ طاری ہوا کہ وہ بمشکل وہاں پہنچ پائی۔ اس کے دل و دماغ سے یہی صدا اُٹھ رہی تھی کہ آج کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ وہ ہمت کر کے خیمے میں جا پہنچی۔ منک آنہ نے اس کی صورت دیکھی تو شفقت بھرے لہجے میں اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ آگے بڑھ کر ایک جانب سمٹ کر بیٹھ گئی۔ منک آنہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

''دیکھو گل!'' وہ اس کی جانب جھکتا ہوا بولا ''میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تمہارے باپ کا قاتل کون ہے مگر اسے سزا دی جائے یا اس کا جرم نظر انداز کر دیا جائے، اس بارے میں تمہیں ہی کوئی فیصلہ کرنا ہوگا''۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی''۔

''میرا خیال ہے کہ مجھے تم سے کھلے لفظوں میں بات کرنی چاہئے''۔

''آپ جیسا مناسب سمجھیں''۔

''بات یہ ہے کہ تم اپنے باپ کے قتل کی ذمہ دار ہو''۔ منک آنہ گھمبیر لہجے میں بولا۔ گل وقوژ اس کی بات سن کر لمحہ بھر کے لئے بھونچکا رہ گئی۔

''تو کیا آپ بھی مجھے اپنے باپ کا قاتل سمجھتے ہیں؟'' اس نے دبے انداز میں احتجاج کیا۔

''میں نے یہ تو نہیں کہا کہ تم نے اپنے باپ کو موت کے گھاٹ اتارا ہے، بلکہ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری غلط روش کی وجہ سے وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے''۔

''آپ میرے کردار پر انگلی اُٹھا رہے ہیں'' گل وقوژ کا لہجہ قدرے تخت ہوگیا۔

''تمہارا کردار!'' منک آنہ تمسخرانہ انداز میں ہنسا۔ ''اس سے میں خوب واقف ہوں، کیا یہ کسی منگول لڑکی کو زیب دیتا ہے کہ وہ ایک مسلمان سے عشق لڑائے اور اس کے لئے ویرانوں میں دھکے کھاتی پھرے؟''

''کک..... کیا مطلب؟'' گل وقوژ گھبرا گئی

''وہ کیا نام بتایا تھا تمہارے باپ نے؟'' منک آنہ پیشانی کو انگلی سے ٹھونکنے لگا۔ ''ہاں یاد آیا، مطیع الدین۔ تم اس کی تلاش میں ازقائی قبیلے سے مدد حاصل کرنے نہیں گئی تھیں؟ مجھے اگر پہلے معلوم ہو جاتا کہ وہ تمہیں اپنے فریب میں الجھائے ہوئے ہے تو قسم جاودانی آسمان کی۔ میں اسے پہلے ہی دن ہلاک کر دیتا۔ تمہاری اس نادانی سے سرخوں کا وقار سرنگوں ہو کر رہ گیا، اور تو اور بھرے دربار میں اس کی بے عزتی ہوئی۔ قاآن اعظم نے صرف بے عزتی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اسے ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سلا دیا۔ مجھے نظر بندی کی صعوبت اُٹھانا پڑی۔ یہ سب کیوں ہو رہا تھا؟ صرف اس لئے کہ تم اس مسلمان کے چکر میں اپنوں سے غداری کر رہی تھیں''۔ منک آنہ کا لہجہ بے حد خونخوار ہو رہا تھا۔ گل وقوژ اس کی باتیں سن کر حیران ہونے کے ساتھ ساتھ خوفزدہ بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ منک آنہ کی باتیں سن کر اسے احساس ہونے لگا کہ ابھی تک اس نے اسے قیدی بنا کر رکھا ہوا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے''۔ گل وقوژ آہستگی سے بولی۔

''لڑکی! مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو، میں نے یہ عمر انہی پہاڑوں پر گذاری ہے، میرے سامنے تو پتھر بھی جھوٹ بولنے سے کتراتے ہیں''۔ منک آنہ سفاک لہجے میں بولا۔

''اگر میں یہ کہوں کہ یہ سچ ہے تو.....!'' گل وقوژ نے گردن جھکا کر دھیمے لہجے میں کہا۔ دوسرے لمحے

ایک زناٹے دار تھپڑ نے اس کا چہرہ دوسری جانب گھما دیا۔ منک آنہ آپے سے باہر ہو گیا تھا

''دوبارہ ایسی بات منہ سے نکالنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں تمہاری اس حرکت کو پہلی اور آخری نادانی جان کر معاف کر رہا ہوں اور کان کھول کر سن کرلو کہ تمہاری ماں نے مجھے تمہارے معاملات میں کلی اختیار دے رکھا ہے۔ میں نے تمہاری شادی کی بات طے کر دی ہے۔ چند دن بعد تمہاری شادی شنگ سے کی جا رہی ہے۔ اگر تم نے کوئی الٹی سیدھی حرکت کی تو جان لو کہ تمہیں بھی تمہارے باپ کے پاس پہنچا دیا جائے گا''۔ منک آنہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ گل وتوژ پھٹی نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اسے منک آنہ کی آنکھوں سے بے حد خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ یکدم ایک ایسے موڑ پر آن کھڑی ہوئی تھی جہاں اس کی سے کا اختیار چھین لیا گیا تھا۔ وہ مطیع الدین کو فراموش نہیں کر سکتی تھی اور شنگ کو شوہر کے طور پر قبول نہیں کر سکتی تھی۔

''سردار منک آنہ!'' وہ سب رشتوں کو بھلا کر جارحانہ انداز میں غرائی۔ ''میں تمہاری اس دھونس کو چلنے نہیں دوں گی۔ تم کیا سمجھتے کہ میں اتنی بے بس ہو چکی ہوں کہ تم جیسے بھی کٹھ پتلی کی طرح گھماؤ گے میں گھومتی چلی جاؤں گی، میں اپنے فیصلے خود کرنا جانتی ہوں۔ تم بھی کان کھول سن لو کہ مجھے تمہارا یہ فیصلہ کسی قیمت پر منظور نہیں''۔

منک آنہ اس کے لب و لہجے پر دم بخود رہ گیا۔ اسے ایسی توقع ہرگز نہیں تھی۔ پھر اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ وہ اپنے اندر بھڑکتے ہوئے غصے کو دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آج تک کسی نے اس کے سامنے اس انداز میں زبان درازی نہیں کی تھی۔

''لڑکی!'' وہ غصہ ضبط کرتا ہوا بولا۔ ''جو میں نے کہہ دیا ہے وہی کچھ ہوگا۔ میں نے عورتوں پر کبھی زبردستی نہیں کی۔ مجھے ضد دلانے کی کوشش نہ کرو۔ اگر تمہیں یہ شادی منظور نہیں تو میں یہ شادی مسترد کر دیتا ہوں مگر اس کے عوض تمہیں خود کو جادوائی آسمان کے حضور بھینٹ چڑھانا ہوگا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ دونوں راہوں میں تم کون سی چننا پسند کرو گی، یہ میں تم پر چھوڑتا ہوں''۔

''واہ! دونوں بار اپنے ہی فائدے کی بات''۔ گل وتوژ نے طنز کی۔ ''تم بھی کان کھول کر سن لو۔ اگر تم ضد کے دھنی ہو تو میں بھی تمہارا ہی خون ہوں۔ تم دیکھ لینا، نہ تو میں اپنی قربانی پیش کروں گی اور نہ ہی شنگ سے شادی کروں گی''۔

''تم خون کا طعنہ دیتی ہو نادان لڑکی! ٹھیک ہے میں تمہیں ایک موقعہ دوں گا کہ تم جو کر سکو وہ کر کے دکھاؤ۔ اگر تم اپنے ارادے میں کامیاب ہو گئیں تو میں ساری زندگی اس خیمے سے باہر نکل کر کھلا آسمان نہیں دیکھوں گا اور اگر تم ناکام ہو گئیں تو تمہیں خود شنگ سے شادی کرنا ہو گی''۔

منک آنہ کا لہجہ اٹل تھا۔ گل وتوژ کے چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ جو چاہتی تھی اس نے پا لیا تھا۔ وہ جان بوجھ کر اسے طیش دلا رہی تھی کہ وہ کسی طرح فرار ہونے کا ایک موقعہ تو اسے فراہم کرے۔ یہ فرار ہی اس کی تقدیر بنا سکتا تھا اور لاپتہ مطیع الدین سے ملاقات کا ذریعہ بن سکتا تھا۔



برقائی خان کو مطیع الدین کی مکمل صحت یابی کا بڑی بے چینی سے انتظار تھا، اسی وجہ سے وہ ابھی تک ضرگامی قبیلے میں رُکا ہوا تھا۔ بالآخر وہ دن آ ہی پہنچا جب ضرگامی طبیب نے اسے مطیع الدین کی مکمل صحت یابی کا مژدہ سنایا۔ اس نے اس خوشی میں سپاہیوں کو کوچ کی تیاری کا حکم دیا اور طبیب سے مطیع الدین کے بارے میں استفسار کیا کہ وہ اب کہاں ہے؟ طبیب نے اطلاع دی کہ وہ طبی تشخیص کے بعد موٹے فونتا جو خان کے ساتھ چلا گیا تھا۔ برقائی خان نے طبیب کو رخصت کیا اور کچھ دیر تک اپنے خیمے میں موجود رہ کر ضروری نوعیت کے امور کو انجام دیتا

رہا۔ فراغت ہونے پر وہ ضرگامی قبیلے کے خیموں کی جانب بڑھ گیا۔ برقائی خان نے اپنے خیمے قبیلے کی بستی کے باہر کچھ ہی فاصلے پر لگوا رکھے تھے۔ ایسا کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بستی کے عام لوگوں اور شاہی خاندان کے مرتبے کو خلط ملط نہیں کرنا چاہتا تھا۔ علاوہ ازیں اپنے سپاہیوں کا بار اس مفلس قبیلے پر ڈالنا بھی اُس کی شان کے خلاف تھا۔ وہ جب بستی میں پہنچا تو قبیلے کے لوگوں نے جگہ جگہ اسے تعظیم دی، وہ انہیں ایسا کرنے سے منع تو نہیں کر سکتا تھا اس لئے محض سر کے اشارے سے جواب دینے پر اکتفا کرتا رہا۔ ضرگامی سردار کو برقائی خان کی آمد کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ تیزی سے اپنے خیمے سے نکل کر اس کی جانب بڑھا۔ دونوں جب آمنے سامنے پہنچے تو سردار نے بھی تعظیم دی۔

''قاآن زادے! مناسب ہوتا کہ آپ مجھے طلب کر لیتے''۔

''اس کی ضرورت نہیں تھی! مجھے طبیب نے کچھ دیر پہلے میرے دوست کی صحت یابی سے آگاہ کیا تو میں نے واپسی کا ارادہ کر لیا۔ بس اپنے کوچ کے بارے میں تمہیں بتانا چاہتا تھا۔ دوسرا اپنے دوست کو بھی سفر کی تیاری کا پیغام دینا مقصود تھا''۔

''قاآن زادے! مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ آپ نے مجھے مہمانی کا شرف نہیں بخشا''۔ سردار کے لہجے میں شکوہ تھا۔

''ممکن ہے تمہیں برا لگے مگر میں اپنا بار کسی پر ڈالنا پسند نہیں کرتا۔ ابھی میرے دونوں بازو سلامت ہیں''۔ برقائی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''قاآن زادے! جو وقت گذرنا تھا بہرحال وہ گذر گیا ہے۔ بے شک آپ کو ناگوار محسوس ہو مگر میں آپ کو اب ایک چھوٹی سی تکلیف ضرور دوں گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ اسے رد نہیں کریں گے''۔

''کیا کہنا چاہتے ہو میں کچھ سمجھا نہیں......؟'' برقائی خان حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

''میرے لوگوں نے اپنے ہاتھوں سے ان تھوڑے سے ایام میں آپ کے لئے کچھ اشیاء تیار کی ہیں، ان کی خواہش ہے کہ آپ انہیں تحفتاً قبول کر لیں''۔ سردار نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

برقائی خان اس کی بات پر مسکرانے لگا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم لوگ مجھ سے زیادہ ضرورتمند ہو۔ جو کچھ تم مجھے دینا چاہتے ہو، اگر وہ تم تجارت میں استعمال کرو گے تو تمہیں کچھ رقم حاصل ہو جائے گی۔ میرے پاس تو سب کچھ موجود ہے''۔

''آپ ہمیں یوں ذلیل تو نہ کریں''۔ سردار کے چہرے پر پژمردگی سی دکھائی دینے لگی۔

''ارے! میرا مقصد تمہیں تکلیف پہنچانا نہیں تھا، میں تو تم لوگوں کی بھلائی چاہتا ہوں۔ اگر تمہارا دل میری بات سے دُکھا ہے تو میں سب کچھ لینے پر تیار ہوں''۔ برقائی خان تیزی سے بولا۔

سرداز کے چہرے پر بشاشت پھیل گئی۔

''آپ کب کوچ فرمائیں گے؟''

''کل صبح......!''

''میں روانگی کے انتظامات کئے دیتا ہوں''۔

برقائی خان نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اب میں اپنے دوست سے ملنا چاہوں گا''۔

''وہ تو شاید کچھ دیر پہلے موٹے فونتا جو خان کے ساتھ بستی سے باہر نکلا ہے''۔ سردار کے پہلو میں موجود

ایک شخص جلدی سے بولا۔

''کچھ معلوم ہے کہ کس جانب گئے ہیں؟''

''مجھے اندازہ نہیں''۔

''ٹھیک ہے وہ لوگ جونہی واپس لوٹیں انہیں میری جانب بھیج دینا''۔ برقائی خان نے مڑتے ہوئے ہدایت دی۔ سردار نے تعظیماً گردن کو خم کیا۔ برقائی خان بستی سے نکل کر اپنے خیموں کی جانب لوٹ گیا۔



شیخ الاسلام عزالدینؒ بن عبدالسلام دمشقی ملکہ شجرۃ الدر اور دیگر مصری امرأ کے ہمراہ صفر 648ء میں واپس قاہرہ پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے ایک عورت کو اقتدار سونپنے پر شدید ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔ ان کے خیال میں عورت کی حکمرانی کے باعث مصری مسلمان بہت جلد کسی بڑی مصیبت میں مبتلا ہو جائیں گے۔ مصری امرأ کو تو اپنے مناصب اور عہدوں کی پڑی تھی جو کہ ملکہ شجرۃ الدر کی بدولت ان کے قبضے میں واپس لوٹنے تھے، اگر وہ ملکہ شجرۃ الدر کی مخالفت کرتے تو ممکن تھا کہ ان مناصب اور عہدوں سے دوبارہ ہاتھ دھو بیٹھتے۔ اسی لئے انہوں نے شیخ عزالدینؒ کی باتوں پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ بظاہر اُن کی ہاں میں ہاں ملا کر انہیں ٹالتے رہے۔ شیخ عزالدینؒ کئی دن سے بے چین تھے کہ مسلمانوں کے حق میں یہ فعل نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے لہٰذا دیگر امرأ کو بھی اس طرف توجہ دلائی جائے۔ وہ اسی سلسلے میں رئیس العساکر (سالارِ اعظم) جاشنگیر ایبک کے پاس جا پہنچے۔ جاشنگیر ایبک نے ان کی آمد پر بظاہر مسرت کا اظہار کیا اور خاطر مدارت کی۔ کچھ دیر بعد اس نے ان کے آنے کا سبب دریافت کیا تو شیخ عزالدینؒ نے بات شروع کی۔

''جاشنگیر! میرے یہاں آنے کا مقصد صرف یہی ہے کہ تمہیں بھی قبل از وقت اس بات سے باخبر کر دوں کہ اسلام میں عورت کی حکومت کا کوئی تصور موجود نہیں۔ عورت کا باپردہ اور اپنی حدود میں رہنا ہی درست طریقہ ہے۔ تم سب لوگوں نے مل جل کر اپنے دنیاوی فائدوں کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ مناسب نہیں ہے۔ اللہ کے غضب سے ڈرو اور لوگوں کو مصیبت میں مت ڈالو''۔

''یا شیخ!'' جاشنگیر ایبک بولا۔ ''جب عورت کے قدموں تلے جنت ہو سکتی ہے تو وہ حکمران کیوں نہیں بن سکتی؟ یہ منطق مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی''۔

''دو الگ الگ چیزوں کو مشترک کرنے کی کوشش نہ کرو۔ عورت کا ماں ہونا اور حکمران ہونا دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ ماں کے رُتبے کو اگر اتنی اہمیت دی گئی ہے تو اس کے پیچھے دوسرے عوامل پوشیدہ ہیں جنہیں تم نہیں سمجھ سکتے کیونکہ تمہیں ماں کی ممتا نصیب ہی نہیں ہو سکی۔ رہا سوال اقتدارِ اعلیٰ کا، تو یاد رکھو کہ شجرۃ الدر کتنی ذہین و فطین کیوں نہ ہو، یہ بھاری ذمہ داری اٹھانے کی اہل نہیں ہو سکتی۔ بہتر یہی ہوگا کہ تم خود میں سے کسی مرد کو چن کر اپنا سلطان بنا لو''۔

جاشنگیر ایبک شیخ عزالدینؒ کی بات پر پہلو بدل کر رہ گیا تھا۔ ''بہر حال آپ یہ بتائیے کہ آپ میرے ہی پاس کیوں آئے ہیں؟ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں تنہا کچھ نہیں کر سکتا''۔

''تمہارے دل میں جو چھپا ہے، میں اسی کو ہوا دینے آیا ہوں''۔ شیخ عزالدینؒ نے تحمل سے جواب دیا۔ جاشنگیر ایبک نہ سمجھنے والے انداز میں انہیں تکتا رہا۔

''اگر آپ سمجھتے ہیں کہ عورت کی حکمرانی ناجائز ہے تو آپ فتویٰ جاری کر دیجئے۔ میں آئندہ حالات کے تحت فیصلہ کروں گا''۔

''میں بخوبی جانتا ہوں میرا فتویٰ مسالک کے تنازعے کی نذر کر دیا جائے گا۔ بہتر ہوگا کہ تم یہ فتویٰ امیر المومنین سے منگواؤ''۔

''کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ امیر المومنین آپ کے فتویٰ کی حمایت کریں گے؟'' جاشنگیر ایبک حیرت سے ان کی جانب دیکھنے لگا۔

''میرے فتویٰ کی نہیں بلکہ شعائرِ اسلامیہ کی''۔ شیخ عزالدینؒ نے اس کی تصحیح کی۔

''ٹھیک ہے میں امیر المومنین سے رابطہ کر کے اس امر پر کوئی فیصلہ کروں گا''۔

''میں تمہیں مزید کہوں گا کہ جو بھی کرنا ہے وہ جلد از جلد کر لو اس سے پہلے کہ کوئی ناگہانی آفت تم لوگوں پر ٹوٹ پڑے''۔

''آپ اللہ تعالیٰ سے رحم و کرم کی دعا کیجئے۔ میں اس سلسلے میں کوئی قدم اُٹھاتا ہوں''۔ جاشنگیر ایبک نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ شیخ عزالدینؒ نے مزید وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا اور اس سے اجازت لے کر وہاں سے نکل آئے۔ جاشنگیر ایبک ان کے جانے کے بعد کافی دیر تک اس ضمن میں سوچتا رہا۔



مطیع الدین، فوئتا جو خان کے ساتھ اسی یخنی پہاڑی پر گیا تھا جہاں اس نے اپنی زندگی کا ایک ہولناک معرکہ لڑا تھا۔ فوئتا جو خان اپنے بھاری بھرکم ڈیل ڈول کے ساتھ ساتھ کافی ہنس مکھ بھی تھا۔ اس نے مطیع الدین کو اپنے واقعات سنا سنا کر بے حد محظوظ کیا تھا۔ مطیع الدین ریاست منگولیانہ کے ویرانوں میں ایک عرصہ تک بھٹکنے کے بعد اتنا سنجیدہ ہو چکا تھا کہ اسے امید نہیں تھی کہ وہ دوبارہ پہلے جیسی شگفتہ مزاجی حاصل کر سکے گا مگر فوئتا جو خان کے ساتھ چند دن رہ کر اس نے محسوس کیا کہ اس کے اندر کے کھلنڈرے نوجوان میں ابھی بھی زندگی کی رمق باقی ہے۔ اس کے دل میں یہ خواہش مچلنے لگی کہ وہ فوئتا جو خان کو بھی ساتھ لے جائے مگر ضرگامی قبیلے کی مہربانیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ انہیں ایک بہترین جنگجو اور شکاری سے محروم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس وقت وہ دم بخود رہ گیا جب فوئتا جو خان نے از خود برقائی خان کے ساتھ سرائے جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ وہ اپنی زندگی کی یکسانیت سے اکتا چکا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ سپاہ میں شامل ہو کر اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ برفانی ریچھ اور دیگر جانوروں کے شکار تک محدود رہ کے وہ خود کو ضائع ہوتا محسوس کر رہا تھا۔ مطیع الدین اس کا ارادہ سن کر خوش ہوا اور اسے سمجھانے بجھانے کے بجائے اس کی حوصلہ افزائی کرنے لگا۔ دونوں بے مقصد سیر کے بعد جب واپس بستی میں پہنچے تو انہیں برقائی خان کی آمد اور کوچ کی تیاری کی خبر ملی۔ مطیع الدین فوئتا جو خان کے ساتھ برقائی خان کے خیموں کی طرف نکل آیا۔ برقائی خان کو ان کی آمد کی خبر دی گئی تو اس نے انہیں اپنے مخصوص خیمے میں طلب کیا۔ کچھ دیر بعد وہ برقائی خان کے سامنے بیٹھے تھے۔

''میرے دوست! میں تمہیں ایک خاص بات سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ آگے چل کر ہماری رفاقت میں مسئلہ بن سکتی ہے''۔ برقائی خان نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ مطیع الدین اس کی بات سن کر چونک پڑا۔

''میرے خیال میں آپ لوگوں کو تنہائی کی ضرورت ہوگی لہٰذا میں چلتا ہوں''۔ فوئتا جو خان اُٹھتے ہوئے بولا۔

''بیٹھ جاؤ! تمہاری موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا''۔ مطیع الدین نے اس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ برقائی خان نے حیرت بھری نگاہوں سے مطیع الدین کو دیکھا۔ فوئتا جو خان بے یقینی کے عالم میں کھڑا برقائی خان کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

''جب میرے بھائی نے کہا ہے تو بیٹھ جاؤ''۔ برقائی خان دھیرے سے بولا۔ ''بات کچھ اس طرح ہے

کہ جب تمہیں سرخ غر قبیلے والوں نے اغوا کیا تھا اس دن سے شاہی دربار میں ایک عجیب کشمکش پھیل گئی۔ اس سارے معاملے کو غلط رنگ میں پیش کر کے ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ مجھے مجرم بنا کر راستے سے ہٹا دیا جاتا۔ اس گھناؤنی سازش کے پیچھے درباری امیر تو تائی خان کا ہاتھ تھا۔ اس نے تمہارے باپ کو یہ باور کرایا کہ میں نے تمہیں قتل کر کے تمہاری لاش کو سرخ غر کی کسی کھائی میں پھینک دی ہے۔ یہ بات صرف میری ذات تک محدود نہیں تھی بلکہ اس امر سے ریاست میں انتشار پھیلا کر مسلمانوں اور منگولوں کے مابین پُر امن معاہدے کو توڑنا مقصود تھا۔ میری ناقص رائے کے مطابق اس معمولی واقعے کو یوں ہوا دینا کسی چھوٹے دماغ کا کام نہیں ہو سکتا۔ بہر حال میں اسی عزم سے تمہیں تلاش کرتا رہا کہ حریفوں کا داؤ کامیاب نہ ہو سکے اب میں نے تمہیں تلاش کر لیا ہے اور کچھ دنوں بعد ہم واپس سرائے پہنچیں گے۔ وہاں اب کیسے حالات پیدا ہوں گے اس بارے میں میں کچھ کہہ نہیں سکتا، ممکن ہے کہ تم دونوں یہ سن کر ہڑ بڑا اُٹھو کہ میں نے ...... اسلام قبول کر لیا ہے اور میں مسلمان ہو چکا ہوں''۔ برقائی خان بات مکمل کرتے ہوئے ان کے چہروں کو بغور دیکھ رہا تھا۔ مطیع الدین اس نئے انکشاف سے ہکا بکا رہ گیا جبکہ فوئنا جو خان کے چہرے پر الجھن کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ اچانک مطیع الدین اپنی جگہ سے اُٹھا اور دونوں بانہیں پھیلا کر برقائی خان پر جا گرا۔ وہ دیوانہ وار اس کے چہرے کے بوسے لے رہا تھا۔ برقائی خان نے مسکرا کر اسے خود سے الگ کیا اور بیٹھنے کی تلقین کی۔ مطیع الدین خوشی سے بے خود دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا چہرہ فرطِ جذبات سے سرخ تھا۔

''میرا خیال ہے کہ تم میری بات کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں؟''

''میں سب سمجھ رہا ہوں۔ تم نے ابھی تک یہ اعلان نہیں کیا ہے، اب واپس لوٹ کر یہ اعلان کرو گے اور قوی امکان ہے کہ تمہاری مخالفت میں ریاستی عمائدین اور شاہی لوگ اُٹھ کھڑے ہوں۔ کسی بھی بڑے فرد کو ایسے اقدام پر ایسی ہی صورتِ حال درپیش ہوتی ہے۔ تم بے فکر رہو میں ہر میدان میں تمہارے ساتھ رہوں گا، چاہے اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے''۔

''مجھے اپنی مخالفت کی کوئی پرواہ نہیں ہے، تم میری بات کو غلط جانب موڑ رہے ہو۔ میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ میرا بھائی میری حفاظت کرنا بخوبی جانتا ہے، اس نے مجھے اچانک اس سرحد پر روانہ کیا اور یہاں کی ایسی تصویر میرے سامنے کھینچی کہ جیسے یہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب غلط ہے۔ میں یہاں درحقیقت ضرگامی قبیلے کی سرکوبی کے لئے پہنچا تھا مگر یہاں آ کر معلوم ہوا کہ قبیلے نے کبھی اپنی حدود سے تجاوز ہی نہیں کیا۔ میں نے اتنے دن ان میں رہ کر بغور مشاہدہ کیا ہے کہ یہ لوگ ویسے نہیں ہیں جیسا کہ بیان کیا گیا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قاآن اعظم نے مجھے سرائے سے اتنی دور کیوں بھیجا؟ اس بارے میں ابھی واپس سرائے پہنچ کر ہی معلوم ہو سکے گا بہر حال تمہیں بتانے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ وہاں غیر معمولی نوعیت کے حالات سے سامنا ہو سکتا ہے تمہیں ذہنی طور پر تیار رہنا ہو گا۔ ہم کل صبح روانگی اختیار کریں گے''۔ برقائی خان نے اپنی بات مکمل کی۔ مطیع الدین اس کی بات کو کچھ کچھ سمجھ رہا تھا۔ وہ سرائے پہنچ کر ہی معاملات سے پوری طرح آگاہ ہو سکتا تھا۔ مطیع الدین نے اس بارے میں مزید کرید مناسب نہ سمجھی اور موضوع بدلتے ہوئے فوئنا جو خان کی خواہش کا ذکر چھیڑ دیا۔ فوئنا جو خان کو برقائی خان کے اسلام قبول کرنے پر عجیب سا دھچکا پہنچا تھا۔ وہ خاموش رہا۔ برقائی خان نے اس سے کچھ پوچھنا چاہا تو اس نے طبیعت کی خرابی کا عذر کرتے ہوئے رخصت طلب کر لی۔ مطیع الدین اس کے رویئے میں اچانک پیدا ہونے والی تبدیلی دیکھ کر کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔



غازی عبداللہ شافعی معزز اور نامی گرامی مصری امرأ میں سے ایک تھا۔ وہ نجم الدین ایوب کے دور میں اس کی غیر موجودگی میں قاہرہ میں نائب امیر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتا رہا تھا۔ سلطان نجم الدین ایوب کی وفات اور سلطان توران شاہ کے بہیمانہ قتل کے بعد اس پر ذمہ داری کا بوجھ مزید بڑھ گیا۔ ملکہ شجرۃ الدر نے قاہرہ واپس لوٹ کر اسے کئی نئی ذمہ داریاں سونپ کر اس کے عہدے میں ترقی کر دی تھی۔ وہ ملکہ شجرۃ الدر کا وزیرِ اعلیٰ کہلایا جانے لگا۔ وہ اپنے عہدے کی ترقی سے جتنا خوش تھا، اسی قدر اس میں جوش و خروش بھی دکھائی دیتا تھا۔ ایک شام مصری و مملوک افواج کا سالارِ اعظم جاشنگیر ایبک اس کے پاس چلا آیا۔ وہ کچھ ضروری امور سے ابھی فارغ ہی ہوا تھا۔ جاشنگیر کی غیر متوقع آمد پر اسے حیرت ہوئی۔ دونوں پرتپاک انداز میں ملے۔ غازی عبداللہ شافعی نے اسے بٹھاتے ہوئے گرم گرم قہوہ پیش کیا اس کے بعد آمد کے بارے میں دریافت کیا۔

''بات کچھ یوں ہے کہ آج صبح شیخ عز الدینؒ میرے پاس آئے تھے......''

''میں جانتا ہوں کہ انہوں نے کیا کہا ہو گا؟'' غازی عبداللہ شافعی نے بات اچک لی۔

''میں اسی سلسلے میں آیا ہوں کہ رعایا میں بھی بے چینی کی کیفیت چھائی ہوئی ہے، دوسرا شیخ عز الدینؒ نے کسی خوفناک آفت کی آمد کا بھی ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو مگر مجھے ان کی برہمی سے خوف محسوس ہوتا ہے''۔

''شیخ عز الدینؒ سے خوفزدہ ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں، ان کی شخصیت اتنی اہم نہیں کہ ان کی باتوں پر کان دھرا جائے، البتہ لوگوں میں موجود بے چینی کی کیفیت کو فرد کرنے کے لئے کوئی قدم اُٹھانے پر غور کیا جا سکتا ہے''۔

''مجھے لوگوں کی کوئی پرواہ نہیں، انہیں سنبھالنا کوئی مشکل بات نہیں، شیخ عز الدینؒ کی باتوں سے کئی امرأ میں مخالفت کی فضا پروان چڑھ رہی ہے۔ یہ معاملہ آنے والے وقت میں کشیدگی کا باعث بن سکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلے کا سر اُٹھانے سے پہلے ہی خاتمہ کر دیا جائے''۔

''یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ملکہ شجرۃ الدر کو معزول کر دیا جائے؟''

''نہیں! میں یہ چاہتا ہوں کہ ملکہ شجرۃ الدر کے بارے میں جلد از جلد امیر المومنین سے رجوع کر لیا جائے تاکہ اس ضمن میں کوئی فتنہ کھڑا نہ کیا جا سکے''۔

''تمہاری بات کسی حد تک درست ہے، میں کل ہی ملکہ شجرۃ الدر کو اس معاملے سے آگاہ کر کے اطاعت کا بیعت نامہ بغداد بھجوانے کی کوشش کرتا ہوں''۔ غازی عبداللہ شافعی نے اس کے مؤقف کی حمایت کی۔ جاشنگیر ایبک نے کچھ دیر تک اس بارے میں مزید مشورے دیئے۔ دونوں میں اس بات پر اتفاق رائے تھا کہ کسی بھی طرح ملکہ شجرۃ الدر کو اقتدار پر قائم رکھا جائے۔



مطیع الدین شام کے وقت فوئنا جو خان کے پاس چلا آیا۔ برقائی خان نے فوئنا جو خان کے رویئے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا البتہ اس سے اتنی قربت پر احتیاط سے کام لینے کا مشورہ ضرور دیا تھا۔ فوئنا جو خان اسے اپنے خیمے میں مل گیا۔ وہ مطیع الدین کی صورت دیکھ کر پھیکے پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔

''کیا بات ہے؟ صبح تک تو تم بڑے چہک رہے تھے، اب یکدم کیا ہو گیا ہے''۔

''میں جانتا ہوں کہ تم مسلمان ہو۔ مجھے تمہارے ساتھ رہ کر بھی اس بات کا شدت سے احساس نہیں ہوا مگر قاآن زادے کی بات پر گہرا صدمہ پہنچا ہے''۔

''تمہارا اشارہ اس کے مسلمان ہونے کی جانب ہے غالباً؟''

"ہاں! جاودانی آسمان کے محافظ ہی اگر اپنے دین کو چھوڑ دیں گے تو اس کا وارث کون بنے گا؟"

"اگر تمہارے جاودانی دین میں انسانیت ملا دی جائے تو وہ اسلام بن جاتا ہے۔ میرا مذہب کوئی ایسی شے نہیں کہ اسے حقارت یا تنگ نظری سے دیکھا جائے یا اسے کسی پر محدود کر دیا جائے۔ اس میں ایسی اچھی باتیں ہیں جو کہ سب کے لئے فائدہ مند ثابت ہوتی ہیں"۔

"میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا"۔

"میں کوئی بحث نہیں کر رہا بلکہ تمہاری تنگ نظری کی گرہ کو کھولنا چاہ رہا ہوں۔ دیکھو میں بھی ایک مسلمان ہوں مگر برقائی خان مجھ پر جان چھڑکتا ہے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ مسلمان ہو چکا ہے، اس بات کی آگاہی سے پہلے بھی میرے دل میں اس کے لئے اتنی ہی عزت تھی جتنی اب ہے ہم دو الگ الگ عقائد کے حامل ہوتے ہوئے بھی مثالی دوستی میں بندھے ہوئے تھے۔ یہی وہ تعلیم ہے جو مجھے میرا مذہب دیتا ہے"۔

"میں تمہاری بات کو پسند کرتا ہوں، میں نے بھی دوستی کے جذبے کے تحت تمہاری جانب قدم بڑھایا تھا مگر جاودانی آسمان کے محافظوں کی طرف سے ایسے کسی اقدام کے بارے میں، میں سوچنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا"۔

"بہر حال میں مزید کچھ نہیں کہوں گا۔ تم سرائے جانا چاہتے تھے کہ وہاں سپاہ میں شامل ہو کر کوئی مقام پیدا کر سکو۔ اس بارے میں اب تمہارا کیا خیال ہے؟" مطیع الدین نے بات کا رُخ بدلا۔

"میں فی الحال کچھ کہہ نہیں سکتا، کل صبح تک اس بارے میں حتمی فیصلہ کروں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے"۔ نوسنا جو خان سر جھکا کر بولا۔

مطیع الدین نے اس کا مزاج دیکھ کر اسے تنہا چھوڑ دینا بہتر سمجھا۔



الملک الناصر صلاح الدین یوسف ایوبی دمشق و حلب میں سلطان نجم الدین ایوب کی جانب سے والی مقرر تھا۔ یہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے بیٹے الملک الفضل کا پوتا تھا۔ نجم الدین ایوب کی وفات کے بعد اس نے کافی کوشش کی کہ اسے نیا سلطان بنایا جائے مگر مملوک فوج اور امرا نے اس کی خواہش پر بند باندھ دیا تھا۔ ملکہ شجرۃ الدر کی اطاعت اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے سرکشی اختیار کرتے ہوئے بلادِ شرقیہ میں اپنی خود مختار حکومت کا اعلان کر دیا اور دمشق اس کا پایہ تخت قرار دیا۔ دمشق کے سابق سلطان عمادالدین اسمٰعیل کے دور میں صلیبیوں کا دمشق میں داخلہ عام تھا جسے نجم الدین ایوب نے دمشق کی فتح کے بعد ختم کیا تھا۔ الملک الناصر صلاح الدین یوسف ایوبی نے سابقہ روش کو دوبارہ جاری کیا اور نصاریٰ کے ساتھ اچھے تعلقات استوار کئے۔ یہ سب صرف اس لئے کیا گیا تھا کہ ملکہ شجرۃ الدر کی جانب سے اُٹھائے جانے والے کسی اقدام کا منہ توڑ جواب دیا جا سکے۔ صلیبیوں سے مدد لینا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کئی ایوبی حکمران یہ قدم اُٹھا چکے تھے۔ الملک الناصر صلاح الدین یوسف نے صلیبی سپاہ کو یہ یقین دہانی کرائی کہ وہ مصر کی جانب سے فرصت پاتے ہی یروشلم پر ان کا قبضہ بحال کرنے میں معاونت دے گا۔

نصاریٰ کے ساتھ مل کر اس نے کئی دوسرے والیوں کو شکست دی جو کہ بلادِ مصر کے محکوم تھے۔ اس نے تیزی کے ساتھ تمام بلادِ شرقیہ و جزیرہ پر اپنی مستحکم حکومت قائم کر لی۔ صلیبی سپاہی مسلمانوں کے شہروں میں آزادانہ گھومتے اور اکثر نقصان بھی پہنچاتے۔ الملک الناصر صلاح الدین یوسف تک ایسی شکایات مسلسل پہنچتی رہیں مگر وہ انہیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اُڑاتا رہا۔ اس نے داد و دہش سے سپاہ کو ایسا گرویدہ بنا

رکھا تھا کہ وہ اس کے ہر فیصلے کا نہایت گرمجوشی سے خیر مقدم کرتیں۔

الملک الناصر صلاح الدین یوسف نے ربیع الاوّل 648ھ میں نصاریٰ کی معاونت سے ایک بڑا لشکر تیار کیا تاکہ وہ بلادِ مصر پر حملہ آور ہو سکے۔ وہ مملوک امرا کو ایوبی سلطان توران شاہ کا قاتل سمجھتا تھا اور انہیں نمک حرامی کی سزا دینا چاہتا تھا۔ اس کے عمائدین نے پرزور انداز میں اسے یہ باور کرایا کہ بلادِ مصر کی حکومت ایوبی خاندان کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہے۔ اگر اس نے بروقت کارروائی نہیں کی تو بلادِ مصر ایوبیوں کے لئے خواب بن کر رہ جائے گا۔ اسے تحریک دینے والوں نے اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے ایسے قلابے ملائے کہ وہ خود کو ایوبی خاندان کا اکلوتا سلطان سمجھنے لگا۔

ملکہ شجرۃ الدر تک اس کی باغیانہ حرکات کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ بلادِ مصر پر حملہ آور ہونے کا خواہش مند ہے تو اس نے اپنے لشکر کو تیاری کا حکم دے دیا۔ وہ اس کی سرکشی کو میدان میں کچل دینے کا ارادہ کئے ہوئے تھی۔

بلادِ مصر ان دنوں عورت کی حکمرانی کے موضوع پر الجھا ہوا تھا۔ امرا دو گروہوں میں بٹ چکے تھے۔ مملوک سپاہیوں میں شیخ عزالدینؒ کی بات کو زیادہ فوقیت حاصل تھی۔ رئیس العساکر جاشنگیر ایبک نے حالات میں بڑھتی ہوئی کشیدگی کو دیکھتے ہوئے اپنے تئیں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ملکہ شجرۃ الدر کو معزول کر دیا جائے۔ اس نے نہایت خاموشی سے ایک مراسلہ بغداد روانہ کیا جس میں بلادِ مصر کی صورت حال اور شیخ الاسلام عزالدینؒ کے جاری کردہ فتویٰ کے نکات تحریر کئے گئے تھے۔ اس کے مراسلے کے تیسرے دن ملکہ شجرۃ الدر کی جانب سے بھی بیعت نامہ تیار کر کے دربارِ خلافت میں بھیج دیا گیا۔ بغداد میں امیرالمومنین کے سامنے جب صورت حال پیش ہوئی تو انہوں نے عزالدینؒ کے جاری کردہ فتویٰ کی تکمیل میں دیر پر سخت برہمی کا اظہار کیا۔ خلیفہ مستعصم باللہ شیخ عزالدینؒ سے بے حد متاثر تھا۔ اس نے جوابی مراسلے میں نہایت درشت انداز اختیار کرتے ہوئے یہ لکھا: "کیا مصری امرا کے پاس مردوں کی کمی ہو گئی کہ انہوں نے تاجِ شاہی ایک لونڈی کے سر پر سجا دیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں اپنے دربار سے کوئی غلام بھیجے دیتا ہوں تاکہ تم لوگ اسے اپنا سلطان بنا لو"۔

یہ جواب مصری امرا کے منہ پر کھلا طمانچہ تھا، مجلس انتخاب میں ہلچل سی مچ گئی۔ انہوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کرتے ہوئے ربیع الاوّل 648ھ کے آخر میں اسّی دن کے مختصر اقتدار کے بعد ملکہ شجرۃ الدر کو معزول کر دیا۔

ملکہ شجرۃ الدر کی معزولی سے ریاستی حالات میں ابتری سی پیدا ہو گئی۔ مجلس انتخاب کے لئے یہ فیصلہ نہایت مشکل تھا کہ وہ تاجِ سلطانی کس کے سر پر رکھیں۔ کوئی ایسا نام سامنے موجود نہیں تھا کہ جسے منصبِ سلطانی کا اہل سمجھا جاتا۔ دوسرا امرا کی ایک بڑی جماعت کو اپنے عہدوں کی فکر لاحق تھی۔ ایسے میں کوئی ایسا شخص ہی سلطان بنایا جا سکتا تھا جو پہلے سے انہیں ان کے عہدوں کے تحفظ کی ضمانت مہیا کرتا۔ رئیس العساکر جاشنگیر ایبک نے غازی عبداللہ شافعی کو رائے دی کہ وہ آگے بڑھ کر منصبِ سلطانی سنبھال لے مگر اس نے صاف الفاظ میں انکار کر دیا۔

بالآخر ایک چھ سالہ ایوبی شہزادے علاء الدین موسیٰ کے نام قرعہ کھلا۔ مجلس انتخاب نے اسے نیا سلطان مقرر کرنے کا اعلان کیا یہ قدم اس لئے اُٹھایا گیا تھا کہ بلادِ مصر کے لوگ ایوبی خاندان کو اپنا محافظ خیال کرتے تھے۔ ملکہ شجرۃ الدر عورت ہونے کے ساتھ ساتھ ایوبی خاندان کی فرد بھی نہیں تھی، نیا سلطان اتنا کم سن تھا کہ اسے اپنا ہوش ہی نہیں تھی، وہ کیا حکم جاری کر سکتا تھا! اس کام کے لئے رئیس العساکر جاشنگیر ایبک کو اس کے ساتھ شریک سلطان کا منصب دیا گیا۔ جاشنگیر ایبک پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی تھی کہ وہ سلطان علاء الدین موسیٰ کی

تربیت کے ساتھ ساتھ ملکی استحکام کے امور پر نگاہ رکھے۔ مجلس امرا نے سلطان علاء الدین موسیٰ کو الملک الاشرف کا خطاب دیا۔

الملک الناصر صلاح الدین یوسف بلادِ مصر پر حملہ آور ہونے کی سوچ رہا تھا کہ اسے اچانک اس تبدیلی کی اطلاع ملی، اس کے پاس جنگ کا جو جواز تھا وہ صرف یہی تھا کہ حکومت ایوبی خاندان کو واپس لوٹائی جائے۔ ایوبی شہزادے کی تخت نشینی کو اس نے کافی خیال کیا اور فوری طور پر حملے سے باز رہا۔



گل وتوژ کو قبیلہ سرخ غر میں قریباً دو ماہ گذر چکے تھے۔ اس کا نانا منک آنہ اس کے مثبت جواب کا منتظر تھا، شنگ کی صورت اس نے ایک عرصے سے نہیں دیکھی تھی۔ شنگ ماہر شکاری تھا اور اکثر شکار کے سلسلے میں ویرانوں اور سنگلاخ چٹانوں کی خاک چھانتا رہتا تھا۔ گل وتوژ روز قبیلے سے فرار کے منصوبے بناتی مگر اسے کچھ سجھائی نہ دیتا تو تلملا کر رہ جاتی۔ وہ اس قید سے تنگ آ چکی تھی، قبیلہ سرخ غر میں منک آنہ کا رعب ودبدبہ اتنا قوی تھا کہ اس کے صرف ایک بار منع کرنے پر ہی قبیلے کی دیگر خواتین نے اس سے منہ پھیر لیا اور دوبارہ کبھی اس سے بات نہیں کی۔ یہ ایک طرح کی ہلکی سی سزا تھی جو گل وتوژ کو راہِ راست پر لانے کے لئے مسلط کی گئی تھی۔ گل وتوژ عالی حوصلہ لڑکی تھی۔ اس نے یہ سب ہمت وصبر سے برداشت کیا۔ قبیلہ سرخ غر کی ایک بھولی بھالی لڑکی گھنانم اکثر اسے ہمدردنگاہوں سے دیکھا کرتی۔ اس کا سن سترہ کے لگ بھگ تھا، وہ گل وتوژ کے بارے میں اکثر اپنی ماں اور بڑی بہنوں سے دریافت کرتی کہ ان سے دوسرے لوگ بات کیوں نہیں کرتے؟ اس کی ماں صرف یہ کہہ کر اسے ٹال دیا کرتی کہ یہ اپنے نانا کی نافرمان ہو چکی ہے اور کسی کافر کی محبت میں اپنے باپ کو بھی کھا گئی ہے۔ اتنی وضاحت گھنانم کی نگاہ میں کافی نہیں تھی۔ وہ کچھ اور بھی جاننا چاہتی تھی مگر کوئی اس سے زیادہ جاننا ہوتا تو اس کو بتاتا۔ وہ بے چارگی و بے بسی سے اکثر گل وتوژ کو تکتی رہتی۔ ایک آدھ بار اس کی ماں نے اس حرکت پر اسے متنبہ بھی کیا مگر اس کا تجسس شدت اختیار کرتا رہا۔ پھر ایک دن اس نے ہمت باندھی اور گل وتوژ کے پاس جا پہنچی۔

یہ دوپہر کا وقت تھا۔ سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ گل وتوژ ان کے لئے ایسے تھی جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ گھنانم نظر بچا کر اس کے پاس آنے میں کامیاب ہوگئی۔ گل وتوژ اس وقت اپنے خیمے میں تنہا تھی۔ منک آنہ نے چند دن قبل اس کا خیمہ الگ کر دیا تھا تاکہ احساسِ تنہائی کی شدت بڑھ جائے۔ اس کے لئے کھانا ایسے رکھا جاتا تھا جیسے وہ کسی چھوت کے مرض کی مریضہ ہو۔ وہ اکثر کھانے سے بے پرواہ رہتی تھی اور جب انتڑیاں بلبلا اُٹھتیں تو مجبوراً کھانا کھاتی۔ خیمے میں کسی کی آہٹ پر وہ چونک اُٹھی۔ اس نے گردن گھما کر اس جانب دیکھا تو ایک معصوم اور بھولا بھالا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ لمحہ بھر کے لئے اس انجانی صورت کو دیکھ کر دنگ رہ گئی پھر اس نے دھیرے سے دریافت کیا۔ ''تم کون ہو؟''

''میرا نام گھنانم ہے اور میں سنتائی خان کی بیٹی ہوں، میرا باپ قبیلے میں لائے گئے شکار کردہ جانوروں کی کھال اتارنے کا کام کرتا ہے''۔

''یہاں کیوں آئی ہو؟''

''تم سے باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا اس لئے چلی آئی''۔

''کسی سے پوچھ کر آئی ہو؟''

''نہیں! دوسروں کا دھیان بٹا دیکھا تو چپکے سے تمہارے خیمے میں داخل ہوگئی''۔

''جانتی ہو کہ میرے خیمے میں ہر کسی کا داخلہ بند ہے اور اس حکم سے نافرمانی کرنے کی سزا کیا ہے؟''

''ہاں معلوم ہے مگر میں کسی کی پرواہ نہیں کرتی''۔

''کیا چاہتی ہو؟'' گل وتوژ اس کی جانب سے پوری طرح مطمئن نہیں ہو پائی۔

''جاننا چاہتی ہوں کہ یہ سب کیا ہے؟ میری ماں کہتی ہے کہ تم کسی کافر کے دامِ الفت میں آ گئی تھیں اور باپ کے سمجھانے بجھانے پر اسی پر ہاتھ صاف کر گئیں مگر تمہاری صورت دیکھ کر تو ایسا نہیں لگتا''۔

''اگر میں یہ کہوں کہ یہی سچ ہے تو......؟''

''میرا دل نہیں مانے گا''۔

''کیوں نہیں مانے گا، کیا ایسا نہیں ہو سکتا''۔

''کسی کا خون بہانے والے کی آنکھوں میں ایسی معصومیت نہیں ہوتی جو تمہاری آنکھوں سے جھلکتی ہے''۔

چہرے دھوکا بھی دے سکتے ہیں۔

''ممکن ہے کہ ایسا ہو مگر تمہارے سلسلے میں ایسا کچھ سمجھنے کی غلطی نہیں کروں گی''۔

گل وتوژ اس کی بات سن کر دھیرے سے ہنس دی۔ ''تم یا تو نادان ہو یا پھر بے حد چالاک۔ بہرحال جیسی بھی ہو میں تمہیں مشورہ دوں گی یہاں سے چلی جاؤ اگر کسی کی نگاہ تم پر پڑ گئی تو تمہاری مفت میں شامت آ جائے گی''۔

''بھلا ایسے ہی چلی جاؤں، مجھے اتنا نادان بھی نہ سمجھو کہ اتنے دنوں کی کوشش کے بعد میں تم سے بات کرنے میں کامیاب ہوئی ہوں اور اپنی تشنگی مٹائے بغیر چلی جاؤں گی''۔

گل وتوژ مختلف حیلوں سے اُسے سمجھاتی رہی، اُس نے گھنانم کو متوقع سزا سے ڈرانے کی کوشش بھی کی مگر وہ ضد کی پکی نکلی، اس نے ہر حجت کو رد کر دیا۔ بالآخر گل وتوژ اس کی ضد کے آگے بے بس ہوگئی۔ خود اس کا بھی دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس سے ڈھیر ساری باتیں کرے مگر اسے اندیشہ تھا کہ کہیں یہ لڑکی محض اپنا تجسس مٹانے کی کوشش میں کسی مشکل میں گرفتار نہ ہو جائے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ منک آنہ کی کسی نئی چال کے تحت اس کا قرب حاصل کرنا چاہتی ہو لیکن پھر گل وتوژ کے دل میں یہ خیال آیا کہ اب کون سی بات ڈھکی چھپی رہ گئی ہے۔ وہ اگر اسے کچھ بتا بھی دے تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔ اس نے کسی حد تک معاملات گھنانم کے سامنے افشا کر دیے۔ گھنانم بڑی حساس لڑکی تھی جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس پر باپ کے قتل کا الزام بے بنیاد ہے اور محض مسلمان سے محبت کرنے کے جرم کی سزا دی جا رہی ہے تو اس نے پل بھر میں یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ قبیلہ سرخ غر کے چنگل میں پھنسی اس بے قصور لڑکی کو آزادی دلانے میں پوری مدد کرے گی۔ اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اسے اپنی مدد کا یقین دلایا اور کچھ دیر بیٹھ کر رخصت ہوگئی۔ پھر اس نے معمول بنا لیا کہ ہر دو تین دن بعد، جب اسے موقع ملتا، گل وتوژ کے خیمے میں آ جاتی اور دیر تک اس سے گفتگو کرتی رہتی۔ اس نے قبیلے کی دیگر نوجوان لڑکیوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا، وہ گل وتوژ کی مدد کرنے پر آمادہ دکھائی دینے لگیں لیکن ان میں سے کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ گل وتوژ کے خیمے کی جانب بڑھ پاتی۔ اسی طرح قبیلے کی کچھ عمر رسیدہ عورتوں کو بھی اس امر کی خبر ہوگئی کہ گھنانم دیر تک گل وتوژ کے خیمے میں رہتی ہے مگر انہوں نے اس معاملے کو اپنے تک ہی محدود رکھا۔ ایک عورت ہونے کے ناطے ان کے دلوں میں گل وتوژ کے لئے ہمدردی موجود تھی مگر وہ اپنے مردوں کے آگے بے بس تھیں۔ دوسرا گھنانم کا گل وتوژ سے میل جول ان کے خیال میں کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ جسے برا سمجھا جاتا۔ یہ سلسلہ کافی دنوں تک یونہی چلتا رہا۔ منک آنہ جیسا گھاگ شخص بھی اس ضمن میں بے خبر رہا۔

ایک دن گھنانم گل وتوژ کے خیمے میں آئی تو اس کے چہرے سے عجیب سی بے تابی جھلک رہی تھی، گل

دتوڑ اس کا چہرہ دیکھ کر یہ سمجھی کہ شاید اس کی یہاں آمد و رفت کا راز افشا ہو گیا چنانچہ اس نے چھوٹتے ہی گہنانم سے اس بارے میں پوچھ لیا۔ گہنانم ایک گہری سانس لے کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

''میں آج ایک نہایت ضروری بات کرنے آئی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم جلد از جلد میری پیشکش کا جواب دو گی کیونکہ میرے پاس وقت بہت کم ہے''۔

''خیریت تو ہے گہنانم! تم آج کیسی باتیں کر رہی ہو؟'' گل دتوڑ پریشانی سے بولی۔

''گل دتوڑ! کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں صرف اپنی ذات تک محدود رکھا جاتا ہے، ایسی ہی ایک بات میرے دل میں بھی محفوظ ہے۔ میں تمہارے پاس یونہی نہیں چلی آتی تھی، اس کے پیچھے ایک مقصد تھا جو میں نے تم سے پوشیدہ رکھا''۔

''آج تم پہیلیاں بجھانے کا ارادہ رکھتی ہو شاید''۔

''دیکھو! اپنے دل کا ایک راز میں تمہارے حوالے کر رہی ہوں، اگر تمہیں میری پیشکش سے انکار ہو تو اسے ایک سہیلی کی امانت سمجھ کر ہمیشہ کے لئے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینک دینا اور کبھی کسی سے اس کا تذکرہ نہ کرنا''۔

''گہنانم! جو کچھ کہنا چاہتی ہو صاف صاف لفظوں میں کیوں نہیں کہتیں، بات کو یوں گھما پھرا کر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟'' گل دتوڑ نے سنجیدگی سے کہا۔

''پہلے تم وعدہ کرو''۔

''میرا خیال ہے اتنے دن کی رفاقت کے بعد تمہیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ میں کس قسم کی لڑکی ہوں، ضروری نہیں کہ میں زبان سے اظہار کروں''۔

''مجھے تم پر پورا اعتماد ہے تو ہی اپنے دل کی بات کہنے جا رہی ہوں''۔

''اب کہہ بھی ڈالو''۔ گل دتوڑ اکتا سی گئی۔

''گل دتوڑ!'' گہنانم لفظوں کو ترتیب دینے لگی۔ ''جیسے تم کسی سے محبت کرتی ہو، ایسے ہی میں بھی ایک نوجوان کو دل دے بیٹھی ہوں، میں جانتی ہوں کہ میرا باپ اس نوجوان سے میری شادی پر کبھی تیار نہیں ہوگا مگر میں اس کے بغیر جینے کا اب تصور بھی نہیں کر سکتی''۔

''اوہ یہ بات ہے!'' گل دتوڑ دھیرے سے مسکرائی۔ ''کیا وہ قبیلے سے باہر کا نوجوان ہے؟''

''نہیں! وہ میرے باپ کا غلام ہے۔ اس کا نام شکنان ہے، میری ماں بتاتی ہے کہ وہ اسے بڑے قاآن اعظم کے دور میں کسی ترک علاقے سے لایا تھا۔ اس وقت اس کی عمر چار سال تھی، میں تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئی تھی''۔ وہ اپنی بات پر خود ہی ہنسنے لگی۔ کچھ توقف کے بعد گہنانم نے بات آگے بڑھائی۔ ''میں نے جب سن بلوغت میں قدم رکھا تو اس جیسا وجیہہ اور کسی کو نہ دیکھا۔ وہ بڑا مخلص اور جانثار دکھائی دیا۔ جہاں کہیں میری ذات ملوث ہوتی میں نے اسے اپنی طرفداری کرتے دیکھا۔ جانے کب میں اُسے اپنا دل دے بیٹھی، اپنے ہی گھر میں عرصے تک ہم اپنی اپنی محبت چھپائے گھلتے رہے پھر ایک دن میں نے بڑھ کر اپنے دل کا حال اس پر کھول دیا۔ وہ شاید اپنی حیثیت اور میری جانب سے کسی سختی کے اندیشے کے باعث دل کی بات زبان پر نہیں لا سکا تھا۔ میرے بڑھتے قدم دیکھ کر اس نے بھی اپنی محبت کا بھید کھول دیا۔ کل اس نے مجھے ایک پیشکش کی تو میں نے سوچا کہ تمہیں بھی اپنے ساتھ شریک کر لوں''۔

''قبیلے سے فرار ہونے کا ارادہ ہے؟'' گل دتوڑ کڑی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ گہنانم اس کے لہجے

سے گڑبڑا سی گئی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے اس سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو۔ اس نے اپنے سر کو خفیف سی حرکت دی۔

''جانتی ہو کہ قبیلے والے بڑی تیزی سے فرار ہونے والوں کو ڈھونڈ نکالتے ہیں؟''

''اسی لئے تو میں تمہارے پاس آئی ہوں کیونکہ تم ہماری مدد کر سکتی ہو''۔

''کیسی مدد؟''

''ہم دونوں کو راستوں کے بارے میں کچھ زیادہ آگاہی نہیں، تم ہمیں کسی طرح صحیح راستے پر ڈال دو کہ ہم دونوں ترک علاقے کی جانب نکل جائیں''۔

''یعنی میں بھی تمہارے ساتھ فرار ہو جاؤں؟''

''ظاہر ہے''۔ گہنانم ملتجیانہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ گل دتوڑ کے لئے یہ ایک اچھا موقعہ تھا مگر اسے بار بار یہ خدشہ ستا رہا تھا کہ یہ منگ آنہ کی کوئی سازش نہ ہو، وہ بار بار گہنانم کی صورت دیکھتی اور اس کی پیشکش کے محرکات کو سمجھنے کی کوشش کرتی مگر گہنانم کسی طرف سے بھی ایسی مکار اور دھوکے باز دکھائی نہیں دیتی تھی کہ اس پر کسی سازش میں شریک ہونے کا شبہ کیا جا سکتا۔ گل دتوڑ گہری سوچوں میں گم تھی کہ گہنانم نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

''دیکھو! جو کہنا ہے جلدی سے کہہ دو کیونکہ شام ہونے میں تھوڑی ہی دیر باقی ہے، اندھیرا ہونے کے بعد میری شکنان سے ملاقات نہیں ہو سکے گی کیونکہ وہ غلاموں والے خیمے میں چلا جائے گا۔ میں نے اسے تمہارے فیصلے سے بھی آگاہ کرنا ہے، یہ ذہن میں رکھو کہ ہم آج رات ہی یہاں سے نکل جائیں گے''۔

''گہنانم! تم نے مجھے عجیب مخمصے میں ڈال دیا ہے، میں اتنی عجلت میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی، مجھے کچھ سوچنے کا وقت تو دو''۔

''میں نے تمہیں آتے ہی باور کرایا تھا کہ تمہیں فوری طور پر کوئی جواب دینا ہوگا''۔ گہنانم اسے گومگو کی کیفیت میں مبتلا دیکھ کر بگڑنے لگی۔

''تم ایسا کرو کہ اس وقت جاؤ، میں فوری طور پر کچھ نہیں کہہ سکتی، اچھی طرح سوچ بچار کے بعد ہی جواب دوں گی''۔ گل دتوڑ اس کے جارحانہ رویے پر خفا ہو کر بولی۔

''یعنی کہ میں یہ سمجھوں کہ تم ہمارے ساتھ اس قید خانے سے نہیں نکلنا چاہتیں؟'' گہنانم نے کہا۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ میں آزادی کی خواہاں ہوں مگر یہاں سے نکلنے کے بعد مجھے اپنی حفاظت کے بارے میں بھی سوچنا ہوگا، یوں بلا سوچے سمجھے یہاں سے نکلنا حماقت ہوگی''۔

''تم جاودانی آسمان کے سہارے سب چھوڑ دو۔ کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا''۔

''دیکھو اب تم جاؤ! کوئی نہ کوئی میرے لئے دوپہر کا کھانا لاتا ہی ہوگا''۔

''دوپہر کا.....؟'' گہنانم حیرت زدہ رہ گئی۔

''قیدیوں کو ایسے ہی کھانا دیا جاتا ہے''۔

''میں تمہارے جواب سے کیسے آگاہ ہوں گی؟''

''تم اپنے شکنان سے کہہ دینا کہ وہ جب رات کو نکلنے لگے تو میرے خیمے پر نگاہ ڈال لے، اگر خیمے کے دروازے پر سفید کپڑا لٹکا دکھائی دیا تو سمجھ لینا کہ میں رضامند ہوں، اس کے علاوہ مجھے اپنی حفاظت کے لئے لمبے پھل والا خنجر بھی درکار ہوگا''۔ گل دتوڑ اُسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

''مجھے امید ہے کہ تم ہمارے ساتھ جانے کا ہی فیصلہ کرو گی''۔ وہ مختصراً بولی اور خیمے کے دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ اس نے باہر جھانک کر گرد و نواح کا جائزہ لیا اور پھر تیزی سے باہر نکل گئی۔ گل دتوژ اس کے جانے کے بعد اس کی باتوں پر غور کرنے لگی۔ گہنانم کی سوچ کوئی انوکھی نہیں تھی، منگولوں میں بھی اکثر لڑکیاں اسی طریقے سے اپنے گھر والوں سے بغاوت کیا کرتی تھیں۔ گل دتوژ کو اس وقت آزادی کی ضرورت تھی تاکہ وہ اپنے نانا کی ناجائز ضد سے خود کو محفوظ کر سکے۔ گہنانم اس کے لئے وہی پیشکش لائی تھی جس کی اسے ضرورت تھی مگر وہ بلا سوچے سمجھے کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتی تھی کیونکہ اسے یہ خدشہ بھی لاحق تھا کہ کہیں یہ اس کے نانا کی ہی کوئی چال نہ ہو اور وہ اپنی ناکامی کی خفت مٹانے کیلئے اسے اپنی راہ سے ہی ہٹا دینے کے درپے ہو۔



رئیس العساکر جاشنگیر ایبک بلادِ مصر کے سیاہ و سفید کا مالک بن گیا تھا۔ الملک الاشرف موسیٰ محض نام کا سلطان تھا۔ جاشنگیر ایبک پہلا مملوک فرد تھا جسے اتنے وسیع اختیارات تفویض کیے گئے تھے۔ اس نے تیزی سے بگڑے ہوئے ملکی حالات کو سہارا دیا اور بلادِ مصر کے طول دارض میں امن کی فضا قائم کر دی۔ اسے کئی باغی ایوبی شہزادوں کی سرکوبی کی ضرورت بھی پیش آئی جو سلطانی کا دعویٰ لے کر اُٹھے تھے۔ اس کے دور میں مملوک امرأ کی جمعیت بہت زیادہ فعال ہو گئی تھی، اس نے فارس الدین اقطائی اور بیبرس کو اعلیٰ خدمات کے پیش نظر اعلیٰ مناصب پر لا بٹھایا۔ مصری امرأ کا دربار سلطانی میں اثر و رسوخ دن بہ دن کم ہو رہا تھا جس کی انہیں تشویش لاحق تھی، ان میں سے کئی جاشنگیر ایبک کی مخالفت میں اُٹھے مگر مملوک امرأ نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا، ان کی املاک ضبط کر لی گئیں اور ساتھیوں سمیت انہیں زنداں خانے میں ڈال دیا گیا۔ کچھ امرأ نے تو بھاری تاوان ادا کر کے زنداں خانے سے آزادی حاصل کر لی اور ہمیشہ اطاعت کرنے کا عہد لکھ دیا۔ جو ایسا نہ کر سکے، وہ ہمیشہ کے لئے زندا کے اندھیروں میں گم ہو گئے۔

نوعمر ایوبی سلطان الملک الاشرف موسیٰ عیش میں مبتلا رہا۔ اسے کبوتر بازی کے شوق نے گھیر لیا۔ شاہی محل اس کی خواہش پر کبوتر خانہ بن کر رہ گیا۔ مصری امرأ اپنے سلطان کے مشغلے کے لئے قیمتی اور نادر کبوتر ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے اور ان کی تعریف و توصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملا کر انعام و اکرام حاصل کرتے۔ شاہی خزانہ نوعمر سلطان کے اس فضول شوق پر بے دریغ اڑنے لگا۔

رئیس العساکر جاشنگیر یہ سب دیکھ رہا تھا مگر اس نے نوعمر سلطان کی تربیت و اصلاح کی جانب کبھی توجہ نہیں دی حالانکہ اس سے عہد لیا گیا تھا کہ وہ نوعمر سلطان کو اس قابل بنائے گا کہ وہ سلطنت کے نظام کو بخوبی چلا سکے۔ ملکہ شجرۃ الدر بھی یہ تماشا دیکھ رہی تھی اور اس نے اپنی دور بین نگاہوں سے ایوبی خاندان کے اقبال کا سورج غروب ہوتا دیکھ لیا تھا۔

649ھ میں الملک الناصر صلاح الدین یوسف نے صلیبی لشکروں کے ساتھ اتحاد کر کے بلادِ مصر پر دھاوا بول دیا۔ وہ بلادِ مصر کو بھی اپنی مملکت میں شامل کرنے کا خواہاں تھا۔ وہ بیس ہزار سپاہیوں کا لشکر لے کر بلادِ مصر میں داخل ہوا۔ جاشنگیر ایبک کو بروقت اطلاع مل گئی اور اس نے جوابی کارروائی کر کے غزہ کے مقام پر انہیں رکنے پر مجبور کر دیا۔ مملوک فوج کو الملک الناصر صلاح الدین یوسف سے زیادہ صلیبی سپاہیوں کی آمد پر غم و غصہ تھا۔ صلیبی سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد میدانِ جنگ میں مملوکوں کے غیض کی بھینٹ چڑھ گئی۔ صورتِ حال اپنے خلاف دیکھ کر انہوں نے میدان سے راہِ فرار اختیار کی، الملک الناصر کے پاس بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ مصالحت کر کے واپس لوٹ جاتا۔ اس جنگ میں بیبرس کی کارکردگی اتنی نمایاں تھی کہ اسے ترقی دے کر سو دستوں

کا سالار بنا دیا گیا۔ بیبرس کی ترقی پر فارس الدین اقطائی بے حد خوش ہوا، اس جنگ کی کامیابی کے بعد بیبرس کو باقاعدہ دربار میں عہدہ دیا گیا اور اس کی نشست لگائی گئی۔ الملک الناصر نے اس جنگ کو اپنے عم زاد بھائی الملک المعظم توران شاہ کے قتل کا بدلہ قرار دیا تھا مگر وہ بدلہ لینے میں ناکام رہا۔ اس بڑی جنگ کے بعد مصری امرأ کا جاشنگیر ایبک پر اعتماد بڑھ گیا۔ بہت سے ایسے امرأ جو دل میں اس کے لئے کینہ رکھتے تھے مخالفت سے باز آ گئے۔

650ھ میں دوسری بار الملک الناصر صلاح الدین یوسف ایک جرار لشکر کے ساتھ بلادِ مصر پر حملہ آور ہوا، وہ اپنی سابقہ ہزیمت کا ازالہ کرنا چاہتا تھا، جاشنگیر ایبک نے فارس الدین اقطائی کو سالارِ اعلیٰ بنا کر ایک بڑے لشکر کے ساتھ روانہ کیا۔ دونوں لشکروں میں لڑائی کا آغاز ہوا تو لاشوں کے انبار لگنے لگے، مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہنے لگا، صلیبی سپاہ اپنے عہد و پیمان کے مطابق پوری تندہی سے الملک الناصر کا ساتھ دے رہی تھیں۔ لڑائی طول کھینچنے لگی تو فارس الدین اقطائی نے بیبرس اور احمد چولاک کی مدد سے پے در پے ایسے حملوں کا سلسلہ شروع کیا کہ جلد ہی الملک الناصر کو اپنی کمزوری کا احساس ہو گیا۔ اس نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی افواج کو جوش دلاتا رہا مگر بیسویں دن کی لڑائی میں پانسہ پوری طرح اس کے خلاف پلٹ گیا۔ اس کی فوج کا ایک بڑا حصہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ مجبوراً اس نے پسپائی اختیار کی اور کئی منزلیں پیچھے ہٹ کر دوبارہ منظم ہونے لگا۔ وہ ابھی دوبارہ حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہا تھا کہ خلیفہ مستعصم باللہ نے مداخلت کرتے ہوئے جانبین کو جنگ بندی کا حکم دیا۔ دربارِ خلافت کی طرف سے قاضی عزالدین کو ثالث مقرر کیا گیا۔ ان کے فیصلے کے تحت دونوں فریقین نے آپس میں صلح کر لی اور بلادِ مصر کی حکومت کو دریائے اردن تک تسلیم کر لیا گیا۔ دونوں فریقین نے یہ عہد بھی کیا کہ وہ آئندہ صلیبیوں کے مقابلے میں متحد رہیں گے۔

652ھ میں ملکہ شجرۃ الدر نے شریک سلطان جاشنگیر ایبک سے تنہائی میں ملاقات کی اور اس کی توجہ نوعمر سلطان کی جانب مبذول کرائی کہ بیت المال کی رقم کو یوں برباد ہونے سے بچایا جائے، اور یہ بھی مشورہ دیا کہ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ تم سلطان الملک الاشرف موسیٰ کو معزول کر کے خود یہ عہدۂ سلطانی سنبھال لو، جاشنگیر ایبک نے اس ضمن میں مملوک و مصری امرأ اور مجلس انتخاب کی مخالفت کا خدشہ ظاہر کیا۔ ملکہ شجرۃ الدر نے اسے اپنی عسکری قوت کے استعمال کا مشورہ دیا۔ یہ بات جاشنگیر ایبک کے دل کو لگی اور اس نے خاص مملوک امرأ سے اس ضمن میں مشورہ کرنا شروع کر دیا۔ فارس الدین اقطائی نے ساتھ دینے کے لئے یہ شرط باندھی کہ اسے فوج میں نائب سالار بنایا جائے، جاشنگیر ایبک نے پانچ سو دستوں کی سالاری پر اسے راضی کر لیا۔ اسی طرح مختلف امرأ کی شرائط پوری کرنے کے وعدے پر ان کی وفاداریاں حاصل کر لی گئیں۔



اگلی صبح برقائی خان اپنے خیمے اکھڑوا کر چلنے کی تیاری کر رہا تھا، مطیع الدین کو ضرگا ی قبیلے نے اس کا گھوڑا واپس کر دیا تھا۔ ضرگا ی سردار بھی وہاں موجود تھا۔ اسی دوران نوئنا جوخان بھی وہاں چلا آیا۔ مطیع الدین رات کو ہی نوئنا جوخان سے ہونے والی بات چیت برقائی کے علم میں لا چکا تھا۔ برقائی خان اسے اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر متوجہ ہوا۔ نوئنا جوخان نے آ کر اسے حسب سابق تعظیم دی اور ساتھ چلنے کی اجازت طلب کی۔

''مجھے تمہیں ساتھ لے جانے میں کوئی تعرض نہیں، البتہ تمہیں اپنے والدین اور سردار سے اجازت لینا ہو گی''۔ برقائی خان نے جواب دیا۔

نوئنا جوخان رات ہی اپنے باپ کو اس سلسلے میں رضامند کر چکا تھا چنانچہ اس کا باپ تیزی سے آگے بڑھتا ہوا بولا۔ ''قاآن زادے! میری جانب سے اسے پوری اجازت ہے''۔

ضرگامی سردار نے بھی اس کی تقلید میں رضامندی کا اشارہ کیا۔

''ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں''۔

برقائی خان اپنا کام مکمل کر چکا تھا، ان لوگوں سے مصافحہ کرنے کے بعد اس نے روانگی اختیار کی۔ فونناجو خان کو ایک طاقتور گھوڑا فراہم کیا گیا تھا، جب وہ کود کر اس پر سوار ہوا تو گھوڑا بری طرح سے ہنہنا اُٹھا۔ مطیع الدین کی ہنسی چھوٹ گئی جبکہ برقائی خان اس کی جانب دیکھ کر مسکرانے لگا۔ ضرگامی لوگ بھی لطف اندوز ہوئے۔ فونناجو خان نے اچھی طرح سنبھل کر بیٹھنے کے بعد سب کی جانب حیرت بھری نگاہوں سے دیکھا اور معاملے کو سمجھ کر تھوڑا سا خفیف ہو گیا۔ برقائی خان نے نعرہ بلند کیا اور گھوڑوں کا یہ چھوٹا سا قافلہ ضرگامی بستی سے نکل کر اردوئے زریں کے دارالحکومت سرائے کی جانب بڑھنے لگا۔

اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی وہ اپنے طے کردہ مقام پر پہنچ گئے تھے، برقائی خان نے ایک چھوٹے سے چشمے کے دامن میں پڑاؤ ڈالا تاکہ شب بسری کی جا سکے۔ تمام سفر کے دوران کسی کو بھی بات چیت کرنے کا موقعہ نہ مل سکا تھا۔ فونناجو خان کی خاموشی مطیع الدین کو پریشان کئے دے رہی تھی۔ وہ اس کی جانب بڑھ آیا۔ سپاہی خیمے گاڑنے میں مصروف تھے جبکہ برقائی خان خیمے لگانے والوں کے پاس کھڑا انہیں ہدایات دے رہا تھا۔

''خیریت تو ہے، اتنی خاموشی......؟''

فونناجو خان نے سر اُٹھا کر اس کی جانب دیکھا اور دھیرے سے مسکرا دیا۔ اس نے انکار میں گردن ہلائی۔ ''کوئی بات نہیں خواہ مخواہ پریشان نہ ہو''۔

''تھک گئے ہو کیا؟''

''ہاں! گھوڑے کی پیٹھ پر کبھی اتنا طویل سفر نہیں کیا، اسی لئے تکان محسوس ہو رہی ہے''۔

''اسی لئے میں کہتا ہوں کہ وزن کم کرنے کی کوشش کرو، اگر ایسے ہی پھیلتے رہے تو..... ویسے مجھے اس گھوڑے پر بڑا ترس آ رہا ہے، سوچ رہا ہوگا کہ یہ مجھ پر کس جرم کی سزا لاد دی گئی ہے''۔

''تم بے فکر رہو! گھوڑے کو کچھ نہیں ہوگا، یہ بڑا سخت جان جانور ہے اور اگر اسے کچھ ہو بھی گیا تو تمہارا گھوڑا کس مرض کی دوا ہے''۔

''اچھا! ابھی تک تمہاری حریص نگاہیں میرے گھوڑے پر ہیں.....'' مطیع الدین آنکھیں نکالتا ہوا بولا۔

فونناجو خان اس کی بات پر دیدے مٹکانے لگا۔

''اپنے آپ میں رہو سمجھے! میں حجم کا لحاظ کئے بغیر ہی بھڑ پڑوں گا''۔

''مات کھا جاؤ گے مطیع الدین!''

''دوستوں میں مات کیسی؟'' مطیع الدین بگڑ کر بولا۔

فونناجو خان اس کی بات پر دانت نکالنے لگا۔ ''خود کو کمزور پا کر خوب آڑ نکالی ہے''۔

''دیکھو مجھے غصہ نہ دلاؤ......''

''اب تو میں یہ پوچھنے کا حق دار ہوں کہ بھائی خیریت ہے یوں آگ بگولا کیوں ہو رہے ہو؟''

مطیع الدین اس کی بات پر ہنسنے لگا۔ اسی دوران برقائی خان اس طرف نکل آیا۔ سپاہی خیموں کے کام سے فارغ ہو کر ان کیلئے کھانے کا بندوبست کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ برقائی خان کو دیکھ کر فونناجو خان یکلخت سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے تعظیم پیش کی۔ برقائی خان نے اس کی حرکت کو ناپسند کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو فونناجو! اس تعظیم وغیرہ کی مجھے کوئی حاجت نہیں۔ میں کوئی خود پسند یا خوشامد پرست شخص نہیں

ہوں کہ بار بار تعظیم کو ہضم کر سکوں، میں تمہیں آخری بار ہدایت کر رہا ہوں کہ یہ سلسلہ اب ختم ہو جانا چاہئے''۔

''ٹھیک ہے جیسے آپ کا حکم!''

''یاد رکھو کہ میں اپنے ساتھ لوگوں کا اجتماع صرف اس لئے نہیں رکھتا کہ مجھے اپنی ذات پر پورا بھروسہ ہے اور ان کی موجودگی میرے یقین کو کمزور کرتی ہے۔ میرے ساتھ جو بھی رہتا ہے وہ یا تو میرا دوست ہو سکتا ہے یا میرا بھائی! اس لئے تمہیں اس امر کا خیال رکھنا پڑے گا۔ اگر تم اس پر رضامند نہیں ہو تو تم مجھ سے آگے نکل جاؤ یا میرے پیچھے پیچھے سفر کرو، سرائے پہنچ کر مجھ سے رابطہ کر لینا میں تمہاری ہر جائز خواہش کو پورا کر دوں گا''۔

''میں اپنی حدود سے تجاوز نہیں کر سکوں گا''۔ فونناجو خان دوٹوک انداز میں بولا۔

''ٹھیک ہے تم میرے عقب میں یا آگے سفر کرو''۔ برقائی خان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''نہیں! یہ ہمارے ساتھ ہی سفر کرے گا''۔ مطیع الدین نے فوراً مداخلت کی۔

برقائی خان نے اس پر تیز نگاہ ڈالی۔ ''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں ان حرکتوں سے عاجز ہوں، مجھے ان سے گھن آتی ہے اور میرے ساتھ کوئی ایسا سلوک روا رکھے گا تو میں یہی سمجھوں گا کہ وہ مجھے چڑا رہا ہے''۔

''تم اس کی فکر مت کرو، میں اسے سمجھا دوں گا''۔ مطیع الدین نے اس کی حمایت کی۔ فونناجو خان خاموش کھڑا رہا۔

''دیکھو!'' برقائی خان نرمی سے بولا۔ ''میں قاآن زادہ ضرور ہوں مگر میں اب دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکا ہوں۔ میں سب لوگوں کو اپنے برابر سمجھتا ہوں۔ میں کسی سے افضل و اعلیٰ نہیں ہوں اور یہ عادت اسلام قبول کرنے سے پہلے بھی میرے اندر پائی جاتی تھی۔ اس پر میرا کوئی زور نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں ناراض کروں مگر یہ میری فطرت کا خاصہ بن چکی ہے''۔

''میں سمجھ رہا ہوں!'' فونناجو خان آہستگی سے بولا۔ ''میں پوری کوشش کروں گا''۔

برقائی خان تھوڑی دیر تک اسے سمجھاتا رہا پھر سپاہیوں کی جانب چلا گیا جہاں کھانا تیاری کے قریب تھا۔ مطیع الدین نے بھی فونناجو خان کو سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔



652ھ میں مجلس انتخاب اور امرا و عمائدین کے باہمی مشورے پر نوعمر سلطان الملک الاشرف موسیٰ کو منصب سلطانی سے معزول کرنے کا فیصلہ طے ہو گیا۔ نوعمر سلطان کو جب اس امر کی خبر ہوئی تو وہ خود اپنے خاص اعزا کے ساتھ وہاں چلا آیا اور اس نے استدعا کی کہ اسے یوں ذلیل و رسوا نہ کیا جائے بلکہ وہ خود کاروبار حکومت سے دست بردار ہو جائے گا۔ امرا نے اسے معزول کرنے کے بجائے اس کی درخواست کو منظور کیا اور اس نے بھرے دربار میں اپنی کم سنی اور امورِ اقتدار سے بے زاری کا عذر پیش کرتے ہوئے یمن کو روانگی کا مژدہ سنایا۔ ایوبی خاندان کے خیر خواہ امرا نے بہتیری کوشش کی کہ وہ اپنا فیصلہ واپس لے لے اور اپنا مستقبل تاریک نہ کرے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر اس پر کسی قسم کا دباؤ ہے تو وہ بیان کرے، اس کا سدباب کیا جائے گا۔ مگر سلطان اپنے فیصلے پر ڈٹا رہا اور اسی رات پوشیدہ طور پر یمن روانہ ہو گیا جہاں اس کے ننھیالی رشتہ دار موجود تھے۔ بلادِ مصر میں الملک الاشرف موسیٰ ایوبی خاندان کا آخری حکمران ثابت ہوا۔ اس نے جاشنگیر ایبک کے ساتھ چار سال تک مشترکہ حکومت کی۔ اس کی دستبرداری کے ساتھ ہی بلادِ مصر میں ایوبی خاندان کی حکومت کا باب ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

مجلس انتخاب نے طے شدہ منصوبے کے تحت تیسرے روز رئیس العسا کر جاشنگیر ایبک کو اپنا سلطان تسلیم

کرنے کا اعلان کیا۔ اسے الملک المعز کا خطاب دیا گیا۔ جانشگیر ایبک کا تعلق بحری ممالیک سے تھا، اس نے اقتدار سنبھالتے ہی بحری ممالیک کو اپنے زیادہ قریب کیا اور ان کے اثر و رسوخ کا دائرہ وسیع کر دیا۔ ملکہ شجرۃ الدر کے حسن اور اعلیٰ ذہانت سے وہ بے حد متاثر تھا۔ اس نے کوشش کی کہ کسی طرح ملکہ شجرۃ الدر اس کا مستقل ساتھ دینے پر رضامند ہو جائے۔ ملکہ شجرۃ الدر ایک عرصے سے شاہی وظیفہ پا رہی تھی، وظیفے کی رقم سے اس نے قاہرہ میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا اور اس کے پہلو میں مسجد کی تعمیر کرائی تھی۔ فارس الدین اقطائی نے سلطان الملک المعز کی خواہش اس کے گوش گزار کی جسے اس نے بڑی فراخ دلی سے قبول کر لیا۔

652ھ میں ملکہ شجرۃ الدر نے سلطان الملک المعز سے نکاح کر لیا اور ایک بار پھر عنانِ اقتدار کی شریک بن گئی۔ سلطان الملک المعز چونکہ بے حد شجاع اور سپاہی قسم کا شخص تھا اس لئے اس نے قصد کیا کہ وہ اپنی سلطنت کو وسعت دے۔ اس کی نگاہیں بلادِ شرقیہ و شام پر جا رکیں جہاں الملک الناصر صلاح الدین یوسف خود مختار سلطان تھا اور ماضی میں اس سے دو بار ہزیمت اُٹھا چکا تھا۔



برقائی خان کئی دن کی مسافت کے بعد اپنے چھوٹے سے قافلے کے ساتھ سرائے پہنچا۔ اس نے شاہی محل جانے کے بجائے شیخ نورالدین کے گھر کا رُخ کیا تاکہ مطیع الدین کو غم زدہ باپ سے ملا کر اس کے دل میں پیدا ہونے والی غلط فہمی کا ازالہ کر سکے۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو رخصت کیا اور فونکاجو خان اور مطیع الدین کے ساتھ نورالدین کے گھر چلا آیا۔ فونکاجو خان کافی حد تک بدل گیا تھا، اس نے کافی کوشش کے بعد خود کو یہ باور کرایا تھا کہ برقائی خان صرف شہزادہ ہی نہیں بلکہ اس کا دوست اور بھائی بھی ہے۔ نورالدین اپنے گمشدہ بیٹے کو طویل عرصے کے بعد سامنے پا کر بے خود سا ہو گیا، اس نے مطیع الدین کو بھینچ کر سینے سے لگا کر خود کو یقین دلایا کہ اس کے سامنے اس کا بیٹا حقیقتاً موجود ہے اور اس کی آنکھیں اسے جاگتے میں خواب نہیں دکھا رہیں۔ یقین آیا تو اس کا دل برقائی خان کے لئے شکر گزاری کے جذبات سے معمور ہو گیا۔ برقائی خان باپ بیٹے کے ملن سے روحانی خوشی محسوس کر رہا تھا جبکہ موٹا فونکاجو خان ایک جانب لاتعلق کھڑا عجیب نگاہوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ نورالدین نے ان سب کے لئے خاطر مدارات کا اہتمام کیا، وہ یوں بھاگ بھاگ کر ہدایات دے رہا تھا جیسے اس کی بوڑھی ہڈیوں میں پھر سے جوانی پلٹ آئی ہو، برقائی خان تکلفات میں نہیں پڑنا چاہتا تھا مگر وہ نورالدین کی اجازت کے بغیر وہاں سے رخصت بھی نہیں ہو سکتا تھا، مجبوراً وہ قہوے کے دور تک وہیں رُکا رہا۔ اس دوران کئی موضوعات چھڑے۔ نورالدین نے اچانک تونائی خان کے قتل کا معاملہ چھیڑ دیا جس میں برقائی خان کا نام لیا جا رہا تھا۔ مطیع الدین بھی تونائی خان کے نام پر چونک اُٹھا اور طرح طرح کے سوال کرنے لگا۔ برقائی خان تونائی خان کے قتل کے بارے میں جاننے کے بعد بخوبی سمجھ گیا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ قاآن اعظم باتو خان نے اسی مقصد کے لئے اسے منظر سے ہٹایا تھا کہ تونائی خان کو ٹھکانے لگایا جا سکے، جب نورالدین نے تونائی خان کے قتل کے الزام میں اس کی بیٹی گل دتوژ کی گرفتاری اور اچانک اغوا کے بارے میں بیان کیا تو مطیع الدین کا دل ایک لمحہ کے لئے اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ برقائی خان نے سنجیدگی کے ساتھ پورا واقعہ سنا، اسے قصر شاہی پہنچنے کی جو عجلت تھی وہ ختم ہو چکی تھی، کافی دیر تک ان کے درمیان گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ کچھ سوالات اُٹھتے تو پھر ان کی وضاحت کا آغاز ہو جاتا، اسی طرح شام کا وقت ہو گیا۔ برقائی خان نے فونکاجو خان کو مطیع الدین کے پاس قیام کرنے کی ہدایت دی اور خود شاہی محل کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ باتو خان سے اس سلسلے میں ضروری امور پر بات کرنا چاہتا تھا۔ مطیع الدین گل دتوژ کی گمشدگی پر گھلا جا رہا تھا، اگر کوئی اور موقعہ ہوتا تو شاید وہ اسی وقت گھر کی دہلیز عبور کر چکا ہوتا،

اتنے عرصے کے بعد گھر واپس لوٹنے پر وہ گھر والوں کے حصار میں پھنس کر رہ گیا۔ شیخ نورالدین اس دن خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا، فونکاجو خان کے لئے یہ سب کچھ نیا نیا سا تھا۔ وہ خاموشی سے سب کچھ دیکھتا رہا۔



ایک شام سلطان الملک المعز دربار کے شاہی امور سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو دربار کے باہر موجود محافظوں نے اسے اپنے نرغے میں لے لیا، یہ حفاظتی لحاظ سے ایک قدم تھا کہ کوئی سلطان کے قریب پہنچ کر اس پر حملہ آور نہ ہو جائے، سلطان اپنے محافظ دستے کے ساتھ ابھی چند قدم طے کر پایا تھا کہ سامنے کی جانب سے تیس آدمیوں کا ایک گروہ اس کی جانب بڑھا، وہ سب سفید لباس اور سفید عماموں میں ملبوس تھے، سلطان انہیں اچانک سامنے پا کر پریشان دکھائی دینے لگا، اس نے وہیں رُک کر محافظ دستے کے امیر کو ان کی جانب بھیجا کہ وہ ان سے آنے کی وجہ دریافت کریں، امیر نے انہیں کچھ دور روک کر وجہ دریافت کرنا چاہی کہ ان میں سے ایک شخص نے خنجر کے کاری وار سے اس کا کام تمام کر دیا۔ یہ دیکھ کر سلطان الملک المعز بوکھلا اُٹھا، اسے اتنے بڑے قدم کی توقع نہیں تھی، اس نے تیزی سے محافظ دستے کو ان پر حملہ کرنے کا حکم دیا اور خود ان کے بیچ میں سے نکل کر دربار کے صدر دروازے کے چبوترے پر جا کھڑا ہوا۔ محافظ دستہ جس کی تعداد چالیس کے لگ بھگ تھی اپنی اپنی تلواریں سونت کر ان پر حملہ آور ہو گیا۔ وہ گروہ پہلے ہی سے صورتِ حال کے مطابق منصوبہ بندی کر کے آیا تھا، انہوں نے محافظوں سے لڑائی میں پوری شجاعت و جانفشانی کا مظاہرہ کیا، تھوڑی ہی دیر میں محافظ دستہ کمزور پڑتا دکھائی دینے لگا، یہ دیکھ کر سلطان الملک المعز کی جان پر بن آئی۔ اس نے چبوترے پر کھڑے دیگر لوگوں کو مدد کے لئے پکارنا شروع کر دیا۔ دربار کافی دیر پہلے برخاست کیا جا چکا تھا اس لئے وہاں کوئی دوسرا شخص موجود نہیں تھا، اسی دوران ایک شخص اس گروہ کے عقب میں دربار کی جانب آتا دکھائی دیا۔ وہ شکل و صورت سے متوسط طبقے کا فرد معلوم ہوتا تھا، وہ جونہی اندر کی جانب مڑا تو وہاں کچھ لوگوں کو متصادم دیکھ کر ٹھٹک گیا، صورتِ حال کی نزاکت کا اندازہ کرنے میں اسے زیادہ دیر نہ لگی، اس نے اپنی تلوار نکالی اور نعرہ لگاتا ہوا تیزی سے سفید پوشوں کی جانب بڑھا۔ سفید پوشوں نے اپنے عقب میں نعرہ کی آواز سن کر ادھر توجہ کی اور وہاں صرف ایک شخص کو پا کر کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہ کیا۔ ان کی ساری توجہ شاہی محافظوں پر مرکوز تھی۔

اس شخص کے قریب پہنچنے پر ایک سفید پوش اپنے ساتھیوں سے الگ ہو کر اس کے مقابلے پر آیا۔ نووارد شمشیر زنی میں مہارت رکھتا تھا، اس نے چند ساعتوں میں ہی اس سفید پوش کا سر تن سے جدا کر دیا۔ یہ دیکھ کر سفید پوشوں نے اس پر پورے زور سے حملہ کر دیا، اب وہ بچے کھچے محافظوں اور نووارد دونوں سے نبرد آزما تھے۔ نووارد ایک عالی حوصلہ جوان تھا۔ اس کی ہمت و شجاعت دیکھ کر محافظوں کی کمزور پڑتی ہمت بھی بحال ہو گئی۔

سلطان الملک المعز یہ سب دیکھ رہا تھا، نووارد کی مہارت دیکھ کر اس کے لبوں سے بے اختیار تحسین آمیز جملے نکلنے لگے۔ چند ہی ساعتوں میں بازی پلٹ گئی، بائیس سفید پوش ہلاک کر دیئے گئے جبکہ آٹھ کو زخمی حالت میں گرفتار کر لیا گیا۔ محافظوں میں سے نصف سے زائد ہلاک ہوئے، نووارد کی اچانک آمد سے سلطان المعز کی جان بچ گئی تھی۔ یہ سفید پوش باطنی فدائی تھے جنہوں نے بلادِ مصر میں دوبارہ فاطمی حکومت قائم کرنے کی قسم کھا رکھی تھی، یہ لوگ ایسے ہی اچانک رئیسان و عمائدین سلطنت کو ہلاک کیا کرتے تھے، سلطان الملک المعز قاہرہ میں ان کی موجودگی سے بے خبر رہا جس کے باعث وہ ایک ناکام حملہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ گرفتار کئے گئے باطنی مجرموں کو سرِعام سزا دی گئی اور ان کی گردنیں اُڑا دی گئیں۔ باطنیوں سے فارغ ہو کر سلطان الملک المعز نے اس نووارد کو اپنے شاہی محل میں طلب کیا جس کی بروقت آمد کی بدولت وہ باطنی شر سے محفوظ رہا تھا۔ وہ اجنبی جب

اس کے سامنے لایا گیا تو اس نے تعظیم دی اور مؤدبانہ انداز میں کھڑا ہو گیا۔

''نوجوان! تم کون ہو؟'' سلطان نے سوال کیا۔

''سلطان محترم! میں ایک غلام ہوں، اور میرا نام محمود ہے۔ اپنے آقا احمد عبداللہ قطوزی کے ہمراہ یمن سے تجارت کی غرض سے یہاں آیا ہوں''۔

''تم اس وقت دربار کی جانب کیا کرنے آئے تھے؟'' سلطان الملک المعز نے سوال کیا۔

''میں اپنے آقا کی ہدایت پر آج صبح کچھ سامان بازار لے گیا تھا اور وہاں کے ایک تاجر سے بات چیت کے بعد اسے بیچ دیا، اس نے رقم کی ادائیگی میں کچھ مہلت طلب کی، میں نے اسے ظہر تک کی مہلت دی کہ اس کے بعد میرے آقا نے واپسی اختیار کرنا تھی، ظہر کی نماز کے فوراً بعد میں اس کے پاس پہنچا کہ رقم لے کر روانہ ہو سکوں تو اس نے بے ایمانی اختیار کی اور مجھ سے مال تک لینے سے منکر ہو گیا۔ میرے پاس اس کا لکھا ہوا ایک کاغذ محفوظ تھا جو اس نے صبح مجھے لکھ کر دیا تھا، میں نے اسے بار بار دیانت داری کی ترغیب دینا چاہی، مگر وہ آگ بگولا ہو کر میرے ساتھ لڑنے بھڑنے پر اتر آیا، یہ دیکھ کر میں شکایت کی نیت سے کوتوال شہر کے پاس پہنچا، اس نے سارا ماجرا سننے کے بعد اسی تاجر کی حمایت کی اور مجھے خاموشی سے واپس لوٹنے کا مشورہ دیا، میں نے وہاں سے نکل کر قاضی کے پاس شکایت کی کوشش کی مگر معلوم ہوا کہ وہ اپنے امور نمٹا کر گھر جا چکے ہیں، مجھے اس دوران اور کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا، اپنے آقا کو اس امر کی خبر دیتے ہوئے بھی شرمندگی محسوس ہو رہی تھی، میں نے سوچا کہ کیوں نہ دربار عالیہ سے براہ راست رجوع کروں، اسی نیت سے میں دربار کی جانب آ نکلا مگر وہاں کچھ اور ہی معاملہ پایا''۔

''میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تمہاری آمد سے فتنہ کا فوری سدباب ہو گیا ورنہ نہ جانے کیا ہو جاتا۔ میرے لئے تو تم مددِ خداوندی بن کر آئے ہو''۔ سلطان الملک المعز نے کہا۔ ''تم اس تاجر کا نام میرے حاجب کو لکھوا دو، میں اس معاملے کو خود دیکھوں گا، دوسرا اپنے آقا کی قیام گاہ کے بارے میں باخبر کر دو تا کہ اسے اطلاع پہنچائی جا سکے کہ تم اس وقت کہاں ہو؟''

محمود ایک یمنی رئیس احمد عبداللہ قطوزی کا غلام تھا جس نے اسے یمن کے بازار سے خریدا تھا اور تجارت کے لئے ان دنوں مصر آیا ہوا تھا۔ محمود کا تعلق خوارزم کے شاہی خاندان سے تھا اور وہ آخری سلطان جلال الدین خوارزم کا بھانجا تھا۔ تاتاریوں نے اسے نوعمری میں گرفتار کر کے دوسرے نوعمر قیدیوں کی طرح غلاموں کی منڈی میں بیچ ڈالا تھا۔ اس نے اپنے والدین کو تاتاریوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترتے دیکھا تھا اور تاتاریوں کی بربریت سے خوفزدہ تھا۔ احمد عبداللہ قطوزی کو اسے خریدنے کے بعد جب اس کے خاندانی پس منظر کا علم ہوا تو اس نے محمود کی تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور تمام دنیاوی و دینی علوم کی تعلیمات دلائیں۔ وہ اسے غلام سمجھنے کے بجائے بیٹوں کی طرح عزیز رکھتا تھا۔

سلطان الملک المعز نے احمد عبداللہ قطوزی کو طلب کیا اور تمام معاملے کی چھان بین ہونے کے بعد تاجر سے سامان کی رقم دلوائی اور تاجر پر بددیانتی کے جرم میں بھاری جرمانہ بھی عائد کیا گیا۔ سلطان الملک المعز غلام محمود کی شجاعت اور بہادری کو اپنی نگاہوں سے ملاحظہ کر چکا تھا اس لئے وہ اس سے خاصا متاثر تھا، اس نے احمد عبداللہ قطوزی سے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس غلام کا تعلق سلطنت خیوا کے شاہی خاندان سے ہے تو اس کے دل میں محمود کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی۔ اس نے اسی لمحے فیصلہ کر لیا کہ وہ اب اسے احمد عبداللہ قطوزی کے پاس نہیں رہنے دے گا لہٰذا ایک خطیر رقم کے عوض اس نے محمود کو خریدنے کا ارادہ ظاہر

کر دیا۔ احمد عبداللہ قطوزی سلطانوں کے مزاج سے خوب واقف تھا، وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے سلطان کے حضور تحفتاً پیش کرنے پر مجبور ہو گیا، وہ اسے بیٹوں کی طرح چاہتا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے انکار کی جرأت کی تو سلطانی مزاج برہم بھی ہو سکتا ہے لہٰذا محمود سے دستبرداری کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ سلطان نے اس کی دلجوئی کے لئے خاصی رقم نذر کی اور یوں محمود سلطان کے حاشیہ برداروں کی صف میں شامل کر دیا گیا، علوم دینی و دنیاوی میں خاص لیاقت رکھنے کے باعث جلد ہی محمود سلطان کا معتمد خاص بن گیا تھا، اس کا خاندانی نام سیف الدین بحال کیا گیا۔ اس نے اپنے نام سیف الدین کے ساتھ اپنی غلامی کی یادگار محمود کو بھی برقرار رکھا، سلطان الملک المعز اسے اکثر قطوزی کے نام سے بھی پکارا کرتا تھا جو کہ اس کے آقا کے قبیلے کا نام تھا۔ اس نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا بلکہ آقا کی نسبت کو بھی اپنے نام کے ساتھ جوڑ لیا۔ مملوک امرأ سیف الدین قطوزی کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے البتہ اس کی لیاقت و قابلیت کے معترف ضرور تھے۔

653ھ کے اواخر میں سلطان الملک المعز نے سیف الدین محمود قطوزی کی قابلیت و لیاقت کو دیکھتے ہوئے اسے اپنے بیٹے کم سن نور الدین کا اتالیق مقرر کیا۔ سیف الدین محمود کو جب یہ منصب حاصل ہوا تو اس کے اختیارات کا دائرہ مزید وسیع ہو گیا۔ وہ کچھ عرصے پہلے تک محض ایک بے اختیار غلام ہوا کرتا تھا مگر اب وہ مصری و مملوک امرأ کے طبقے میں سب سے زیادہ باعزت و بااختیار شخص بن چکا تھا۔ اکثر مواقع پر امرأ کی جماعت بھی اس کی مدد حاصل کرنے پر مجبور ہو جایا کرتی تھی۔



برقائی خان صورت حال کو مکمل طور پر سمجھ چکا تھا کہ اسے سرائے سے باہر بھیجنے کا اصل سبب کیا تھا۔ وہ نور الدین کے گھر سے نکلنے کے بعد سیدھا زرین خیل منگولوں کے قاآن اعظم اور اپنے بڑے بھائی باتو خان کے پاس چلا آیا۔ باتو خان اسے سامنے دیکھ کر جہاں خوش ہوا تھا وہیں اس کے چہرے پر پریشانی بھی بکھر کر رہ گئی تھی۔ برقائی خان کا چہرہ ہر طرح کے تاثر سے عاری تھا۔

''میں آپ سے صرف یہ جاننا چاہوں گا کہ آپ نے کس وجہ سے مجھے اتنی دور بھیجا تھا جبکہ وہاں آپ کے بیان کردہ حالات جیسی کوئی صورت حال نہیں تھی؟'' برقائی خان نے لب کشائی کی۔

''مجھے معلوم تھا تم آتے ہی پہلا سوال یہی کرو گے، مجھے تمہارے ساتھ روانہ کئے جانے والے امیر نے ساری صورت حال بتادی ہے، میں اسے محض غلط فہمی کا نتیجہ قرار دوں گا کیونکہ جن مخبروں نے یہ اطلاعات فراہم کی ہیں، ان کو گرفتار کر کے چھان بین کرنے کے بعد یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ ضرگامی باشندوں سے ذاتی عناد کے باعث ایسی خبریں دربار کو فراہم کرتے رہے ہیں تا کہ انہیں بغاوت پر آمادہ سمجھ کر ختم کر دیا جائے۔ میں نے حقیقت معلوم ہونے پر ضرگامی سردار کو اپنی غلط فہمی سے آگاہ کرتے ہوئے کچھ امداد بھی روانہ کی ہے''۔ باتو خان نے تفصیلاً اسے آگاہ کیا۔ برقائی خان نے اس کی بات پر تبصرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

''توتائی خان کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟''

''میرا خیال ہے کہ تمہیں اس معاملے کو دوبارہ کریدنے کی ضرورت نہیں ہے''۔

''بہرحال آپ نہ بھی بتائیں تو میں سمجھ چکا ہوں کہ اسے آپ کے اشارے پر ہلاک کیا گیا ہے اور اس کے قتل کا الزام اس کی بیٹی کے سر تھوپ کر اسے بھی ٹھکانے لگا دیا گیا ہے، مجھے یہاں سے نکلتے ہوئے کسی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا''۔

''سب ویسا نہیں ہے، جیسا تم سمجھ رہے ہو، توتائی خان خفیہ طریقے سے زرین خیل سلطنت کو ایک بڑی

پریشانی سے دوچار کرنے کی سازش کررہا تھا، اس نے کئی قبائل کو ساتھ ملا کر بغاوت پر اکسالیا تھا لہٰذا اس کا خاتمہ ضروری ہوگیا تھا۔ رہا اس کی بیٹی کا تعلق تو میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، اسے میرے اشارے پر گرفتار نہیں کیا گیا بلکہ وہ از قاقی قبیلے کے سردار مانجی خان کو زخمی کر کے واپسی پر سپاہیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئی تھی''۔

''اس کی بیٹی کو ناحق کس جرم کی سزا دی گئی؟''

''اس کی بیٹی کو کوئی سزا نہیں دی گئی بلکہ اسے قبیلہ سرخ غر کی استدعا پر ان کے حوالے کر دیا گیا ہے، آج کل وہ وہاں سلامت اور خوش ہے''۔

''میری معلومات کے مطابق اسے اچانک کچھ لوگوں نے اغوا کر لیا اور آپ کہہ رہے ہیں کہ وہ قبیلہ سرخ غر کے حوالے کر دی گئی''۔

''میں نے جو کچھ کہا ہے وہ بھی غلط نہیں، البتہ طریقہ کار کچھ مختلف اختیار کیا گیا ہے۔ تمہیں اس معاملے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اس طرح کے چھوٹے موٹے قضیے تو چلتے رہتے ہیں''۔ باتو خان نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''بہرحال آپ نے یہ اچھا نہیں کیا، میں تو نائی خان کے الزام کا جواب دینے کے لئے اس گمشدہ دوست کو ڈھونڈ لایا ہوں، میں اسے دربار میں ہی لاجواب کر دیتا، افسوس آپ نے کچھ جلدی کی''۔

''دیکھو برقائی خان!'' باتو خان تیز لہجے میں بولا۔ ''معاملہ اس مسلمان نوجوان کی حد سے بڑھ چکا تھا، تم صیغہ مخبری سے ساری تفصیلات معلوم کر سکتے ہو۔ دوسرے میرا مشورہ ہے کہ تم اس مسلمان دوست سے دور رہو، کہیں وہ بھی تمہاری دوستی کی زد میں نہ آجائے، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ قاآن اعظم منگو خان کا رویہ مسلمانوں کے حق میں کچھ زیادہ اچھا نہیں''۔

''اس کی رفاقت کو تو میں چھوڑ نہیں سکتا کیونکہ میں بھی مسلمان ہو چکا ہوں اور آپ کو بھی دعوت دیتا ہوں کہ دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں''۔

باتو خان، اپنے بھائی کی بات سن کر دم بخود سا رہ گیا۔ وہ حیرت سے اس کا چہرہ دیکھے جا رہا تھا۔

''یہ تم نے کیا کیا برقائی خان......؟'' وہ تاسف کے عالم میں اپنے ہاتھ ملنے لگا۔

''میں نے نہایت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے''۔

''تم نے مجھے بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے برقائی خان! میں اپنے باپ سے کئے گئے وعدے سے مجبور ہوں کہ ہر حالت میں اپنے بھائیوں کا خیال رکھوں گا ورنہ میں اسی وقت تمہارے قتل کا حکم جاری کر دیتا''۔ باتو خان غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔

''میں نے جو کرنا تھا کر دیا، اور آپ کو تنبیہ کر رہا ہوں کہ میرے فعل کی سزا اگر اس سلطنت کے ایک بھی مسلمان فرد کو دی گئی تو میں نافرمانی کرنے میں ذرا تساہل نہیں برتوں گا''۔

''تم میری نگاہوں کے سامنے سے ہٹ جاؤ برقائی خان!'' باتو خان آگ بگولا ہو کر بولا۔ برقائی خان نے اپنے بھائی کو مزید طیش دلانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہاں سے نکل کر اپنے شاہی محل کی جانب روانہ ہو گیا، وہ آنے والے ان لمحات کا منتظر تھا جو کوئی بڑا طوفان لانے والے تھے۔



سلطان الملک المعز بلادِ مصر کے اندرونی انتظام سے فارغ ہوا تو اسے بلادِ شرقیہ وشام کی فکر لاحق ہوئی، وہ اس کے اقتدار سے پہلے قاہرہ کے اطاعت گزار تھے، امیر حلب و دمشق الملک الناصر سلطان صلاح الدین

یوسف نے ملکہ شجرۃ الدر کے دور میں خود مختاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہاں اپنی آزاد حکومت قائم کر لی تھی، دو خونریز جنگوں کے بعد دربار خلافت نے ان دونوں کی حدود بھی متعین کر دی تھیں، سلطان الملک المعز اس کوشش میں تھا کہ کوئی ایسا جواز پیدا کیا جائے کہ سلطان الملک الناصر پر حملہ کیا جا سکے۔ سیف الدین محمود کے سامنے اس نے اپنی خواہش کا تذکرہ کیا تو اس نے الملک الناصر کے قریبی حریف سے تعلقات استوار کرنے کا مشورہ دیا۔ الملک الناصر کا دیرینہ اور قریبی حریف امیر موصل بدرالدین لولو تھا۔ یہ نصیر الدین زنگی کا غلام تھا، نصیر الدین زنگی نے امور حکومت اسے سونپ رکھے تھے۔ بدرالدین لولو اپنا دائرہ اقتدار بڑھانے کا خواہاں تھا، دوسرا کچھ امور پر اسے دربار خلافت سے بھی اختلاف تھا۔ وہ خلیفہ مستعصم باللہ سے عداوت رکھتا تھا، سلطان الملک المعز کو ایسے ہی شخص کی ضرورت تھی، اس نے بدرالدین لولو کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور کچھ ہی عرصہ میں یہ دوستی رشتہ داری میں بدل گئی، امیر موصل نے اپنی بیٹی کی شادی سلطان الملک المعز سے کر دی، بڑی دھوم دھام سے شہزادی لولو قاہرہ پہنچی، اس شادی کا سب سے زیادہ دکھ ملکہ شجرۃ الدر کو ہوا، اسے کچھ عرصے پہلے امور حکومت میں مداخلت سے منع کر دیا گیا تھا۔ وہ احساس کمتری میں مبتلا ہونے لگی، اس نے سلطان کے ارادے جان کر اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ امیر موصل کے ساتھ مل کر وہ جس خواہش کی تکمیل چاہتا ہے وہ بدعہدی قرار پائے گی، دوسرا امیر موصل کے ساتھ تعلقات بڑھانے پر دربار خلافت کوئی سخت قدم اُٹھا سکتا ہے مگر اس نے ملکہ شجرۃ الدر کی بات پر کان دھرنا مناسب نہیں سمجھا بلکہ الٹا ملکہ شجرۃ الدر کو اس کی حدود کی یاد دہانی کرائی۔ ملکہ شجرۃ الدر اپنی ناقدری پر کٹ کر رہ گئی۔ سلطان الملک المعز کے خلاف مملوک امرا کی ایک جماعت نے سر اُٹھانے کی کوشش کی، وہ ملکہ شجرۃ الدر سے عقیدت رکھتے تھے مگر سلطان الملک المعز نے بے دریغ دادودہش سے اس عقیدت کے جوش کو ٹھنڈا کر دیا۔ اس کے فوراً بعد ملکہ شجرۃ الدر کو امرا کو اپنی حمایت میں بھڑکانے کے جرم میں شاہی محل کے ایک کمرے میں نظر بند کر دیا گیا۔ شاہی کنیزوں کو اس کے پاس آنے جانے کی اجازت تھی لیکن اس کے اپنے کمرے سے باہر نکلنے پر کڑی پابندی عائد تھی۔



گل وتوڑ سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ اس موقعے کو گنوانا مناسب نہیں۔ اسی لئے اس نے سفید کپڑا دروازے پر ٹانگ دیا تھا۔ وہ اپنے فرار کے لئے کچھ ضروری تیاریاں کرتی رہی، نصف شب کے وقت اس کے خیمے کے قریب حرکت کے آثار نمودار ہوئے تو وہ سنبھل کر بستر پر بیٹھ گئی۔ چند ساعتوں کے بعد خیمے کا کپڑا ہٹا اور گمنام اندر داخل ہوئی، اس نے اپنا چہرہ ایک بڑے کپڑے سے چھپا رکھا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھی، خیمے میں دیئے کی لو روشن تھی۔

''تم نے صحیح فیصلہ کیا ہے گل وتوڑ! باہر شکنان موجود ہے، تم میرے ساتھ آؤ، قبیلے کے لوگ بے خبر ہیں، ہم بآسانی نکل جائیں گے اور باہر موسم میں خنکی زیادہ ہے لہٰذا بستر کی چادر ہی لپیٹ لو''۔ گمنام سرگوشی نما لہجے میں بول رہی تھی۔

''تم میری چیز لائی ہو؟'' گل وتوڑ نے پوچھا۔

''ہاں! یہ لو''۔ گمنام نے اپنے لبادے میں سے ایک لمبے پھل والا خنجر نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا۔ گل وتوڑ نے خنجر لے کر اپنے کمر بند میں اڑس لیا اور جسم کے گرد بستر کی چادر لپیٹ کر اس کے ہمراہ خیمے سے باہر نکل آئی۔ باہر تاریکی چھائی ہوئی تھی، شکنان نے شاید مشعلوں کو بھی گل کر دیا تھا۔ گمنام نے شکنان کے قریب پہنچ کر اسے ٹہوکا مار کر اپنی آمد سے آگاہ کیا۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولا بلکہ ہاتھ کے اشارے سے انہیں ایک جانب

بڑھنے کی ہدایت کی، وہ آگے آگے چل رہا تھا جبکہ وہ دونوں اس کے تعاقب میں تھیں، گل وتوژ پوری طرح چوکنا تھی اسے بار بار یہ خدشہ تنگ کر رہا تھا کہ کہیں یہ سب کسی سازش کا حصہ نہ ہو۔ تھوڑی دیر میں وہ بستی سے باہر نکل آئے، باہر پہنچ کر شکنان نے لب کشائی کی اور گہنانم کو کہا کہ وہ گل وتوژ سے معلوم کرے کہ اب ہمیں کس جانب چلنا چاہئے۔ گل وتوژ سرائے کی جانب جانے کا ارادہ کئے ہوئے تھی مگر وہاں اسے کوئی تحفظ نہیں مل سکتا تھا لہٰذا اس نے سرائے سے مخالف سمت میں چلنے کا اشارہ کیا، یہ اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں پہنچ جائے گی البتہ اسے اتنا اندازہ تھا کہ وہ اسی سمت میں سفر کرتی ہوئی منگولوں کی سرزمین سے دور نکل جائے گی۔ شکنان نے مطلوبہ سمت کا اشارہ پا کر پیدل ہی سفر شروع کیا۔ وہ تینوں تیز قدموں سے بستی سے دور ہوتے جا رہے تھے، گل وتوژ دھڑکتے ہوئے دل سے چلتی رہی، اس کے خدشات وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ معدوم پڑنے لگے۔ رات کا تمام حصہ اسی سفر میں بیت گیا، صبح کا اجالا انہیں سرخ غر کی بستی سے کافی دور لے آیا تھا مگر وہ ابھی بھی ان کی رسائی کی حد میں موجود تھے۔ صبح کے وقت گہنانم نے مزید چلنے سے انکار کر دیا، وہ نیند اور تکان کے غلبے سے بے حال ہو رہی تھی جبکہ شکنان کا چہرہ تکان کے آثار سے پاک تھا۔ گل وتوژ بھی نیند کے غلبے میں تھی مگر وہ اندیشوں میں گھری نیند کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ شکنان گہنانم کے آگے بے بس سا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے ایک چھوٹا سا غار تلاش کر کے وہیں کچھ دیر آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔ شکنان اس دوران جنگل سے لکڑیاں اکٹھی کر لایا۔ لکڑیاں گیلی تھیں مگر شکنان نے انہیں بہت جلد ہی سلگا لیا تھا، لکڑیوں کی آگ سے غار میں گرمی پیدا ہونے لگی، گہنانم تو غار میں داخل ہوتے ہی لیٹ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کے خراٹے غار میں گونجنے لگے جبکہ گل وتوژ آگ کے قریب بیٹھی رہی، شکنان غار کے دروازے پر موجود رہا تا کہ باہر کی نگرانی کر سکے۔ گل وتوژ نے شکنان کی صورت صبح کے اجالے میں پہلی بار دیکھی تھی، وہ صورت سے منگول نہیں دکھائی دیتا تھا بلکہ اس کے نقوش مطیع الدین سے ملتے جلتے تھے، گل وتوژ نے یہی اندازہ لگایا کہ یہ کسی مسلمان کی اولاد ہے جو سرخ غر کے ہاتھ لگی ہے۔ گل وتوژ سونا نہیں چاہتی تھی مگر نیند کے غلبے کے آگے اس کا بس نہیں چل سکا اور وہ نیند کی گہرائیوں میں ڈوب گئی۔

جانے وہ کب تک سوتی رہی تھی، اسے خود بھی اندازہ نہیں ہوا جسم کے سرد پڑنے پر اس کی آنکھ کھلی، وہ ابھی تک غار میں ہی موجود تھی، پورا غار تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ رات جلائی گئی آگ بھی ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ وہ پریشانی کے عالم میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے گہنانم کو آواز دی مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے تیزی سے اپنی کمر پر ہاتھ مارا تو وہاں اڑسے ہوئے خنجر کو موجود پایا۔ اس نے چادر کو اچھی طرح سے جسم پر لپیٹا اور اِدھر اُدھر ٹٹول کر غار کا جائزہ لینے لگی۔ تھوڑی دیر میں اس کا خیال حقیقت میں بدل گیا کہ غار میں اب کوئی موجود نہیں تھا۔ گہنانم اور شکنان اسے تنہا چھوڑ کر فرار ہو چکے تھے۔ اچانک اس کے ذہن میں خیال پیدا ہوا کہ کہیں باہر سے غار کا منہ تو بند نہیں کر دیا گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی مگر تاریکی اس قدر گہری تھی کہ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی غار کے منہ کی جانب بڑھنے لگی جہاں اسے تاریکی ہی تاریکی دکھائی دے رہی تھی۔



ملکہ شجرۃ الدر نے نظر بندی کے دوران اپنی کنیزوں میں سے ایک کو فارس الدین اقطائی کے پاس روانہ کیا کہ وہ چپکے سے اسے حقیقت حال بتائے اور ملاقات کا پیغام دے۔ فارس الدین اقطائی مملوک امرا میں سب سے ممتاز اور بااختیار فرد تھا۔ وہ ملکہ شجرۃ الدر کی بے حد عزت کرتا تھا اور اس کی لیاقت و فراست کا تہہ دل سے

قائل تھا۔ اسے جب ملکہ شجرۃ الدر کا حال معلوم ہوا تو اسے بڑا دکھ ہوا، وہ سلطان الملک المعز کے پاس آیا اور دبے الفاظ میں ملکہ شجرۃ الدر کی بے حرمتی کا شکوہ کیا۔ سلطان الملک المعز نئی ملکہ لولو کا دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے فارس الدین اقطائی کے سامنے ملکہ شجرۃ الدر کے عیوب کا دفتر کھول دیا۔ فارس الدین اقطائی نے ہر چند کوشش کی کہ سلطان الملک المعز ذہین ملکہ سے بے اعتنائی نہ برتے مگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ فارس الدین اقطائی نے ایک دن موقع محل دیکھ کر شاہی محل کی راہ لی اور خفیہ راستے سے ملکہ شجرۃ الدر کے پاس پہنچا۔ ملکہ شجرۃ الدر نے اسے سامنے دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ احوال و شکایات کے سلسلے کے بعد ملکہ شجرۃ الدر اپنے مقصد پر آ گئی جس کے لئے اس نے فارس الدین اقطائی کو بلوایا تھا۔

''اقطائی! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے''۔

''میں ملکہ عالیہ کا ہر حکم بجا لانے کو تیار ہوں، آپ بلا خوف کہئے''۔

''جاشنگیر ایبک کے رویئے نے مجھے بے حد صدمہ پہنچایا ہے لہٰذا میں نے طے کیا ہے کہ اُسے اس کے کئے کی سزا دی جائے، اس سلسلے میں مجھے تمہاری مدد درکار ہے''۔

''اگر ملکہ عالیہ کا اشارہ اس کے قتل کی جانب ہے تو میں اس سلسلے میں مدد سے معذرت چاہوں گا بلکہ ملکہ کو توران شاہ کے قتل پر کہے جانے والے الفاظ یاد دلانے کی جرأت کروں گا''۔

''تم میری مدد کو غلط رنگ نہ دو، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ توران شاہ کے قتل پر میں نے کیا کہا تھا۔ میں تم سے صرف تھوڑی سی مدد کی طالب ہوں، اس میں صرف سزا مقصود ہے نا کہ قتل......''

''میں ملکہ عالیہ کی ہر جائز مدد کرنے کو تیار ہوں''۔ فارس الدین اقطائی نے حامی بھری۔

''مجھے جاشنگیر ایبک کے کچھ معمولات سے آگاہی درکار ہے، مجھے امید ہے کہ تم مجھے وہ فراہم کرو گے''۔

''کیسے معمولات؟...... میں کچھ سمجھا نہیں''۔

''یہی کہ سلطان، سونے کے لئے کب جاتا ہے، غسل کے اوقات کیا ہیں، کھانا کس ساعت میں کھاتا ہے، اور یہ کہ تمام معمولات میں کون سے مقامات استعمال کئے جاتے ہیں''۔

''یہ سب تو آپ کو معلوم ہونا چاہئے، میں کیسے یہ سب معلوم کر سکتا ہوں؟'' فارس الدین اقطائی حیرانگی سے اس کی صورت دیکھ رہا تھا، وہ ملکہ شجرۃ الدر کا ارادہ نہیں سمجھ پایا تھا۔

''مجھے جب معلوم تھے تب تھے، اب کے معمولات کے بارے میں، میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے ان کی خبر درکار ہے، کیا تم یہ کر سکتے ہو؟''

''محل کے اندر کے معمولات تو ممکن نہیں البتہ باہر کے معمولات سے آگاہ کرتا رہوں گا، یہ وعدہ کرتا ہوں''۔ فارس الدین اقطائی بولا۔

''مجھے تم سے یہی امید تھی''۔

''میں ابھی تک آپ کا مقصد نہیں سمجھ پایا''۔

''وقت آنے پر سمجھ جاؤ گے، تم اب جا سکتے ہو''۔ ملکہ شجرۃ الدر نے اسے رخصت کیا، اس کے جانے کے بعد ملکہ شجرۃ الدر کے چہرے پر بشاشت سی پھیل گئی۔ وہ جو کرنا چاہتی تھی کہ اس کا ایک مرحلہ طے ہو چکا تھا۔ وہ اب تیزی سے دوسرے مرحلے کی جانب بڑھنے کا سوچ رہی تھی۔ وہ سلطان الملک المعز کو ایسی سزا دینا چاہتی تھی کہ وہ نہ جی سکے اور نہ ہی مر سکے۔ یہ ملکہ شجرۃ الدر کا انوکھا انتقام تھا جو تاریخ کے اوراق پر ایک نئی روایت ثبت

کرنے والا تھا۔



کئی دن گذر چکے تھے مطیع الدین کی ملاقات برقائی خان سے نہیں ہو پائی تھی۔ وہ سرائے واپس لوٹنے کے بعد برقائی خان کے بیان کردہ خدشے کے سلسلے میں کافی پریشان تھا۔ تونائی خان کے پراسرار قتل کے باعث وہ ایک بار بھی اس کے گھر کی حدود میں داخل نہیں ہو پایا۔ گل دتوژ کی گمشدگی بھی حیرت سے کم نہیں تھی۔ اس نے اپنے تئیں گل دتوژ کو تلاش کرنے کی کوشش بھی کی مگر سب بھاگ دوڑ لاحاصل رہی۔ گل دتوژ کا کوئی پتہ نہیں چل سکا، تونائی خان کے گھر میں چھائی ہوئی اطمینان کی فضا اُسے بار بار کھٹک رہی تھی۔ اسے اس امر پر حیرت تھی کہ تونائی خان کی بیٹی کو سرِ بازار کچھ لوگوں نے اغوا کر لیا اور اس کے بھائیوں اور ماں کو اس بارے میں ذرا بھر بھی پرواہ نہیں تھی۔ کہیں نہ کہیں دال میں کچھ کالا ضرور تھا۔ اس نے اپنی جستجو کو تیز تر کر دیا۔ اس کے ذہن میں مبہم سا خیال یہ بھی پیدا ہوا کہ ان لوگوں نے اغوا کا ڈرامہ رچا کر خود اسے کہیں چھپا رکھا ہے۔ وہ گل دتوخ کے بارے میں جاننے کے لئے ایک دفعہ اس کے گھر میں سابقہ انداز میں داخل ہوا مگر اسے اس بارے میں کوئی بات معلوم نہ ہو سکی۔ اس نے کھوج لگانے کی خاطر تونائی خان کے پرانے ملازم یاغی سے تعلقات بڑھائے۔ وہ اکثر بیشتر اس کے ساتھ رہتا اور مختلف امور پر گپ شپ لگاتا۔ یاغی اپنے مالک کے قتل کے بعد ٹوٹ سا گیا تھا۔ تونائی خان کے بیٹوں نے بھی اسے بوڑھا جان کر نظر انداز کر دیا تھا۔ ان کی بے مروتی اور بے اعتنائی نے اسے مزید دل شکستہ کر ڈالا۔ مطیع الدین کے ساتھ گفتگو کرنے سے اسے کچھ حوصلہ ہوا۔ وہ ترنگ میں آ کر اپنے مالک کے بے شمار واقعات سناتا۔ مطیع الدین اس کی باتوں سے کبھی کبھی اکتا بھی جاتا مگر اس نے ہمت نہیں ہاری کیونکہ وہ اس سے گل دتوژ کا پتہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ وہ براہِ راست صرف اس لئے نہیں پوچھنا چاہتا تھا کہ یاغی کسی شک میں مبتلا ہو کر اس کی رفاقت کو ترک نہ کر دے۔

ایک دن یاغی شام کے وقت مطیع الدین کے پاس چلا آیا۔ اس دن اس کی حالت کافی خراب تھی۔ مطیع الدین اس کا چہرہ دیکھ کر پریشان سا ہو گیا۔ یاغی کی آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔ سارا چہرہ پسینے سے شرابور تھا۔ سرائے شہر دنیا کے اس خطے پر واقع تھا جہاں گرمی کبھی کبھار ہی آیا کرتی تھی۔ سرد علاقے میں پسینے کو دیکھ کر مطیع الدین کافی حیران بھی ہوا۔ یاغی کا ستا ہوا چہرہ کچھ دیر کے بعد بحال ہوا تو مطیع الدین نے اس کی متغیر حالت کی وجہ دریافت کی۔

''جاودانی آسمان کی قسم!'' یاغی گہری سانس لے کر بولا۔ ''میرا آقا بڑا سخت گیر اور جلد برہم ہو جانے والا شخص تھا مگر اس نے بھی کبھی میرے ساتھ ایسی زیادتی نہیں کی جیسی آج میرے ساتھ ہوئی ہے''۔ مطیع الدین کو اس کے بولنے کے انداز سے معلوم ہو گیا کہ وہ آج شراب پئے ہوئے ہے۔

یاغی کچھ دیر تک خاموش رہا اور خود ہی بولا۔ ''اوطائی خان مجھے ناکارہ اور اناج پر بوجھ قرار دیتا ہے، بھلا اس سے کوئی پوچھے کہ یہ سامانِ عیش و عشرت کہاں سے آیا ہے؟ تونائی خان کو اس کے باپ نے ترکے میں صرف غریبی دی تھی۔ یہ شان و شوکت اسے میری بدولت ملی ہے۔ میں نے اسے جگہ جگہ مشورے دیئے، میری رہنمائی سے وہ بڑے قاآن کے پاس گیا تھا۔ میری ذہانت اس کی کامرانی کے پیچھے کارفرما تھی۔ وہ برقائی خان کو ذلیل کرنا چاہتا تھا تو میں نے ہی اسے راہ سجھائی تھی۔ وہ گل دتوژ کو اس مسلمان کے چنگل سے چھڑانا چاہتا تھا تو بھی میرے ہی مشورے اس کے کام آئے تھے''۔

مطیع الدین اس کی بات پر چونک پڑا۔ برقائی خان اور گل دتوژ کے ناموں نے اس کا پورا وجود ہلا ڈالا

تھا۔ وہ بے تابی سے بولا۔ ''برقائی خان نے تمہارے آقا کا کیا بگاڑا تھا؟''

''برقائی خان!'' وہ پھنکار کر بولا۔ ''اس نے میرے مالک کی سرِ دربار بے عزتی کی اور گل دتوژ کو مجرم ٹھہرایا کہ اس کے باعث اس کا دوست کسی مشکل کا شکار ہو چکا ہے۔ تونائی خان سرِ دربار اپنی بے عزتی پر تلملا گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ برقائی خان کو کسی ایسے جال میں پھنسائے کہ باتو خان بھی چوکڑی بھول جائے۔ وہ شاہی خاندان کو تباہ و برباد کر دینا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے وہ خود باتو خان کا شکار بن گیا''۔

''میں کچھ سمجھا نہیں! میں نے تو سنا ہے کہ تمہارے مالک کو گل دتوژ نے قتل کیا تھا''۔

''یہ سب جھوٹ ہے، تونائی خان کی قاتل اس کی بیٹی ہوتی تو اب تک موت کے گھاٹ اتار دی گئی ہوتی، اسے یوں پراسرار انداز میں قبیلہ سرخ غر میں غائب نہ کر دیا جاتا۔ باتو خان نے ہی تونائی خان کو قتل کرایا تھا اور خاموشی کی قیمت بھی چکا دی تھی۔ گل دتوژ اسی کی مرضی سے غائب کی گئی تھی۔ بھلا تم خود سوچو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوتوال کے ہاتھوں سے مجرم چھین لیا جائے اور چھیننے والے کا نشان بھی نہ مل سکے''۔

مطیع الدین کا چہرہ فرطِ جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔ جو سوال اسے کئی دنوں سے ستا رہا تھا، وہ خود بخود اس کے سامنے جواب بن کر آ گیا تھا۔ مطیع الدین نے ذرا کھل کر اس موضوع پر بات شروع کر دی۔ کچھ ہی دیر میں اسے یاغی کے منہ سے قبیلہ سرخ سے تونائی خان کی رشتہ داری اور گل دتوژ کا منک آنہ کی تحویل میں ہونے کا حال معلوم ہو گیا۔ یاغی کافی دیر تک شراب کے نشے میں بہکا بولتا رہا۔ جب اس کی ہمت جواب دے گئی تو اس کا سر ایک جانب ڈھلک گیا۔ وہ نشے کے باعث بے ہوش ہو چکا تھا۔ مطیع الدین نے اسے سیدھا کر کے بستر پر لٹا دیا۔ اس کا باپ شیخ نور الدین اس دن گھر میں نہیں تھا ورنہ شاید وہ یاغی کو اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت بھی نہ دیتا۔ شیخ نور الدین شراب اور شرابی دونوں سے دور بھاگتا تھا۔ یاغی کے ذہن پر شراب اور صدمے کا ایسا گہرا اثر ہوا تھا کہ وہ بہت سی ایسی باتیں مطیع الدین سے کہہ گیا جنہیں عالمِ ہوش میں وہ شاید کبھی زبان پر نہ لاتا۔ اس نے بڑی سوچ و بچار کے بعد یاغی کو ہی استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یاغی کا بڑھاپا اور کمزور قوتِ ارادی ہی اس کے کام آئی۔ وہ اب قبیلہ سرخ غر کی جانب روانگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ وہی قبیلہ تھا جہاں وہ ایک بار پہلے بھی ایک قیدی کی حیثیت سے پہنچا تھا اور وہ لوگ اس کی موت کا فیصلہ کر چکے تھے مگر تقدیر کے پلٹے نے اسے نہ صرف ان کے چنگل سے بچا لیا بلکہ ایک طویل عرصے کے لئے ویرانوں کی جانب دھکیل دیا تھا۔ ایک بار پھر اسی منزل کی جانب سفر کی خواہش سر اُٹھا رہی تھی۔ پہلی بار تو وہ غفلت کے عالم میں وہاں پہنچا تھا مگر اب وہ پوری تیاری سے وہاں جانا چاہتا تھا۔ قبیلہ سرخ غر کا کچھ قرض باقی تھا جو اسے چکانا بھی تھا۔



سلطان الملک المعز نے حاجب کا عہدہ مصری امیر فخر الدین کو دیا تھا۔ یہ عہدہ نہایت کلیدی اہمیت کا حامل تھا۔ سلطان تک براہِ راست رسائی حاجب کو حاصل تھی۔ اس کے علاوہ بہت سارے معاملات میں حاجب خود مختار ہوتا۔ یہ ایک طرح کی وزارتِ اعلیٰ تھی اس عہدے پر خصوصاً مصری امیر کی تقرری اس بات کا بین ثبوت تھی کہ سلطان الملک المعز یک لخت عنانِ اقتدار کا رخ ممالیک کی جانب نہیں موڑنا چاہتا تھا۔ مصری رعایا کو سلطان صلاح الدین ایوبی سے بڑی محبت تھی اور وہ یقین رکھتے تھے کہ مصر کی حفاظت اس کے خاندان کے علاوہ کوئی اور نہیں کر پائے گا۔ سلطان الملک المعز کے اقتدار سنبھالنے پر بھی بڑا شور اُٹھا تھا مگر سلطان الملک المعز کی سخاوت، داد و دہش اور مصری امیر فخر الدین کے تقرر نے اس شور و غلغلے کو کافی حد تک دبا دیا تھا۔ امیر فخر الدین نے اپنے ہم قوم لوگوں پر بے شمار عنایات کرتے ہوئے اپنی جگہ بنائی تھی۔

حاجب امیر فخر الدین نے اپنی بڑائی اور شہرت کی خاطر جامع مسجد عمرو بن عاصؓ کے سامنے ایک بڑا بالا خانہ بنوایا۔ اس بالا خانہ کی تعمیر کے بعد اس نے باقاعدہ اس جگہ کو اپنا دفتر قرار دیا۔ اس بالا خانے میں کسی بھی وقت کسی کی بھی آمد و رفت پر کوئی پابندی نہیں تھی، اس لئے وقت بے وقت لوگ اپنی اپنی حاجتیں لے کر یہاں جمع ہوتے۔ بسا اوقات حاجب دیگر معاملات کے باعث وہاں پہنچ نہ پاتا تو لوگوں کی بڑی تعداد اس کے انتظار میں جمع ہو جاتی۔ جامع عمرو بن عاصؓ میں نمازیوں کو اس مجمع سے تکلیف پہنچی تو انہوں نے امیر فخر الدین سے شکایت کی کہ مسجد کے باہر لوگ کثیر تعداد میں جمع ہو کر اتنا شور و غل مچاتے ہیں کہ نماز پڑھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ امیر فخر الدین نے اس معاملے پر توجہ کرتے ہوئے وہاں ایک بڑا طبل نصب کروا دیا۔ تمام لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ جب تک نوبت کی آواز نہ سن لیں وہاں کا قصد نہ کریں۔ نوبت کی آواز دراصل امیر فخر الدین کی آمد کی علامت تھی۔ یہ سلسلہ دو چار روز تک ہی جاری رہا کہ نمازیوں کو شور و غل سے زیادہ طاقتور نوبت کی آواز نے عاجز کر دیا۔ حاجب امیر فخر الدین دن کے مختلف اوقات میں وہاں پہنچتے اور پھر کچھ دیر تک نوبت بجائی جاتی۔ نمازیوں نے جمع ہو کر اس امر کے خلاف قاضی القضاۃ کے پاس مقدمہ درج کرا دیا۔ قاضی القضاۃ کے عہدے پر شیخ عز الدینؒ بن سلام دمشقی فائز تھے۔ انہوں نے بڑے تحمل سے تمام واقعہ سنا اور اس کے بعد اس نوبت کو اسی وقت توڑنے کا فیصلہ سنا دیا۔ کوتوال شہر کو ہدایت کی گئی کہ وہ اس نوبت کو توڑنے کے لئے سپاہی ساتھ لے کر جائے اور جو کوئی مداخلت کرے اسے گرفتار کر لیا جائے۔ حاجب امیر فخر الدین کو آمرانہ روش کے اختیار کرنے پر انہوں نے ناقابل شہادت قرار دیا۔ یہ اپنے وقت کا بہت بڑا فتویٰ تھا کہ کسی شخص کے احکام و اقوال کو ناقابل اعتبار قرار دے دیا جائے۔ یہ فیصلہ سنانے پر کئی امراء نے انہیں کڑے انجام سے ڈرانا چاہا مگر انہوں نے کسی کی پرواہ نہیں کی۔ وہ کچھ دیر تک دوسرے امور میں مصروف رہے۔ جب فراغت ہوئی تو کئی احباب نے فیصلے کے پہلے حصے کو برقرار رکھنے اور دوسرے کو متروک قرار دینے کی سفارش کی مگر انہوں نے اس جانب توجہ نہیں دی۔ احباب کے بار بار تنگ کرنے پر شیخ عز الدینؒ نے محسوس کیا کہ وہ فرائض منصبی کو بھرپور انداز میں ادا نہیں کر سکیں گے اور امیر فخر الدین بھی ان پر دباؤ ڈالے گا لہٰذا انہوں نے چند ساعتوں میں فیصلہ کرتے ہوئے عدالت کے آخری وقت میں اپنے مستعفی ہونے کا اعلان کیا اور گھر کی جانب چلے گئے۔

امیر فخر الدین کو جب اس بابت معلوم ہوا تو وہ تلملا اُٹھا۔ اسے نوبت کی کوئی پرواہ نہیں تھی مگر خود کو ساقط شہادت قرار دیئے جانے پر بے حد غصہ تھا۔ اس نے فوراً شیخ عز الدینؒ کو حاضر کرنے کا حکم جاری کیا مگر جب اسے یہ بتایا گیا کہ وہ قاضی القضاۃ کے عہدے سے استعفیٰ دے کر گھر لوٹ گئے ہیں تو وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ یہ خبر اتنی تیزی سے پھیلی کہ شام ہونے سے پہلے ہی سلطان الملک المعز تک جا پہنچی۔ اُسے جب تمام معاملہ کا علم ہوا تو وہ خود ننگے پاؤں بھاگتا ہوا شیخ عز الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

الملک الصالح سلطان نجم الدین ایوب کے تربیت یافتہ ممالیک پر شیخ عز الدینؒ کا ایسا گہرا اثر تھا کہ وہ انہیں ذرا سی تکلیف پہنچنے پر شدید ردعمل کا اظہار کرتے تھے۔ ممالیک انہیں اپنا مذہبی رہنما قرار دیتے تھے۔ شیخ عز الدینؒ کے پاس رات کی مجالس میں کئی بڑے مملوک امراء حاضری دیا کرتے تھے ان میں بیبرس بندقداری بھی شامل تھا۔ بیبرس نے یوں تو فقہ و حدیث کی کافی تعلیم حاصل کر رکھی تھی مگر اسے صحیح معنوں میں نکھارنے اور سنوارنے میں شیخ عز الدینؒ کا بڑا ہاتھ تھا۔

سلطان الملک المعز نے شیخ عز الدینؒ کے پاس پہنچ کر حاجب کے بارے میں اپنی اس غفلت پر معذرت کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ اپنے استعفیٰ کو واپس لے کر منصب قاضی القضاۃ پر قائم رہیں۔ شیخ عز الدینؒ

نے اپنے احکامات کی عدم بجا آوری کا عذر پیش کیا تو وہ خود جامع عمرو بن عاصؓ پہنچا اور امیر فخر الدین کے بالا خانے میں موجود اس نوبت کو گرانے میں بطور مزدور شامل ہوا۔ حاجب امیر فخر الدین کو جب سلطان الملک المعز کے اس فعل کی خبر ہوئی تو اسے اپنا عہدہ ہاتھ سے نکلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ اپنے گھر میں چھپ کر بیٹھ گیا نوبت کے گرائے جانے کے بعد سلطان الملک المعز مٹی سے اَٹے ہوئے کپڑوں میں شیخ عز الدینؒ کی خدمت میں پہنچا اور ان کے حکم کی بجا آوری کی خبر دی۔ شیخ عز الدینؒ اس کی حالت دیکھ کر مجبور ہو گئے کہ منصب قاضی القضاۃ دوبارہ قبول کر لیں۔ اس واقعے کی خبر اتنی پھیلی کہ وہ بغداد جا پہنچی۔ خلیفہ مستعصم باللہ نے اس واقعے کو سننے کے بعد شیخ عز الدینؒ کی جرأت مندی کو سراہا۔

سلطان الملک المعز نے حاجب امیر فخر الدین کو محض متنبہ کرنا مناسب خیال کیا۔ کچھ دنوں کے بعد امیر فخر الدین کو چند پیغامات امیر المومنین تک پہنچانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اس نے قاصد کو بلوایا اور اسے سلطان الملک المعز کے پیغام بتا کر بغداد روانہ کر دیا۔ قاصد کئی دن کی مسافت کے بعد بغداد پہنچا اور خلیفہ مستعصم باللہ کی خدمت میں پیش ہو کر سلطان الملک المعز کا پیغام سنایا۔ امیر المومنین نے بڑے تحمل سے تمام پیغام سنا اور یہ دریافت کیا کہ یہ پیغام تم نے سلطان الملک المعز کے منہ سے سنا ہے یا کسی اور سے؟ قاصد نے سادگی میں جواب دیا کہ اس نے یہ پیغام امیر فخر الدین کے منہ سے سنا ہے۔ امیر المومنین نے یہ سن کر جواب میں صرف یہ کہا کہ حاجب موصوف کو شیخ عز الدینؒ نے ساقط الاعتبار قرار دے رکھا ہے لہٰذا تم واپس جاؤ اور سلطان کے منہ سے یہ پیغام سن کر ہمارے پاس آؤ تاکہ اس کی تعمیل کرائی جا سکے۔ ہم کسی ایسے شخص کے کلمات پر یقین نہیں کر سکتے جو ناقابل شہادت ہو۔ قاصد یہ سن کر واپس لوٹا اور امیر فخر الدین کے پاس پہنچ کر سارا معاملہ بیان کر دیا۔ اتفاق سے اسی لمحے سلطان الملک المعز بھی اس جانب آ نکلا اور سفیر کی صورت دیکھ کر جواب طلب کیا۔ امیر فخر الدین شرم کے مارے گردن جھکائے بیٹھا رہا تو سلطان الملک المعز نے سفیر سے براہ راست پوچھا۔ اس نے حقیقت کھول دی تو سلطان الملک المعز نے وہ پیغام دوبارہ اسے دیا اور بغداد جانے کی ہدایت کی۔ حاجب امیر فخر الدین کے لئے اس سے بڑھ کر ذلت کا مقام کیا ہو سکتا تھا اس نے عہدہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے استعفیٰ کو سلطان الملک المعز نے بلا تکلف قبول کر لیا تھا۔



اردوئے زریں کے قاآن اعظم باتو خان نے ایک دن برقائی خان کو اپنے پاس طلب کیا۔ برقائی خان کے اسلام قبول کرنے کی خبر پا کر وہ گہرے صدمے سے دوچار ہوا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ اسے قتل کرنے کا حکم جاری کر دیتا مگر اپنے باپ توشی خان کو دیئے گئے عہد اور دادا چنگیز خان کے مروج یساق کو دیئے گئے حلف نے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ یساق دستور العمل کی ایک کتاب تھی جسے منگولوں میں مذہبی کتاب کی سی حیثیت حاصل تھی۔ یساق کو چنگیز خان نے خود مرتب کیا تھا۔ علامہ ابن مقریزی اپنی کتاب ''والحفظ والآثار'' میں لکھتے ہیں کہ یساق کا ایک نسخہ بغداد کے مدرسہ مستنصریہ میں محفوظ تھا جسے انہوں نے خود ملاحظہ کیا ہے۔

باتو خان اپنے تئیں یہ قسم کھا چکا تھا کہ برقائی خان کی صورت کبھی نہیں دیکھے گا مگر جشن قرولتائی کے انعقاد کا اعلان کیا گیا۔ بڑے قاآن منگو خان نے تمام بھائیوں اور عزیزوں کو اس میں شمولیت کی ہدایت جاری کی تو وہ برقائی خان کو مطلع کرنے پر مجبور ہو گیا۔ جشن قرولتائی میں بڑے قاآن منگو خان کے سامنے تمام عمال پیش ہوتے اور اپنی اپنی کارکردگی کا خلاصہ پیش کرتے تھے۔ اسی اجلاس میں کئی اہم امور کے فیصلے بھی کئے جاتے تھے۔ قرولتائی کا اجلاس یوں تو منگولوں میں بہت پہلے سے رائج تھا مگر چنگیز خان نے تاتاریوں اور منگولوں کے باہمی

اتحاد کے بعد اس کی نئی حدود مقرر کر دی تھیں۔ جشن قرولتائی ایک طرح سے باہمی ربط قائم رکھنے کی روایت تھی۔

برقائی خان اپنے بھائی باتو خان کے مزاج سے خوب واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ بار بار اس کے سامنے جائے گا تو اس کا غصہ بھڑک اُٹھے گا۔ اس کے غصے کو ٹھنڈا ہونے تک اسے اپنے محل میں رہ کر انتظار کرنا تھا۔ وہ محل سے باہر بھی نہیں نکلتا تھا کیونکہ اگر اس کی غیر موجودگی میں باتو خان کی جانب سے کوئی بلاوا آ گیا تو قاصد اسے نہ پا کر باتو خان کو غیر موجودگی کی خبر کرے گا۔ یہ ایک ایسا عمل ثابت ہو سکتا تھا جس سے وہ بگڑ جاتا اور اس فعل کو سرکشی قیاس کرتا۔ برقائی خان کی اپنے محل میں قید رہنے کی یہی ایک بڑی وجہ تھی۔ وہ باہر کی دنیا سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ اس نے اس گوشہ تنہائی میں خود کو مصروف رکھنے کے لئے اسلام کی تعلیمات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک مسلمان عالم کو اس کام کے لئے مقرر کیا گیا جو تمام دن مختلف پہلوؤں پر اس سے گفتگو کیا کرتا۔ چند دن میں برقائی خان نماز سیکھ گیا اور پانچوں اوقات کی نماز ادا کرنے لگا۔ وہ بڑی محنت سے قرآن پڑھنا بھی سیکھ رہا تھا مسلمان عالم اس کی لگن اور انہماک سے جہاں متحیر تھا وہیں اسے یہ خوشی بھی تھی کہ اس کے ہاتھوں ایک سورج پرست سچا مسلمان بن رہا ہے۔ برقائی خان کی تنہائی نے اسے اسلام کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ فراہم کیا تھا وہ تعلیمات اسلامیہ کے علاوہ مسلمان خلفاء اور اصحاب رسول ﷺ کے احوال و واقعات بھی بڑے غور سے سنتا۔

یہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ کرم تھی کہ اس نے اس قوم پر اپنی نظر کی تھی جس نے مسالک کے بکھیڑوں میں اُلجھے اور بگڑے ہوئے مسلمانوں کی کھوپڑیوں کے مینار بنا کر عبرت اور ہیبت کی فضا گرم کی تھی۔ یہ لوگ سورج پرست تھے مگر وقت انہیں ہدایت کی جانب موڑ رہا تھا۔ برقائی خان پہلا منگول تھا جس کا تعلق براہ راست شاہی خاندان سے تھا اور وہ دائرہ اسلام کی پناہ میں آ چکا تھا۔ اس نے تعلیمات حاصل کرنے کے لئے کسی ایک فرد پر تکیہ نہیں کیا بلکہ کئی مسلمان اس کے محل میں اس سلسلے میں آنے لگے جو اپنی اپنی استطاعت کے مطابق اسے بتاتے رہتے۔ یہ وہ وقت تھا کہ اسلام کے مبلغین اس جانب آنے کا قصد تو ضرور کرتے تھے مگر دشوار اور غیر محفوظ راستوں کے باعث منزل تک نہ پہنچ پاتے۔ اردوئے زریں کی سرحدوں کے ساتھ ایل خانی منگولوں کی حکومت موجود تھی جس کی سرحدیں عراق سے ملتی تھی۔ فارس، خوارزم شاہیہ، افغانستان، اور ترک علاقے اس میں شامل تھے ایل خانی منگول چنگیز خان کے بیٹے تولی خان کی اولاد تھے۔ چنگیز خان کی وفات کے بعد اوکتائی خان منگولوں کا حکمران بنا تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا تویوق خان حکمران ہوا۔ تویوق کی اچانک موت کے بعد ترکینہ خاتون نے حکومت کی۔ بعد میں قرولتائی کے مشترکہ اجلاس میں چنگیز خان کے چھوٹے بیٹے تولی خان کی اولاد کو حاکم تسلیم کر لیا گیا۔ تولی خان کا بڑا بیٹا منگو خان اپنے باپ کے بعد اب بڑے قاآن کا تخت سنبھالے ہوئے تھا۔ منگو خان کے پاس جو علاقے تھے ان میں تاتار اور منگولیا نہ شامل تھے جن کی سرحدیں روس اور چین کے ساتھ جڑی ہوئی تھیں۔ اس کا چھوٹا بھائی ہلاکو خان بلاد فارس پر قاآن مقرر تھا۔ اسی کی سلطنت اردوئے زریں کے ساتھ لگتی تھی۔ باتو خان چچا زاد بھائی ہونے کے حوالے سے ہلاکو خان کو عزیز رکھتا تھا۔ ہلاکو خان دولت و جاہ کا بے حد حریص تھا۔ اس کے گرد ایسے لوگ جمع رہتے تھے جو اس کی خوشامد میں جتے رہتے دولت کی بے جا ہوس نے اسے خود سر اور مغرور بنا دیا تھا۔ درباری امیر اپنے قاآن کی خواہش کی بجا آوری کے لئے رعایا پر ظلم و ستم روا رکھتے تھے۔ قافلوں کو لوٹ لینا ان کا مرغوب مشغلہ تھا مسلمان حاجیوں کے قافلوں کو نشانہ بنانا وہ اپنا دینی فریضہ سمجھتے تھے۔ ہلاکو خان کے دربار میں منگول امرأ کے علاوہ مسلمان اور عیسائی امرأ بھی شامل تھے۔ چنگیز خان کا غصہ اور مسلمانوں سے نفرت اس کی رگ رگ میں رچی ہوئی تھی۔ وہ اپنے دربار میں مسلمانوں کی نسبت عیسائیوں کو زیادہ ترجیح دیتا۔

اس سب بیان کا خلاصہ یہ تھا کہ اردوئے زریں کی جانب مسلمان مبلغین کو آنے کے لئے ہلاکو خان کے

ملک میں سے گذرنا پڑتا تھا۔ چنگیز خان اور اوکتائی خان کے دور میں جو مسلمان یہاں پہنچ گئے تھے۔ وہی اس سلطنت کا حصہ تھے۔ ان کے پاس دینی تعلیم کا فقدان تھا۔ ان میں کوئی کامل نہیں تھا جسے خاص شہرت حاصل ہوتی۔ برقائی خان نے شیخ نجد دیؒ کو تلاش کرنے کی بھی کوشش کی تھی مگر وہ یوں پوشیدہ ہو چکے تھے جیسے وہ اس جانب کبھی آئے ہی نہ ہوں۔ برقائی خان نے شیخ نورالدین سے تھوڑی بہت تعلیمات حاصل کیں۔ اس تمام عرصے میں برقائی خان کو خلیفہ بغداد سے غائبانہ اُنسیت پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ اگر اسے موقعہ ملا تو وہ امیر المومنین سے ضرور شرف ملاقات حاصل کرے گا۔

برقائی خان نے جب اپنے بھائی باتو خان کی طلبی کا پیغام سنا تو اس کے چہرے پر رونق پھیل گئی۔ وہ کافی عرصے سے اسی لمحے کا منتظر تھا۔ وہ پیغام پاتے ہی شاہی محل کی جانب روانہ ہو گیا۔ باتو خان اپنے مخصوص شاہی کمرے میں تھا۔ یہاں دیگر امرأ بھی موجود تھے۔ برقائی خان کی صورت دیکھ کر باتو خان کے ساتھ ساتھ وہاں موجود ہر شخص کو جھٹکا لگا۔ وہ دیدے پھاڑے اسے یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ کسی اجنبی کو اپنے درمیان دیکھ رہے ہوں۔ برقائی خان نے اپنے بھائی کو تعظیم دی اور مؤدب کھڑا ہو گیا۔ باتو خان اس کا چہرہ دیکھ کر مایوس ہوا تھا اس نے گردن جھکا لی۔

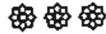
”میں نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ قرولتائی کے اجلاس کا انعقاد اگلے چاند کے آغاز پر ہو رہا ہے قاآن اعظم نے خاندان کے سب لوگوں کو وہاں جمع ہونے کی ہدایت کی ہے“۔

”جیسا آپ کا حکم!“ برقائی خان نے مختصرا جواب دیا۔

”برقائی خان!“ ایک امیر اپنے ضبط پر قابو نہ رکھ سکا۔ ”یہ تم نے داڑھی کس انداز کی رکھی ہے کہیں تم مسلمان تو نہیں ہو گئے؟“

”الحمدللہ!“ برقائی خان مسکرا کر بولا۔

برقائی خان کے جواب پر امرأ میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ وہ برقائی خان کی جرأت پر حیران ہو رہے تھے۔ باتو خان اس لمحے خود کو خجل سا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے برقائی خان کو واپس اپنے محل میں لوٹنے کا حکم سنایا۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس موضوع پر گفتگو کا سلسلہ یہیں شروع ہو جائے۔ امرأ میں سے چند ایک نے برقائی خان کی مخالفت میں اپنے ردعمل کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تو باتو خان نے انہیں سختی سے ڈانٹ پلائی۔ وہ اپنے بھائی یا خاندان کے کسی بھی فرد کے بارے میں درباری امرأ کو اتنی جرأت نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ ان پر انگلی اُٹھا سکیں اس کے انتہائی سخت رویئے نے وہاں موجود لوگوں کو خاموش ہونے پر مجبور کر دیا۔ برقائی خان حکم پاتے ہی وہاں سے نکل آیا۔ وہ قرولتائی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اصل میدان تو وہاں لگے گا۔



ملکہ بدر منیر لولو والئی موصل بدرالدین لولو کی بیٹی تھی۔ سلطان الملک الناصر والئی دمشق و حلب سے بدلہ لینے اور اسے بلادِ مصر کی جانب سے روکنے کے لئے سلطان الملک المعز نے بدرالدین لولو سے تعلقات استوار کئے اور اس کی بیٹی کو اپنے عقد میں لے لیا۔ سلطان بدرالدین لولو نورالدین زنگی کے پڑپوتے کا غلام تھا جس نے اپنی ذہانت وفہم سے امورِ حکومت اپنی جانب موڑ لئے تھے اور زنگی خاندان کو موصل کی حکمرانی سے ہمیشہ کے لئے نکال دیا تھا۔ زنگی اور ایوبی خاندان ایک دوسرے کے ساتھ کئی رشتوں سے جڑے ہوئے تھے۔ ان کی خانہ جنگی نے انہیں اتنا کمزور کر دیا تھا کہ ان کے غلام ان کی ریاستوں کے حاکم بن بیٹھے تھے۔ مصر میں الملک المعز تھا تو موصل میں بدرالدین لولو۔ دونوں میں ایک قدر مشترک تھی کہ ان کا آبائی تعلق ترکستان سے تھا جسے چنگیز خان اور

اس کے بیٹوں نے غارتگری کا نشانہ بنایا تھا۔

ملکہ بدر منیر خوبصورتی میں بے مثل تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سلطان الملک المعز اس پر مرمٹا۔ اس نے سابقہ ملکہ شجرۃ الدر کو نظر بند کر دیا اور اُس کا مقام ملکہ بدر منیر کو دیدیا۔ ملکہ بدر منیر ملکہ شجرۃ الدر کے معاملے میں بڑی محتاط تھی۔ اس نے اپنی کنیزوں کو اس کے گرد پھیلا رکھا تھا کہ وہ ملکہ شجرۃ الدر پر کڑی نگاہ رکھیں۔ امیر فارس الدین اقطائی کی خفیہ آمد کی اطلاع پا کر وہ چونک پڑی تھی۔ اس نے سلطانی مخبروں کو اس کی خفیہ نگرانی کا بھی حکم دیا۔ اس نے سلطان الملک المعز کو بھی ملکہ شجرۃ الدر کی اس حرکت کے بارے میں آگاہ کیا۔ سلطان الملک المعز نے فارس الدین اقطائی کی ہر دلعزیزی اور بہادری کو دیکھتے ہوئے براہ راست فوری کوئی قدم اُٹھانے سے گریز کیا اور موقع کی تلاش میں رہنے لگا کہ کب اس کا قصہ پاک کر دیا جائے۔

ایک رات ملکہ شجرۃ الدر کے کمرے میں پانچ کنیزوں کے تادیر موجود رہنے کی اطلاع ملکہ بدر منیر کو ملی تو وہ پریشان ہوگئی۔ اس نے دوسری صبح فوراً ان کنیزوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ تمام محل چھان مارا گیا مگر وہ کنیزیں بازیاب نہیں ہوسکیں۔ ملکہ بدر منیر اس پوشیدگی کو کسی بڑی سازش پر قیاس کرنے لگی۔ اس نے ارادہ کیا کہ وہ سلطان الملک المعز کو اس بارے میں مطلع کر دے مگر اسے معلوم ہوا کہ سلطان الملک المعز شاہی حمام میں غسل کے لئے تشریف لے جاچکے ہیں۔ وہ نہایت بے چینی کے عالم میں ٹہلنے لگی۔ تمام رات وہ صحیح طرح سو نہیں پائی تھی کافی دیر گذر گئی تو اس نے غلاموں کو دوبارہ دوڑایا کہ وہ سلطان کے پاس جائیں اگر وہ غسل کر چکے ہوں تو فوراً ملاقات کا پیغام دیں۔ غلام حکم پا کر روانہ ہوگئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ غلام قریباً بھاگتا ہوا واپس لوٹا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ملکہ بدر منیر کا دل اس کی صورت دیکھتے ہی بیٹھنے لگا۔ اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے تیز لہجے میں دریافت کیا تو وہ غلام ہانپتا ہوا بولا کہ سلطان الملک المعز پر دوران غسل پانچ کنیزوں نے حملہ کر دیا اور بے خبری کے عالم میں ان کا رشتہ حیات منقطع کر دیا۔ خون زیادہ بہہ جانے کے باعث وہ انتقال فرما گئے ہیں۔ تمام کنیزوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور انہوں نے ملکہ شجرۃ الدر پر اس حرکت کی ذمہ داری عائد کی ہے۔

ملکہ بدر منیر لولو یہ سن کر سکتے کے عالم میں آگئی تھی۔ اسے ایسی کوئی توقع نہیں تھی کہ کنیزوں کے ذریعے سلطان الملک المعز پر قاتلانہ حملہ کیا جائے گا۔ ملکہ شجرۃ الدر کا نام سنتے ہی جیسے اسے ہوش آگیا۔ وہ خونخوار لہجے میں غرائی اور ملکہ شجرۃ الدر کو حراست میں لینے کا حکم دیا۔ ابھی فقرے اس کے منہ میں ہی تھے کہ ایک کنیز نے آکر اسے ملکہ شجرۃ الدر کی گرفتاری کی اطلاع دی۔ مملوک امرأ ملکہ شجرۃ الدر سے ہمدردی رکھتے تھے مگر وہ اپنے قبیلے کے کسی بھی فرد پر کسی ایسے حملے کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ملکہ شجرۃ الدر کا ارادہ سلطان الملک المعز کو قتل کرنے کا نہیں تھا بلکہ وہ اسے نامرد بنا دینا چاہتی تھی۔ جس مردانگی کی ترنگ میں آکر وہ اُسے چھوڑ کر ملکہ بدر منیر کی زلفوں کا قیدی بن گیا تھا، مگر قدرت کو اس کا نامرد بنا کر زندہ رکھنا منظور نہیں تھا وہ صدمے اور زیادہ خون بہہ جانے کے باعث ربیع الاوّل 655ھ میں اس دارفانی سے رخصت ہوگیا۔ وہ صرف سات برس تک بلادِ مصر پر حکومت کر پایا تھا۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ بلادِ شرقیہ دشام بھی اس کی حدودِ سلطنت میں داخل ہو جاتے مگر وہ اپنی خواہش کی تکمیل سے پہلے ہی یہ دنیا چھوڑ گیا۔ ملکہ شجرۃ الدر کو اقبال جرم پر قلعہ کے زنداں خانے میں دھکیل دیا گیا اور ایک رات ملکہ بدر منیر کی وفادار کنیزوں نے اپنی ملکہ کی ہدایت پر زنداں خانے پہنچ کر لکڑی کے جوتوں سے اُسے اتنا زدوکوب کیا کہ اس کا سر پاش پاش ہوگیا اور بھیجا سر سے باہر نکل آیا۔ زنداں خانے کے پہرے دار چپ چاپ کھڑے یہ تماشا دیکھتے رہے۔ ملکہ شجرۃ الدر جس نے اپنی قابلیت اور ذہانت سے بے شمار لوگوں کے دل جیت رکھے تھے، اپنے دوسرے شوہر کی ہلاکت کے کچھ ہی دن بعد دردناک موت کے گھاٹ اتر گئی ملکہ بدر منیر لولو کے

حکم پر اس کی لاش کو قلعے کی خندق میں پھینک دیا گیا تا کہ چیلیں اور کوے اس کی لاش نوچ کھائیں۔ مملوک امرأ کو جب ملکہ بدر منیر کی حرکت کا علم ہوا تو انہوں نے کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہیں کیا بلکہ کچھ افراد نے کسی قدر مسرت ظاہر کی۔

امیر فارس الدین اقطائی کو جب ملکہ شجرۃ الدر کے انجام کی خبر ہوئی تو وہ کافی دیر تک سکتے کے عالم میں خاموش بیٹھا رہا۔ اسے ملکہ شجرۃ الدر سے والہانہ چاہت تھی۔ وہ اسے نہایت محترم خیال کرتا تھا حالانکہ اس نے سلطان الملک المعز کو قتل کرایا مگر وہ اس تمام معاملے میں سلطان الملک المعز کو ہی مجرم گردانتا تھا۔ اس نے اپنے رفقاء کو غیرت دلائی اور ملکہ شجرۃ الدر کے بلادِ مصر پر احسانات کو جتا کر یہ کہا کہ اسے بے گور و کفن پڑا رہنے دینا قرین انصاف نہیں ہے۔ اگر اس نے کوئی جرم کیا تھا تو اسے اس کی سزا بھی اسی دنیا میں مل چکی ہے۔ اب خوف خدا کرتے ہوئے ہمیں اپنا فرض نبھانا چاہئے۔ وہ ان کو ساتھ لے کر قلعہ میں پہنچا اور ملکہ شجرۃ الدر کی مسخ شدہ لاش کو خندق میں سے نکالا اور اسے کفن دے کر اسی کی تعمیر کردہ ایک مسجد کے احاطے میں دفن کر دیا۔ ملکہ شجرۃ الدر نہایت دیندار اور فہم وفراست کے زیور سے آراستہ خاتون تھی۔ اسے کئی بار حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس نے خانہ کعبہ کے لئے غلاف خود اپنے ہاتھوں سے تیار کیا تھا۔ اس کام میں تمام شاہی کنیزیں اس کے ساتھ کام کرتی تھیں۔ اس کا تیار کردہ غلاف جب خانہ کعبہ پر چڑھایا گیا تو بلادِ مصر کے لوگوں نے اسے اپنے لئے بہت بڑا اعزاز تصور کیا اور پھر اس دن سے ہر سال غلاف کعبہ مصر سے ہی تیار کر کے لایا جانے لگا۔

سلطان الملک المعز جاشنگیر ایبک کو باب النصر کے باہر شمس الدولہ نامی قبرستان میں دفن کیا گیا۔



مطیع الدین نے اپنے باپ نورالدین کے آنے سے قبل یاغی کو رخصت کر دیا تھا۔ مطیع الدین جانتا تھا کہ اگر اس کے باپ نے یاغی کی حالت دیکھ لی تو اسے سمجھانا دشوار ہو جائے گا۔ یاغی جب ہوش میں آیا تو اس نے خود کو مطیع الدین کے پاس پا کر حیرت کا اظہار کیا تھا۔ مطیع الدین نے اسے ذرا محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ عالم مدہوشی میں کیا کچھ کہتا رہا ہے۔ صرف قونائی خان کے بیٹوں کے حوالے سے مطیع الدین نے اسے اتنا ضرور کہا تھا کہ وہ نشے میں اتنا بہک گیا تھا کہ انہیں گالی گلوچ سے نوازتا رہا۔ یاغی نادم ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ مطیع الدین اندھیرا پھیلنے کے بعد یہی سوچتا رہا کہ اسے قبیلہ سرخ غر کے بارے میں کیا لائحہ عمل اپنانا چاہئے کافی سوچ بچار کے بعد ایک منصوبہ اس کے ذہن میں پنپنے لگا۔

نورالدین رات کے پہلے پہر میں لوٹ آیا۔ فونا جو خان اس کے ہمراہ تھا۔ مطیع الدین نے آتے ہی دریافت کیا کہ وہ لوگ اسے کچھ بتائے بغیر کہاں چلے گئے تھے۔

نورالدین نے چند منگول امرأ کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا۔ ”وہ حال ہی میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے ہیں۔ انہیں آداب مسنونہ سکھانے میں ذرا دیر ہوگئی۔ میں تو پہلے ہی لوٹ آنا چاہتا تھا مگر انہوں نے کھانے کا انتظام کر ڈالا۔ اس لئے مجھے وہاں رُکنا پڑ گیا۔ دوسرا فونا جو خان گھر میں بے کار بیٹھا اُکتاہٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اسے بھی ساتھ لئے چلتا ہوں، اس کا دل بہل جائے گا۔ جب سے سرائے آیا ہے اس گھر کا قیدی بن کر رہ گیا ہے“۔

فونا جو خان نے اسی اثناء میں ایک زوردار ڈکار لی تو مطیع الدین آنکھیں نکال کر اُسے دیکھنے لگا۔ فونا جو خان اپنی حرکت پر جھینپنے کے بجائے بے ڈھب انداز میں ہنسنے لگا۔ نورالدین بھی مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔

”موٹے!“ مطیع الدین تیز لہجے میں بولا۔ ”اگر تو خوراک سلیقے سے ہضم نہیں کر سکتا تو کیا ضرورت تھی

اتنا زیادہ ہڑپ کرنے کی؟''

''جادِ دانی آسمان کی قسم! میں تو ابھی بھوک چھوڑ کر آیا ہوں''۔ فو ئنا جو خان معصومیت سے بولا۔

''مجھے لگتا ہے کہ تو سرائے کا اناج ایک دن ضرور ختم کر ڈالے گا۔ اپنی گوگل کو چھانٹ لے ورنہ بڑا پچھتائے گا''۔

''دیکھو بابا!'' فو ئنا جو خان شکوہ کرتا ہوا بولا۔ ''آج پھر یہ میرے پیٹ کے پیچھے پڑ گیا ہے، خود اس کا پیٹ تو لومڑی کی مانند پسلیوں میں دھنسا پڑا ہے''۔

''کیا..... کیا..... مجھے لومڑی کہا.....'' مطیع الدین اس کی جانب لپکا مگر دوسرے ہی لمحے وہ زمین پر منہ کے بل گرا پڑا تھا۔ جوش میں خود اس کا اپنا پاؤں قالین میں اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ فو ئنا جو خان اس کی حالت دیکھ کر قہقہے لگانے لگا۔ نور الدین نے دونوں کو بظاہر ڈانٹ کر اندر کی راہ لی حالانکہ وہ بھی زیر لب مسکرا رہا تھا۔

نور الدین کے اندر جاتے ہی مطیع الدین تیزی سے سیدھا ہوا اور فو ئنا جو خان کو کھینچتا ہوا گھر سے باہر نکال لایا۔ فو ئنا جو خان اُس کی اس عجیب حرکت پر حیرت و پریشانی سے اس کی صورت دیکھنے لگا۔

''مم..... میں..... کچھ سمجھا نہیں''۔ فو ئنا جو خان ہڑبڑا کے بولا۔

''بے فکر رہو! تمہیں اپنے گھر سے نکالنے کی کوشش نہیں کر رہا''۔ مطیع الدین نے تسلی دی۔

''اس غلط فہمی میں نہ رہنا کہ میں تمہارے نکال باہر کرنے سے تمہارا گھر چھوڑ جاؤں گا''۔

''یہ سب چھوڑو! میری بات غور سے سنو، جس کے لئے میں تمہیں گھر سے باہر لایا ہوں''۔

''خیریت تو ہے؟'' فو ئنا جو خان اس کے غیر متوقع پر اسرار انداز سے سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''خیریت بالکل نہیں! میں نے گل دتوژ کا پتہ لگا لیا ہے کہ وہ کہاں ہے؟''

''یہ معرکہ تم نے کب مار لیا؟''

''آج ہی..... مگر اس معاملے کی صورتِ حال کچھ پیچیدہ ہے، اس کے لئے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے''۔ وہ دونوں اپنے گھر سے کافی دور نکل آئے تھے۔ فو ئنا جو خان اب اس کے برابر چل رہا تھا۔

''میں کیا کر سکتا ہوں؟'' فو ئنا جو خان ہاتھ جھٹک کر بولا۔

''تم میرے گھر کے اناج کا بیڑہ غرق کر سکتے ہو اور کچھ نہیں کر سکتے''۔ مطیع الدین اس کے انداز سے بگڑتے ہوئے بولا۔

''اس کی تم فکر نہ کرو، بس مجھے بھرتی ہو جانے دو۔ ایک سال کی تنخواہ تمہاری ہتھیلی پر رکھ دوں گا''۔

''بڑے کمینے ہو.....!'' مطیع الدین اس کی ضرورت سے زیادہ سادگی پر جل بھن گیا۔ ''میں تم سے ایک سنجیدہ معاملے پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں اور تم بات کو گھما پھرا دیتے ہو''۔

''اچھا غصہ تھوک دو۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''مجھے معلوم ہوا کہ گل دتوژ قبیلہ سرخ غر میں قید کی گئی ہے۔ تونائی خان کو اس کے اور میرے تعلق کی خبر ہو گئی تھی اسی لئے اس نے اپنے سسر کو ہدایت کر دی تھی کہ گل دتوژ کا خیال رکھا جائے''۔

''یہ تونائی خان کون ہے؟''

''میں نے تمہیں تمام معاملہ کئی بار بتایا ہے مگر تم پھر مجھ سے کوئی اُلٹا سوال کر بیٹھتے ہو۔ تونائی خان گل دتوژ کا باپ تھا جو قتل ہو چکا ہے''۔

''ٹھیک ہے تم اس معاملے میں مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' فو ئنا جو خان نے بات کا سلسلہ بڑھایا۔

''میں کل بابا سے کہوں گا کہ تم اور میں شکار کے لئے نکلنا چاہتے ہیں۔ ہم شکار کے بہانے قبیلہ سرخ غر کی جانب نکل پڑیں گے''۔

''مگر میں تو شکار پر نہیں جانا چاہتا''۔

''میں تمہارا یہ بڑا سا سر کسی پتھر سے توڑ کر رکھ دوں گا موٹے!'' مطیع الدین غرایا۔ ''اگر تم میرے ساتھ نہیں چلو گے تو بابا مجھے تنہا جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ تمہارے ساتھ چلنے پر انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا''۔

''اچھا تو تم مجھے بطور ڈھال استعمال کرنا چاہتے ہو''۔

''دوست ہی دوست کے کام آتا ہے''۔

''لفظی مکھن سے میرا پیٹ نہیں بھرتا''۔

''بے فکر رہو! مجھے موقعہ ملا تو تمہاری توند پر ایسا مکھن ملوں گا کہ باقی ساری زندگی گدگدی میں گذارو گے''۔

''میری توند کو معاف رکھو! اگر سوچنا ہے تو میرے معدے کے بارے میں کچھ سوچو''۔

''بعد میں سوچوں گا۔ کل صبح میں شکار کا ذکر چھیڑ دوں گا تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ میری تائید کرتے رہنا''۔

''ٹھیک ہے! کل صبح سوچوں گا''۔

مطیع الدین اسے کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھنے لگا جس پر شرارت آمیز تبسم پھیلا ہوا تھا۔ وہ دونوں یونہی ہنسی مذاق کرتے کچھ دیر گھومتے رہے اور پھر گھر لوٹ آئے تمام رات مطیع الدین قبیلہ سرخ غر میں گھس کر گل دتوژ کو نکالنے کی تدبیریں کرتا رہا۔

دوسری صبح ناشتے کے کچھ دیر بعد اس نے اپنے باپ نور الدین سے شکار کی بابت ذکر چھیڑ دیا۔ فو ئنا جو خان نے بھی شکار پر جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو نور الدین انکار نہ کر سکا۔ اس نے انہیں کئی نصیحتیں کیں اور پانچ روز کے اندر گھر واپس لوٹنے کی خصوصی ہدایت کی۔ اجازت ملنے کی سرشاری میں وہ دونوں دن چڑھنے سے پہلے ہی گھر سے نکل پڑے۔ یہ صرف شکار کی مہم نہیں تھی بلکہ اس میں سنسنی خیزی کی آمیزش بھی اس نے محسوس کی تھی۔

وہ دونوں اسی راستے سے کوہ سرخ غر کی جانب روانہ ہوئے جہاں سے مطیع الدین پہلی بار برقائی خان کے ہمراہ شکار کے لئے روانہ ہوا تھا۔ قبیلہ سرخ غر کو سرائے سے جانے والا راستہ دوسرا تھا مگر اس کے بارے میں مطیع الدین کو آگاہی نہیں تھی۔ فو ئنا جو خان تو پہلی بار اس جانب آیا تھا۔ وہ راستوں کے بارے میں بالکل لاعلم تھا۔ دونوں اپنے گھوڑوں پر برف کا میدان پار کرتے ہوئے کوہ سرخ غر کی جانب بڑھنے لگے جس کے دوسری جانب دامن میں قبیلہ سرخ غر آباد تھا۔

❁ ❁ ❁

بلادِ مصر کے سلطان الملک المعز کی اچانک موت نے کاروبارِ سلطنت میں ہلچل سی مچا دی تھی۔ توران شاہ کے قتل کے بعد سے جو امن بلادِ مصر میں قائم تھا وہ ایک بار پھر خطرے سے دوچار ہو گیا تھا۔ دریائے اُردن کے کناروں پر آباد ایوبی والیوں کے دل میں ایک بار پھر بلادِ مصر کی عنان سنبھالنے کی خواہش نے سر اُٹھایا۔ انہوں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کرنے کے ساتھ ساتھ آپس میں گٹھ جوڑ شروع کر دیئے کہ وہ ایک دوسرے سے باہم مل کر بلادِ مصر کے مرکز قاہرہ پر قابض ہو جائیں۔ ان سب ایوبی والیوں میں کوئی ایسا فرد نہیں تھا جسے امور جہانبانی

اور دور اندیشی سے مس ہوتا۔ وہ پہلے مرحلے پر ہی جھگڑوں کا شکار ہو گئے۔ ہر ایوبی والی خود کو سلطان تصور کئے بیٹھا تھا۔ کوئی دوسرے کی بالا دستی قبول کرنے پر رضا مند نہیں تھا۔ بالآخر ایک ایوبی فرمانروا شہاب الدین الملک الاصغر والئی صیدا نے اپنی جمعیت کے ساتھ قاہرہ کا رُخ کیا۔ اس کے ساتھ سات ہزار سپاہی تھے۔ وہ بلاد مصر کے دارلحکومت پر قابض ہونے کے لئے تنہا ہی میدان میں اتر پڑا تھا۔ اس نے چلنے سے پہلے تمام ایوبی رشتہ داروں کو ہمراہ چلنے کی دعوت دی مگر کسی کے کان پر جوں نہیں رینگی۔ وہ اس کی اطاعت قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ربیع الاوّل کے آخرے عشرے میں وہ تیز رفتاری سے سفر کرتا ہوا قاہرہ کے باہر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے پڑاؤ ڈال کر مصری امرا کو ملاقات کے پیغامات بھجوائے۔

سلطان الملک المعز کی وفات کے بعد مجلس انتخاب کے اجلاس کئی دنوں سے جاری تھے۔ کوئی ایسا نام ابھی تک سامنے نہیں آ پایا تھا جسے بطور سلطان قبول کر لیا جاتا۔ مملوک امرا کا ایک طبقہ امیر فارس الدین اقطائی کو سپہ سالار اعلیٰ کے ساتھ ساتھ سلطان بنانے کا خواہش مند تھا جبکہ مصری امرا اور مملوک امرا کا دوسرا طبقہ وراثت کو زیادہ اہم قرار دے رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سلطان الملک المعز کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اس لئے اس کا حق اس کے کم سن بیٹے کو ملنا چاہیے۔ امیر فارس الدین اقطائی امور حکومت میں دلچسپی نہیں لینا چاہتا تھا۔ وہ سپاہی تھا اور خود کو میدان جنگ کا اہل قرار دیتا تھا۔ جب مجلس انتخاب تک والئی صیدا الملک الاصغر کی آمد کی خبر ہوئی تو انہوں نے سلطانی کے قضیئے کو جلد از جلد نبٹانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے امیر فارس الدین اقطائی کو طلب کر کے اس سے آخری بار رائے دریافت کی۔ اس نے صاف الفاظ میں انہیں منع کر دیا۔ شام ہونے سے پہلے 27 ربیع الاوّل کو سلطان الملک المعز کے کم سن بیٹے نور الدین کو الملک المنصور کا لقب دے کر تخت نشین کر دیا گیا۔ اس کی عمر صرف بارہ برس تھی۔ کم سن سلطان کا اتالیق سیف الدین محمود قطوزی کو مقرر کیا گیا۔ سیف الدین محمود قطوزی نے کم سن سلطان الملک المنصور کی جانب سے پہلا حکم والئی صیدا کی سرکوبی کا جاری کیا۔ مملوک سپاہی بلادِ مصر کے لئے اپنی جانیں ہتھیلی پر لئے پھرتے تھے۔ انہوں نے حکم پاتے ہی قاہرہ سے باہر اپنی صفیں سیدھی کر لیں۔ شہاب الدین الملک الاصغر نے جب مملوک سپاہیوں کا سیلاب اپنے چاروں جانب بکھرا دیکھا تو وہ ہمت ہار بیٹھا۔ کچھ مصری امرا جو کہ ایوبی فرمانروائی سے والہانہ لگاؤ رکھتے تھے اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کر چکے تھے مگر ان کی کوششوں کے آغاز سے قبل ہی بازی پلٹ چکی تھی۔ الملک الاصغر شہاب الدین نے ہتھیار ڈال دیئے اور اطاعت نامہ لکھ کر واپس ہو گیا۔ مملوک امرا نے اسے متنبہ کرتے ہوئے اس غلطی کو آخری قرار دیا تھا۔ وہ ناکام و نامراد لوٹنے پر بے حد رنجیدہ تھا۔



صحرائے گوبی ترکستان کے جنوب میں ایک وسیع ریگستان ہے جو کہ چین و روس کے درمیان پھیلا ہوا ہے۔ یہاں دروں کی بہتات ہے۔ پہاڑی علاقے میں ریگستان کی صورت عرب کے ریگستانوں سے کافی مختلف ہے۔ منگولوں کے مختلف قبیلے اسی صحرا کے مختلف حصوں میں آباد تھے جہاں پانی کے قدرتی چشمے موجود تھے۔ سلطنت خوارزم کے سپہ سالاروں نے ان دشوار گذار علاقوں پر کئی بار چڑھائی کی اور بے شمار منگولوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ منگول پسپائی اختیار کرتے رہے اور بالآخر شمالی ترکستان کے ایک مستحکم مقام میں پناہ گزین ہو گئے۔ اس مقام کو چاروں جانب سے پہاڑوں نے گھیر رکھا تھا اور صرف ایک داخلی راستے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ دروں کے درمیان وسیع وادی تھی جسے کاران کہا جاتا تھا۔ یہاں کسی قدر سبزہ بھی موجود تھا جس کے باعث انہیں شکار کے لئے جانور مل جایا کرتے۔ پالتو جانوروں کے لئے خوراک بھی کسی حد تک مہیا تھی جبکہ

انسانوں کے لئے خوراک انہیں باہر سے لانا پڑتی تھی شکاری جانوروں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی کہ ان پر تکیہ کیا جاتا۔ اس مرغزار میں قیام کا باعث ایک بڑا قدرتی چشمہ تھا۔ اس چشمے کو وہ بلیق چاق کے نام سے پکارتے۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس مقام پر خیموں کے بجائے کچے مکانات بننے لگے اور یوں بلیق چاق ایک چھوٹے سے شہر کی حیثیت اختیار کر گیا۔ وقت گذرتا گیا اور چنگیز خان کا دور آیا۔ اس نے اپنے وطن سے نکل کر دنیائے اسلام کو پامال کیا اور پھر اسی مقام کی جانب لوٹ گیا۔ یہی وہ شہر تھا جہاں سے منگولوں کے غول نکلتے اور مخلوق خدا کو روندتے ہوئے واپس لوٹ آتے۔

قاآن اعظم منگو خان اسی شہر میں بیٹھا اپنی وسیع و عریض سلطنت کے احکام جاری کیا کرتا تھا۔ اس کے حکم سے جشن قرولتائی منعقد کیا گیا۔ وہ شام بلیق چاق کے لئے بڑی اہم ترین تھی کیونکہ تمام بڑے سردار اور چنگیز خان کے پوتے اور پڑپوتے وہاں اکٹھے ہوئے تھے۔ منگو خان نے جشن قرولتائی کا افتتاح کیا۔ اس نے منگولوں کے باہمی اتحاد کو ہی تنگری (جاودانی خدا) کے سایہ کا نشان قرار دیا۔ اس کے بعد اس نے کئی دوسرے اہم امور پر اپنے نئے احکامات سنائے یہ تقریب منگولوں میں قربت بڑھانے کا ایک بہانہ تھا۔ اپنے خطاب کے بعد اس نے بڑے الاؤ کے روشن کرنے کا اعلان کیا۔ جب تک یہ الاؤ دہکتا رہتا اتنے دن تک یہ جشن جاری رہتا۔ اس کے بعد منگو خان نے ایک مجلس میں شمولیت اختیار کی جہاں دوسرے علاقوں سے آئے ہوئے منگولوں سے حالات و واقعات و مشکلات کا ذکر رہا۔ ان تمام معاملات سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے رشتہ داروں کی محفل میں چلا آیا۔ یہاں شراب نوشی عروج پر تھی۔ سب لوگ آگ پر پکنے والے جانوروں کے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ منگو خان کی نگاہ برقائی خان پر پڑی تو وہ لمحہ بھر بھونچکا رہ گیا۔ وہ ان سب سے پرے بیٹھا ان کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا۔ منگو خان نے اپنے قریبی غلام کو اشارہ کیا کہ وہ اسے بلا لائے۔ برقائی خان اپنی طلبی پا کر اس کے قریب چلا آیا۔ اس نے بڑے قاآن کو احتراماً تعظیم دی۔

''میرے چچا کے بیٹے! یہ تم نے کیسی وضع بنا لی ہے؟ قسم جاودانی آسمان کی......! تم صورت سے مسلمان دکھائی دیتے ہو''۔ منگو خان محبت بھرے لہجے سے بولا۔

''میں قاآن اعظم کی باریک بینی کی داد دیتا ہوں کہ انہوں نے صورت سے ہی سامنے والے کا حال جان لیا''۔ برقائی خان مؤدب انداز میں بولا۔

''یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ جانتے ہو کہ یساق میں اس بارے میں کیا لکھا ہے؟''

''میں یساق سے بہت دور نکل چکا ہوں''۔

باتو خان شراب نوشی میں مشغول تھا کہ اس کی نگاہ برقائی خان پر پڑی جو کہ منگو خان کے پاس موجود تھا۔ اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اس جانب بڑھ آیا۔ باتو خان کی صورت دیکھ کر منگو خان تیز لہجے میں بولا۔

''باتو خان! مجھے تمہاری خدمات کا اعتراف ہے، مگر تمہارے بھائی کا جرم ناقابل معافی ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یساق میں تنگری سے غداری کی سزا کیا مقرر ہے''۔

''آپ حاکم ہیں، یساق میں ترمیم کرنے کا آپ کو اختیار ہے، یاد کیجئے کہ قویوق کی وفات کے بعد جب سب لوگ مجھے قاآن بنانے پر متفق تھے تو میرے اسی بھائی نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر اس تخت پر بٹھا دیا۔ میں نے اپنے بھائی کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے آپ کی اطاعت میں کبھی غفلت نہیں کی''۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یساق میں کوئی تبدیلی کی جائے باتو خان؟'' منگو خان کا چھوٹا بھائی ہلاؤ خان کڑک

دار لہجے میں بولا۔ وہ اپنے بھائی منگو خان کے چہرے پر بدمزگی دیکھ کر اس طرف نکل آیا تھا۔ وہ باتو خان کا صرف آخری جملہ ہی سن پایا تھا۔ اس کے گونجدار لہجے نے سب لوگوں کی توجہ اس جانب مبذول کرا دی تھی۔ گرما گرم محفل میں گہری خاموشی چھا گئی۔ وہ سب مستفسرانہ نگاہوں سے ان کی جانب دیکھ رہے تھے۔

''باتو خان! ہلاؤ خان ٹھیک کہتا ہے کہ یاساق میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ اگر میں نے ایسا کوئی قدم اُٹھالیا تو آنے والے ہر دور میں یہ کام جاری رہے گا اور پھر ایک دن یہ اپنی اصل شکل سے بہت دور ہٹ چکی ہوگی تمہارے بھائی کے جرم کو تمہاری خدمات کے عوض نظرانداز نہیں کیا جاسکتا''۔ منگو خان فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

''میں پھر بھی قاآن اعظم سے اس معاملے میں نرمی کی درخواست کروں گا''۔ باتو خان کا لہجہ بھر آیا۔ لوگ ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے اسی لئے انہوں نے کھسر پھسر شروع کر دی تھی۔

''باتو خان!'' ہلاؤ خان متکبرانہ انداز میں بولا ''غلطی کی سزا ہوتی ہے یہی یاساق میں درج ہے۔ اگر تمہارے باپ نے غلطی نہ کی ہوتی تو اسے زہر دے کر ہلاک نہ کیا جاتا۔ حالانکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہمارا دادا سب بیٹوں میں سے بڑھ کر اسے چاہتا تھا۔ جس شخص نے یہ قانون بنایا ہے اس نے اسے اپنے عزیز بیٹے پر لاگو کر کے دکھایا ہے''۔

''ہلاؤ خان!'' برقائی خان برداشت نہ کرتے ہوئے بول پڑا۔ ''تمیز کی حدود میں رہ کر بات کرنا سیکھو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ دو بڑے افراد آپس میں گفتگو کر رہے ہیں۔ تم بار بار ان کے بیچ میں مداخلت کر رہے ہو''۔

''قاآن اعظم! میں درخواست کروں گا کہ آپ اپنے بھائی سے کہئے کہ وہ اپنے الفاظ واپس لے، میں اپنے مردہ باپ کے لئے کوئی ناخوشگوار بات برداشت نہیں کر سکتا''۔ باتو خان کا لہجہ کافی حد تک سخت ہو گیا تھا۔

''باتو خان!'' ہلاؤ خان استہزائیہ لہجے میں بولا ''میرا نام ہلاؤ خان ہے اور میرے بدن میں چنگیز خانی خون دوڑ رہا ہے۔ میں تھوکتا ہوں چاٹتا نہیں''۔

باتو خان اس کی بات پر اتھے سے اکھڑ گیا اس نے اپنی تلوار بے نیام کر لی اور تیزی سے اس کی جانب لپکا۔ برقائی خان نے اسے روکنا چاہا مگر وہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ منگو خان اپنی جگہ دم بخود رہ گیا تھا۔ باتو خان کی جانب سے اسے کوئی ایسی توقع نہیں تھی۔ معاملہ بگڑتے دیکھ کر کئی افراد بیچ میں کود پڑے۔ ہلاؤ خان بھی تلوار لہرا کر اسے دعوت مبارزت دے رہا تھا۔ منگو خان نے اسے ڈانٹ کر خاموش کرایا۔ اس نے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ جب دونوں کو خاموش کرا دیا گیا تو دوسرے افراد نے مؤدب انداز میں اصل معاملہ دریافت کیا۔ برقائی خان نے کسی کے بولنے سے پہلے ہی صاف الفاظ میں اعلان کر دیا کہ وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو چکا ہے، اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں۔ اگر آپ لوگ میرے اس فعل کو اچھا نہیں سمجھتے تو میں آپ کے ملک کی حدود سے باہر نکل جاتا ہوں۔ سب لوگ اس کی بات سن کر جیسے سکتے کے عالم میں کھڑے تھے۔ کسی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس مقام پر کیا کہے۔ ہلاؤ خان کو جب یہ معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہو چکا ہے تو وہ اسے برا بھلا کہنے لگا۔

''قاآن اعظم!'' ایک بزرگ منگول آگے بڑھ کر بولا۔ ''آپ یاساق پر عمل درآمد کرانے کے پابند ہیں۔ منگولوں کے سب قبیلے اس بات پر متفق ہیں کہ یاساق ہی ان کا پہلا اور آخری قانون ہے۔ اب یہ ذمہ داری آپ کے کندھوں پر ہے کہ انصاف سے کام لیتے ہوئے پہل اپنے ہی گھر سے کیجئے''۔

''کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''میرے پاس ایسے شواہد موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کا بھائی ہلاؤ خان سرزمین فارس میں

رہ کر حلیف نصرانیوں کے زیر اثر آ کر اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ چکا ہے''۔

''کیا تم ہوش میں ہو......؟'' منگو خان کا لہجہ کرخت ہو گیا۔

''اس بات کا پہلا شاہد تو میں ہوں۔ مزید بات پھیلانے کی خواہش ہے تو میں باہر موجود دوسرے لوگوں میں کئی ایسے پیش کر سکتا ہوں جو اس بات کی شہادت دیں گے کہ انہوں نے ہلاؤ خان کو نصرانی عبادت کرتے دیکھا ہے۔ اس کی ایک بیوی بھی نصرانی ہے جسے اس نے ملکہ کا مقام دے رکھا ہے''۔ بوڑھے منگول کا لہجہ بے باک تھا۔

''کیا یہ سچ ہے ہلاؤ خان؟''

منگو خان گردن گھما کر اس کی جانب متوجہ ہوا، ہلاؤ خان اپنے بڑے بھائی کے سامنے جھوٹ بولنے کی ہمت نہ کر سکا اور خاموشی سے گردن جھکا لی۔ منگو خان محض اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گیا۔

''قاآن اعظم......! اب کیا سوچ رہے ہیں؟ میری بات مان لیجئے۔ یاساق کی اس شرط کو ہٹا دیجئے ورنہ ایک دن ایسا آئے گا کہ سب لوگ یاساق کو تنہا چھوڑ دیں گے''۔ باتو خان نرمی سے بولا۔

''تم سب لوگوں کی کیا رائے ہے؟'' منگو خان اپنے بھائی کا جرم سن کر بجھ سا گیا تھا۔

''قاآن اعظم!'' وہی بوڑھا شخص دوبارہ بولا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ باتو خان کی تجویز امن کا احاطہ کرتی ہے۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ چنگیز خان کے وارث ایک دوسرے کا خون بہانے کا سلسلہ شروع کر دیں''۔

''آج برقائی خان اور ہلاؤ خان جیسے طاقتور افراد اپنے آبائی مذہب سے ہٹ گئے ہیں تو آنے والے کل میں دوسرے لوگ بھی ایسا ہی کریں گے''۔ منگو خان نے خدشہ ظاہر کیا۔

''آپ کی سختی بھی اس عمل کو نہیں روک سکے گی، لوگ آپ سے باغی ہو جائیں گے۔ منگولوں کے اتحاد کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ میری رائے یہی ہے کہ تبدیلی مذہب کو جرم قرار دے کر اپنے بہادروں سے محروم ہونے کی کوشش نہ کی جائے۔ جو لوگ اس وقت حالات کو قابو میں رکھے ہوئے ہیں یہ انہی کا کام ہے دوسروں میں اتنی اہلیت نہیں ہے''۔

''قاآن اعظم! وقت کا تقاضہ یہی ہے کہ یاساق کے اس قانون میں ترمیم کر دی جائے''۔ ایک دوسرے منگول نے تائید کی۔

کچھ لوگوں نے اس تجویز کی بڑی شد و مد سے مخالفت کی مگر آخری فیصلہ یہی صادر کیا گیا کہ یاساق میں ترمیم کر دی جائے۔ یہ پہلا مرحلہ تھا کہ منگولوں کے اتحاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے یاساق میں ترمیم کی گئی تھی یہ تقریب قرولتائی بارہ دن تک جاری رہی اس تقریب کے اختتام پر منگو خان نے باضابطہ طور پر یاساق میں موجود مذہب کی قید کو ختم کر ڈالا۔ اس اعلان سے منگولوں میں ناخوشگواری پھیل گئی اسلام قبول کرنے والوں اور اس جانب رغبت رکھنے والوں کے لئے یہ خبر بڑی مسرت آمیز تھی۔ انہوں نے پرتپاک انداز میں اس فیصلے کا خیر مقدم کیا۔ یہ پہلا مرحلہ تھا کہ برقائی خان اور ہلاؤ خان میں سرد جنگ کا آغاز ہو گیا۔ یہ دونوں چنگیز خان کے پوتے اور آپس میں چچازاد بھائی تھے۔ ہلاؤ خان کی نصرانی بیوی نے اسے برقائی خان کے اقدام کے خلاف اتنا بھڑکایا کہ وہ اس کی صورت دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ تقریب قرولتائی کے اختتام پر سب لوگ اپنے اپنے مقامات پر لوٹ گئے۔



مطیع الدین تیز رفتاری سے سفر کرتا ہوا فونا جو خان کے ساتھ شام تک کوہ سرخ غر کے دامن میں جا

پہنچا۔ یہاں چھوٹا سا جھاڑی دار جنگل موجود تھا۔ مطیع الدین نے ایک محفوظ مقام تلاش کر کے اپنے خیمے نصب کیے۔ فوکناجو خان کا چہرہ ستا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ شاید وہ تکان محسوس کر رہا تھا۔ مطیع الدین نے اس ضمن میں اس سے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ خاموشی سے خیمے لگوانے میں اس کا ہاتھ بٹاتا رہا۔ مطیع الدین نے کام سے فارغ ہونے کے بعد ایک چھوٹی سی مشعل روشن کی۔ موسم زیادہ سرد تو نہیں تھا مگر ہوا میں خنکی قدرے بڑھ گئی تھی۔ وہ چونکہ کھلے علاقے میں موجود تھے اس لئے یہاں سردی کا احساس بھی زیادہ تھا۔ فوکناجو خان کام سے فارغ ہو کر خیمے کے باہر ٹہلنے لگا۔ مطیع الدین نے اسے آواز لگائی کہ وہ لیٹ کر کچھ دیر آرام کر لے تو اس نے آرام کے لئے تمام رات کو کافی قرار دیا۔ مطیع الدین نے اس کے جواب پر کندھے اچکائے اور بستر میں گھس کر لیٹ گیا۔ نیند تو اس کی آنکھوں سے بہت دور تھی دل ودماغ پر گل دقوژ کی صورت قبضہ جمائے ہوئے تھی وہ اپنے آنے والے وقت کے لئے سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔ اچانک مطیع الدین کے کانوں میں کچھ اس قسم کی آوازیں پڑیں جیسے باہر کوئی گتھم گتھا ہو رہا ہو۔ وہ بجلی کی سی سرعت سے اپنے بستر سے نکلا اور پہلو میں پڑی تلوار کو بے نیام کرتے ہوئے باہر آ گیا۔ باہر پہنچتے ہی اس کی آنکھیں پل بھر کے لئے پھٹی رہ گئیں۔ فوکناجو خان ایک بڑے برفانی ریچھ سے نبرد آزما تھا۔ دونوں آپس میں ایسے الجھے ہوئے تھے جیسے کوئی دیرینہ دشمنی ہو۔ فوکناجو خان خالی ہاتھ تھا۔ اسے کسی ریچھ کی اس طرف آ نکلنے کی توقع نہیں تھی۔ وہ ریچھ خوراک کی تلاش میں بھٹکتا ہوا اس سے بھڑ گیا۔ فوکناجو خان نے اس کی صورت دیکھتے ہی اس کی جانب چھلانگ لگائی اور اس سے لپٹ گیا۔ مطیع الدین بھاگتا ہوا ان دونوں کے پاس پہنچا۔ ریچھ فوکناجو خان سے اونچا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ اسے گرا کر نقصان پہنچا دیتا۔ مطیع الدین نے کمال ہوشیاری سے تلوار کا گہرا وار کیا اور ریچھ کا دایاں بازو کٹ کر دور جا گرا ریچھ بازو کٹنے پر اس بری طرح ڈکرایا کہ جنگل کا بھیانک سکوت ٹوٹ کر رہ گیا۔ فوکناجو خان نے اسی لمحے اس کی گردن پر ہاتھ ڈال کر دباؤ کی شدت بڑھا دی۔ ریچھ پوری قوت سے اسے اپنے سے الگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا اور تھوڑی دیر میں ٹھنڈا پڑ گیا۔ ریچھ کے خون سے فوکناجو خان کے کپڑے تر ہو رہے تھے۔ ریچھ کی آخری ہچکی پر اس نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ اب مطیع الدین کو گھور کر دیکھ رہا تھا۔

''خیریت ہے......؟'' مطیع الدین کے منہ سے فقط اتنا نکلا۔

''خاک خیریت ہے۔ تمہیں کس نے کہا تھا کہ اس پر تلوار کا استعمال کرو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ زخمی جانور کو سنبھالنا زیادہ دشوار ہوتا ہے۔ وہ غصے اور تکلیف سے پاگل ہو جاتا ہے۔ ایسے میں اس کی قوت سوگنا بڑھ جاتی ہے''۔

''میں نے تو تمہاری مدد کرنا چاہی تھی......''

''تم خود شکاری نہیں ہو اسی لئے ایسا سوچتے ہو۔ اب میں اس کا کیا کروں گا؟ بازو کاٹ کر اس کی کھال کا بھی ستیاناس کر دیا''۔ فوکناجو خان حقیقتاً غصے میں تھا۔ مطیع الدین نے اس کا بگڑا مزاج دیکھ کر خاموشی سے خیمے کی راہ لی۔

''اب اُدھر کیا کرنے جا رہے ہو؟'' فوکناجو خان چیخ کر بولا۔ ''ادھر آؤ اور میرے ساتھ اسے اُٹھانے میں مدد کرو''۔

مطیع الدین اس کی بات سن کر پلٹا پھر دونوں نے مل کر ریچھ کو گھسیٹتے ہوئے خیمے کے پاس پہنچایا۔ فوکناجو خان نے اس سے شکاری خنجر لیا اور ماہرانہ انداز سے ریچھ کی کھال جسم سے اتارنے لگا۔ مطیع الدین خاموشی سے اس کے پاس بیٹھ کر یہ سب دیکھتا رہا۔ اسے حقیقتاً کبھی ریچھ کے شکار کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ فوکناجو خان نے کھال

سلیقے سے لپیٹ کر ایک جانب ڈال دی۔ اب وہ ریچھ کا پیٹ چاک کر کے اسے آلائشوں سے صاف کر رہا تھا۔ وہ کافی دیر تک اپنے کام میں مصروف رہا۔ اس کے ہاتھ اتنی مہارت سے رواں تھے کہ مطیع الدین کئی بار بے اختیاری سے پہلو بدل کر رہ گیا۔ فوکناجو خان نے ریچھ کے گوشت کے پارچے بنا کر ایک بڑے کپڑے میں لپیٹ کر رکھ دیے۔

''کل صبح دھوپ میں انہیں ڈال دیں گے شام تک اکڑ جائیں گے''۔ فوکناجو خان نے اسے بتایا۔

''یہ تو خراب ہو جائیں گے؟''

''تم بے فکر رہو سرد علاقے میں گوشت جلدی خراب نہیں ہوتا۔ دھوپ سے گوشت کا پانی بھی خشک ہو جائے گا''۔

''خشک گوشت کو شاید مسالہ بھی لگایا جاتا ہے''

''مجھے معلوم ہے، میں صبح مسالے کے پودے لے آؤں گا میں نے راستے میں کئی جگہ انہیں دیکھا ہے''۔ فوکناجو خان کا بگڑا مزاج صحیح ہو گیا تھا۔

تم خیمے میں سے میرا دوسرا لباس نکالو۔ یہ نہ ہو کہ خون کی بو پا کر کوئی دوسرا جانور اس جانب نکل آئے''۔ مطیع الدین خیمے کے اندر چلا گیا۔ وہ کچھ دیر بعد نکلا تو فوکناجو خان اسے اسی جگہ دکھائی دیا جہاں اس نے ریچھ کو مار گرایا تھا۔ فوکناجو خان اپنے بھاری بھرکم جوتوں سے اس جگہ کو بری طرح مسل رہا تھا۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟''

''خون کی بو مار رہا ہوں۔ مٹی اور ریت میں مل کر خون کی بو ختم ہو جائے گی''۔ فوکناجو خان نے اس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر وہ خیمے کے پاس چلا آیا اس نے اپنا لباس بدلا اور خون والے لباس کو ایک موٹے کپڑے میں لپیٹ دیا۔

''میرا خیال ہے کہ یہاں کہیں نزدیک کوئی چشمہ موجود ہے۔ رات کی خاموشی میں پانی بہنے کی آواز محسوس ہو رہی ہے''۔ فوکناجو خان نے کہا۔

''میں بھی تمہارے خیال سے متفق ہوں مگر اندازہ نہیں لگا پا رہا کہ یہ چشمہ کس جانب ہو سکتا ہے''۔ مطیع الدین چاروں جانب دیکھتا ہوا بولا۔

''تم یہیں ٹھہرو! میں دیکھتا ہوں، یہ خون والے کپڑے بھی مجھے دے دو اگر چشمہ مل گیا تو ان پر پانی ڈال لاؤں گا''۔ فوکناجو خان نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ سب صبح دیکھا جائے گا''۔

''تمہیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہم اس وقت جنگل میں ہیں۔ خون کی بو بڑی تیز ہوتی ہے اور خونخوار درندے اسے فوراً پا لیتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ رات میں کسی درندے کا سامنا کروں''۔

مطیع الدین کچھ نہیں بولا۔ فوکناجو خان نے خود ہی ہاتھ بڑھا کر اس کے پہلو میں پڑے ہوئے خون آلود کپڑوں کی پوٹلی اُٹھائی اور پانی کی آواز کا اندازہ لگا کر ایک طرف چل پڑا۔ مطیع الدین نے اسے پیچھے سے آواز دی اور لمبے پھل والا خنجر اس کی جانب اچھال دیا۔ خنجر اس کے پاس جا گرا۔ فوکناجو خان نے جھک کر خنجر اُٹھایا اور آگے بڑھ گیا۔ مطیع الدین خیمے کے باہر ہی بیٹھ گیا۔ وہ تنہائی کے عالم میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ ایک بار پہلے بھی وہ تنہائی اور بے خبری کے عالم میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا۔ خیمے کے باہر بیٹھے اس کا ذہن ایک بار پھر گل دقوژ کی جانب بھٹک گیا۔ وہ گذرے لمحوں کے سمندر میں اترتا چلا گیا اچانک اسے کسی حرکت کا احساس ہوا۔ اس کا ذہن

فوراً بیدار ہو گیا۔ وہ چونک کر اپنے اردگرد دیکھنے لگا۔ مشعل کی روشنی میں اسے کچھ دور تک کا حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے آگے گہرا اندھیرا تھا۔ وہ اس جانب سر اُٹھا کر دیکھنے لگا جہاں کچھ دیر پہلے فونتا جو خان گیا تھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کا ذہن پوری طرح چوکس تھا۔ یہ اس کی چھٹی حس کا کمال تھا کہ اسے اپنے گرد کسی کی موجودگی کا احساس بڑی شدت سے ہو رہا تھا۔ وہ اپنے گرد موجود خطرے کو یہ احساس بھی نہیں دلانا چاہتا تھا کہ وہ اس سے آگاہ ہو گیا ہے۔ اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ وہ فونتا جو خان کو آواز دے، شاید وہ ہی ہو مگر کسی خیال کے تحت وہ آواز نکالنے سے باز رہا۔ اس کی گرفت تلوار کے دستے پر مضبوط ہو چکی تھی۔



سیف الدین محمود قطوزی نے کم سن سلطان کے اتالیق کی حیثیت سے کئی احکام جاری کئے جن میں سرکش ایوبی والیوں کی سرکوبی اور بلادِ مصر کے امن کا استحکام شامل تھا۔ وہ خاندان خوارزم شاہیہ کا ایک ہونہار فرد تھا جس نے اپنے ماموں سلطان جلال الدین شاہ کو چنگیز خان کے مقابلے پر ڈٹے دیکھا تھا۔ وہ بہادر دادا کا نواسا تھا۔ اس کی ماں جرأت مند سلطان محمد علاء الدین شاہ کی بیٹی تھی جس کا جاہ و دبدبہ چین و ترکستان سے لے کر وادیٔ سندھ تک اور مرکز اسلام بغداد میں معروف تھا۔

ایک دن وہ قاہرہ کے شافعی مسلک کے مشہور فقیہ شمس الدینؒ ابوالعباس کے پاس جا پہنچا۔ انہوں اس کی صورت دیکھی تو اُٹھ کر اسے اپنے پاس بٹھایا اور خیریت دریافت کی۔ سیف الدین محمود قطوزی بیٹھنے کے بعد کچھ دیر سر جھکائے خاموش رہا۔ شمس الدینؒ نے اپنے پاس موجود لوگوں کے امور جلدی جلدی نبٹائے اور اس کی جانب توجہ کی۔

"اتابک سلطنت کو میرے غریب خانے کی یاد آج کیسے آگئی؟"

"ابوالعباس! میں دو روز سے ایک پریشانی کا شکار ہوں، سمجھ نہیں آتا کہ اسے کیا نام دوں؟"

"محمود! جو کچھ بھی ہے صاف لفظوں میں بتاؤ میں پوری کوشش کروں گا کہ تمہارے دل و دماغ کو اطمینان نصیب ہو"۔

"دو روز سے آنکھ بند ہوتے ہی ایک عجیب سا خواب مجھے گھیر لیتا ہے چونک کر بیدار ہو جاتا ہوں تو کافی دیر تک دل دھڑکتا رہتا ہے۔ پھر سونے کی کوشش کرتا ہوں تو نیند کا غلبہ ہوتے ہی وہ خواب دوبارہ میرے دل و دماغ کو جھنجھوڑنے لگتا ہے۔ سمجھ نہیں آتا ہے کہ آخر یہ سب کیا ہے؟" اس نے پریشانی کے عالم میں بتایا۔ شمس الدینؒ ابوالعباس نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ خون کی مانند سرخ دکھائی دیں۔ اسے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں ہوئی کہ وہ خواب کے خوف سے سو نہیں پایا

"محمود! کیا تم مجھے اس خواب کے بارے میں کچھ بتاؤ گے؟"

"میں دیکھتا ہوں کہ میں شہر کے صدر دروازے پر کھڑا ہوں اور دور سے مرغولوں کی صورت میں ایک بڑا ٹڈی دل میری جانب بڑھ رہا ہے۔ میں پہلے یہ خیال کرتا ہوں کہ شاید گرد و غبار کا بڑا ریلہ ہے مگر جونہی وہ کافی قریب پہنچ جاتا ہے تو اس کی حقیقت مجھ پر آشکارا ہو جاتی ہے۔ ان میں سے کچھ ٹڈیاں میرے نزدیک آگرتی ہیں تو میں انہیں دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتا ہوں۔ ان کی لمبی لمبی مونچھیں خون آلود ہیں اور چپٹے چپٹے منہ سے دانت چمک رہے ہیں میں خوف سے لرزتا رہتا ہوں کہ میرے عقب سے ایک خوبصورت سفید پرندوں کا غول برآمد ہوتا ہے اور وہ اس ٹڈی دل پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ وہ بڑی سرعت سے اس ٹڈی دل کو کھا جاتے ہیں۔ پھر وہ اُڑتے ہوئے واپس میری جانب آتے ہیں تو میں ڈر کے مارے انہیں ہش ہش کرتا ہوں کہ کہیں مجھے بھی نہ کھا جائیں۔ اس

پرندوں کے غول میں سے ایک پرندہ میری آنکھوں کے مقابل ٹھہر کر مجھے گھورتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں جھانکنے پر مجھے دکھائی دیتا ہے کہ اس کی آنکھ میں ہلکا سا کرنج موجود ہے۔ لمحہ بھر میں وہ کرنج غائب ہو جاتا ہے اور میں اسے وہم قرار دیتا ہوں کہ پرندہ اپنا منہ کھولتا ہے تو اس کے بڑے بڑے دانت دکھائی دیتے ہیں اور اس کی زبان باہر نکلتی ہے جس پر ملک الموت لکھا دکھائی دیتا ہے۔ میں چیخ مار کر پیچھے ہٹتا ہوں تو میری آنکھ کھل جاتی ہے"۔

شمس الدینؒ ابوالعباس بڑے غور و انہماک سے اس کا خواب سن رہا تھا۔ اس نے بات مکمل ہونے پر اپنی گردن جھکائی اور کچھ دیر کے لئے آنکھیں بھینچ لیں۔ سیف الدین محمود قطوزی اس کے انہماک کو دیکھ کر خاموشی سے منتظر بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد شمس الدینؒ نے اپنی آنکھیں کھولیں اور کھنکار کر انا للہ وانا الیہ راجعون...... کہا اور پھر اس کی جانب متوجہ ہوا۔ "محمود! اللہ تعالیٰ ہم سب کے حال پر رحم فرمائے تمہارا خواب کسی حد تک مبارک ہے اور کچھ پریشان کن بھی۔ بلادِ مصر کی حفاظت چونکہ اس وقت تمہارے ذمے ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے تمہیں قبل از وقت ایک آنے والے خطرے سے آگاہ کیا ہے وہ خطرہ کیا ہو سکتا ہے؟ اس کے بارے میں تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا البتہ وہ جو کچھ بھی ہے بڑا شدید اور ہولناک ہے۔ اس ہولناکی کا ٹل جانا بھی تمہارے خواب سے ثابت ہے۔ سفید پرندے اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد ہے۔ البتہ جس پرندے کا تم ذکر کر رہے ہو اس کے بارے میں میں کوئی درست رائے نہیں دے سکتا۔ ممکن ہے کہ تم سے اس قہر الٰہی کے دوران میں کوئی خطا یا برائی سرزد ہو جائے، اسے محض تنبیہی اشارہ کہا جا سکتا ہے یا ممکن ہے کہ اس خطرے کی زد میں تم بھی آ جاؤ"۔

"میری اس بات سے شاید آپ کو کچھ اندازہ ہو جائے کہ اس طرح کا ملتا جلتا خواب میں نے اپنے بچپن میں دیکھا تھا اور پھر منگولوں نے ہماری سرزمین کو روند ڈالا اور بے شمار لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار ڈالا۔ بستیوں کی بستیاں تباہ و برباد کر ڈالیں۔ ہمارا خاندان مفلوک الحالی کی چکی میں پس کر رہ گیا۔ کہیں یہ ویسا ہی اشارہ تو نہیں ہے؟"

"اللہ تعالیٰ تمہارے بزرگوں اور بے گناہ لوگوں پر رحم کرے میں نے سلطنت خیوا کی تباہی کا حال سنا ہے۔ تم بے فکر رہو۔ بلادِ مصر ان سے بہت دور ہے۔ یہاں تک پہنچنے سے پہلے انہیں امیر المومنین سے ٹکرانا ہو گا۔ الحمدللہ بغداد کوئی کچی لکڑی نہیں ہے جسے توڑ لیا جائے۔ تمام امت مسلمہ بغداد پر اپنی جان چھڑکتی ہے۔ اس کی جانب اُٹھنے والی منگولوں کی ہر انگلی کو توڑ دیا جائے گا تم منگولوں کی جانب سے اطمینان رکھو۔ اگر انہوں نے ایسی غلطی کی تو انہیں روئے زمین پر ڈھونڈے سے کہیں پناہ نہیں مل سکے گی"۔

"اللہ تعالیٰ آپ کی زبان مبارک کرے۔ بلادِ مصر کے اطراف سے اُٹھنے والی پریشانیوں کو میں سنبھال لوں گا مگر جانے کیوں منگولوں کی جانب دھیان جاتے ہی میرا دل ڈوبنے لگتا ہے"۔

شمس الدینؒ ابوالعباس نے نرم لہجے میں اس کی ڈھارس بندھائی اور رات کو سونے سے پہلے چند آیات کا ورد بتایا انہوں نے اس کی حالت کو ماضی کی تلخ یادوں سے تعبیر کیا تھا۔ منگولوں کی ہولناکی اور سفاکی حقیقتاً ایسی ہی تھی۔ جن لوگوں نے اس خونخواری کا عالم اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ عرصہ تک سکون اور نیند سے محروم رہے تھے۔ سلطنت خیوا شاہی جسے خوارزم بھی کہتے ہیں بے حد عظمت و استقلال سے عبارت تھی مگر جب اس پر منگولوں کا عذاب نازل ہوا تو یہ ایسی تباہ و برباد ہو کر بکھری کہ طویل زمانے تک اس کی رونقیں بحال نہ ہو پائیں ایسے روح فرسا مناظر دیکھنے والے کسی فرد کا یوں ایک عجیب خواب سے خوفزدہ ہو جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ شمس الدینؒ ابوالعباس نے ہر ممکن کوشش کی کہ سیف الدین محمود کے دماغ میں چھایا ہوا خوف و ہراس کم کر دیا جائے اور ان کی کوشش بے کار نہیں گئی تھی۔ سیف الدین محمود قطوزی جب وہاں سے نکلا تھا تو اس کا چہرہ پُرسکون تھا۔



بیبرس زندگی کی یکسانیت سے اس قدر اکتا جاتا کہ کبھی کبھار وہ خود کو ناکارہ خیال کرتا۔ وہ ایک ہزار سپاہیوں کا سالار بن چکا تھا مگر جنگ و جدل کے معرکے دورِ امن میں سرد پڑ چکے تھے۔ اس نے اپنے فارغ اوقات میں یہ معمول بنالیا کہ وہ شیخ عزالدینؒ کی خدمت میں حاضر رہتا اگر وہ قاہرہ کی مرکزی مسجد جامع عمرو بن عاصؓ میں درس و تدریس میں مصروف ہوتے تو ان کی باتوں کو بڑے انہماک سے سنتا۔ شیخ عزالدینؒ جامع عمرو بن عاصؓ کے مہتمم و منتظم بھی مقرر تھے۔ یہاں وہ ہروقت لوگوں پر تعلیماتِ شرعیہ کے پھول برسایا کرتے تھے۔ اگر شیخ عزالدینؒ کمرۂ عدالت میں ہوتے تو بیبرس وہاں بھی موجود ہوتا اور ان کے فیصلوں کو بڑی توجہ سے سنتا۔ رات کی مجالس میں تو وہ پہلے بھی شامل ہوا کرتا تھا۔ یہ معمول ایک عرصے سے جاری تھا۔ شیخ عزالدینؒ بیبرس کی عقیدت دیکھ کر اس میں دلچسپی لینے لگے۔ وہ اکثر اسے پند و نصائح کیا کرتے اور سابقہ خلفاء اور سلطانوں کے ایمان افروز واقعات سناتے۔ یہ صرف بیبرس کے لئے نہیں تھا بلکہ ان کی مجالس کے معمول کا ایک حصہ بھی تھا۔ بیبرس کے علاوہ امیر فارس الدین اقطائی بھی ان کے پاس آیا کرتا۔ سلطان الملک المعز کی وفات کے بعد اسے سپہ سالارِ اعلیٰ بنادیا گیا تھا اس منصب کے باعث اس کی دیگر مصروفیات بڑھ گئیں۔

ایک دن بیبرس شیخ عزالدینؒ کے پاس چلا آیا وہ چہرے سے کچھ افسردہ دکھائی دے رہا تھا۔ شیخ عزالدینؒ نے اس کی جانب دیکھ کر خیریت معلوم کی تو اس نے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ شیخ عزالدینؒ اس وقت کمرۂ عدالت میں موجود تھے اس لئے انہوں نے زیادہ دباؤ نہیں ڈالا۔ البتہ رات کی مجلس میں انہوں نے اس سے افسردگی کی وجہ دریافت کی۔ بیبرس کچھ دیر تک خاموش رہا۔ ان کے دوبارہ استفسار پر اس نے لب کشائی کی۔

''اک عجیب سے خواب نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ آج صبح جب خواب سے بیدار ہوا تو اذانِ فجر کانوں میں پڑی تو میں مزید پریشان ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ وہ ہم سب پر رحم و کرم فرمائے''۔

''اگر تو کوئی اچھا خواب ہے تو بیان کر دو ورنہ خاموشی میں ہی بہتری ہے''۔ شیخ عزالدینؒ نے کہا۔

''میں کچھ کہہ نہیں سکتا کہ اس میں اچھائی ہے یا نہیں......!'' بیبرس گومگوئی کے عالم میں بولا۔

''چلو بتا ڈالو! ورنہ مخمصے کا شکار رہو گے''۔ شیخ عزالدینؒ کے چہرے پر تبسم پھیل گیا۔

''خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں روضہ رسول ﷺ کے باہر بے کار بیٹھا ہوا ہوں اور دل میں خواہش مچل رہی ہے کہ کوئی کام مل جائے تو وہ کر ڈالوں مگر کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔ میں اسی کیفیت کا شکار تھا کہ ایک لمبی قامت، متناسب جثے کا باریش شخص میری جانب بڑھا اور کڑکتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''نوجوان ایک کام کرو گے؟'' میں نے اسے جواب دیا۔ ''الحمدللہ! اسی فکر میں ہلکان ہوئے جا رہا ہوں''۔ اس نے میری بات سن کر ایک لمحہ کچھ سوچا اور پھر اپنی چادر اتار کر میری جانب بڑھا دی اور کہا کہ یہ پھٹ گئی ہے اسے سی دو۔ میں اس کی چادر میں دیکھنے لگا جہاں ایک بڑا حصہ سرے سے ہی غائب تھا۔ میں نے اسے کہا کہ اس کا باقی ٹکڑا بھی لاؤ کہ اسے سی دوں۔ اس نے مجھے کہا کہ نوجوان یہ بس اتنی ہی بچی ہے۔ اسی میں کوئی کاریگری دکھاؤ۔ میں ہنسنے لگا۔ وہ میری جانب عجیب سی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا کہ میرے پاس سوئی دھاگہ نہیں ورنہ اسے ایسا رفو کرتا کہ یہ سوراخ بند ہو جاتا۔ اس نے اپنے لباس میں سے ایک سوئی اور دھاگے کا لچھا میری جانب بڑھا دیا اور بولا اور کچھ تو نہیں چاہیے؟ میں نے اس کے ہاتھ سے چیزیں لے کر کہا کہ بس کافی ہیں۔ اس کے بعد میں نے سر جھکایا اور وہ چادر رفو کرنا شروع کر دی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب میں اپنا کام مکمل کر چکا تو سر اُٹھا کر اس کی جانب دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ اسی پریشانی کے عالم میں میری آنکھ کھل گئی''۔ بیبرس خاموشی سے ان کی جانب دیکھنے لگا۔

''الحمدللہ! یہ تو بڑا مبارک خواب ہے''۔ شیخ عزالدینؒ اپنی جگہ جھوم اُٹھے۔ حاضرین محفل میں بیبرس کی

بات پر تجسس سا پیدا ہوگیا تھا۔ وہ منتظر تھے کہ شیخ عزالدینؒ کیا تعبیر بتائیں گے۔

''حضرت! ہمیں بھی کچھ سمجھایئے کہ یہ سب کیا ہے؟'' حاضرین میں سے ایک شخص بے تابی سے بول اُٹھا۔ دوسروں کے چہرے بھی تائیدی نگاہوں سے شیخ عزالدینؒ کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

''مزید کچھ بتائیں گے کیا؟'' بیبرس آہستگی سے بولا۔ شیخ عزالدینؒ نے نفی میں گردن ہلائی تو حاضرین کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ شیخ عزالدینؒ نے حاضرین مجلس کی توجہ دوسری جانب مبذول کرتے ہوئے دوسری بات چھیڑ دی اور ایسی عمدگی سے سلسلہ کلام جوڑا کہ سب کی توجہ بیبرس کے خواب سے ہٹ گئی۔ تہجد سے کچھ پہلے اس محفل کا اختتام ہوا اور سب لوگ اُٹھ کر اپنے اپنے گھروں کی جانب لوٹنے لگے۔ بیبرس نے آگے بڑھ کر شیخ عزالدینؒ سے مصافحہ کیا تو ان کی سرگوشی نما آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

''جس شخص نے تمہیں وہ چادر دی تھی وہ رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ تھے اور وہ چادر کچھ اور نہیں خلافت الٰہیہ ہے جس کی حفاظت کے لئے تمہیں منتخب کرلیا گیا ہے۔ یہ بات اپنے تک محدود رکھنا۔ وقت آنے پر خود ہی ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے گی کہ خلافت کی حفاظت کی ذمہ داری تم پر ڈال دی جائے گی''۔

بیبرس چونک کر ان کی صورت دیکھنے لگا۔ انہوں نے اشارہ کرتے ہوئے اسے رخصت کر دیا۔ بیبرس کچھ اور پوچھنا چاہ رہا تھا مگر شیخ عزالدینؒ اس کے مزید ٹھہرنے پر راضی نہیں تھے۔ وہ بے چارگی کے عالم میں وہاں سے نکل آیا۔ گھر تک پہنچنے تک اس کے ذہن میں شیخ عزالدینؒ کے فقرے گونجتے رہے۔ اسے کسی قدر خوشی بھی تھی کہ اس کی جان ناموسِ خلافت کے کام آجائے تو اس کے لئے اس سے بڑا اعزاز کیا ہو سکتا ہے؟ مگر پریشانی اس امر کی تھی کہ ناموس خلافت پر ایسی کون سی مصیبت ٹوٹنے والی ہے جس سے اس کا ایک حصہ ہی گم ہو جائے گا۔ وہ خیالات کے بھنور میں پھنس کر جانے کیا کیا سوچتا رہا اور بالآخر نیند کے شدید غلبے نے اس کی سب پریشانیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔



مطیع الدین بے حد چوکنے انداز میں بیٹھا ارد گرد دیکھ رہا تھا۔ کوئی نہ کوئی ضرور اس کے قریب میں موجود تھا جو اُسے بخوبی دیکھ رہا تھا اور اپنی موجودگی کے منکشف ہو جانے پر دبک کر بیٹھ گیا تھا۔ بالآخر اس سے نہ رہا گیا تو وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور رزوردار آواز میں بولا۔

''تم جو کوئی بھی ہو اندھیرے سے نکل کر میرے سامنے آجاؤ۔ مجھے تمہاری موجودگی کی خبر ہوگئی ہے یہ نہ ہو کہ میری تلوار سے تمہارا خون ناحق بہہ جائے''۔ مطیع الدین خاموشی سے قرب و جوار میں دیکھنے لگا۔ کچھ دیر تک یونہی سناٹا چھایا رہا پھر کسی کی حرکت کی آواز سنائی دی۔ وہ آواز کی سمت میں گھوم گیا۔ اندھیرے میں اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اچانک کسی کے چلنے کی چاپ سنائی دی مطیع الدین کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں پیش آئی کہ وہ جو کوئی بھی تھا اکیلا نہیں تھا۔ کچھ ہی دیر بعد دو افراد تاریکی میں سے نکل کر اس کے سامنے آ گئے، ان کے چہرے ڈھاٹوں میں چھپے ہوئے تھے۔ لمبے لمبے لبادوں میں انہوں نے خود کو لپیٹا ہوا تھا۔ اسی اثناء میں نوئنا جوخان بھی وہاں آ پہنچا۔ اسے دور سے ہی مطیع الدین کی آواز سنائی دی تھی، وہ کسی کی موجودگی یا کسی جانور کے حملے کے خیال میں تیز قدموں سے آیا تھا۔ خیمے کے سامنے وہ دو افراد کو موجود پا کر ٹھٹک گیا۔

''مطیع الدین! کون لوگ ہیں؟'' وہ جلدی سے بولتا ہوا آگے بڑھا۔

''معلوم نہیں! مجھے تو ان کی موجودگی کا احساس کافی دیر پہلے ہو چکا تھا''۔

''کون ہو تم لوگ؟'' نوئنا جوخان تیز آواز سے ان کی جانب متوجہ ہوا۔

''مسافر! ہم رستے سے بھٹک گئے ہیں''۔ ایک شخص بولا۔

''کہاں سے آئے ہو اور کدھر جانے کا ارادہ ہے؟'' مطیع الدین نے دریافت کیا۔

''ہمیں منگولوں کی سرزمین سے کہیں دور جانا ہے''۔ وہ شخص بولا۔

''کیا مطلب؟'' فونا جو خان اس کے جواب پر چونک گیا۔ ''صاف صاف بتاؤ''۔

''ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہمیں دوست سمجھو، ہم صرف خود کو نقصان پہنچانے والوں پر حملہ کرتے ہیں''۔ مطیع الدین نے تسلی دی۔

''تم شاید مسلمان ہو؟'' وہ شخص بولا۔ مطیع الدین نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ہم تم پر بھروسا کر سکتے ہیں۔ میرا نام شکنان ہے، اور ہمارا تعلق قبیلہ سرخ غر سے ہے''۔ مطیع الدین کو اس کی بات پر حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

''میرا تعلق کسی طرح سے بھی قبیلہ سرخ غر سے نہیں ہے میں ضرگا ی قبیلے سے ہوں۔ تم جھجکو مت، میں تمہاری ہر آفت سے حفاظت کروں گا''۔ فونا جو خان نے اپنا تعارف کرایا۔

''دراصل میں اور یہ اپنے قبیلے سے فرار ہو کر جائے پناہ کی تلاش میں ہیں۔ سرخ غر کے لوگ ہماری تلاش میں ادھر ادھر بھٹک رہے ہیں''۔

''یہ کون ہے؟ اور تم لوگ اپنے چہرے کھول دو مجھے پوشیدہ چہروں سے وحشت ہوتی ہے''۔ مطیع الدین نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ شکنان نے اپنے چہرے کا ڈھاٹا کھول دیا تھا۔ وہ چہرے سے منگول نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ اس بات پر مطیع الدین کو حیرت ہوئی جبکہ اس کے ساتھ دوسرا فرد چہرہ کھولنے سے ہچکچا رہا تھا۔ شکنان نے اسے اشارہ کیا تو اس نے اپنے چہرے سے پردہ اٹھا دیا۔ فونا جو خان اسے دیکھ کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ وہ کوئی عورت تھی۔

''یہ کون ہے اور تمہاری کیا لگتی ہے؟'' مطیع الدین معاملے کو کسی حد تک سمجھ چکا تھا۔

''یہ میرے منگول آقا کی بیٹی ہے، اسی نے مجھے اس جانب مائل کیا کہ ہم کہیں دور نکل جائیں''۔

''یار مردوں والی بات کرو۔ کیا عورتوں کی سی صفائیاں پیش کر رہے ہو سیدھی طرح کہو کہ محبت کے مارے ہو اور خدا کی زمین پر اپنی جنت بسانے کے درپے ہو''۔ مطیع الدین نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ تمہاری قبیل کے لوگ لگتے ہیں''۔ فونا جو خان نے مطیع الدین پر پھبتی کسی مطیع الدین مصنوعی غصے سے اسے گھورنے لگا۔

''تم ہمارے ساتھ یہاں آرام کرو۔ ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں، سرخ غر کے باپ بھی تمہیں ہاتھ نہیں لگا سکتے''۔ فونا جو خان نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ وہ دونوں شاید شدید بھوکے تھے اسی لئے وہ عورت نہ رہ پائی اور اس نے اپنی ضرورت کا اظہار کر ڈالا۔ مطیع الدین نے ان دونوں کے لئے کھانا نکالا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ سرخ غر کے لوگ یہیں گھوم رہے ہیں ہمیں چوکنا رہنا ہوگا''۔ مطیع الدین نے فونا جو خان کو مخاطب کیا۔ وہ دونوں اس بات پر اسے دیکھنے لگے۔ فونا جو خان نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں اطمینان دلایا۔

''چلو! دو دو ہاتھ تو کرنا ہی تھے، کل نہیں تو آج ہی سہی''۔ فونا جو خان نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر میں وہ دونوں کھانا کھا چکے تھے۔ مطیع الدین نے اپنی چھاگل ان کی جانب بڑھائی۔

''شکنان! میں تم سے کچھ پوچھنا چاہوں گا، مجھے یقین ہے کہ تم سچ بتاؤ گے''۔

''ہم نے تم پر مکمل بھروسہ کرتے ہوئے اپنے بارے میں صحیح بتایا ہے''۔ وہ تذبذب کا شکار ہو گیا۔

''مجھے تمہارے بارے میں نہیں سرخ غر کے بارے میں کچھ پوچھنا ہے''۔ مطیع الدین نے کہا۔

''میں کوشش کروں گا کہ صحیح بتاؤں''۔

''قبیلہ سرخ غر کا قونائی خان سے کیا تعلق ہے؟'' مطیع الدین نے سوال کیا۔ اسے کوئی توقع نہیں تھی کہ اس کا جواب اسے مل پائے گا۔

''کون قونائی خان؟'' شکنان کی آنکھوں میں حیرت نمودار ہوئی۔ ''قبیلہ سرخ غر میں کوئی ایسا شخص نہیں جس کا نام قونائی خان ہو''۔

''اوہ! میں تمہیں صحیح سمجھا نہیں سکا۔ قونائی خان قبیلہ سرخ غر کا نہیں ہے بلکہ وہ سرائے میں رہتا ہے اس کی قبیلے والوں سے کوئی رشتہ داری ہے، جس کے بارے میں، میں نہیں جانتا''۔

''تم کہیں گل دقوز کے باپ کے بارے میں تو نہیں پوچھ رہے جو قتل ہو گیا تھا؟'' عورت جوشیلے انداز میں یکدم بول پڑی۔ مطیع الدین اس غیر متوقع بات پر بری طرح اچھلا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی پڑی تھی۔

''ہاں...... ہاں وہی!'' وہ چیختا ہوا بولا جیسے اسے ہوش آ گیا ہو۔ ''لیکن تم گل دقوز کو کیسے جانتی ہو؟''

''وہ ہمارے ساتھ ہی وہاں سے نکلی تھی مگر......'' وہ اچانک خاموش ہو گئی۔ شکنان اس کی جانب تیز نگاہوں سے دیکھنے لگا شاید اسے اس کی بے جا مداخلت پسند نہیں آئی تھی۔

''ہاں کہو کہو تم رُک کیوں گئی؟'' مطیع الدین کی وارفتگی دیکھنے کے لائق تھی۔ فونا جو خان اس نئی صورتِ حال سے خود پریشان دکھائی دے رہا تھا اس کا ذہن پوری طرح مستعد تھا۔ وہ ان لوگوں کی اچانک آمد اور پھر گل دقوز سے تعلق پر شک وشبہ کا شکار ہو گیا تھا اس کی چھٹی حس بار بار کسی خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔

''دراصل بات یہ ہے کہ وہ ہمارے ساتھ تو ضرور وہاں سے آئی مگر وہ یہاں کسی غار میں ہم سے گم ہو گئی''۔ وہ بات جوڑتا ہوا بولا۔

''گم ہو گئی...... کیا مطلب؟'' مطیع الدین کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''میں اور گمنام دونوں صبح ہونے پر اس غار سے باہر نکلے جہاں ہم تینوں رات بھر ٹھہرے تھے ہم دونوں وہاں سے نزدیکی چشمے تک پہنچے اور وہاں ہاتھ منہ دھویا۔ میں نے کچھ جنگلی پھل توڑے اور ہم دونوں واپس غار کی جانب لوٹے تو وہاں غار ہی موجود نہیں تھا۔ میں یہ دیکھ کر ششدر گیا کیونکہ گل دقوز کو ہی راستوں کا علم تھا۔ میں اس بارے میں کچھ جانتا ہی نہیں تھا''۔

''نوجوان! تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا کیسی اول فول بک رہے ہو''۔ فونا جو خان نے سخت لہجے میں کہا۔

''میں گمنام کی قسم کھا کر کہہ رہا ہوں ایسا ہی ہوا ہے۔ میں سمجھا کہ شاید ہم راستہ بھول گئے ہیں لہٰذا ہم دونوں دوبارہ اس چشمے پر پہنچے اور پھر دوبارہ اسی راستے سے واپس وہاں پہنچے مگر وہاں غار نہیں دکھائی دیا''۔ اس کا لہجہ اس کی سچائی کی چغلی کھا رہا تھا۔

''یہ واقعہ کب رونما ہوا؟'' مطیع الدین نے دریافت کیا۔

''یہ آج صبح کی بات ہے۔ اس وقت سے ہم اس جنگل میں بھٹک رہے ہیں۔ ہم کو کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا کہ کس طرف کو نکلیں کہ یہ جنگل ختم ہو جائے''۔ گمنام نے جواب دیا۔

''اس چشمے کو پہچانتے ہو جہاں تم لوگ گئے تھے''۔ فونا جو خان نے اچانک سوال کیا۔

''ہاں! اسے دیکھ کر پہچان لوں گا''۔

''ٹھیک ہے تم آرام کرو، اس بارے میں کل صبح بات ہوگی''۔ فوتنا جو خان نے کہا۔ مطیع الدین شاید کچھ اور بھی پوچھنا چاہ رہا تھا مگر اس نے اشارے سے منع کر دیا۔ وہ دونوں خیمے سے باہر نکل آئے۔ فوتنا جو خان نے ایک دوسرا خیمہ نکالا اور اسے لگانے میں جت گیا۔ مطیع الدین اس کا مقصد سمجھ گیا تھا وہ اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ وہ کام میں مصروف ضرور تھا مگر اس کا دماغ ان لوگوں کی باتوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ فوتنا جو خان نے خیمہ لگانے کے بعد جب اسے تنہا آرام کرنے کا کہا تو مطیع الدین نے چونک کر اس سے وجہ دریافت کی۔

''میں رات کو ان لوگوں کا خیال رکھوں گا کیونکہ مجھے خدشہ ہے کہ وہ فرار ہو جائیں گے، صبح ہونے پر میں انہیں ایک نئی چیز دکھاؤں گا تو سب سچائی سامنے آجائے گی۔ تم بے فکر ہو کر سو جاؤ، سمجھو کل صبح گلی دقو ژل جائے گی اگر وہ ان کے ساتھ واقعی آئی ہے تو......!''

مطیع الدین کچھ سمجھ نہیں سکا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے خاموش رہا البتہ خیمے کے بستر پر لیٹنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ کانٹوں کا بستر کسے کہتے ہیں۔

❁ ❁ ❁

برقائی تقریب قرولتائی سے اپنے بھائیوں اور دیگر رشتہ داروں کے ہمراہ واپس سرائے لوٹ آیا۔ سرائے کا پرانا نام اتل تھا جو کہ دریائے والگا کے کنارے پر آباد تھا۔ چنگیز خان کے بڑے بیٹے توشی خان کو یہ جگہ اس قدر بھائی کہ اس نے اسے اپنی سلطنت کا دارالخلافہ قرار دے دیا۔ اس کے بعد سے اب تک اسے اردوئے زریں میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ برقائی خان کو جس خدشے کا اندیشہ لاحق تھا وہ قدرت نے ایسے مٹا ڈالا تھا جیسے اس کا وجود ہی نہ ہو۔ یساق کی یہ ترمیم اس کے مقاصد کے لئے بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ اس نے سرائے پہنچ کر سب سے پہلے ہر عام و خاص کو اس ترمیم سے آگاہ کیا اور اپنے مسلمان ہو جانے کا برملا اظہار کر دیا۔ منگولوں کے ایک بڑے طبقے نے جو کہ اسلام کی جانب رغبت رکھتے تھے موت کا خوف دور ہوتے ہی اسلام میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ جو لوگ خفیہ مسلمان ہو چکے تھے انہوں نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ باتو خان تک مسلسل ایسی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ وہ اس نئی روش پر خود کو بے بس محسوس کرنے لگا۔ اسے اب پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے کیوں یساق میں ترمیم کی تجویز پیش کی تھی۔ اس نے غم غلط کرنے کی خاطر خود کو شراب میں ڈبو دیا۔ باتو خان کو قرولتائی میں اپنی سبکی کا شدید دکھ تھا۔ وہ اکثر نشے کے عالم میں برقائی خان کو کوستا رہتا کہ کاش وہ اس کا بھائی نہ ہوتا۔

دریائے والگا کے کنارے برقائی خان کا محل مسلمانوں کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ برقائی خان نے مطیع الدین کی جانب قاصد دوڑایا۔ اس کی غیر موجودگی کی خبر پا کر وہ لمحہ بھر کو پریشان ہوا مگر دوسری مصروفیت نے اسے اس جانب سے غافل کر دیا تھا۔ جوں جوں دن گذرتے جا رہے تھے اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ زریں خیل منگولوں میں اسلام کی جانب رغبت بڑھنے لگی۔ برقائی خان نے اپنے کچھ قاصد دربار خلافت میں بھی تحائف کے ساتھ روانہ کیے تا کہ سلطنت خوارزم کے سینے میں لگائے گئے زخموں کا کسی حد تک مداوا کیا جا سکے۔

ایک دن وہ اپنے محل میں موجود تھا کہ اس کے بھائی باتو خان کا بڑا بیٹا سرتاق وہاں آگیا۔ بھتیجے کو دیکھ کر برقائی خان بڑی محبت سے پیش آیا۔ سرتاق کی عمر اکیس برس سے اوپر تھی۔ وہ بڑا مغرور اور ظالم طبیعت کا مالک تھا۔ اس نے کئی لوگوں کو ناحق قتل کیا اور شرفاء کی عزتیں اچھالی تھیں۔ اس کا دبدبہ ایسا تھا کہ کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اس کی شکایت باتو خان سے کرتا۔ یہی چیز اس کا مزاج بگاڑنے کے لئے کافی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ باتو خان تک اس کی حرکات کی پوری خبر پہنچ جایا کرتی اور وہ پوشیدہ انداز میں مراعات سے شرفاء کی دل جوئی کرتا رہتا۔ اسے خوف تھا کہ اس کے بعد اگر سرتاق بادشاہ بنا تو سو فی صد ملک میں بغاوت کے آثار پیدا ہو جائیں

گے۔ اس نے سرتاق کو کئی بار ہوشمندی اور معاملہ فہمی کی صلاح دی مگر وہ بدمستی کے عالم میں ایسا سرشار تھا کہ اسے اپنے باپ کی بات سننا تو گوارا تھی مگر اس پر عمل کرنا اس کی لغت میں نہیں تھا۔ باتو خان ان کے چال چلن کا شکوہ اکثر برقائی خان سے کیا کرتا کہ وہ ہی اسے راست کی ترغیب دے کیونکہ آنے والے وقت میں انہی لوگوں کے ہاتھ باگ ڈور سونپی جائے گی اگر اس کی روش ایسی ہی رہی تو اردوئے زریں توشی خان کی اولاد کے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ برقائی خان نے کسی حد تک اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی تو اس نے برقائی خان سے ہی کنی کترانا شروع کر دی۔ وہ کوشش کرتا کہ اس کا سامنا چچا سے نہ ہو جائے۔

سرتاق کی آمد برقائی خان کے لئے غیر متوقع تھی کیونکہ وہ ایک عرصے کے بعد اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ سرتاق خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھ گیا اس کے تیور کچھ اچھے معلوم نہیں ہوتے تھے۔

''کہو سرتاق! کیسے ہو اور کہاں غائب ہو گئے تھے، بڑے عرصے کے بعد یہ چچا تمہیں یاد آیا''۔

''چچا!'' سرتاق اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یہ تم نے کیا کھیل رچا رکھا ہے کہ میرے باپ کا چہرہ غم و اندوہ کی تصویر بن کر رہ گیا ہے''۔

''کیا ہوا؟'' برقائی خان اس کی بات سمجھ نہیں سکا۔ سرتاق اس کی سادگی پر ہونٹ کاٹنے لگا۔ ''تم سمجھتے ہو کہ جاودانی آسمان کے تنگری کو چھوڑ کر ان ملعونوں کے ساتھ سکھ چین سے رہ پاؤ گے ......ایسا نہیں ہوگا یہ تمہاری بھول ہے''۔

''میں نے روشنی کو پا لیا ہے اور یقین مستحکم رکھتا ہوں کہ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ میری زندگی ویسی ہی گذرے گی جیسے پہلے گذر رہی تھی البتہ میری عاقبت خوشگوار ہوگی''۔ برقائی خان نے جواب دیا۔

''تم کچھ نہیں سمجھتے چچا! تمہارا دماغ سٹھیا گیا ہے۔ میں تمہیں آخری بار تنبیہ کر رہا ہوں کہ اس بدمزگی کو پھیلانے سے باز آجاؤ ورنہ تمہارے خون میں میرے ہاتھ تر ہو جائیں گے''۔ سرتاق تیز آواز میں بولا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''لڑکے! ابھی تمہارے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے، یہ گیدڑ بھبکیاں کسی اور کو دینا۔ یاد رکھو کہ میں بھی تمہارا چچا ہوں''۔ برقائی خان اس کی بدتمیزی پر بھڑک گیا تھا۔

''چچا! کچھ عرصے کی بات ہے، خوب موج کر لو۔ پھر میں دیکھوں گا کہ گیدڑ بھبکیاں کس کی نکلیں گی''۔ سرتاق پاؤں پٹخ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں اپنے اللہ سے دعا کروں گا کہ وہ میرے ہاتھ تمہارے خون میں نہ رنگے اور تمہیں میری راہ میں لا کر کھڑا نہ کرے''۔ برقائی خان نے دانت پیس کر جواب دیا۔

''مگر میں جاودانی آسمان کے تنگری سے ضرور یہ دعا کروں گا کہ مجھے وہ ایسا موقع ضرور دے کہ میں تمہیں سبق سکھا سکوں اور واپس اپنی سابقہ روش کو اختیار کرنے مجبور کر دوں''۔ سرتاق طنزیہ انداز میں بولا۔ برقائی خان چپ رہا۔ سرتاق کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر ناک بھوں چڑھاتا ہوا واپس لوٹ گیا۔ برقائی خان کو اس کے رویے پر شدید رنج ہوا تھا۔ وہ باتو خان کے سب لڑکوں اور اپنے بھائیوں سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اسے ہرگز توقع نہیں تھی کہ سرتاق بدتمیزی کی تمام حدود پار کر جائے گا۔ اس نے تحمل کا دامن پکڑے رکھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اردوئے زریں میں کوئی بگاڑ پیدا ہو یا بدمزگی پھیلے۔ یہی وہ دن تھا جس نے اس کی تمام تر توجہ سلطنت کے امور کی جانب موڑ دی۔ وہ باقاعدہ طور پر ریاستی معاملات میں دلچسپی لینے لگا۔

❁ ❁ ❁

شنک گل وقوژ کا ماموں زاد بھائی تھا وہ زیادہ تر شکار میں مشغول رہا کرتا۔ گل وقوژ کو قبیلہ سرخ غر میں لانے کے بعد وہ حسب عادت پھر شکار پر نکل کھڑا ہوا۔ جب گھر کی یاد نے ستایا تو قبیلے میں لوٹ آیا۔ قبیلے میں پہنچنے کے بعد اسے گل وقوژ کا خیال آیا۔ گل وقوژ کے بارے میں اس کے دل کے کسی گوشے میں ہمدردی موجود تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ منک آنہ کی تحویل میں ہے جو اسے اپنے داماد تونائی خان کے قتل کے جرم میں کوئی خوفناک سزا دینا چاہتا ہے۔ گل وقوژ کا اصل جرم کیا تھا اس بارے میں شنک لاعلم تھا۔ اس نے قبیلے میں پہنچتے ہی گل وقوژ کی خیریت معلوم کی تو اسے معلوم ہوا کہ وہ دو دن قبل قبیلے کی ایک دوسری لڑکی گہنام اور ایک غلام شکنان کے ساتھ فرار ہوگئی ہے۔ یہ اس کے لئے حیرت کی بات تھی کہ قبیلے سرخ غر میں سے تین کمزور افراد اچانک فرار ہو جائیں اور قبیلے والوں میں سے کسی کو کچھ معلوم ہی نہ ہو سکے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ فرار کے منصوبے اچانک نہیں بنتے۔ ان کے پیچھے کئی دن کی سوچ بچار اور کسی نہ کسی کی مدد ضرور شامل ہوتی ہے۔ وہ اسی معاملے پر بات کرنے کی غرض سے منک آنہ کے پاس پہنچا۔ منک آنہ نے اپنے پوتے کو دیکھا تو اس کا چہرہ دمک اُٹھا۔

''دادا!'' شنک بولا۔ ''یہ میں گل وقوژ کے بارے میں کیا سن رہا ہوں؟''

''اس کی عقل میں خلل واقع ہوگیا تھا اسی لئے اس نے طبعی موت کے بجائے حادثاتی موت کو اپنے لئے چن لیا۔ تم اس کی فکر نہ کرو، وہ اپنے انجام تک پہنچ گئی ہے۔ میری گرفت سے کوئی اتنی آسانی سے فرار نہیں ہو سکتا''۔

''تو کیا...... گل وقوژ کو آپ نے ہلاک کروادیا ہے؟ وہ آپ کی نواسی تھی''۔ شنک چونک اُٹھا۔

''بے فکر رہو! وہ ابھی ہلاک نہیں ہوئی بلکہ صرف موت سے نبرد آزما ہے۔ یہ اس کی آخری سزا تھی۔ میں نے سمجھانے بجھانے کی بڑی کوشش کی کہ وہ تم سے شادی کرکے ہنسی خوشی زندگی بسر کرے مگر اس بدتمیز لڑکی کے دماغ پر کسی مسلمان کا بھوت سوار تھا۔ ایسی بغاوت کم از کم میں برداشت نہیں کرسکتا تھا''۔ منک آنہ کی بات سن کر شنک کے چہرے پر خوف کے آثار نمودار ہونے لگے۔

''صحیح بتایئے کہ آپ نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟''

''تمہارا چہرہ کیوں متغیر ہو رہا ہے، گل وقوژ کسی بھی ہمدردی کے لائق نہیں تھی''۔ منک آنہ نے اس کی صورت دیکھتے ہوئے کہا۔

''دادا!'' شنک بے چینی سے بولا۔ ''آپ میری فکر نہ کیجئے بلکہ مجھے صرف اتنا بتایئے کہ آپ نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟''

''میں نے اسے آخری رسم کی سزا دے دی ہے اور وہ اپنی سزا بھگت رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آج رات کے بعد وہ اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوجائے گی''۔

''کیا......!'' شنک اپنی جگہ اچھل پڑا۔ ''یہ آپ نے کیا ظلم کیا؟ گل وقوژ اگر آپ سے نہیں سمجھ پائی تھی آپ مجھے کہہ دیتے میں اسے سمجھا بجھا کر راہ راست پر لے آتا۔ ہمارا اس سے خونی رشتہ تھا''۔

شنک کے چہرے پر گہرا تاسف پھیل گیا۔ منک آنہ اس کی متغیر حالت پر پریشان تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی بات کی کیسے وضاحت کرے کہ شنک مطمئن ہوجائے۔ لہٰذا وہ خاموش رہا۔ کچھ توقف کے بعد شنک دوبارہ بولا۔

''آپ نے اسے کہاں بند کیا ہے؟''

''تم کیا کرنا چاہتے ہو؟'' منک آنہ نے الٹا سوال پوچھ لیا۔ شنک کا چہرہ بالکل سپاٹ دکھائی دے رہا تھا۔

''میں اسے وہاں واپس لانے کی کوشش کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ وہ میری بات مان جائے گی''۔

''یہ تمہاری خوش فہمی ہے کہ ایسا ہوسکتا ہے، میں نے اچھی طرح سوچ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔ اگر مجھے اس کے فیصلے میں لچک دکھائی دیتی تو میں کبھی اتنا بڑا اقدام نہ اُٹھاتا''۔

''یہ سب آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے، اگر میں اسے سرائے سے یہاں تک لاسکتا ہوں تو اس کے خیالات کا دھارا موڑ بھی سکتا ہوں''۔ شنک کے لہجے میں پختہ عزم کی جھلک دکھائی دی۔

''شنک! میرے بچے تمہیں ابھی ایسی باتوں کا تجربہ نہیں ہے۔ میں بخوبی جانتا ہوں کہ عشق و محبت کا بھوت کیا ہوتا ہے؟ جن پر یہ بھوت سوار ہوجاتا ہے وہ خونی رشتوں کو بھی ٹھوکر پر رکھ لیتے ہیں''۔

''میں آپ کی بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ آپ صرف مجھے اس جگہ کے بارے میں آگاہ کردیجئے باقی سب مجھ پر چھوڑ دیجئے''۔

''پتہ تو میں تمہیں بتائے دیتا ہوں مگر مجھے امید نہیں ہے کہ تم اسے زندہ پاسکو گے''۔ منک آنہ نے اپنا خدشہ ظاہر کیا اور پھر وہ اسے اس جگہ کے بارے میں بتانے لگا جہاں اس نے گل وقوژ کو بند کر دیا تھا۔ شنک منک آنہ سے تمام تفصیلات معلوم کرنے کے بعد اسی رات کوہ سرخ غر کی جانب روانہ ہوگیا۔ اسے توقع تھی کہ وہ ہر حال میں گل وقوژ کو بچا لینے میں کامیاب ہوجائے گا البتہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ایک مبہم سا خدشہ بھی اس کے ذہن کے پردوں پر دستک دے رہا تھا۔



دوسری صبح فوئنا جو خان مطیع الدین کی صورت دیکھ کر بخوبی سمجھ گیا تھا کہ وہ رات بھر صحیح طریقے سے سو نہیں پایا ہے۔ اس نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے عشق کی علت کو اچھی طرح نوازا تھا۔ یہ اس کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ضرگامی قبیلے کے کئی نوجوان اس کے سامنے عشق کی بدولت ایسی ایسی حرکات کے مرتکب ہوتے رہے تھے کہ دیکھ کر ہنسی چھوٹ جاتی تھی۔ اس نے مطیع الدین کو منہ ہاتھ دھو لینے کا مشورہ دیا تو مطیع الدین اس کی جانب خونخوار نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ فوئنا جو خان نے اس لمحے اس سے اُلجھنا مناسب نہیں سمجھا اور دوسرے خیمے کی جانب بڑھ گیا جہاں گہنام اور شکنان مقیم تھے۔ خیمے میں داخل ہوتے ہی فوئنا جو خان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں کیونکہ خیمہ بالکل خالی تھا۔ وہ احمقوں کی مانند خیمے کے عقب میں لگائی گئی نقب کو دیکھ رہا تھا جو اس کی تمام رات کی نگرانی کا منہ چڑا رہی تھی۔ وہ تیزی سے خیمے کی عقبی سمت میں بڑھا۔ وہاں موجود مٹی پر اسے ان دونوں کے پاؤں کے نشانات صاف دکھائی دے رہے تھے۔ فوئنا جو خان رتجگے سے اتنا نڈھال نہیں ہوا تھا جتنا ان دونوں کے فرار پر دکھائی دے رہا تھا۔ وہ جھک کر مٹی پر موجود پاؤں کے نشانات کا بغور جائزہ لینے لگا۔ فوئنا جو خان نے جب گذشتہ شام یہاں خیمے نصب کئے تھے، انہوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ اس جگہ بھربھری مٹی موجود ہے جو کہ قدموں کی چاپ کو دبا دیتی ہے۔ اگر چلنے والا احتیاط انداز میں پاؤں رکھے تو پھر کسی قسم کی آواز کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ بھربھری مٹی کا یہ قطعہ کافی دور تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ قدموں کے نشانات پر آگے بڑھتا رہا۔ کچھ دور آکر پاؤں کے نشانات غائب ہوگئے تھے۔ یہاں سے وہ دونوں کچے راستے سے ہٹ کر پتھریلی سطح پر چلنے لگے تھے۔ فوئنا جو خان نے اس مقام سے گرد کا جائزہ لیا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ ایک ایسی جگہ پر کھڑا تھا کہ جہاں سے ان دونوں کے سفر کی منزل کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ وہ واپس خیمے کی جانب لوٹ آیا۔ مطیع الدین منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہو چکا تھا۔ وہ فوئنا جو خان کو خیمے کی عقبی جانب سے آتے ہوئے دیکھ کر حیران ہوگیا۔ فوئنا جو خان کے چہرے پر تکان کے آثار نمایاں تھے۔

''ادھر کیا کرتے پھر رہے ہو؟ چلو ان دونوں کو آواز دے کر بیدار کرو تا کہ رات کے واقعے کی تصدیق کی جا سکے''۔ مطیع الدین کہا۔

''خیمے میں کوئی نہیں...... وہ دونوں میرے خدشے کے مطابق فرار ہو چکے ہیں''۔

''کک...... کک...... کیا مطلب......؟ تم ساری رات کہاں جھک مارتے رہے تھے......؟'' مطیع الدین کے چہرے کی رگیں اس کی بات پر کھنچنے لگیں۔

''اس میں میرا قصور نہیں ہے، وہ بھربھری مٹی کا فائدہ اُٹھانے میں کامیاب ہو گئے۔ میں نے خیمے میں نگاہ ڈالنا مناسب نہیں سمجھا، اس لئے معلوم نہیں ہو پایا کہ وہ رات کے کس پہر میں نکل گئے''۔ فو نکا جو خان نے جواب دیا۔

مطیع الدین اس کی بات سن کر دانت پیس کر رہ گیا۔ خیمے کے عقب کا پھٹا ہوا حصہ دیکھ کر وہ تلملا کر رہ گیا۔ وہ اسی حصے میں سے گذر کر خیمے کی عقبی جانب نکل آیا۔ فو نکا جو خان اپنی جگہ بدستور کھڑا اس کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا۔ مطیع الدین مٹی پر موجود نشانات کے جائزے میں مصروف دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد مطیع الدین شکستہ قدموں سے چلتا ہوا اس کی جانب لوٹ آیا۔

''پاؤں کے گڑھوں میں کناروں سے مٹی کی ایک چھوٹی سی تہہ گری ہوئی ہے جو کہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ لوگ ہمارے خیمے سے باہر نکلنے کے قریباً ایک ساعت کے بعد ہی وہاں سے نکل گئے تھے۔ مجھے تم پر حیرت ہے کہ تم تو خیمے کے پاس ہی موجود تھے تمہیں ذرا سی بھی آہٹ سنائی نہیں دی......!'' مطیع الدین ان لوگوں کے ہاتھ سے نکل جانے پر افسردہ سا دکھائی دے رہا تھا۔

''مجھے رات ہی ان پر شبہ ہو گیا تھا کہ وہ صریحاً غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں''۔ فو نکا جو خان نے کہا۔

''تم مجھے رات کچھ کہہ رہے تھے کہ صبح ہونے پر حقیقت واضح کروں گا......؟'' مطیع الدین نے بات کا رُخ پلٹا۔

''میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن ممکن ہے کہ میرا اندازہ کسی حد تک صحیح ہو......!''

''دیکھو......! میں پہلے ہی ساری رات نہیں سو پایا، میرے صبر کو مزید امتحان میں مت ڈالو''۔ مطیع الدین کی آواز بلند ہونے لگی۔ فو نکا جو خان نے ہاتھ کے اشارے سے اسے پُرسکون ہونے کا کہا۔

''ہمیں خیمے سمیٹ لینے چاہئیں تا کہ ہم اس جانب نکل جائیں جس کا خیال رات کو میرے ذہن میں کوندا تھا۔ ضروری نہیں کہ جو کچھ میرے ذہن میں ہے وہی درست ہو......!'' فو نکا جو خان نے کہا۔

مطیع الدین اس کی بات پر خاموش ہو گیا لیکن کچھ توقف کے بعد پھر بول پڑا۔ ''اگر تھوڑی سی کوشش کی جائے تو ہم ان دونوں مفروروں کو تلاش کر لینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ہمارے پاس گھوڑے ہیں جبکہ وہ پیدل ہیں۔ وہ سرائے کی جانب ہی گئے ہوں گے۔ شام ڈھلنے سے پہلے انہیں سرائے کے باہر پکڑا جا سکتا ہے''۔

''میرے خیال میں یہ بھاگ دوڑ فضول ہوگی، اگر انہیں واقعی راستوں کا صحیح علم نہیں ہے تو سرائے جانے والے راستے سے بھٹک کر کسی دوسری سمت بھی نکل سکتے ہیں''۔

''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ...... وہ حقیقتاً جھوٹ بول رہے ہوں''۔ مطیع الدین کا چہرہ پُرسکون ہو چکا تھا۔ چند لمحے پہلے دکھائی دینے والا اضطراب مٹ چکا تھا۔ فو نکا جو خان نے نفی میں سر ہلایا اور خیموں کی جانب بڑھ گیا۔ وہ اب خیموں کو اکھاڑنے میں مصروف دکھائی دے رہا تھا۔ شکار کی یہ مہم بدمزگی کا شکار ہو چکی تھی۔ مطیع الدین نے اس کے ساتھ مل کر خیموں کو سمیٹا اور سارا سامان گھوڑوں پر لاد دیا۔ دن کے پہلے حصے میں وہ دونوں ہلکا پھلکا ناشتہ

کرنے کے بعد وہاں سے روانہ ہو گئے۔ مطیع الدین فو نکا جو خان کی رہنمائی میں اس جانب بڑھ رہا تھا جہاں ایک چشمہ انہیں دور سے چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔



ایک دن بلادِ مصر کے کم سن سلطان نور الدین المنصور کا اتالیق مصر سیف الدین محمود قطوزی اپنے محل میں کچھ سرکاری کاموں میں مصروف تھا کہ اسے سابق ملکہ بدر منیر لولو کی آمد کی اطلاع ملی۔ اس نے اپنی کنیزوں کو اُسے زنان خانے میں بٹھانے کے لئے کہا اور عجلت میں اپنے کام نمٹا کر محل کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ آیا۔ ملکہ بدر منیر لولو سیاہ لباس میں ملبوس ایک جانب پڑی ہوئی صراحی کو دیکھنے میں مشغول تھی۔ سیف الدین محمود قطوزی کی آہٹ پا کر وہ مڑی۔ لمحہ بھر کے لئے سیف الدین محمود اسے دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ ملکہ بدر منیر نے چہرے سے مخملیں نقاب ہٹا رکھا تھا اور سیاہ ریشمی لباس میں اس کا حسن مزید بجلیاں گرا رہا تھا۔ سیف الدین محمود ملکہ بدر منیر کے حسن کی تاب نہ لا سکا اور اس نے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔ ملکہ بدر منیر اس کی حرکت پر دھیرے سے مسکرانے لگی۔

''ملکہ عالیہ......!'' سیف الدین محمود نگاہیں جھکائے بولا۔ ''آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیوں گوارا کی، مجھے پیغام بھجوا دیا ہوتا تو زیادہ مناسب ہوتا''۔

''نوجوان......! ہمیشہ پیاسا کنوئیں کے پاس آتا ہے نہ کہ کنواں پیاسے کے پاس جاتا ہے''۔ ملکہ بدر منیر نے ایک ادا سے کہا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں......!'' سیف الدین محمود کسی قدر گھبرا کر بولا۔

''جان بوجھ کر نادان نہ بنو میں خوب جانتی ہوں کہ تم میری بات سمجھ رہے ہو''۔

''آپ کی بات سمجھنا درکنار، میں تو ابھی تک آپ کی آمد کا مقصد بھی سمجھ نہیں پایا''۔ سیف الدین محمود سپاٹ لہجے میں بولا۔ اس کے ماتھے پر بکھری اُلجھن کی شکنیں اس بات کا ثبوت تھیں کہ وہ واقعی پریشان ہو رہا تھا۔ ملکہ بدر منیر کی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس نے بھانپ لیا کہ اسے سمجھانے کے لئے لفظوں کا سہارا ہی لینا پڑے گا۔ وہ دھیمے انداز میں چلتی ہوئی اس کے قریب آ گئی۔

''تم ابھی جوان ہو، زندگی کا ایک بڑا حصہ باقی ہے۔ کیا تم اسی ڈھب سے اپنی باقی زندگی بھی بسر کرنا چاہو گے......؟'' ملکہ بدر منیر کے لہجے میں شیرینی رچی ہوئی تھی۔

''یہ تو خیر میں نہیں جانتا کہ آنے والے دنوں میں کیا ہوگا؟ فی الحال میں اپنی زندگی کے اسی انداز سے مطمئن ہوں''۔ سیف الدین محمود نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔

''تم ذرا تصور کی آنکھ سے اس دن کا نظارہ کر سکتے ہو جب کم سن نور الدین جوان ہو جائے گا اور امورِ مملکت اپنے ہاتھوں میں لے لے گا تو کیا وہ اس وقت تمہارا شکر گذار ہوگا کہ تم نے اتنے عرصے تک اس کی سلطنت کا نظام خوش اسلوبی سے چلایا اور اس کے نا سمجھی کے زمانہ میں اس کے حق کو ہر خطرے سے محفوظ رکھا۔ کیا تم اس وقت عنانِ اقتدار اپنے ہاتھوں سے نکلتا دیکھ کر بے موت نہیں مر جاؤ گے......؟'' ملکہ بدر منیر نے اپنی بات آگے بڑھائی۔

سیف الدین محمود ابھی بھی اس کی بات نہیں سمجھ پایا تھا۔

''ملکہ عالیہ......!'' وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''میری عقل سے باہر ہے کہ آپ مجھے کیا باور کرانا چاہتی ہیں؟ کیا میں کم سن سلطان کے حق پر قبضہ جما لوں یا پھر اس ذمہ داری سے دستبردار ہو جاؤں......؟''

''تم میری بات کو کسی حد تک سمجھ رہے ہو۔ میرا سمجھانے کا مقصد کسی کے حق پر ڈاکہ زنی کرنا نہیں ہے بلکہ تمہیں صرف یہ بتانا ہے کہ تمہیں اپنے مستقبل کے بارے میں بھی سنجیدگی سے سوچنا چاہئے۔ کیا تم یہ نہیں جانتے کہ مصری مملوک تمہاری تقرری کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتے، وہ کسی بھی وقت تمہاری ٹانگ کھینچ کر ریاستی باگ ڈور خود سنبھالنے کی فکر میں ہیں''۔

''میں اس بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں اور ان کے اوچھے ہتھکنڈوں کا جواب دینا مجھے خوب آتا ہے۔ آپ مجھے صرف یہ بتایئے کہ ان سب باتوں سے آگاہ کرنے میں آپ کا کیا مفاد ہے......؟''

''مفاد...... اس میں میرا مفاد نہیں، بلکہ پسندیدگی پوشیدہ ہے۔ میری کوئی ایسی عمر بھی نہیں کہ میں زندگی کے بقیہ ایام بیوگی میں بسر کروں۔ میں اپنی زندگی کے اگلے فیصلے میں تمہیں اپنے ساتھ شریک کرنا چاہتی ہوں''۔

ملکہ بدر منیر کے بات سن کر سیف الدین محمود لمحہ بھر کے لئے بھونچکارہ گیا۔ اسے قطعاً کوئی ایسا اندازہ نہیں تھا کہ ملکہ بدر منیر یک لخت یہ کہہ ڈالے گی۔ وہ سکتے کے عالم میں کھڑا بے یقینی سے ملکہ بدر منیر کی صورت تکے جا رہا تھا۔ ملکہ بدر منیر کے چہرے پر دلکش مسکراہٹ چھائی ہوئی تھی۔

''کیا آپ کو اپنا اعزاز برقرار رکھنا عزیز نہیں رہا......؟'' سیف الدین محمود بمشکل بولا۔

''جو اعزاز مجھے حاصل ہے وہ ہمیشہ رہے گا بلکہ ہم دونوں آپس میں مل جل کر نور الدین کی عمدہ انداز میں تربیت کر سکتے ہیں اور اسے سلطنت کے سرکشوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں''۔ ملکہ بدر منیر نے جواب دیا۔

''آپ بے شک حسن کا شاہکار ہیں مگر میں اتنا بڑا فیصلہ کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہوں۔ لوگ اسے میری خود غرضی سمجھیں گے۔ خدانخواستہ اس دوران مجھ سے کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو میں اللہ کے نزدیک مجرم قرار پاؤں گا''۔ سیف الدین محمود نے معذرت آمیز لہجے میں جواب دیا۔

''اونچ نیچ تو اس فیصلے کے بغیر بھی ہو سکتی ہے، بلکہ کوئی دوسرا فرد تمہارے منصب پر قبضہ جمانے کے بعد کم سن سلطان کی بھی چھٹی کرا سکتا ہے۔ تم ایک دین دار اور متقی شخص ہو۔ میرے ساتھ مل کر چلنے سے بھی تو کم سن سلطان کو ہی فائدہ پہنچے گا اور شادی تو تمہیں ایک دن کرنا ہی ہے''۔ ملکہ بدر منیر نے مدلل بات کی۔

''میرا خیال ہے کہ آپ کو دوبارہ اختیارات حاصل کرنے کی طمع کچھ زیادہ ہی ہے''۔ سیف الدین محمود ملکہ بدر منیر کے واضح عندیے کو سمجھ کر ہنس پڑا۔

''طنز کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اگر میں بھی تمہاری جگہ ہوتی تو ممکن تھا کہ یہی خیال میرے ذہن میں آتا۔ تمہیں یہ بخوبی سمجھ لینا چاہئے تھا کہ میں اب بھی اختیارات کی مالک ہوں جبکہ تمہارے ساتھ تعلق استوار کرنے پر میرا درجہ کم ہو کر محض ایک اتابیکہ کا رہ جاتا ہے''۔ ملکہ بدر منیر نے اس کی بات کا برا نہیں منایا تھا۔

''اگر میں یہ کہوں کہ میں ابھی نکاح کے جھنجٹ میں ہی نہیں پڑنا چاہتا تو......!''

''میں تمہارے فیصلے کا انتظار کر سکتی ہوں''۔ ملکہ بدر منیر اس کی نگاہوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔ سیف الدین محمود اس کی بے باکی پر جہاں متحیر تھا وہیں وہ ملکہ بدر منیر کے بارے میں شک وشبے کا بھی شکار تھا۔

''آخر مجھ ہی پر نظر کرم کیوں......؟''

''میں نے تمہیں دل کی بات بتا دی ہے کہ مجھے بیوگی میں زندگی بسر کرنے کی کوئی خواہش نہیں، میں نے ایک دن شادی ہی کرنا ہے تو پھر میں اپنی پسند سے کیوں نہ کروں۔ مجھے محض ملکہ کہلانے کا یا عنانِ اقتدار حاصل کرنے کی ضرورت نہیں''۔ ملکہ بدر منیر نے کہا۔

''یعنی آپ مجھے یہ باور کرانا چاہتی ہیں کہ میں آپ کی پسندیدگی کا محور بن چکا ہوں......''

''اس میں کوئی شک نہیں...... تم جوان ہو، خوبصورت ہو، عقل و دانش سے مالا مال ہو، نیک سیرت اور دین دار شخص ہو، ایک اچھے منصب پر فائز ہو۔ ایک عورت کو اور کیا چاہئے؟'' ملکہ بدر منیر نے اس کے اوصاف گنوائے۔

''مجھے اس معاملے میں سوچنے کے لئے کچھ وقت چاہئے''۔ سیف الدین محمود نے بات ختم کرنے کی کوشش کی۔

ملکہ بدر منیر نے آنکھوں کے خفیف اشارے سے رضامندی کا اظہار کیا۔ وہ اسے سوچ سمجھ لینے کا موقع دینا چاہتی تھی۔ ''میں تمہارے جواب کا شدت سے انتظار کروں گی......!'' وہ کچھ لمحے اس کے سامنے ساکت کھڑی رہی پھر ایک دلکش ادا سے واپس مڑی اور تمکنت سے قدم اٹھاتی ہوئی وہاں سے نکل گئی۔ ریاست کے انتظام اور کم سن سلطان کے حق کی حفاظت کے سلسلے میں اُسے کوئی فکر دامن گیر نہیں تھی۔ مملوک امرا اس کام میں بے حد فعال تھے۔ وہ اس امر سے بخوبی آگاہ تھا کہ اگر وہ پوری کوشش بھی کرے تب بھی مملوک امرا اُسے تاجِ سلطانی تک رسائی حاصل نہیں کرنے دیں گے۔ ملکہ بدر منیر اس رشتے کی آڑ میں کیا حاصل کر سکتی ہے؟ اس ضمن میں اُسے اپنے ذہن کے سب دریچے بند دکھائی دے رہے تھے۔



محمود بیبرس کافی عرصے سے ایک لگے بندھے معمول پر زندگی گزارتے رہنے کے باعث بے چینی کا شکار ہو کر رہ گیا تھا۔ درباری امور اس کے ذمے نہیں تھے کہ وہ انہی میں مشغول رہتا۔ سپاہ کی روزانہ کسرت اور ریاضت کا عمل ایک مخصوص ڈھب پر محیط تھا۔ بیبرس طبیعت کے بوجھل پن سے بے قرار ہونے لگا تو شیخ عز الدینؒ کی خدمت میں پیش ہو کر سارا ماجرا بیان کر دیا۔ شیخ عز الدینؒ اس کی بات سن کر محض مسکرا دیئے۔ انہوں نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ کچھ دنوں کے لئے کہیں گھوم پھر آئے۔ سیر و سیاحت میں اُسے ایسے مواقع میسر آئیں گے کہ طبیعت پر چھائی اُداسی اور بے کیفی ختم ہو جائے گی۔ شیخ عز الدینؒ کا مشورہ اُسے پسند آیا اور اس نے جلد ہی قاہرہ سے باہر نکلنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

ایک دن اس نے روز روز کی سوچ بچار سے تنگ آ کر چند پرچیوں پر ان سب مقامات کے نام لکھے جہاں اس کے قدم ابھی تک نہیں پہنچ پائے تھے۔ ان سب پرچیوں کو اچھی طرح بند کر کے اس نے اپنے سفر کا قرعہ نکالا۔ بیبرس کافی دیر تک قرعہ میں ہاتھ لگنے والی پرچی کو لئے بیٹھا رہا۔ پھر اس نے دھڑکتے دل سے کاغذ کی تہیں کھولیں تو دکھائی دینے والا نام اس کے جذبات سے میل کھاتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کی سیاحت کا قرعہ آرمینیہ کے نام پر کھلا تھا۔ آرمینیہ شام و فلسطین کی سرحدوں پر بالائی جانب ایک خالص نصرانی حکومت تھی۔ یہ ملک دو پہاڑوں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ اس کی شمال کی جانب سلسلہ پونٹک اور جنوب کی سمت میں سلسلہ کوہ طارس ہے۔ اس کی سرحدیں ایک جانب سے شام و فلسطین سے ملتی تھی تو دوسری طرف اناطاکیہ سے متصل تھیں۔ یہ ریاست صلیبی جنگجوؤں کو اپنی حدود سے گذار کر ارضِ مقدس پر منتقل کیا کرتی تھی اور بیزنطینی کلیسا کے ماتحت تھی۔ اس ریاست پر متعدد بار اسلامی لشکروں نے حملے کئے اور تاخت و تاراج کیا مگر اس کی پختہ قدمی ایسی تھی کہ وہ اپنی سرزمین پر بارہا نقصانات اُٹھانے کے باوجود مسلمانوں کے خلاف جوش و خروش سے سرگرمِ عمل رہی۔ کچھ عرصہ تک یہ علاقے اسلامی سلطنت میں بھی رہے مگر یہاں موجود یہودیوں اور نصرانیوں نے جزیہ دے کر ان مقامات کو اپنی تحویل میں برقرار رکھا۔ یہاں مقیم نصرانیوں اور یہودیوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ یہاں مسلمانوں کو آباد کاری کا موقع نہ فراہم کیا جائے۔ مسلمان اپنی جان و مال کے عدم تحفظ کے پیش نظر کم ہی اس

جانب آباد ہوئے اور جو آئے وہ بھی ان کی تعصب پسندی کے باعث یا تو جان گنوا بیٹھے یا پھر لٹی پٹی حالت میں شام کی جانب واپس لوٹ آئے۔

ہبرس نے سالارِ اعلیٰ فارس الدین اقطائی کے سامنے جب اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ تو اس نے اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھا مگر جانے اس کے دل میں کیا خیال آیا کہ اس نے بلا بحث و تمحیص اسے سفر کرنے کی اجازت دے دی۔ ہبرس اجازت پا کر سفر کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ اس نے اپنے سابقہ تجربے کے لحاظ سے تجارت کی غرض سے آرمینیہ کا سفر اختیار کیا۔ وہ مصری مصنوعات لے کر ایک چھوٹے سے قافلے کے ساتھ قاہرہ سے باہر نکلا۔ یہ قافلہ کئی دن کی مسافت کے بعد الکرک پہنچا جہاں کچھ دن قیام کے بعد وہ انطاکیہ کی جانب بڑھ گیا۔ انطاکیہ سے نکل کر وہ آرمینیہ میں داخل ہوا۔ یہ سفر خاصا تھکا دینے والا ثابت ہوا تھا۔ قافلے کی سست رفتاری کے باعث وہ مقررہ دن سے کئی دن بعد وہاں پہنچ پائے۔ آرمینیہ کے تاجروں نے نہایت خوش اسلوبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس قافلے سے مصنوعات کی خرید و فروخت کی البتہ آرمینیہ کے محافظ دستوں نے ان کی حرکات و سکنات پر گہری نگاہ رکھی تھی۔ انہیں خدشہ تھا کہ تاجروں کے بھیس میں مسلمان جاسوس ان کے علاقے میں داخل ہو سکتے ہیں، اسی لئے انہوں نے الگ ہو جانے والے تاجروں کو خصوصی طور پر نگاہوں کے حصار میں رکھا۔ ہبرس پہلے ہی دن نگرانی کرنے والے افراد کو تاڑ گیا تھا۔ اس نے خواہ مخواہ انہیں مشکوک کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ ایک دن وہ گھومتے ہوئے بازار میں نکل گیا۔ وہ گھوم پھر کر آرمینیہ کے اس شہر کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی دوربین نگاہیں شہر کی فصیل کے ساتھ ساتھ بازاروں کی ترتیب کو بھی ذہن میں محفوظ کر رہی تھیں۔ وہ سادہ انداز میں ٹہلتا ہوا بازار کے آخر میں آ نکلا۔ یہاں لوگوں کا جمِ غفیر دکھائی دیا تو تجسس کی خاطر وہ ان میں داخل ہو گیا۔ سامنے آنے پر اسے معلوم ہوا کہ یہ پنڈال بردہ فروشی کے لئے سجایا گیا ہے۔ بڑے سے چبوترے پر کھڑے نوعمر افراد کی شکلیں دیکھ کر اسے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ ایک دن وہ بھی اسی طرح بازار کے ایسے چبوترے پر بے بس کھڑا تھا کہ اچانک شفیق علاء الدین بندقداری اس کی زندگی میں ہوا کے لطیف جھونکے کی مانند داخل ہو گیا۔

اس نے بکنے والے نوجوانوں کی صورتوں پر اک نگاہ ڈالی۔ اس کی نگاہ گھومتی ہوئی ایک نحیف سے نوجوان پر آ کر ٹھہر گئی۔ وہ خد و خال اور شکل و صورت سے عرب دکھائی دیتا تھا۔ عرب نوجوان کو اس مقام پر پا کر جہاں اسے حیرت ہوئی وہیں اسے یہ اندازہ لگانے میں بھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی کہ یقیناً یہ کسی نصرانی کے ستم کا شکار رہا ہوگا۔ ایک بدہیئت شخص نے چبوترے پر آگے بڑھ کر نیلامی کا آغاز کیا۔ جانوں کی بولیاں لگتی رہیں اور ایک ایک کر کے نوجوان چبوترے سے کم ہوتے گئے۔ ہبرس کو یہ سلسلہ بالکل نہیں بھا رہا تھا مگر وہ اپنی جگہ چھوڑ نہ سکا۔ بالآخر اس عرب صورت نوجوان کو آگے کر کے اس کی بولی کا آغاز ہوا۔ عرب نوجوان کی قیمت بالکل کم لگائی جا رہی تھی۔ یہ بات ہبرس نے خصوصاً محسوس کی۔ اس سے پہلے کہ آخری بولی پر وہ نوجوان کسی کی ملکیت بن جاتا...... ہبرس کے لبوں میں حرکت ہوئی اور اس نے آخری بولی سے دگنی قیمت لگا دی۔ یہ سب غیر شعوری انداز میں ہوا تھا۔ بردہ فروش نے زیادہ قیمت پا کر فوری طور پر یہ سلسلہ ختم کر کے اس نوجوان کو ہبرس کی جانب بڑھا دیا۔ وہ نوجوان سہما سہما سا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی خوفزدہ صورت دیکھ کر ہبرس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ ہبرس نے قیمت کی پوٹلی بردہ فروش کی جانب اچھال دی۔ وہ خلافِ توقع اتنی رقم پا کر خوش دکھائی دے رہا تھا۔ ہبرس نے اس نوجوان کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ پنڈال سے نکل کر بازار میں داخل ہوا ہی تھا کہ ہتھیار سے لیس ایک باوردی سپاہی نے اس کا راستہ روک لیا۔ ہبرس چونک کر اس کی صورت دیکھنے لگا۔



چشمے پر پہنچ کر فوننا جو خان گھوڑے سے اتر آیا۔ مطیع الدین نے بھی اس کی تقلید کی۔ فوننا جو خان گھوڑے کی باگیں چھوڑ کر چشمے کی ایک سمت بڑھا۔ مطیع الدین نے اس کی پیش قدمی کے رخ پر نگاہیں دوڑائیں اور اس کی نظروں سے بھی وہ جگہ اوجھل نہ رہ سکی جہاں گادکا ایک چھوٹا سا تالاب تھا۔ گادکا یہ تالاب باقاعدہ مستطیل صورت میں تھا جسے دیکھ کر مطیع الدین حیرت کا شکار دکھائی دینے لگا۔ یہ واقعی قدرتی طور پر ایسا ہے یا کسی انسانی ہاتھ کی کاریگری ہے؟ اس نے اپنے خیال کو جھٹکا اور فوننا جو خان کی جانب متوجہ ہوا جو کہ تالاب کے کنارے بیٹھ کر گاد میں دونوں ہاتھ بری طرح سے مار رہا تھا۔ مطیع الدین اس کی عجیب سی حرکت پر متفکر نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ فوننا جو خان کچھ دیر تک گاد میں ہاتھ مارنے کے بعد خاموشی سے اُٹھا اور چشمے کی جانب بڑھ گیا۔ اب وہ صاف پانی سے اپنے ہاتھ دھو رہا تھا۔

''میرا اندازہ کسی حد تک صحیح نکلا ہے......!'' فوننا جو خان مطیع الدین کو گہری نگاہوں سے دیکھتا ہوا بولا۔

''تم آخر چاہتے کیا ہو......؟'' مطیع الدین جھنجھلا کر بولا۔ ''کل رات سے تم مسلسل مجھے ذہنی اذیت پہنچا رہے ہو۔ ہر بار ادھوری بات کر کے تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو......؟''

''تحمل سے کام لو...... کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کا صرف مقامی لوگوں کو ہی علم ہوتا ہے۔ تم بے فکر رہو...... میں تمہیں سب کچھ تفصیل سے بتاؤں گا'' ۔فوننا جو خان نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''کیا خاک بتاؤ گے......؟ جو کچھ کہنا ہے ابھی کہہ ڈالو۔ میں اب زیادہ دیر تک برداشت سے کام نہیں لے سکتا'' مطیع الدین نے بیزاری سے کہا۔

''یہ گادکا تالاب ہے......!'' فوننا جو خان نے اُس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اسے ہماری زبان میں جولاشہ کہتے ہیں۔ تمہیں اب میرے ساتھ اس مقام کی تلاش کرنا ہوگی جہاں یہ گاد لے جایا گیا ہے''۔

''اس گادکا گل وتوژ سے کیا تعلق......؟'' مطیع الدین نے الٹا سوال کیا۔

''میں نہیں جانتا......!'' فوننا جو خان نے کندھے اچکائے۔ ''میں نے تمہیں جس کام کے لئے کہا ہے اگر وہ کر سکتے ہو، تو میرے ساتھ چلو ورنہ یہیں ٹھہر کر میری واپسی کا انتظار کرو''۔

''بس مجھے ذرا گل وتوژ کے بارے میں کچھ معلوم ہو جانے دو...... پھر دیکھنا میں تمہاری کیسی خبر لیتا ہوں......!'' مطیع الدین پاؤں پٹختا ہوا گاد کے تالاب کی جانب بڑھ گیا۔ گاد کے تالاب کے کنارے پہنچنے پر اُسے محسوس ہوا کہ اس میں سے چونے کی تیز بو آ رہی ہے۔ اس نے تالاب کے چاروں جانب گھوم کر اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ گاد اگر تالاب سے نکال کر کسی جانب لے جایا گیا ہے تو وہ کون سی سمت ہو سکتی ہے۔ فوننا جو خان بھی اسی کام میں مشغول دکھائی دے رہا تھا۔ کافی دیر تک مغز کھپائی کے باوجود انہیں اندازہ نہیں ہو پایا کہ اس تالاب میں سے واقعی گاد نکالا گیا ہوگا۔ فوننا جو خان کسی سراغ کی تلاش میں تالاب سے کچھ دور تک نکل گیا۔

مطیع الدین تالاب کے کنارے بیٹھ گیا۔ اس کا ذہن اس وقت گل وتوژ کو فراموش کر چکا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ تالاب میں سے اگر واقعی گاد کی کچھ مقدار نکالی گئی ہے تو یقیناً کسی برتن یا خول کا استعمال کیا گیا ہوگا......؟ گاد کو باہر نکالنے پر گاد کی گھسٹ ضرور دکھائی دینا چاہئے۔ جبکہ ایسا وہاں کچھ نہیں تھا۔ اگر کسی نے گاد میں گھس کر بھی گاد نکالا ہو تب بھی اس کے باہر نکلنے کے نشان ضرور ہونے چاہئیں۔ یہ عجیب سی صورتِ حال تھی کہ وہ ایک ایسے کام میں مصروف تھا جس کے بارے میں اُسے سرے سے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ وہ تالاب کے کنارے سے اُٹھ کر قریب موجود جھاڑیوں کے جھنڈ کی جانب بڑھا۔ چشمے کے قریب یہی ایک ایسا مقام تھا جسے گاد لے جانے کے لئے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اس نے جھاڑیوں کو اِدھر اُدھر ہٹا کر اندر جھانکا۔ وہاں بھی کچھ نہیں دکھائی

دیا۔ کچھ دیر تک وہ جھاڑیاں ٹٹولتا رہا۔

اتفاقاً اس کی نگاہ ایک پتے پر جا پڑی جو کہ سفیدی سے چمک رہا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا اور جھک کر پتے کی سطح دیکھنے لگا۔ وہ بلاشبہ گاد کا ایک چھوٹا سا نشان تھا جو کہ سوکھنے کے بعد سفید پڑ چکا تھا۔ مطیع الدین نے مڑ کر تالاب کی جانب دیکھا کہ ممکن ہے کہ گاد میں سے کوئی چھینٹ اس جانب آ گری ہو مگر تالاب کا یہاں سے فاصلہ کچھ زیادہ تھا۔ گاد کی چھینٹ کا یہاں تک پہنچ جانا ممکن نہیں تھا۔ مطیع الدین چھینٹ اور پتے کے زاویے پر غور کر رہا تھا کہ اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال کوندا۔ اس کی نگاہیں مقناطیسی انداز میں اوپر کی جانب اُٹھتی گئیں۔ یہ چھینٹ یقیناً اوپر سے گری ہوگی۔ اس کے سر سے کچھ اوپر ایک موٹا سا رسّا جھول رہا تھا۔ اس نے رسے کی سمت کا اندازہ لگایا تو وہ آگے کی جانب جاتا دکھائی دیا۔ وہ جھاڑیوں کے جھنڈ سے باہر نکل آیا۔ اس نے فونتاجو خان کو بلند آواز میں اپنی جانب متوجہ کیا۔ فونتاجو خان دوسری سمت تلاش میں مصروف تھا کہ مطیع الدین کی آواز پر چونک کر تیزی سے اس کی جانب بڑھ آیا۔ مطیع الدین نے اوپر جھولتے رسے کی جانب اس کی توجہ مبذول کرائی تو اس کا منہ سیٹی بجانے کے انداز میں سکڑ کر رہ گیا۔

''یعنی آخری رسم کے لئے منچوری طریقہ استعمال کیا گیا ہے......؟'' فونتاجو خان بڑبڑایا۔

''منچوری...... سے کیا مراد ہے؟'' مطیع الدین اب اس معاملے میں دلچسپی لے رہا تھا۔

''چین اور جینانی سرزمین کے درمیان کچھ علاقے منچوریوں کے آباد ہیں۔ انہیں سرخ غز بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ قدرتی طور پر سرخ بالوں اور سرخ ڈاڑھیوں والے لوگ ہیں۔ وہ لوگ دریاؤں کے اوپر سے گذرنے کے لئے ایسے ہی رسوں کے پل بناتے ہیں اور کسی بھاری سامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لئے اس سے آسان طریقہ کوئی نہیں سمجھا جاتا''۔

''یعنی انہوں نے گاد کو کسی شے میں ڈال کر رسوں کی مدد سے کہیں پہنچایا ہے...... ؟'' مطیع الدین نے پوچھا۔ فونتاجو خان نے اثبات میں سر ہلایا۔ فونتاجو خان رسوں کے تعاقب میں بڑھ گیا۔ مطیع الدین گھوڑوں کی باگیں تھام کر اس کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ دونوں رسوں کی مدد سے اس مقام کی جانب بڑھ رہے تھے جہاں گاد کی بڑی مقدار پہنچائی گئی تھی۔ رسے درختوں کے درمیان بڑی مہارت سے بندھے ہوئے تھے۔ انہیں باندھنے والوں نے اس بات کا بھی خاص خیال رکھا تھا کہ وہ پہلی نظر میں کسی کی نگاہ میں نہ آسکیں۔ کافی دیر کی مسافت کے بعد وہ ایک غار کے سامنے جا کھڑے ہوئے جہاں گاد اور چھوٹے بڑے پتھروں کی نامکمل دیوار دکھائی دے رہی تھی۔ وہ غار کے دہانے میں موجود شگاف کا جائزہ لے رہا تھا۔

''لگتا ہے کوئی اپنا کام ادھورا ہی چھوڑ گیا ہے''۔ مطیع الدین بولا۔

فونتاجو خان نے اس کی جانب مڑتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ''کام ادھورا نہیں چھوڑا گیا بلکہ مکمل کیا گیا ہے۔ کسی تیسرے فرد نے یہاں نقب لگا کر اپنا کام دکھا دیا ہے''۔

مطیع الدین اس کی بات پر دنگ رہ گیا۔ فونتاجو خان اس کی جانب مڑنے کے بجائے اب غار میں داخل ہو چکا تھا۔ مطیع الدین باہر کھڑا اس کا انتظار کرتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد فونتاجو خان باہر نکلا تو اس کا چہرہ جوش سے سرخ ہو رہا تھا جیسے اسے کوئی بڑی کامیابی حاصل ہوگئی ہو۔



باتو خان قرولتائی سے واپس سرائے آیا تو برقائی خان کی تبلیغ اسلام سے سخت دل برداشتہ تھا۔ اس نے خود کو شراب میں ڈبو کر غم ہلکا کرنا چاہا۔ یہ سلسلہ زیادہ دن تک جاری نہ رہ سکا اور وہ فالج کے شدید حملے سے دوچار

ہوگیا۔ شراب نوشی کی کثرت نے اس کی ہڈیاں کھوکھلی کر ڈالی تھی۔ وہ فالج سے چند دن لڑنے کے بعد اس دنیا فانی کو چھوڑ گیا۔ فالج کا اس پر ایک حملہ گیارہ سال قبل بھی ہوا تھا مگر وہ اس حملے سے بچ گیا اور کچھ ہی عرصے بعد دوبارہ امور سلطنت میں جت گیا۔ فالج کا پہلا حملہ اس وقت ہوا تھا جب قاآن اعظم تویوق کا انتقال ہوا تھا۔ اس وقت سب منگول اس بات پر متفق تھے کہ قاآن اعظم کا عہدہ باتو خان کو دے دیا جائے مگر فالج کے حملے نے اسے تاج پوشی سے محروم کر دیا۔ باتو خان نے اڑتالیس سال کی عمر میں 1252ء میں وفات پائی۔ موت کے وقت وہ سرائے سے کچھ میل دور ایک بلند پہاڑی محل میں مقیم تھا۔ درباری امرأ نے اس کی ناگہانی موت پر فوری طور پر برقائی خان کو آگاہ کیا۔ برقائی خان کو جب اپنے بھائی کی وفات کی خبر ملی تو وہ دیر تک ساکت و جامد بیٹھا رہا۔ قاآن اعظم منگو خان کو باتو خان کی موت کی خبر بھیجی گئی تو وہ تیز رفتاری سے سفر کرتا ہوا سرائے پہنچ گیا۔ کچھ ہی دنوں میں سب عزیز رشتہ دار وہاں جمع ہوگئے اور باتو خان کی آخری رسومات ادا کر کے اسے ایک بڑے تہہ خانے میں ساز و سامان کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ شیبان خان جو کہ باتو خان کا چھوٹا بھائی تھا، اس نے کوشش کی کہ باتو خان کے ساتھ دس کنیزوں اور دس غلاموں کو بھی دفن کیا جائے مگر برقائی خان نے اپنے بھائی کی کڑی مخالفت کرتے ہوئے ایک مردہ شخص کے ساتھ زندہ افراد کو دفن کرنے کی اجازت نہیں دی۔ قاآن اعظم منگو خان نے برقائی خان کی بات پر ناراضگی کا اظہار کیا تھا مگر وہ اس موقع پر کوئی بدمزگی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ باتو خان کے سترہ لڑکے بھی آخری رسومات میں شامل تھے۔ قاآن اعظم نے ان سب سے فرداً فرداً ملاقات کی اور تعزیت کر کے ان کی ڈھارس بندھائی۔ تدفین کی آخری رسومات کے تیسرے دن منگو خان نے برقائی خان کا ہاتھ پکڑ کر اسے باتو خان کے تخت پر بٹھا دیا۔ اردوئے زریں کے خیام خیل منگولوں کے نئے قاآن کے طور پر برقائی خان کے تقرر پر خوشی کا اظہار کیا گیا۔ یہ پہلی منگول سلطنت تھی جس کا حکمران سچا اور پختہ مسلمان تھا۔ برقائی خان نے منگو خان کی اطاعت کو اپنے لئے بہتر خیال کیا اور اس نے اپنے پہلے خطاب میں قاآن اعظم منگو خان کی قیادت سے وفاداری اور اطاعت کا اعلان کیا۔ قاآن اعظم منگو خان نے چلتے وقت برقائی خان کی کمر ٹھونکی اور مسکرا کر کہا۔ ''ہمیں وہ دن اچھی طرح یاد ہے برقائی خان! جب تم نے منگولوں کے درمیان اپنے بھائی کا حق روند کر ہمیں تخت پر لا بٹھایا تھا سو میں نے وہ قرض آج اتار دیا''۔

''میں آپ پر پہلے کبھی کوئی قرض سمجھتا تھا اور نہ ہی آج میرے ذہن میں ایسا کچھ باقی ہے''۔

''مجھے تمہارے مسلمان ہونے پر گہرا رنج ہے......!'' قاآن اعظم منگو خان نے مختصراً کہا۔

''اس ضمن میں میں مجبور ہوں البتہ آپ کی اطاعت میں مجھ سے کوئی لغزش سرزد نہیں ہوگی''۔

''میں نے منگولوں کا روشن مستقبل اب تمہیں سونپ دیا ہے۔ یہ شان کب تک برقرار رہ پائے گی اس کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے''۔ منگو خان نے کہا اور سرائے کو خیرباد کہہ گیا۔ اسے اس مقام پر دوبارہ لوٹنے کی کوئی تمنا نہیں تھی۔ باتو خان سے اس کی محبت شدید تھی مگر برقائی خان کا قبول اسلام ان دونوں میں فاصلہ بڑھا رہا تھا۔

برقائی خان نے عنان اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد اپنی ہمسایہ ریاستوں میں سفارتیں روانہ کیں۔ کچھ قاصد برصغیر میں بھیجے گئے۔ ہلاؤ خان کے پاس بھی اس کی سفارت پہنچی مگر اس نے سفارت سے ملاقات کرنا گوارا نہیں کیا اور وہ سفارت کئی دن تک وہاں ٹھہرنے کے بعد ناکام واپس لوٹ آئی۔ ریاست کا انتظام سنبھالنے کے ایک ماہ بعد اسے امیر المومنین خلیفہ مستعصم باللہ کی جانب سے خلعت اور قیمتی تحائف موصول ہوئے۔ خلیفہ مستعصم باللہ نے اسے مبارکباد کے ساتھ ساتھ جلال الدین ابراہیم کا خطاب بھی دیا تھا اور ساتھ ہی اس بات کا اعلان بھی کیا گیا تھا کہ جمعہ کے خطبات میں امیر المومنین کے ساتھ ساتھ اس کا نام بھی پڑھا جائے گا۔ برقائی

خان نے حوصلہ افزائی پاکر پورے تزک و احتشام سے منگولوں میں تبلیغ اسلام کا سلسلہ شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اردوئے زریں اسلام کا ایک بڑا مرکز بن گیا۔ برقائی خان نے برصغیر سے مبلغین کی بڑی تعداد کو اپنے ملک میں آنے کی دعوت بھی دی جسے برصغیر کے سلطان ناصر الدین محمود نے روک دیا تھا۔ برصغیر آنے والی زریں خیل منگولوں کی اس سفارت کو واپس وطن لوٹنے کی اجازت نہیں دی گئی اور انہیں جاسوسی کے شک میں قنوج نامی شہر میں نظر بند کر دیا گیا جہاں وہ کچھ عرصہ بعد وفات پا گئے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس سفارت میں شامل تمام تاتاری مسلمان تھے اور پابندی سے نماز ادا کیا کرتے تھے۔ وہ دربارِ دہلی سے قلعہ گوالیار اور پھر قلعہ قنوج روانہ کئے گئے۔

برقائی خان نے مختلف شہروں میں مساجد تعمیر کیں اور منگولوں کو شعائرِ اسلامی سے آگاہ کرنے کے لئے علماء و مبلغین کی ایک بڑی جماعت کو مقرر کیا۔ اس نے اسلامی تعلیمات کی کمی کے پیش نظر بخارا میں تباہ شدہ مدرسوں کی مرمت کرا کے دوبارہ بحال کیا اور سمر قند سے اردوئے زریں کے دارالحکومت سرائے تک تبلیغ اسلام کی ایک بڑی زنجیر قائم کی۔ مساجد میں علماء امیر المومنین کے ساتھ ساتھ اس کا نام بھی خطبے میں پڑھنے لگے۔ وہ اپنے ابتدائی برسوں میں منگولوں میں کشادگی ذہن کی کوشش میں مصروف رہا۔

عنانِ حکومت سنبھالتے ہی دوسرے مہینے اسے اچانک خبر ملی کہ اس کا بھتیجا سرتاق اس کے چچازاد بھائی ہلاکو خان کے پاس پہنچ کر نصرانیت اختیار کر چکا ہے اور وہ ایک لشکر کے ساتھ سرائے کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اس لشکر میں ہلاکو خان کے سپاہی اور اردوئے زریں کے کچھ سرکش قبائل شامل ہیں۔ برقائی خان نے اپنی سپاہ کو فوری تیاری کا حکم دیا۔ وہ سرتاق کی شکل میں اٹھنے والے اس پہلے فتنے کا مکمل طور پر خاتمہ کرنا چاہتا تھا۔



ہیرس سوالیہ نگاہوں سے روکنے والے کی صورت دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جو سادہ کپڑوں میں کئی دن سے اس کی مسلسل نگرانی کر رہا تھا۔ سپاہی اپنی نیام کا ٹھوکا لگاتے ہوئے اسے ایک جانب بڑھنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ سپاہی کی شکل دیکھ کر لوگ ہیرس کی جانب دیکھنے لگے جو انہیں کوئی پردیسی دکھائی دے رہا تھا۔

''تمہاری اس حرکت سے میں کیا مطلب اخذ کروں......؟'' ہیرس نے گھمبیر لہجے میں پوچھا۔

''تم ریاست کے قانون کے تحت ایک سنگین جرم کے مرتکب ہوئے ہو لہٰذا تمہیں میرے ساتھ کوتوالی چلنا ہوگا''۔ سپاہی نے کہا۔

''کیسا جرم......؟'' ہیرس اس کے مسلح سراپے پر کڑی نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔

''تم نے یہ مقامی غلام کیوں خریدا ہے......؟ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس ریاست میں صرف مقامی لوگ ہی اس قسم کی خریداری کر سکتے ہیں''۔ سپاہی کا لہجہ جارحانہ تھا۔ ہیرس اس کی بات سن کر پُرسکون ہو گیا۔ سپاہی اس کے چہرے پر بڑھتے ہوئے اطمینان سے گڑبڑا سا گیا۔ اس نے ایک بار پھر ٹھوکا لگایا۔ ہیرس نے اس نوجوان کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور خود سپاہی کے ساتھ کوتوالی کی جانب بڑھ گیا۔ کچھ دیر میں وہ کوتوالی کے افسر کے سامنے کھڑا تھا۔ افسر نے سپاہی کی جانب مستفسرانہ نظروں سے دیکھا تو اس نے ایک ہی سانس میں اپنی کارکردگی کا خلاصہ پیش کر دیا۔ افسر چہرے سے ہی سخت گیر قسم کا شخص دکھائی دیتا تھا۔

''اجنبی! میرا خیال ہے کہ تمہیں تجارت کے امور کا کوئی زیادہ تجربہ نہیں...... ورنہ تم ایسی حماقت نہیں کرتے۔ کسی بھی ریاست میں داخل ہونے کے بعد مقامی تاجروں سے اس ملک کے قوانین سے ضرور آگاہی حاصل کر لینا چاہئے تاکہ بے خبری میں کوئی جرم سرزد نہ ہو جائے''۔ افسر ہیرس کی جانب متوجہ ہو کر بولا۔

''میں یہاں کے قوانین سے بے خبری کے لئے معذرت خواہ ہوں''۔ ہیرس نے مختصراً کہا۔

''صرف معافی سے کام نہیں چلے گا۔ جرم کیا ہے تو اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑے گا''۔

''میرے جرم کی سزا کیا ہو سکتی ہے......؟'' ہیرس تحمل سے گفتگو کر رہا تھا۔

''سب سے پہلے تو تمہیں اس غلام سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ جو قیمت تم ادا کر چکے ہو، وہ تو رائیگاں گئی سمجھو۔ اس کے بعد تمہارا تمام سامان جو تم ساتھ لے کر یہاں آئے ہو وہ ریاست کا مال سمجھا جائے گا اور تمہیں وہ مال خانے میں جمع کرانا پڑے گا۔ جس قدر مال تم بیچ چکے ہو اس کی قیمت بھی واپس لوٹانا ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھ لو کہ تمہیں اس ریاست سے خالی ہاتھ واپس لوٹنا ہوگا...... البتہ تمہارا لباس میری مہربانی سے تمہارے جسم پر موجود رہے گا''۔

''اگر میں تمہاری تمام باتیں ماننے سے انکار کر دوں تو......'' ہیرس کا لہجہ یکدم سرد ہو گیا۔

''اجنبی! یہ ریاست ہماری ہے اور یہاں ہمارا ہی قانون چلتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم کوئی ایسی حرکت نہیں کرو گے جس سے تمہاری جان خطرے میں پڑ جائے''۔ افسر اس کے لہجے کو نظر انداز کرتا ہوا بولا۔

''تو پھر کان کھول کر سن لو کہ نہ تو میں یہ غلام واپس لوٹا رہا ہوں اور نہ ہی تمہاری دوسری کوئی بات ماننے پر رضامند ہوں۔ اب تم اپنی اگلی کارروائی کر سکتے ہو''۔ ہیرس فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ہیرس کی بات سن کر افسر اور وہاں موجود کچھ سپاہیوں کے چہروں پر پہلے حیرت نظر آئی پھر افسر کا چہرہ فرطِ طیش سے سرخ ہونے لگا۔ وہ اپنی مٹھیاں بھینچتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

''اجنبی! یہ تمہارا ملک نہیں ہے کہ تم جیسی لاقانونیت چاہو پھیلا سکو''۔

''میں بھی کوئی عام سا تاجر نہیں ہوں کہ تمہاری گیدڑ بھبکیوں سے ڈر کر اپنا سب مال و متاع یہاں لٹا کر واپس لوٹ جاؤں۔ میں نے بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے''۔ ہیرس کا لہجہ بے حد سرد تھا۔

سپاہی اس کی جرأت پر حیران ہو رہے تھے۔ شاید پہلی دفعہ کوئی تاجر انہیں الٹا دھمکا رہا تھا۔ افسر نے چند لمحوں تک اسے گھورا پھر سپاہیوں کو حکم دیا۔

''اسے بیڑیاں ڈال کر اندھیری کوٹھڑی میں ڈال دو۔ جب اس کی طبیعت درست ہو جائے گی تو میرے سامنے پیش کرنا''۔ سپاہی اپنے افسر کی بات سن کر ہیرس کی جانب بڑھنے لگے۔ یہ بڑا نازک وقت تھا۔ ہیرس کو اسی وقت فیصلہ کرنا تھا کہ اسے زنداں میں چلا جانا چاہئے یا انہیں منہ توڑ جواب دینا چاہئے۔ ہیرس نے جوانمردی دکھانے کا فیصلہ کیا اور تیزی سے آگے بڑھ کر افسر کی نیام پر ہاتھ ڈال کر اس کی تلوار کھینچ لی۔ اس کی جانب بڑھتے ہوئے سپاہی یکدم ٹھٹک سے گئے۔ وہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی غیر انسانی مخلوق ہو۔ افسر بھی ہیرس کی جرأت پر دم بخود رہ گیا۔

''اگر کسی کو اپنی جان عزیز نہیں ہے تو وہ میری جانب بخوشی بڑھ سکتا ہے''۔ ہیرس نے تلوار لہراتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ افسر اس دوران سنبھل چکا تھا۔ وہ اب خونخوار نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا تو کئی سپاہی اپنی تلواریں لہراتے ہوئے ہیرس پر حملہ آور ہو گئے لیکن کوتوالی کے معمولی سپاہیوں کا ایک جنگجو سپہ سالار سے بھلا کیا مقابلہ ہو سکتا تھا۔ ہیرس نے اپنی مہارت کا معمولی سا مظاہرہ کیا اور اگلی ساعت میں وہ سب زخم خوردہ ہو کر زمین بوس دکھائی دیئے۔ افسر یہ دیکھ کر گڑبڑا سا گیا۔

''تم یقیناً تاجر نہیں ہو''۔ اس نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔ ''تم نے سپاہیوں پر حملہ کر کے اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر لئے ہیں۔ اب تم کسی بھی صورت میں اس ملک سے باہر نہیں جا پاؤ گے''۔

''میں اب جا رہا ہوں۔ کل صبح اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس لوٹ جاؤں گا۔ تم سے جو ہو سکے تم بہ خوشی کر سکتے ہو البتہ تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہئے کہ میں تمہاری جان بخش کر جا رہا ہوں''۔ ہیرلس نے سخت لہجے میں اسے جواب دیا اور غلام کو بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا باہر نکل گیا۔ سپاہی زمین پر پڑے کراہ رہے تھے اور افسر انہیں ٹھوکریں مارتا ہوا ان پر برس رہا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ کوتوالی میں اس وقت زیادہ نفری نہیں تھی۔ ہیرلس وہاں سے نکل کر سیدھا اپنے قافلے کی قیام گاہ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھی تاجروں کو یہاں سے لے کر فوری نکل جانا چاہتا تھا کیونکہ وہ کسی حد تک سمجھ گیا تھا کہ یہاں کے ریاستی کارندے پردیسی تاجروں سے ان کا مال دستاع ہتھیا لینے میں خاصے ماہر ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ افسر ٹلنے والا شخص نہیں ہے اور وہ جلد ہی قافلے والوں پر مزید نفری کے ساتھ حملہ آور ہوگا۔



''کیا ہوا......؟'' مطیع الدین نے فونا جو خان کا چہرہ دیکھتے ہوئے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

''سب کچھ میرے سامنے عیاں ہو چکا ہے کہ کیا ہوا تھا......؟'' فونا جو خان نے جوشیلے لہجے میں جواب دیا۔

''میں تمہیں اب کیا کہوں......! جسم پر چربی پر منوں کے حساب سے لاد رکھی ہے مگر کھوپڑی میں سمجھ بوجھ نامی کوئی چیز موجود نہیں''۔ مطیع الدین آسمان کی جانب منہ اُٹھا کر بولا۔

''جاودانی آسمان کے تنگری کا مجھ پر خاص کرم ہے کہ اس نے مجھے ایسی سمجھ بوجھ سے محروم رکھا ہے جس کے باعث اچھے بھلے لوگ ویرانوں کی خاک چھانتے دکھائی دیتے ہیں''۔ فونا جو خان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ مطیع الدین اس کی برجستگی پر ہنسنے لگا پھر بولا۔

''خدا کی قسم ......! تم نے کل رات سے میری نیند حرام کر رکھی ہے اور کچھ بتانے کے بجائے ایسی سنسنی پھیلا رہے ہو کہ اب میرا دل یہ چاہتا ہے کہ تمہاری کھوپڑی کسی پتھر سے کچل کر رکھ دوں''۔

''برادرم ......! تم بھول رہے ہو کہ پتھر سے میرا بال بھی بیکا نہیں ہونے کا... پہاڑ کی بات کرو تو مجھے شاید کچھ فکر لاحق ہو''۔ فونا جو خان نے اس کی اصلاح کرتے ہوئے کہا۔

''اب کچھ منہ سے پھوٹو گے بھی یا نہیں......؟'' مطیع الدین روہانسا ہو کر بولا۔

''لگتا ہے اب تمہاری طبیعت کچھ کچھ اعتدال پر آ رہی ہے''۔ فونا جو خان نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ مطیع الدین اس کی بات پر دانت پیس کر رہ گیا۔ فونا جو خان ذرا توقف کے بعد دوبارہ بولا۔ ''مجھے غار کے اندر سے کچھ ایسے شواہد ملے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی عورت موجود رہی تھی''۔

''موجود رہی تھی کیا مطلب......؟ کیا اب غار میں کوئی نہیں ہے؟'' مطیع الدین اس کی بات سن کر چونک پڑا۔

''جب میں بتا رہا ہوں تو بیچ میں بولنے کی کیا ضرورت ہے......؟'' فونا جو خان نے اس کی بات پر برا سا منہ بنایا۔ مطیع الدین نے جلدی سے ہاتھ کھڑے کرتے ہوئے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ فونا جو خان نے دوبارہ سلسلہ کلام جوڑا۔ ''میں یہ نہیں جانتا کہ وہ عورت گل دقوز ہی تھی یا کوئی اور...... البتہ یہاں کسی عورت کی آخری رسم ادا کی گئی۔ وہ عورت زندہ تھی اس بارے میں غار میں موجود شواہد سے ظاہر ہے''۔

''آخری رسم سے کیا مراد ہے......؟ تم شاید پہلے بھی یہ لفظ کہہ چکے ہو''۔ مطیع الدین متفکر ہو کر بولا۔

''آخری رسم دراصل پہلے ... میں مردوں کو دفنانے کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔ پہلے زمانے میں

منگول قبائل کسی بھی غار میں اپنے مردے رکھ کر اس کا منہ مخصوص گاد اور پتھروں کی چنائی کے ساتھ بند کر دیتے تھے، منگولوں میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد مردے کی روح تاریکی کی طاقتوں کے تابع ہو جاتی ہے اور وہ روشنی کی طاقتور کو نقصان پہنچانے کے لئے نکل پڑتی ہے۔ وہ گاد اور پتھروں کی چنائی سے اسے غار کا قیدی بنا دیتے تھے تاکہ وہ کبھی باہر نہ نکل سکے اور زندہ انسان ان کے شر سے محفوظ رہ سکیں''۔

''یعنی تمہارا کہنے کا مطلب ہے کہ گل دقوز کو اس غار میں بند کر دیا گیا تھا...... مگر کیوں......؟''

''اس بارے میں تو میں کچھ نہیں جانتا۔ البتہ کل رات اس چشمے پر پہنچا تو مجھے گاد کی مخصوص بو سی محسوس ہوئی۔ پھر جب ان لوگوں نے یہ کہا کہ غار گم ہو چکا تھا تو میرے ذہن میں آخری رسم کا مبہم سا شک پیدا ہوا۔ میں تمہیں رات کو ہی اس معاملے سے آگاہ کر دیتا مگر میں خود اس بارے میں پُر یقین نہیں تھا۔ میں پہلے اپنا شک دور کر لینا چاہتا تھا''۔

''اب غار میں کوئی موجود نہیں ہے......؟'' مطیع الدین نے بے تکا سا سوال کیا۔ فونا جو خان نے اس کی جانب تیز نظر ڈالی اور مٹھی میں دبی ہوئی ایک چھوٹی سی چیز اس کی جانب بڑھا دی۔ مطیع الدین چونک کر اس کی جانب متوجہ ہوا۔ وہ کٹے ہوئے سنہری بالوں کا ایک چھوٹا سا گچھا تھا۔ مطیع الدین کی نگاہوں کے سامنے گل دقوز کی سنہری زلفیں لہرانے لگیں۔

''میں تم پر یہ بھی واضح کر دوں کہ کسی بھی منگول عورت کے سر کے بال صرف اسی صورت میں کاٹے جاتے ہیں جب وہ مر چکی ہو۔ یہاں ہم سے پہلے کوئی آیا تھا، اس نے یہاں موجود اس عورت کو باہر نکالا اور اس کے بال کی یہ لٹ کاٹ کر اس بات کا اظہار کیا کہ وہ واقعی مر چکی ہے۔ البتہ ایک بات ابھی تک مجھے سمجھ نہیں آ سکی کہ اگر آخری رسم ادا کر دی گئی تو اس غار کا دہانہ کھول کر اسے دوبارہ واپس نکالنے کی کیا ضرورت تھی......؟''

فونا جو خان سوچتے ہوئے بولا۔ مطیع الدین کے دل پر اس کی باتیں تیز خنجر کی طرح گھاؤ لگا رہی تھیں۔ وہ اپنی کیفیت کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر آنکھوں میں چمکنے والا پانی اس کے بس کی بات نہیں رہا تھا۔ فونا جو خان اس کے چہرے پر افسردگی کے آثار بخوبی دیکھ رہا تھا۔ کیا گل دقوز واقعی مر چکی ہے؟ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں سے دبی دبی سی آواز ابھری۔ اس کا دل اس بات کو تسلیم کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔ اگر بالوں کی گواہی کافی ہوتی ہے تو یہ بال واقعی گل دقوز کے ہی تھے مگر سنہری بال تو دوسری کئی منگول لڑکیوں کے بھی تھے۔ وہ خود ہی اپنی ڈھارس بندھانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ فونا جو خان نے اس کی توجہ بٹانے کے لئے اپنی بات آگے بڑھائی۔

''تمہیں شاید یہ جان کر حیرت ہو کہ اس رسم کی ادائیگی میں دو چار افراد شامل نہیں ہوتے۔ گاد کو جہاں سے یہاں تک لایا گیا ہے اس میں یقیناً پچیس افراد کی کاوش ضرور شامل ہوگی''۔

مطیع الدین اس کی بات سننے کے بجائے اپنی ہی دنیا میں گم تھا۔ اس کے چہرے پر بدلنے والے رنگ اس بات کے عکاس تھے کہ وہ گہرے صدمے سے دوچار ہوا ہے۔ وہ آج رات یہیں قیام کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ چشمے کے کنارے پہنچ کر خیمے لگانے میں مصروف ہو گیا۔ مطیع الدین جب سکتے کے عالم سے بیدار ہوا تو اسے فونا جو خان دکھائی نہیں دیا البتہ کہیں سے پتھر کوٹنے کی آواز اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ وہ آواز کی جانب قدم بڑھانے لگا۔



سیف الدین محمود قطوزی نے ملکہ بدر منیر کی پیش کش پر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ بچار کیا وہ امور

سلطنت کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ اس مسئلے پر بھی غور کرتا رہا۔ اس نے ایک دن ابوالعباس شمس الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا مسئلہ صاف لفظوں میں بیان کر کے جب ان کی رائے طلب کی تو انہوں نے اس پیشکش کو فوراً قبول کرنے کا مشورہ دیا۔ سیف الدین محمود قطوزی نے سب لوگوں کے اقرار کو خوش آئند قرار دیتے ہوئے بالآخر ربیع الاوّل 657ھ میں ملکہ بدر منیر لولو سے عقد کر لیا۔ اس شادی میں مملوک امرأ کے ساتھ ساتھ ملکہ بدر منیر کا بھائی بھی شامل ہوا تھا۔ کچھ لوگوں نے اس شادی کو مشکوک نگاہوں سے بھی دیکھا مگر وہ خاموش رہے۔

ملکہ بدر منیر اس شادی سے بے حد خوش تھی۔ اسے اپنی منزل قریب آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر ملکہ بننے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اب وہ مملوک سلطان کے بجائے خوارزم شاہی سلطان کی ملکہ بننے کی خواہاں تھی۔

شادی کے کچھ دنوں بعد ملکہ بدر منیر لولو نے مملوک امرأ سے فرداً فرداً ملاقات کر کے انہیں کم سن سلطان کے بجائے کسی زمانہ شناس اور تجربہ کار سلطان کی ضرورت پر قائل کرنا شروع کر دیا۔ وہ اپنی کوشش جاری رکھے ہوئے تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر سیف الدین محمود قطوزی کو اس کے منصوبے کی ذرا سی بھنک پڑ گئی تو وہ بری طرح بدک جائے گا کیونکہ اس کے خیال میں کم سن سلطان نورالدین الملک المنصور کا حق اس کے پاس امانت ہے اور امانت میں خیانت کا سوچنا بھی اس کی نگاہ میں گناہ کبیرہ تھا۔ ملکہ بدر منیر نے اپنے منصوبے کی تکمیل کے لئے نہایت راز داری کا اہتمام کر رکھا تھا۔ اس نے سیف الدین محمود کو بھنک تک نہیں پڑنے دی کہ اس کے عزائم کیا ہیں اور وہ صرف انہی مملوک امرأ کو اپنی بات پر قائل کرتی دکھائی دی جو اس کے خیال میں اس کی مٹھی میں تھے اور ان سے یہ خبر منکشف ہونے کا ذرا سا خدشہ موجود نہیں تھا۔



اردوئے زریں کے سابق قاآن اعلیٰ باتو خان کا بیٹا سرتاق خان اپنے باپ کے مرنے کے بعد خود قاآن بننے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ قاآن اعظم منگو خان یقیناً عنان سلطنت کے لئے اسے ترجیح دے گا مگر جب برقائی خان کو اردوئے زریں کی قیادت سونپ دی گئی تو وہ گہرے صدمے سے دوچار ہوا۔ وہ کچھ عرصہ پہلے برقائی خان کو اسی بل بوتے پر دھمکا کر آیا تھا کہ بہت جلد قاآن اعلیٰ بن کر برقائی خان کے ارادوں کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دے گا مگر تقدیر نے سارا معاملہ ہی پلٹ دیا تھا۔ برقائی خان قاآن اعلیٰ بن چکا تھا۔ سرتاق خان اپنی حیثیت سے کم تر زندگی اور حق تلفی پر تلملا اٹھا۔ اس نے بلیق جاق پہنچ کر قاآن اعظم منگو خان کے سامنے اپنی حق تلفی کا واویلا مچایا تو منگو خان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ کسی طور پر اپنے باپ کے حق سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں ہوا۔ قاآن اعظم منگو خان نے اسے طمغاج نامی علاقے میں بطور والی تقرری کا پروانہ لکھ کر دیا تو وہ طیش کے عالم میں پروانہ پھاڑ کر لوٹ گیا۔ اسے قپچاق دقسین کی سرزمین کی ہوس تھی۔ اس کی واپسی پر منگو خان نے اپنے خاص خادم کو اس کے عقب میں روانہ کیا کہ وہ اس پر گہری نظر رکھے جب وہ کسی سازش کا مرتکب ہو تو فوری طور پر اس کی خبر دی جائے۔ سرتاق خان وہاں سے نکل کر سیدھا اپنے باپ کے چچازاد بھائی اور قاآن اعظم کے سگے بھائی ہلاکو خان کے پاس جا پہنچا۔

ہلاکو خان نے سرتاق خان کی آمد کا مژدہ سن کر اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی خوب دل جوئی کی۔ برقائی خان کو ہلاکو خان پہلے ہی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ سرتاق خان کی آمد نے اس کے شیطانی دماغ میں ایک نئی منصوبہ سازی کو پروان چڑھایا۔ اس نے سرتاق خان کو بطور ڈھال استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ایل خانی سلطنت کی وسعت بڑھانے کا خواہاں تھا۔ اردوئے زریں کے خیام خیل منگولوں کو اطاعت گذار بنانے کے

ساتھ ساتھ وہ انہیں قبول اسلام کی خوفناک سزا دینا چاہتا تھا۔ ہلاکو خان نے بذاتِ خود سامنے آنے کے بجائے سرتاق خان کو مسلح لشکر کے ساتھ اردوئے زریں کی طرف بڑھنے کی شہہ دی۔ اس نے سرتاق خان کی اسلام دشمنی کا بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہوئے اسے نصرانیت قبول کرنے کی دعوت دی جسے سرتاق خان نے دوسرے احسانات کے ساتھ بخوشی قبول کر لیا۔

سرتاق خان کے بارے میں تاریخ کہتی ہے کہ وہ جہاں کہیں مسلمانوں کو دیکھ لیتا اسے اتنی دیر تک سکون حاصل نہ ہوتا جب تک وہ ان سب کو موت کی نیند سلا نہ دیتا۔ وہ دین اسلام کے بارے میں نہایت متعصب ذہنیت کا مالک تھا۔ اس نے اردوئے زریں کے ایسے قبائل کے ساتھ مراسلہ نگاری کا سلسلہ شروع کیا جو اپنے آبائی مذہب کو ہر صورت میں ترجیح دیتے تھے۔ انہوں نے برقائی خان کی تبلیغ اسلام کی مہم کی مخالفت میں سرتاق خان کا ساتھ دینے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یوں ایک بڑا لشکر سرتاق خان کے جھنڈے تلے جمع ہو گیا۔ سرتاق خان لاؤ لشکر کے ساتھ تیزی سے پیش قدمی کرتا ہوا سرائے کی جانب بڑھا۔ ادھر برقائی خان کو بھی خبر ہو چکی تھی کہ اس کا بھتیجا سرتاق خان ایک بڑے لشکر کے ساتھ آ رہا ہے لہٰذا اس نے مکمل تیاری کے ساتھ قہرات کے قریب اپنا لشکر خیمہ زن کر دیا۔ جب سرتاق خان کو برقائی خان کے لشکر کے بارے میں علم ہوا تو اس نے رستہ بدل کر سرائے کی جانب پیش قدمی اختیار کی۔ برقائی خان نے یہ دیکھ کر کچھ دستے مختلف علاقوں میں پھیلا دیئے۔ سرتاق خان برقائی خان کی بروقت منصوبہ بندی سے پریشان ہو گیا۔ وہ جس طرف سے بھی آگے بڑھنے کی کوشش کرتا اسے آگے لشکر کی موجودگی کی خبر ملتی۔ برقائی خان نے اپنے بھائی شیبان خان کی معیت میں ایک سفارت اس کی جانب روانہ کی جس میں اسے یہ پیغام دیا گیا تھا کہ وہ اردوئے زریں کا امن خطرے سے دوچار نہ کرے بلکہ خاموشی سے اپنے چچا کے پاس چلا آئے اور اس کے ساتھ مل جل کر امور سلطنت میں ہاتھ بٹائے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ''میں تیرے باپ کی جگہ ہوں تو مجھ سے کیوں خفا ہو کر اجنبیوں کی مانند بھٹکتا پھر رہا ہے؟ کل تک تو میری گود میں خوشی سے کلکاریاں بھرا کرتا تھا اور آج میرے ہی خون کا پیاسا ہوا بیٹھا ہے۔ تو میرے پاس چلا آ...... آج بھی میرے دل میں تیرے لئے ویسی ہی شفقت موجود ہے''۔

سرتاق خان نے چچا شیبان خان کے سامنے اپنے مردہ باپ کے حق کا بڑا واویلا مچایا۔ شیبان خان نے تحمل سے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ برقائی خان کوئی غیر نہیں ہے۔ اگر آج ہم اپنوں کی ٹانگیں یوں کھینچنے لگیں گے تو یہ سلطنت ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے گی اور ہماری نسلیں حسرت بھری نگاہوں سے اس دقت کو یاد کریں گی۔ سرتاق خان کے دماغ پر صرف قاآن بننے کا بھوت سوار تھا۔ وہ کسی دلیل کو ماننے کو تیار نہیں ہوا۔ اس نے صاف الفاظ میں کہا۔ ''برقائی خان ایک مسلمان ہے اور میرا دین نصرانیت ہے۔ میرے نزدیک کسی مسلمان کا چہرہ دیکھنا بھی باعث نحوست ہے۔ اردوئے زریں میں صرف نصرانیت کا ہی جھنڈا لہرائے گا۔ اسلام بہت جلد خواب پارینہ بن جائے گا''۔ شیبان خان ناکام ہو کر واپس لوٹ آیا۔ اس نے برقائی خان کے سامنے اس کے جذبات بیان کرنے میں ذرا سی دروغ گوئی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

برقائی خان کو اپنے بھتیجے سرتاق خان کی سرکشی اور بدتمیزی کا گہرا صدمہ ہوا۔ کافی دیر کی سوچ بچار کے بعد اس نے حکم دیا کہ لشکر سے کچھ دور ویرانے میں ایک خیمہ لگا دیا جائے۔ اس کے حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ وہ لشکر گاہ سے نکل کر اس خیمے میں چلا گیا اور سختی سے حکم دیا کہ جب تک وہ خود نہ واپس لوٹے کوئی اس کی جانب نہ آئے۔ برقائی خان نے خیمے میں جا کر ایک بیڑی اور طوق منگوایا اور سپاہی اس انوکھی فرمائش پر حیران ہوئے مگر اپنے قاآن کی حکم عدولی کی ان میں جرأت نہیں تھی۔ برقائی خان نے طوق اپنے گلے میں ڈالا اور بیڑی سے اپنے

پاؤں باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے عجز و انکسار سے باری تعالیٰ کے حضور گریہ و زاری کی اور دعا کی کہ ''اے الٰہی! اگر تیرا دین اسلام اور شریعت محمدی واقعی برحق ہے تو سرتاق کے معاملے میں مجھ سے انصاف فرما۔ میرے بھائی نے جیسے میری حفاظت میں کبھی کوتاہی نہیں کی ایسے ہی مجھے بھی توفیق فرما کہ میں اس کی اولاد سے زیادتی نہ کروں''۔ وہ تین دن تین رات اس خیمے میں تنہا اسی حالت میں گریہ و زاری کرتا رہا۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ کب مشیت ایزدی کا حکم اسے سنائی دیتا ہے؟

قاآن اعظم منگو خان تک جب سرتاق کی بغاوت اور لشکر کشی کی خبر پہنچی تو اس نے فوراً ہی کہا کہ مجھے پہلے دن ہی اس کے ماتھے پر فتنہ لکھا دکھائی دے گیا تھا مگر میں نے جان بوجھ کر اسے سدھرنے کی مہلت دی تھی۔ اس نے اپنے خفیہ خادموں کو حکم دیا کہ فوری طور پر سرتاق خان کو ہلاک کر دیا جائے چاہے اس کے لئے کوئی بھی طریقہ استعمال کیا جائے۔ منگو خان کے خادم تیز رفتاری سے سرتاق خان کے لشکر میں جا پہنچے اور انہوں نے پہنچنے کے دوسرے دن سرتاق خان کے کھانے میں زہر ملا دیا۔ سرتاق خان کو زہر کی بابت اس وقت معلوم ہوا جب اس کے پیٹ میں درد اُٹھا۔ اس نے لشکر میں موجود طبیب کو فوری علاج کا حکم دیا مگر زہر بے حد سریع الاثر تھا۔ صرف ایک گھنٹے کے بعد وہ ایک بڑے لشکر کی موجودگی میں بے بسی سے موت کے گھاٹ اتر گیا۔ برقائی خان کی گریہ و فریاد قبولیت کو پہنچی۔ وہ چاہتا تھا کہ سرتاق خان سے جنگ کی نوبت پیدا نہ ہو، وہی ہوا۔ سرتاق لاؤ لشکر کے ساتھ دین اسلام کے خلاف جس نفرت کا اظہار کرتا تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا، ایک خون کا قطرہ بہائے بغیر ہی اس دنیا سے گذر گیا۔ جب سرتاق کی وفات کی خبر برقائی خان کو دی گئی تو اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے واقعی ان دونوں کے درمیان انصاف کیا ہے۔ اس نے بیڑی کھولی اور طوق گلے سے اتار دیا۔ وہ بوجھل قدموں سے سرتاق خان کے لشکر میں پہنچا۔ اس کی لاش ساتھ لے کر سرائے واپس آیا اور نصرانیت کی رسومات کے مطابق اس کی تدفین کر دی۔



مطیع الدین چشمے کے قریب پہنچا تو فونا جو خان خیمے نصب کرتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے فونا جو خان کو منع کرنا چاہا کہ خیمے نہ لگائے جائیں بلکہ واپسی کا سفر اختیار کیا جائے مگر فونا جو خان اس کی ابتر حالت دیکھ کر واپسی پر تیار نہیں ہوا۔ فونا جو خان نے کھانے پینے کے سامان میں سے کچھ گوشت نکالا اور چشمے کی ایک جانب آگ دہکا کر بھونے لگا۔ وہ دن بھر ادھر اُدھر پھرتے رہنے سے کچھ کھا پی نہیں سکا تھا۔ مطیع الدین کو تو جیسے چپ لگ گئی تھی۔ فونا جو خان اُس کی مسلسل خاموشی سے بوریت محسوس کر رہا تھا۔ گوشت کے پارچے جب خوشبو دینے لگے تو اس نے کچھ ٹکڑے مطیع الدین کی جانب بڑھا دیئے۔

''اب کیا ارادہ ہے......؟'' فونا جو خان نے طویل سکوت کو توڑنے کی کوشش کی۔

''سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے کہ اب کیا کروں......؟ تم نے ایسی منحوس خبر سنائی ہے کہ ذہن بار بار بہک جاتا ہے۔ کیا تمہیں واقعی یقین ہے کہ گل وتوژ مر چکی ہے......؟'' مطیع الدین دبے لہجے میں بولا۔

''میں نے یہ تو نہیں کہا...... کہ گل وتوژ مر چکی ہے...... یہ خیال تمہارے ذہن کی اختراع ہے۔ میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ اس غار میں کوئی عورت موجود تھی، ممکن ہے کہ وہ گل وتوژ ہی ہو لیکن اگر وہ گل وتوژ ہی تھی تو اس کی لاش وہاں سے نکالنے کی نوبت کیوں پیش آئی......؟ منگول قبائل آخری رسم کا غار کبھی نہیں کھولتے''۔

''تمہاری اسی بات سے دل کی کچھ ڈھارس بندھتی ہے کہ غار میں موجود عورت گل وتوژ نہیں ہو گی''۔

''میں ابھی تک سمجھ نہیں سکا کہ ان لوگوں کو آخر ایک زندہ عورت کی آخری رسم ادا کرنے کی ضرورت

کیوں پیش آئی......؟ اگر میں اسے سزا بھی قیاس کروں تو بھی یہ سزا کوئی منگول تجویز نہیں کرتا۔ شاید یہ ہمیں بہکانے کے لئے کوئی منصوبہ بندی ہو''۔ فونا جو خان گہری سوچ میں ڈوبا ہوا بولا۔

''ہمیں بہکانے کی کسی کو کیا ضرورت ہے......؟ ہم کسی کو یہ بتا کر تو نہیں آئے تھے کہ کوہ سرخ غر پر کس کام کی غرض سے جا رہے ہیں''۔ مطیع الدین نے اس کے قیاس کو رد کرتے ہوئے کہا۔

''تمہاری بات بھی کسی حد تک درست ہے مگر زندہ عورت کو غار میں بند کر دینا اور بعد میں غار کے دہانے پر نقب زنی کر کے اس کی لاش کو نکال لینا کم از کم میری عقل سے باہر ہے''۔ فونا جو خان شاید اس موضوع سے اکتا گیا تھا۔ وہ بات کا رُخ موڑنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ مطیع الدین نے سلسلۂ کلام دوبارہ جوڑ دیا۔

''ایک خیال میرے ذہن میں آیا ہے کہ شاید یہاں بھی کوئی محبت کی داستان پوشیدہ ہو۔ کوئی عورت محبت میں مبتلا ہو کر والدین یا قبیلے سے بغاوت کر بیٹھی ہو اور انہوں نے اسے راہ راست پر لانے کے لئے یہ قدم اُٹھایا ہو۔ یا اس عورت کو کہیں دور بھیج کر اس کے محبوب کو یہ باور کرایا گیا ہو کہ وہ عورت مر چکی ہے''۔ مطیع الدین سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔ فونا جو خان نے فقط اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ایسا بھی ممکن ہے......!''

''کیا آج رات آرام کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے......؟'' فونا جو خان نے سوال کیا۔

''اگر وہ دونوں ہمارے ہاتھ سے نہ نکلتے تو شاید اب ہمارے سامنے کوئی واضح صورتِ حال موجود ہوتی''۔ مطیع الدین نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''سانپ نکل چکا ہے اب لکیر کو پیٹنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میرے خیال میں ہمیں واپس لوٹ کر قاآن زادے برقائی خان کی مدد لینا چاہئے۔ اس کا اثر رسوخ وسیع ہے وہ آسانی سے ہمیں گل وتوژ کے بارے میں حقیقت سے باخبر کر سکتا ہے''۔ فونا جو خان نے تجویز پیش کی۔

''میں گل وتوژ کی تلاش میں برقائی خان کو استعمال نہیں کرنا چاہتا''۔ مطیع الدین نے ٹکا سا جواب دیا۔

''پھر ہمیں واپس لوٹنے کی ضرورت نہیں ہے، سیدھا قبیلہ سرخ غر میں چلتے ہیں جو کچھ ہو گا سامنے آ جائے گا''۔ فونا جو خان نے دوسری رائے پیش کی۔

''کون لوگ ہو تم......! اور قبیلہ سرخ غر میں کیا تلاش کرنا چاہتے ہو......؟'' ایک تیز آواز انہیں عقب میں سنائی دی۔ وہ دونوں اپنی جگہ سے قریباً اچھلتے ہوئے تیزی سے مڑے۔ فونا جو خان کی پھرتی تو مناسب تھی مگر وہ اپنا بوجھ نہ سنبھال سکا اور توازن کھو کر گرتا چلا گیا۔ مطیع الدین حیرت و پریشانی سے اس شخص کو دیکھ رہا تھا جو سیاہ ڈھاٹا چہرے پر لپیٹے جانے کب ان کے پیچھے آن کھڑا ہوا تھا۔



ہیرس جب اپنی قیام گاہ پر واپس لوٹا تو اُسے معلوم ہوا کہ آرمینیہ کے سپاہیوں نے اس کے باقی ساتھی تاجروں کے ساتھ بھی کچھ اسی سے ملتا جلتا سلوک کر کے ان کے مال و متاع مختلف حربوں سے ہتھیا لئے ہیں۔ ہیرس ان کی بات سن کر محض دانت پیس کر رہ گیا۔ اسے تجارت میں سرکاری سطح پر ایسی بے ایمانی کی توقع نہیں تھی۔ یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ آرمینیہ میں جتنے بھی مسلمان تاجر متوقع منافع کی منڈی کے خیال سے اس جانب رُخ کرتے تھے۔ ان کے ساتھ کچھ ایسا ہی سلوک کیا جاتا تھا۔ جب وہ مال فروخت کر کے واپس لوٹنے کی تیاری میں مصروف ہوتے ہو تو شاہی ہرکارے ان کے گرد پھیل کر خواہ مخواہ ان پر الزامات ٹھونس دیتے اور ان سے جمع پونجی چھین لیتے۔ کچھ لوگ اعلیٰ سطح پر شکایت لے کر پہنچ بھی گئے مگر ان کے مقامی نہ ہونے پر ان کی فریاد کو سننے سے

انکار کر دیا گیا۔ ہیرس چونکہ کبھی اس جانب نہیں آیا تھا، اس لئے اُسے کوئی ایسا تجربہ نہیں تھا۔ نہ ہی اس کے ساتھی تاجروں نے آرمینیہ کی لوٹ مار کا تذکرہ کبھی پہلے کیا تھا۔ ہیرس نے اس جانب سے لاعلمی کی ایک وجہ یہ بھی قیاس کی کہ مسلمان تاجروں کو لوٹ کر انہیں آرمینیہ کی سرحد بھی پار نہیں کرنے دی جاتی ہوگی تاکہ دوسرے علاقوں میں آرمینیہ کے برتاؤ کی خبر نہ پہنچ سکے۔

حالات چونکہ بے حد نازک موڑ اختیار کر چکے تھے۔ ہیرس کو اپنی جان سے زیادہ مصیبت میں پھنسے ہوئے مسلمانوں کی زندگی عزیز تھی۔ اس لئے تیزی سے فیصلہ کرتے ہوئے اس نے اپنے ساتھیوں کو فوری واپسی کا مشورہ دیا۔

''واپسی کی بات بھی منہ تک نہیں لانا..... تمہارا مال شاید ابھی تک بچا ہے اسی لئے تم فوری واپس لوٹنے کا واویلا مچا رہے ہو۔ ہماری جمع پونجی لٹ چکی ہے۔ ہم یہاں سے خالی ہاتھ واپس نہیں جائیں گے''۔ ایک تاجر فرطِ جذبات میں آپے سے باہر ہوتا ہوا بولا۔

''بات میرے یا تمہارے مال کی نہیں ہے۔ کیا تم اس چوہے دان میں پھنس کر اپنی جانوں سے بھی ہاتھ دھونا چاہتے ہو؟'' ہیرس نے کہا۔

''اس میں جان کا کیا سوال.....؟'' وہ تاجر بھڑک کر بولا ''ہمارا حق ناجائز طریقے سے ہتھیایا گیا ہے۔ تجارت کے بھی کچھ قواعد وضوابط ہوتے ہیں۔ ہم سب کو مل کر دربارِ شاہی تک رسائی حاصل کرنا چاہئے''۔

''یہ سب اگر دربارِ شاہی کے ہی اشارے پر ہو رہا ہو تو پھر.....؟ میں بخوبی سمجھ چکا ہوں کہ حکومت اس معاملے میں چشم پوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تم لوگوں پر الٹا بے ایمانی کا جھوٹا الزام تھوپ کر موت کی سزا سنائے گی۔ وہ تم جیسے لوگوں کو زنداں میں بند رکھ کر کھانا کھلانے کے روادار دکھائی نہیں دیتے''۔ ہیرس نے سب لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''تو کیا ہم خاموشی سے یونہی اپنا مال ومتاع لٹا کر واپس لوٹ جائیں؟'' ایک تاجر ہیرس کی مخالفت میں بولا۔

''کوشش کے باوجود کچھ اور ہو بھی نہیں سکے گا۔ تم لوگ کسی اسلامی ریاست میں نہیں ہو، یہ خالص نصرانی ریاست ہے۔ یہاں مسلمانوں کے لئے رحم یا انصاف قانون کی کسی کتاب میں موجود نہیں ہے''۔

''لگتا ہے اس کا مال ابھی سلامت ہے''۔ پہلا تاجر طنزیہ لہجے میں بولا۔

''میں تم لوگوں کو خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اب تمہیں لاعلم رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے کوتوالی میں مال ضبط کرنے والے افسر کو اس کے سپاہیوں سمیت زخمی کر دیا ہے۔ وہ جلد ہی اس طرف کا رُخ کرنے والا ہے۔ اسی لئے میں بار بار تمہیں کہہ رہا ہوں کہ بچا کھچا سامان سمیٹو اور یہاں سے فوراً کسی محفوظ مقام کا رُخ کرو''۔ ہیرس نے حقیقت بیان کر دی۔ ہیرس کی بات سن کر سب تاجروں کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

''یہ تم نے کیا کر دیا.....؟ جانتے ہو کہ اب ہماری جان بچنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی''۔ ایک تاجر تاسف بھرے لہجے میں بولا۔

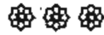
''جان بچانے والی ذات صرف اللہ ہی کی ہے۔ ثابت قدمی کا مظاہرہ کرو، تمہارا بال بھی بیکا نہیں ہوگا''۔

''میں تو سوچ رہا تھا کہ مقامی تاجروں سے بات کر کے انہیں اپنے ساتھ ملا کر دربارِ شاہی تک رسائی حاصل کر کے شاہی کارندوں کی شکایت کروں گا۔ مقامی تاجروں کی بدولت ہمیں کچھ نہ کچھ تو واپس مل ہی جائے گا

مگر تمہاری حرکت سے وہ امید بھی ٹوٹ گئی ہے''۔ پہلے تاجر نے یاسیت کے عالم میں کہا۔

''تم لوگ پریشان مت ہو، میں کوشش کروں گا کہ تمہارا نقصان پورا ہو جائے مگر پہلے یہاں سے جان بچا کر اپنے وطن تک لوٹنا ضروری ہے''۔ ہیرس نے ان کی ڈھارس بندھائی۔ وہ سب تیزی سے اپنے بچے کھچے کپڑے سمیٹنے لگے۔ کچھ ہی دیر میں وہ ہیرس کے ساتھ اس مقام سے نکل گئے۔ کوتوالی کا افسر جب وہاں پہنچا تو اس کی توقع کے مطابق اسے وہاں کچھ نہیں ملا۔ اس نے فوری طور پر دربارِ شاہی تک یہ خبر پہنچائی کہ کچھ مسلمان جاسوس ریاست میں گھس آئے ہیں اور انہیں گرفتار کر لیا گیا تھا لیکن وہ کوتوالی میں کم نفری کا فائدہ اُٹھا کر سپاہیوں کو زخمی کر کے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ دربارِ شاہی سے ان کی تلاش کا حکم نامہ جاری ہو گیا۔

ہیرس ان سب تاجروں کو شہر کی حدود سے باہر لے آیا تھا۔ ایک محفوظ مقام پر اس نے پڑاؤ ڈال کر صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے منصوبہ بندی پر غور شروع کر دیا۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ انہیں مخصوص حلئے میں پہچان لیا جانا کوئی مشکل بات نہیں ہوگی۔ اس کے لئے کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا ضروری تھا جس سے آرمینیہ کے محافظوں کی نگاہوں میں دھول جھونکی جا سکے۔



ہلاؤ خان کے پاس جب سرتاق خان کی موت کی خبر پہنچی تو وہ تڑپ اُٹھا۔ اس کا اردوئے زریں پر قبضے کا خواب بکھر کر رہ گیا تھا۔ اس نے زہر خورانی کی سازش میں برقائی خان کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ اس نے برقائی خان کے اس اقدام کے خلاف قاآن اعظم منگو خان کے پاس شکایت کی اور پُرزور طریقے سے برقائی خان کو معزول کر دینے کی سفارش کی۔ مگر منگو خان نے اسے اپنے معاملات کی جانب متوجہ رہنے کی تلقین کی۔ وہ خود برقائی خان کے خلاف لشکر کشی کا ارادہ باندھے بیٹھا تھا مگر جب بڑے بھائی کی جانب سے اس معاملے میں عدم مداخلت کا واضح حکم ملا تو وہ بے بسی کے عالم میں پیچ وتاب کھانے لگا۔ وہ برقائی خان کو بزور کچل دینا چاہتا تھا مگر ان دونوں کے درمیان قاآن اعظم کی ذات موجود تھی۔ برقائی خان کے بھی کچھ ایسے ہی جذبات تھے مگر وہ پہل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ہلاؤ خان نے اپنے خاص نصرانی سالار کتبغا خان کو مشورہ کے لئے اپنے پاس طلب کیا۔ چند دوسرے خاص مقربین کی موجودگی میں ہلاؤ خان نے سرتاق خان کی موت، برقائی خان کی زہر خورانی اور قاآن اعظم کی ممانعت کا معاملہ ان سب کے گوش گذار کیا۔ ہلاؤ خان کی بات سننے کے بعد انہوں نے دریافت کیا کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ ہلاؤ خان نے صاف لفظوں میں برقائی خان کی ذلت آمیز موت اور اردوئے زرین کے منگولوں کو سزا دینے کی خواہش کا اظہار کیا۔

''قاآن اعظم کی حکم عدولی کے بارے میں تو سوچا بھی نہیں جا سکتا البتہ اردوئے زریں میں موجود برقائی خان کے مخالفین کی حوصلہ افزائی کر کے انہیں بغاوت پر ضرور اکسایا جا سکتا ہے''۔ ایک مقرب جان جوز جانی نے اپنی رائے پیش کی۔

''یہ کام بہت سست اور وقت طلب ہے مجھے کوئی ایسا قدم اُٹھانے کی خواہش ہے جو کہ نہایت کاری بھی ہو اور فوری نتائج کا حامل بھی ہو''۔ ہلاؤ خان نے کہا۔

''میرے پاس ایک خاص تجویز ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں صرف آپ کو تنہائی میں بتاؤں گا''۔ کتبغا خان نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''تم بخوبی جانتے ہو کہ یہ سب لوگ میرے خاص مقربین ہیں.....!'' ہلاؤ خان نے تیز لہجے میں کہا۔

''میری تجویز کا تقاضا یہ ہے کہ وہ میرے اور آپ کے درمیان رہے''۔ کتبغا خان نے جواب دیا۔

ہلاکو خان نے سب لوگوں کو باہر جانے کا حکم دیا۔ وہ قدرے ناگواری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہاں سے نکل گئے۔ ہلاکو خان ان کے جانے کے بعد کتبغا کی جانب متوجہ ہوا۔

''خان اعظم ....!'' کتبغا خان مؤدب لہجے میں بولا۔ ''آپ کے مقربین میں کچھ مسلمان بھی موجود تھے اس لئے میں نے ان کے سامنے بات کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کی''۔

''ٹھیک ہے تم جو کہنا چاہتے ہو صاف الفاظ میں کہہ سکتے ہو''۔ ہلاکو خان نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔

''آپ کو برقائی خان سے اسی لئے نفرت ہے کہ وہ مسلمان ہو چکا ہے اور بڑی تیزی سے ارد دے زریں میں اسلام کا دائرہ پھیلا کر منگولوں کو مذہب سے دور کر رہا ہے''۔ کتبغا خان نے کہا۔

''یہ بھی کہہ سکتے ہو۔ میری مخالفت اسلام سے بھی اتنی ہی ہے جتنی برقائی خان سے ہے''۔ ہلاکو خان بولا۔

''اگر آپ چاہیں تو برقائی خان تڑپ کر خود آگے بڑھ کر آپ پر حملہ آور ہو سکتا ہے......!'' کتبغا خان نے پراسرار لہجے میں کہا۔ ہلاکو خان کی آنکھیں اس کی بات پر چمک اٹھیں۔ کتبغا خان نے توقف سے بات آگے بڑھائی۔ ''برقائی خان اور تمام مسلمانوں کا مرکز بغداد ہے۔ وہاں مسلمانوں کا خلیفہ بیٹھ کر تمام ریاستوں میں موجود والیوں اور سلطانوں کو ہدایات دیتا ہے۔ برقائی خان بھی اسی سلسلے سے جڑ چکا ہے۔ اگر مرکز کی جانب پیش قدمی کر دی جائے تو برقائی خان برداشت نہیں کر پائے گا اور خود لشکر کشی پر آمادہ ہو جائے گا''۔

''تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا کتبغا خان......!'' ہلاکو خان اس کی بات پر چونک کر پہلو بدلنے لگا۔ ''بغداد پر حملہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خلیفہ کے ماتحت تمام مسلمان سلطانوں کی تلواروں کا رُخ اپنی جانب موڑ لیا جائے۔ ایسا کرنا حماقت ہوگی۔ برقائی خان سے پہلے ہمیں تمام سلطانوں سے نبٹنا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی کا داؤ چل جائے اور ہماری ہیبت کی عمارت ہی فلک بوس ہو جائے''۔

''خان اعظم.....!'' کتبغا خان ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں نے یہ بات یونہی نہیں کہہ دی۔ اس کے پیچھے ایک بڑا نکتہ میرے ہاتھ لگا ہے''۔

''جو بھی کہنا ہے صاف صاف الفاظ میں کہو......!'' ہلاکو خان جھنجلا کر بولا۔

''آپ کے وزیر نظام الملک طوسی کے پاس کل ایک سفارت پہنچی ہے جس میں خلیفہ اسلام کے اہم وزیر ابن علقمی نے کچھ تجاویز بھیجی ہیں۔ ان میں خلافت کے عہدے کو کسی دوسرے خاندان میں منتقل کرنے میں مدد مانگی گئی ہے۔ اگر آپ تھوڑی سی کوشش کریں تو میدان بڑی خوبصورتی سے جیتا جا سکتا ہے۔ نظام الملک طوسی تو آپ کی مٹھی میں ہی ہے''۔ کتبغا خان نے انکشاف کیا تو ہلاکو خان سوچ میں پڑ گیا۔

''حیرت ہے کہ نظام الملک طوسی نے تو ایسا کوئی تذکرہ نہیں کیا......؟''

''آپ جب اس سے پوچھیں گے تو ساری بات واضح کر دے گا۔ میرے خیال میں مسلمانوں کے مرکز پر حملہ کر دینے کے بعد اسے تباہ و برباد کر کے برقائی خان کیا روئے زمین پر موجود سارے مسلمانوں کا وجود مٹایا جا سکتا ہے۔ یہ نصرانیت کی سب سے بڑی فتح ہوگی جو کہ آپ کے نام کے ساتھ ہمیشہ یاد رکھی جائے گی''۔ کتبغا خان نے ہلاکو خان کی اسلام دشمنی کو تقویت دینے کی کوشش کی۔ ہلاکو خان اس کی بات سن کر ایک دوسرے زاویے پر سوچنے لگا۔ وہ حالات سے مکمل باخبری کے بعد ہی کوئی واضح فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ اسے بے حد خواہش تھی کہ وہ اپنے دادا چنگیز خان کی طرح کوئی بڑا کام انجام دے کر ہی اس دنیا سے رخصت ہو۔ ایک ایسا کام جو کبھی فراموش

نہ کیا جا سکے۔ وجود اسلام کی بیخ کنی..... کتبغا خان کے شیطانی دماغ نے اس کی سوچ کے دھارے کو ایک نئی جہت بخشی تھی۔



مطیع الدین اپنے سر پر اجنبی کو پا کر فکر مند ہو گیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا نہایت چالاک اور ہوشیار شخص معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اپنی آمد کا رتی بھر بھی احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ فونا جو خان تیزی سے سنبھل کر اُٹھ کھڑا ہوا جبکہ مطیع الدین بیٹھا رہا۔ نو وارد اجنبی ان دونوں کی صورتیں باری باری دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ شاید وہ انہیں پہچاننے کی کوشش میں مصروف تھا۔

''اجنبی.....! تم کون ہو اور یوں چوری چھپے ہمارے عقب میں آنے سے تمہارا کیا مقصد ہے؟'' فونا جو خان نے اُلٹا سوال کر دیا۔

''یہی بات میں تم سے جاننا چاہ رہا ہوں کہ تم دونوں سرخ غروں کی سرزمین میں کیا کر رہے ہو...؟ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہماری حدود میں اجنبیوں کا داخلہ ممنوع ہے''۔ اجنبی نے سخت گیر لہجے میں کہا۔

''ہم مسافر ہیں اور کھو جانے والے ساتھی کی تلاش میں اس طرف آ نکلے ہیں''۔ مطیع الدین نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

''تمہارا نصب شدہ خیمہ اور آگ کا الاؤ تمہاری بات کی نفی کرتا ہے۔ تم یقیناً اس جگہ شکار کھیلنے کی غرض سے آئے ہو''۔ اجنبی نے ان کا مؤقف تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

''تم اپنا چہرہ تو دکھاؤ......! تاکہ ہمیں معلوم ہو سکے کہ تم کون ہو؟ کیونکہ کل رات بھی ہمیں کچھ لوگ یونہی دھوکہ دے کر نکل گئے ہیں''۔ فونا جو خان نے تیز لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

''کون لوگ......!'' اجنبی چونک پڑا۔ ''کہیں تمہاری مراد ایک سردار دو عورتوں سے تو نہیں؟''

''دو نہیں صرف ایک عورت اور ایک مرد......!'' مطیع الدین تنک کر بولا۔

''تمہاری ان سے بات وغیرہ تو ہوئی ہوگی......؟'' اجنبی نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''بات..... وہ کل رات ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا کر ایک عجیب سی کہانی سنا کر رات کی تاریکی میں ہمیں دھوکہ دے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں''۔ مطیع الدین نے جواب دیا۔

''ان کے ناموں کے بارے میں کچھ جانتے ہو......؟'' اجنبی سوالات کئے جا رہا تھا۔

''ہم یہ سب تمہیں کیوں بتائیں.....؟'' فونا جو خان مطیع الدین کے بولنے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

''خاصے پرجوش دکھائی دیتے ہو.....!'' اجنبی لفظ چبا کر بولا۔ ''مجھے ان دونوں کی تلاش ہے۔ بہرحال اگر تم ان کے بارے میں کچھ بتا سکو تو شاید میں تمہاری اس علاقے میں آمد کے جرم میں کچھ نرمی برت سکوں''۔

''اپنی نرمی اپنے پاس ہی رکھو اور اپنی تلوار بے نیام کر کے میدان میں اتر آؤ..... تمہارا دم بھی دیکھ لیتا ہوں''۔ فونا جو خان اس کے دھمکی آمیز لہجے پر تھے سے اکھڑ گیا۔ اجنبی شاید کچھ زیادہ ہی جوشیلا تھا۔ اس نے دعوت مبارزت قبول کرنے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کی۔ وہ اپنی تلوار لہراتا ہوا دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ مطیع الدین نے صورتِ حال کا بگڑتے دیکھ فوراً مداخلت کی اور فونا جو خان کو برداشت سے کام لینے کا مشورہ دیا۔

''اجنبی.....! تمہیں مطلوبہ باتیں ضرور بتائی جائیں گی مگر اس سے پہلے ضروری ہے کہ ہمیں تمہارا تعارف حاصل ہو۔ تم کون ہو......؟'' مطیع الدین نے ٹھنڈے دماغ سے کام لیتے ہوئے بات شروع کی۔

''میرا نام شنگ خان ہے اور قبیلہ سرخ غر کے سابق سردار کا پوتا ہوں۔ کچھ لوگ میری عزیزہ کو اغوا کر

کے اس جانب فرار ہوئے ہیں، میں ان کی تلاش میں یہاں آیا ہوں''۔ اس نے جواب دیا۔

''تمہارا قونائی خان سے کیا کوئی رشتہ ہے......؟'' مطیع الدین نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا تو وہ اجنبی بری طرح چونک کر محض اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گیا۔

''تم قونائی خان کو کیسے جانتے ہو......؟'' اس نے الجھے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

''قونائی خان میرے گھر کے برابر میں رہتا تھا۔ کسی وجہ سے اسے اچانک پراسرار موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا''۔ مطیع الدین نے جان بوجھ کر تفصیل سے کام لیا۔

''تم سرائے میں رہتے ہو......؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ظاہر ہے......! قونائی خان کا گھر سرائے میں ہی ہے''۔ مطیع الدین نے ہنس کر جواب دیا۔

''قونائی خان کے گھر کے کسی فرد کو جانتے ہو......؟'' شنگ نے پوچھا۔

''چاہو تو میں سب کے نام گن کر بتا سکتا ہوں''۔ مطیع الدین نے جواب دیا۔

''کل رات جو لوگ تمہیں ملے تھے ان میں مرد کا نام شکنان اور عورت کا نام گھنانم تھا......؟'' شنگ نے بات بدل دی۔ مطیع الدین نے اثبات میں جواب دیا۔ اس کے بعد اس نے کچھ دوسرے سوالات کئے جن سے ان دونوں کے حلئے کی تصدیق ہو گئی۔ کچھ دیر تک وہ ان سے فرار کے حوالے سے گفتگو کرتا رہا۔

''تم لوگ قبیلہ سرخ غر میں کیا حاصل کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے......؟'' اچانک اس نے پینترا بدلا۔

''اس بات کا جواب حاصل کرنا کہ انہوں نے ایک زندہ عورت کی آخری رسم کیوں ادا کی......؟'' فوسنا جو خان تیزی سے بولا۔ شنگ اس کی بات سن کر فرط حیرت سے گرتے گرتے بچا۔ اسے فوسنا جو خان کے غیر متوقع جملے پر شدید جھٹکا لگا تھا۔

''تمہیں کیسے معلوم ہے کہ کسی زندہ عورت کو آخری رسم کی سزا دی گئی ہے......؟'' اس نے بمشکل پوچھا۔

''سزا......!'' فوسنا جو خان نے لفظ چبا کر ادا کیا۔ ''جانتے ہو کہ منگولوں میں اس مقدس رسم کی بے حرمتی کی کیا سزا ہے؟ اگر دوسرے قبائل کو ذرا بھی بھنک پڑ جائے تو وہ سرخ غروں کی بوٹیاں نوچ کھائیں گے''۔

''تمہارے پاس کیا ثبوت ہے......؟'' وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بات کرنے لگا۔

''تمہارے چہرے کی حالت اور وہ غار......!'' فوسنا جو خان نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''کیا تم نے وہ غار دیکھا ہے......؟'' شنگ خان پے در پے حیرت کے جھٹکوں سے نبرد آزما تھا۔

''غار بھی دیکھا ہے، اس پر لگی نقب بھی دیکھی ہے اور غار کے اندر موجود سنہرے بالوں کی لٹ بھی......!'' فوسنا جو خان نے تیز لہجے میں جواب دیا۔

''کک... کیا مطلب گل وقوژ مر چکی ہے؟'' وہ تڑپ کر چیختا ہوا بولا۔ مطیع الدین اس کے لبوں پر گل وقوژ کا نام سن کر سکتے میں رہ گیا۔ وہ جس خیال کو کچھ دیر پہلے بڑی مشکل سے ذہن سے اتار پایا تھا وہ حقیقت کا روپ دھار کر دوبارہ ذہن پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ فوسنا جو خان اس جملے کی کاٹ کو محسوس کر کے بے بس کھڑا رہ گیا۔ وہ اچھی طرح واقف تھا کہ گل وقوژ کی موت کی تصدیق مطیع الدین کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے گی۔



بیبرس نے ایک محفوظ مقام پر ٹھہرنے کے بعد اپنے ساتھیوں سے علیحدگی اختیار کی اور اپنا حلیہ تبدیل کر کے مقامی لباس پہن کر واپس اسی شہر میں لوٹ آیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کے لئے کچھ لباس خریدے اور ضروری سامان لے کر واپس لوٹ گیا۔ ساتھی تاجر بیبرس کی صورت دیکھ کر بدک گئے اور یہ سمجھے کہ بیبرس نے

انہیں یہاں لا کر پھنسا کر ان کی مخبری کر دی ہے تبھی یہ آرمینی شخص یہاں پہنچ گیا ہے۔ ان کی گھبرائی ہوئی شکلیں دیکھ کر بیبرس نے اصلی لہجے میں بات کر کے ان کی ڈھارس بندھائی اور انہیں مقامی لباس پہننے کی ہدایت کی۔ اس لباس نے ان کی وضع قطع میں خاصا فرق پیدا کر دیا تھا۔ وہ کسی بھی طور پر پردیسی یا مسلمان نہیں دکھائی دیتے تھے۔ بیبرس کے پر یقین اور با اعتماد انداز سے اب ان میں کچھ کچھ حوصلہ پیدا ہونے لگا کہ وہ بیبرس کی معیت میں واپس وطن لوٹ جائیں گے۔ بیبرس نے ان ضروری کاموں سے فارغ ہو کر ایک بڑا سا تھیلا ان کی جانب بڑھا دیا۔ اس میں کھانے پینے کی کچھ اشیاء تھیں۔ انہیں سفر کے دوران کھانے پینے کے سامان کی ضرورت پڑتی۔ بیبرس نے غذا کے استعمال میں احتیاط برتنے کا مشورہ دیا۔ کیونکہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ نصرانی ریاست میں کب تک یونہی بھٹکنا پڑے گا۔ بیبرس انہیں مختلف کاموں میں مصروف کر کے اپنے چھوٹے سے خیمے کی جانب بڑھا۔ خیمے کے قریب پہنچ کر اسے اندر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو وہ چوکنا ہو گیا۔ وہ احتیاط سے خیمے کی جانب بڑھا اور ایک جھٹکے سے پٹ اٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر موجود شخص بیبرس کی اچانک آمد پر گڑ بڑا گیا۔ بیبرس کی نگاہ جب اس شخص پر پڑی تو اطمینان کی سانس لی۔ وہ وہی نحیف نوجوان تھا جسے اس نے بازار سے خریدا تھا۔

''شکل و صورت سے تو عرب دکھائی دیتے ہو، یہاں کیا کر رہے تھے......؟'' بیبرس نے پوچھا۔

''میں یہیں رہتا ہوں، مجھے نہیں معلوم میرے والدین کہاں کے رہنے والے تھے اور اب کہاں ہیں۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے اسی ظالم کے شکنجے میں خود کو پایا ہے''۔ اس نے جواب دیا۔

''لگتا ہے تم کسی عرب تاجر کی کم سن اولاد ہو جو ان نصرانیوں کے ہاتھوں بربادی کا شکار ہو گیا ہوگا''۔ بیبرس نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''تمہارا نام کیا ہے......؟''

''مجھے سب لوگ مرندی کہہ کر بلاتے ہیں''۔ اس نے جواب دیا۔

''نصرانی ہو کیا......؟'' بیبرس نے اچانک چونک کر پوچھا۔

''میں صرف غلام ہوں، مذہب سے میرا کوئی واسطہ نہیں رہا۔ نصرانیت کیا ہوتی ہے؟ اس بارے میں میں کچھ کہہ نہیں سکتا''۔ اس نے پھیکی سی ہنسی سے جواب دیا۔

''کبھی ان لوگوں کے ساتھ کلیسا گئے ہو......؟''

''غلاموں کا قدم بھی اگر کلیسا کے دروازے کو چھو جائے تو وہ پاؤں کاٹ دیتے ہیں''۔

''میں مسلمان ہوں......! آج سے تم میرے لئے کام کرو گے اور تمہارا نام مجھے کچھ پسند نہیں آیا تم کوئی دوسرا نام اپنے لئے تجویز کر سکتے ہو''۔ بیبرس نے کہا۔

''آپ کو جو نام پسند ہو وہی رکھ دیں میرے لئے ناموں میں کیا رکھا ہے''۔ اس نے بے چارگی سے کہا تو بیبرس لمحہ بھر کے لئے پریشان ہو گیا۔ غلامی کے عالم میں انسان کی کیا کیفیت ہوتی ہے وہ اس سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس نے نام بدلنے پر کوئی زور نہیں دیا بلکہ اسے باہر موجود تاجروں کے ساتھ مل کر ہاتھ بٹانے کا کہہ کر وہ اپنے اگلے قدم کے بارے میں سوچنے لگا۔

چار دن کے مسلسل قیام کے بعد اس نے شہر کا ایک اور چکر لگایا وہ تازہ صورت حال سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔ وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ دربار شاہی سخت خوف و ہراس کا شکار ہے۔ ایلخانی تاتاری لشکر باطنیوں کے کئی مضبوط قلعے روندتے ہوئے آرمینیہ کی سرحدوں تک پہنچ گئے تھے۔ تاتاریوں کی بربریت سے وہاں کے لوگ خوب واقف تھے۔ اسی لئے وہ شہر سے فرار ہو کر کسی محفوظ مقام کی تلاش میں مصروف تھے۔ بیبرس نے لوگوں کی

ابتر حالت دیکھ کر واضح منصوبہ بنالیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ایسی حالت میں ان کی تلاش کا کام ترک کیا جا چکا ہوگا۔ وہ تیزی سے اپنی کمین گاہ پر لوٹا اور ساتھی تاجروں کو فوری سفر کی تیاری کا حکم دیا۔ شام پڑنے سے پہلے ہی وہ چھوٹا سا قافلہ آرمینیہ کی سرزمین پر تیز رفتاری سے اپنے سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ ہیرس اس قافلے کی خود قیادت کر رہا تھا۔ اس نے حفظ ماتقدم کے طور پر اپنے ساتھیوں کو نصرانی حلیوں میں ہی رہنے دیا تا کہ کوئی انہیں مسلمان سمجھ کر متصادم ہونے کی کوشش نہ کرے۔ ان کے آگے پیچھے کئی قافلے رواں دواں تھے جو تاتاریوں کے خوف سے کسی محفوظ جگہ پر پہنچ جانا چاہتے تھے۔

آرمینیہ کی سرحد تک سفر بے حد پُرسکون رہا۔ بغیر کسی مشکل یا رکاوٹ کے وہ سرحد تک بآسانی پہنچ گئے۔ آرمینیہ کی سرحد پر پہنچنے پر تاجروں نے بے حد تکان کے باعث کچھ دیر آرام کرنے کی خواہش ظاہر کی تو ہیرس نے انہیں سمجھانا چاہا کہ کچھ دیر کی بات ہے ہم اس ریاست کی حدود سے باہر نکل کر انطاکیہ میں داخل ہو جائیں گے۔ وہاں بے شک ایک ماہ تک آرام کرتے رہنا۔ مگر انہوں نے مزید سفر سے معذوری کا اعلان کر دیا تو ہیرس کو مجبوراً وہیں رُکنا پڑا۔ شام ہونے سے پہلے اس مقام پر تین دوسرے قافلے بھی پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے پہلے موجود قافلوں کے پڑاؤ کو دیکھ کر وہیں رات بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہیرس ان مقامی لوگوں کے درمیان گھومتا رہا اور ان کے مشاغل اور انداز و اطوار کا جائزہ لیتا رہا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں ان قافلوں میں کوئی مخبر نہ موجود ہو جو شہر کے قیام کے دوران ان کے تعاقب و نگرانی پر مامور رہا ہو۔ جب اچھی طرح اطمینان ہو گیا تو رات کے آخری پہر میں وہ سو گیا۔

اگلی صبح تیز شور وغل کی آواز سے ہیرس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے خیمے سے باہر نکل کر دیکھا تو کچھ لوگ ایک جگہ دائرہ کی شکل میں موجود تھے اور وہاں کسی بات پر تلخ کلامی ہو رہی تھی۔ ہیرس تیزی سے اس جانب بڑھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے جو منظر دیکھا وہ اس کے لئے خاصا پریشان کن تھا۔ وہ حیرت بھری نگاہوں سے ان سب کی جانب دیکھ رہا تھا جو اس کی آمد سے ابھی تک بے خبر تھے۔



مطیع الدین کے ماتھے پر چمکتی ہوئی بوندیں دیکھ کر شنگ کے چہرے پر حیرت کی شکنیں گہری ہوتی گئیں۔ وہ اس کی متغیر کیفیت کو کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔ مطیع الدین اس کے منہ سے گل وتوژ کا نام سن کر شدید صدمے سے دوچار ہوا تھا۔ اسے ذرا بھی توقع نہیں تھی کہ اس غار میں واقعی گل وتوژ ہی بند کی گئی تھی، اور پھر شنگ سے بھی یہ امید نہیں تھی کہ وہ یکدم ایسی کوئی بات منہ سے نکال دے گا۔ وہ گذرے وقت میں گہنام اور شکنان کی باتوں کو مبالغہ آرائی کا نام دینے میں مصروف رہا تھا کہ اس کی تمام کوششوں کی عمارت ایک ہی پل میں زمین بوس ہو چکی تھیں۔ فوتنا جو خان کے لئے یہ لمحہ بڑا اہمیت کا حامل تھا۔ وہ کسی قیمت پر شنگ کو یہ سمجھنے کا موقعہ نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ لوگ گل وتوژ کی تلاش میں ہی اس طرف آئے ہیں۔ مطیع الدین کی متغیر حالت شنگ کو کسی حد تک صورتِ حال سمجھنے کا موقعہ فراہم کر رہی تھی۔

''تم نے تونائی خان کی بیٹی گل وتوژ کا نام لیا ہے..... کیا واقعی اس غار میں گل وتوژ کو ہی آخری رسم کی سزا دی گئی تھی؟'' مطیع الدین بمشکل بولا۔

شنگ اس کی جانب تیز نگاہوں سے دیکھتا ہوا بولا۔ ''تم گل وتوژ کو کیسے جانتے ہو؟''

''میں نے تمہیں پہلے بتایا تھا کہ میں تونائی خان کا ہمسایہ بھی ہوں، اس ناطے میں اس کی بیٹی، بیٹوں، بیویوں اور غلاموں تک کو جانتا ہوں''۔ مطیع الدین کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش

کرنے لگا۔

''تمہارا جواب اور تمہارا لہجہ کچھ سمجھ نہیں رہا.....'' شنگ اسے طنزیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

''شنگ خان!'' فوتنا جو خان فوراً بیچ میں بول پڑا۔ ''اس بات کو چھوڑ دو، تم اپنی بات کرو۔ کچھ لمحے پہلے تک تو تم یہ بات ماننے کو تیار ہی نہیں تھے کہ یہاں کسی زندہ عورت کو آخری رسم کی سزا دی گئی تھی مگر تمہاری وارفتگی نے تمام حقیقت منکشف کر دی''۔

''ن..... ن..... نہیں ..... نہیں تو''۔ شنگ خان اس کے اچانک حملے سے بوکھلا اُٹھا۔

''اب بات چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں، میں فوتنا جو خان اس معاملے کو منگولوں کے قرولتائی میں اُٹھاؤں گا کہ قبیلہ سرخ غر کے لوگ اپنی ذاتی رنجشوں اور ناراضگیوں میں اس حد تک بڑھ جاتے ہیں کہ وہ جاودانی آسمان کی مقدس رسومات کی کھلم کھلا پامالی کرتے ہیں''۔

''تم حد سے بڑھ رہے ہو۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ ایسا کچھ ہوا ہے۔ دوسرا تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ قبیلہ سرخ غر کسی ایسی مذموم حرکت کا مرتکب ہوا ہے؟'' شنگ نے تیز لہجے میں کہا۔

''ثبوت تو میں قرولتائی میں ہی پیش کروں گا''۔ فوتنا جو خان نے مستحکم لہجے میں کہا۔

''تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تم اس وقت ہماری حدود میں موجود ہو اور تمہارا یہاں سے زندہ سلامت نکل جانا کوئی آسان بات نہیں ہے''۔ شنگ اُسے دھمکانے لگا۔

''دھمکیاں دینے کی ضرورت نہیں ہے شنگ!'' مطیع الدین نے مداخلت کی۔ ''تم شاید نہیں جانتے کہ میں ایک بار پہلے بھی سرخ غر کے نرغے کا طوق توڑ چکا ہوں۔ گذشتہ بار تو تم لوگ میری بے خبری کا فائدہ اُٹھانے میں کامیاب ہو گئے مگر اس بار ایسا کچھ نہیں ہو سکے گا''۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' شنگ اس کی بات کو سمجھ نہیں پایا۔

''دتبا ژائی خان کیوں مارا گیا تھا اس بارے میں کچھ جانتے ہو''۔ مطیع الدین نے پوچھا۔

''تم دتبا ژائی خان کو بھی جانتے ہو!'' شنگ قبیلہ سرخ غر کے سابق مردہ سردار کا نام اس کے منہ سے سن کر بے اختیار اچھل پڑا۔ مطیع الدین کی شخصیت اس کے لئے کسی عجوبے سے کم نہیں تھی۔

''بس یہ جان لو کہ دتبا ژائی خان کی موت کا سبب میں ہی تھا''۔ مطیع الدین نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''کہیں تم وہی قیدی تو نہیں.....؟ جسے ازقائی قبیلے کے لوگ لے اُڑے تھے''۔ اس کے چہرے پر حیرت کے ساتھ ساتھ پریشانی بھی عود کر آئی تھی۔

''تمہاری معلومات اور تجزیہ کافی عمدہ ہیں''۔ مطیع الدین اس کے جواب پر سر دھن کر رہ گیا۔

''اوہ! اب میں سمجھا کہ گل وتوژ کی موت کے بارے میں سن کر یکدم تمہاری حالت بگڑ کیوں گئی تھی۔ تم یقیناً گل وتوژ کو واپس حاصل کرنے آئے ہو''۔ شنگ خان حقیقت سے آگاہ ہونے پر دانت پیستے ہوئے بولا۔ وہ ہی ہوا جس کا فوتنا جو خان کو اندیشہ تھا۔ شنگ پر مطیع الدین کی حقیقت منکشف ہو چکی تھی۔ مطیع الدین اس کی بات پر محض منہ بنا کر رہ گیا۔ وہ اپنی تمام طاقت مجتمع کرنے میں مصروف تھا کہ کسی بھی ناگہانی صورتِ حال سے فوری نبٹا جا سکے۔ شنگ نے بات آگے بڑھائی۔

''مجھے تم سے سچائی چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مت سمجھنا کہ میں تم سے دب گیا ہوں یا تمہارے اس ساتھی کی تلخ باتوں سے مرعوب ہو گیا ہوں۔ میں تم سے کچھ سودا کرنا چاہتا ہوں''۔

''تم اپنے قبیلے کے جرم کی پردہ پوشی کرنے کی کوشش مت کرو.....'' فوتنا جو خان بولا۔ مطیع الدین نے

تیزی سے اسے اپنی جانب کھینچتے ہوئے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ فوننا جو خان تیز نگاہوں سے مطیع الدین کی جانب دیکھنے لگا۔ اسے مطیع الدین کا یہ مصلحت آمیز رویہ ناگوار گذر رہا تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ یہ حقیقت ایک نہ ایک دن کھل کر سامنے آنا ہی تھی۔ گل وقوژ کو حاصل کرنا میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے اور میں اپنا مقصد پانے کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ تم کھل کر بات کرو کہ تم کیا سودا کرنا چاہتے ہو؟'' مطیع الدین کے چہرے پر گہری سنجیدگی دکھائی دینے لگی۔

''میں تم لوگوں کے ساتھ اس غار تک پہنچنا چاہتا ہوں جہاں گل وقوژ کو بند کر دیا گیا تھا۔ یقین کرو کہ یہ بات میرے لئے بالکل نئی ہے کہ گل وقوژ اب وہاں موجود نہیں ہے اور ساتھ ہی بالوں کی لٹ کی کہانی سے بھی یکسر انجان ہوں۔ مجھے سب سے پہلے یہ جاننا ہے کہ کیا واقعی گل وقوژ موت کا شکار ہو گئی ہے یا کسی ہمارے دشمن نے ہمارے ساتھ کوئی کھلواڑ کیا ہے یا ان دونوں مفروروں نے اس کی مدد میں یہ کام انجام دیا ہے اور وہاں بالوں کی لٹ پھینک کر ہمیں بہکانے کی کوشش کی ہے''۔ شنگ نے کہا۔

''جہاں تک ان دونوں مفروروں کی بات ہے تو میں یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ گل وقوژ ان کے ساتھ نہیں تھی۔ البتہ تمہاری دوسری بات کسی حد تک صحیح معلوم ہوتی ہے مگر ان تمام باتوں کا سودے بازی سے کیا تعلق ہے؟'' مطیع الدین اس کی باتوں پر غور کرتے ہوئے بولا۔

''یہ سودا اس وقت شروع ہوگا، جب مجھے اپنے قیاس پر یقین ہو جائے گا اور میں کسی نتیجے پر پہنچ جاؤں گا''۔ شنگ مختصراً بولا۔

''شنگ خان......!'' فوننا جو خان نے پھر کچھ بولنا چاہا کہ مطیع الدین کی گھورتی نگاہوں کو دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا۔ جانے کیوں فوننا جو خان کو شنگ کا انداز کچھ بھایا نہیں تھا۔ اسے شنگ کی پھیلائی گئی اسراریت میں کسی چال کا گمان ہو رہا تھا مگر مطیع الدین کے جھکاؤ آمیز رویے پر وہ محض دانت پیس کر رہ گیا۔



ہلاؤ خان نے خراسان پر فتح پانے کے بعد بادغیس کو اپنا دارالخلافہ بنایا تھا۔ یہیں بیٹھ کر وہ تمام امورِ سلطنت انجام دیتا تھا۔ اس کی مختلف مہمات باقاعدگی سے خراساں کے اطراف میں جاری تھیں۔ وہ ہر وقت اپنے دادا چنگیز خان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی سلطنت کو بڑھانے کی فکر میں مبتلا رہتا۔ زیریں فارس کے مسلمان امرا اور والیوں نے اپنے اقتدار کو غیر محفوظ سمجھتے ہوئے خود ہلاؤ خان کے دربار میں پیش ہو کر اس کی اطاعت و وفاداری کا حلف اُٹھا لیا تھا۔ انہیں میں بلادِ فارس کا امیر اتابک ابوبکر بھی شامل تھا۔ ہلاؤ خان نے ان سے عہد و پیمان لیا تھا کہ جب اُسے کوئی بڑی مہم پیش آئے گی تو وہ اسے عسکری سامان اور لشکر فراہم کریں گے اور خراج کے طور پر ایک خطیر رقم باقاعدگی سے اس کے پاس پہنچتی رہے گی۔ اسی دوران اسے جوشیلے باطنی فدائیوں سے نبرد آزما ہونا پڑا جو کہ اپنی جان داؤ پر لگا کر سرکردہ شخصیات کو موت کے گھاٹ اُتارنے میں سرگرم عمل تھے۔ ان کا مرکز قلعہ الموت تھا جہاں حسن بن صباح اور اس کے جانشین طویل عرصے سے قابض تھے۔ یہ قلعہ ایک ایسے مقام پر واقع تھا جہاں پہنچنا اور معرکہ آرائی بہت دشوار تھی۔ قاآن اعظم منگو خان کی ہدایت پر اس نے خود اس فتنے کی سرکوبی کی مہم شروع کی اور حلیف مسلمانوں کے ساتھ مل کر وہ قلعہ الموت پر موت بن کر جھپٹا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے باطنی فدائیوں کی قوت پارہ پارہ کر دی۔ لاکھوں افراد کی ہلاکت سے یہ تحریک ٹھنڈی پڑ گئی۔ اس مہم کی واپسی پر تقریب قرولتائی میں برقائی خان سے ناگوار ملاقات نے اس کی سوچ کا دھارا یکلخت مختلف سمت میں موڑ دیا۔ وہ مسلمانوں کو اپنا سب سے خطرناک دشمن خیال کرنے لگا۔ نصرانیت قبول کرنے کے بعد اسلام

دشمنی اس کا دینی فریضہ بن چکی تھی۔ کتبغا خان نے اس کی نگاہیں جس امر کی جانب مبذول کی تھیں وہ دشوار تو تھا مگر اس میں نصرانیت کی بڑی زبردست کامیابی مضمر تھی۔ اس نے پہلی ہی فرصت میں اپنے وزیر نظام الملک نصیر الدین طوسی کو بلوایا اور اس ضمن میں دریافت کیا۔ نظام الملک نصیر الدین طوسی نے اپنے حکمران کے سامنے ساری بات کھول کر رکھ دی۔ نظام الملک نصیر الدین طوسی باطنی فدائیوں کا ایک سرکردہ امیر رہ چکا تھا اور قلعہ الموت کی فتح کے بعد وہ ہلاؤ خان کے مصاحبین خاص میں شامل ہو گیا۔ اس نے اسی عرصے میں اخلاق ناصری نامی کتاب لکھی تھی۔ وہ متعصب اور غالی شیعہ تھا۔ ہلاؤ خان کے سامنے جو تفصیل آئی تھی اس کے مطابق خلیفہ مستعصم باللہ کا وزیر سلطنت احمد بدر الدین بن عبدالملک علقمی، ہلاؤ خان کی مدد سے خلافت عباسیہ کا خاتمہ کرنے کا متمنی تھا اور وہ ہلاؤ خان کی بغداد میں آمد کے لئے راہیں ہموار کرنے پر تہہ دل سے تیار تھا۔

ہلاؤ خان کے لئے اس خصوصی مدد کا ایک سبب وزیر سلطنت ابن علقمی کی خلیفہ مستعصم باللہ کے فرزند کلاں ابوبکر محمد کے ساتھ دلی رنجش تھی۔ ابوبکر محمد امیر المومنین کا جانشین بھی تھا اور بڑا بہادر جنگجو اور دانا شخص تھا۔ وہ طویل عرصے سے تاتاریوں کے بڑھتے ہوئے سیل کے سامنے آہنی دیوار بنا کھڑا تھا۔ ہلاؤ خان بھی اس سے نالاں تھا۔ ایک موقعے پر دربار خلافت سے امیر ابوبکر محمد کو رافضی شیعہ جماعتوں کی سرکشی اختیار کرنے پر سرکوبی کے لئے متعین کیا گیا تو اس نے انہیں میدان جنگ میں عبرت ناک شکست سے دوچار کیا اور بڑی جماعت کو تہہ تیغ کر دیا۔ میدان جنگ میں باغیوں نے اپنی قوت کمزور دیکھ کر راہ فرار اختیار کی اور ان کی بڑی تعداد میدان جنگ سے فرار ہو کر کرخ اور مشہد جا پہنچی۔ یہاں پناہ گیر ہونے کے بعد انہوں نے زور و شور سے از سر نو جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ ابوبکر محمد کو جب معلوم ہوا تو اس نے انہیں مزید موقعہ دینا مناسب نہیں سمجھا اور تیزی سے سفر کرتا ہوا پہلے کرخ جا پہنچا اور وہاں باغیوں کو چن چن کر ہلاک کیا گیا۔ اس کے بعد وہ مشہد امام موسیٰ جعفرؒ پہنچا اور باغیوں کی قوت منتشر کرتے ہوئے پکڑے جانے والوں کو عبرت ناک سزائیں دیں اور ان کے مال و متاع پر قبضہ کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان رافضی باغیوں کو ابن علقمی کی پشت پناہی حاصل تھی کیونکہ ابن علقمی خود بھی غالی رافضی تھا۔ ابوبکر محمد کا یہ معرکہ ابن علقمی کے سینے پر سانپ بن کر لوٹنے لگا اور اس نے اپنے ہم مسلک احباب کے ساتھ مل کر ایک بڑی خوفناک سازش کا تیار کی۔ اس نے تاتاریوں کی بربریت و فتنہ انگیزی کو نظر انداز کرتے ہوئے ہلاؤ خان کو بغداد پر حملے کی باقاعدہ دعوت دے ڈالی۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ ہلاؤ خان دندناتا ہوا بغداد میں داخل ہو اور خلیفہ مستعصم باللہ کو ہلاک کر کے اہل بیت کے کسی فرد کو خلافت کی گدی پر بٹھا دے۔ ہلاؤ خان اس معاملے میں کسی جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس نے ابن علقمی کی دعوت کو اپنے موافق تدبیروں کی تعمیل پر مشروط کر دیا۔ نظام الملک نصیر الدین طوسی بھی غالی شیعہ تھا، وہ اس معاملے میں منتظم کے فرائض انجام دیتے ہوئے ابن علقمی کو ہدایات جاری کرتا رہا۔ ابن علقمی نے نظام الملک نصیر الدین طوسی کو یہ باور کرایا تھا کہ عباسیوں کی خلافت کے خاتمے کے بعد حق خلافت ہم اہل بیت کی جانب منتقل کر دیں گے کیونکہ یہ انہی کا حق ہے جو پہلے امویوں نے اور پھر عباسیوں نے ان سے حربوں و حیلوں سے چھین لیا تھا۔ نظام الملک نصیر الدین طوسی اہل بیت سے بڑی عقیدت رکھتا تھا، اسی جذبے کے تحت وہ ابن علقمی کی سازش میں اس کے ساتھ مل گیا۔

ہلاؤ خان نے اس کام کے ابتدائی مرحلے میں چھوٹے چھوٹے دستوں پر مشتمل لشکر حدود خلافت کے شہروں میں روانہ کرنا شروع کئے۔ وہ اس امر سے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ بغداد پر حملہ کرنے پر اسے کیسا ردعمل دیکھنے کو مل سکتا ہے؟ عراقی شہروں پر تاتاری غارتگری کے نتیجے میں امیر علم سلیمان شاہ ایوائی ترکمان نے امیر محمد ابوبکر کے ساتھ مل کر عسکری قوت کا استعمال تیز کر دیا اور آگے بڑھ کر تاتاریوں کو پے در پے شکستیں

دیں تو ہلاکو خان خاصا پریشان ہو گیا۔ اس نے تاتاریوں کے رعب و دبدبے کی گرتی عمارت دیکھ کر خود میدان میں نکلنے کا فیصلہ کیا اور تیزی سے بلادِ عراق کی جانب روانہ ہوا۔ امیر موصل بدرالدین لولو کو جب ہلاکو خان کی آمد کی بابت معلوم ہوا تو وہ خود اس کے پاس پہنچا اور اپنی خلیفہ سے ذاتی دشمنی کا حوالہ دے کر اطاعت پیش کر دی۔ ہلاکو خان کے سامنے بس ایک ہی خواب تھا...... بغداد پر قبضہ...... اس نے امیر موصل بدرالدین لولو کے سامنے یہ کڑی شرط رکھی تو اس نے خوشدلی و شکر گزاری کے ساتھ اُسے قبول کرتے ہوئے اپنی امیر المومنین سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا۔ وہ پہلے بھی امیر المومنین کو دل سے پسند نہیں کرتا تھا اور اس کی ریاست میں تمام خطبوں میں امیر المومنین کا نام نہیں لیا جاتا تھا۔ ہلاکو خان نے امیر بدرالدین لولو کی اطاعت کو نیک شگون قرار دیا اور بغداد کے قریبی علاقوں میں اپنے سپاہیوں کے دستے تعینات کر دیئے۔

ہلاکو خان کی روانگی اور بغداد پر حملے کی رضامندی کی اطلاع پا کر ابن علقمی نے خلیفہ مستعصم باللہ کے سامنے سپاہ کے اخراجات کا ایسا رد نا رویا کہ خلیفہ پریشان ہو کر رہ گیا اور اس نے دریافت کیا کہ ان اخراجات کی ادائیگی کیسے ممکن ہے؟ ابن علقمی نے مسلمان سپاہیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اسے آگاہ کیا کہ ایک خطیر رقم ان کی ماہانہ تنخواہوں میں خرچ ہوتی ہے اور وہ بے کار بیٹھ کر مفت کی تنخواہ پا رہے ہیں حالانکہ بغداد کے گرد و نواح میں امن و امان کی فضا قائم ہے۔ پُرامن حالات میں اتنی بڑی سپاہ کا رکھنا سراسر خسارے کا سودا ہے اور بیت المال پر مفت کا بار ہے۔ خلیفہ مستعصم باللہ نے اس کی بات سن کر مناسب اقدامات اُٹھانے کی ہدایت کی۔ اس نے وزیر خلافت سے اپنے اختیارات کے کھلے استعمال کی اجازت پاتے ہی سپاہیوں کے کچھ حصوں کو دور دراز مختلف مقامات پر حیلوں بہانوں سے روانہ کرنا شروع کر دیا اور سپاہیوں کی بہت بڑی تعداد کو جبری طور پر برطرف کر کے گھروں کو بھیج دیا۔ سپاہ نے وزیر سلطنت کے فیصلے پر احتجاج کرنا چاہا مگر ان کی بات سننے والا کوئی نہیں تھا۔ اس وقت وزیر ابن علقمی کے خونخوار پنجے بے حد مضبوطی سے ہر سو گڑے ہوئے تھے، کوئی اس کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ خلیفہ مستعصم باللہ تک اس کے غلط اقدامات کی حقیقت نہ پہنچ سکے۔ اس کا بھی اس نے الگ انتظام کر رکھا تھا۔ خلیفہ کے رفقاء میں زیادہ تر اس کے مخبر موجود تھے جو پل پل کی خبریں اس تک پہنچایا کرتے۔ امیر المومنین مستعصم باللہ شاہی محل کی چار دیواری میں مقید، باہر کی دنیا سے بے خبر و بے فکر اپنے ذوقِ محافل میں مگن رہتا تھا۔ اس کے خیر خواہ رفقاء میں سے بھی کسی کو اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ ابن علقمی کا پول اس کے سامنے کھول پاتے۔ جبری فارغ شدہ مسلمان سپاہیوں نے بغداد کے گلی کوچوں میں خوب ہنگامہ آرائی مچائی۔ مگر جب انہوں نے اپنے احتجاج کی دال گلتی نہ دیکھی تو بے بسی و بے چارگی سے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ سپاہیوں کا تقریباً اسی فی صد حصہ مختلف علاقوں سے آ کر لشکر میں شامل ہوا تھا۔ ان کے جانے سے بغداد خالی خالی سا دکھائی دینے لگا۔ ابن علقمی نے بغداد کے حالات تاتاری حملے کے موافق سازگار کر دیئے تھے۔ اب بغداد ہلاکو خان کو پکے ہوئے پھل کی مانند دکھائی دینے لگا۔



ہیرس فرطِ حیرت سے زمین پر پڑے شخص کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں تھا بلکہ اس کے قافلے کا ہی ایک تاجر تھا۔ اس کا حلیہ بے حد خراب دکھائی دے رہا تھا۔ منہ سے خون بہہ رہا تھا اور کپڑے قریباً تار تار ہو چکے تھے۔ ہیرس کو اس کی حالت پر تعجب ہوا۔ لوگوں کا ایک گروہ اسے اپنے نرغے میں لئے ہوئے تھا۔ ہیرس آگے بڑھا۔ ایک شخص نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر ہیرس اس کی پرواہ کئے بغیر بیچ میں جا پہنچا۔ قریب موجود سبھی لوگ ہیرس کو خونخوار نگاہوں سے گھورنے لگے۔ انہیں ہیرس کی مداخلت ناگوار گذری۔

''کیا بات ہے؟...... تم لوگ اسے کیوں پیٹ رہے ہو؟'' ہیرس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''تمہارا اس شخص سے کیا واسطہ ہے، کیا تم بھی اس کے ساتھ ہو؟'' ایک شخص تنک کر بولا۔

''یہ میرے قافلے کا ایک معزز فرد ہے، اس لئے مجھے یہ پوچھنے کا پورا اختیار ہے کہ تم لوگوں نے اس کی یہ حالت کیوں کی ہے؟'' ہیرس سرد لہجے میں بولا۔

''مار و اسے بھی مارو...... یہ اس کا ساتھی ہے اور ہمیں الو بنا کر اسے چھڑانے آیا ہے''۔ ان میں ایک شخص چیختا ہوا بولا۔ اس کی بات سن کر دو افراد جوش میں آگے بڑھے تاکہ وہ ہیرس کو نشانہ بنا سکیں۔ ہیرس نے صورتِ حال کو اپنے خلاف جاتے دیکھ کر تیزی سے اپنی تلوار بے نیام کی اور ایک ہی وار میں بڑھنے والے دونوں افراد کو ہلکا سا زخمی کر دیا۔ تلوار کی دھار نے ان کے بازوؤں پر معمولی سا گھاؤ ڈال دیا۔

''تم میں سے اب کسی شخص نے بھی کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش کی تو اب کی بار اس کا بازو ہی جسم سے الگ کر دوں گا''۔ ہیرس غصیلے لہجے میں بولا۔ وہ لوگ سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔ انہیں شاید ہیرس کے پاس تلوار کی موجودگی کی توقع نہیں تھی۔

''مجھے ان سے بچالو!'' زمین پر گرا ہوا زخمی تاجر دونوں ہاتھ جوڑتا ہوا بولا۔

''یہ لوگ اب تمہیں کچھ نہیں کہیں گے، تم بے فکر رہو۔ پہلے مجھے اصل معاملہ دریافت کرنے دو پھر میں دیکھتا ہوں کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جانا چاہئے؟'' ہیرس نے سرد لہجے میں کہا۔ ہیرس اُن سب لوگوں کے چہرے پر تیز نگاہ ڈالتے ہوئے دوبارہ گویا ہوا۔ ''کیا تم میں سے کوئی میرے ساتھی کی یہ درگت بنانے کی وجہ بتائے گا یا میں اپنے ساتھی کی ایسی حالت بنانے والوں کو بلا جانے ہی کڑا سبق سکھاؤں''۔

''تمہارا یہ ساتھی چور ہے''۔ ایک شخص تیزی سے بولا۔ ''اس نے ہمارے خیموں میں گھس کر نقدی اور سامان چوری کرنے کی کوشش کی ہے، ہم نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے''۔

''میں نے کچھ نہیں کیا خدا کی قسم! میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ لوگ مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہے ہیں''۔ زخمی تاجر نے اُس کی بات پر واویلا مچانا شروع کر دیا۔

''تم خاموش رہو''۔ ہیرس نے اُسے ڈانٹ پلائی۔ وہ صورتِ حال سے آگاہ ہونے پر متفکر دکھائی دے رہا تھا۔ ''تم لوگ وضاحت کر سکتے ہو کہ کس نوعیت کا سامان اس نے چرانے کی کوشش کی ہے''۔ ہیرس نے ان سے دریافت کیا۔

''تمہارا ساتھی صبح سویرے میرے خیمے میں داخل ہوا اور ہم لوگوں کو سوتا پا کر اس نے ہمارے صندوق کھولے اور ان میں سے تمام نقدی نکال لی۔ یہ جب نقدی کی تھیلی اپنے لباس میں اڑس رہا تھا، اُس وقت اتفاق سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے جب اپنے خیمے میں اجنبی کو دیکھا تو مجھے صورتِ حال سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ بس میں نے اسے دبوچ لیا اور شور مچا دیا پھر یہ سب لوگ بھی وہاں پہنچ گئے''۔ ان میں سے ایک شخص آگے بڑھ کر بتانے لگا۔

''نقدی کی تھیلی، تم میں سے کن لوگوں نے پکڑے گئے شخص کے پاس دیکھی تھی''۔ ہیرس نے سوال کیا۔ ان میں تین افراد نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ہیرس نے اکا دُکا سوال کے بعد زخمی تاجر کی جانب توجہ مبذول کی جو کہ خوفزدہ نگاہوں سے سب لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔

''تمہیں یہ حرکت کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟'' ہیرس تلخی سے بولا۔

''خدا کی قسم! ایسی کوئی بات نہیں ہے یہ سب لوگ جھوٹ بول رہے ہیں''۔ وہ ہچکچاتا ہوا بولا۔

''فضول آدمی! خدا کا نام یوں بدنام نہ کرو۔ یہ سب لوگ تمہاری اس حرکت کے گواہ ہیں اگر یہ تمہیں قاضی کے پاس گھسیٹ کر لے جائیں تب بھی تم بچ نہیں سکو گے۔ اتنی شہادتیں سن کر تو قاضی بلاتوقف تمہارے بارے میں وہی فیصلہ سنائے گا جو کسی چور کے لئے سنایا جاتا ہے۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے سب سچ سچ بتادو، شاید میں تمہاری کوئی مدد کرسکوں''۔ ہیرس تیز لہجے میں بولا۔

''ہیرس! یہ حرکت اسی نے ہی کی ہوگی۔ یہ پہلے بھی ایسی حرکتوں کا مرتکب ہو چکا ہے۔ ایک بار تو اسے قاضی نے سخت جرمانے کی سزا بھی دی تھی مگر یہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا''۔ ہیرس کے ایک ساتھی تاجر نے آگے بڑھ کر گواہی دی۔ اس کی صورت دیکھتے ہی زخمی تاجر کا چہرہ بالکل بجھ گیا۔ ہیرس کو یقین ہو چکا تھا کہ یہ شخص پکڑے جانے پر جان بوجھ کر جھوٹ بول رہا ہے۔

''میں تمہیں آخری موقعہ دے رہا ہوں کہ سچ بتادو ورنہ میں تمہیں ان لوگوں کے حوالے کر کے واپس لوٹ جاؤں گا پھر چاہے یہ لوگ تمہاری بوٹیاں نوچ ڈالیں مجھے کوئی پرواہ نہیں ہوگی''۔

''مجھ سے غلطی ہوگئی ہے، میں گذشتہ کئی دن سے بے حد پریشان تھا چونکہ میرا سارا مال نفع واصل سمیت لٹ چکا تھا اور میں یوں خالی ہاتھ منہ لٹکا کر واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ اسی لئے میں نے ان لوگوں سے اپنی محرومی کا بدلہ لینا چاہا تھا''۔ وہ ہیرس کی دھمکی سے مرعوب ہو کر ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

''کیا تمہیں خدا کی قدرت پر یقین باقی نہیں رہا تھا''۔ ہیرس دانت پیس کر بولا۔

''میں بے حد شرمندہ ہوں''۔ وہ مختصراً بولا۔

''میرے خیال میں تم لوگ اسے کافی سزا دے چکے ہو۔ تمہارا مال بھی تمہیں واپس مل چکا ہے۔ اب مزید مار پیٹ کا کوئی فائدہ نہیں اور تم بھی کان کھول کر سن لو۔ تم اب ہمارے قافلے کے ساتھ سفر نہیں کر سکتے۔ یہ میرے پاس کچھ نقدی ہے یہ لو اور اپنا راستہ ناپو''۔ ہیرس نے زخمی تاجر کی جانب ایک تھیلی اچھالتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا۔ وہ لوگ ہیرس کی بات سن کر اپنے اپنے خیموں کی جانب لوٹنے لگے۔ کچھ ہی دیر میں وہاں چھائی ہوئی بھیڑ چھٹ گئی۔ ہیرس بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنے خیموں میں واپس لوٹ آیا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی ہیرس کے قافلے نے خیمے سمیٹ لئے اور وہاں سے روانگی اختیار کی۔ دن کی پہلی ساعت میں ہی ان کا قافلہ انطاکیہ کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔

انطاکیہ کی سرحد پر موجود دوسرے قافلے بھی ایک ایک کر کے وہاں سے چلتے بنے۔ زخمی تاجر کا سارا جسم پھوڑے کی مانند دکھ رہا تھا اور کافی خون بہہ جانے سے اس کی حالت خاصی بگڑ چکی تھی۔ اسے تیمارداری کی ضرورت تھی مگر کوئی اس کی جانب دیکھنے کا بھی روادار نہیں تھا۔ سب لوگ اس پر نگاہ غلط ڈالتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوتے گئے۔ زخمی تاجر زمین پر پڑا ان سے مدد کی بھیک مانگتا رہا مگر ان لوگوں کی نگاہ میں اس کا جرم اتنا بڑا تھا کہ معافی کی صورت باقی نہیں بچی تھی۔ اس نے ہیرس سے ملی نقدی کا لالچ دیتے ہوئے انہیں خود انطاکیہ پہنچانے کی استدعا کی مگر کوئی اسے اپنے قافلے میں شامل کرنے کو تیار نہیں ہوا۔



وہ بڑی تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ بغیر رُکے طویل فاصلہ طے کر کے وہاں پہنچا ہے۔ بالوں میں اَٹی ہوئی دھول اور کپڑوں کی ناگفتہ بہ حالت نے اس کا حلیہ کافی حد تک مضحکہ خیز بنا رکھا تھا۔ کمرے میں موجود شخص اس کی حالت دیکھ کر متفکر سا دکھائی دینے لگا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے آمد کی وجہ دریافت کی۔

''قاآن اعظم کا اقبال بلند ہو۔ میں بلا رُکے سمرقند سے سیدھا چلا آرہا ہوں۔ میرے ہمراہ ایک اہم مگر بڑی افسوس ناک اور روح فرسا خبر ہے''۔ اجنبی نے تعظیم دیتے ہوئے کہا۔

''کیا اس خبر کا سننا ہمارے لئے واقعی اہم ہے''۔

''میں اپنی جان کی امان چاہوں گا''۔ اجنبی مؤدب لہجے میں بولا۔

''جہاں اتنی بری خبریں سننے کو ملتی ہیں وہاں ایک اور سہی''۔

''آپ کے تایازاد بھائی ہلاکو خان نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ مرکز اسلام بغداد کا محاصرہ کر لیا ہے اور وہ نصرانیت کے زعم میں بغداد کو تباہ برباد کرنے کا ارادہ کئے ہوئے ہے''۔ وہ تیزی سے بولتا چلا گیا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' اردوئے زریں کا قاآن اعظم برقائی خان اس کی بات کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنی جگہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اجنبی کی عجلت آمیز آمد کو اس نے اس قدر گھمبیر تصور نہیں کیا تھا۔ اس کے ذہن کے پردوں پر کسی والئی شہر کی بغاوت کا عکس موجود تھا۔

''مرکز اسلام کی جانب سے کیسا ردعمل دکھائی دے رہا ہے؟'' برقائی خان نے کچھ توقف کے بعد سوال کیا۔

''قاآن اعظم! بغداد کی صورتِ حال کے بارے میں جو اطلاعات ہم تک پہنچی ہیں، ان کے مطابق وہاں کی حالت کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ ہلاکو خان نے دربار کی کسی بڑی شخصیت کو اپنے دام فریب میں پھنسا رکھا ہے اور وہ بھرپور انداز میں اس کے لئے آسانیاں پیدا کر رہا ہے''۔ اجنبی نے جواب دیا۔

''کیا دوسری مسلمان ریاستوں کے سلطانوں نے کچھ نقل و حرکت کی ہے''۔ برقائی نے پوچھا۔

''ہلاکو خان نے سب سے پہلے بغداد کے گرد و نواح کے سلطانوں کو ہی اطاعت گزار بنایا ہے اور وہ سب امیر المومنین کے خلاف اس کے جھنڈے تلے دکھائی دے رہے ہیں''۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ میں دیکھتا ہوں کہ کیا کیا جا سکتا ہے؟'' برقائی خان نے اُسے رخصت کر دیا۔ اس کے جانے کے بعد برقائی خان نے اپنے کاتب کو بلوا کر فوری طور پر دو مراسلے لکھوائے۔ ان میں سے پہلا مراسلہ منگولوں کے قاآن اعظم منگو خان کے نام تھا، جس میں ہلاکو خان کی اس پیش قدمی کو اسلام دشمنی قرار دیتے ہوئے روکنے کی استدعا کی گئی تھی اور مرکز اسلام کو نقصان پہنچنے کی صورت میں منگولوں میں پھوٹ پڑ جانے کا اندیشہ بیان کیا گیا تھا۔ اس نے یہ وضاحت بھی کی تھی کہ یہ بڑا نازک مرحلہ ہے کہ منگولوں کا ایک بڑا حصہ اسلام قبول کر چکا ہے اور وہ مرکز اسلام کو نہایت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے، ایسے میں ہلاکو خان کی کسی بھی ناعاقبت اندیشی سے مسلمان منگول اپنے ہی بھائیوں کے خلاف مرکز اسلام کی حفاظت کے لئے میدان جنگ میں اُتر سکتے ہیں۔ برقائی خان نے پُرزور درخواست کی تھی کہ قاآن اعظم فوری طور پر ہلاکو خان کو بغداد کا محاصرہ ختم کرنے اور اپنی سلطنت میں واپس لوٹنے کا حکم جاری کریں۔

دوسرا مراسلہ ہلاکو خان کے نام لکھا گیا تھا، جس میں اُسے کسی بھی غلط روش کے نتیجے میں برقائی خان کی جانب سے سخت ترین کارروائی کا عندیہ دیا گیا تھا۔ اس پر واضح کیا گیا کہ مرکز اسلام بغداد مسلمانوں کا روحانی مرکز ہے اور امیر المومنین مسلمانوں کے روحانی پیشوا کی حیثیت رکھتے ہیں اگر انہیں ذرا سی بھی گزند پہنچی تو اردوئے زریں کا ایک ایک بچہ ہلاکو خان کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوگا۔ برقائی خان نے مراسلہ جات کی روانگی میں ذرا سی بھی تاخیر سے کام نہیں لیا۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی اس نے اپنی سپاہ کو فوری تیاری کا حکم دے دیا تاکہ ہلاکو خان کی سرزمین پر دھاوا بول کر اس کی توجہ بغداد سے ہٹائی جا سکے۔ یہ منگولوں کے ذاتی تعلقات کے

درمیان بہت کڑا فیصلہ تھا، جس سے منگولوں میں آپسی دشمنی کا آغاز ہو سکتا تھا۔ اس فیصلے پر کئی منگول سرداروں نے تنقید کی اور اس فیصلے کو قاآن اعظم منگو خان کی حکم عدولی اور بغاوت قرار دیا۔ برقائی خان نے ان کی توجہ مرکز اسلام پر منڈلاتے خطرے کی جانب مبذول کرانے کی کوشش کی تو انہوں نے اُلٹا اسے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اس نے قاآن اعظم منگو خان کو مراسلہ روانہ کر کے اپنا کام پورا کر دیا ہے۔ اب یہ طے کرنا اُن کا کام ہے کہ ایسے حالات میں کیا مناسب ہے؟ قاآن اعظم منگو خان کے حکم کے بغیر ہلاکو خان ایک انچ بھی قدم نہیں بڑھا سکتا اور قاآن اعظم جو بھی فیصلہ کریں گے وہ حالات و واقعات پر گہرے غور کے بعد ہی عمل میں لایا جائے گا۔

منگول سرداروں اور امرا نے برقائی خان کو سرکشی اختیار کرنے سے روک دیا تھا۔ برقائی خان کو بھی قاآن اعظم کی دانشمندی پر مکمل بھروسہ تھا، اس لئے وہ کسی فوری نوعیت کی حرکت سے باز رہا۔



حلب، میافارقین اور آمد کا علاقہ جسے ولایت دیار بکر کہا جاتا تھا۔ آج کل یہ علاقے اناطولیہ کے جنوب مشرق میں شامل ہیں۔ ان علاقوں کی ولایت ایوبی خاندان کے سلطان شہاب الدین غازی کے حصے میں آئی تھی۔

653ھ میں یہاں اس کا بیٹا سلطان الملک الکامل کے لقب سے تخت نشین تھا۔ میافارقین کو دیار بکر کے دارالخلافہ کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ چھوٹا سا شہر ایک بلند و بالا پہاڑ کے سائے میں واقع تھا۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر نصرانیوں کی ایک قدیم خانقاہ موجود ہے، جسے مرقومہ کہا جاتا ہے۔ یہ نصاریٰ کے نزدیک مقدس اور متبرک مقام ہے۔ اس پہاڑ پر سے ایک بڑا چشمہ جاری تھا جو شہر میں پانی کی فراہمی کا باعث تھا۔ شہر کے وسط میں ایک بڑا تالاب بنایا گیا تھا جہاں چشمے کا پانی جمع رکھا جاتا تھا۔ یہ شہر پہاڑوں کی مضبوط فصیل سے گھرا ہوا تھا۔

جب دیار بکر کے اطراف میں تاتاریوں کی پے در پے حملوں سے شدید خطرہ پیدا ہوا تو سلطان الملک الکامل نے اپنے تئیں یہ فیصلہ کیا کہ اسے منگولوں کی اطاعت اختیار کرتے ہوئے اپنے علاقوں کو ان کی غارتگری سے محفوظ رکھنا چاہئے۔ وہ ایک وفد کے ساتھ قاآن اعظم منگو خان کے پاس جا پہنچا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب تقریب قرولتائی اختتام پذیر تھی۔ منگو خان نے اس کی آمد پر مسرت کا اظہار کیا اور اسے اپنے قریب نشست دی۔ اس کی اطاعت پر منگو خان نے اسے اعزازی خلعت دے کر اس کی ریاست کو محفوظ کر دیا تھا۔ منگو خان نے محفل مے نوشی کے دوران اسے بھی شراب پیش کرنے کی ہدایت کی تو سلطان الملک الکامل نے صاف الفاظ میں شراب نوشی سے انکار کر دیا۔ منگو خان نے جب سبب دریافت کیا تو اس نے شراب نوشی کو حرام قرار دیتے ہوئے صاف اعلان کیا کہ وہ کسی بھی دباؤ میں آ کر اپنے دین کے خلاف کوئی کام نہیں کرے گا۔ منگو خان کو اس کی بے باکی کا یہ انداز اس قدر بھایا کہ اس نے اپنی قبا اُتار کر اُسے اوڑھا دی۔ جشن قرولتائی کے اختتام پر منگو خان نے اسے ہدایت کی کہ وہ ہلاکو خان کے ساتھ روانہ ہو اور اس کے احکامات پر عمل پیرا رہے۔ ہلاکو خان کی اطاعت کی صورت میں اسے اور دیار بکر کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ سلطان الملک الکامل ہلاکو خان کے ساتھ بادغیس پہنچا۔ یہاں اس کی خوب مہمان نوازی کی گئی۔ اسی دوران کتبغا خان نے ہلاکو خان کو بغداد پر حملے کی ترغیب دی تو اُسے سپاہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ہلاکو خان نے سلطان الملک الکامل کو پیغام بھیجا کہ وہ اس کے دربار میں حاضر ہو۔ سلطان الملک الکامل جب وہاں پہنچا تو ہلاکو خان نے اسے سات ہزار سوار اور بیس ہزار پیادے لے کر بغداد کے اطراف میں پہنچنے کا حکم سنایا۔ سلطان الملک الکامل نے معذرت کرتے ہوئے جواب دیا کہ اس کے پاس تو اتنی بڑی فوج نہیں ہے۔ وہ اسے صرف دو ہزار سوار اور پانچ ہزار پیادے فراہم کر سکتا ہے۔

ہلاکو خان نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنے حکم کی تعمیل پر اصرار کیا بصورت دیگر دیار بکر کے علاقوں کو روند ڈالنے کی دھمکی دے دی۔ سلطان الملک الکامل اس کی بات سن کر پریشان ہو گیا اور اس دھمکی کے بارے میں قاآن اعظم منگو خان سے براہ راست بات کرنے کا ارادہ کرنے لگا۔ اس کی رخصتی پر ہلاکو خان نے اپنے اکابرین سے مشورہ کیا تو انہوں نے سلطان الملک الکامل میں جنم لیتی سرکشی کو کچل دینے کی جانب توجہ مبذول کرنے کا مشورہ دیا۔ ہلاکو خان نے بھی سلطان الملک الکامل کے چہرے پر اپنے لئے ناپسندیدگی کی لہر دیکھ لی تھی، اسی لئے اس نے اس کے فوری خاتمے کی ٹھان لی۔ اتفاق سے ہلاکو خان کے ایک سمرقندی مسلمان مشیر تک یہ خبر پہنچ گئی، اسے سلطان الملک الکامل سے ہمدردی ہوئی تو اس نے اسے خفیہ طور پیغام بھجوایا کہ ہلاکو خان کا دل اس کی جانب سے صاف نہیں رہا اور وہ کسی بھی وقت سلطان کو موت کے گھاٹ اتار دے گا اگر جان بچانا چاہتے ہو تو فوراً اس کی حدود سے نکل جاؤ۔

سلطان الملک الکامل بڑا کائیاں اور زیرک شخص تھا، اسے بھی اس امر کا خدشہ ہو چکا تھا۔ اس نے سرعت کا مظاہرہ کیا اور اپنے ساتھیوں جن کی تعداد اسّی کے قریب تھی، ساتھ لے کر تیز رفتاری سے سفر کرتا ہوا سات روز میں اپنی ریاست میں پہنچ گیا۔ ہلاکو خان کو جب تین روز بعد اس کی بلا اجازت روانگی کی اطلاع ملی تو اس نے کئی دستے اس کے تعاقب میں دوڑائے مگر وہ کچھ نہ ملنے پر ناکام و نامراد واپس لوٹ آئے۔ سلطان الملک الکامل نے دیار بکر میں داخل ہوتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ وہاں موجود تمام منگول نگرانوں کو گرفتار کر لیا اور انہیں دیواروں کے ساتھ لگا کر پانچ پانچ میخیں ٹھونک دیں۔ الملک الکامل پر عیاں ہو چکا تھا کہ ہلاکو خان کے عزائم بے حد خطرناک ہیں اور وہ مرکز اسلام بغداد پر قبضہ کر کے اسے پامال کرنا چاہتا ہے۔ اس نے امیر المومنین کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس سلسلے میں بلادِ شرقیہ کے سلطان الملک الناصر صلاح الدین یوسف کے پاس ہرکارے دوڑا دیئے۔ وہ ایک بھرپور لشکر کے ساتھ ہلاکو خان کے سامنے آہنی دیوار بننا چاہتا تھا۔ اسے صرف اب بلادِ شرقیہ کے لشکروں کا انتظار تھا۔



دوسری صبح مطیع الدین شنگ کے ساتھ اسی غار تک چلا آیا جہاں وہ کل پہنچے تھے اور گل دقوژ کو جہاں زندہ بند کر دیا گیا تھا۔ فوئنا جو خان نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے ساتھ چلا آیا۔ اس نے مطیع الدین کو سمجھانے کی بہتیری کوشش کی تھی کہ وہ شنگ خان کا ساتھ نہ دے کیونکہ اسے اس کی نیت میں فتور جھلکتا دکھائی دے رہا ہے۔ مطیع الدین نے اُلٹا اُسے دماغ ٹھنڈا رکھنے اور خوامخواہ کی مخالفت سے باز رہنے کی تلقین کی۔ شنگ اس غار کے سامنے پہنچ کر کچھ دیر تک حیرت سے اس شگاف کو دیکھتا رہا، جو غار کے منہ پر کی گئی چنائی کے وسط میں تھا۔ شنگ جست لگا کر غار کے اندر داخل ہو گیا اور کافی دیر تک اندر موجود رہا۔ وہاں اسے گل دقوژ کے سر کے کچھ کٹے ہوئے بال بھی دکھائی دیئے۔ اس کے علاوہ اُسے وہاں اور کچھ نہ مل سکا۔ وہ غار کا مختلف زاویوں سے جائزہ لیتا رہا مگر یہ تمام بھاگ دوڑ لاحاصل رہی۔ وہ کافی دیر کے بعد جب غار سے باہر نکلا تو اس کے ستے ہوئے چہرے سے صاف عیاں تھا کہ وہ گل دقوژ کے زندہ بچ نکلنے کے بارے میں کوئی سراغ حاصل نہیں کر پایا۔

''کوئی سراغ ملا کیا؟''...... مطیع الدین نے پوچھا۔

''نہیں! میں اس بارے میں کچھ وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ گل دقوژ کو یہاں سے نکالنے والوں نے اسے کس حالت میں نکالا ہو گا۔ زندہ یا مردہ...... البتہ یہ بات ضرور طے ہے کہ گل دقوژ کو یہاں نکالنے میں کسی عام شخص کا ہاتھ نہیں ہے۔ اُسے نہ صرف یہ پہلے سے ہی معلوم تھا کہ گل دقوژ کو اس غار میں بند کیا جانے والا ہے

بلکہ وہ چنائی کے دوران بھی یہیں کہیں موجود رہا ہوگا، لہٰذا اس نے کام مکمل کر کے جانے والے لوگوں کی روانگی کے تھوڑے وقفے بعد ہی اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ یہ بات مجھے اکھڑی ہوئی گاد کے معائنے کے بعد معلوم ہوئی ہے''۔ شنگ نے متفکر لہجے میں جواب دیا۔

''ایسا کون شخص ہوسکتا ہے جسے پہلے سے ہی اس بارے میں پوری معلومات حاصل رہی تھیں''۔ مطیع الدین اس کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔

''میں بہت جلد اس شخص کا کھوج لگالوں گا''۔ شنگ پُر یقین انداز میں بولا۔ وہ غار کے پاس سے ہٹ کر ان لوگوں کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ اسے کوئی سراغ مل چکا ہے۔ جس سے اسے معاملے کی نوعیت کا اندازہ ہو چکا ہے کہ گل وتوژ کو یہاں سے نکال لے جانے والا شخص کون ہوسکتا ہے؟'' فو ئنا جوخان نے مطیع الدین کو آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ شنگ نے فو ئنا جوخان کی بات سن کر تحقیرانہ انداز میں اس پر نظر ڈالی۔

''بھولے فو ئنا جوخان! اگر اس پر کوئی حقیقت منکشف بھی ہوگئی ہو تو ہمیں کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ ہمیں گل وتوژ کا پتہ بتانے سے تو رہا۔ البتہ یہ بات طے ہے کہ میں اپنی سی کوشش جاری رکھوں گا اور اس شخص کی تلاش میں جتا رہوں گا جو یہاں سے گل وتوژ کو نکال کر لے گیا ہے''۔ مطیع الدین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تمہارا یہ ساتھی کچھ زیادہ ہی اکھڑ اور بدمزاج ہے، میں نہیں جانتا کہ اسے کس بات پر اتنا زعم ہے؟'' شنگ کے چہرے پر ناگواری پھیلی دکھائی دی۔

''دیکھو تم میرے منہ نہ ہی لگو تو اچھا ہے''۔ فو ئنا جوخان غرایا۔

''تم رات کسی سودے کے بارے میں کہہ رہے تھے شاید؟'' مطیع الدین نے فضا آلودہ ہوتے دیکھ کر بات بدل دی۔ شنگ خان، فو ئنا جوخان کو مسلسل کڑی نظروں سے گھور رہا تھا، مطیع الدین کی بات پر وہ چونک پڑا۔

''تم نے اچھے وقت یاد دلایا''۔ شنگ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم کوئی معمولی شخص نہیں ہو۔ تمہارے بارے میں مجھے کافی باتیں معلوم ہیں۔ میں اگر تمہیں سرخ غروں کی سرزمین میں داخل ہونے یا گل وتوژ کو حاصل کرنے کے لئے یہاں آنے کے جرم میں گرفتار بھی کرلوں تو اس سے تمہیں کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے پیچھے ایک طاقتور ہاتھ موجود ہے۔ سرخ غر پہلے بھی تمہاری وجہ سے اپنا ایک قیمتی سردار کھو چکے ہیں۔ میں دوبارہ ماضی کی داستان دہرانا نہیں چاہتا۔ اس لئے میں تمہیں یہاں سے صحیح سلامت جانے کی اجازت دیتا ہوں''۔

''اس میں سودے والی کیا بات ہوئی؟'' مطیع الدین نے اس کی بات پر ناگواری کا اظہار کیا۔

''میں اسی طرف آ رہا ہوں۔ تمہیں شاید یہ جان کر حیرت ہو کہ میں گل وتوژ کا منگیتر بھی ہوں''۔ شنگ نے اپنی نظریں مطیع الدین کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اس کی بات واقعی چونکا دینے والی تھی۔ مطیع الدین لمحہ بھر کے لئے ساکت ہو کر رہ گیا تھا جبکہ فو ئنا جوخان بھی اس کے غیر متوقع جملے پر اُلجھن کا شکار دکھائی دینے لگا۔

''یہ بات میرے لئے نئی ہے''۔ مطیع الدین سنبھل کر بولا۔

''گل وتوژ سے میری شادی کا معاملہ میرے دادا سردار منک آنہ اور توتائی خان نے طے کیا تھا۔ توتائی خان کی اچانک موت کے باعث یہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ میں تمہیں صرف یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ منگولوں میں اپنی منگیتروں پر نظر رکھنے والے افراد کو زندہ نہیں رہنے دیا جاتا ہے......'' شنگ نے رُک کر مطیع الدین کے چہرے پر کوئی تاثر پڑھنے کی کوشش کی مگر سپاٹ چہرہ دیکھ کر وہ خود ہی ہنس پڑا۔ ''میں روایتی منگول نہیں ہوں اسی

لئے تم ابھی تک زندہ دکھائی دے رہے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ گل وتوژ بھی تمہیں پسند کرتی ہے ممکن ہے کہ وہ تم سے شادی پر بھی رضامند ہو۔ میں کسی ایسی عورت کو اپنی بیوی نہیں بنا سکتا جو پہلے سے کسی دوسرے کو اپنا دل دے بیٹھی ہو۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا''۔

''تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو صاف صاف کہو''۔ مطیع الدین نے اس کی بات پر کسی ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم خود ہمیشہ کے لئے اس کی راہ سے ہٹ جاؤ''۔ شنگ الفاظ پر زور دیتا ہوا بولا۔

''شاید تمہیں میرا کچھ دیر پہلے کا جملہ یاد نہیں رہا''۔

''اگر میری بات نہیں مانو گے تو مشکل میں پھنس جاؤ گے، البتہ رضامندی کی صورت میں تمہیں میں ایک خاص تحفہ دوں گا''۔ شنگ خان کا لہجہ پُراسرار سا ہوگیا۔

''مجھے تمہارے کسی بھی تحفے کے بارے میں کچھ جاننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔ مطیع الدین نے لاپروائی سے جواب دیا۔ شنگ کا چہرہ اس کی بات پر متغیر دکھائی دینے لگا۔

''گل وتوژ صرف میری ہی بنے گی، یہ بات تو طے ہے، تم خسارے میں رہ جاؤ گے دوست''۔

''میں اس بارے میں قبل از وقت کوئی ڈھینگ نہیں ماروں گا، یہ تو آنے والا وقت بتائے گا کہ کیا ہوگا؟'' مطیع الدین اس سے ذرا بھی مرعوب نہیں دکھائی دے رہا تھا۔

''مجھے خوشی ہے کہ میرا واسطہ ایک بہادر شخص سے پڑا ہے، مگر یاد رکھنا کہ میں بھی اعلیٰ پائے کا شکاری ہوں، میرے ہاتھوں کبھی بھی شکار بچ نہیں سکا۔ تمہارے ساتھ زندگی کے اس شکار کھیلنے میں بہت لطف آئے گا''۔ شنگ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''اگر تم ہمارے راستے میں آئے تو جاودانی آسمان کی قسم! میں تمہیں چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دوں گا''۔ فو ئنا جوخان اس کی دھمکی سے بھڑکتا ہوا غرا کر بولا۔

''پہلے میں اپنے شکار سے فارغ ہو جاؤں پھر تمہیں بھی دیکھ لوں گا''۔ شنگ کا لہجہ بدلنے لگا۔

''میرا خیال ہے کہ اگر تمہارے دل میں کوئی حسرت باقی ہے تو ابھی میدان میں آجاؤ، فیصلہ کر لیتے ہیں، میرا ساتھی بیچ میں نہیں آئے گا، یہ میرا وعدہ ہے''۔ مطیع الدین اس کے بدلتے تیور دیکھ کر سیدھا ہوگیا۔

''فی الوقت تو میں اپنی گل وتوژ کی تلاش میں جا رہا ہوں، لیکن یاد رکھو کہ میں ماہر شکاری کی طرح تم پر جھپٹوں گا اس وقت بچ سکے تو بچ جانا اور دل کھول کر اپنی ساری حسرتیں بھی پوری کر لینا''۔ شنگ نے جواب دیا اور تیزی سے اپنے گھوڑے کی جانب بڑھ گیا۔

''سنو......!'' فو ئنا جوخان نے آواز لگائی مگر مطیع الدین نے اسے کچھ کہنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ شنگ کو شاید فو ئنا جوخان کی بات سننا بھی گوارا نہیں تھی اس لئے اُس نے اُسے نظر انداز کرتے ہوئے اپنے گھوڑے پر بیٹھنے کے بعد ایڑ لگائی اور کچھ ہی لمحوں میں ان کے سامنے سے اوجھل ہوگیا۔ مطیع الدین اس کے عجیب دعویٰ کے بارے میں سوچ رہا تھا، وہ ان سے دوبدو مقابلہ کرنے کے بجائے خاموشی سے چلا گیا تھا۔ اس میں ضرور اس کی کوئی چال تھی۔ مطیع الدین کو اس لومڑی جیسے دشمن سے نبٹنے کے لئے اپنی آنکھیں کھول کر رکھنا تھیں۔ فو ئنا جوخان بھی مطیع الدین کے رویے سے دل برداشتہ دکھائی دے رہا تھا۔



خلیفہ مستعصم باللہ کے غلاموں اور سرداروں پر ابن علقمی کی سازش کا راز بہت جلد کھل گیا۔ یہ لوگ خاص مقربین میں سے تھے، جنہیں سلاطین کہا جاتا تھا۔ انہوں نے سر جوڑ کر ابن علقمی کی حیلہ جوئی اور مکاری کے

بارے میں صلاح مشورہ کیا تو سب سے پہلے یہ طے پایا کہ بغیر ثبوت کے امیر المومنین تک یہ خبر پہنچانا بالکل فضول ہوگا کیونکہ ابن علقمی صاف مکر جائے گا اور اسے الزام تراشی اور حسد قرار دے گا اور ساتھ ہی ان کا جانی دشمن بھی بن جائے گا۔ خلیفہ مستعصم باللہ اپنے وزیر سلطنت ابن علقمی کی ذہانت وفراست سے بے حد متاثر تھا۔ اسے یہ باور کرانا بڑا مشکل تھا کہ وہ اس کی پشت میں خنجر گھونپ رہا ہے۔

ان مقربین میں مجاہد الدین ایبک سرکردہ شخصیت کا مالک تھا۔ وہ سرد دوات دار کے عہدے پر فائز تھا۔ ابن علقمی اور اس کے درمیان گہری مخالفت اور کشمکش پہلے سے موجود تھی۔ اس نے وزیر سلطنت ابن علقمی کے گرد اپنے مخبروں کا جال پھیلا دیا کہ وہ کسی طرح بھی ابن علقمی کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت ڈھونڈ نکالیں۔ چند دن میں ہی وہ لوگ ابن علقمی کا ایک قاصد پکڑ لائے جو کہ اس کا خط ہلاکو خان کے پاس لے جا رہا تھا۔ اس خط میں ابن علقمی نے ہلاکو خان کو تازہ ترین صورتِ حال لکھی تھی اور فوری بغداد پر حملے کا مشورہ دیا تھا۔

مجاہد الدین ایبک وہ خط لے کر سیدھا دربارِ خلافت پہنچا اور امیر المومنین کے سامنے وہ خط اور گرفتار قاصد پیش کر دیا۔ امیر المومنین نے وہ خط ملاحظہ کیا اور چند ایک سوالات کئے۔ مجاہد الدین نے ابن علقمی کی اس سازش کی وجہ کرخ اور مشہد میں رافضیوں کی ہلاکت بیان کی اور فوری طور پر اسے گرفتار اور معزول کرنے کی استدعا کی۔ مجاہد الدین ایبک کے ساتھ موجود لوگوں نے بھی ابن علقمی کے خلاف اپنی زبانیں کھول ڈالیں۔ خلیفہ مستعصم باللہ اپنے وزیر کے بارے میں یہ سب سن کر لمحہ بھر کے لئے دنگ رہ گیا۔ ان سب لوگوں کو تسلی کے ساتھ رخصت کر دیا گیا کہ تفتیش کا سلسلہ شروع کیا جائے گا اور فوری طور پر حقیقی صورتِ حال سامنے لائی جائے گی۔ ان کے جانے کے بعد خلیفہ مستعصم باللہ نے وزیر ابن علقمی کو خلوت میں بلوایا اور اس کے سامنے خط رکھ دیا۔ اس نے کسی قسم کی پریشانی کا اظہار نہیں کیا اور جواباً کہا کہ مجاہد الدین ایبک کے ساتھ میری کشمکش اور مخاصمت کا حال سب لوگوں کو معلوم ہے۔ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر آپ کو معزول کرتے ہوئے ابوبکر محمد کو خلیفہ بنانے کی فکر میں ہے۔ میں چونکہ اس کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہوں اس لئے اس نے میرے خلاف آپ کے کان بھر دیئے ہیں۔ اگر آپ حکم فرماتے ہیں تو میں اسی وقت اپنے منصب سے استعفیٰ دے دیتا ہوں اور خود کو اسی وقت کوتوال کے حوالے کر دیتا ہوں۔ آپ بلاتردد مجھ پر مقدمہ چلائیں تاکہ حقیقت سامنے آ جائے۔ خلیفہ مستعصم باللہ اس کی باتیں سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے اسے رخصت کر کے اس معاملے سے چشم پوشی اختیار کی۔

چند دن بعد کئی دوسرے مقربین نے ابن علقمی کے مزید کچھ خط پکڑ لئے۔ ابن علقمی ہلاکو خان کو جلد از جلد بغداد پر حملے کی تقویت میں اندھا دھند خطوط لکھ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تھوڑے عرصے میں اس کے کئی خط پکڑے گئے۔ جب ان سلاطین نے ابن علقمی کے خطوط خلیفہ مستعصم باللہ کے سامنے پیش کئے تو خلیفہ مستعصم باللہ نے ہنس کر بے تکلفی سے کہا کہ یہ سب تو سرد دوات مجاہد الدین ایبک کا کارنامہ ہے۔ اس سے جا کر کہہ دو کہ میں اس کی باتوں میں آ کر ابن علقمی کو معزول نہیں کروں گا۔ اس کی بات سن کر سلاطین و مقربین کے چہرے بجھ گئے اور تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے وہاں سے نکل آئے۔ ہلاکو خان کی افواج سست روی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ وہ بغداد سے صرف دس فرسنگ کے فاصلے پر موجود تھیں جبکہ خلیفہ مستعصم باللہ اپنے شاہی محل کے عالیشان کمروں میں اپنی لہو و لعب کی محافل میں مست اتنی زحمت بھی گوارا نہیں کر رہا تھا کہ وہ محل کی چھت پر سے ہی بغداد کے اطراف میں نظر ڈال لیتا تو تاتاریوں کی بکھرے ہوئے جھنڈوں کا سمندر دکھائی دیتا۔

سالار اعلیٰ ایوائی ترکمان سلیمان شاہ، الملک عزالدین بن فتح کرد اور مجاہد الدین ایبک مستنصری نے

خلیفہ مستعصم باللہ کی چشم پوشی اور لاپروائی پر گہرے غم و غصے کا اظہار کیا۔ سلیمان شاہ ایک عرصے سے تاتاریوں کے دستوں سے نبرد آزما تھا۔ وہ انہیں کئی بار بغداد کی حدود سے بھگا چکا تھا۔ الملک عزالدین کرد شہر کا ایک نامی گرامی پہلوان تھا۔ ساتھ ہی لشکر کے دائیں بازو کا سالار بھی تھا۔ وہ تاتاریوں کے مسلسل حملوں سے پسپا ہوتے ہوئے کافی پیچھے ہٹ چکے تھے۔ ان کے ساتھ ولی عہد امیر ابوبکر محمد بھی شامل تھا۔ سالاروں نے شہر میں پہنچ کر مجاہد الدین ایبک سے بات کی تو اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں نے اپنی پوری کوشش کر لی ہے مگر امیر المومنین میری کسی بات پر کان نہیں دھرتے۔ میں صرف یہ کر سکتا ہوں کہ امیر المومنین سے خلوت میں آپ کی ملاقات کا انتظام کر دوں، جو کچھ کرنا ہے، اب آپ ہی لوگ کیجئے۔ انہوں نے اس پر اتفاق کیا اور شام کے وقت انہیں بارگاہ خلافت میں پہنچا دیا گیا۔

دونوں سالاروں نے تاتاریوں کی پیش قدمی اور مسلمانوں کی مسلسل پسپائی کے بارے میں تفصیل امیر المومنین کے گوش گزار کی اور ابن علقمی کے منافقانہ رویے پر کڑی تنقید کی۔ سلیمان شاہ نے کہا کہ اب وقت بالکل ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے اگر اس مرحلے پر بھی کوئی تدبیر نہ کی گئی تو بغداد کو تاتاریوں کی غارتگری سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ آپ فوری طور پر کوئی تدبیر کیجئے۔ خلیفہ مستعصم باللہ بڑی سنجیدگی سے ان کی باتیں سنتا رہا اور آخر میں فقط یہ کہہ کر انہیں رخصت کر دیا کہ اس معاملے میں وزیر ابن علقمی سے کہہ دیا گیا ہے، انہیں بھی اس کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے تاکہ خلافت کے سازشیوں کے پیچھے لگ کر اپنی وفاداری کو شکوک و شبہات کا شکار کر لیا جائے۔ یہ سن کر وہ دونوں سکتے کے عالم میں آ گئے۔ انہوں نے مزید کچھ کہنا چاہا مگر خلیفہ نے تخلیے کے لئے ہدایت جاری کر دی۔ وہ دونوں مایوس ہو کر وہاں سے اپنے لشکر میں آ گئے۔ یہ لشکر کیا تھا۔ خلافت کے ان وفادار اور جانثار سپاہیوں پر مشتمل دستے تھے جنہوں نے مسلمانوں کے سروں پر منڈلاتے سیاہ بادلوں کو دیکھ کر بلا معاوضہ اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ ان کے ساتھ ساتھ شہر کے نوجوان رضاکار بھی شامل تھے۔ ان کے مقابلے میں ہلاکو خان کا لشکر کئی گنا بڑا تھا۔ اس کے لشکر میں نصرانیوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی بھی ایک بڑی تعداد شامل تھی جو امیر المومنین کی حفاظت کے مقابلے میں اپنی اغراض و مقاصد کو فوقیت دے چکے تھے۔



بیبرس اپنے قافلے کے ساتھ انطاکیہ پہنچ گیا تو اسے مختلف سرحدی علاقوں سے آنے والے لوگوں سے معلوم ہوا کہ تاتاری بڑی تیزی سے بڑھتے چلے آ رہے ہیں اور شہروں کو فتح کرنے اور قتل عام کے بعد انہیں نذر آتش کر رہے ہیں۔ لوگ محفوظ مقامات کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ قتل و غارت کے اس سلسلے کی داستان اتنی خوفناک پیرائے میں بیان کی جا رہی تھی کہ عام لوگوں میں خوف و ہراس کی فضا پیدا ہونے لگی۔ بیبرس تاتاریوں کی سفاکی اور بربریت سے خوب واقف تھا۔ اس کا بچپن انہی خونخواروں کے زیر سایہ گذرا تھا۔ اُسے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ انطاکیہ کے باشندوں میں تاتاریوں سے نبرد آزما ہونے کی اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ ان سے خود کو محفوظ رکھ سکیں۔ اسی لئے بیبرس نے اپنے ساتھیوں کو انطاکیہ میں زیادہ دیر قیام سے منع کر دیا۔ اس کے ساتھیوں نے کئی عذر پیش کئے مگر بیبرس نے ان کی کوئی بات نہیں سنی۔ جب تاجر اپنی برہمی کا اظہار کرنے لگے تو بیبرس نے کھلے لفظوں یہ اعلان کر دیا کہ وہ انہیں وہیں چھوڑ کر تنہا روانہ ہو جائے گا۔ یہ سن کر ان کے چہروں پر پریشانی جھلکنے لگی۔ وہ جس مفلسی اور کسمپرسی کی حالت میں وہاں پہنچے تھے، ایسے میں بیبرس ان کے لئے محفوظ سائبان کی سی حیثیت رکھتا تھا۔ انہیں یہ امید بھی بندھی تھی کہ بیبرس شاید ان کی اتنی مالی مدد کر دے گا کہ وہ اپنے گھروں کو لوٹتے وقت خالی ہاتھ نہیں ہوں گے۔ بالآخر ان کی ضد دم توڑ گئی اور وہ بیبرس کے سامنے ڈھیر ہو

گئے۔ سفر کا سلسلہ دوبارہ جاری ہو گیا۔ بیبرس انہیں اپنے ساتھ لیتا ہوا انطاکیہ سے نکلا اور صیدا سے ہوتا ہوا دمشق پہنچ گیا۔ دمشق کی فضا نے اُسے بے چین کر دیا۔ بیتے وقت کے منظر اس کی آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگے تو وہ بے قرار ہو کر اپنے ماضی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ وہ دھڑکتے دل سے اپنی مرحومہ شفیق مالکہ فاطمہ کے گھر کی جانب آنکلا مگر اب وہاں کچھ بھی باقی نہیں تھا۔ جس گھر میں اس نے اپنا بچپن گزارا تھا وہ اب کسی اور کی ملکیت بن چکا تھا۔ اس نے گھر کے پہلے مکینوں کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کی مگر اُسے کچھ کامیابی نہیں ہو سکی۔ وہ مایوسی کے عالم میں واپس سرائے پہنچ گیا جہاں اس کے ساتھی تاجر بے تابی سے اس کی راہ دیکھ رہے تھے۔

بیبرس کی صورت دیکھ کر ان کے مرجھائے چہرے کھل اُٹھے۔ انہوں نے بلا تکلف اپنے خدشے کا اظہار کر دیا کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ بیبرس انہیں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ بیبرس ان کی بات سن کر ہنس پڑا۔ اس نے اپنے منافع کی رقم کو ان سب لوگوں میں یکساں تقسیم کر کے انہیں جانے کی اجازت دے دی۔ وہ اب اپنی مرضی سے کہیں بھی جا سکتے تھے۔ انطاکیہ اور آرمینیہ میں وہ چونکہ غیر محفوظ تھے اس لئے بیبرس ان کے ساتھ ساتھ رہا۔ دمشق میں انہیں ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا اس لئے بیبرس نے انہیں رخصت کر دیا۔ وہ بیبرس کو دعائیں دیتے ہوئے اپنی اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔ بیبرس قاہرہ واپسی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ بازار میں بجنے والے نقارہ کی آواز نے اسے اپنی جانب کھینچ لیا۔ وہ نقارہ بجنے کا سبب معلوم کرنے کے لئے وہاں پہنچ گیا۔ لوگوں کی خاصی تعداد کے جمع ہونے پر نقارہ بجانا بند کیا گیا اور ایک سپاہی نے بڑھ کر شاہی فرمان با آواز بلند سنانا شروع کیا۔

”دمشق کے لوگو! ایک اہم خبر سنو۔ الملک الناصر نے عام جہاد کا اعلان کیا ہے۔ منگولوں اور تاتاریوں نے مدینۃ السلام بغداد کا محاصرہ کر لیا ہے۔ امیر المومنین سخت خطرے میں گھر چکے ہیں۔ انہیں سپاہ کی سخت ضرورت ہے۔ آپ لوگوں کو ہدایت کی جاتی ہے، جہاد کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں اور لشکر شاہی میں شامل ہو کر اپنے خلیفہ کی مدد کو نکلیں۔ جلدی کیجئے تاکہ لشکر فوری روانہ کیا جا سکے“۔

بیبرس بغداد پر منگولوں کے حملے اور محاصرے کا سن کر سکتے میں کھڑا رہ گیا۔ اس کے دماغ کے پردوں پر گذشتہ دنوں دکھائی دینے والا خواب ایک بار پھر روشن ہو چکا تھا۔ خلافت پر کڑی مصیبت پڑنے والی تھی اور وہ اپنی جولانی طبیعت میں مبتلا ادھر ادھر گھومتا پھر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں شیخ عز الدینؒ کے جملے بھی گونج رہے تھے کہ جب وقت آئے گا تو یہ کام خود بخود تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔ بیبرس نے وہیں کھڑے کھڑے فوری فیصلہ کیا اور سرائے پہنچ کر اپنا مختصر سا سامان سمیٹ کر سیدھا دربار شاہی کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس نے اپنے منصب کا حوالہ دیتے ہوئے بہت جلد ہی سلطان الملک الناصر تک رسائی حاصل کر لی۔ اسے عزت و احترام کے ساتھ شاہی محل میں پہنچا دیا گیا۔ بیبرس نے سلطان الملک الناصر کے سامنے بلا جھجک اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ الملک الناصر نے اس کی دمشق میں موجودگی کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا اور اپنے دیرینہ حریف بلادِ مصر کے مرحوم سلطان الملک المعز کے لئے بلادِ شرقیہ کی راہ ہموار کرنے کا گمان کیا۔ اس نے بیبرس کو جاسوسی کے الزام میں گرفتار کرنا چاہا تو بیبرس اس کے بیہودہ فعل پر طیش میں آ گیا اور حرمت خلافت پر اپنے جذبات کا برملا اظہار کیا، جس پر الملک الناصر شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ اس نے بیبرس کو رضا کاروں کے دستے کا سالار بنایا اور جلد از جلد تیاری مکمل کرنے کی ہدایت کی تاکہ دیار بکر سے سلطان الملک الکامل کے لشکر کے کوچ کا سنتے ہی روانگی اختیار کرتے ہوئے بغداد پہنچا جا سکے۔ بیبرس پوری تندہی سے اپنے کام میں جت گیا۔ وہ بغداد روانگی تک رضا کار مجاہدین کی جماعت کو تربیت دینے میں مصروف رہا۔



ہلاکو خان نہایت احتیاط سے پیش قدمی کر رہا تھا۔ اسے یہ خطرہ لاحق تھا کہ کہیں دوسرے مسلمان سلطان اپنے خلیفہ کی حفاظت کے لئے نہ اُٹھ کھڑے ہوں۔ اس نے تمام قریبی علاقوں پر اپنے دستے بھیجے جہاں جہاں اسے مزاحمت کا اندیشہ تھا۔ وہ ان تمام علاقوں پر اپنا کنٹرول رکھتے ہوئے بغداد میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ ہلاکو خان نے اپنے تجربہ کار سالار باجونوین کو اسی ہزار سپاہیوں کے ساتھ بالائی علاقوں سے پیش قدمی کرنے کا حکم دیا۔ وہ گھومتا ہوا ترک علاقوں میں داخل ہوا اور آذربائیجان کی جانب سے تیزی سے حرکت کرتا ہوا موصل کی جانب آنکلا۔ یہاں سلطان بدر الدین لولو موجود تھا جو کہ ہلاکو خان کا اطاعت گذار تھا۔ اس نے مزاحمت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ موصل کے غیرت مند مسلمانوں کے گروہ نے تاتاریوں پر حملہ کر دیا جس پر باجونوین بگڑ گیا اور اس نے قتل عام کا اعلان کر دیا۔ موصل کو بری طرح پامال کر دیا گیا۔ سالار باجونوین نے موصل کے قریب موجود پل پر قبضہ کر لیا اور تکریت کی جانب بڑھ گیا۔ غازیان تکریت تک موصل کی تباہ کاری کی خبر پہنچ چکی تھی انہوں نے اس پل کو توڑ ڈالا تاکہ منگول سپاہی اس طرف نہ آ سکیں۔ سالار باجونوین نے فوری طور پر کشتیوں کا پل بنانے کا حکم دیا۔ تمام رات میں وہ پل تیار کیا گیا تو علی الصبح غازیان تکریت نے چھوٹی سی جھڑپ کے بعد اس پل کو آگ لگا دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پل جل کر راکھ بن گیا۔ باجونوین اس پر تلملا اُٹھا۔ اس نے دوبارہ پل بنانے کی ہدایت کی۔ منگول سپاہیوں نے پھرتی سے پل تیار کیا اور کافی تعداد کو پل کی حفاظت پر تعینات کر دیا گیا۔ اس مرتبہ اہل تکریت سے کچھ نہیں بن پایا اور وہ بڑی تعداد میں شہید ہو گئے۔ باجونوین آسانی سے دجلہ عبور کر کے تکریت میں داخل ہونے کے بجائے آگے بڑھا اور کوفہ، حلہ اور کرخ پر قابض ہو گیا۔ اہل شہر پر قیامت ڈھائی گئی۔

الملک عز الدین کرد اور سلطان مجاہد الدین ایبک نے تاتاریوں کو سبق سکھانے کے لیے بغداد سے روانگی اختیار کی اور بیس ہزار سوار سپاہیوں کے ساتھ باجونوین کی جانب پیش قدمی کی۔ کرخ اور دوسرے شہروں سے بے شمار لوگ رضا کارانہ اسلامی لشکر میں شامل ہو گئے۔ باجونوین کے ساتھ کرخ کے باہر معرکہ گرم ہوا۔ تاتاریوں کی بڑی تعداد کے باوجود اس جنگ میں انہیں ہی نقصان پہنچا۔ اسلامی لشکر میں پیادے بہت زیادہ تھے جو کہ ثابت قدمی سے لڑے۔ تاتاریوں کے لاشے گرنے کی رفتار بہت زیادہ تھی جس پر باجونوین نے پسپائی اختیار کرنا ضروری سمجھی۔ وہ شام سے پہلے ہی میدان سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس معرکے میں تاتاریوں کی ایک بڑی تعداد کام آئی تھی۔ الملک عز الدین کرد نے تاتاریوں کا تعاقب کرنا چاہا تاکہ شکست خوردہ دشمن کو تہ تیغ کر دیا جائے مگر سلطان مجاہد الدین ایبک نے تاتاریوں کے تعاقب کی مخالفت کی۔ اس نے وہیں رُک کر رات بسر کرنے کا مشورہ دیا تاکہ اس دوران اسلامی سپاہ کو آرام مل جائے اور وہ صبح تازہ دم ہو کر آگے بڑھے۔

ہلاکو خان کے پاس جب اسلامی لشکر کی تباہ کاری کا حال پہنچا تو وہ تڑپ اُٹھا اور اس نے فوراً تیز رفتار پیادے کے ذریعے ابن علقمی کو خط بھیجا۔ ابن علقمی کو جب تاتاری شکست کی بابت معلوم ہوا تو اسے اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ ہلاکو خان نے اپنے خط میں اسے معرکے میں مرنے والے تاتاریوں کی موت کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے کڑی سزا کا مستحق قرار دیا تھا۔ ہلاکو خان صرف اسی بل بوتے پر پیش قدمی کر رہا تھا کہ بغداد بالکل خالی ہے۔ ابن علقمی نے اسے پورا یقین دلایا تھا کہ اس نے سپاہیوں کو فارغ کر دیا ہے۔ اب اسلامی لشکر باقی نہیں رہا صرف چند عہدے دار باقی ہیں۔ مورخین بیان کرتے ہیں کہ وزیر سلطنت ابن علقمی نے ڈھائی لاکھ سپاہیوں کو ملازمت سے برطرف کر کے گھروں کو بھیج دیا تھا۔ یہ عظیم لشکر سابق خلیفہ ناصر الدین باللہ نے تاتاریوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے پیش نظر تیار کیا تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر تاتاریوں کے دانت کھٹے کر دیئے جائیں۔

ابن علقمی نے اپنے احباب سے اس ضمن میں صلاح و مشورہ کیا اور اس مقام کے بارے میں پوری معلومات حاصل کیں جہاں اسلامی لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ جب ابن علقمی کو یہ معلوم ہوا کہ اسلامی لشکر نہر شیر کے نشیب میں موجود ہے تو اس کے شیطانی دماغ میں ایک نئی چال آئی اس نے اپنے گروہ کے سپاہیوں کو فوراً روانہ کیا کہ وہ ہر قیمت پر صبح ہونے سے پہلے پہلے نہر شیر کا بند توڑ ڈالیں۔ نہر شیر کا بند توڑنا کوئی زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔ نصف رات کو ہی یہ بند توڑ دیا گیا اور اسلامی لشکر زیر آب آ گیا۔ سپاہی اپنے ساز و سامان بچانے کے چکر میں ساری رات نہر کے پانی سے نبرد آزما رہے۔ انہیں آرام کرنے کا موقعہ ہی نہ مل سکا۔ ہلاؤ خان تک یہ خبر پہنچا دی گئی تھی۔ اس نے فوری طور پر تازہ دم لشکر باجونوین کی زیر قیادت روانہ کیا۔ مسلمان رات بھر کی زحمت کے بعد جم کر مقابلہ نہیں کر سکے۔ ان کے ہتھیار بھی خراب ہو چکے تھے۔ کیچڑ میں لت پت اسلامی لشکر مدافعتی انداز میں لڑتا رہا۔ ان پر اضطرار کی سی حالت طاری تھی لہٰذا وہ بہت جلد شکست کھا گئے۔ الملک عز الدین کرد اور مجاہد الدین ایبک صورتِ حال کی نزاکت کا اندازہ پہلے ہی لگا چکے تھے۔ انہوں نے اپنے سپاہیوں کو منظم انداز میں پسپائی اختیار کرنے کا حکم دیا۔ تاتاریوں نے اسلامی لشکر کے پیچھے ہٹنے پر حملے کی شدت میں اضافہ کر دیا۔ اس معرکے میں مسلمانوں کی بڑی تعداد شہید ہو گئی۔ دونوں سالار بڑی مشکل سے تھوڑے سے سپاہیوں کو بچا کر دجلہ عبور کرنے میں کامیاب ہو پائے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے بغداد کے شرقی دروازے پر خود کو از سر نو منظم کرنے کی کوشش شروع کی۔ یہاں قریب ہی سلطان سنجر کی بنوائی گئی جامع مسجد اور قصر شاہی موجود تھا۔

محرم 656ھ میں جب ہلاؤ خان کا لشکر بغداد کی فصیل کے قریب پہنچ گیا تو اہل شہر میں بے چینی سی پھیل گئی۔ سلیمان شاہ، مجاہد الدین ایبک، الملک عز الدین کرد اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ دربار خلافت میں پہنچ گئے اور خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خلیفہ نے ان کی صورت دیکھ کر ناگواری کا اظہار کیا۔

امیر لشکر سلیمان شاہ نے عرض کیا کہ امیر المومنین دشمن ہماری کوتاہیوں اور غلط تدبیروں کے باعث شہر کے دراوزے تک آن پہنچا ہے۔ اب وہ وقت دور نہیں جب وہ شہر میں داخل ہو کر تباہی و بربادی کا بازار گرم کر دے گا۔ بغداد میں ہمارے پاس سوار بھی قلیل ہیں اور عسکری قوت بھی کمزور ہے۔ تاتاریوں کے لشکر کی تعداد دو لاکھ کے قریب ہے اور ان کے عزائم خوفناک ہیں۔ مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ امیر المومنین ہمارا مشورہ مان لیں۔ خلیفہ مستعصم باللہ نے ان سے تجویز کی بابت دریافت کیا تو مجاہد الدین ایبک نے عرض کیا کہ امیر المومنین شاہی کشتی میں سوار ہو جائیں، خواتین حرم اور مال و دولت بھی ساتھ لے لیں۔ ہم سب امیر المومنین کی خدمت کے لئے ساتھ رہیں گے۔ دریائے فرات کے راستے ہم بصرہ پہنچ جائیں گے اور وہاں محفوظ مقام پر پناہ گزین ہو جائیں گے یہاں تک کہ پھر اللہ تعالیٰ کی نصرت میسر آ جائے اور ہم تاتاریوں کو مغلوب کر لیں۔

خلیفہ مستعصم باللہ نے ان لوگوں کی تجویز پر غور کرتے ہوئے وزیر ابن علقمی کو بلوایا اور اس کے سامنے یہ تجویز رکھ دی۔ ابن علقمی یہ بات سن کر دم بخود رہ گیا۔ اس نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ خلیفہ نے اپنے تئیں کوئی فیصلہ نہیں کر لیا۔ اس نے فوری طور پر بات بنائی کہ امیر المومنین کو شاید یہ علم نہیں ہے کہ میں پوری طرح اس کوشش میں مصروف ہوں کہ تاتاری خطرہ بغداد سے ٹل جائے۔ اسی لئے میں نے اپنے طور پر ہلاؤ خان سے گفت و شنید کا سلسلہ شروع کیا ہوا ہے۔ مجھے کچھ امید دکھائی دے رہی ہے کہ تاتاری بغداد کا محاصرہ چھوڑ کر واپس لوٹ جائیں گے۔ امیر المومنین کو در بدر ٹھوکریں کھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ وقت تو اس مسئلے کو افہام و تفہیم سے حل کرنے کا ہے۔ آپ ایسا کیجئے کہ اپنے فرزند کلاں ابوبکر محمد کو ایک وفد کے ساتھ ہلاؤ خان کے پاس بھیج دیجئے۔ جو بھی صورت حال ہو گی آپ کے سامنے آ جائے گی۔ خلیفہ مستعصم باللہ کو وزیر کی رائے زیادہ بہتر محسوس ہوئی اور

اس نے وزیر کی باتوں پر اعتماد کرتے ہوئے ابوبکر محمد کو اپنے خاص مقربین کے ساتھ ہلاؤ خان کے پاس روانہ کر دیا۔ سلیمان شاہ اور اس کے ساتھی ابن علقمی کی نئی چال کی کامیابی پر بے بسی کے عالم میں محض ہونٹ چبا کر رہ گئے۔

ابن علقمی نے اپنے طور پر خلیفہ کے سامنے جھوٹ بول کر اسے بغداد میں تو روک لیا تھا اور حالات کی اصلیت کے بارے میں ابوبکر محمد پر ساری ذمہ داری پڑ چکی تھی۔ کہیں ہلاؤ خان اسے کوئی نقصان نہ پہنچا دے اسی لئے ابن علقمی نے فوری طور پر اپنے ایک معتمد کو خفیہ راستے سے ہلاؤ خان کے پاس بھیج دیا کہ وہ اسے ابوبکر محمد کی آمد کے بارے میں آگاہ کر دے اور آنے والے وفد کو یہ یقین دلایا جائے کہ خوفزدہ ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم بغداد پر قبضہ نہیں کرنے آئے ہیں۔ ساتھ ہی ابوبکر محمد کی خاطر تواضع میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی جائے اور اس کا بہت اعزاز و اکرام کیا جائے۔ تا کہ خلیفہ مستعصم باللہ کے دل میں اعتماد پیدا ہو جائے اسی طرح ہلاؤ خان کا دلی مقصد پورا ہو سکتا ہے۔

ابن علقمی کا پیغام پا کر ہلاؤ خان نے تمام تیاریاں مکمل کر لیں۔ جب ابوبکر محمد کا وفد ہلاؤ خان کی لشکر گاہ میں پہنچا تو اس نے خود آگے بڑھ کر ان کا شاندار استقبال کیا اور خدمت گذاری کے تمام آداب پورے کئے۔ ہلاؤ خان اسے خود اپنے ہمراہ لے کر شاہی خیمے میں آیا اور اپنے تخت پر اسے نشست دی۔ ابوبکر محمد ہلاؤ خان کے انداز سے بے حد حیران تھا اور ساتھ ساتھ متاثر بھی۔ ابوبکر محمد نے ہلاؤ خان کے بغداد کی جانب پیش قدمی کا مقصد دریافت کیا تو وہ دو زانو بیٹھ کر بولا۔ ''جاودانی آسمان کی قسم! میں کسی غلط نیت سے نہیں آیا ہوں بلکہ میری آمد کا مقصد تو صرف امیر المومنین کی خدمت میں حاضری کا ہے۔ میرے چچا زاد بھائی برقائی خان کے بارے میں تو امیر المومنین خوب واقف ہیں۔ وہ شیخ سیف الدین باخرزی کے ہاتھ پر مسلمان ہو چکا ہے۔ جن دنوں کی یہ بات ہے میں بھی وہیں تھا۔ شیخ سیف الدین باخرزی نے مجھے بھی دعوت اسلام دی تھی مگر میں نے اپنے وزیروں سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ آپ حاکم ہیں اور آپ کے قبول اسلام کی رسم کسی بڑے مسلمان کے ذریعے ہی ادا ہونا چاہئے۔ میں نے جب اُس بڑے مسلمان کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے امیر المومنین کا نام لیا۔ میں نے اسی دن سے ٹھان لی کہ خود بارگاہ خلافت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کروں گا''۔

ابوبکر محمد اس کی بات سن کر دم بخود رہ گیا۔ اس نے ایک اچھے کام کی نیت کے ساتھ آمد کے ساتھ جڑے خون خرابے کے بارے میں نکتہ چینی کی تو اس نے اسے اپنے دفاع اور مسلمانوں کے پیشگی حملے کا نام دیا۔ ہلاؤ خان کافی دیر تک میٹھی میٹھی باتیں کرتا رہا۔ اس کے انداز بیان میں ایسا جادو تھا کہ ابوبکر محمد جیسے زیرک شخص کی آنکھیں بھی موند گئیں۔ وہ اس کی زہر آلود فضولیات پر اعتماد کرنے پر مجبور ہو گیا۔ وہاں سے ابوبکر محمد نکل کر سیدھا امیر المومنین کی خدمت میں پہنچا اور وہ سب گفتگو جو اس سے ہلاؤ خان نے کی تھی، خلیفہ مستعصم باللہ کے گوش گزار دی۔ وزیر سلطنت ابن علقمی بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے یہ سب سن کر بڑے فخر سے اپنی اہمیت جتائی اور امیر المومنین کو تجویز دی کہ حقیقت آپ کے سامنے عیاں ہو چکی ہے۔ اب مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ امیر المومنین خود پورے جلو کے ساتھ ہلاؤ خان کے لشکر میں جائیں تا کہ ہلاؤ خان استقبال و خدمت گزاری کی شرطیں بجا لائے۔ خلیفہ مستعصم باللہ کو وزیر کی بات بے حد بھائی اور اس نے خود ہلاؤ خان کے لشکر میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے پر دربار شاہی میں کھلبلی سی مچ گئی۔ اکابرین سلطنت اور خاص مقربین امیر المومنین کے اس فیصلے کی کھلے لفظوں میں مخالفت کرنے لگے۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہلاؤ خان اپنے بیان میں سچا ہے تو اسے چھوٹے وفد کے

ساتھ دربار خلافت میں بلوا لیا جائے تاکہ خلیفہ کو کسی قسم کی گزند پہنچائے جانے کا احتمال پیدا نہ ہو۔ وزیر ابن علقمی نے مقربین کی اس تجویز کو ہلاؤ خان کی توہین قرار دیتے ہوئے دوبارہ اپنی تجویز کی منظوری پر اصرار کیا۔

سلیمان شاہ، مجاہد الدین ایبک اور ابوبکر محمد بھی اس بارے میں امیر المومنین کے ہم خیال نہیں تھے۔ خلیفہ مستعصم باللہ نے مقام خلافت پر چھوٹا سا خطبہ دیا اور خود ہلاؤ خان کے لشکر میں جانا منظور کیا۔ امیر المومنین کے اس فیصلے پر دربار میں موجود کئی لوگوں کے چہرے مرجھا گئے۔ انہیں بغداد کی عافیت خطرے سے دوچار ہوتے دکھائی دے رہی تھی۔



برقائی خان تک بغداد کے محاصرے کی خبریں مسلسل پہنچ رہی تھیں۔ قاآن اعظم منگو خان نے اس کے مراسلے کے جواب میں صرف یہ لکھا تھا کہ ہلاؤ خان سمجھدار شخص ہے، وہ کسی ایسی حرکت کا مرتکب نہیں ہوگا جس سے مسلمانوں میں یا منگولوں میں انتشار پیدا ہو یا ان کی توہین کا پہلو ظاہر ہو۔ میں جانتا ہوں کہ منگولوں میں بھی مسلمان ہیں اور منگولوں کے ماتحت بھی مسلمان ہیں۔ تم بے فکر رہو، ہلاؤ خان وقار و دانشمندی کے ساتھ کوئی مناسب فیصلہ کرے گا۔

برقائی خان اس جواب پر آگ بگولا ہو گیا، اس نے ایک بار پھر زریں خیل سپاہیوں کو تیاریوں کا حکم دے دیا۔ برقائی خان کے اس فیصلے کی خبر جب اکابرین و امرأ سلطنت کو ہوئی تو وہ جلدی جلدی اس کے پاس پہنچے اور اس سے استدعا کی کہ وہ اپنے اس حکم کو واپس لے لے ورنہ اس سے اردوئے زریں پر ہولناک عتاب نازل ہو جائے گا۔ برقائی خان کا یہ فیصلہ کھلم کھلا قاآن اعظم کے خلاف بغاوت و سرکشی کا اعلان ہے۔ برقائی خان نے ان لوگوں کے سامنے قاآن اعظم کا مراسلہ پھینک دیا جس میں نہایت عمدگی سے برقائی کا مطالبہ رد کر دیا گیا تھا۔

ان میں سے ایک سردار بولا۔

''قاآن اعظم! ہم آپ کے جذبات کو سمجھ سکتے ہیں، ہلاؤ خان نے جان بوجھ کر یہ قدم اُٹھایا ہے کہ آپ میدان میں اُتر پڑیں، یہ مصلحت کا تقاضا ہے کہ آپ صبر کرتے ہوئے خاموشی اختیار کریں اور تمام معاملات اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیں۔ وہ خود امیر المومنین کی حفاظت فرمائے گا''۔

''ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہمیں اس وقت ہلاؤ خان کو یہ باور کرانا ہے کہ ہم صرف نام کے مسلمان نہیں ہوئے بلکہ اب ہمارے قلب بھی ان کے ساتھ دھڑکتے ہیں''۔ برقائی خان جذبات کی رو میں بہتا چلا گیا۔

''قاآن اعظم! آپ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ بغداد یہاں سے بہت دور ہے، وہاں تک پہنچنے میں اتنا وقت خرچ ہو جائے گا کہ ہلاؤ خان اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا ہوگا۔ لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ آپ قاآن اعظم منگو خان کے فرمان پر عمل پیرا رہیں۔ اگر ہلاؤ خان نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو آپ کا ہاتھ اوپر ہوگا''۔ ایک دوسرے امیر نے حالات کا دوسرا رُخ دکھانے کی کوشش کی۔

''یہی تو مصیبت ہے کہ اگر میں نے اسی دن اپنے حکم کی تعمیل کرا دی ہوتی تو آج ہم بغداد سے کچھ ہی فاصلے پر موجود ہوتے۔ ہماری آمد کا سن کر ہلاؤ خان خود بخود بغداد چھوڑ کر ہم سے مقابلے کی تیاری کر رہا ہوتا''۔ برقائی تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

''قاآن اعظم!'' پہلا امیر آگے بڑھ کر مخاطب ہوا۔ ''آپ حالات کی نزاکت کو بخوبی سمجھ بھی رہے ہیں اور پھر بھی ناسمجھی کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں''۔

''تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو کہ میں یہ امر کیسے برداشت کر سکتا ہوں کہ ہلاؤ خان مرکز خلافت کے گرد دندناتا پھرے اور میں شاہی محل کے کمروں میں محض ٹہل ٹہل کر وقت گنواتا رہوں''۔ برقائی خان کسی بے بس پنچھی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمایاں تھے۔

ان امرأ نے کافی دیر تک اس کے ساتھ مغز کھپائی کی اور بمشکل اسے اس بات پر راضی کیا ہے کہ وہ اپنا فیصلہ فی الوقت واپس لے لے، اگر ہلاؤ خان نے کوئی ایسی حرکت کی جس سے مرکز اسلام کو نقصان پہنچا تو ہم سب برقائی خان کے ساتھ ہوں گے اور ہلاؤ خان کے ساتھ ہمدردی و خلوص کے تمام رشتے ناطے توڑ دیں گے اور ساتھ ہی قاآن اعظم منگو خان کی اطاعت کا طوق بھی گلے سے اتار پھینکیں گے۔ برقائی خان نے ان کے بجھے ہوئے چہرے دیکھ کر یہ گمان کیا کہ جب میرے ساتھی روانگی سے قبل ایسی گومگوئی کا شکار ہیں تو وہ میدان جنگ میں کیا جوہر دکھا پائیں گے لہٰذا دوسری بار پھر اسے اپنے فیصلے میں ترمیم کرنا پڑی۔ اس نے اپنے مخبروں کو سختی سے ہدایت کر رکھی تھی وہ بغداد کی جانب سے آنے والی کی خبریں اس تک بلا تاخیر پہنچائیں تاکہ اگر کوئی موقع مل سکے تو وہ خود کوئی ایسی حرکت کرے جس کی بدولت ہلاؤ خان بغداد کی جانب سے پیچھے ہٹ جائے۔



یکم صفر 656ھ کو خلیفہ مستعصم باللہ بڑے فخر سے شاہی محل سے باہر نکلا۔ اس کے امراہ بارہ سو سوار تھے۔ ان میں ممتاز عالم، سردار، اکابرین، تاجر اور معززین شہر شامل تھے۔ شاہی سواری زرق برق لوگوں کے جلو میں شہر کے صدر دروازے پر پہنچی تو نعروں سے فضا گونج اُٹھی۔ ہلاؤ خان کو امیر المومنین کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ خود استقبال کے لئے چالیس قدم آگے آیا۔ خلیفہ کے ساتھ ابوبکر محمد بھی موجود تھا۔ تاتاریوں نے جب خلیفہ کی شاہانہ آمد کا حال دیکھا تو وہ بھی ایک بار دم بخود رہ گئے۔ قیمتی زرق برق چمکیلے لباسوں میں ملبوس لوگ جوق در جوق ہلاؤ خان کی لشکرگاہ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ان کے جسم پر قیمتی لباس دیکھ کر تاتاریوں کو اپنی بے چارگی کا خیال آیا۔ وہ ایک ایسے علاقے سے تعلق رکھتے تھے جہاں کھانے پینے کے بعد سب سے مہنگی چیز لباس تھا۔ وہ کھالیں پہن کر گذارا کیا کرتے۔ احساس محرومی نے ان کے اندر حسد کی آگ لگا دی تھی۔ ہلاؤ خان نے آگے بڑھ کر خلیفہ مستعصم باللہ کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور انہیں اپنے ساتھ لے کر شاہی خیمے کی جانب بڑھا۔ اس کے ساتھ صرف خاص مقربین کو آنے کی اجازت دی گئی جبکہ دوسرے تمام لوگوں کو دوسری طرف جانے کا اشارہ کیا گیا جہاں ان کے لئے طعام خاص کا انتظام کیا گیا تھا۔ طعام کی بابت سن کر امرأ اور رئیسانِ شہر تیزی سے اس جانب بڑھ گئے۔ وہاں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ وہاں طعام کی شکل میں موت ان کی منتظر تھی۔ تاتاری جلاد پہلے سے تیار بیٹھے تھے۔ بغداد کے معززین کو چوہے دان میں گھیر کر گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا گیا۔ ان لوگوں نے شور شرابہ مچانے کی کوشش کی کہ دوسروں تک حقیقت حال پہنچ جائے مگر یہ انتظام کچھ ایسے انداز میں کیا گیا تھا کہ شور شرابے کی آوازیں وہیں دب کر رہ گئیں اور نہایت خاموشی سے کشت و خون کا سلسلہ جاری رہا۔

ادھر ہلاؤ خان نے خلیفہ مستعصم باللہ کو بڑی عزت سے تخت پر بٹھایا اور اپنے محافظوں کو اشارہ کر دیا۔ پل بھر میں محافظوں نے تلواریں سونت کر تمام مقربین کو گرفتار کر کے ان کی مشکیں باندھ دیں۔ خلیفہ مستعصم باللہ ہلاؤ خان کی بدعہدی پر بے بسی و بے چارگی سے یہ سارا منظر دیکھتا رہ گیا۔ سلیمان شاہ، مجاہد الدین ایبک اور عز الدین کرد امیر المومنین کی جانب تیز نگاہوں سے محض دیکھتے رہ گئے۔ ان کی توقع کے مطابق وہی کچھ ہوا تھا جس کا انہیں بہت پہلے سے خدشہ تھا۔ وہ جانتے ہوئے کہ سامنے موت کھڑی ہے، اس مشکل گھڑی میں بھی امیر المومنین کے ساتھ چل پڑے تھے۔ ہلاؤ خان نے ان لوگوں کی گرفتاری کے بعد ایک سادہ کاغذ منگوایا اور خلیفہ مستعصم باللہ

کی جانب بڑھا دیا۔ خلیفہ مستعصم باللہ مستفسرانہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔ ہلاؤ خان نے حکم دیا کہ وہ شہر کے ممتاز و اکابر لوگوں کے نام یہ پیغام لکھے کہ اس کی تاتاریوں سے صلح ہو چکی ہے اور ہلاؤ خان نے اہل شہر کے لئے طعام خاص کا بندوبست کیا ہے۔ میں بذات خود وہاں موجود ہوں اور تم لوگوں کو بھی ہدایت کرتا ہوں کہ وہ سب باہر آ کر اس محفل طعام سے لطف اندوز ہوں۔ خلیفہ مستعصم باللہ اس پیغام کے بارے میں کچھ اندازہ نہیں لگا سکا کہ ہلاؤ خان کیا چاہتا ہے؟ شہ رگ پر ٹکی تلوار کی تیز دھار نے اسے یہ حکم لکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ تاتاریوں نے یہ پیغام بغداد میں پہنچا دیا اور پھر کیا تھا؟ مسلمان جوق در جوق اپنی موت کے بلاوے پر بھاگتے ہوئے آنے لگے۔ تاتاری جلاد اپنے کاموں میں جتے رہے۔ یہ سلسلہ شام تک جاری رہا۔ خلقت خدا تمام دن تاتاریوں کی بھینٹ چڑھتی رہی۔ شام کے وقت تاتاریوں کا بھید کھل گیا اور باقی بچے کھچے لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ شہر سے باہر جانے والے لوگوں کا کیا حشر ہوا ہے۔ اس خبر نے دہشت کی ایسی لہر دوڑائی کہ لوگ اپنے مال ومتاع چھوڑ کر جان بچانے کے لئے مختلف راستوں سے فرار ہونے لگے۔ باہر تاتاریوں کے محاصرے، میں جو جو لوگ پکڑے گئے انہیں سیدھا ملک عدم پہنچا دیا گیا جبکہ ایک بڑی تعداد ساحلی جانب فرار ہونے کی کوشش میں دلدلوں میں پھنس کر ہلاک ہو گئی۔ تاتاریوں نے شہر کی مدافعت ٹوٹتے دیکھ کر بلہ بول دیا اور لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ شہر میں موجود خواتین اور بچوں کو بھی نہیں چھوڑا گیا۔ انہیں جو کوئی زندہ دکھائی دیتا اسے ہلاک کر دیا جاتا۔ اس قتل عام میں مرد، عورت، بچے، بوڑھے، معذور، بیمار، کسی کی تخصیص نہیں تھی۔ روشنیوں کا شہر اور اسلام کا مرکز بغداد تاریکی کے گہرے بادلوں میں گھر چکا تھا۔ کوئی اس کا پرسان حال نہیں تھا۔ خلیفہ خود قیدی کی حیثیت سے شہر سے باہر ایک چھوٹے سے خیمے میں نظر بند تھا۔ وحشی اور غیر تہذیب یافتہ تاتاریوں نے اس کی خوبصورتی اور رنگینوں کو ایسے ایسے طریقوں سے پامال کیا جنہیں ضبط قلم میں لانا ممکن نہیں ہے۔ علم کے خزانوں کو آگ لگا دی گئی۔ لائبریریاں جلا دی گئیں، کتب دریائے فرات و دجلہ کے پانیوں کی نظر کر دی گئیں۔ بیس لاکھ کی آبادی کا یہ عظیم شہر تباہی و بربادی کا شکار ہو گیا۔ مورخین کی روایات کے مطابق آٹھ لاکھ / سترہ ہزار افراد تاتاریوں کے ہاتھوں لقمہ اجل بن گئے۔ مسلمانوں کے تشتت و افتراق اور بے حمیتی نے تاتاریوں کو قلب اسلام پر حملہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ انحطاط کے اس دور میں اسے اپنی بقاء کے لئے ہمیشہ کسی نہ کسی مضبوط سہارے کی ضرورت رہتی تھی۔ طاقتور غزنوی، ترک سلجوقی، زنگی، ایوبی حکمرانوں کے دور میں اسے کچھ نہ کچھ سنبھالا حاصل تھا مگر ان کے بعد وہ بے یارومددگار رہ گئی تھی۔ خلیفہ مستعصم باللہ جیسا شخص شاہی محل کے کمروں میں ایسا گھسا کہ اسے دوبارہ باہر دیکھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں ہوئی اگر وہ تھوڑی سی بصیرت سے کام لیتا تو شاید اسے یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔



سلطان الملک الناصر یوسف صلاح الدین محرم 656ھ کے [illegible] میں اپنے بھاری لشکر اور ساز و سامان کے ساتھ نکلا۔ اس نے اپنی روانگی کی اطلاع سلطان الملک الکامل کو پہنچا دی تھی۔ وہ بھی طے شدہ پروگرام کے تحت دیار بکر سے اپنی افواج کے ساتھ باہر نکلا۔ دونوں لشکر دو مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے بغداد کی جانب تیزی سے بڑھنے لگے۔ نصف راہ میں انہیں یہ روح فرسا خبر ملی کہ انہیں نکلنے میں دیر ہو چکی ہے اور تاتاریوں نے بغداد پر قبضہ کر لیا ہے اور مرکز اسلام کو بری طرح تباہ و برباد کر دیا گیا ہے۔ امیر المومنین کا کچھ پتہ نہیں ہے کہ وہ زندہ ہیں یا ہلاک کر دیئے گئے ہیں۔ بغداد کی آبادی کا بڑا حصہ ہلاک کر دیا گیا ہے اور ان میں سے کوئی فرد زندہ نہیں بچ سکا۔ سلطان الملک الکامل تاتاریوں کی بربریت کے انداز سے خوب واقف تھا لہٰذا اس نے اسی مقام سے فوراً واپس لوٹنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے خیال میں آگے بڑھ کر تاتاریوں سے دست و گریباں ہونا اس

موقعہ پر مناسب نہیں تھا۔ اس نے فوری طور پر سلطان الملک الناصر کو اپنی واپسی کی اطلاع بھجوائی اور ہدایت کی وہ بھی دمشق واپس لوٹ جائے اور وہاں موجود رہ کر شہروں کی مکمل حفاظت کا بندوبست کرے تاکہ جب تاتاری آگے بڑھ کر ان پر حملہ آور ہوں تو انہیں بھرپور انداز سے جواب دیا جا سکے اور ان کے بڑھتے حوصلوں کو لگام ڈالی جا سکے۔ دونوں سلطان اس بات پر متفق ہو گئے کہ اب بغداد جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

دونوں لشکروں میں شامل رضا کار مجاہدین کو اس سانحے کا گہرا صدمہ پہنچا تھا، وہ امیر المومنین کی حفاظت کے لئے جذبہ ایمانی کے تحت گھروں سے نکلے تھے۔ بغداد سے آنے والے متاثرین کی زبانی جب انہیں وہاں کے دلدوز حالات کا علم ہوا تو وہ بے اختیار رونے لگے۔

بیبرس کو جب مرکز خلافت پر ٹوٹنے والے ستم کی خبر ملی تو کافی دیر ساکت و جامد بیٹھا رہا۔ اسے اس ضمن میں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ سب کیا ہے؟ اس کے خواب کی تعبیر اتنی مختلف کیوں تھی؟ جب خلافت کی حفاظت کے لئے اسے منتخب کر لیا گیا تھا تو پھر خلیفہ مستعصم باللہ تاتاریوں کے ہاتھ کیسے لگ گیا۔ اس نے اس خیال کے تحت پسپائی اختیار کرنے کی مخالفت کی کہ ممکن ہے کہ امیر المومنین زندہ ہوں اور انہیں تاتاریوں کے چنگل سے چھڑایا جا سکے۔

خونخوار تاتاریوں کا بالآخر داؤ چل گیا تھا۔ سلطنت خوارزم کے بعد اسلام کا دوسرا بڑا خطہ تباہی و بربادی کا شکار ہو چکا تھا۔ بیبرس سلطان الملک الناصر صلاح الدین یوسف کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا کہ وہ واپسی کا ارادہ ترک کر دے اور آگے بڑھ کر تاتاریوں پر حملہ کر دے مگر سلطان الملک الناصر نے اسے سراسر خودکشی قرار دیتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کی۔ بیبرس نے کہا کہ اس طرح واپسی کی خبر جب تاتاریوں تک پہنچے گی تو ان کے حوصلے مزید بلند ہو جائیں اور وہ بے دھڑک مسلمانوں پر چڑھ دوڑیں گے۔ خلیفہ کی گرفتاری اور پُراسرار گمشدگی سے تقدس خلافت پر نہایت بُرا اثر پڑا ہے، مسلمان خود کو غیر محفوظ اور تنہا خیال کر رہے ہیں۔ یہ بڑا نازک مرحلہ ہے لہٰذا ہر فیصلے میں دانشمندی کی ضرورت ہے۔

الملک الناصر نے بیبرس کے جذبات کو سراہا مگر عسکری قوت کی کمی کو اپنی کمزوری قرار دیتے ہوئے واپسی کے ارادے کو برقرار رکھا۔ اس کی رائے میں بغداد کے ساتھ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ اب زیادہ ضرورت اس امر کی تھی کہ تاتاریوں کو بغداد کے بعد آگے بڑھنے سے روکا جائے اور یہ کام اپنے شہروں میں محصور رہ کر زیادہ عمدگی سے انجام دیا جا سکتا تھا۔

بیبرس الملک الناصر کی اس مصلحت آمیز روش پر دل برداشتہ ہو گیا اور اس نے دمشق لوٹنے کے بجائے قاہرہ لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ وہ مسلمانوں کی بڑی تعداد کی ہلاکت و بربادی اپنے باطن کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا مگر وہ ان کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ یہاں بالکل بے اختیار تھا، بلادِ شرقیہ کے حکمران میدان میں اترنے کے بجائے دفاعی حکمت عملی پر عمل پیرا تھے۔ مسلمانوں کی عسکری قوت ان کے ناقص فیصلوں سے تقسیم کر چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم ہو کر رہ گئی تھی۔ مسلمان حکمرانوں کا یہ طریقہ کار تاتاریوں کے لئے بڑا امید افزا تھا کہ وہ بڑی آسانی سے انہیں گھیر کر ختم کر سکتے تھے۔ بیبرس قاہرہ پہنچ کر اپنے دستوں کو تیار کر کے تاتاریوں کو سبق سکھانے کی نیت باندھ چکا تھا۔ اس نے دمشق پہنچ کر الملک الناصر سے اجازت لی اور قاہرہ روانہ ہو گیا۔



تاتاریوں کی غارتگری اور بربریت کی داستانیں بغداد سے نکل کر اطراف میں پھیلتی گئیں۔ لوگوں نے تاتاریوں کے سیل کو عذاب الٰہی قرار دیا اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے قول کی تکمیل سے تعبیر کیا۔ تاریخ مقدسی

میں ہے کہ ایک دن حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے قسم کھا کر کہا تھا کہ خلافت میرے فرزندوں کو ملے گی پھر ان کی عزت و دولت پر سرخ ترک غلبہ پالیں گے ان کے چہرے ایسے ہوں گے جیسے کہ چوڑی ڈھالیں۔ اس بارے میں علماء کرام یہ تاویلیں پیش کر چکے تھے کہ یہ ترک مسلمان ہوں گے مگر جب تاتاری فتنہ ان پر ظاہر ہوا تو وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

ہلاؤ خان کے پاس قاآن اعظم منگو خان کا یہ فرمان پہنچ چکا تھا کہ بغداد پر قبضے کے بعد اگر خلیفہ مستعصم باللہ تمہارے قبضے میں آجائے تو کوشش کرنا کہ اسے ہلاک نہ کیا جائے کیونکہ اس فعل سے ہمارے ماتحت مسلمانوں میں بے چینی پھیل جائے گی اور وہ ہمارے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ ان میں ہمارے بھائی بھی شامل ہیں۔ میں نہیں چاہتا ہے ہم کسی غیر ذمہ دارانہ فعل سے آپس میں لڑنے جھگڑنے لگیں۔ البتہ اگر خلیفہ کی ہلاکت ناگزیر ہو جائے تو بھی سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا جائے۔ ہلاؤ خان چاہتا تھا کہ خلیفہ کو ہلاک کرنے کے بجائے نظر بند رکھا جائے کیونکہ اس کے لشکر میں موجود مسلمانوں نے اسے یہ باور کرایا تھا کہ خلیفہ کا تعلق خاندان نبوت سے ہے اور اگر ہلاؤ خان نے خلیفہ کا خون زمین پر بہایا تو وہ اور تاتاری لشکر خوفناک کا شکار ہو جائے گا اور ساز و سامان کے ساتھ زمین میں دھنس جائے گا۔ ان مسلمانوں کی خواہش یہ تھی کہ خلیفہ مستعصم باللہ کو کسی طرح زندہ رکھا جا سکے، سب کو خلیفہ کے قتل میں توقف مناسب دکھائی دے رہا تھا۔ امیر موصل بدرالدین لولو کو جب ہلاؤ خان کے اس فیصلے کے بارے میں علم ہوا تو وہ خود ہلاؤ خان کے پاس پہنچا اور سمجھاتے ہوئے کہا کہ یہ سب باتیں تو ہم پرستی کی علامت ہیں۔ خلیفہ کے قتل سے کوئی عذاب نہیں ٹوٹے گا۔ اگر خلیفہ کو زندہ رکھا گیا تو جو مسلمان اس وقت تاتاری لشکر میں شامل ہیں، وہ دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کے ساتھ مل کر اپنے خلیفہ کو تاتاریوں کے چنگل سے چھڑالیں گے اور پھر آپ کو کسی قیمت پر زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ امیر موصل کی بات سن کر ہلاؤ خان سوچ میں پڑ گیا۔ ہلاؤ خان کو صاف دکھائی دے رہا تھا کہ آنے والے دنوں میں کچھ ایسا ہی ہوگا۔ اگر خلیفہ زندہ رہا تو مسلمان خروج کریں گے اور اگر اسے تلوار سے ہلاک کیا گیا تو اس کا خون زمین پر گرے گا تو قیامت خیز زلزلہ تاتاریوں کو نیست و نابود کر دے گا۔ اس نے اپنے مسلمان وزیر نظام الملک نصیرالدین طوسی سے اس بارے میں رائے دریافت کی۔ نصیرالدین طوسی نے ہلاؤ خان کے دل سے خوف کا اثر زائل کرنے کی پوری کوشش کی اور اسے یہ سب محض وسوسہ بتایا۔ اس نے کہا کہ حضرت یحیٰ علیہ السلام تو پیغمبر خدا تھے جب ان کا خون ناحق بہایا گیا تھا تو ایسا کچھ نہیں ہوا تھا، حضرت امام حسینؓ کو جب میدان کربلا میں شہید کر دیا گیا تھا تو بھی کوئی زلزلہ نہیں آیا تھا۔ ایسا عقیدہ سراسر سادہ لوحی پر مبنی ہے۔ نصیرالدین طوسی کی بات سن کر ہلاؤ خان سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے خلیفہ کو زندہ رکھنا مناسب نہیں سمجھا لہٰذا اس نے خلیفہ کو قتل کرنے کا دوسرا طریقہ اختیار کیا اور کپڑے رکھنے والے چرمی تھیلے میں خلیفہ کو بند کر کے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ اسے ٹھوکریں مار مار کر ہلاک کر دیں، اس امر کا خاص خیال رہے کہ خلیفہ کا خون زمین پر گرنے نہ پائے۔ صرف چار دن کی نظر بندی کے بعد خلیفہ مستعصم باللہ 4 صفر 656ھ کو نہایت بے دردی سے ہلاک کر دیا گیا۔ ہلاؤ خان نے جس دھوکے سے بغداد پر قبضہ کیا تھا، اسی دھوکے سے خلیفہ کو امان دینے کے بعد ہلاک کر دیا تھا۔

خلیفہ کی ہلاکت کی خبر سے تاتاری لشکر میں موجود مسلمانوں میں بے چینی پھیل گئی، وہ خلیفہ کو ہر حال میں زندہ رکھنے کے متمنی تھے مگر ہلاؤ خان کی چالاکی سے ان میں پژمردگی پھیل گئی۔ انہوں نے ہلاؤ خان کو ہلاکو خان کہنا شروع کر دیا۔ جب اس نئے نام کی بابت ہلاؤ خان کو معلوم ہوا تو اس نے وزیر نصیرالدین طوسی سے دریافت کیا اس نام سے کیا مراد ہے؟ تو وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ تو واقعی ہلاکو ہے کیونکہ اس وقت تیری ہلاکت خیزی سے

زمین و آسمان پناہ مانگ رہا ہے۔ ہلاؤ خان کو یہ جملہ اتنا بھایا کہ اس نے خود کو ہلاکو خان کہنے کا فرمان جاری کر دیا۔

سلیمان شاہ، مجاہد الدین ایبک، عزالدین کرد اور امیر ابوبکر محمد کو ان کے اقرباء متوسلین کے ساتھ ہلاکو خان کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے سب سے پہلے فتح الدین کرد اور مجاہد الدین ایبک کے سامنے ان کے اہل و عیال کو ذبح کیا اور پھر ان کی گردنیں اُڑا دیں۔ اس کے بعد وہ سلیمان شاہ کی جانب متوجہ ہوا۔ ہلاکو خان نے سلیمان شاہ سے سوال کیا کہ تم بڑے دور اندیش اور نجومی سمجھے جاتے تھے تم نے اپنا مستقبل کیوں نہیں دیکھ لیا تھا کہ تمہاری موت میرے ہاتھوں لکھی ہے۔ سلیمان شاہ نے ہنس کر جواب دیا کہ افسوس ہے کہ میرے سامنے امیر المومنین کی بدنصیبی تھی اور میرے ساتھ ساتھ سب لوگوں پر اسی بدنصیبی کے بادل چھا چکے تھے، ایسے میں مشیت ایزدی سے فرار حاصل کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔

ہلاکو خان کو سب سے زیادہ غصہ سلیمان شاہ پر ہی تھا کیونکہ اس نے گذشتہ تیس سال سے تاتاریوں کی پیش قدمی کو ناکامی سے دوچار کیا ہوا تھا۔ جہاں ہلاکو خان اس کی جرأت اور بہادری سے متاثر تھا، وہیں وہ اسے زیادہ دیر تک زندہ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے بغداد کے اس جانباز کو بھی تلواروں کے حوالے کر دیا۔ مجاہد الدین ایبک، فتح الدین کرد اور سلیمان شاہ کے سر کٹوا کر موصل روانہ کر دیئے گئے تاکہ انہیں دریائے دجلہ کے پل پر آویزاں کر دیا جائے۔ سلیمان شاہ امیر موصل بدرالدین لولو کا گہرا دوست تھا۔ جب امیر موصل نے اس کا بریدہ سر دیکھا تو وہ بے اختیار رونے لگا اور آسمان کی جانب دیکھ کر کہنے لگا کہ اے خدا! تو بے شک جانتا ہے کہ میری دشمنی صرف خلیفہ کے ساتھ تھی اور میں نے تیری خلقت کے لئے کبھی ایسا نہیں سوچا تھا، اپنی کوتاہیوں کے باعث میں جس دلدل میں پھنس چکا ہوں اس سے نکلنا اب میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اب تو ہی کوئی ایسی ہوا بھیج کہ جس سے تاتاریوں کے اس گروہ میں طاعون پھوٹ پڑے اور وہ ہلاک ہو جائیں۔

امیر ابوبکر محمد کو جب ہلاکو خان کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ خاموش کھڑا رہا۔ ہلاکو خان نے اسے کچھ کہنا چاہا تو ابوبکر محمد خود ہی بول پڑا کہ تو خائن ہے مجھے تجھ سے کسی اچھائی کی توقع نہیں ہے۔ تو میرا خون بہانا چاہتا ہے تو جلدی کر، تاکہ میں بھی اپنے لوگوں کے ساتھ جاملوں۔ ہلاکو خان نے یہ سن کر اس کی گردن اُڑانے کا حکم جاری کر دیا۔ یہی سلوک بارگاہ خلافت کے دوسرے امراء و اکابرین کے ساتھ کیا گیا۔ امیر المومنین کے عیال میں سے صرف ایک چھوٹا سا بچہ زندہ بچا تھا۔

ہلاکو خان بغداد کے تمام اموال و خزائن پر قابض ہو چکا تھا جن کی مقدار کے بارے میں مختلف روایات موجود ہیں۔ ہلاکو خان مال و خزائن دیکھ کر مبہوت رہ گیا تھا۔ اس نے مال غنیمت کو حصوں میں بانٹ کر ایک بڑا حصہ قاآن اعظم منگو خان کی خدمت میں بھیجا اور کچھ خاص اور قیمتی اشیاء بطور ''تحفہ'' برقائی خان کو روانہ کیں۔ امیر المومنین کی بعض بیویاں، لونڈیاں اور بیٹیاں بھی قاآن اعظم کے پاس روانہ کر دی گئیں۔

جب ہلاکو خان بغداد کو لوٹ چکا اور خلق خدا کو شہید کر چکا تو اس نے اپنے محسن اور مددگار کو بلوا کر بچا کھچا بغداد اُس کے حوالے کر دیا۔ اس کے ساتھ ایک معمولی تاتاری کو بطور نگران مقرر کر دیا۔ وزیر ابن علقمی خلیفہ کے ساتھ ہلاکو خان کے لشکر میں آچکا تھا، اسے بغداد کی تباہی کے بارے میں کچھ خبر نہیں تھی۔ خلیفہ کی موت پر اس نے کلمہ شکر ادا کیا اور نگران تاتاری کے ساتھ بغداد میں داخل ہوا۔ جلے اور گرائے گئے مکانات اور گلی کوچوں میں بکھری ہوئی گلی سڑی لاشوں کے انبار دیکھ کر ابن علقمی غم و دیوانگی سے چیخنے چلانے لگا۔ وہ خود بھی یہ سب نہیں چاہتا تھا۔ اسے صرف خلیفہ کی معزولی اور اہل بیت میں سے کسی نئے خلیفہ کی تقرری کی خواہش تھی مگر ہلاکو خان کو اس کی خواہش سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ابن علقمی نے بغداد کے بچے کھچے شہریوں سے واپس لوٹنے کی استدعا کی تاکہ

بغداد کی اجڑی رونق کو بحال کیا جا سکے۔

ابن علقمی بغداد کے انتظام سے فارغ ہو کر ہلاکو خان کی خدمت میں پہنچا اور اپنی وفاداری کا معاوضہ طلب کیا تو ہلاکو خان نے اس سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس نے ابن علقمی سے پوچھا کہ تجھے عزت، دولت اور اقتدار حاصل تھا، یہ سب تجھے کس سے ملے تھے؟ ابن علقمی نے جواب دیا کہ مرکز خلافت سے، ہلاکو خان نے کورے انداز میں کہا کہ جب تو نے اپنے منعم کی نعمت کے حق کا کوئی پاس نہیں کیا تو میری خدمت کے لائق کیونکر ہو سکتا ہے۔ ابن علقمی اس کی بات سن کر لا جواب ہو گیا۔ اس نے مختلف حربوں سے اپنے عمل کو درست قرار دینے کی کوشش کی اور نظام الملک نصیر الدین طوسی کی جانب بے چارگی سے دیکھا مگر اس نے بھی نظریں پھیر کر دوسری جانب کر لیں۔ ہلاکو خان کے دربار سے رسوا ہو کر وہ شکستہ قدموں سے بغداد چلا آیا۔ اب بغداد تو موجود تھا مگر اس میں پہلے سی رونق باقی نہیں تھی۔ ویرانی و گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بچے کھچے لوگوں کے سہمے ہوئے چہرے اور آہ و بکا کی پکار بغداد کی گلیوں میں دبے دبے انداز میں گونج رہی تھی۔ ابن علقمی کو اپنے فعل پر سخت ندامت تھی مگر وہ اب گذرے ہوئے وقت کو واپس تو نہیں لا سکتا تھا صرف ایک ہفتہ قبل کی بات تھی کہ وہ شان و شوکت اور تمکنت سے اپنے محل سے نکلتا تھا۔ اب کوئی اس کے استقبال کے لئے موجود نہیں تھا۔ خالی دیواریں اور لٹے پٹے محل اسے کاٹنے کو دوڑتے تھے۔

خلیفہ کے مقربین اور غلاموں کی ایک جماعت ہلاکو خان کی بربریت سے بچ کر دریائے فرات کی دلدلی وادی میں پناہ لئے ہوئے تھی۔ ان میں کچھ لوگ عام شہری بھی تھے۔ انہوں نے جمع ہو کر فیصلہ کیا کہ بغداد میں موجود نگران تاتاریوں پر شب خون مارا جائے تاکہ وہ خوفزدہ ہو کر بغداد سے نکل جائیں۔ انہوں نے دو ماہ کے عرصے میں لڑنے کے لئے ساز و سامان اکٹھا کیا اور تیاریاں کرتے رہے۔ جب ان کی تیاریوں کا حال قرب و جوار کے لوگوں کو معلوم ہوا تو انہوں نے بھی رضا کارانہ خدمات پیش کر دیں۔ ان لوگوں کی تعداد تقریباً دس ہزار کے قریب پہنچ گئی تو انہوں نے خروج کیا اور بغداد میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے بغداد میں موجود نگران تاتاریوں کو چن چن کر ہلاک کیا اور شاہی محل پر دھاوا بول کر ابن علقمی کو گرفتار کر لیا۔ ابن علقمی کا چہرہ دیکھ کر ان کے غصے کی انتہا نہیں رہی۔ اس کے چہرے پر صدیوں کے بیمار کے سے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ مجاہدین نے اسے لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا اور اتنا زد و کوب کیا کہ اس کی روح پرواز کر گئی۔ غدار اعظم ابن علقمی اپنے بھیانک انجام تک پہنچ گیا تھا مگر اس کی غداری سے جو نقصان ہو چکا تھا اس کی تلافی اب ممکن نہیں تھی۔ مسلمان اپنے مرکز کی تباہی کے بعد پراگندہ ہو چکے تھے۔ مختلف ریاستوں کے سلاطین سر جوڑ کر مقابلہ کرنے کے بجائے ہلاکو خان کی خدمت میں وفود بھیج کر اپنی جان بچانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ مجاہدین کے اس چھوٹے سے لشکر نے بغداد میں ایک بار پھر قتل عام کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ابن علقمی کے ساتھیوں، رافضیوں اور نصرانیوں کے گھروں پر حملے کئے گئے اور انہیں قتل کر کے ان کے گھروں کو آگ لگا دی گئی۔ بغداد کی بچی کھچی سہمی ہوئی رعایا نئے عتاب کے سامنے بے بسی کی تصویر بنی رہی۔ مجاہدین اپنوں کو ہلاک کرنے کے بعد تیزی سے بغداد سے باہر نکل گئے۔ مجاہدین کا یہ عمل ہلاکو خان کو اس قدر ناگوار گذرا کہ اس نے بغداد پر تاتاریوں کو کھلا چھوڑ دیا تاکہ وہ اس شہر کا وجود صفحۂ ہستی سے ہی مٹا دیں۔ ان بدمست تاتاریوں نے گھروں میں گھس کر بچوں اور عورتوں کو زبردستی باہر نکالا اور بیچ چوراہوں پر لا کر ذلیل کرتے ہوئے قتل کر دیا۔ بغداد کے باقی ماندہ گھروں کو گرایا جانے لگا۔ چالیس دن تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پُر رونق اور ہنستا کھیلتا بغداد کھنڈرات بن چکا تھا۔ ہلاکو خان نے بغداد سے بے فکر ہونے کے بعد سلطان الملک الکامل کی جانب توجہ کی، اس کے خروج کی خبر اس تک پہنچ چکی تھی۔ سلطان الملک

الکامل اور سلطان الملک الناصر کی سرکوبی کے لئے اس نے اپنے لشکر کے دو بڑے حصے روانہ کئے جن میں سے ایک کی قیادت اس کے بڑے بیٹے بوقا خان کے ہاتھوں میں تھی۔



خلیفہ مستعصم باللہ کی ہلاکت کی جان گداز خبر جب برقائی خان کے پاس پہنچی تو وہ تڑپ اٹھا۔ اسے جس امر کا اندیشہ تھا وہی ہوا۔ ہلاؤ خان نے نصرانیت کی خوشنودی کے لئے اسلامی مرکز پر حملہ کر کے مسلمانوں کی قوت ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔ خلیفہ کی ہلاکت اور بغداد کی تباہی کا حال جب اس کے سامنے بیان کیا گیا تو بے تابی سے رونے لگا۔ وہ بار بار خود کو کوستا کہ اس کی حماقت اور سستی کے باعث خلیفہ اور بغداد پر یہ قیامت ٹوٹی ہے۔ اگر وہ بروقت کوئی قدم اٹھا لیتا اور اپنے امرا اور سرداروں کی باتوں میں نہ آتا تو اسے یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ مسلمان منگول امرا اور سردار بھی اس خبر پر گہرے غم سے دوچار تھے۔ وہ ابھی اس بارے میں آپس میں صلاح و مشورہ کر رہے تھے کہ ایسے حالات میں انہیں کیا حکمت عملی اپنانا چاہئے کہ تیسرے دن ہلاؤ خان کی جانب سے بھیجا گیا قافلہ سرائے پہنچ گیا۔ یہ ہلاؤ خان کی جانب سے بغداد کے مال غنیمت میں سے برقائی خان کا حصہ اور ہلاؤ خان کی جانب سے بھیجے گئے کچھ نادر تحفے لے کر آیا تھا۔ برقائی خان کو جب اس کی آمد کی اطلاع دی گئی تو وہ فرط طیش سے بے قابو ہو گیا۔ اس نے ان لوگوں کو شرف باریابی بخشنے کے بجائے فوراً ان کے سر گردنوں سے جدا کرنے کا حکم دیا۔ مسلمان منگول پہلے سے ہی گہرے صدمے سے دوچار تھے کہ ہلاؤ خان کی اس تمسخرانہ حرکت پر بھڑک اٹھے۔ انہوں نے تمام سپاہیوں اور سرداروں کے سر کاٹ کر ہلاؤ خان کی خدمت میں واپس بھجوا دیئے۔ دربار خلافت کی قیمتی اشیاء جب برقائی خان کے سامنے لا کر رکھی گئیں تو وہ فرط غم سے روتا ہوا اپنے تخت سے اتر کر ان کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا۔ اس نے قسم کھائی کہ آج کے بعد ہلاؤ خان اس کا سب سے بڑا دشمن ہے اور اس کی ہر فتح کو ناکامی و شکست میں بدل دیا جائے گا۔ یہ چنگیز خان کے خاندان میں پہلے فرد کی کھلی بغاوت کا اعلان تھا۔ قاآن اعظم منگو خان کی اطاعت کو ختم کرتے ہوئے برقائی خان نے اردوئے زریں میں خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس نے قاآن اعظم منگو خان کی جانب سے آنے والے وفد کو کھلے لفظوں میں یہ باور کرا دیا تھا کہ اس کی جنگ صرف ہلاؤ خان سے ہے اگر قاآن اعظم نے اردوئے زریں کی جانب کسی قسم کی کارروائی کا خیال کیا تو وہ ان کے ساتھ رشتوں اور سابقہ احترام کو بالائے طاق رکھ دے گا۔ ہلاؤ خان نے مرکز اسلام پر حملہ کر کے برقائی خان کے جذبات کو شدید ٹھیس پہنچائی تھی۔ بغداد کی خوفناک تباہی نے نئی تاریخ رقم کر دی تھی۔ منگولوں کا گروہ اب دو بڑے حصوں میں بٹ کر رہ گیا۔ ایک حصہ مسلمان تھا جو کہ برقائی کے زیر علم جمع ہو تا رہا جبکہ دوسرا گروہ ہلاؤ خان کے ساتھ ہمدردی رکھتا تھا۔ اس گروہ میں منگو خان، کے ساتھ ساتھ قبلائی خان بھی شامل تھا جو کہ بلاد چین پر حکمران تھا۔ برقائی خان نے حرمت خلافت کی پامالی کا بدلہ لینے کے لئے اپنی فوجوں کو عسکری تیاریوں کا حکم دے دیا۔ وہ اس مرتبہ اپنے حکم کو کسی قیمت پر بھی واپس نہیں لینا چاہتا تھا۔



وہ آنکھیں مسلتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ اس نے اپنے چاروں جانب حیرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ خود کو اجنبی ماحول میں پا کر تعجب کی گہری پرچھائیں اس کے چہرے پر امڈ آئی۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ وہ واقعی عالم بیداری میں ہی ہے یا کسی سہانے خواب نے اسے اپنی آغوش میں لے رکھا ہے۔ وہ خواہ خواب تھا یا حقیقت...... بڑا دلکش اور آنکھوں کو تراوٹ بخشنے والا منظر تھا۔ دودھ کی سی سپید دیواریں، دیواروں پر آویزاں خوبصورت و دیدہ زیب آرائشی قالین اور ریشمی پردے، سنگ مرمر کے فرش پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر قرینے سے رکھی گئی چھوٹی

چھوٹی نقرئی تپائیاں، فرش کے وسط میں مخملیں قالین، جس کے شوخ وچنچل رنگوں کی تازگی، یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی تھی کہ اسے تیار کیے ہوئے ابھی زیادہ دیر نہیں گذری ہوگی۔ دیواروں میں روشنی کے لئے بنائے گئے طاقچوں پر کچھ اس انداز کے نقش ونگار تھے کہ دیکھنے والا یہ اندازہ لگانے میں خطا کھا جاتا ہے کہ یہ طاقچے چھت میں بنائے گئے ہیں یا دیواروں میں۔ طاقچوں سے لے کر تمام چھت کو کچھ اس طرح نقش ونگار سے ڈھانپ دیا گیا تھا کہ ان کی حدود آپس میں مدغم ہو کر رہ گئی تھیں۔ چھت کے بیچوں بیچ لٹکتے ہوئے طلائی فانوس کی دلکشی اپنی جگہ منفرد تھی۔

وہ اس کمرے کے سحر میں کافی دیر تک مبہوت بیٹھی رہی۔ اس کی نگاہیں اس شاہی کمرے کے درودیوار سے رینگتی ہوئی جانے کب اپنے سراپے پر آن ٹھہریں۔ اپنے سراپے پر نگاہ پڑتے ہی وہ گہرے خوف وحیرت کا شکار دکھائی دینے لگی۔ اس کے جسم پر نہایت قیمتی لباس موجود تھا جس کی زرق برق اس کی اپنی آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی۔ وہ خود کو ٹٹولنے لگی۔ اسے اب واقعی یہ یقین ہو چلا تھا کہ جو کچھ بھی اس کی نگاہوں کے سامنے ہے، وہ کسی صورت میں حقیقت نہیں ہو سکتا، وہ یقیناً عالم نوم میں ہے اور یہ سب کچھ کسی دلکش خواب کا حصہ ہے۔ اس نے غیر ارادی طور پر خود کو چٹکی بھری، ہلکی سی کراہ اس کے منہ سے نکل گئی۔ وہ خوف زدہ ہونے کے بجائے مخمصے کا شکار ہو گئی کیونکہ بھیانک اندھیرے غار سے یہاں تک کا سفر کیسے اور کب طے ہوا تھا......؟ اسے کچھ بھی یاد نہیں تھا.....

اس کا دل ودماغ گہری تشویش میں مبتلا تھا، وہ اپنے گذرے کل کے بارے میں سوچنے لگی اس کے ذہن کے دریچے ایک ایک کر کے کھلنے لگے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ جب وہ رات کو سفر کی تکان کے باعث گہری نیند کی آغوش میں اُتر گئی تھی تو وہ ایک پتھریلا غار ہی تھا، پھر جانے رات کے کس پہر میں اس کی آنکھ کھل گئی تو اسے یہ احساس شدت سے ستانے لگا کہ وہ غار میں تنہا ہے، رات کو اس کے دونوں ساتھی اس کے ساتھ ہی غار میں موجود تھے۔ اُس نے انہیں کئی بار پکارا مگر کوئی جواب نہیں ملا تو اس نے یہی قیاس کیا کہ وہ شاید اسے تنہا چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ پھر اسے یہ خیال آیا کہ ممکن ہے کہ وہ دونوں غار کے باہر راز ونیاز کی دنیا میں محو ہوں، وہ اپنے خیال کو پرکھنے کے لئے اندھیرے میں غار کی ناہموار دیواریں ٹٹولتی ہوئی دہانے کی جانب بڑھی۔ وہ کافی دیر تک غار کی دیواروں سے الجھتی رہی مگر اسے دہانے کا راستہ نہیں ملا تھا۔ اسی کشمکش وپیچ میں اُسے اچانک یہ محسوس ہوا کہ جیسے غار میں گھٹن سی بڑھ رہی ہو، اسے سانس لینے میں مشکل پیش آنے لگی۔ وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کچھ دیکھنے کی کوشش کرتی رہی کہ شاید اسے کوئی ایسا سراغ مل جائے کہ حقیقت کھل جائے پھر اچانک اسے آخری رسم کے بارے میں تھوڑا تھوڑا یاد آنے لگا۔ غار میں موجودگی، دہانے کی گمشدگی اور پھر بڑھتی ہوئی گھٹن نے اس کے خیال کو تقویت دی، وہ آخری رسم کے بارے میں سوچ کر خوفزدہ ہو گئی۔ اس نے کافی دیر تک اپنی سی کوشش جاری رکھی مگر وہ ہر بار ناکامی سے دوچار ہوئی۔ غار کا دہانہ بھی غائب تھا اور فضا میں گھٹن بڑھتی جا رہی تھی۔ اُسے تھوڑی ہی دیر بعد سانس لینے میں خاصی دشواری پیش آنے لگی۔ اس کا پورا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ بالآخر وہ ہمت ہار بیٹھی پھر سانس گھٹنے کے باعث اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں اور وہ گر گئی۔

اس کے بعد کیا ہوا تھا؟ اسے کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔ وہ اب کہاں ہے اور غار سے یہاں کیسے پہنچ گئی؟ اگر کوئی اسے یہاں لایا ہے تو وہ کون ہو سکتا ہے؟ سوالوں کی بوچھاڑ اس کے ذہن میں ہیجان پیدا کرنے لگی۔ وہ زمین پر لگے ہوئے بستر سے باہر نکل آئی۔ نرم قالین پر وہ اِدھر اُدھر ٹہلتی ہوئی یہ جائزہ لینے کی کوشش کر رہی تھی کہ شاید کوئی اور بھی وہاں موجود ہو مگر یہ جان کر اسے شدید حیرت ہوئی کہ وہ اتنے بڑے کمرے میں تنہا ہی تھی۔ پھر اس کی نظر دروازے پر جا پڑی جو کہ پہلو کی جانب بڑے پُراسرار انداز میں بنایا گیا تھا۔ اگر وہ اس جانب نہ پہنچ

پاتی اور اچانک اس کی نگاہ دروازے پر نہ پڑتی تو وہ شاید یہی سمجھتی کہ اس کمرے میں کوئی دروازہ موجود نہیں۔ اس کے قدم خود بخود دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ دروازے کے پاس پہنچ کر وہ ششدر رہ گئی۔ وہ لکڑی کا دروازہ تھا، جس کے دونوں پاٹ بالکل سپاٹ دکھائی دے رہے تھے۔ دروازہ کھولنے کے لئے کنڈا یا ہتھی تک موجود نہیں تھی۔ اس نے دروازے کو باہر کی جانب دھکیلنا چاہا مگر دروازہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ وہ شاید باہر سے بند تھا۔ اسے وہ کمرہ کوئی پنجرہ محسوس ہونے لگا۔ وہ پریشانی کے عالم میں ٹہلتی ہوئی واپس اپنی جگہ پہنچ گئی۔

وہ کافی دیر تک گومگو میں مبتلا رہی اسے یہ معلوم ہی نہیں ہو پایا کہ دروازہ کھول کر کوئی اندر آچکا ہے۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اس کا ذہن وسوسوں اور خدشوں کے بھنور میں پھنسا نجات کی راہیں تلاش کر رہا تھا۔ اندر آنے والے نے آہستگی سے کھنکار کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ وہ چونک کر اُس اجنبی کی جانب دیکھنے لگی جو اس کے بالکل پاس کھڑا تھا۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی کیونکہ یہ چہرہ اس کے لئے اجنبی تو تھا ہی مگر جانے کیوں اسے یہ شک ہو رہا تھا کہ اس نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے مگر کہاں؟ اس بارے میں وہ کوئی اندازہ نہیں کر پائی۔ اجنبی کے چہرے سے اس کی عمر تیس سال کے قریب دکھائی دیتی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر دھیرے سے مسکراتا ہوا مخاطب ہوا۔

''کیسی ہو گل وتوژ.....؟ تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو محسوس نہیں ہو رہی ہے؟''

گل وتوژ اس کے منہ سے اپنا نام سن کر دنگ رہ گئی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا بس خاموش بیٹھی اُلجھی نگاہوں سے اسے تکتی رہی۔ وہ اپنے ذہن پر زور دینے میں مصروف تھی کہ شاید یہ چہرہ اس کی پہچان میں آجاتے۔ اجنبی اس کے چہرے پر پھیلی سراسیمگی کا مفہوم سمجھ چکا تھا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔



دوسری صبح مطیع الدین نے فونگاجو خان کو ہدایت کی کہ اب اس علاقے میں مزید قیام کرنا مناسب نہیں ہے، ہمیں فوری طور پر سرائے کی جانب بڑھنا چاہئے۔ فونگاجو خان نے بھی اس کی رائے کی تائید کی۔ دونوں نے مل کر اپنا سامان سمیٹ کر گھوڑوں پر لادا اور سرائے کا رُخ کیا۔ مطیع الدین ابھی تک شنگ خان کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کیسا کھیل کھیلنے والا ہے؟ اگر وہ چاہتا تو گذشتہ رات ہی میں کوئی نہ کوئی فیصلہ کن وار کر سکتا تھا۔ وہ مدمقابل آنے سے بھی ہچکچا رہا ہے اور احمقانہ انداز سے اس لڑائی میں فاتح رہنے کا بھی خواہشمند ہے۔ اگر وہ واقعی گل وتوژ کا منگیتر تھا تو گل وتوژ کو جب آخری رسم کی سزا دی جا رہی تھی تو اس وقت اس کی چاہت کو کیا ہو گیا تھا؟ دوسری طرف فونگاجو خان مطیع الدین کی مصلحت انگیزی سے بالکل متفق نہیں تھا۔ اس کے خیال میں شنگ خان جیسے لومڑی نما مکار دشمن کو خواہ مخواہ وار کرنے کے مواقع نہیں فراہم کرنا چاہئے تھے۔ وہ مطیع الدین کی رفاقت میں مایوسی کا شکار دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے پھولے ہوئے چہرے نے اس کی ساری شخصیت کو مضحکہ خیز بنا کر رکھ دیا۔ مطیع الدین اپنے خیال میں کھویا ہوا گھوڑا دوڑا رہا تھا کہ اچانک بے خیالی میں اس کی نگاہ فونگاجو خان کے چہرے پر پڑ گئی۔ وہ چونک گیا۔ اس نے فونگاجو خان کو ہاتھ کے اشارے سے گھوڑا ٹھہرانے کے لئے کہا۔ فونگاجو خان اس کے بے وقت اشارے پر پریشان دکھائی دینے لگا۔ اس نے تیزی سے اپنے اطراف میں نگاہ دوڑائی۔ اس نے ٹھہرنے کے اشارے کو کسی خطرے پر قیاس کیا تھا۔ اس نے گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اسے مطیع الدین کی جانب حرکت دی۔ دونوں جب قریب پہنچ گئے تو فونگاجو خان نے یوں رُکنے پر استفسار کیا۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا......!'' مطیع الدین نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''کیا مطلب......؟'' فوئنا جو خان اس بے تکے سوال پر جز بز دکھائی دیا۔

''میرا خیال ہے کہ میں نے کوئی ایسا سوال نہیں کیا کہ مجھے مزید وضاحت کرنا پڑے''۔

''کیا یہی پوچھنے کے لئے مجھے روکا ہے''۔ فوئنا جو خان کے چہرے کی رگیں تن گئیں۔

''تمہارے پھولے ہوئے چہرے پر نظر پڑی تھی تو مجھے محسوس ہوا کہ شاید تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں''۔ مطیع الدین نے دھیمے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''مطیع الدین......!'' فوئنا جو خان تیز لہجے میں بولا۔ ''اس وقت کسی قسم کا بے ہودہ مذاق کرنے سے گریز کرنا، یہ نہ ہو کہ میں تمہیں یہیں کہیں دفن کرنے پر مجبور ہو جاؤں''۔

فوئنا جو خان کے تیور خاصے تیکھے دکھائی دیتے تھے۔ مطیع الدین کو بخوبی اندازہ ہو گیا کہ فوئنا جو خان کو اس وقت چھیڑنا مناسب نہیں ہے ورنہ وہ کسی بھی لمحے ہتھے سے اکھڑ سکتا ہے۔

''شاید تمہیں اب میرا ساتھ گوارا نہیں ہے......؟'' مطیع الدین نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

''یہ بات نہیں...... مجھے تمہاری رفاقت سے کوئی شکوہ نہیں مگر جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے سخت اختلاف ہے۔ میں تمہیں اتنا بزدل نہیں سمجھتا تھا''۔ فوئنا جو خان ہونٹ کاٹتا ہوا بولا۔

''میں جانتا ہوں کہ تمہیں شنگ خان پر بے حد غصہ ہے مگر اسے قتل کرنے پر ہمیں کچھ بھی حاصل نہیں ہونا تھا۔ تم یہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ اس کی بدولت ہی ہمیں گل وتوژ کے بارے میں اصلیت معلوم ہوئی ہے۔ میں بے کار میں اپنا وقت گنوانے کا خواہش مند نہیں ہوں۔ شنگ خان کو ہم کسی بھی وقت سبق سکھا دیں گے''۔ مطیع الدین نے کہا۔

''تم نرے احمق ہو...... تم ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکے کہ شنگ خان ہمیں اپنی مطلب برآری کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے''۔ فوئنا جو خان اس کی بات سے اختلاف کرتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب......؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو......؟'' مطیع الدین اس کے منہ سے غیر متوقع بات سن کر چونک پڑا۔

''شنگ خان نے تمہیں جان بوجھ کر زندہ رہنے کا موقع دیا ہے، یہ بات نہیں ہے کہ وہ تم سے کمزور تھا یا مقابلے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ تم گل وتوژ کو تلاش کرو اور جب تم کامیاب ہو جاؤ تو وہ اس وقت تمہیں ہلاک کر کے گل وتوژ کو حاصل کر لے''۔

''وہ یہ کیسے سوچ سکتا ہے کہ میں واقعی گل وتوژ کو تلاش کر لوں گا حالانکہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟'' مطیع الدین کے چہرے پر حیرت کی شکنیں گہری ہو گئیں۔

''شنگ خان کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ تم ہی گل وتوژ کے محبوب ہو جس کے لئے گل وتوژ نے سب کچھ ٹھکرا دیا تھا، میں سمجھ رہا ہوں کہ گل وتوژ کو آخری رسم کی سزا کیوں دی گئی تھی۔ شنگ خان کو اس بات کا اندازہ ہو چکا ہے کہ جیسے تم گل وتوژ کی تلاش میں کوہ سرخ تک پہنچ گئے تھے، اسی طرح تم اس کا سراغ لگانے میں ایک دن ضرور کامیاب ہو جاؤ گے''۔

''کوہ سرخ پر گل وتوژ کے بارے میں جو کچھ مجھے معلوم ہوا وہ تو محض ایک اتفاق تھا''۔

''زندگی میں ایسے ہی اتفاقات، انسان کو کامیابی سے قریب کر دیتے ہیں''۔

''فلاسفروں جیسی باتیں بھی کر سکتے ہو، یہ بات میرے علم میں نہیں تھی''۔ مطیع الدین نے اس کے چہرے کی جانب غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ فوئنا جو خان نے اس کی بات پر بھنویں چڑھا دیں۔ چند لمحوں کی گفتگو نے

فوئنا جو خان کے ذہن پر چھائے ہوئے غبار کو رفع کر دیا تھا۔ وہ اپنی سادہ اور بے لوث عادت کے باعث جلد ہی اعتدال پر آ گیا۔ وہ دونوں کوہ سرخ سے کافی دور برف کے میدان میں پہنچ چکے تھے۔ چھوٹی چھوٹی برف سے ڈھکی جھاڑیاں اس میدان میں جا بجا پھیلی دکھائی دے رہی تھیں۔ صبح کا پہلا پہر گذرنے والا تھا۔ اسی لمحے ہوا میں تیزی پیدا ہونے لگی پھر بادلوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں سورج کے قریب ہونے لگیں۔

''میرا خیال ہے کہ برف باری کا سلسلہ شروع ہونے والا ہے، ہمیں تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنا ہوگا ورنہ ہم طوفان میں پھنس کر برف میں ہی دفن ہو جائیں گے''۔ فوئنا جو خان نے اسے آگاہ کیا۔ مطیع الدین نے بھی اس کی بات پر صاد کیا۔ وہ دونوں گھوڑوں پر سوار ساتھ ساتھ آہستگی سے چل رہے تھے۔ فوئنا جو خان نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی تو گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ مطیع الدین نے فوئنا جو خان کی جانب دیکھتے ہوئے اس کی تقلید میں اپنے گھوڑے کو ایڑ لگانا چاہی مگر گھوڑا بری طرح بدک گیا۔ مطیع الدین کے لئے گھوڑے کا بدکنا غیر متوقع بات تھی اس لئے وہ فوراً سنبھل نہ سکا اور الٹ کر زمین پر آن گرا۔ فوئنا جو خان کے کانوں میں گھوڑے کی تیز ہنہناہٹ پڑی تو اس نے مڑ کر دیکھا۔ مطیع الدین کو گرتے ہوئے دیکھ کر اس نے اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اسے تیزی سے موڑا اور مطیع الدین کی طرف بڑھنے لگا۔ مطیع الدین کے پاس پہنچ کر وہ تیزی سے نیچے اترا۔ مطیع الدین بے دھیانی میں نیچے گرا تھا، اس لئے اس کی کمر میں موچ آ گئی۔ وہ اٹھنے کی کوشش تو کر رہا تھا مگر کمر سے اٹھنے والا شدید درد اس کی کوشش کو ناکام کئے ہوئے تھا۔ فوئنا جو خان نے ہاتھ بڑھا کر اسے پاؤں پر کھڑا کیا۔ مطیع الدین بمشکل سیدھا ہوا۔ وہ حیرت بھری نگاہوں سے گھوڑے کی جانب دیکھنے لگا کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ گھوڑے نے اپنے مالک کو گرا دیا تھا۔ ہوا میں تیزی بڑھ چکی تھی۔ فوئنا جو خان نے مطیع الدین کے گھوڑے کو پیار سے پچکارتے ہوئے اس کی گردن تھپتھپائی۔ مطیع الدین کے کپڑوں پر برف کے ذرے چمکتے دکھائی دے رہے تھے۔ فوئنا جو خان نے گھوڑے کی باگیں اس کی جانب بڑھا کر چلنے کا اشارہ کیا۔

''زیادہ چوٹ تو نہیں آئی ہے......؟''

''نہیں...... بس ذرا کمر میں جھٹکا لگا ہے تم بے فکر رہو میں گھوڑے پر سفر کرنے کے قابل ہوں''۔ مطیع الدین نے اسے تسلی دی اور گھوڑے کی جانب بڑھ گیا۔

''شاید تمہارا رومال گر گیا ہے''۔ فوئنا جو خان نے برف پر گرے ہوئے کپڑے کے ٹکڑے کو اٹھا کر اس کی جانب بڑھایا۔ مطیع الدین رومال کے نام پر مڑا۔ سفید کپڑے کا چھوٹا سا ٹکڑا فوئنا جو خان کے ہاتھوں میں لہراتا دکھائی دیا۔

''یہ میرا نہیں ہے، تم چاہو تو اپنے پاس رکھ لو...... ورنہ پھینک دو''۔ مطیع الدین نے اس پر اچٹتی سی نگاہ ڈال کر جست لگائی اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ فوئنا جو خان نے اس کی بات پر اس کپڑے کے ٹکڑے کو اپنی آنکھوں کے سامنے لہرایا اور پھر اسے ہوا میں چھوڑ دیا۔ رومال ہوا کے زور سے ان کے آگے کی جانب اڑنے لگا مگر دوسرے ہی لمحے فوئنا جو خان تیزی سے اس رومال کے پیچھے لپکتا دکھائی دیا۔ مطیع الدین اس کی حرکت پر دم بخود سا کھڑا رہ گیا۔



سلطان الملک الکامل بغداد کی تباہی کا حال سن کر نصف راہ سے نہایت سرعت سے واپس میافارقین لوٹ آیا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ ہلاکو خان کا اگلا ہدف وہی بنے گا۔ اس نے تیز رفتاری سے اپنے قلعوں اور شہروں کے استحکام کا انتظام کیا۔ اسی دوران اس نے اپنی ریاست میں موجود تمام خانہ بدوش قبائل کو یہ احکامات

بھجوائے وہ جس قدر جلدی ہو محفوظ و مستحکم مقامات کی جانب کوچ کر جائیں۔ وہ خود میافارقین کے قلعے میں پوری تیاری کے ساتھ تاتاریوں کا انتظار کرنے لگا۔ ہلاکو خان بغداد کی جانب سے جب بے فکر ہو گیا تو اسے الملک الکامل کا خیال آیا۔ اس کے بارے میں اسے خبر مل چکی تھی اس نے بغداد کی جانب پیش قدمی کی تھی مگر بیچ راہ سے ہی لوٹ گیا تھا۔ ہلاکو خان نے اس کی حرکت کو بغاوت قرار دیتے ہوئے اس کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔ اس نے ایک بڑا لشکر اپنے بیٹے بوقا خان کی قیادت میں دیار بکر کی جانب روانہ کیا۔ ایک دوسرا بڑا لشکر دمشق کی جانب سلطان الملک الناصر کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا گیا۔ بوقا خان نے میافارقین کے قلعے پر پہنچ کر محاصرہ کر لیا۔ سلطان الملک الکامل نے وقفے وقفے سے اپنی جنگی حکمت عملی کے مطابق اس پر تابڑ توڑ حملوں سے اُسے بے حد نقصان پہنچایا۔ بوقا خان تین ماہ تک وہیں پڑا رہا۔

تاتاری لشکر میں بڑی بڑی منجنیقیں موجود تھیں، جن سے وہ پتھر اور آگ کے دہکتے گولے قلعے میں پھینکتے۔ سلطان الملک الکامل کے لشکر میں شامل مجاہدین ان پتھروں اور آگ کے گولوں کو نہایت سرعت انگیزی سے اندر نصب کی گئی منجنیقوں کی مدد سے واپس پھینک دیتے۔ یہ عمل تاتاری لشکر کے لئے بڑا حیرت انگیز تھا۔ وہ یہی سمجھتے کہ اندر کوئی ایسی قوت موجود ہے جو ان کے پتھروں اور گولوں کو اندر داخل ہی نہیں ہونے دیتی بلکہ واپس لوٹا دیتی ہے۔ مجاہدین کا طریقہ جنگ بے حد مناسب اور عمدہ حکمت عملی پر مبنی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بوقا خان پوری کوشش کے باوجود میافارقین شہر کے قریب بھی نہیں پھٹک پایا۔ مجاہدین سفید لباسوں میں ملبوس اچانک قلعے سے نمودار ہوتے اور تاتاریوں کی بڑی تعداد کو تہ تیغ کرتے ہوئے واپس لوٹ جاتے۔ ان کے باہر نکلنے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ بوقا خان اس طرز عمل پر کافی پریشان ہونے لگا۔ تین ماہ کی مسلسل کشمکش کے باوجود میافارقین تسخیر نہ ہونے پر ہلاکو خان نے جارحانہ انداز میں اپنے بیٹے بوقا خان اور قابل سالاروں کو ڈانٹا۔

''میں نے تو مسلمانوں کا مرکز اور سب سے مستحکم شہر بغداد صرف ایک ہفتے کی قلیل مدت میں حاصل کر لیا تھا تم کیسے نااہل سالار ہو کہ تین ماہ گذر گئے ہیں اور تم سے ایک چھوٹا سا قلعہ نہیں فتح ہو سکا''۔

بوقا خان اپنے باپ کی سرزنش برداشت نہیں کر سکا اور اس نے کھلے الفاظ میں لکھ بھیجا۔

''پدر محترم! بغداد کی بات نہ کیجئے کیونکہ وہ آپ کی بدعہدی سے حاصل کیا گیا ہے جبکہ مجھے یہاں تلوار چلانا پڑ رہی ہے اور ہر روز سینکڑوں سپاہی ہلاک ہو جاتے ہیں۔ آپ اس مقام کا قیاس بغداد سے نہ ہی کریں تو اچھا ہوگا''۔

جب بوقا خان کا پیغام ہلاکو خان کو ملا تو وہ کھول اُٹھا اور اس نے قاصد کے ہاتھ پیغام بھجوایا۔ ''میرے بیٹے سے کہہ دو کہ وہ میری آنکھوں سے دور رہے ورنہ میں اسے پہلی نظر پڑتے ہی قتل کر ڈالوں گا۔ میں اس امر پر قسم کھاتا ہوں کہ میں تجھے تین دن میں میافارقین فتح کر کے دکھاؤں گا''۔ ہلاکو خان نے قاصد کی روانگی کے فوراً بعد اپنی افواج کو میافارقین کی جانب کوچ کرنے کا حکم دیا۔ اطاعت گذار مسلمان سلطانوں کی افواج ہلاکو خان کی زیر قیادت اپنے اگلے ہدف کی جانب روانہ ہو گئیں۔ اس لشکر میں جہاں تاتاری اور مسلمان موجود تھے، وہیں ان کے شانہ بہ شانہ ایوبی خاندان کے پرانے دشمن ہاسپٹلر اور ٹیمپلرز بھی شامل تھے۔ نصرانیوں کی بڑی جماعت اپنے حکمران ریمنڈ کے ساتھ ہلاکو خان کے لشکر میں شامل تھی۔

ہلاکو خان کے مطیع امیر موصل بدر الدین لولو کا فرزند علاء الدین لولو، اپنے باپ کی جگہ مسلمانوں کے لشکر کی قیادت کر رہا تھا۔ ہلاکو خان کے پہنچنے پر وہاں موجود تاتاری لشکر کے جوش میں بے حد اضافہ ہوا۔ ہلاکو خان نے سب سے پہلے میافارقین کے قلعے کا حدود اربعہ ملاحظہ کیا تو اسے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ اس قلعے کی تسخیر حقیقتاً

مشکل مرحلہ ہے۔ اس نے پہلے دن بھرپور انداز میں قلعے پر سنگ باری کی اور فصیل کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی مگر اندھیرا چھانے تک اسے کوئی بڑی کامیابی نہیں حاصل ہو سکی۔ دوسرے دن بھی کوئی نتیجہ نہ نکل پایا۔ تیسرے دن کی ناکامی کے بعد ہلاکو خان نے یہ سمجھ لیا کہ اس قلعے کی تسخیر مقابلے کی صورت میں ممکن نہیں۔ اس کے لئے کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ اس نے جنگ بندی کا اعلان کر کے تمام افواج کو خیموں میں آرام کرنے کا حکم دے دیا۔ مجاہدین ہلاکو خان کی حکمت عملی پر خاموش ہو گئے۔ وہ اس کی جانب سے پہل کے منتظر تھے۔

والئی موصل سلطان بدر الدین لولو کے فرزند علاء الدین لولو نے تیسرے دن کی لڑائی کے بعد گہری تکان کے بعد اپنے خیمے کی راہ لی اور اپنے کاموں سے فارغ ہو کر بستر میں گھس گیا۔ رات کی آخری ساعت میں اس نے عالم خواب میں دیکھا کہ میافارقین کے قلعے کی فصیل پر ایک نورانی صورت بزرگ بیٹھے ہیں، ان کے لباس کا دامن اس قدر پھیلا ہوا ہے کہ پوری فصیل اس کے حصار میں لپٹی دکھائی دے رہی ہے۔ نورانی چہرہ دیکھ کر علاء الدین ان کی جانب بڑھ گیا اور دریافت کیا۔

''آپ کون ہیں اور یہ سب کیا ماجرا ہے......؟''

''لڑکے......! یہ قلعہ اللہ کی پناہ میں ہے اور اس پر مجھے محافظ مقرر کیا گیا ہے۔ میں اس کا نبی محمدؐ ہوں، تو باز آ جا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر یہاں سے چلا جا''۔

یہ سنتے ہی علاء الدین کے پورے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ ندائے نبوت کی تاب نہ لا سکا اور نیند سے بیدار ہو گیا۔ اس کے پورے بدن پر رعشہ طاری تھا اور کپڑے پسینے سے بھیگ شرابور ہو چکے تھے۔ اس نے اسی وقت اُٹھ کر وضو کیا اور سجدے میں گر کر اپنے گناہ کی معافی مانگی اور صدق دل سے توبہ کی۔ صبح ہونے تک وہ قرآن پاک کی تلاوت کرتا رہا۔ صبح اس نے اپنے لشکر کے سپاہیوں کے سامنے اپنا خواب بیان کیا۔ جس پر مسلمانوں میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ اس نے انہیں دعوت دی کہ وہ سب اس کے ساتھ چلیں کیونکہ یہاں لڑنا گناہ عظیم کے مترادف ہے۔ سپاہیوں نے تاتاری خطرے کی جانب اس کی توجہ مبذول کرائی تو اس نے انہیں اطمینان دلایا کہ تم سب بے فکر رہو، کچھ نہیں ہوگا۔ سپاہیوں کی چھوٹی سی تعداد اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گئی جبکہ باقی ماندہ تاتاری خوف میں اس قدر مبتلا تھے کہ انہوں نے اس کے ساتھ فرار ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ علاء الدین لولو نے انہیں ان کے حال پر چھوڑا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ چپکے سے لشکر گاہ سے باہر نکل آیا وہ تیز رفتاری سے سفر کرتا ہوا بلادِ فلسطین کی جانب بڑھ گیا کیونکہ اسے اس بات کا احساس تھا کہ اس کے لشکر سے نکل جانے پر ہلاکو خان اچھے سے اکھڑ جائے گا اور اس حرکت کو بغاوت قیاس کرے گا۔ اب وہ وقت زیادہ دور نہیں جب اس کا باپ امیر موصل بدر الدین لولو، ہلاکو خان کے عتاب کا شکار ہو جائے گا۔ وہ تیز رفتاری سے سفر کرتے ہوئے بلادِ مصر کی جانب بڑھتا رہا۔ وہاں اس کی بہن ملکہ بدر منیر موجود تھی اس کے پاس وہ محفوظ رہ سکتا تھا۔

ہلاکو خان نے قسم پوری نہ کر سکنے پر اپنی خفت مٹانے کے لئے ایک نیا اعلان کیا۔ اس نے تین دن میں میافارقین فتح کرنے کا دعویٰ کیا تھا جو باطل ثابت ہو چکا تھا۔ اس نے مسلمانوں پر چھائی ہوئی ہیبت کو برقرار رکھنے کے لئے اعلان کیا کہ میافارقین پر تنگری (جاودانی خدا) کی نظر ہے لہٰذا اسے کسی صورت فتح نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں وقت ضائع کرنے کے بجائے کہیں دوسری جانب روانہ ہو جانا چاہئے۔ اس نے اہل قلعہ کو پیغام بھیجا۔

''مجھے صاف دکھائی دے رہا ہے کہ تنگری تمہارے قلعے پر قیام کئے ہوئے ہے اور میں تنگری سے مقابلہ کی سکت نہیں رکھتا۔ میں تنگری کے لئے ایک ہزار گھوڑے، ایک ہزار اونٹ اور ایک ہزار بکریاں بطور صدقہ دیتا

ہوں۔ تم اپنے معتمد احباب قلعے میں سے باہر بھیجو تا کہ وہ مجھ سے یہ سب چیزیں لے لیں''۔

اہل قلعہ پر بغداد کے واقعات عیاں ہو چکے تھے انہوں نے ہلاکو خان کی اس پیشکش کو منافقانہ چال قرار دیتے ہوئے رد کر دیا اور جواباً کہا۔

''ہلاکو خان! ہم تیرے اوچھے ہتھکنڈوں میں نہیں آنے والے ہیں۔ اگر تو سمجھتا ہے کہ تیرا لشکر یہاں مقیم ہے تو اسے اپنی طرف بلا لے کیونکہ ہمارے لئے اللہ ہی کافی ہے۔ اپنے مال و اسباب کو ساتھ لے جا اور کسی جہنم میں پھینک دے ہمیں ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔

ہلاکو خان نے جب یہاں اپنا وار چلتا نہیں دیکھا تو اس نے خاص سالاروں کے ساتھ صلاح و مشورہ کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ فی الوقت اس مقام سے محاصرہ اُٹھا لینا بہتر ہوگا کیونکہ یہ قلعہ بڑے مضبوط قدرتی حصار میں گھرا ہوا ہے اور یہاں کے لوگوں نے بھی پوری تیاری کر رکھی ہے۔ کچھ عرصے بعد اچانک اور مکینوں کی بے خبری کے عالم میں یہاں دوبارہ حملہ کیا جائے تو زیادہ مناسب رہے گا۔ ہلاکو خان دیار بکر سے باہر نکل کر بلادِ شام پر حملہ آور ہوا۔ یہ علاقے کمزور ایوبی سلطانوں کے پاس تھے اس لئے ان کے حصول میں اسے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی انہیں تاراج کرتا ہوا حلب تک پہنچ گیا۔ وہاں خونی کھیل کھیلنے کے بعد حماۃ کی طرف متوجہ ہوا۔ حماۃ کو تباہ و برباد کرنے کے بعد وہ بعلبک کی طرف بڑھ گیا اور تباہی و بربادی کی تاریخ رقم کرتا ہوا صیدا جا پہنچا۔ وہ اپنے پیچھے لاشوں کے ڈھیر لگاتے ہوئے مسرت سے اگلے مقام کی جانب روانہ ہو جاتا۔ صیدا کی شان و شوکت کو تباہ کرنے کے بعد وہ سیدھا دمشق کی جانب بڑھا۔ یہاں اس کا بھیجا ہوا پہلا لشکر محاصرہ کئے بیٹھا تھا۔ دمشق میں الملک الناصر صلاح الدین یوسف ایوبی موجود تھا۔ یہ وقت مسلمانوں پر بے حد سخت تھا۔ تاتاریوں کی تعداد میں اضافہ ہوتے دیکھ کر الملک الناصر نے اپنے اردگرد کے سلطانوں سے مدد مانگنے کی کوشش کی مگر کوئی اس قابل ہی نہیں تھا کہ اس کی مدد کو پہنچ پاتا۔ الملک الناصر نے چوہے بلی کے کھیل کے بجائے مرد میدان بننے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنے لشکروں اور رضاکار مجاہدین کے ساتھ دمشق سے باہر نکلا اور ہلاکو خان پر سامنے کی جانب سے حملہ آور ہوا۔ کئی دن کی مسلسل لڑائی کے بعد الملک الناصر بالآخر شکست کھا گیا۔ اسے گرفتار کر کے بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ اس کی موت کے بعد اس کے اہل و عیال کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ دمشق پر قبضہ کرنے کے بعد تاتاریوں نے اپنی خونخوار عادت کا کھلے عام مظاہرہ کیا۔ قتل عام کے ساتھ ساتھ دمشق کی عمارتوں کو بھی کھنڈرات میں بدل دیا گیا۔ دمشق سے فارغ ہو کر ہلاکو خان الرہا (عدیسہ) کی جانب بڑھا اور وہاں بھی قبضہ کے بعد اپنی عادت کے مطابق تباہی و بربادی کا بازار گرم کر دیا۔ الرہا کو کھنڈرات کا شہر بنانے کے بعد وہ نصیبین کی جانب آیا اور سابقہ روش دہرائی۔ وہاں سے نکل کر اس نے حرّان کا محاصرہ کر لیا۔ اہل حرّان نے ہلاکو خان کی پے در پے کامیابیوں اور سفاکانہ غارتگری کو دیکھتے ہوئے صلاح و امان کے لئے کوشش کی۔ ہلاکو خان نے انہیں امان دیتے ہوئے شہر کے تمام دروازے کھولنے کا حکم دیا۔ اہل حرّان نے امان پاتے ہی خود کو اس کے ہاتھوں میں سونپ دیا اور پھر دروازے کھلتے ہی ہلاکو خان نے بدعہدی سے کام لیا اور تاتاری سپاہیوں کو قتل عام کا حکم دے دیا اور ہنستے بستے شہر حرّان کو بھی ماضی کا مزار بنا دیا گیا۔ ہلاکو خان کی پیش قدمی اور سفاکانہ طریقہ کار سے مسلمانوں میں دہشت کی فضا چھا چکی تھی، کسی میں بھی تاتاریوں کا مقابلہ کرنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔ ہلاکو خان بلادِ شام اور بلادِ شرقیہ کی تسخیر کے بعد بلادِ فلسطین میں داخل ہو گیا۔ وہ زمین کے آخری سرے تک اپنی ہیبت کی دھاک بٹھانا چاہتا تھا۔ ارض فلسطین میں نصاریٰ اس کے حلیف بن گئے اور مسلمانوں کو چن چن کر ہلاک کیا گیا۔ ہلاکو خان نے بغداد کی تسخیر کے صرف دو سال بعد تمام بلادِ شام اور بلادِ شرقیہ کو روند ڈالا تھا۔ وہ بے لگام گھوڑے کی

مانند جدھر چاہتا منہ اُٹھا کر چل پڑتا۔



گل وقوژا اپنے ذہن پر پورا زور دینے کے باوجود اس اجنبی کو پہچاننے میں ناکام رہی۔ اجنبی کے چہرے پر مسکراہٹ بدستور موجود تھی۔ اس کا رویہ کچھ ایسا دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ گل وقوژ کو اس سے خوف محسوس ہوتا۔ کمرے میں چھایا ہوا جمود بالآخر ٹوٹا۔

''تم یقیناً مجھے نہیں جانتی کیونکہ تمہاری میرے ساتھ کبھی ملاقات نہیں ہوئی البتہ میں تمہیں بخوبی جانتا ہوں کہ تمہارا نام گل وقوژ ہے۔ تم منگول سردار توتائی خان کی بیٹی ہو۔ تمہیں تمہارے باپ کے جرم میں زنداں خانے میں بند کر دیا گیا تھا اور جب تمہاری رہائی قریب تھی تو تمہیں پُر اسرار انداز میں قبیلہ سرخ غر میں پہنچا دیا گیا۔ تمہارے سوتیلے نانا منک آنہ نے تمہیں کوہ سرخ غر کے دامن میں آخری رسم کی سزا دی''۔ وہ بولتے ہوئے یکدم خاموش ہو گیا۔ گل وقوژ اس کی آگاہی پر تصویر حیرت بنی بیٹھی رہی۔

''تمگ.....مگ ... مگر تم کون ہو....؟'' گل وقوژ بمشکل بولی۔ اسے اپنے حلق میں کانٹے چبھتے محسوس ہوئے۔ اجنبی اس کے لہجے سے بھانپ گیا۔ اس نے تیزی سے ایک کونے میں پڑی طلائی صراحی اُٹھائی اور کوزے میں پانی انڈیل کر اس کی جانب بڑھا دیا۔ گل وقوژ نے جھجکتے ہوئے انداز میں اس کے ہاتھ سے پانی کا کوزہ لیا اور کچھ توقف کے بعد اسے اپنے لبوں سے لگا لیا۔ اجنبی ایک بار پھر دھیمے سے مسکرا دیا۔

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا''۔

''میرا نام شیخ کبیرالدین ہے''۔

''میرے لئے یہ نام نیا ہے، تم وضاحت کرنا پسند کرو گے کہ تم مجھے کیسے جانتے ہو اور اُس غار سے یہاں کیوں لائے ہو.....؟'' گل وقوژ شاید اب خود کو کسی بھی نئی صورتِ حال سے نپٹنے کے لئے پوری طرح تیار کر چکی تھی۔

''میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ تمہیں یہ بتایا جائے کہ میں تمہیں کیسے جانتا ہوں لیکن پھر بھی میں تمہیں اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہوں گا۔ میں نے تمہیں پہلی بار ازقائی قبیلے میں دیکھا تھا۔ میں وہاں اپنے خاص کام سے گیا ہوا تھا۔ شاید میں تمہیں اتنی اہمیت نہ دیتا مگر سردار مانجی خان کے جسم میں خنجر اتارنے کا تمہارا وہ انداز مجھے بے حد بھایا تھا۔ میں نے اسی وقت یہ ٹھان لیا کہ تم ہی وہ عورت ہو جس میں میری شریک حیات بننے کی اہلیت موجود ہے۔ اس دن کے بعد کے واقعات مجھے ایسے معلوم ہوئے کہ میں سائے کی مانند تمہارے پیچھے پیچھے رہا۔ میں چاہتا تو اس دن تمہاری گرفتاری ہی عمل میں نہ آنے دیتا مگر میں تمہارے بارے میں مزید معلوم کرنا چاہتا تھا، دوسرا مجھے تمہاری اچانک گرفتاری پر خود بھی حیرت تھی۔ بعد میں حالات سے آشنائی کے بعد میں نے تہیہ کر لیا کہ تمہیں ہر حال میں قبیلہ سرخ غر سے نکال لوں گا''۔

گل وقوژ اس کی باتیں سن کر سناٹے میں آ گئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اجنبی یوں اپنی خواہش کا برملا اظہار کر دے گا۔ شیخ کبیرالدین کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے گل وقوژ کے ردعمل کی پرواہ نہیں تھی۔

''تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں تمہاری خواہشات کے مطابق زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہو جاؤں گی.....؟'' گل وقوژ پھنکارتی ہوئی بولی۔

''گل وقوژ.....! مجھے اس قسم کی فضولیات میں پڑنے کی عادت نہیں ہے۔ مجھے جو چیز پسند آ جائے میں

اسے ہر قیمت پر حاصل کر لیتا ہوں۔ میں نے تمہیں دیکھا اور پسند کر لیا، اب تمہیں پا بھی لیا ہے۔ تم قبیلہ سرخ غر کے خیال کے مطابق مر چکی ہو''۔

''اسے پانا نہیں کہتے، سیدھے لفظوں میں کہو کہ تم نے مجھے اغوا کر کے قید میں رکھا ہوا ہے''۔ گل وقوژ لفظ چبا کر بولی۔

''یونہی سہی......!'' شیخ کبیر نے کندھے اچکائے۔ گل وقوژ اس کے انداز پر ہونٹ کاٹنے لگی۔

''کیا میں اس وقت سرائے میں ہوں......؟'' گل وقوژ نے اچانک سوال کیا۔

''مجھے اس سوال کی بڑی دیر سے توقع تھی، تمہیں یہ جان کر شاید دُکھ ہو کہ تم اس وقت سرائے سے ہی نہیں منگولوں کی سرزمین سے بھی ہزاروں کوس دور پہنچ چکی ہو۔ یہ دشوار گذار پہاڑی سلسلے میں بنایا گیا قدیم قلعہ ہے جہاں تم اس وقت موجود ہو''۔

گل وقوژ اس کی بات پر چونک پڑی۔ جانے کیوں اسے شیخ کبیر الدین کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی تشویش دیکھ کر شیخ کبیر الدین نے خود سلسلہ کلام جوڑا۔

''تم بے فکر رہو، میں جلد ہی تمہیں باہر کی دنیا کی سیر بھی کراؤں گا پھر تمہیں میری بات پر یقین آ جائے گا کہ تم اس وقت کہاں موجود ہو''۔

''میں واپس سرائے جانا چاہتی ہوں''۔ گل وقوژ ہمت کر کے بولی۔

''میرے خیال میں تم اتنی بھی نادان نہیں ہو کہ میں تمہاری بات مان لوں گا''۔

''تم میرے ساتھ کچھ ایسا ویسا نہیں کر سکتے......؟'' گل وقوژ کے لرزتے چہرے پر گہرے خدشات بکھر گئے۔

''یہ تو میری مرضی پر منحصر ہے کہ میں کیا کر سکتا ہوں اور کیا نہیں کر سکتا''۔ شیخ کبیر الدین زہریلے لہجے میں بولا۔ گل وقوژ کو یوں لگا کہ جیسے وہ اس کے سامنے بالکل بے بس ہو چکی ہو۔ اس کی ساری قوت و توانائی اس کے جسم سے زائل ہو گئی ہو۔ شیخ کبیر الدین اس کے متغیر چہرے پر طنزیہ نگاہ ڈالتا ہوا مڑا اور دھیرے سے دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ گل وقوژ یوں ساکت و جامد بیٹھی تھی جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ شیخ کبیر الدین دروازے کے پاس پہنچ کر رُکا اور مڑتے ہوئے بولا۔

''اس کمرے میں داخلے اور باہر جانے کا راستہ صرف یہ ایک ہی ہے اور کوئی دوسرا چور دروازہ موجود نہیں جس کے ذریعے تم فرار ہو سکو۔ تم خود کو میری فرمائش کے لئے ذہنی طور پر تیار کر لو۔ میں تمہیں صرف ایک ماہ کی مہلت دوں گا۔ اگر مقررہ مدت گذر جانے کے بعد بھی تم اپنے فیصلے پر نظرثانی کرنے میں ناکام رہی تو مجھے اپنی بات منوانے کے دوسرے تمام طریقے بخوبی معلوم ہیں''۔

شیخ کبیر الدین نے اسے سخت لہجے میں متنبہ کیا اور اگلے لمحے کسی جواب کا انتظار کئے بغیر دروازے سے باہر نکل گیا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ گل وقوژ خاموشی سے دروازے کی جانب گھور رہی تھی۔ اسے شیخ کبیر الدین کی گیدڑ بھبکی کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں تھی بلکہ اسے تو یہ پریشانی لاحق تھی کہ اگر شیخ کبیر الدین کے کہنے کے مطابق وہ واقعی منگولوں کی سرزمین سے اتنی دور پہنچ چکی ہے تو اس کی واپسی کیسے ممکن ہو گی......؟



بیبرس جب قاہرہ پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ کم سن سلطان الملک المنصور کی معزولی کے بعد سیف الدین محمود قطوزی کو بلادِ مصر کا نیا سلطان منتخب کر لیا گیا ہے۔ بیبرس کو اس نئی تبدیلی سے کوئی غرض نہیں تھی کیونکہ وہ عام

سالار تھا۔ امورِ جہانبانی کے پیچیدہ داؤ اور الجھاؤ اس کی سردرد نہیں تھے۔ اسے قاہرہ میں بھی ہر طرف بے چینی اور خوف کی فضا دکھائی دی۔ بغداد اور بلادِ شرقیہ سے لوگ ہجوم در ہجوم بلادِ مصر چلے آ رہے تھے۔ ہر آنے والا قافلہ تاتاریوں کے ظلم و ستم کی نئی داستانیں ساتھ لا رہا تھا۔ دن بدن تاتاریوں کی پیش قدمی اور ہنستے بستے شہروں کی تباہی کا حال بلادِ مصر پہنچ رہا تھا۔ اُجڑے اور بدحال مسلمانوں کے قافلوں کی آمد دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ لوگ بلادِ مصر کو محفوظ خیال کر رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ تاتاریوں کے لئے یہ مقام خاصا دور تھا اور ان دونوں کے درمیان بلادِ فلسطین میں موجود ریگستان کا پھیلا ہوا علاقہ حائل تھا۔

قاہرہ پہنچنے کے بعد بیبرس نے سب سے پہلے امیر فارس الدین اقطائی سے ملاقات کی جو کہ مصری مملوک افواج کا سالارِ اعلیٰ تھا۔ بیبرس نے اس کے ساتھ تاتاریوں کی ہلاکت خیزی اور بغداد کی تباہی کے بارے میں تفصیلی بات چیت کی اور اس پر زور دیا کہ وہ سلطان الملک المظفر پر زور دے کہ مصری افواج کو بلادِ شام و شرقیہ کی جانب روانہ کیا جائے تاکہ تاتاریوں کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکا جا سکے۔ امیر فارس الدین اقطائی نے بیبرس کی تجویز کو ناقابلِ عمل قرار دیا اور یہ جواب دیا کہ سلطان الملک المظفر اس امر کی اجازت کبھی نہیں دے گا کہ مصری افواج کو بلادِ شرقیہ میں بھیجا جائے۔ بیبرس اس کی بات سن کر بجھ سا گیا۔ امیر فارس الدین اقطائی نے اس کی مایوس صورت دیکھی تو اس سے وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں سلطان الملک المظفر سے بات کرے گا۔ بیبرس نے اس کی بات پر خواہش ظاہر کی کہ وہ اگر اس کے سامنے سلسلہ چھیڑے تو زیادہ موزوں ہو گا۔ امیر فارس الدین اقطائی نے بیبرس کو ہدایت کی کہ یہ معاملہ خلوت میں چھیڑا جانے والا نہیں ہے، وہ اسے کل شاہی دربار میں مناسب موقع پا کر چھیڑے گا لہٰذا بیبرس دوسرے امرأ کو بھی اپنی بات پر قائل کر لے تو زیادہ بہتر ہو گا۔ سلطان الملک المظفر دوسرے درباری امرأ کے اصرار پر اس سلسلے میں غور کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ بیبرس نے امیر فارس الدین اقطائی کا شکریہ ادا کیا اور اپنی دوستی کا واسطہ دیا کہ وہ اس معاملے میں پہلوتہی سے کام نہ لے۔ امیر فارس الدین اقطائی نے اس کی ڈھارس بندھائی اور اس کے جذبے کو سراہا۔

دوسرے دن شاہی دربار میں جب سلطان الملک المظفر سیف الدین محمود قطوزی موجود تھا تو امیر فارس الدین اقطائی نے بیبرس اور دیگر امرأ کی موجودگی میں تاتاریوں کا معاملہ چھیڑ دیا۔ تاتاریوں کا ذکر شروع ہوتے ہی دربار میں اضطراب پیدا ہو گیا۔ درباری امرأ کے کھلے ہوئے چہرے پل بھر میں ہراساں دکھائی دینے لگے۔ کئی امرأ نے بے موقع تاتاریوں کا ذکر چھیڑنے پر امیر فارس الدین اقطائی کو دل میں برا بھلا کہا۔

''امیر فارس الدین...... ! تمہارا اشارہ جس جانب ہے ہم اسے بخوبی سمجھ سکتے ہیں ذرا صبر سے کام لو ابھی وہ وقت نہیں آیا''۔ سلطان الملک المظفر نے جواب دیا۔

''سلطان محترم......!'' فارس الدین اقطائی نے کہا۔ ''بغداد اور بلادِ شرقیہ کے متاثرہ شہروں کی حالت زار پر محض آنسو بہانے یا ڈھارس بندھا دینے سے مسلمانوں کی حفاظت نہیں کی جا سکتی ہے۔ ہمیں اس امر کی ضرورت ہے کہ خود آگے بڑھ کر تاتاری یورش کا راستہ روکیں اور ان کے ناپاک عزائم ناکام بنا کر انہیں واپس لوٹنے پر مجبور کریں''۔

''میں تم سے زیادہ بہتر انداز میں تاتاریوں کو سمجھ سکتا ہوں ان پر آگے بڑھ کر حملہ آور ہونا سراسر خودکشی کے مترادف ہو گا اور میں بلادِ مصر کے مسلمانوں کو ایسی خودکشی کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا''۔ سلطان الملک المظفر نے جواب دیا۔

''سلطان محترم...... !'' بیبرس خاموش نہ رہ پایا۔ ''مسلمان صرف بلادِ مصر میں نہیں بستے، بلادِ شرقیہ اور

شام میں بسنے والے بھی مسلمان ہیں۔ ان کی حفاظت کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ کل تک امیر المومنین خود موجود تھے مگر آج ایسا نہیں ہے۔ لوگ ہر اس سلطان کی جانب ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں جو عسکری اہلیت کا حامل ہے اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اقتدار سونپا ہے تو آپ بھی اس کی مخلوق کی حفاظت میں پوری تندہی کا مظاہرہ کیجئے''۔

''مجھے حکومت کی کوئی خواہش نہیں ہے بیبرس......!'' سلطان الملک المظفر کا لہجہ سخت تھا۔ ''شاید تمہیں ایسا لگتا ہے کہ میں مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں ہوں مگر ایسی کوئی بات نہیں۔ میں اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ تاتاریوں کا بھی کوئی خوف میرے دل میں نہیں ہے۔ میں صرف اس امر کو وجود میں آنے سے روک رہا ہوں جو ماضی میں بار بار ہماری تباہی کا موجب بنتا آیا ہے۔ اگر سلطان علاء الدین محمد خوارزم شاہی حکومت کا خیر خواہ ہوتا تو وہ تاتاریوں کو اپنی سلطنت میں گھسنے کا موقع نہ دیتا۔ چنگیز خان نے حق وانصاف کے نام پر ان مجرموں کو طلب کیا تھا جو بدعہدی کے مرتکب ہوئے تھے۔ سلطان علاء الدین محمد نے طاقت وغرور کے نشے میں وحشی تاتاریوں کو بے ننگ وبے مرام سمجھا اور ان کے خروج کو معمولی سمجھا۔ تاتاریوں کو چھیڑنا اس کے لئے عذاب بن گیا۔ سلطنت ختم ہوگئی۔ بارونق اور تہذیب یافتہ شہر کھنڈرات میں بدل گئے۔ کیا تم لوگ بھی یہ چاہتے ہو کہ میں ان لوگوں کو دعوت مبارزت دے کر ان کا رُخ بلادِ مصر کی جانب پھیر دوں تاکہ وہ دندناتے ہوئے یہاں پہنچیں اور بلادِ مصر کے حسن ورونق کو بھی داستان پارینہ بنا ڈالیں''۔

''سلطان محترم......! اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ انہیں بالکل ہی بے لگام چھوڑ دیا جائے کہ وہ جہاں چاہیں اپنے جارحانہ قوانین کے مطابق تباہی وبربادی پھیلاتے رہیں''۔ امیر فارس الدین اقطائی نے احتجاج کیا۔

''اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم ان پر چڑھائی کر کے انہیں دبالو گے تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ وہ تعداد میں تم سے کئی گنا زیادہ ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ ان کے سامنے موجود سپاہی ان کی سفاک صورتیں دیکھ کر ہی ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ خوفناک اور بدشکل ہیں بلکہ اُن کے چہروں پر ملک الموت کی مہریں ثبت ہیں۔ تاتاری انسانی مخلوق نہیں ہیں، وہ عذاب الٰہی ہیں''۔ سلطان الملک المظفر نے کہا۔

''سلطان محترم......! اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کل جب تاتاری لشکر بلادِ مصر کی جانب بڑھیں گے تو آپ انہیں خوش آمدید کہہ کر تخت وتاج ان کے قدموں میں ڈال دیں گے اور قوم کو یہ کہہ کر قتل ہونے کی ہدایت کریں گے کہ عذاب الٰہی کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں ہے لہٰذا خاموشی سے اپنی جانیں تاتاریوں کے حوالے کردو''۔ بیبرس کا لہجہ بے حد جارحانہ تھا۔

''بیبرس آداب شاہی کو ملحوظ رکھو۔ تم ایک اچھے سالار ہو اور میں نہیں چاہتا کہ تمہیں اتنے معمولی جرم پر قتل کی سزا سناؤں''۔ سلطان الملک المظفر اپنا غصہ دباتا ہوا بولا۔

''سلطان محترم......! میں بیبرس کی گستاخی پر معذرت خواہ ہوں''۔ امیر فارس الدین اقطائی جلدی سے بولا۔ ''آپ چونکہ لگاتار بیتے ماضی کی بات کر رہے ہیں جس پر کسی بھی جذباتی مسلمان کا طیش میں آجانا بے موقع نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کا کہنا درست ہو مگر اس سے پہلے کہ جب اس عذاب کا رُخ ہماری جانب مڑ جائے، ہمیں اس سے نپٹنے کے لئے کوئی نہ کوئی لائحہ عمل تجویز کر لینا چاہئے''۔

''میں دربار میں موجود ہر شخص کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ وہ بے فکر ہو کر گھر جائے، وقت پڑنے پر میں خود میدان میں اتروں گا۔ پہل کرنا کسی بھی لحاظ سے مناسب نہیں ہے۔ اگر آج ہم نے ایسا کوئی قدم اُٹھایا تو ہلاکو

خان کو فوراً اس کی بھنک پڑ جائے گی اور اس کے لشکر بلادِ شرقیہ کو چھوڑ چھاڑ کر بلادِ مصر پر چڑھ دوڑیں گے۔ ہمیں ابھی اس امر کا انتظار کرنا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اور تاتاریوں کے درمیان کیا فیصلہ کیا ہے......؟'' سلطان الملک المظفر نے کہا۔

''سلطان محترم......! جب تک آپ کسی عملی قدم کا حکم جاری نہیں فرمائیں گے تو کیسے معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا امر کیا ہے......؟'' ایک درباری نے اُلجھے لہجے میں عرض کیا۔

''میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب چنگیز خان نے خوارزم شاہی ریاست پر حملہ کیا تو وہ بلادِ عراق کی سرحدوں سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ ممکن ہے کہ ہلاکو خان بھی بلادِ شرقیہ تک ہی محدود رہے اور اس کا مزید پیش قدمی کرنے کا ارادہ نہ ہو۔ جب تک وہ خود اپنے عزائم کا اظہار نہیں کرتا، ہمیں خاموش رہ کر دانشمندی کا ثبوت دینا ہوگا۔ اگر ہلاکو خان بلادِ شرقیہ کی فتح کے بعد مطمئن ہو جائے تو کیا ضرورت پڑی ہے کہ اسے خود دعوت دی جائے کہ بلادِ شرقیہ کے دوسری جانب بلادِ مصر بھی اس کے منتظر ہیں''۔

''سلطان محترم......! بات بلادِ مصر کی نہیں تھی بلکہ ان مسلمانوں کی کی جارہی ہے جو تاتاریوں کے ہاتھوں تختۂ مشق بن رہے ہیں اور ان وحشیوں کے ظلم وستم کا شکار ہونے والے لوگوں کو ہماری مدد کی اشد ضرورت ہے۔ اپنے دین کی خاطر ہمیں فوری طور پر ان کی مدد کے لئے اُٹھنا ہوگا''۔ بیبرس نے سلسلہ کلام آگے بڑھایا۔

''تم لوگ میری بات سمجھ کیوں نہیں رہے، تم اپنے تئیں یہ کیوں قیاس کئے بیٹھے ہو کہ میرے دل میں اُن ستم زدہ بھائیوں کے لئے جذبہ ہمدردی موجود نہیں ہے۔ میں ان کی مدد کرنا چاہتا ہوں مگر یہاں بسنے والوں کا حق مجھ پر زیادہ ہے، انہوں نے مجھ پر اعتماد کیا ہے اور مجھے سلطنت کا سارا انتظام سونپ دیا ہے۔ میں انہیں کسی ایسے خطرے سے دوچار نہیں کرنا چاہتا کہ وہ ساری زندگی مجھے بددعائیں دیتے رہیں اور خود بھی پچھتاوے کی آگ میں جلتے رہیں۔ تاتاریوں پر یلغار کرنے کا سیدھا مطلب یہی ہے کہ ان کو بلادِ مصر میں باقاعدہ دعوت دے دی جائے''۔

''سلطان محترم......!'' ایک درباری امیر نے مداخلت کی۔ ''آپ اگر یہ یقین کئے ہوئے ہیں کہ تاتاری اس جانب کا رُخ کبھی نہیں کریں گے تو یہ سوچ غلط ہوگی۔ تاتاریوں کا بغداد اور پھر بلادِ شام وشرقیہ کی طرف پیش قدمی کرنا یہی ظاہر کرتا ہے کہ آنے والے دنوں میں وہ ضرور بلادِ مصر کو نگلنے کی کوشش کریں گے''۔

''تم لوگ اطمینان رکھو۔ تمہارے سلطان کو شمشیر زنی کا فن بخوبی یاد ہے۔ جب کوئی تاتاری ہماری جانب آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی کوشش کرے گا تو اس وقت اسے ایسا بھرپور جواب دیا جائے گا کہ تاتاری ہمیشہ کے لئے پیش قدمی کے اسباق بھول جائیں گے''۔ سلطان الملک المظفر نے مستحکم لہجے میں جواب دیا۔

''یعنی ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ آپ بلادِ شرقیہ کے مسلمانوں کے کندھوں سے کندھے ملانے سے کترا رہے ہیں......؟'' بیبرس نے تلخی سے کہا۔

''میں تمہارے جذبات سے خوب واقف ہوں مگر میں اپنی رعایا کو کسی بھی کڑے امتحان میں ڈالنے سے گریز کروں گا۔ تم بے فکر رہو جب تاتاری اس جانب رُخ کریں گے تو میں اس ذمہ داری کا حصہ دار تمہیں ضرور بناؤں گا''۔ سلطان الملک المظفر نے یہ کہہ کر دربار برخاست کرنے کا حکم دے دیا۔ وہ بحث کو مزید طول نہیں دینا چاہتا تھا کیونکہ اس نے دربار میں موجود امراء کے طبقے میں ان کے چہروں پر ناپسندیدگی کے تاثرات پڑھ لئے تھے۔

یہ حقیقت تھی کہ امراء کا ایک طبقہ سلطان الملک المظفر کی اس دُہری روش سے سخت مایوس ہوا تھا۔ ان میں زیادہ تر مملوک امراء شامل تھے۔ چونکہ ان لوگوں کی تربیت شروع سے ہی عسکری انداز پر کی گئی تھی، اس لئے

ان کی نگاہ میں دشمن کو خواہ مخواہ نقصان پہنچانے کا موقع دینا سراسر حماقت کے مترادف تھا۔ مملوک امرأ کے علاوہ مصری امرأ بھی اپنے سلطان کی اس مصلحت پر ناخوش تھے ان میں خصوصاً وہ لوگ شامل تھے جو ماضی میں ایوبی سلطانوں کے شانہ بشانہ صلیبی لشکروں سے نبرد آزما رہ چکے تھے۔

بیبرس کو سلطان الملک المظفر کے رویئے سے سخت مایوسی ہوئی۔ وہ جو کچھ سوچ کر واپس قاہرہ لوٹا تھا، سب کچھ اس کے برعکس ہو رہا تھا۔ اس کے پاس تاتاریوں سے مقابلہ کرنے کا جذبہ بے تحاشا تھا مگر عسکری قوت سلطان الملک المظفر کے پاس محکوم تھی۔ اُس کے ہر حکم کی پیروی کرنا اس کی مجبوری بن چکا تھا۔ امیر فارس الدین اقطائی نے بیبرس کو دربار سے نکلنے کے بعد سمجھانے کی کوشش کی مگر بیبرس ناکامی کے غم میں اس قدر رنجیدہ حال تھا کہ وہ اس کی بات سنے بغیر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ وہ کسی ایسی جگہ جانا چاہتا تھا جہاں اُسے دو پل سکون کے نصیب ہو جاتے۔ بلادِ شرقیہ کے سلطان الملک الناصر اور بلادِ مصر کے سلطان الملک المظفر میں اسے کوئی فرق دکھائی نہیں دیا۔ دونوں کی سوچ غلط اور ناپختہ تھی۔ سلطان الملک الناصر اپنی ہٹ دھرمی کے باعث تاتاریوں کے ہاتھوں اپنے انجام تک پہنچ چکا تھا۔

سلطان الملک المظفر کی بدستور خاموشی سے تاتاریوں کو تقویت حاصل ہوئی۔ وہ بلادِ فلسطین پر غارتگری میں سابقہ حدیں بھی پار کر گئے۔ بلادِ فلسطین میں کسی بڑے مدمقابل کو نہ پا کر وہ اب بلادِ مصر کی جانب دیکھنے لگے، جو چھونے سے ریگستان کے دوسری جانب بڑا خوشحال اور سرسبز خطہ تھا۔ تجارت کی غرض سے اس جانب آنے والے تاتاری تاجروں نے ہلاکو خان کے سامنے اس سرزمین کی تعریف و توصیف میں ایسے قلابے ملائے کہ وہ بھی سنجیدگی سے اس جانب پیش قدمی کے بارے میں سوچنے لگا۔



فونا جو خان کو اُس بے کار سے ٹکڑے کے پیچھے یوں بھاگتا دیکھ کر مطیع الدین پریشان ہو گیا۔ وہ اس کی اچانک حرکت کو کوئی نام نہیں دے پایا۔ اس نے بلند آواز میں اسے اپنی جانب متوجہ کرنا چاہا مگر وہ پاگلوں کی طرح گرتا پڑتا بھاگ رہا تھا۔ کپڑے کا ٹکڑا ہوا کی تیزی کے باعث اس کے آگے آگے اُڑتا رہا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے فونا جو خان اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ ہوا میں تیزی کے ساتھ ساتھ برف باری کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔ مطیع الدین نے لمحہ بھر میں فیصلہ کر لیا کہ اسے وہاں رُکنے کے بجائے اس کے تعاقب میں جانا چاہئے۔ اس نے اپنے گھوڑے کو حرکت دی اور دوسرے دونوں گھوڑوں کی باگیں پکڑیں اور فونا جو خان کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ کپڑے کے اس ٹکڑے نے فونا جو خان کی کافی دوڑ لگوا دی تھی۔ کچھ دور جانے کے بعد مطیع الدین کو فونا جو خان زمین پر اوندھا پڑا دکھائی دیا۔ اس نے تیزی سے گھوڑوں کو اس کی جانب بڑھایا۔ فونا جو خان کے قریب پہنچتے ہی وہ چھلانگ لگا کر گھوڑے سے نیچے اترا۔ تینوں گھوڑوں کی باگیں کھینچتے ہوئے وہ فونا جو خان کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ ہوا کی تیزی اور برف باری کے باعث گھوڑے بری طرح ہنہنا رہے تھے۔ اگر مطیع الدین سے ذرا بھی چوک ہو جاتی تو گھوڑے منہ اُٹھائے کسی بھی طرف بھاگ سکتے تھے۔ مطیع الدین نے فونا جو خان کا کندھا ہلا کر اسے اُٹھانے کی کوشش کی۔ کندھے پر دباؤ پا کر فونا جو خان کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے اپنا چہرہ گھمایا اور مطیع الدین کی جانب دیکھا۔ فونا جو خان کا چہرہ سپید دکھائی دے رہا تھا۔ دوڑنے کے باعث اس کی سانس پھول چکی تھی۔ اس نے بمشکل ہاتھ اُٹھا کر اپنی خیریت سے آگاہ کیا۔

''جب تمہیں معلوم ہے کہ تمہارا بھاری بھر کم جسم تمہیں یوں دوڑنے کی اجازت نہیں دیتا تو کیا پڑی تھی کہ اس کپڑے کے پیچھے بھاگنے کی؟'' مطیع الدین نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔

''ٹھہرو......! ذرا سانس سنبھلنے دو، ابھی بتاتا ہوں''۔ فونا جو خان نے تیز تیز سانس لیتے ہوئے کہا۔

''ویسے مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم برف پر بھاگنے میں بھی خاصے ماہر ہو''۔ مطیع الدین نے کہا۔ فونا جو خان اس کی بات پر مسکرانے لگا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ اُٹھا اور کپڑوں سے برف جھاڑنے لگا۔

''برف باری بڑھ رہی ہے ہمیں جلد ہی کسی محفوظ مقام پر پہنچنا چاہئے''۔ مطیع الدین نے موسم کی خرابی کو بھانپتے ہوئے کہا۔

''بے فکر رہو......! ہم آسانی سے اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔ یہ برف باری زیادہ دیر تک جاری نہیں رہے گی، البتہ اس کے خاتمے پر ہی اصل پریشانی کا آغاز ہوگا''۔ فونا جو خان نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''کیسی پریشانی......؟'' مطیع الدین اس کی بات پر چونک پڑا۔

''سرد ہوا کی پریشانی...... برف باری کے بعد ہمیشہ ایسی سرد ہوائیں اُٹھتی ہیں کہ آدمی ان میں ٹھٹھر کر ہی جان گنوا بیٹھتا ہے۔ میں نے آتے ہوئے راستے میں ایک ایسا مقام دیکھا تھا جہاں ہم کچھ وقت قیام کر سکتے ہیں۔ برف باری کے خاتمے سے پہلے پہلے یقیناً ہم وہاں تک پہنچ جائیں گے''۔ فونا جو خان نے اسے آگاہ کیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر اس کپڑے کا کیا بنا جس کے پیچھے تم بھاگے تھے......؟'' مطیع الدین کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ فونا جو خان نے اس کی بات سن کر مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ کپڑے کا ٹکڑا اس کی مٹھی میں دبا دکھائی دے رہا تھا۔ لہراتے کپڑے کو دیکھ کر مطیع الدین کا تجسس بڑھ گیا۔ اس نے کپڑا فونا جو خان کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ غور سے اسے دیکھنے لگا۔ کپڑے کا یہ چھوٹا ٹکڑا خود رومال نہیں تھا بلکہ کسی بڑے کپڑے کا پھٹا ہوا حصہ تھا۔ مطیع الدین نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا تو اس میں کوئی ایسی بات نہیں دکھائی دی جو کسی اہمیت کی حامل ہوتی۔ کچھ نہ پا کر مطیع الدین نے فونا جو خان کی جانب متجسس نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ فونا جو خان سمجھ چکا تھا کہ مطیع الدین بھی اس میں وہ چیز نہیں دیکھ پایا جو اس کی نگاہوں میں آ چکی تھی۔

''اسے اپنے سامنے پھیلا کر اس میں آر پار دیکھنے کی کوشش کرو''۔ فونا جو خان نے اسے ہدایت کی۔ مطیع الدین نے کپڑے کے ٹکڑے کو دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے اپنے سامنے پھیلا لیا۔ کپڑے میں دکھائی دینے والی مخصوص چمک سے لمحہ بھر کے لئے اس کی پتلیاں پھیلنے لگیں۔ جس کپڑے کو اس نے غیر اہم سمجھ کر پھینکنے کے لئے کہا تھا، اس میں بڑی حیرت انگیز چیز موجود تھی جو اتفاق سے فونا جو خان کو دکھائی دے گئی تھی۔



الملک المظفر سیف الدین قطوزی بظاہر امرائے مصر اور عمائدین سلطنت کو اپنے بھرپور حفاظتی انتظامات سے مطمئن کر چکا تھا کہ تاتاری فتنہ بلادِ مصر کا رُخ نہیں کرے گا مگر ان کے بڑھتے ہوئے سیل کو دیکھ کر اس کے دل و دماغ میں سنگین خدشات جڑیں پکڑتے جا رہے تھے، اس کے ذہن کے پردوں پر اُس عجیب اور پُرخوف خواب کے مناظر ہر وقت متحرک رہتے۔ یہ وہم بھی اس کے دل میں گھر کر چکا تھا کہ اب وہ وقت زیادہ دور نہیں، جب اس کا ناطہ ہمیشہ کے لئے رشتۂ حیات سے کٹ جائے گا۔ خواب میں دکھائی دینے والے سفید پرندوں کے غول میں سے نکلنے والا وہ پرندہ جس کی آنکھ میں الملک المظفر کو کرنج کی جھلک دکھائی دی تھی، ہر لمحے ستاتا رہتا۔ سلطان الملک المظفر کی الجھی ہوئی حالت دوسروں کی نگاہ سے پوشیدہ نہ رہ پائی۔ اس کے عمائدین یہ بخوبی محسوس کر سکتے تھے کہ سلطان الملک المظفر روزانہ موصول ہونے والی تاتاریوں کی پیش قدمی کی خبروں کے باعث سخت ہیجان کا شکار ہے اور وہ ہر وقت بلادِ مصر کو متوقع خوفناک تباہی سے بچانے کے لئے گہری سوچ و بچار میں منہمک رہتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی، عمائدین اور امرأ اس کی دربار شاہی میں ذہنی عدم موجودگی پر تبصرہ نہیں کرتے تھے۔

سلطان الملک المظفر نے ہر قسم کے حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے مملوک افواج کو مکمل تیاری کا حکم دے دیا۔ اُدھر ہلاکو خان ارضِ فلسطین پر قابض ہونے کے بعد تاجروں اور دوسرے حلیفوں سے بلادِ مصر کے جملہ کوائف معلوم کرنے میں مصروف تھا۔ بلادِ شام، بلادِ شرقیہ اور بلادِ فلسطین اس کی بربریت کا نشانہ بن کر تباہ و برباد ہو چکے تھے۔ ان علاقوں کی تباہی اور ہلاکو خان کی لگاتار فتوحات کے پیچھے کس حد تک مسلمان غداروں کا ہاتھ بھی شامل تھا جو ہلاکو خان سے انعام و اکرام پانے کے حریص تھے۔ ہلاکو خان نے انہیں ابن علقمی کی طرح مایوس نہیں کیا بلکہ تباہ حال شہروں کے انتظام کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں تھما دی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ تاتاریوں کو ایسے شہروں میں نہیں رکھنا چاہتا تھا، جن کا حدود اربعہ انہیں صحیح طرح معلوم نہیں تھا۔ بغداد میں تاتاری دستوں کی ہلاکت کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا کہ شہروں کی تباہی اور رعیت کے خاتمے کے بعد انہیں اپنے خاص ''حلیفوں'' کے حوالے کر دینا زیادہ بہتر اقدام ہوگا۔ اس طرح وہ اس کے احسان تلے دبے رہیں گے اور کسی طرح کی سرکشی و شورش کا اندیشہ بھی باقی نہیں رہے گا۔ یہ طریقہ کار صرف بڑے اور معروف شہروں کے لئے مستعمل تھا جبکہ چھوٹی آبادی والے شہروں اور قصبوں کو سرے سے ہی مٹا دینا تاتاری اپنا اولین فرض سمجھتے تھے۔

بچے کھچے تارکین وطن تیزی سے بلادِ مصر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ قاہرہ ان کی امید کا آخری سہارا تھا۔ تاریخ دانوں نے قاہرہ کے بارے میں یہ بیان کیا ہے کہ تارکین وطن کی تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ مکانات میں ان کے لئے جگہ کم پڑ گئی۔ وہ لوگ گلی کوچوں میں زندگی کے باقی ایام بسر کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ سلطان الملک المظفر نے تباہ حال تارکین وطن کے لئے مختلف اقدام اُٹھائے۔ ان کی رہائش کے لئے تمام سراؤں اور مسافر خانوں کو مختص کر دیا گیا مگر ان کی بڑھتی ہوئی تعداد نے سب کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر یہ سلسلہ ایسے ہی جاری رہا تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ مقامی آبادی کو کھانے پینے کے لالے پڑ جائیں گے۔ ویسے بھی بلادِ مصر اکثر و بیشتر قحط سالی کا شکار رہنے والا خطہ تھا۔ امرا و عمائدین نے اس مرحلے پر یہ عرض گوش گذار کی کہ باہر سے آنے والے لوگوں کو قاہرہ کے بجائے دوسرے مقامات کی جانب جانے کا حکم دیا جائے۔ سلطان الملک المظفر نے جلد ہی تارکین وطن کو قاہرہ کے اطراف میں منتقل ہونے کا حکم جاری کر دیا۔ اس حکم کی کیا تعمیل ہوتی کہ قاہرہ سے باہر بھی تارکین وطن ہر سُو پھیلے ہوئے تھے۔ شہروں اور قصبوں میں تل دھرنے کی جگہ باقی نہیں تھی۔ ان لوگوں کی زبانی جب تاتاریوں کی سفاکی کے قصے عام ہونے لگے تو مقامی رعیت میں خوف و ہراس پیدا ہونے لگا۔ یہ فضا بلادِ مصر کے لئے کسی بھی طرح موزوں نہیں تھی۔ مملوک امرا نے تیزی سے اس بارے میں عملی اقدام اُٹھائے اور تارکین وطن کو ایسے فسانے سنانے سے سختی سے منع کیا۔ ان سب تدبیروں کے باوجود یہ عالم تھا کہ مقامی اور باہر سے آئے ہوئے لوگ سب روزانہ یہی قیاس آرائیاں کرتے کہ آنے والی صبح کو ضرور تاتاری سپاہی شہر کے باہر گشت کرتے دکھائی دیں گے۔

سلطان الملک المظفر کے لئے یہ حالات کافی پریشان کن تھے، وہ ایک جانب اپنی ذہنی حالت سے نبرد آزما تھا تو دوسری طرف اسے قاہرہ میں پیدا ہونے والی پیچیدگی کا سامنا تھا۔ اسے ہر دم یہ دھڑکا لگا رہتا کہ تارکین وطن کے بھیس میں کہیں تاتاری ہی قاہرہ میں داخل نہ ہو جائیں۔ اس نے کئی حکم جاری کئے۔ جاسوسی کے نظام کو یہاں تک فعال بنایا کہ ہر ساعت کی خبر اس تک پہنچ جاتی۔ طویل عرصے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ امرائے مصر اور مملوک عمائدین دونوں ہی پورے خلوص و دیانتداری سے سلطان الملک المظفر کا مکمل ساتھ دے رہے تھے۔



برقائی خان اپنے زریں خیل دستوں کی تیاری کے مکمل ہونے کی اطلاع پا کر شاہی محل سے نکل کر عسکری

چھاؤنی کی جانب بڑھ آیا۔ برقائی خان کے پاس ہلاکو خان کی قیامت خیزی کی خبریں مسلسل پہنچ رہی تھیں۔ ہلاکو خان دینِ نصرانیت کی خدمت کے نشے میں دیوانہ ہو چکا تھا۔ برقائی خان کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ خود آگے بڑھ کر ہلاکو خان کو للکارتا۔ برقائی خان نے اپنے امرا و عمائدین کو اعتماد میں لے کر ہلاکو خان کو منہ توڑ جواب دینے کا فیصلہ کر لیا۔ سلطنت اردوئے زریں کے امرا میں بھی ہلاکو خان کی تباہ کاریوں نے بے چینی کی فضا پیدا کر دی تھی۔ ان کے نزدیک کسی قصور کے بغیر اتنی بڑی تعداد میں خلقت کو قتل کر دینا منگولوں کے نام پر بدنما دھبے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ چنگیز خان کی سلطنت خوارزم پر یورش کے پیچھے انتقامی عنصر غالب تھا جبکہ ہلاکو خان کی اس یورش کے پیچھے انہیں کوئی واضح وجہ دکھائی نہیں دی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے ہی بھائیوں اور رشتہ داروں کے خلاف برقائی خان کے پرچم تلے جمع ہو گئے تھے۔

برقائی خان جب فوجی چھاؤنی میں پہنچا تو منگول سپاہی عسکری مشقوں میں مصروف دکھائی دیئے۔ یہ چھاؤنی کیا تھی؟ سرائے شہر کے باہر ایک بڑا پتھریلا میدان تھا جہاں زرد خیموں کا بڑا شہر آباد تھا۔ سرائے میں پختہ مکانات کی کمی کے باعث زیادہ تر لوگ خیموں میں ہی مقیم تھے اور بازار بھی خیموں کی قطاروں میں واقع تھے۔ شہری آبادی کے خیموں کے رنگ عموماً سفید اور خاکی تھے۔ صرف شاہی عمائدین اور چھوٹے سرکاری دفاتر کے خیموں کا رنگ زرد تھا، کسی عام شہری کو اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ وہ زرد رنگ کے خیموں کا استعمال کرے۔

برقائی خان کی چھاؤنی میں آمد کی خبر پا کر منگول سپہ سالار عبداللہ انائی خان تیزی سے اس جانب لپکا۔ عبداللہ انائی خان تھوڑا عرصہ پہلے دائرہ اسلام میں داخل ہوا تھا۔ یہ برقائی خان کے باپ توشی خان کا وفادار امیر تھا۔ اس نے ہند و عجم میں ہونے والے جنگی معرکوں میں اپنی قابلیت و شہ زوری کے جوہر دکھائے تھے۔ برقائی خان کے حکمران بننے پر وہ بغیر کسی دباؤ کے مسلمان ہو گیا اور برقائی خان کو عبداللہ انائی خان کا انداز اس قدر بھایا کہ اس کے بے لوث جذبے کو سراہتے ہوئے اُسے اردوئے زریں کی تمام افواج کی کمان سونپ دی۔

''قاآن اعظم کو خادم خوش آمدید کہتا ہے''۔ عبداللہ انائی خان نزدیک پہنچتے ہوئے بولا۔

''تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں، میں ہر قیمت پر کل صبح نکل جانا چاہتا ہوں''۔

''میں نے سب انتظامات مکمل کر دیئے ہیں، ہم کل صبح روانہ ہوں گے اور انشاء اللہ سات دن میں سمرقند پہنچ جائیں گے۔ سمرقند پہنچ کر ہمیں مرو کی جانب بڑھنا ہوگا۔ ممکن ہے کہ مرو پہنچنے کی نوبت ہی نہ آئے، راستے میں کسی مقام پر ہلاکو خان سے سامنا ہو جائے''۔ عبداللہ انائی خان نے بتایا۔ برقائی خان اس کی بات پر کسی سوچ میں پڑ گیا۔

''قاآن اعظم! میں نے سپاہیوں کو خاص تیاری کروائی ہے مجھے امید ہے کہ وہ ہماری توقع سے کہیں تیز رفتاری سے سفر کریں گے۔ تمام بیمار اور سست رفتار گھوڑے علیحدہ کر دیئے گئے ہیں، آپ کا ساتھ پا کر سپاہیوں میں خاصا جوش دیکھنے میں آ رہا ہے''۔

''وہ سب ٹھیک ہے، تمہیں مخبروں کو پوری طرح چوکس رکھنا ہوگا، مجھے اندیشہ ہے کہ ہمیں دو حریفوں سے بیک وقت نبرد آزما ہونا ہوگا۔ ابھی تک تو بڑے قاآن منگو خان کی جانب سے کسی قسم کی کارروائی کوئی خبر نہیں ملی ہے مگر میں جانتا ہوں کہ وہ اپنے بھائی کی مدد کے لئے ضرور مداخلت کرے گا''۔

''آپ بے فکر رہیں! میں نے پورا بندوبست کر رکھا ہے۔ اگر ایل خانی لشکر ہماری جانب بڑھا تو اس سے بھی نبٹ لیا جائے گا۔ ہمارا لشکر دو متوازی حصوں میں سفر کرے گا۔ پہلا حصہ دوسرے حصے سے نصف دن کے فاصلے پر سفر کرے گا۔ اگر کسی مقام پر پہلے حصے کو گھیرنے کی کوشش کی گئی تو وہ اپنے مدمقابل کو اس وقت تک

اُلجھائے رکھے گا کہ دوسرا حصہ عقب میں مدد کے لئے پہنچ جائے''۔

''اگر پہلا حصہ خیریت سے نکل گیا اور دوسرا حصہ زد میں آ گیا تو......؟''

''دوسرے حصے کے اطراف میں تین چھوٹے چھوٹے دستے پھیل کر سفر کریں گے، ان کے پاس مخصوص بگل موجود ہیں جو کسی قسم کے خطرے کے پیشِ نظر بجائے جائیں گے جس سے تینوں دستے اور مرکزی حصہ باخبر ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ تمام راہوں میں مخبروں کا جال بچھا دیا گیا ہے، کوئی بھی خبر پاتے ہی وہ تمام فوج کو مطلع کر دیں گے۔ اس کے لئے پیغام رساں پرندوں کی تیاری بھی مکمل کر لی گئی ہے''۔

برقائی خان نے مزید کئی سوالات کئے، جب وہ پوری طرح مطمئن ہو گیا تو اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور فتح و نصرت کے لئے عاجزی و انکساری سے دعا کی۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ واپس اپنے محل کی جانب بڑھ گیا، وہ ریاستی انتظام کے لئے کچھ ضروری اقدامات کرنا چاہتا تھا۔ وہ ابھی راستے میں ہی تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ بڑے قاآن اعظم منگو خان کا چھوٹا بھائی ارق بوقا خان شاہی محل میں اس کا منتظر ہے۔ برقائی خان یہ اطلاع پا کر لمحہ بھر کے لئے دنگ رہ گیا۔ ارق بوقا خان کے بارے میں اسے یہ خبر ملی تھی کہ وہ ہلاکو خان کے ساتھ عراق و عجم میں موجود ہے اور بغداد کی تباہی میں بھی بطور سپہ سالار شامل رہا ہے۔ ارق بوقا خان، قاآن اعظم منگو خان کی جانب سے ترک و سلجوق قبائل پر حکمران تھا۔ اس کا دوسرا بھائی کبلا خان ترکستان اور گرجستان کے علاقوں پر حکمران تھا جبکہ ہلاکو خان عجم و فارس پر مقرر تھا۔ اس امر پر مؤرخین کا کہنا ہے کہ تمام بڑے مناصب پر قاآن اعظم منگو خان کے ساتوں بھائیوں کے قبضے نے بھی منگول امراء و عمائدین کی وفاداری میں دراڑیں ڈال دی تھیں۔



مطیع الدین کپڑے کے اس ٹکڑے کو باریک بینی سے دیکھ رہا تھا۔ اس پر کوئی دھندلی دھندلی تحریر دکھائی دے رہی تھی۔ اس تحریر کو لکھنے میں کسی قسم کی سیاہی کا استعمال نہیں کیا گیا تھا بلکہ وہ پہلی نظر میں پانی سے لکھی دکھائی دیتی تھی۔ مطیع الدین نے اسے پڑھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ فونتاجو خان اس کی جانب مشتاق نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

''اللہ کی قسم! یہ چیز واقعی میرے لئے کسی عجوبے سے کم نہیں ہے''۔ مطیع الدین بے اختیار ہو کر بولا۔ فونتاجو خان اپنی کاوش پر مسرور دکھائی دینے لگا۔ مطیع الدین کی نگاہ جب اس کے فاخرانہ انداز پر پڑی تو وہ رہ نہ پایا۔

''موٹے! تو پہلے سے ہی اتنا فربہ ہے، یوں اظہارِ فخر میں منہ پھلا کر کیوں اپنے جثے پر بدنامی کی مہر لگانے پر تلا ہے''۔

''دیکھو مطیع الدین! ایک تو میں نے اتنی محنت سے تمہارے لئے کام کی چیز گم ہونے سے بچائی ہے اور تم میرا شکریہ ادا کرنے کے بجائے بے ہودگی پر اتر آئے ہو''۔

''میں نے تم سے کوئی استدعا تھوڑی کی تھی کہ اس بے کار سے کپڑے کے پیچھے یوں لپکو''۔

''یہ بے کار کپڑا ہے! لاؤ ادھر مجھے دو، میں اس کا بندوبست کرتا ہوں''۔ فونتاجو خان نے تیزی سے کپڑے کا ٹکڑا اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور دوسرے لمحے اسے ہوا کے دوش پر آزاد چھوڑ دیا۔ ہوا کی تیزی میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ کپڑا فونتاجو خان کے ہاتھوں سے آزاد ہوتے ہی ایک بار پھر تیزی سے ان سے دور ہوتا چلا گیا۔ مطیع الدین اس کی غیر متوقع جسارت پر جھنجھلا کر رہ گیا۔

''ہوا کی خنکی اگلے چند گھنٹوں میں ناقابلِ برداشت ہو جائے گی، میرا خیال ہے کہ گھوڑے پر سوار ہو جاؤ تاکہ ہم طوفان کی آمد سے پہلے سرائے پہنچ جائیں''۔ فونتاجو خان نے اطمینان بھرے لہجے میں اسے صلاح دی۔

''فونتاجو! تم کسی وقت ایسی بے ہودگی کرتے ہو کہ بس......!'' مطیع الدین ہونٹ کاٹتا ہوا بولا۔ وہ اپنی مٹھیاں بھینچتا ہوا جست لگا کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اس نے فونتاجو خان کی پرواہ کئے بغیر ہی گھوڑے کو ایڑ لگائی اور آگے کی جانب نکل گیا۔ فونتاجو خان اس کی حرکت پر مسکرا دیا۔ دوسرے لمحے وہ بھی گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ سامان والے گھوڑے کو ساتھ لئے وہ مطیع الدین کے عقب میں بڑھنے لگا۔ کافی دیر بعد اسے مطیع الدین کا ہوا سے باتیں کرتا گھوڑا دکھائی دیا۔ موسم خراب ہو رہا تھا۔ اب یخ بستہ ہواؤں میں شدت پیدا ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہلکی ہلکی ژالہ باری شروع ہو گئی۔ مطیع الدین نے فونتاجو خان کی جانب دیکھ کر اشارہ کیا کہ اسے مزید تیز رفتاری اختیار کرنا چاہئے۔ موسم اس قدر بگڑ چکا تھا کہ اب ان کے پاس یہ صورت بھی باقی نہیں رہی تھی کہ وہ کسی محفوظ مقام پر ٹھہر کر اپنے خیمے نصب کر لیتے۔ تیز ہوائیں انہیں سرائے کی جانب دھکیلنے میں مدد کر رہی تھیں۔ گھوڑے بھی موسم کی خرابی کے پیشِ نظر بے قابو ہونے لگے۔ وہ برف کے میدان کو کاٹتے ہوئے بالآخر اس کے کنارے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہاں ہواؤں کی شدت میں معمولی کمی محسوس ہوئی۔ کئی گھنٹوں کی مسلسل مسافت کے بعد وہ سرائے شہر کے قریب پہنچ گئے۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہ دونوں تاریکی میں شہر میں داخل ہوئے۔

سرائے شہر میں ایک نئی تبدیلی دیکھ کر مطیع الدین چونک پڑا۔ اسے خیموں کی قطاروں کے ساتھ ساتھ لمبے لمبے بانس نصب دکھائی دیئے۔ بانسوں کا یہ سلسلہ گنجان تھا۔ ان بانسوں کے سروں پر کافی مقدار میں جھاڑ جھنکار لپٹی ہوئی تھی۔ بانسوں کے نچلے حصوں پر روشن مشعلوں کو اس ترتیب سے لگایا گیا تھا کہ ان کی آگ بانس سے خاصی دور تھی۔ طوفانی موسم میں مشعل کی آگ کا مسلسل روشن رہنا مطیع الدین کے لئے کوئی خاص بات نہیں تھی کیونکہ اس میں کچھ ایسے عنصر شامل کئے جاتے تھے جو ہوا کی شدت پر مزید پھیل کر آگ کو برقرار رکھتے تھے لیکن بانسوں کا یہ عجیب سا سلسلہ اس کو حیران کیے دے رہا تھا۔

فونتاجو خان نے خیموں پر اچٹتی نگاہ ڈالی۔ کچھ لوگ اسے متحرک دکھائی دیئے جبکہ اکثریت خیموں میں دبکی بیٹھی تھی۔ خیموں کے آخر میں کچھ کچے مکانات تھے جن میں ایک گھر مطیع الدین کا تھا۔ فونتاجو خان نے کچھ دیر گزرنے پر مطیع الدین کی جانب دیکھا جو جامد و ساکت کھڑا دکھائی دیا۔ اس کی آنکھوں میں اُلجھن کے آثار دیکھ کر فونتاجو خان نے آگاہ کیا۔

''یہ وہی شہر ہے جہاں سے ہم روانہ ہوئے تھے، اگر تمہیں اپنے گھر کا رستہ یاد نہیں رہا تو میں تمہاری تھوڑی بہت رہنمائی کر سکتا ہوں''۔ مطیع الدین اس کی بات پر عالمِ حیرت سے باہر نکل آیا۔ اس نے فونتاجو خان کی بات کا مفہوم سمجھنے پر اس کی جانب دیکھا، پھر کچھ توقف سے بولا۔ ''سرائے میں کوئی نہ کوئی اہم واقعہ ضرور ہوا ہے؟''

''کہیں تمہارا اشارہ ان بانسوں کی جانب تو نہیں!'' فونتاجو خان نے اچانک سوال کیا۔

''تمہارا اندازہ صحیح ہے''۔

''ان بانسوں کی طرف......!'' فونتاجو خان ہاتھ جھلاتے ہوئے زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔ مطیع الدین اس کی حرکت پر جھنجھلا اُٹھا۔ وہ قہر آلود نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ فونتاجو خان اتنی زور سے ہنس رہا تھا کہ خیموں کے قریب لوگ چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگے۔

''اپنی اس تھوتھنی کو قابو میں رکھو ورنہ میں کسی پتھر سے مسل کر اسے مزید چپٹی کر دوں گا''۔ مطیع الدین دانت پیس کر بولا۔

''پھر تو میں مزید فربہ دکھائی دوں گا''۔ فونتاجو خان ہنستے ہوئے بولا۔ ''تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ ایسے بانس خاص مقصد کے لئے لگائے جاتے ہیں۔ اگر باہر کے کسی لشکر کے حملے کا اندیشہ ہو یا پھر خراب موسم کی شدید

ہواؤں کے جھکڑوں سے بچنے کے لئے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ موسم کتنا بگڑا ہوا ہے۔ ان بانسوں پر لگی جھاڑ سے شدید ہواؤں کا دباؤ کم ہو جائے گا اور خیموں کے اُڑنے کا احتمال بھی نہیں رہے گا''۔

''میرے لئے یہ تجربہ نیا ہے''۔ مطیع الدین نے جواب دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے گھر میں موجود تھے۔ کمرے کے وسط میں بڑا آتش دان روشن تھا۔ مطیع الدین کا باپ نورالدین غصے کے عالم میں انہیں لعن طعن کر رہا تھا جبکہ وہ دونوں گردنیں جھکائے بیٹھے تھے۔ دیر تک نورالدین کمرے میں ٹہل ٹہل کر انہیں برا بھلا کہتا رہا۔ مطیع الدین صرف چند دن کی اجازت لے کر شکار کے لئے روانہ ہوا تھا جبکہ واپسی میں اس نے دو ماہ سے زیادہ عرصہ لگا دیا۔ نورالدین اس کے لئے کئی دن سے پریشان تھا۔ جب وہ اپنے دل کا غبار نکال چکا تو وہ تھک کر ایک جانب بیٹھ گیا۔

''بابا! پہاڑی پر شکار کے دوران کئی بار موسم خراب ہوتا رہا اسی لئے......'' فو ننا جو خان نے صفائی پیش کرنا چاہی کہ نورالدین اس کی بات کاٹتا ہوا بولا۔

''میں سمجھتا تھا کہ مطیع الدین ہی ناخلف ہے مگر تم بھی اس کے ساتھ مل گئے۔ یوں بہانے تراشتے ہوئے تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آتی''۔

''بابا! کچھ کھانے کو ملے گا بڑی زور کی بھوک لگی ہے''۔ فو ننا جو خان مسمسی صورت بنا کر بولا۔ نورالدین نے اس کی جانب گھور کر دیکھا پھر خاموشی سے اندر بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد کھانا آ گیا۔ فو ننا جو خان سب کچھ بھول کر کھانے میں مشغول ہو گیا اور مطیع الدین اس کے کھانے کے انداز پر جل بھن کر رہ گیا۔

''تم لوگوں کے جانے کے بعد برقائی خان کا کئی بار پیغام آیا ہے''۔ نورالدین نے بتایا۔

''میں کل اس سے ملاقات کر لوں گا''۔ مطیع الدین نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

''آج کل یہاں کے حالات کافی کشیدہ ہیں، برقائی خان شاید کل لشکر کے ساتھ روانہ ہو جائے گا۔ مجھے آج ہی یہ خبر ملی ہے''۔ نورالدین نے کہا۔

''ظاہر ہے! اردوئے زریں کا حکمران ہے تو ایسی مہمات تو پیش آئیں گی''۔ مطیع الدین نے جواباً کہا۔ نورالدین نے اس کے غیر سنجیدہ انداز پر اس موضوع پر مزید کلام کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ فو ننا جو خان کو کھانا کھاتے اچانک کچھ یاد آ گیا۔ وہ عجلت میں دسترخوان سے اُٹھ کر ایک جانب بڑھ گیا۔ نورالدین غیر مہذب حرکت پر اسے تیکھی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ فو ننا جو خان نے اپنے سامان کے تھیلے میں سے کپڑے کا ٹکڑا نکالا اور اپنی جگہ واپس لوٹ آیا۔ مطیع الدین بھی تجسس بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ جونہی کپڑے کے ٹکڑے پر اس کی نظر پڑی تو وہ ہاتھ میں پکڑا لقمہ منہ میں ڈالنا بھول گیا۔

''یہ تو تم نے ہوا میں اُڑا دیا تھا......؟'' وہ تیزی سے بولا۔

''اسے دوبارہ تلاش کر لینا بھی میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ تم نے تو اسے بے کار سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا مگر میرے دل میں اس پر موجود تحریر کے بارے میں تجسس ابھی باقی ہے''۔ فو ننا جو خان کھانے کا نوالہ منہ میں ٹھونستے ہوئے بولا۔ اس نے کپڑے کا ٹکڑا نورالدین کی جانب بڑھا دیا۔ نورالدین کپڑے کے ذکر پر ان کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔ کپڑے کا ٹکڑا ہاتھ میں آتے ہی وہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

''اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے''۔ نورالدین، ان کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

فو ننا جو خان نے اسے مخصوص انداز میں دیکھنے کے لئے کہا۔ نورالدین نے اسے لہرا کر روشنی میں دیکھا۔ مگر کپڑے میں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ فو ننا جو خان نے کپڑا لے کر اس کے آر پار جھانکا۔ وہ تحریر جو انہیں

برف کے میدان میں دکھائی دی تھی اس کا دور دور تک کچھ پتہ نہیں تھا۔ فو ننا جو خان پریشان دکھائی دینے لگا۔ وہ انجانے میں کپڑے کو یوں جھاڑنے لگا جیسے اس میں سے تحریر نکل کر باہر گر پڑے گی۔ مطیع الدین بھی اپنی جگہ دنگ بیٹھا تھا۔ اس نے بھی وہ تحریر اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ نورالدین نے ان سے کپڑے کا ٹکڑا دوبارہ لے لیا اور اس میں جھانکنے لگا۔ اچانک اس کے چہرے کی کیفیت میں تغیر پیدا ہوا۔ اسے کپڑے میں کسی تحریر کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ نورالدین کسی خیال کے تحت اپنی نشست سے اُٹھا اور آتشدان کی جانب بڑھ گیا وہ کپڑے کو لہرا لہرا کر سینک لگانے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں کپڑے پر موجود تحریر انگاروں جیسی رنگت میں نمایاں ہو گئی۔ کپڑے میں نئے رنگ کے ظہور پر وہ دونوں بھی اس کے عقب میں پہنچ گئے۔ اس کپڑے میں چھپی تحریر کو مطیع الدین اب صاف پڑھ سکتا تھا۔

''ارضی جنت کی تلاش میں مجھے اپنے باطن کو دھونا ہوگا''۔ نورالدین تحریر پڑھتا چلا گیا۔ مطیع الدین تحریر کے بارے میں کوئی اندازہ لگانے میں ناکام رہا۔ نورالدین کچھ لمحے اس کپڑے کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔

''سچ سچ بتاؤ......تم دونوں کہاں گئے تھے؟ یہ کپڑا اس علاقے کا نہیں ہے''۔ نورالدین شک بھری نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگا۔

فو ننا جو خان سرخ غر پہاڑی اور وہاں ریچھ کے شکار اور پھر دو اجنبیوں کی آمد اور کسی عورت کی آخری رسم کی سازش کے بارے میں نورالدین کو آگاہ کرنے لگا۔ مطیع الدین کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا کہ کہیں وہ بے وقوف اپنی سادہ لوحی میں گل دتوتز کا نام نہ لے بیٹھے مگر اس کا اندیشہ بے بنیاد ثابت ہوا۔ فو ننا جو خان گل دتوتز کا ذکر سرے سے ہی غائب کر گیا تھا۔ سرخ پہاڑ سے روانگی اور راستے میں کپڑے کے اچانک مل جانے کی روداد اس نے حرف بہ حرف سچ سنائی تھی۔ نورالدین کا ذہن ابھی پوری طرح صاف نہیں ہوا تھا۔ وہ انہیں اپنی مردم شناس نگاہوں سے پرکھنے میں مصروف تھا فو ننا جو خان کے چہرے پر چھائی ہوئی معصومیت سے اسے کچھ دیر میں یقین آ گیا کہ وہ لوگ واقعی سچ بول رہے ہیں۔

''تمہیں معلوم ہے کہ یہ کپڑا کس کام آتا ہے؟'' نورالدین نے ان سے سوال کیا۔

''اگر ہمیں اس بارے میں کچھ معلوم ہوتا تو ہمارے چہرے یوں تجسس دکھائی نہ دیتے''۔ مطیع الدین نے جواب دیا۔

''یہ گھوڑے کے ماتھے پر باندھا جانے والا انوکھا رومال ہے''۔ نورالدین نے انکشاف کیا۔ ''اس رومال کا استعمال یہاں نہیں ہوتا، یہ کسی شامی یا عربی کا معلوم ہوتا ہے۔ عرب اور شام کے باشندے اپنے گھوڑے کے ماتھے پر بطور نشانی ایسے رومال باندھتے ہیں''۔

''مگر یہ تو ہمیں برف کے میدان میں ملا ہے......!'' مطیع الدین نے تعجب سے کہا۔

''تمہارے اردگرد کوئی ایسا شخص موجود تھا جس کے پاس گھوڑا تھا اور وہ جان بوجھ کر یہ رومال تمہارے رستے میں پھینک گیا ہے''۔ نورالدین نے اندازہ لگایا۔

''جان بوجھ کر......؟'' فو ننا جو خان تیزی میں بولا۔

''ہاں! جان بوجھ کر کیونکہ یہ رومال گھوڑے کے سر سے کبھی نہیں گرتے، انہیں گرایا جاتا ہے تاکہ دوسرے کو یہ خبر ہو سکے کہ وہ اس کے اردگرد موجود ہے''۔

''کسی شامی یا عربی شخص سے تو ہماری تمام رستے کوئی ملاقات نہیں ہوئی، دوسرا اسے ہمیں پیغام دینے کی کیا ضرورت تھی جبکہ ہم اسے سرے سے جانتے ہی نہیں؟'' فو ننا جو خان نے اپنی صفائی پیش کی۔

''اس تحریر سے کیا مراد ہے؟'' مطیع الدین نے اپنے باپ کی توجہ اس طرف مبذول کی۔

''تم یقیناً حیران ہو گے کہ میں اس تحریر میں چھپے پیغام کو بخوبی سمجھ چکا ہوں''۔ نورالدین نے مسکراتے ہوئے کہا اور ان دونوں کی نگاہوں میں اشتیاق اتر آیا۔

''فارس کے بالائی اضلاع میں نصف صدی قبل ایک فتنہ برپا ہوا تھا جس نے مسلمانوں کو گمراہ کیا اور اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کو رد کرتے ہوئے نئی شریعت کا پرچار کیا۔ خلیفہ اسلام نے اس کی بیخ کنی کی کافی کوشش کی مگر وہ فتنہ پسپائی اختیار کر کے بالائی پہاڑی علاقوں میں پناہ گزین ہو گیا۔ اس فتنے کے پیروکار خود کو باطنی فدائی کہتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اپنے دین کی خدمت کے بعد وہ سیدھے ارضی جنت میں جائیں گے جہاں انہیں ہمیشہ کی زندگی اور سدا قائم رہنے والی راحت نصیب ہو گی''۔ نورالدین نے تفصیل بتائی۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ تحریر ہمیں دینے کا مقصد کیا ہے؟'' فوکناجو خان نے سوال کیا۔

''وہ جو کوئی بھی ہے، تمہیں اپنی موجودگی اور شناخت سے آگاہ کرنا چاہتا ہے۔ یا تو وہ تمہیں اپنے پاس بلانے کا خواہش مند ہے یا پھر وہ تمہارا کوئی پوشیدہ دشمن ہے''۔

''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے یہ پیغام کسی دوسرے کے لئے گرایا ہو اور اتفاق سے یہ ہمارے ہاتھ لگ گیا''۔ فوکناجو خان نے بات بنائی۔

''فدائیوں کے بارے میں، میں نے بہت کچھ سن رکھا ہے۔ وہ کوئی بھی کام ادھورا یا کچا نہیں کرتے۔ وہ اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے جان پر کھیل جانا معمولی بات سمجھتے ہیں۔ تم دونوں محتاط رہنا۔ میں کل ہی برقائی خان سے بات کروں گا کہ وہ کوتوال شہر کو خصوصی ہدایت دے کہ وہ سرائے میں موجود تمام ایسے افراد کی اچھی طرح جانچ پڑتال کرے جو حال ہی میں باہر سے یہاں آئے ہیں۔ مجھے شک ہے کہ فدائیوں کا کوئی گروہ پس پردہ کسی سازش کا ارتکاب کر رہا ہے''۔ نورالدین کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

مطیع الدین کا ذہن اپنے باپ کے قائم کردہ اندازے کے بجائے دوسری سمت متحرک تھا اسے یہ شنگ خان کی کارستانی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اُسے اعلانیہ مبارزت سے باخبر کر چکا تھا۔ فدائی والی بات اس کے حلق سے نیچے نہیں اُتر رہی تھی۔ شنگ خان اور فدائیت دونوں عوامل مختلف زاویوں میں موجود تھے۔ یکا یک اس کے ذہن کے کواڑوں پر ایک نئے خیال نے دستک دی۔ ''کہیں وہ تیسرا فرد فدائی تو نہیں جو گل دقوز کو غار میں سے نکال کر لے گیا تھا؟''



امیر موصل بدرالدین لولو کا باغی بیٹا علاء الدین لولو اپنے خاص مصاحبوں کے ساتھ میافارقین پر تاتاری محاصرے کے دوران اپنے باپ کے حلیف تاتاریوں کو جل دے کر فرار ہو گیا تھا۔ بدرالدین لولو کے پاس جب اپنے بیٹے علاء الدین کے فرار کی اطلاع پہنچی تو تڑپ کر رہ گیا۔ اس کی بیٹے کی نادانی کے باعث ہلاکو خان کے ہاتھ سنہرا بہانہ لگ گیا تھا، وہ اب کسی بھی وقت موصل کا رُخ کر سکتا تھا۔ بدرالدین کی تمام سابقہ خدمات کو پس پشت ڈال کر موصل کو تاخت و تاراج کرنے میں اب اس کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ارض فلسطین پہنچ کر علاء الدین لولو نے اپنے باپ کو اپنی خبر دی تو اس نے پیغام لانے والے قاصد کو صاف لفظوں میں جواب دیا کہ تو نے مجھے اور میری حکومت کو ہلاکت میں ڈال دیا ہے اور میری مملکت کے لئے تباہی کا خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ تاتاریوں سے مخالفت کی یہ جرأت تجھ سے کیونکر سرزد ہوئی؟ میں تجھے متنبہ کرتا ہوں کہ اگر تمہارے قدم میری زمین پر پڑے تو میں خود اپنے ہاتھوں سے تیرا سر قلم کر دوں گا۔

علاء الدین لولو نے اپنے باپ کے فیصلے پر اس پیغام کے ساتھ دوبارہ قاصد روانہ کیا کہ آپ کی مملکت اور رعیت کو میں نے اللہ اور اس کے نبی کے سپرد کر دیا ہے، میں نے جو کچھ خواب میں دیکھا اگر آپ بھی دیکھ لیتے تو یقیناً آپ بھی تاتاریوں کا ساتھ چھوڑ دیتے۔ تاتاریوں کا ساتھ ایمان کی سلامتی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ میں تاتاریوں کے زیر سایہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جنگ کی تاب نہیں لا سکتا۔ اسی لئے میں نے انہیں ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا ہے۔ آپ جلد ہی سنیں گے کہ آپ کا یہ بیٹا دشمنان نبی سے لڑتا ہوا شہید ہو گیا ہے۔ اگر شہادت میرے نصیب میں نہ ہوئی تو بھی میں آپ کی حکم عدولی کا موجب نہیں بنوں گا اور آپ کی رضامندی کے بغیر موصل کی زمین پر قدم نہیں رکھوں گا۔

بدرالدین لولو نے بیٹے کا جواب سن کر چپ سادھ لی۔ اس نے اس کے عذر کو بہانہ قرار دیا اور اسے اس کے حال پر چھوڑ کر اپنی مملکت کے بارے میں امراء و عمائدین سے صلاح و مشورے کرنے لگا۔ اس نے تحائف کا انبار اپنے ہمراہ لیا اور ارض فلسطین کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس نے ہلاکو خان سے ملاقات کی اور تحائف پیش کرتے ہوئے اپنے ناخلف بیٹے کے جرم کے لئے معذرت کی۔ سالانہ محصول میں اضافے اور اطاعت گذار رہنے کا وعدہ کیا۔ ہلاکو خان موصل سے کافی دور تھا۔ اس نے موصل کے لئے فیصلہ محفوظ رکھتے ہوئے فی الوقت بدرالدین لولو کو تسلی دی اور اس کی سابقہ خدمات کے پیش نظر اس کے بیٹے کی نادانی کو درگزر کر دیا۔ امیر موصل بدرالدین لولو، ہلاکو خان کا ردعمل دیکھ کر مطمئن ہو کر واپس لوٹ گیا۔

علاء الدین لولو مختلف ایوبی سلطانوں کے لشکروں میں شامل رہ کر تاتاریوں کے خلاف لڑتا رہا۔ جب اسے یقین ہو جاتا کہ اب تاتاری پلہ بھاری پڑ رہا ہے اس معرکے کا انجام شکست ہی ہے تو وہ خاموشی سے پسپائی اختیار کرتے ہوئے میدان سے نکل جاتا اور کسی دوسرے سلطان کے پاس پہنچ کر اس کے سپاہیوں میں شامل ہو جاتا۔ اس کا یہ انداز خاصا عجیب تھا کیونکہ وہ درجہ شہادت پانے کی کوشش کرنے کے بجائے مسلسل فرار کی راہ اختیار کئے ہوئے تھا۔ جب بلادِ شرقیہ اور بلادِ فلسطین پر ہلاکو خان کا مکمل قبضہ ہو گیا تو وہ وہاں سے نکل کر مصر چلا آیا۔ یہاں اس کا بہنوئی عہدۂ سلطانی پر فائز تھا۔ علاء الدین لولو کی آمد پر اس کی بہن ملکہ بدرمنیر لولو بے حد خوش ہوئی۔ اس نے سلطان الملک المظفر سے اس کے لئے خصوصی سفارش کی۔ سلطان الملک المظفر تاتاری یلغار کی مصدقہ خبروں کا بے چینی سے منتظر رہتا تھا، جب اسے علاء الدین لولو کی آمد کی خبر ملی تو وہ رہ نہ سکا۔ اس نے علاء الدین لولو سے ملاقات میں تاتاری حملے کے بارے میں اتنے سوال جواب کئے کہ خود علاء الدین لولو بھی عاجز آ گیا۔ سلطان الملک المظفر دراصل مختلف ذریعوں سے تاتاری سیل کے بارے میں یہ اندازہ لگانے میں مصروف تھا کہ ان کی حتمی تعداد کیا ہے اور وہ کس مقام تک پہنچ چکے ہیں؟ اس کے علاوہ وہ ان کے جنگ کے طریقہ کار کو جاننا چاہتا تھا۔ اس نے انتشار کے ان ایام میں بھرپور فیصلہ کر لیا تھا کہ تاتاری اگر بلادِ مصر کی جانب بڑھے تو وہ انہیں پوری قوت سے نہ صرف روکے گا بلکہ ان سے اپنے اجداد کا بدلہ بھی لے گا۔ وہ کینہ پرور مزاج کا انسان نہیں تھا کہ انتقامی کارروائی کے بارے میں سوچتا۔ جب آفت کا رُخ اس کی جانب مڑ ہی چکا تھا تو ایسے میں اس کے نزدیک سب کچھ جائز تھا۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر تاتاری لشکر مصر کی جانب نہ بڑھا تو وہ خود آگے بڑھ کر اسے نہیں چھیڑے گا۔

علاء الدین نوجوان تھا اور ساتھ ہی جنگجو سپاہی بھی۔ تاتاریوں کے ساتھ مختلف شہروں کے تاخت و تاراج میں وہ کسی حد تک شامل رہا تھا۔ سلطان الملک المظفر اکثر و بیشتر اس کے پاس آ بیٹھتا۔ ملکہ بدرمنیر سے نسبت کے باعث علاء الدین لولو کو دربار شاہی میں بھی جگہ مل گئی۔ ایک شام سلطان الملک المظفر اس کے ساتھ

بیٹھا اپنے مرغوب موضوع پر تبادلہ خیال کر رہا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ علاء الدین لولو کی آنکھوں میں پڑی۔ علاء الدین کی آنکھوں میں کرنج دیکھ کر اس کی سانس اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ علاء الدین لولو حیرت بھری نظروں سے سلطان کی متغیر حالت دیکھنے لگا۔ سلطان الملک المظفر اتنا بدحواس ہوا کہ اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ بے ربط ہونے لگے۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوا وہ اٹھا اور اندر کی جانب بڑھ گیا۔



بیبرس اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود کسی بھی سلطان کو اس امر پر قائل نہیں کر سکا تھا کہ انہیں دفاعی حکمت عملی ترک کر کے تاتاریوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہئے۔ قریباً سب حکمرانوں کے ایک جیسے سرد اور مدافعانہ رویئے سے وہ دلبرداشتہ ہو چکا تھا۔ مایوسی کے اس عالم میں اُسے اپنے مرحوم آقا سلطان الملک الصالح نجم الدین ایوب کی یاد ستانے لگی۔ مرحوم سلطان کی جرأت و بہادری سے وہ بے حد متاثر تھا۔ وہ غلام سے امیر و سالار تو بن چکا تھا مگر اس کی زندگی اب بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں تھی۔ وہ سلطانوں کے غیر دانشمندانہ احکامات کی بجا آوری لانے پر مجبور تھا۔ اس کے دل میں پنپنے والی ہمدردی اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا جذبہ دوسروں کی نظر میں بے معنی تھا۔ وہ شکستہ دل سے شیخ عزالدینؒ بن سلام دمشقی کے پاس چلا آیا۔ شیخ عزالدینؒ سے اس کی محبت وانس کا سلسلہ پرانا تھا۔ شیخ عزالدینؒ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے وہ کچھ عرصہ کے لئے آرمینیہ اور انطاکیہ گیا تھا۔ شیخ عزالدینؒ کی درس و تدریس کی مجلس اس وقت پورے زوروں پر تھی۔ شیخ عزالدینؒ نہایت جوش و خروش سے جذبہ جہاد کی فضیلت بیان کر رہے تھے۔ بیبرس کے چہرے پر ان کی نظر پڑی تو وہ چونک پڑے۔ بیبرس کی قاہرہ واپسی کی انہیں اب تک اطلاع نہیں ہو پائی تھی۔ انہوں نے اپنے موضوع پر سلسلہ کلام جاری رکھا۔ جب سے بغداد پر تاتاری قیامت ٹوٹی تھی، اسی دن سے شیخ عزالدینؒ نے اپنی مجالس میں جہاد کی ترغیب کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ لوگ ان کی محافل میں شرکت کرتے اور جہاد کی فضیلت پر ان کی تفسیر و تشریح سے مستفید ہوتے۔ یہ شیخ عزالدینؒ کی خوبی تھی کہ وہ ہر روز ایک ہی موضوع کو اس عمدگی سے بیان کرتے کہ سابقہ سلسلہ کلام سے بالکل الگ دکھائی دیتا۔ لوگوں کی کچھ تعداد محض یہ دیکھنے کے لئے وہاں جمع ہوتی کہ آج شیخ عزالدینؒ جہاد کی تشریح میں کیا رُخ اختیار کریں گے۔ ان میں یہ صلاحیت خداداد تھی جسے ایک وقت میں خلیفہ بغداد نے بھی سراہا تھا۔ بیبرس نہایت خاموشی سے جہاد کے بارے میں ان کا بیان سنتا رہا۔ عصر کے وقت کے قریب جب محفل برخاست ہونے کا وقت آیا تو شیخ عزالدینؒ نے بیبرس کی جانب توجہ کی۔ شیخ عزالدینؒ نے اس سے سفر اور واپسی کے بارے دریافت کیا۔ بیبرس نے مختصر الفاظ میں جواب دیا۔ بیبرس ان سے مزید گفتگو کا خواہش مند تھا کہ انہوں نے اسے اشارے سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس کی کلائی پکڑ کر جامع مسجد کی جانب روانہ ہو گئے۔ نماز عصر کی ادائیگی کے بعد شیخ عزالدینؒ بیبرس کو ہمراہ لئے اپنے حجرے میں چلے آئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ شیخ عزالدینؒ نے بیبرس کو اپنے ساتھ ساتھ رکھا اور اپنے حجرے میں بھی لائے۔ حجرے میں نشست سنبھالتے ہی بیبرس پھٹ سا گیا، الملک الناصر اور الملک المظفر کے رویئے کا شکوہ کرتے ہوئے اس نے اپنے دل کا غبار نکالا۔ شیخ عزالدینؒ خاموشی سے اس کے شکوے شکایات سنتے رہے۔ جب بیبرس خاموش ہو گیا تو شیخ عزالدینؒ نرمی سے گویا ہوئے۔

''کچھ امر ایسے ہیں جنہیں اپنے وقت مقرر پر پورا ہونا ہے، ان میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جا سکتی۔ مسلمان اس قدر بدمست اور بے پرواہ ہو چکے تھے کہ ان کے دلوں میں سے خوف الٰہی دور ہوتا جا رہا تھا۔ مشیت ایزدی نے انہیں تاتاریوں کی شکل میں متنبہ کیا ہے۔ اگر سلطنت خوارزم مٹ چکی ہے تو وہاں کے لوگوں کے سینے

بھی نور ایمان سے روشن ہو چکے ہیں۔ اگر بغداد پر قتل و غارتگری نے قبضہ جمایا ہے تو اس کے پیچھے مصلحت ایزدی کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ وہاں کے علماء نے دین کو مذاق بنا ڈالا تھا۔ گلی کوچوں میں وہ اللہ کا نام لے کر اپنی تاویلیں گھڑ کر مسلمانوں کو گمراہ کر رہے تھے۔ خلافت ختم نہیں ہوئی بلکہ کمزور خلافت کو وقتی طور پر موقوف کر دیا گیا ہے۔ اب خلافت کا دوبارہ احیاء ہوگا اور تم دیکھ لینا کہ یہ خلافت پہلے جیسی کمزور نہیں ہوگی۔ تمہیں اس طرح دل چھوٹا نہیں کرنا چاہئے''۔

''میں آپ کی باتیں تسلیم کرتا ہوں کہ خلافت کی جڑیں کمزور پڑ گئی تھیں مگر اتنی بڑی تعداد میں مخلوق کی ہلاکت کا کیا جواز ہے؟ وہ جیسے بھی لوگ تھے...... اللہ کے ہی بندے تھے...''

''یاد رکھو! ہر کوئی جو اس دنیا میں آتا ہے اسے ایک نہ ایک دن واپس لوٹ کر اسی اللہ کے حضور پیش ہونا ہے۔ اب کس بندے نے کیسے واپس لوٹنا ہے، اس بارے میں اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس کے فیصلے اٹل ہیں۔ تمہیں اس امر کی فکر نہیں کرنا چاہئے کہ کیا ہو چکا ہے؟ بلکہ تمہیں اس امر کی حفاظت کے لئے چاق و چوبند رہنا چاہئے جو ہونے والا ہے''۔

''یا شیخ!'' بیبرس رنجیدگی سے بولا۔ ''زندگی اور موت بے شک اللہ کے ہی ہاتھ میں ہے مگر خود کو ہلاکت میں ڈالنا کہاں کی دانشمندی ہے، جب سب کو دکھائی دے رہا ہے کہ دشمن کی جمعیت تعداد میں زیادہ ہے تو اس کے مقابلے کے لئے اس سے زیادہ نہیں تو کم از کم اس کے برابر کا سامان تو کرنا چاہئے۔ جب سب جانتے ہیں کہ دشمن خصوصاً شہروں کو فتح کرنے کے بعد بلا جھجک انہیں تباہ و برباد کر دیتا ہے تو اس کا مقابلہ شہروں سے دور رہ کر کیا جائے تا کہ شکست کی صورت میں رعیت پر ستم نہ ٹوٹے''۔

''یہ سب ایمان کی کمزوری اور گمراہی کا نتیجہ ہے، مسلمانوں نے خود کو زمانہ امن میں پا کر اپنی بہادری و جرأت کو عیش و نشاط کے پیمانوں میں ڈبو ڈالا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی عقلوں پر فی الوقت پردہ پڑ چکا ہے، ان کی سب تدبیریں الٹ ہو جاتی ہیں اور زندگی کے پیچھے بھاگنے والے صاحب فراش ہوتے ہیں''۔

''یا شیخ! میں تو حالات کی اس عجیب کروٹ سے مایوس ہو چکا ہوں، مجھے کوئی امید نہیں کہ بلادِ مصر کے مسلمان اس بڑے حریف کے سامنے ٹھہر پائیں گے۔ میں اب خود کو بے حیثیت محسوس کرتا ہوں، میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ تاتاری سیل کے سامنے دیوار آہن بن کر کھڑا ہو جاؤں مگر آخری حکم تو سلطان الملک المظفر کا ہی ہوگا، تاتاریوں سے صلح اور پھر ناقابل برداشت تباہی''۔

''کفرانِ نعمت مت کرو اور نہ ہی اللہ کی رحمت سے مایوس ہو، اللہ ہی بلادِ مصر کی حفاظت کرے گا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ دن قریب ہے جب تاتاریوں کا گروہ اپنے قدم یہاں ڈالے گا پھر وہی ہوگا جو اللہ کو منظور ہے''۔ شیخ عزالدین نے اس کی ڈھارس بندھائی۔

''یا شیخ! اگر میرے پاس طاقت و اختیار ہوتا تو قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، میں تاتاریوں کو ایسا سبق سکھاتا کہ وہ بلادِ اسلامیہ کا بھولے سے بھی رُخ نہ کرتے۔ مگر کیا کروں؟ میں بے اختیار و عاجز ہوں''۔ بیبرس حسرت بھرے لہجے میں بولا۔

''بیبرس!'' شیخ عزالدین اس کی بات پر مسکرائے۔ ''طاقت و اختیار بڑا نشہ آور مرض ہے۔ جب یہ کسی کو لگ جائے تو اس کی دنیا و عاقبت خطرے میں پڑ جاتی ہے''۔

''یا شیخ! یہ نشہ انہیں چڑھتا ہے جو ناز و ادا کے پلے ہوں، مرد میدان کے لئے اس کا اثر بے معنی ہوتا ہے۔ اگر مجھے کبھی یہ نعمت نصیب ہوئی تو آپ دیکھیں گے کہ بیبرس اس امتحان میں کیسے کامیاب ہوتا ہے''۔ بیبرس کا

لہجہ اس کے قلبی جذبات سے معمور تھا۔

''اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو مگر جو ہونا ہے اسے کون ٹال سکتا ہے؟'' شیخ عزالدینؒ مبہم انداز میں بولے۔

بیبرس چونک کر ان کی جانب مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا لیکن شیخ عزالدینؒ نے کوئی وضاحت نہ کی۔

''بیبرس!'' شیخ عزالدین کچھ توقف کے بعد مخاطب ہوئے۔ ''اگر تمہیں تاتاریوں کی مہم کے لئے کہا جائے تو بلا جھجک حلب مانگ لینا''۔

''مگر آپ تو بخوبی جانتے ہیں کہ مجھے علاقوں پر حکمرانی سے کوئی دلچسپی نہیں''۔ بیبرس ان کی ہدایت پر حیران ہو کر بولا۔

''کیسے عجیب شخص ہو! کچھ دیر پہلے تک تو یہ شکایت لئے بیٹھے تھے کہ طاقت و اختیار تمہارے پاس نہیں ہے، میں تمہیں بااختیار ہونے کی تدبیر بتا رہا ہوں تو کہتے ہو کہ مجھے اختیار سے کیا لینا دینا؟'' شیخ عزالدینؒ اس کے جواب پر تیز لہجے میں بولے۔

بیبرس ان کے لہجے میں ناراضگی دیکھ کر گڑبڑا سا گیا، اس نے بات بنانے کی کوشش کی مگر شیخ عزالدینؒ نے کسی بھی تاویل کے پیش کرنے سے روک دیا۔

''تمہیں ہر قیمت پر ولایت حلب مانگنی ہے، بس یہ یاد رکھو''۔ شیخ عزالدینؒ نے تحکمانہ انداز میں کہا اور اسے مزید سوال جواب سے منع کرتے ہوئے رخصت کر دیا۔ بیبرس اس ہدایت کے پیچھے کارفرما عوامل کے بارے میں جاننا چاہتا تھا مگر شیخ عزالدینؒ نے اسے یہ موقعہ ہی نہیں دیا۔ بیبرس وہاں سے نکلا تو اسے خود میں حیرت انگیز تبدیلی محسوس ہوئی۔ طبیعت میں گذشتہ دنوں سے چھائی ہوئی پژمردگی اور گرانی مفقود ہو چکی تھی اور وہ اب خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔



برقائی خان، ارق بوقا کی غیر متوقع آمد کی اطلاع پا کر تیزی سے شاہی محل کی جانب بڑھا۔ وہ تمام راستے ایل خانی شہزادے کی آمد کے بارے میں سوچتا رہا۔ ارق بوقا کا عین اس وقت پہنچنا جب برقائی خان اپنے لشکریوں کے ساتھ ہلاکو خان کے مقابلے کے لئے نکلنے والا تھا، بڑا معنی خیز تھا۔ برقائی خان کے ساتھ کچھ عمائدین سلطنت بھی تھے۔ ارق بوقا کی آمد کے بارے میں انہیں بھی خبر ہو چکی تھی۔ انہوں نے راستے میں برقائی خان سے اس ضمن میں صلاح و مشورہ کیا۔ برقائی خان چونکہ ارق بوقا کے بارے میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا اس لئے اس نے اپنے امرا کو فی الوقت خاموشی اختیار کرنے کی ہدایت کی۔ تھوڑی دیر میں برقائی خان اپنے شاہی محل میں پہنچ گیا۔ ارق بوقا کو مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا تھا۔ ارق بوقا کو جب برقائی خان کی آمد کی خبر ملی تو اس نے پیغام بھجوایا کہ وہ اس سے کچھ ضروری امور پر بات کرنا چاہتا ہے، زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ اسے تنہائی میں ملاقات کرنے کا موقعہ دے۔ برقائی خان اس کے پیغام پر ملاقات کے لئے اٹھا تو درباری امرا نے فوراً مداخلت کی اور ارق بوقا کو حالات کی نزاکت کے پیش نظر مشکوک قرار دیتے ہوئے اس کی خواہش کو سازش سے تعبیر کیا۔

''قاآن اعظم! آپ کسی بھی صورت میں خلوت میں اس سے ملاقات نہ کیجئے، آپ کو اچھی طرح معلوم ہونا چاہئے کہ منگول امرا کو راستوں سے ہٹانے کے لئے ایسے اوچھے ہتھکنڈے اکثر استعمال کئے جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ آپ سے ملاقات کرنے کے بجائے کسی ایسی ہی مذموم مہم کے لئے بھیجا گیا ہو۔ براہ کرم آپ احتیاط کا دامن نہ چھوڑ یئے''۔

برقائی خان اپنے عمائدین کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ قاآن اعظم منگو خان سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔

برقائی خان کے بھتیجے سرتاق خان کے معاملے میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا کہ ایک وفادار تاتاری غلام نے سرتاق خان سے منگو خان کے پیغام کے لئے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور ملاقات ہونے پر اچانک زہریلا خنجر نکال کر اس کے جسم میں اتار دیا۔ ایسا صرف سرتاق خان کے ساتھ نہیں ہوا تھا، منگو خان کے کئی دشمن اسی طرح موت کے گھاٹ اتارے جا چکے تھے۔

برقائی خان نے اس تجویز پر غور کیا اور پھر ارق بوقا کو شاہی دربار میں طلب کر لیا۔ اس کی آمد سے پہلے تمام محافظ سپاہیوں کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ ہوشیار رہیں، ارق بوقا کی کسی بھی مشکوک حرکت پر فوراً اسے تلواروں کے نرغے میں لے لیا جائے۔ ارق بوقا کو جب اپنی طلبی کا پیغام ملا تو وہ اپنی جگہ دم بخود رہ گیا۔ اسے برقائی خان سے ایسے کٹھور انداز کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ اس نے لمحہ بھر کے لئے سوچا کہ وہ ملاقات کا ارادہ ترک کر کے واپس روانہ ہو جائے مگر وہ جس مقصد کی تکمیل کے لئے یہاں آیا تھا وہ ادھورا ہی رہ جاتا۔ اس نے پیغامبر کو چلنے کے لئے کہا۔ پیغامبر اسے اپنی رہنمائی میں دربار میں لے آیا۔ دربار میں پہنچنے پر وہ سیدھا برقائی خان کی جانب بڑھا۔

''ارق بوقا! وہیں رکو...... تمہیں مقصد بیان کئے بغیر قاآن اعظم کے قریب آنے کی اجازت نہیں ہے''۔

ایک امیر اس کی راہ میں حائل ہو کر بولا۔ ارق بوقا خان اس کے لہجے پر پیچ و تاب کھانے لگا۔ اسے اپنی ایسی بے عزتی کی توقع بھی نہیں تھی۔ اس کا ہاتھ غصے کے عالم میں تلوار کے دستے پر جا پہنچا۔ اسی وقت تلواروں کی جھنجھناہٹ سے سارا دربار گونج اٹھا۔ محافظ سپاہیوں نے اپنی تلواریں بے نیام کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا۔ ارق بوقا اپنا غصہ بھول کر حیرت و پریشانی سے چاروں جانب دیکھنے لگا۔ اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر دستے سے دور ہٹ چکا تھا۔

''تلواریں ہٹا لو... ہم ترکستان کے قاآن کو اپنے دربار میں خوش آمدید کہتے ہیں، لیکن آج ہم حالات کے ایسے دوراہے پر ہیں کہ منگولوں کی روایات کے مطابق آپ کی عزت افزائی سے قاصر ہیں۔ اگر آپ کو میرا یہ انداز ناگوار نہ گذرا ہو تو بلا تامل اپنی آمد کا مقصد بیان کیجئے۔ میں آپ کو تخت شاہی سے دور رکھنے پر ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں''۔ برقائی خان نے ارق بوقا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں دلی طور خان خاناں برقائی خان کی بے حد عزت کرتا ہوں مگر مجھے ایسے ناروا سلوک کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ میں تمہیں منگولوں کے سر کا سنہرا تاج قرار دیتا تھا کہ منگولوں میں اگر کوئی مجھے مہذب اور باوقار دکھائی دیا ہے تو وہ صرف برقائی خان ہے''۔

''میں اپنے سلوک کے لئے شرمندگی کا اظہار کر چکا ہوں۔ اگر آپ اصل موضوع کی جانب آ جائیں تو زیادہ بہتر ہوگا، اگر کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے تو میں خود اپنے سپاہیوں کو ہدایت کئے دیتا ہوں کہ وہ پورے اہتمام کے ساتھ آپ کو سرحد تک پہنچا دیں''۔

''برقائی خان! تم عمر میں مجھ سے چھوٹے ہو، اس کے علاوہ ہمارا ایک خاندانی رشتہ بھی ہے۔ یوں روکھے پن کا مظاہرہ نہ کرو۔ آنے والے کل میں ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت پڑ سکتی ہے''۔ ارق بوقا نے تیز لہجے میں کہا۔

''مجھے کل تک جب آپ کی مدد کی اشد ضرورت تھی اور میں نے اپنے ہرکاروں کو آپ کی جانب دوڑایا تو آپ سب نے کان لپیٹ لئے اور آج جب میں آپ کے بھائی کے خلاف لشکر کشی کرنے کے لئے نکلنے والا ہوں تو آپ مجھ سے اپنائیت کی بات کرتے ہیں؟'' برقائی خان استہزائیہ لہجے میں بولا۔

''اس وقت نہ تو میں نے کان لپیٹے تھے اور نہ ہی میں اس حالت میں تھا کہ بغداد کے لئے تمہاری کوئی مدد کر سکتا مگر آج میں ایسی حالت میں ہوں کہ تمہاری مدد کر سکوں اور اسی مقصد کے پیش نظر یہاں آیا ہوں''۔ ارق بوقا نے جواب دیا۔

''الحمدللہ! میں پہلے دن سے اس حالت میں ہوں کہ بزورِ شمشیر مقابلہ کر سکوں مگر خاندانی رشتے مجھے مجبور کیے ہوئے تھے، آج میں نے ان رشتوں کا طوق اپنے گلے سے اتار پھینکا ہے اور مجھے کسی ایسے فرد سے مدد کی کوئی خواہش نہیں ہے جو میرے مدمقابل سے تعلق رکھتا ہو''۔

''دیکھو میرے خلوص پر شبہ نہ کرو، میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ مجھے اپنے پاس آنے دو، میری بات ایک بار سن لو پھر بے شک تم اپنی من مانی کرتے رہنا''۔

''تمہاری بات مان لی جائے تو پھر بچے گا کیا؟'' ایک امیر تنک کر بولا۔

''میں تمہارا اشارہ بخوبی سمجھ رہا ہوں، مجھے اتنا گھٹیا مت خیال کرو کہ میں بے خبری میں وار کروں گا۔ میں منگول بہادروں میں سے ایک ہوں''۔ ارق بوقا تلخی سے بولا۔

''ٹھیک ہے، تم محافظوں کو جامہ تلاشی دو اور اس کے بعد میرے پاس آ جاؤ''۔ برقائی خان نے کچھ سوچ کر کہا۔ برقائی خان کے حکم پر پورے دربار میں بے چینی سی دوڑ گئی۔ ارق بوقا اس ناروا سلوک پر دانت پیس کر رہ گیا۔ اس نے طوعاً و کرہاً اپنی جامہ تلاشی دی۔ اس کے بعد وہ دھیمے انداز میں چلتا ہوا برقائی خان کے پاس پہنچ گیا۔ برقائی خان نے اسے اپنے پہلو میں نشست دی۔ اس کے انداز میں بے اعتنائی جھلک رہی تھی۔

''میں کچھ اہم باتیں تم سے کرنے والا ہوں، مجھے یہ یقین چاہئے کہ وہ تمہارے دربار سے باہر نہیں جائیں گی، زیادہ بہتر یہی تھا کہ تم مجھ سے تنہائی میں گفتگو پر آمادہ ہو جاتے، بہرکیف میں دھیمے لہجے میں اپنا مدعا بیان کروں گا۔ زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ تم دربار میں موجود غیر ضروری اور ناقابل بھروسہ افراد کو باہر بھیج دو''۔ ارق بوقا نے کہا۔

''یہ سب سلطنت کے وفادار ہیں، جہاں تک تمہاری بات کے منکشف ہو جانے کا احتمال ہے تو اسے اپنے دل سے نکال دو۔ اس دربار میں ہونے والی گفتگو یہیں دفن ہو جایا کرتی ہے''۔

''مجھے تقریب قرولتائی میں نیا قاآن اعظم بننے کے لئے تمہاری مکمل حمایت کی ضرورت ہے۔ جس طرح تم نے اور تمہارے بھائی باتو خان نے منگو خان کو ہاتھ پکڑ کر تخت نشین کر دیا تھا، بالکل ویسے ہی مجھے بھی تخت نشین کرنے میں میری مدد کرو''۔ ارق بوقا دھیمے انداز میں بولا۔ اس کی آواز برقائی خان اور قریب موجود چند محافظوں کے کانوں تک ہی پہنچ پائی تھی۔

''کیا مطلب؟'' برقائی خان غیر متوقع بات پر حیرت زدہ رہ گیا۔

''تم نے جو سنا ہے میں نے وہی کہا ہے۔ اس امر میں میرے ساتھ ساتھ تمہارا بھی فائدہ ہے، میں جانتا ہوں کہ تم عسکری تیاریاں مکمل کر کے آج کل میں نکلنے والے ہو۔ مگر شاید تمہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ ہلاکو خان کی حفاظت کے لئے مرکز سے ہدایات جاری ہو چکی ہیں۔ تم جب ہلاکو خان کی جانب روانہ ہو گے تو تمہارے عقب میں ایک جرار لشکر روانہ کر دیا جائے گا جو تمہیں پشت سے نرغے میں لے لے گا اور ہلاکو خان کو بھی ایسی ہدایات دی جا چکی ہیں کہ تمہاری پیش قدمی کی صورت میں وہ تیز رفتاری سے واپس لوٹ کر تمہارے سامنے سے حملہ آور ہو۔ تم خود سوچو کہ سامنے ہلاکو خان اور عقب میں منگو خان کے لشکر جب موجود ہوں گے تو تم ایسی صورت میں شکست سے دوچار ہو جاؤ گے۔ یہ بھی ذہن میں رکھو کہ منگو خان کے پاس صرف ایک لشکر نہیں ہے۔ اگر تم میری

مدد کرو تو میں سیاسی بساط پر ایسی چال چلوں گا کہ پورے کا پورا مرکز تمہارے قبضے میں آ جائے گا''۔ ارق بوقا نے تفصیلی وضاحت کی۔

''بہت خوب!'' برقائی خان ہنس کر بولا۔ ''بڑے قاآن نے مجھے عسکری کارروائی سے روکنے کے لئے کیا خوب منصوبہ سازی کی ہے۔ اس کی ذہانت پر داد دینے کو دل چاہ رہا ہے''۔

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو''۔ ارق بوقا تلملا کر بولا۔ ''میں تمہیں ایک ایسی راہ سجھا رہا ہوں، جس سے تم خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ تم ہلاکو خان کو سبق سکھانا چاہتے ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں، مجھے اپنے بھائی سے کوئی ہمدردی نہیں ہے کیونکہ وہ منگولوں کے نام پر بدنما داغ بن چکا ہے۔ اس نے منگولوں کی بہادری اور شہ زوری پر کاری ضرب لگائی ہے۔ بغداد کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس میں اس کی بہادری کا کوئی دخل نہیں تھا، اس نے دھوکہ دہی کا راستہ اختیار کر کے منگولوں کی عظمت اور وقار کو نقصان پہنچایا ہے''۔

''تمہاری بے سروپا باتیں اس قابل نہیں ہیں کہ ان پر ذرا سا بھی بھروسہ کیا جا سکے''۔ برقائی خان نے کہا۔

''برقائی خان! میں تمہیں آخری بار مشورہ دے رہا ہوں کہ تم اپنی حماقت سے باز آ جاؤ، ورنہ نقصان اُٹھاؤ گے۔ کچھ دن کی بات ہے پھر جو کچھ ہوگا وہ سب تمہارے سامنے ہوگا۔ جہاں تم نے اتنا وقت انتظار کیا ہے صرف چند دن تک ٹھہر جاؤ''۔ ارق بوقا التجائیہ لہجے میں بولا۔

''تم کیا چاہتے ہو، میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا۔ کبھی تم ڈراتے اور دھمکاتے ہو اور کبھی تم بے بسی کا اظہار کرتے ہو۔ تم صاف صاف بات کیوں نہیں کرتے کہ آخر ایسا کیا ہونے والا ہے جس سے تم فائدہ اُٹھانا چاہتے ہو''۔ برقائی خان اس کے انداز پر اُلجھ سا گیا۔

''برقائی خان!'' ارق بوقا نے درباریوں کی طرف محتاط نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''منگو خان کا دماغ چل گیا ہے۔ بڑھاپے کی دہلیز پر اسے اپنی سلطنت میں وسعت کی ہوس نے آن گھیرا ہے۔ وہ چین پر لشکر کشی کرنے پر تلا ہوا ہے۔ منگول امرأ میں اس پر اختلاف پیدا ہو چکا ہے۔ وہ منگو خان کے اس فیصلے کی مذمت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ برملا اپنی رائے کا اظہار تو نہیں کر پاتے، مگر پشت پر ان کے دلوں کا غبار نکلتا دکھائی دیتا ہے۔ منگو خان کا خیال ہے کہ ہلاکو خان کے بغداد اور بلادِ شام و شرقیہ کے قبضے کے بعد اسے بھی اپنی جوانمردی کا مظاہرہ کرنا چاہئے''۔

''اس سے مجھے کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟'' برقائی خان نے حیرت سے پوچھا۔

''تم شاید نہیں جانتے کہ قاآن اعظم چنگیز خان کو تنگری کے خادم نے یہ خبر دی تھی کہ جاودانی آسمان کی نیک روح نے اسے بتایا ہے کہ اس کے خاندان کا کوئی شخص چین فتح نہیں کر سکتا۔ جو کوئی چین کی فتح کا خیال اپنے دل میں لائے گا وہ جلد ہی موت کی گہری نیند سو جائے گا۔ اس کی بات سچ نکلی تھی جب قاآن اعظم چنگیز خان نے اسے واہمہ قرار دیتے ہوئے چین کی جانب پیش قدمی کا ارادہ کیا تھا تو وہ ابھی روانہ بھی نہیں ہو سکا تھا کہ زندگی کا وقت پورا ہو گیا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اب بھی کچھ ایسا ہی ہونے والا ہے''۔

''منگو خان کے مرنے یا مارے جانے سے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟'' برقائی خان نے پوچھا۔

''فائدہ اس کی موت سے نہیں بلکہ اس کے بعد منعقد ہونے والی رسم قرولتائی سے وابستہ ہے۔ تم کسی بھی طرح مجھے اس منصب پر بٹھا دو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری ہر خواہش کا احترام کرتے ہوئے پوری مدد

کر دوں گا اور بغداد میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، اس کی ہر طرح سے تلافی کرنے کی کوشش کروں گا۔ تم مجھے مسلمانوں کے حق میں ایک مخلص حاکم پاؤ گے''۔ ارق بوقا نے یقین دہانی کرائی۔ برقائی خان یہ سن کر سوچ میں پڑ گیا۔

''اگر تم اپنی عسکری قوت کے استعمال کی کوشش کرو گے تو یقیناً منگو خان چین کا خیال چھوڑ کر تمہاری راہ پر لگ جائے گا۔ اگر تم تھوڑا عرصہ خاموشی اختیار کر لو تو میں واپس جا کر منگو خان کو ہر طرح سے مطمئن کر دوں گا کہ برقائی خان پُر امن رہنے کا خواہش مند ہے۔ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ اس طرح وہ مطمئن ہو کر چین کی جانب متوجہ ہو جائے گا اور تم دیکھ لینا کہ انجام وہی ہو گا جو میں نے بتایا ہے''۔ ارق بوقا نے اپنی بات مکمل کی۔

''اگر ایسا نہ ہوا؟ قاآن منگو خان چین کی مہم میں کامیاب ہو گیا تو پھر......'' برقائی خان دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا اور ارق بوقا بغلیں جھانکنے لگا۔

''مجھے اپنے تجزیے پر پورا یقین ہے''۔ تھوڑی دیر بعد وہ مستحکم لہجے میں بولا۔

''تمہاری گفتگو کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم صرف یہ چاہتے ہو کہ میں کسی بھی طرح اپنا ارادہ ترک کر دوں''۔ برقائی خان نے سرسری انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے تم جو کرنا چاہتے ہو، وہ کرو...... میں منگولوں کی آپس میں جنگ کا خواہش مند نہیں تھا۔ قصوروار صرف ہلاؤ خان ہے اور تم سزا ان تمام لوگوں کو دینا چاہتے ہو جو تمہارے سابقہ مذہب پر قائم ہیں۔ ممکن ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ مگر اس دوران جو خونریزی ہو گی اس کے ذمہ دار تم ہو گے۔ میں نے جہاں تک سنا ہے اسلام کا یہ حکم ہے کہ اگر کوئی مسئلہ بغیر تیغ و جدل کے حل ہوتا دکھائی دے تو امن کی راہ اپنانا چاہئے''۔ ارق بوقا ناگواری سے بولا۔

درباری امرا ان دونوں کے بیچ میں ہونے والی گفتگو کے لب لباب سے کسی حد تک واقف ہو چکے تھے۔ ان میں ایسے افراد جو کہ منگولوں کے اتحاد کے قائل تھے، وہ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے لگے۔ ان کے برعکس برقائی خان کے حامی امرا نے ان کے جواب میں اپنے اپنے دلائل دینے شروع کر دیئے۔ دونوں فریقوں میں زور و شور سے بحث ہونے لگی اور دربار ایک طرح کا میدان کارزار بن کر رہ گیا۔ برقائی خان نے سب کو خاموشی اختیار کرنے کا حکم دیا اور ارق بوقا کی جانب متوجہ ہو کر بولا۔

''میں تمہارے کہنے پر اپنا ارادہ ملتوی کر رہا ہوں، میں اپنے طور پر کھوج لگاؤں گا کہ تمہارے بیان میں کتنی سچائی ہے۔ اگر منگو خان واقعی چین کی مہم پر روانہ ہو گیا تو رسم قرولتائی میں میں اپنا کردار ضرور ادا کروں گا۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ...... برقائی خان جو کہہ دیتا ہے اس پر عمل بھی کرتا ہے''۔

برقائی خان کے فیصلے پر درباری امرا کے چہرے کھل اُٹھے۔ برقائی خان یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ بے شک امرا کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں مگر ان کے قلوب آج بھی دوسرے منگولوں کے ساتھ دھڑکتے ہیں۔ اس لئے اس نے اپنے گروہ کے منگولوں کو مزید دھڑوں میں بٹنے سے بچانے کے لئے یہ فیصلہ سنایا تھا۔ اس کے ذہن میں منگو خان کی چین پر لشکر کشی کے سلسلے میں ایک بڑا اچھوتا خیال آیا تھا۔ ارق بوقا کی آمد نے اسے ایک نئی راہ سجھائی تھی، ایک ایسی راہ جس پر چل کر برقائی خان اپنے سب سے طاقتور حریف منگو خان پر ایک کاری ضرب لگا سکتا تھا اور اس کی ذات کی جانب کوئی انگلی بھی نہیں اُٹھا سکتا تھا۔



ہلاکو خان ارض فلسطین میں یافا کے میدان میں اپنا پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ ڈیڑھ لاکھ کے قریب تاتاری

سپاہی اس کے ہمراہ تھے۔ حلیف مسلمانوں اور نصرانیوں کے لشکر اس سے الگ تھے۔ صلیبی نائٹ، ہاسپٹلرز اور ٹمپلرز کی بڑی تعداد بھی اس کے ساتھ موجود تھی۔ ہلاکو خان کی نصرانیت پر خاص نظر کرم کے باعث صلیبی لٹیروں کو کھلی چھوٹ حاصل تھی۔ وہ مسلمان رعایا کو چن چن کر ہلاک کرتے رہے۔ ہلاکو خان کے حلیف مسلمان والیوں میں سے کسی میں اتنا دم باقی نہیں تھا کہ وہ صلیبی کارروائیوں کی مخالفت میں آواز اُٹھاتے۔ ہلاکو خان اسی مقام سے مختلف سمتوں میں اپنے دستے روانہ کرتا اور مزید کمک کی ضرورت کے پیغام موصول ہونے پر نئے اور تازہ دم لشکر بھیجتا۔ یافا میں قیام کے دوران اس نے اپنی فتح و نصرت کا بڑا عظیم الشان جشن منایا۔ شراب و شباب کی محافل چلتی رہیں۔ ایک دن ہلاکو خان اپنے شاہی خیمے میں عمائدین اور ریاستی امرا کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا کہ اسے کسی کاہن کی آمد کی خبر دی گئی۔ ہلاکو خان کاہن کے بارے میں سن کر نظام الملک طوسی کی جانب متوجہ ہوا اور اس سے دریافت کیا کہ کاہن کیا ہوتا ہے؟ نظام الملک طوسی نے مختصراً بتایا کہ یہودیوں اور ستارہ پرستوں میں کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو غیب کی خبریں بیان کرتے ہیں، انہیں کاہن کہا جاتا ہے۔ کہانت کے بارے میں سن کر ہلاکو خان کو تجسس ہوا اور اس نے کاہن کو شاہی خیمے میں طلب کر لیا۔ کچھ ہی دیر میں کاہن اندر داخل ہوا۔ وہ سیاہ رنگ کے موٹے کپڑے کے لبادے میں ملبوس تھا۔ اس کا لبادہ پیالے کی شکل کی مانند نیچے سے گول تھا اور کمر کے پاس ایک موٹی ڈوری سے کس کر بندھا ہوا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر شخص تھا جس کی کھچڑی نما داڑھی میں کالے بال خال خال دکھائی دیتے تھے۔ سر پر سیاہ پٹکا باندھے کاہن نے اندر داخل ہونے کے بعد تعظیم دی۔ کاہن کا حلیہ کچھ ایسا مضحکہ خیز دکھائی دے رہا تھا کہ کئی تاتاری امرا اور سالاروں کے چہروں پر شوخی رقص کرنے لگی۔ ہلاکو خان بھی اس کے عجیب حلیے کو دیکھ کر مسکرائے بغیر نہیں رہ پایا۔

''کہو کاہن! تم ہم سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟''

''سلطانوں کے سلطان! میں آپ کی عظمت کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ میں کاہن نہیں ہوں بلکہ ربی ہوں۔ میرا نام میسا ایل ہے۔ میں نے اپنی کتابوں میں جو کچھ پڑھ رکھا ہے اس حقیقت کا مشاہدہ مجھے آپ کے پاس کھینچ لایا ہے''۔

''کیسی حقیقت؟ ہم کچھ سمجھے نہیں!'' ہلاکو خان نے دریافت کیا۔

''ہماری الہامی کتاب میں عدل کے دن سے پہلے ایک طاقتور قوم کے خروج کا ذکر موجود ہے جس کے بارے میں تمام بیان کردہ نشانیاں آپ لوگوں پر پوری اترتی ہیں۔ چوڑے چہرے، مہذب دور میں بھی تنگ پنڈلیاں اور کھالوں کے لباس، ایک ایسی قوم جو جب سفر کرے گی تو فتح اس کا نشان بن کر رہ جائے گی۔ جس کے بہادر جس طرف سے بھی گذریں گے وہاں کوئی مخالفت کرنے والا زندہ نہیں بچے گا''۔ میسا ایل نے کہا۔

''بے شک ہم وہی ہیں جنہیں رب الافواج نے منتخب کیا اور تہذیب کے نام پر لوٹ کھسوٹ اور بے ایمانی کرنے والوں پر مسلط کر دیا۔ ہم جاودانی آسمان کی نیک روح کے بیٹے ہیں۔ ہمیں ساری زمین روندنے کا اختیار حاصل ہے۔ ہم ناقابل تسخیر ہیں۔ ایک ہمارا دادا چنگیز خان تھا جس نے بناوٹی تہذیب کی دھجیاں اُڑا کر رکھ دیں۔ اب ہمارا زمانہ ہے، تم دیکھ لینا کہ پھر ہم میں سے کوئی اُٹھے گا اور ہمارے ادھورے کاموں کو پایہ تکمیل تک پہنچائے گا''۔ ہلاکو خان اپنی تعریف میں قصیدے پڑھنے لگا۔

''میں سلطانوں کے سلطان کو ایک خاص نصیحت کرنے آیا ہوں''۔ میسا ایل نے دھیمے لہجے میں کہا۔ یہ سن کر درباریوں میں ہلچل سی پیدا ہوئی۔ ہلاکو خان بھی اُس کی جرأت پر دنگ رہ گیا تھا لیکن اس نے اپنے عمائدین کو پُر سکون رہنے کا اشارہ کیا۔

''کیا تمہاری بات کا تعلق بھی تمہاری کتاب سے ہی ہے؟''

''بے شک! میں نے اپنی الہامی کتاب میں جو کچھ پایا، اس سے آپ کو آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ مجھے آپ سے کسی انعام کی توقع یہاں کھینچ کر نہیں لائی اور نہ ہی میں اس بات پر خوفزدہ ہوں کہ آپ کے دربار میں میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا''۔ میسا ایل اطمینان سے بول رہا تھا۔ ہلاکو خان کے لئے اس کی شخصیت اہمیت اختیار کرنے لگی۔ ہلاکو خان ہی نہیں بلکہ تمام منگول اور تاتاری لوگ ایسے لوگوں سے فوری مرعوب ہو جاتے تھے جن کے بارے میں انہیں ذرا سی بھی بھنک پڑ جاتی کہ وہ کاہن یا راہب ہیں۔ یہ امر باعث حیرت ہے کہ ایک ایسی قوم جس نے اپنے زور بازو سے اسلامی خطے کے تہائی رقبے کو تسخیر کیا، تہذیب یافتہ شہروں میں بربریت اور سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قتل و غارتگری کا طوفان برپا کر ڈالا اور بریدہ سروں کے مینار تعمیر کئے، وہ توہمات میں اس قدر مبتلا تھی کہ معمولی سے کاہن سے پل بھر میں خوفزدہ ہو جاتی تھی۔

''تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو، اگر وہ بات ہمارے خلاف ہو گی تو بھی ہم اسے تحمل سے سنیں گے''۔ ہلاکو خان نے نرمی سے کہا۔

''سلطانوں کے سلطان کو میں متنبہ کرتا ہوں کہ ہماری الہامی کتاب میں درج ہے جب وہ قوم ارض مقدس میں داخل ہو جائے گی تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس وقت تک یہاں قیام کرے، جب تک رب الیہود کا فرمان نہ آ جائے۔ اگر وہ صبر و تحمل سے قیام کرے گی تو اس کے لئے ایک نئی منزل اور نئی عزت ہو گی اگر وہ حکم کے برخلاف اپنی من مانی پر آمادہ رہی تو اس کے لئے ذلت کا مقام ہے، ایک ایسی ذلت کا آغاز جو اس قوم کو زوال کی اتھاہ گہرائیوں میں جھونک دے گا پھر ان کا نام لینے والا بھی کوئی باقی نہیں رہے گا۔ میں سلطانوں کے سلطان سے استدعا کرتا ہوں کہ اس مقام پر قیام کو طویل کر دیں اور عزت و منزلت والے حکم کا انتظار کریں''۔

''تمہارے پاس اپنی بات کی سچائی کا کوئی ثبوت ہے؟'' ہلاکو خان نے پوچھا۔

''میرے پاس میری الہامی کتاب موجود ہے، اگر آپ کے دربار میں کوئی عبرانی زبان پڑھ سکتا ہے تو میں اسے بلا جھجک وہ عبارتیں پڑھوا سکتا ہوں''۔ میسا ایل نے جواب دیا۔

''کیا میرے دربار میں کوئی عبرانی سمجھنے والا موجود ہے؟'' ہلاکو خان نے اپنے عمائدین سے دریافت کیا۔ درباریوں میں سے کوئی بھی ایسا شخص نہیں تھا جو عبرانی زبان سمجھ یا پڑھ سکتا۔ ہلاکو خان کو اس امر پر حیرت ہوئی کہ اس کے دربار میں ایسا فرد کیوں نہیں ہے جسے عبرانی زبان پر مہارت حاصل ہو۔

''اجنبی! تم بے فکر رہو، تمہاری آزمائش کل تک موقوف کی جاتی ہے۔ ہم کل تک کسی ایسے شخص کو ڈھونڈ نکالیں گے جو تمہاری زبان سمجھتا ہو، چاہے اسے چین سے ہی کیوں نہ لانا پڑے۔ تم ہمارے مہمان خانے میں ٹھہر سکتے ہو، ہم اس بارے میں مزید بھی جاننا چاہیں گے''۔

''میں سلطانوں کے سلطان کا مشکور ہوں کہ انہوں نے میری بات سماعت فرمائی، میں آپ کے لشکر میں ٹھہرنے کے بجائے اپنی کٹیا میں رات گذارنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ اگر مجھ پر یہ مہربانی فرمائی جائے تو میں شکر گذار ہوں گا، میں کل دوبارہ آپ کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہو جاؤں گا''۔ میسا ایل نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ ہلاکو خان نے لمحہ بھر کے لئے سوچا اور پھر اسے اپنی کٹیا میں واپس لوٹنے کی اجازت دے دی۔ میسا ایل نے ایک بار پھر تعظیم دی اور الٹے قدموں باہر نکل گیا۔ جس وقت وہ خیمے سے باہر نکل رہا تھا، اسی وقت اس کا سامنا کتبغا خان سے ہوا۔ کتبغا خان عجیب ہیئت کے شخص کو دیکھ کر ٹھٹک سا گیا۔ میسا ایل اپنے سامنے کتبغا خان کی صورت دیکھ کر چونک پڑا، اس کے لبوں میں حرکت پیدا ہوئی اور غیر شعوری طور پر یہ جملہ اس کی زبان سے پھسل گیا۔

''تم بے شک وہی ہو جسے ایک دن بڑا معرکہ اسی ارض مقدس پر لڑنا ہو گا اور پھر تم لوگوں اور حملہ کرنے والوں کے درمیان حدود مقرر ہو جائیں گی''۔

کتبغا خان کچھ نہ سمجھ پاتے ہوئے اسے دیکھتا رہ گیا اور میسا ایل پُرسکون انداز میں چلتا ہوا اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ کتبغا خان اس کے جملے کے بارے میں سوچ رہا تھا مگر اس کا مفہوم اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔



بالآخر وہ وقت آن پہنچا جس کا دھڑکا اہل مصر کو مدت سے لگا ہوا تھا، جن اندیشوں اور وسوسوں نے ایک عرصے سے بلادِ مصر کی رعیت کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں، وہ حقیقت کا روپ دھار نے ایک دن ان کے سامنے نمودار ہو گئے۔ 658ھ کے وسط میں ایک گرم صبح تاتاریوں کا ایک گروہ بڑی تمکنت کے ساتھ اکڑ اکڑ کر چلتا ہوا قاہرہ میں وارد ہوا۔ مملوک سپاہیوں نے انہیں اپنے حفاظتی نرغے میں لے لیا۔ قاہرہ کے گلی کوچوں اور بازاروں میں پناہ گزینوں کی بڑی تعداد موجود تھی جن کے چہروں پر مظلومی اور تاتاریوں کی بربریت کی داستانیں عیاں تھیں۔ تاتاری چہروں کے ورود نے ان میں خوف و ہراس اور غیظ و غضب کی ملی جلی فضا پیدا کر دی۔ سلطان الملک المظفر کو اس گروہ کی آمد کے بارے میں بہت پہلے خبر مل چکی تھی۔ اس نے اس گروہ کے بارے اپنے مخبروں سے چھان بین کرائی تو معلوم ہوا کہ وہ ہلاکو خان کی جانب سے سفارتی پیغام لے کر آ رہے ہیں۔ اس لئے انہیں تمام راستے میں کہیں بھی نہیں روکا گیا۔ ان کی مسافت کی منزلوں کے بارے میں پل پل کی خبر سلطان الملک المظفر تک پہنچتی رہی۔ جونہی وہ لوگ قاہرہ کے نزدیک پہنچے تو سلطان الملک المظفر نے مملوک سپاہیوں کے ایک دستے کو حکم دیا کہ وہ انہیں بڑی حفاظت سے دربار شاہی تک لائیں۔ اسے اندیشہ تھا کہ قاہرہ میں موجود پناہ گزین یا رعیت جوش میں آ کر ان پر حملہ نہ کر بیٹھے۔ یہی وجہ تھی کہ مملوک سپاہی ننگی تلواروں کے سائے میں تاتاری وفد کو دربار تک لائے۔ تاتاری وفد اپنے اردگرد کے ماحول سے لاپرواہ دکھائی دے رہا تھا۔ ان کی آمد کی خبر پورے قاہرہ میں وبا کی مانند پھیل گئی۔ امرأ و عمائدین سلطنت حالات کا صحیح رُخ جاننے کے لئے تیزی سے دربار کا رُخ کرنے لگے۔

تلواروں کے سائے میں تاتاریوں کے چہروں پر کوئی خوف نہیں تھا بلکہ وہ بازاروں کی حالت زار دیکھ کر استہزائیہ انداز میں مسکرا رہے تھے۔ مملوک دستے کی رہنمائی اور حفاظت میں وہ وفد دربار تک پہنچا۔ دربار میں ان کی آمد سے قبل ہی تمام افراد پہنچ چکے تھے۔ ان میں سپہ سالار اعظم فارس الدین اقطائی اور سپہ سالار اعلیٰ آقسنقر بھی موجود تھا۔ بیبرس، علاء الدین لولو، فخر الدین اور کئی دوسرے معتمد امرأ بھی موجود تھے۔ تاتاری سفیر گردنیں تانے تکبر سے دربار میں داخل ہوئے۔ مملوک دستہ ان کے گرد موجود تھا۔ تاتاری وفد گھمنڈ کے ساتھ چلتا ہوا الملک المظفر سیف الدین قطوزی کے سامنے جا پہنچا۔ وفد نے آداب شاہی کی کوئی پرواہ نہیں کی اور نہ ہی تعظیم دی بلکہ سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔ الملک المظفر سیف الدین نے سپاہیوں کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا اور تاتاری سفارت سے ان کی آمد کی وجہ دریافت کی۔

تاتاری وفد میں سے ایک شخص نے اپنے لبادے میں سے سفارت نامہ نکالا اور ہاتھ تھما کر اسے الملک المظفر کی جانب پھینک دیا۔ شاہی دربار میں موجود ہر شخص ان کے گستاخانہ انداز پر پیچ و تاب کھانے لگا۔ الملک المظفر نے اپنے عمائدین کی جانب دیکھتے ہوئے انہیں صبر و تحمل اختیار کرنے کا اشارہ کیا اور سپاہی کو ہدایت کی کہ وہ سفارت نامہ اُٹھا کر صاحب دیوان کو دے۔ صاحب دیوان نے سفارتی خط لے کر کھولا اور تحریر پر نگاہ ڈالی اور

پریشان نگاہوں سے سلطان الملک المظفر کی جانب دیکھا۔ سلطان الملک المظفر نے اسے پڑھنے کا حکم دیا تو وہ تحریر پڑھنے لگا۔

''یہ اس شخص کا فرمان ہے جو ساری دنیا کا آقا ہے، جو سلطانوں کا سلطان ہے۔ اپنے شہروں کی فصیلیں منہدم کر دو اور میری اطاعت قبول کر لو۔ اگر ایسا کرو گے تو تمہیں امن وچین سے رہنے دیا جائے گا اور اگر تم نے ہمارا حکم نہ مانا اور سرکشی کا مظاہرہ کیا تو پھر جو کچھ تم کو پیش آئے گا، وہ بلند و بالا جاودانی آسمان کے سوا کوئی نہیں جانتا''۔

صاحب دیوان کی خاموشی پر دربار میں ہلچل سی برپا ہوگئی۔ سفارت نامے میں کسی قسم کے القاب کا استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ الملک المظفر نے پیغام سنا تو اس کی پیشانی پر بھی بل پڑ گئے۔ تاہم اس نے ضبط وتحمل سے کام لیتے ہوئے نرم لہجے میں انہیں مخاطب کیا۔

''ہم تاتاری وفد سے یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ آخر وہ کون سی وجہ ہے جو ہلاکو خان کو ہماری جانب بڑھنے پر مجبور کر رہی ہے حالانکہ ہماری سلطنت اس کی سلطنت سے بہت دور ہے؟ ہم نے کبھی اس کی جانب نظر اٹھا کر نہیں دیکھا اور نہ ہی ہماری جانب سے تاتاریوں کے خلاف کوئی عمل وقوع پذیر ہوا ہے''۔

''مت بھولو کہ تم خیوا شاہی سلطان ہو اور خیوا شاہی اقتدار کا خاتمہ ہمارے قاآن اعظم کا آخری فیصلہ ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ تم پر براہ راست حملے کے بجائے تمہیں اطاعت اختیار کرنے کا موقعہ دیا گیا ہے۔ ابھی تمہارے پاس وقت ہے کہ تم تاتاری سیادت قبول کر لو اور ہمارے ساتھ پابہ زنجیر قاآن اعظم کی قدم بوسی کے لئے روانہ ہو جاؤ''۔ تاتاری سفیر بلند آواز میں بولا۔ اس کے متکبرانہ لہجے پر دربار میں موجود ہر شخص غضبناک دکھائی دینے لگا۔ سلطان الملک المظفر بھی اس کا انداز برداشت نہ کر سکا۔

''تاتاری سفیر! تم اس وقت میرے دربار میں کھڑے ہو، سفارتی آداب کو ملحوظ نظر رکھو''۔

''خیوا شاہی سلطان!'' تاتاری سفیر سلطان الملک المظفر کی تختی پر لال بھبھوکا ہو کر بولا۔ ''کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارا حشر بھی ویسا ہی ہو جیسا کہ بغداد کے مغرور خلیفہ کا ہو چکا ہے۔ اپنی آواز دھیمی رکھو اور بخوبی جان لو کہ ہمارے آقا کی طاقت لامحدود ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اس کے مقابلے پر جم نہیں سکتی۔ وہ خوب جانتا ہے کہ تم جیسے خود سر سلطانوں اور ان کی رعیت کے ساتھ کیا سلوک کیا جانا چاہئے''۔

الملک المظفر سیف الدین قطوزی نے ان کے لہجے کو برداشت کرتے ہوئے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنے انداز سے باز رہیں اور تحمل سے بات کریں مگر تاتاری سفیر اس کے نرم لہجے کو کمزوری خیال کرتے ہوئے مزید اکڑنے لگے۔ اس کا لہجہ درشت سے درشت تر ہو گیا۔ فی الواقع ان کا رویہ سفارتی آداب کے قطعاً منافی تھا۔ الملک المظفر کے نرم رویے پر کئی جوشیلے درباریوں نے تاتاریوں کو سخت لہجے میں کڑے انجام سے ڈرایا مگر ان کی بدتمیزی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ کئی کمزور ہمت اور بزدل امرأ نے تاتاری وفد کی حمایت کرتے ہوئے سلطان الملک المظفر کو یہ مشورہ دیا کہ اسے تاتاری سیادت کو قبول کر لینا چاہئے۔ الملک المظفر اپنے درباریوں کی کم ہمتی پر ذہنی طور پر الجھ کر رہ گیا۔ وہ تاتاریوں سے پہلو بچانے کی کوشش کر رہا تھا کہ مبارزت کی نوبت نہ پیش آئے اور وہ مطمئن ہو کر واپس لوٹ جائیں، مگر ان کی حد سے بڑھتی ہوئی بدتمیزی کو برداشت کرنا بھی اس کے لئے دشوار ہو چکا تھا۔ کچھ امرأ نے تاتاری سیادت کی مخالفت کی مگر ان کے لہجوں میں کسی قدر خوف کی جھلک بھی موجود تھی۔ قریب تھا کہ سلطان الملک المظفر یہ اعلان کر دیتا کہ اسے تاتاری سیادت منظور ہے کہ شیخ عز الدین اٹھ کر اس سے مخاطب ہوئے۔

''میں سلطان محترم کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرانا چاہوں گا کہ تاتاریوں کی اطاعت کا فیصلہ بزدلانہ قدم ہوگا کیونکہ تاتاریوں کے عہد و پیمان کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ بغداد اور بلادِ شام وشرقیہ میں عہد شکنی کی کئی مثالیں آپ کے سامنے موجود ہیں''۔

سلطان الملک المظفر یہ سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ تاتاری سفیر اپنی برائی پر خاموش نہ رہ سکے اور انہوں نے ایک بار پھر خرافات بکنا شروع کر دیں۔ بیبرس کافی دیر سے ضبط کئے ہوئے تھا وہ نہ رہ سکا اور اُٹھ کر بولا۔

''اللہ کی قسم! تمہارے اور میرے بیچ میں اگر سلطان محترم نہ موجود ہوتے تو میں تمہاری بوٹیاں نوچ کر کتوں کے آگے ڈال دیتا۔ میں اپنے سلطان سے بھرپور استدعا کروں گا کہ وہ اپنے اس خادم پر بھروسہ کریں اور حکم عنایت کریں کہ میں انہیں وہ سبق از بر کرادوں جس سے یہ ناواقف ہیں۔ سلطان محترم! بلادِ مصر مسلمانوں کی آخری امید ہے، آپ گذشتہ وقت میں مسلمانوں کے لئے کچھ نہیں کر سکے تو اب انہیں تاتاریوں پر اعتماد کی نذر نہ کیجئے۔ اپنے اللہ پر یقین محکم رکھیں۔ آپ کے وفادار سپاہیوں میں اتنا دم موجود ہے کہ وہ ان بدتہذیب تاتاریوں کو ایسا کڑا سبق سکھائیں کہ وہ بھولے سے مصر کا رُخ نہ کریں''۔

بیبرس کی پرجوش تقریر پر فارس الدین اقطائی نے آگے بڑھ کر اس کی حمایت کی۔ ''سلطان محترم! بیبرس کی رائے بالکل موزوں اور درست ہے۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہمیں تاتاریوں پر یہ ثابت کرنا ہوگا کہ ان کی من مانی اب نہیں چل سکتی''۔

سلطان الملک المظفر ان کی گفتگو سن کر مطمئن دکھائی دینے لگا۔ چند لمحے پہلے اس کی پیشانی پر نظر آنے والی تفکر کی شکنیں دور ہو گئیں۔ وہ تاتاری سفارت کے ناقابل برداشت رویے پر بھرا پڑا تھا۔ بیبرس اور فارس الدین اقطائی کے جملوں نے اس کے عزم ویقین میں اور پختگی پیدا کر دی۔ وہ طے کر چکا تھا کہ موت تو ایک دن آنی ہی ہے تو پھر کیوں نہ ذلت کی زندگی جینے کے بجائے عزت کی موت کو قبول کیا جائے۔ کچھ لمحوں کے توقف کے بعد اس نے سخت ترین لہجے میں حکم دیا۔

''ان بدتمیز اور مغرور تاتاریوں کو فوراً گرفتار کر لیا جائے اور ان کی زبانیں گدی سے کھینچ لی جائیں اور ان کے سر قلم کر کے ہلاکو خان کو روانہ کر دیئے جائیں تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ سلطان الملک المظفر کا جواب کیا ہے؟''

سلطان الملک المظفر کے منہ سے جملوں کا نکلنا تھا کہ مملوک سپاہی ان پر جھپٹ پڑے۔ تاتاری وفد کے ارکان اتنے حیران تھے کہ اپنی مدافعت کے لئے انگلی بھی ہلا نہ پائے۔ آناً فاناً شوریدہ سر سفیروں کو خاک وخون میں لوٹا دیا گیا۔ دربار شاہی میں ہی ان کے سروں کو جسموں سے جدا کر دیا گیا۔

''ان تاتاریوں کے جسموں کو بڑے بڑے چوراہوں پر لٹکا دیا جائے تاکہ رعیت میں پھیلا ہوا خوف و ہراس دور ہو سکے''۔ سلطان الملک المظفر نے دوسرا حکم دیا۔ کچھ ہی دیر میں سپاہی ان تاتاریوں کے سروں اور لاشوں کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ دربار کا اعلیٰ ونفیس قالین تاتاریوں کے خون میں لتھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ فارس الدین اقطائی اور بیبرس کے چہرے پر مسرت کے آثار جھلک رہے تھے جبکہ کمزور ہمت امرأ کے چہرے سفید تھے۔

الملک المظفر نے تاتاری سفارت کو قتل کر کے ایک بار پھر تاریخ کو دہرا دیا تھا۔ اس کے نانا علاء الدین محمد تکش شاہ خوارزم نے چنگیز خان کی سفارت کو قتل کر کے اپنی پوری سلطنت تباہ و برباد کر والی تھی اور اب اس کے نواسے سیف الدین قطوزی نے بھی اسی عمل کا ارتکاب کیا تھا۔ بلادِ مصر نے ہلاکو خان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا

تھا۔ ہلاکو خان عرصے سے ایسے ہی بہانے کا منتظر تھا کہ اسے بلا د مصر پر چڑھائی کا کوئی واضح جواز مل سکے۔ تاتاری سفارت کے بریدہ سروں کی صورت میں جواز اس کے پاس روانہ ہو چکا تھا۔



منگولوں کے ایل خانی قاآن اعظم منگو خان کو جب اردوئے زریں کے حکمران برقائی خان کی جانب سے مکمل اطمینان ہو گیا تو اس نے چین پر لشکر کشی کی تیاریاں زور و شور سے شروع کر دیں۔ وہ اپنے دادا چنگیز خان کے ادھورے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنا چاہتا تھا، جس کی حسرت چنگیز خان اپنے دل ہی میں لئے اس دنیا فانی سے رخصت ہو گیا تھا۔ ایل خانی سلطنت کے وفادار منگولوں پر منگو خان کے ارادوں کا عقدہ کھلا تو انہوں نے بڑی شد و مد سے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ چین پر حملے کے لئے یہ موسم سازگار نہیں ہے اور دوسرا منگولوں کو چین کے بارے میں بھولے سے بھی نہیں سوچنا چاہئے کیونکہ چین پر یلغار کی صورت میں ہمیشہ انہیں ہزیمت اٹھانا پڑی ہے۔ تاتاری کاہنوں نے بھی چین کی سرزمین کو منگولوں کے لئے منحوس قرار دیا ہے۔ منگو خان کے مسلمان رفقاء نے ایسی باتوں کو توہمات قرار دیتے ہوئے اس کی حوصلہ افزائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ نصرانی رفقاء بھی مسلمانوں کی سبقت کو برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے صرف اس خیال کے پیش نظر مسلمانوں کے مؤقف کی حمایت کی کہ کہیں اختلاف کی صورت میں وہ قاآن اعظم کو ناراض نہ کر بیٹھیں اور اس کا دست شفقت عتاب کی صورت نہ اختیار کر لے۔ غیر منگول رفقاء کی اکثریت کی حمایت پا کر منگو خان کا حوصلہ بلند ہو گیا۔ منگول اور تاتاری رفقاء نے اپنے حاکم کی اطاعت کے پیش نظر خاموشی اختیار کر لی۔ منگو خان کے لئے چین کی مہم بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ وہ کچھ عرصہ پہلے بھی مختلف سپہ سالاروں کو اس جانب بھیج چکا تھا۔ وہ چین کے دو چار شہروں پر قبضہ کر چکے تھے مگر ان کا قبضہ دیرپا ثابت نہیں ہوا اور چینی لشکروں کی آمد پر انہیں وہاں سے پسپائی اختیار کرنا پڑی۔

تعجب کا مقام ہے کہ چینی لشکروں کی تعداد منگولوں کے مقابلے میں کبھی بھی زیادہ نہیں رہی تھی۔ وہ اپنی بلند ہمت اور جذبہ حب الوطنی سے معمور میدان میں اترتے اور طاقتور منگولوں کو پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر دیتے۔ چنگیز خان کی زندگی میں ہی یہ سلسلہ شروع ہو چکا تھا جو کہ وقفے وقفے سے جاری رہا۔ منگو خان کے عہد تک منگول اس میں کامیاب نہیں ہو سکے جبکہ سلطنت اسلامیہ جو کہ چین کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع و عریض تھی اور یہاں چین کی نسبت ہر شے کی فراوانی تھی، نامور سپہ سالار موجود تھے، عسکری ساز و سامان اور لشکروں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی، پھر بھی وہ منگولوں کے سامنے ریت کی دیوار ثابت ہوئے۔ پچاس برس کی مدت میں منگولوں نے سلطنت اسلامیہ کو پارہ پارہ کر کے تباہ و برباد کر دیا۔ منگولوں کی فتح یابی میں صرف ان کی بڑی تعداد اور بہادری کو ہی دخل نہیں تھا بلکہ ان کی کامیابی کے پیچھے مسلمان غداروں کی سازشوں اور جذبہ اخوت و ایمان سے خالی سلطانوں کا بھی ہاتھ تھا جو اپنے ہی بھائیوں کی سلطنتوں کی جانب ہمیشہ حریص نگاہوں سے دیکھتے رہتے تھے اور ان پر دسترس پانے کے لئے تمام تر طاقت صرف کر دیا کرتے۔ ملت اسلامیہ میں سے خلوص، انسانیت اور ہمدردی کے اسباق مٹ چکے تھے۔ نئی نسل کو رقص و سرود کی محافل کی عادت پڑ چکی تھی۔ نبیذ کو حلال قرار دے کر نشہ و مستی کا سامان پیدا کر لیا گیا تھا۔ بے راہ روی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ امراؤ شرفا کی خواتین دن دیہاڑے غیروں کے بستر گرم کیا کرتی تھیں۔ نوجوان سپاہی بننے کے بجائے گویے اور شاعر بن کر شاہی درباروں میں رسائی حاصل کیا کرتے اور اپنے فن کا مظاہرہ کر کے داد حاصل کرتے اور انعام و اکرام پاتے۔ امراؤ عمائدین سلطنت ایک دوسروں کی بیخ کنی میں مصروف رہتے۔ وزراء اور نائبین سلطنت اپنی بالادستی کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے حمایتی عہدہ داروں کے ظلم و ستم سے سلطانوں کو بے خبر رکھتے اور رعایا پر ٹوٹنے والے ستم کا کوئی مداوا نہ

کرتے۔ بسا اوقات حالات اس قدر بگڑ جاتے کہ رعایا میں سے کوئی نہ کوئی اٹھ کر ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کرتا اور کئی شہروں پر قابض ہو جاتا۔ یہ وزراء پھر بھی اپنے سلطانوں کو یہی باور کراتے کہ ہر طرف امن و امان کی صورت برقرار ہے۔ بغاوتوں و شورشوں کی کہانیاں محض افواہیں ہیں۔ کبھی کبھار کوئی سلطان ان وزراء کے چنگل سے نکل کر حقیقت سے باخبر ہو جاتا تو وزراء کی جماعت اس کے خلاف اتنی تیزی سے سرگرم عمل ہوتی کہ وہ زندگی سے ہی ہاتھ دھو بیٹھتا اور کبھی وزراء غلط بیانی اور گھناؤنی کرتوتوں کے جرم میں موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے۔ یہ سلسلہ ایک دن یا ایک برس کی پیداوار نہیں تھا بلکہ اس کا سلسلہ کئی سو سال سے اسی طرح جاری تھا۔ ایسے ہی حالات میں غیر تہذیب یافتہ منگول قہر الٰہی بن کر ان پر ٹوٹ پڑے۔ مسلمان سلطانوں کے سرسبز و شاداب ملک کھنڈرات اور ویرانی کی تصویر بن گئے اور ہنستی کھیلتی رعایا موت کی وادیوں میں اتار دی گئی۔

658ھ میں منگو خان اپنے لشکر جرار کے ساتھ چین کی جانب روانہ ہوا۔ اس نے اپنے پیچھے سلطنت طمغاج کی نیابت اپنے بھائی ارق بوقا کو سونپ دی۔ اس کا لشکر سرد طوفانی موسم میں سفر کرتا ہوا چین کی سرحدوں کے قریب پہنچ گیا۔ وہ صوبہ شن سی کی جانب سے حدود چین میں داخل ہوا۔ اس کے لشکروں نے چینی شہروں پر متعدد حملے کئے اور انہیں فتح کر کے نذر آتش کر دیا۔ منگو خان مسلسل کامیابی حاصل ہونے پر پر یقین ہو گیا کہ اب وہ وقت دور نہیں جب وہ چینی سرزمین پر قابض ہو جائے گا۔ چینی شہنشاہ چوآن کو جب منگو خان کی یلغار کی اطلاع ملی تو اس نے لشکروں کے لشکر مدافعت کے لئے اس کی جانب روانہ کئے۔ ان لشکروں کو ہدایت دی گئی تھی وہ ہر قیمت پر منگو خان کو چینی سرحدوں پر روکے رکھیں۔ خیج کیاؤ چاؤ کے ساتھ شدید طوفانی موسم میں منگو خان پیش قدمی کرتا ہوا صوبہ شن سی کے وسط میں پہنچ چکا تھا۔ اس کے جرار لشکر نے سخت ناگوار حالات میں بھی اپنی بہادری، مردانگی اور استقامت کا مظاہرہ کیا۔ منگو خان کا ساتھ ان کے لئے باعث تقویت تھا۔ اس کے لشکر میں سب سے زیادہ ہلاک ہونے والے گھوڑے تھے جو ناموافق موسم کے باعث بیمار ہو کر مر جاتے۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ گھوڑوں کے تلف ہونے کی مقدار میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کی زیادہ فوج پیادہ ہو گئی تو اس نے تیز ترین قاصدوں کو روانہ کیا اور ترکستان اور ماوراء النہر سے گھوڑے منگوائے۔ منگو خان کے نائب ارق بوقا خان نے نہایت مستعدی کا مظاہرہ کیا اور صرف ایک ہفتے میں اسی ہزار گھوڑوں کا قافلہ تیز ترین گھڑ سواروں کی نگرانی میں منگو خان کو روانہ کیا۔ صوبہ شن سی کے ایک مضبوط قلعے ژاؤ ژیان کے محاصرے میں منگو خان کو کئی ماہ تک رکنا پڑا۔ منگو خان اس صورت حال سے جھنجھلا گیا۔ اس نے محاصرے کو ختم کر کے قلعے پر حملے کا حکم دے دیا۔ اس کے سپاہی بھی عاجز آ چکے تھے۔ انہوں نے حکم پاتے ہی قلعے کی فصیلوں سے لمبی سیڑھیاں لگا دیں اور فصیل پر چڑھنا شروع ہو گئے۔ قلعے کے محصورین نے جب یہ منظر دیکھا تو انہوں نے گرم پانی اور آگ کے گولے ان پر برسانا شروع کر دیئے۔ منگول سپاہی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے فصیل کی جانب بڑھتے رہے۔ بالآخر ان کی محنت رنگ لائی اور وہ فصیل پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔ محصورین فصیل پر منگولوں کے قبضے سے متوحش دکھائی دینے لگے۔ انہوں نے ان پر حملوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ منگول سپاہی فصیل پر پوری کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح وہ نیچے اتر کر صدر دروازے پر پہنچ جائیں مگر مدافعت اتنی شدید تھی کہ وہ پیش قدمی میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اسی اثناء میں ہواؤں میں تیزی پیدا ہو گئی اور آسمان بادلوں سے ابر آلود ہو گیا۔ منگو خان نے موسم کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے حملوں میں شدت کا حکم دیا۔ وہ موسم کے زیادہ بگڑنے سے پہلے دروازے تک رسائی حاصل کرنے کا متمنی تھا۔ محصورین بھی بھانپ چکے تھے کہ منگول دروازے کی جانب بڑھنے کے کوشش کر رہے ہیں۔ انہوں نے فصیل کی سیڑھیوں میں آگ کے الاؤ بھڑکا دیئے۔ ہوا کی شدت سے ان کے شعلے بے ترتیبی سے دائیں بائیں پھیلتے رہے۔ کئی منگول سپاہی آگ

میں جھلس کر ہلاک ہوگئے۔ یہ دیکھ کر منگول دستے کے سالار نے سپاہیوں کو فصیل سے چھلانگیں لگانے کا حکم دے
دیا۔ سپاہیوں نے اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر فصیل سے چھلانگیں لگادیں۔ محصورین ان کی جرأت پر ششدر رہ
گئے۔ انہوں نے سپاہیوں کو کسی طرح بھی دروازے تک بڑھنے کا موقعہ نہیں دیا۔ جو کوئی سپاہی چھلانگ لگانے پر بچ
جاتا، وہ ان کی تلواروں کی بھینٹ چڑھ جاتا۔ موسم اس قدر خراب ہوگیا کہ فصیل پر منگولوں کا رہنا دشوار ہوگیا۔
طاقتور طوفانی ہواؤں نے منگول سپاہیوں کو الٹی جانب پھینکنا شروع کردیا۔ منگو خان نے یہ دیکھ کر سپاہیوں کو
سیڑھیوں کے ذریعے تیزی سے اترنے کی ہدایت کی۔ ابھی منگول سپاہی نیچے اترنے کی کوشش میں مصروف تھے کہ
تند ہواؤں نے فصیل سے لگی سیڑھیوں کو اڑا کر دور پھینک ڈالا۔ منگول سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد اس طوفان کے
باعث فصیل سے گر کر ہلاک ہوگئی۔ منگول لشکر میں طوفان کے باعث ابتری کا عالم پھیل چکا تھا۔ محصورین نے جب
یہ کیفیت دیکھی تو انہوں نے فصیل میں موجود چور دریچوں کو کھولا اور تیروں کی بارش ان پر کردی۔ منگول سپاہیوں کو
اس زبردست طوفان میں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ تیروں کی بارش نے انہیں ایسا حواس باختہ کیا کہ وہ پیچھے کی
جانب بھاگ کھڑے ہوئے۔ بے ترتیبی سے فرار ہوتے ہوئے وہ اپنے ہی ساتھیوں کو پیروں تلے کچل گئے۔ منگو
خان نے بڑی مشکل سے انہیں سنبھالا اور منظم کیا۔ انتظام و انصرام میں بہت دیر ہو چکی تھی۔ منگول لشکر کا ایک بڑا
حصہ تباہی و بربادی کا شکار ہو چکا تھا۔ منگو خان اپنے نقصان پر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اسے قلعے کے محصورین پر اتنا
غصہ نہیں تھا جتنا کہ اچانک اٹھنے والے اس شدید طوفان پر تھا۔ وہ اپنے لشکر کی تنظیم کرتے ہوئے اسے ایک محفوظ
درے کی جانب لے آیا۔ وہ محصورین کے تیروں کے حملے کی زد سے اب بالکل محفوظ تھے۔ منگو خان نے اپنے
سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ خود کو تیار رکھیں، طوفان کے تھمتے ہی ایسا زوردار حملہ کیا جائے گا کہ قلعے کے سب حفاظتی
انتظامات دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔

کافی دیر کے بعد طوفان تھما تو منگو خان نے اپنے سپاہیوں کو پیش قدمی کا حکم دیا۔ وہ جونہی قلعے کی جانب
بڑھے تو انہیں منظم انداز میں دور دور تک پھیلا ہوا ایک بہت بڑا لشکر اپنے سامنے دکھائی دیا۔ وہ شہنشاہ چین چوآن کا
لشکر تھا جس کا سرخ جھنڈا ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔ منگو خان کے لئے اس طوفانی موسم میں اچانک شہنشاہ چوآن کی
آمد حیرت انگیز تھی۔ منگو خان نے وقت ضائع کئے بغیر اپنے لشکر کی صفیں سیدھی کیں اور بھرپور پیش قدمی کا حکم دیا۔
دونوں لشکر ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ منگول سپاہی کچھ دیر پہلے طوفانی موسم سے نبرد آزما ہو کر نڈھال ہو چکے تھے
لیکن انہوں نے اپنی تکان کی پرواہ کئے بغیر چینی لشکر پر اپنی دھاک بٹھانے کی پوری کوشش کی۔ کئی گھنٹوں تک یہ
معرکہ جاری رہا۔ دونوں جانب پلہ برابر دکھائی دے رہا تھا۔ شہنشاہ چوآن پیچھے کھڑا میدان جنگ کی صورت حال
کے مطابق مختلف چالیں چل رہا۔ منگو خان کے مقابلے میں اس کا لشکر کافی زیادہ تھا۔ منگو خان کے لشکر کا کافی حصہ
دن کے پہلے حصے میں تباہ ہو گیا تھا۔ لڑائی فیصلہ کن مراحل کی جانب بڑھنے لگی۔ چینی لشکر کا پلہ بھاری ہونے لگا۔ منگو
خان نے طاقت کے توازن میں فرق محسوس کیا تو اس نے محتاط انداز میں اپنی سپاہ کو پسپائی اختیار کرنے کا حکم دیا۔
منگول لشکر مدافعتی انداز میں لڑتا ہوا پیچھے ہٹنے لگا۔ چینی لشکر نے یہ دیکھ کر حملوں میں شدت بڑھادی۔ ان کی لگاتار
کوششیں رنگ لائیں اور چینی لشکر کے سوار قلب میں گھسنے میں کامیاب ہوگئے۔ قلب میں افراتفری سی مچ گئی اور
پھر منگول لشکر کی صف بندی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی۔ منگو خان کے لئے نہایت دشوار حالات پیدا ہو چکے تھے۔
منگول لشکر ابتری کی تصویر بنا دکھائی دے رہا تھا اور چینی لشکر مسلسل انہیں نقصان پہنچا رہا تھا۔

(باقی حالات دوسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں)